سہ ماہی

عرضِ حال بہ جنابِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

(خواجہ الطاف حسین حالی)

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دُعا ہے
اُمّت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

وہ دین ہوئی بزمِ جہاں جس سے چراغاں
اب اُس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے

جو دین کہ تھا شرک سے عالم کا نگہباں
اب اُس کا نگہبان اگر ہے تو خُدا ہے

جس دین کی حُجت سے سب ادیان تھے مغلوب
اب مُعترض اُس دین پہ ہر ہرزہ سرا ہے

ہے دین ترا اب بھی وہی چشمۂ صافی
دیں داروں میں پر آب ہے باقی نہ صفا ہے

گو قوم میں تیری نہیں اب کوئی بڑائی
پر نام تری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہے

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مُدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی
ہاں ایک دُعا تیری کہ مقبولِ خدا ہے
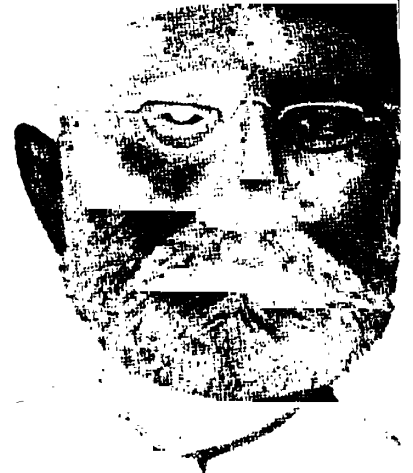
خواجہ الطاف حسین حالی

پنجاب وقف بورڈ
کے زیرِ اہتمام

حضرت شرف الدین بوعلی شاہ صاحب رح پانی پت کے سالانہ عرس کی تقریبات۔

- چادر شریف کے جلوس کا ایک منظر
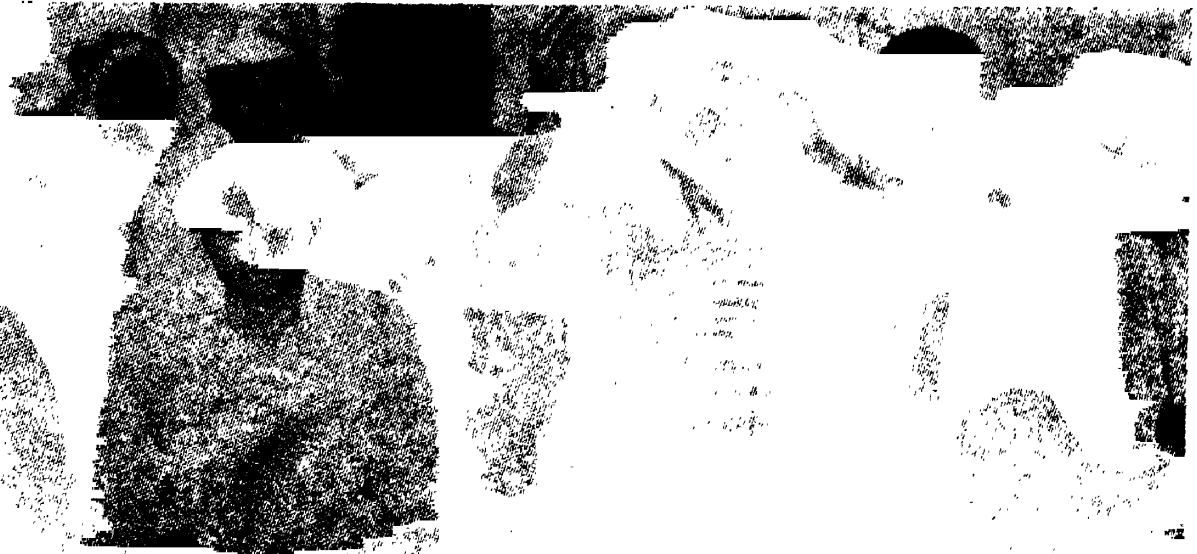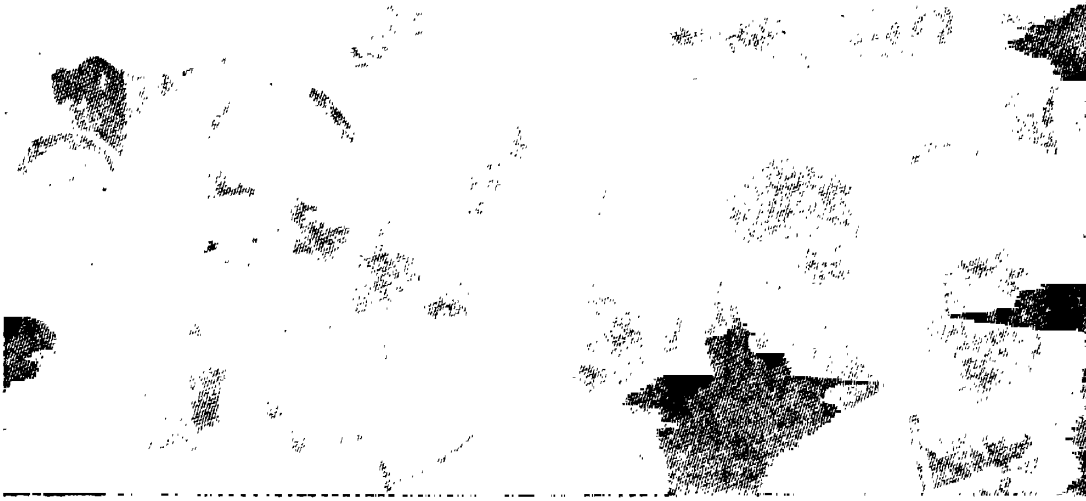
عرس میں محفل قوّالی

جس میں یو، پی اور پنجاب کی متعدد قوال پارٹیوں نے شرکت کی

یکے از مطبوعات پنجاب وقف بورڈ

اوقاف

سہ ماہی

مجلسِ ادارت

مدیر

حکیم اجمل خاں

جلد ۲	جنوری ——— ۱۹۷۴ء	شمارہ ۱

مجلّہ اوقاف سہ ماہی ——— ۵۰ سردار پٹیل مارگ انبالہ کینٹ

ترسیلِ زر کا پتہ

سکریٹری پنجاب وقف بورڈ (میگزین) ۵۰ سردار پٹیل مارگ انبالہ کینٹ

محتویات

پرنٹر و پبلشر ایڈیٹر حکیم اجمل خاں ــــــ پروپرائٹر ــ پنجاب وقف بورڈ ــــــ مطبوعہ کوہ نور پریس دہلی مقام اشاعت ۵۰ سرزا اپٹیل مارگ

ادارہ

اے ایمان والو! اپنے گھروں کے علاوہ دوسرے گھروں میں بغیر اجازت داخل مت ہوؤ! اور ان میں رہنے والوں کو سلام کہو۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ تاکہ تم نصیحت پکڑلو۔ اگر ان میں کسی کو نہ پاؤ۔ تو اس وقت تک مت داخل ہو۔ جب تک تمہیں اجازت نہ ملے۔ اگر تمہیں لوٹ جانے کے لئے کہا جائے۔ پس لوٹ جاؤ۔ یہ تمہارے لئے اچھا ہے۔ اور اللہ تمہارے عمل کو جانتا ہے۔

قرآن مجید ۲۴ / ۲۷ – ۲۸

ان آیات سے قبل سورت کا جو حصہ گذر چکا ہے۔ اس میں زنا و بداخلاقی کی مذمت کی گئی ہے۔ اور اس بداخلاقی کے رونما ہو جانے پر کیا سزا ہے۔ اس کا ذکر ہو چکا ہے جھوٹی تہمت پر کیا سزا ہے۔ اس کے ذکر کے علاوہ اس سلسلے میں تہمت پر ایک خاص واقعہ کو بیان کر کے مختلف ہدایات دی ہیں۔ اب ان آیات سے ان ہدایات اور احکام کا ذکر شروع ہو رہا ہے جن کا مقصد یہ ہے کہ جرائم کا سدباب ہو۔ ان اسباب کو ختم کیا جائے جو کہ ان برائیوں کے پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

یہاں خطاب اہل ایمان سے شروع کیا ہے اور واقعتاً اس خطاب کے حق دار ایمان والے ہی ہیں۔ جو اللہ اور رسول پر ہی ایمان نہ رکھتا ہو اس کا اس خطاب سے تعلق ہی کیا ہے ان آیات سے اسلامی اخلاق کا پورا قانون شروع ہو رہا ہے جس کا پہلا اصول مندرجہ بالا آیات میں بیان کیا ہے۔ تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل مت ہو۔ یہاں تک اجازت لے لو۔

تستانسوا۔۔۔ استیناس انس سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت تک دوسرے کے مکان میں داخل نہ ہو۔ جب تک کہ تم ان سے انس پیدا نہ کر لو۔ یہ وہ تم سے مانوس نہ ہو جاوے۔ ان سے واقفیت نہ ہو جائے۔ ان سے اجازت نہ لے لو۔

استیناس کی مختلف صورتیں ہیں۔ باہر سے آواز دینا۔ دروازہ کھٹکھٹانا۔ دروازے میں کھڑے ہو کر سلام کہنا۔ حدیث میں ہے کہ تین مرتبہ سلام کہنا چاہیئے۔ جواب ملے تو مکان میں داخل ہونا چاہیئے۔ ورنہ واپس ہو جانا چاہیئے۔

بغیر اجازت کسی کے رہائشی مکان میں داخل ہونے سے مختلف فتنے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اگر مکان خالی ہے۔ تو چوری وغیرہ کی بدگمانی ہو سکتی ہے۔ اور اگر اہل خانہ موجود ہیں۔ تو عین ممکن ہے کہ کسی نادیدنی حالت میں ہوں۔ اور اگر گھر میں صرف عورت موجود ہو۔ اور مرد موجود نہ ہو۔ تو یہ مزید فتنہ کا باعث ہوگا۔ ایک حدیث میں ارشاد ہوتا ہے۔ تہمت کے مواقع سے بچو۔ اور ان کے رہنے والوں کو سلام کرو تمہارے لئے بہتر ہے۔ تاکہ تم نصیحت پکڑو۔

سلام اندر جانے سے قبل کرنا چاہیئے۔ حضرت کلدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ کہ وہ رسول اکرم کے پاس گئے۔ تو سلام نہ کیا اور اجازت مانگی۔ رسول اکرم نے حکم دیا کہ لوٹ جاؤ۔ اور باہر جا کر یہ الفاظ کہو۔ السلام علیکم۔ کیا میں اندر آ جاؤں۔ اجازت سے داخل ہونا اور سلام کہنا ہر لحاظ سے بہتر ہے۔ دین ہی نہیں۔ دنیا اور تمہاری ذات کے لئے بھی مفید اور بہتر ہے۔ بدگمانی سے ہر ایک بچتا ہے۔ اور یہ بدگمانی کو روکنے کا بہترین طریقہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس حالت میں گھر والوں کی آمد و رفت بند ہوتی ہے۔ آپ کی بیوی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کسی کام کے سلسلے میں آپ کے پاس آئیں۔ وہ جب واپس جانے لگیں۔ تو آپ ان سے گفتگو کرتے ہوئے دروازے تک پہنچ گئے۔ سامنے سے دو آدمی اپنی غرض کے لئے دوڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی رسول اکرم نے فرمایا کہ آرام سے آؤ۔ یہ میری صفیہ ہیں۔ اسلام میں بدگمانی سے سختی سے روکا ہے۔ بہت بدگمانی سے بچو! زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔ برائی کی ترغیب کے مواقع سے بھی بچو۔ اسلام نے اخلاق کا معیار ساری دنیا سے بلند رکھا۔ خالی گھر میں مت جاؤ اور اگر جانا ضروری ہے تو اجازت طلب کرو۔ وہ مکان جہاں تمہاری سکونت نہیں ہے۔ تمام قریبی رشتہ داروں کے گھر ہیں۔ وہاں خاص کر اور اجازت لے کر داخل ہونا چاہیئے۔ سسرال میں بھی اجازت لینی چاہیئے۔ اپنے گھر میں داخل ہونے کے لئے اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن یہاں بھی دوپہر اور عشاء کے وقت اجازت لینی چاہیئے۔ یا کھانس کر جانا چاہیئے۔ تذکر نصیحت کو قبول کرنا عمل کرنا اور اچھی بات کو ماننا ہی دانش مندی ہے۔ امام شافعی ایک دفعہ جنگل میں نماز پڑھ رہے تھے اور آگے سترہ لگایا ہوا تھا لیکن خود سترہ سے کچھ دور تھے ایک آدمی پاس سے گذرا۔ اس نے آواز دی نمازی سترہ سے قریب ہو جاؤ تم سترہ سے بہت دور ہو امام شافعی نے فوراً تعمیل کی اور اپنے علم کی خامی

ادارہ

ایک روایت

حضرت تمیم داری رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دین خلوص و وفاداری کا نام ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالےٰ عنہم نے عرض کیا۔ کس کے ساتھ خلوص و وفاداری اے اللہ کے رسول۔؟ ارشاد فرمایا۔ اللہ کے ساتھ، اللہ کی کتاب کے ساتھ اللہ کے رسول کے ساتھ، مسلمانوں کے سرداروں، پیشواؤں، اور عوام کے ساتھ۔ (مسلم شریف)

دین کا کوئی شعبہ اور گوشہ ایسا نہیں جو اس حدیث کے مضمون سے باہر رہ گیا ہو۔ اللہ اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت، کتاب اللہ کی پیروی، مسلمانوں سے ہمدردی و خیر خواہی، یہی وہ اعمال ہیں۔ جن سے ایمان و اخلاق کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور بندہ مومن دین و دنیا کی بھلائیوں سے ہم کنار ہوتا ہے۔ اسلام کے دو اہم شعبے حقوق اللہ و حقوق العباد کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی لسان صدق نے نہایت جامع الفاظ میں سمو دیا ہے۔ گویا کوزے میں دریا بند کر دیا گیا ہے۔

اللہ کے ساتھ اخلاص و وفاداری کا مطلب یہ ہے۔ کہ انسان اس کی توحید کا سچے دل سے اعتراف و اقرار کرے۔ اور اس کی ذات و صفات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے اور بندگی و خاکساری کی جبین نیاز اس کی چوکھٹ پر جھکا دے۔ اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی رضا کا طوق گردن میں ڈال لے۔ امن و راحت میں اس کی حمد و ثنا سے رطب اللسان اور اس کی نعمتوں کا معترف ہو۔ رنج و مصیبت میں محض اس کی رضا کے لئے صابر و شاکر رہے اور ہر حال میں اور ہر وقت صرف اسی سے فریاد گریہ و زاری کرے۔ اس کی زبان پر یہ نغمہ ہے

تو کہہ دے کہ میری نماز، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا اللہ ہی کے لئے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔ (الانعام)

کتاب اللہ کے ساتھ وفاداری یہ ہے۔ کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ صدا بلند ہو کہ یہی وہ کتاب الٰہی ہے جو سب سے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ یہی وہ نسخہ کیمیا ہے۔ جس نے مردہ دلوں کو حیات جاودانی عطا کی۔ میرے لئے اس میں ہدایت ہے۔ نور ہے۔ فلاح ہے۔ کامیابی ہے۔ اس کے چھوڑنے سے شقاوت ہے۔ ضلالت ہے خسران ہے۔ ناکامی ہے۔ پس زندگی کے ہر شعبہ میں اسی کی ہدایت کو دستور العمل بنایا جاوے۔ اور اس کے بتلائے ہوئے راستے پر ہی چلا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خلوص و وفاداری یہ ہے۔ کہ قلب و جگر سے یہ صدا بلند ہو کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے آخری نبی اور رسول ہیں۔ ان کی اطاعت، ان کی محبت، ان کے لئے جاں نثاری اور فداکاری میرے لئے سرمۂ بصیرت اور راہ نجات ہے۔ ان کی ہر ادا کی اطاعت مرضیات خالق کائنات کو پانا ہے۔ ان کے نقش قدم پر چلنا رب رحیم کو راضی کرنا ہے۔ کیوں کہ اسی نے فرمایا ہے۔

"جس نے حکم مانا رسول کا، اس نے حکم مانا اللہ کا"

ایک جگہ فرمایا ہے۔

کہہ دیجئے کہ اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ چلو، تاکہ محبت کرے تم سے اللہ اور بخشے گناہ تمہارے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے"

پس اگر تم اللہ کی رحمت و مغفرت کے طلب گار اور اس کی رضا و عطا کو حاصل کرنے کے متمنی ہو۔ تو اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو اپنا شعار بناؤ۔

نہ صرف سرور کائنات سے محبت و الفت ہو۔ بلکہ آپ کے خاندان اہل و عیال اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے گہری عقیدت و محبت ہو۔ اس لئے کہ یہ نفوس قدسیہ آسمان نبوت کے درخشندہ ستارے ہیں۔ اور ان پر رب جلیل نے اپنی رضا و مغفرت کی رحمتیں برساتی ہیں۔

ابو رقیہ تمیم بن اوس بن خارجۃ الداری اپنے جد امجد دار بن ہانی بن حبیب بن بن عدی بن لخم کھلان بن سبا کی طرف منسوب ہیں۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہ وہ پہلے نصرانی تھے۔ اور "دیر" مقام میں عبادت کیا کرتے تھے۔ اسی نسبت سے داری کہلانے لگے۔ حضرت تمیم داری رضی اللہ تعالےٰ عنہ سن ۹ ہجری میں مشرف باسلام ہوئے بڑے عابد و زاہد تھے آپ کا شمار ان بزرگوں میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے ایک رکعت میں قرآن مجید ختم کیا خشوع و خضوع کی کیفیت ایسی تھی۔ کہ ایک رات اللہ کے حضور کھڑے ہوئے۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور لسان صدق سے یہ آیت جاری تھی۔

کیا جنھوں نے برائیاں کمائی ہیں۔ خیال رکھتے ہیں۔ کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر کریں گے۔ جو یقین لائے۔ اور بھلے کام کئے۔ (الجاثیہ)

شروع میں آپ نے مدینہ منورہ میں قیام فرمایا۔ اور عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی شہادت کے بعد بیت المقدس منتقل ہو گئے۔ اور ۴۰ھ میں وہیں وفات پائی۔

(الریاض المستطابہ)

مدیر

فکریات

پچھلے دنوں انبالہ کینٹ میں سمپردائکتا ورودھی کمیٹی کی ہریانہ شاخ نے فرقہ واریت کے خلاف ایک سمیلن منعقد کیا۔ جناب اندرکمار گجرال وزیر اطلاعات ونشریات حکومتِ ہند اس کنونشن میں بطور مہمان خصوصی تشریف فرما تھے۔

کنونشن میں ہریانہ کے مختلف مقامات سے ڈیلیگیٹ لائے گئے تھے۔ ان میں طلبا، اساتذہ، سیاست دان، اور دانش وران موجود تھے۔ سمپردائکتا ورودھی کمیٹی کی ریاستی شاخ کے صدر جناب چودھری طیب حسین ایم پی، جناب سریندر وملیش کنوینر نے ہمیں دعوت دی تھی۔ کہ ہم اس کنونشن میں ضرور شریک ہوں۔ فرقہ پرستی جیسے بدترین سماجی ناسور کو ختم کرنے والی تحریک کے داعیان کی دعوت کے پیش نظر ہم نے مناسب سمجھا کہ اس کنونشن میں شرکت کی جائے۔ تاکہ اس بات کا مطالعہ کیا جاسکے۔ کہ ہندوستان میں فرقہ پرستی کو ختم کرنے والی تحریکات کو طریق کار کیا ہے۔

آل انڈیا سمپردائکتا ورودھی کمیٹی ایک ملک گیر تنظیم ہے۔ جس کی صدر محترمہ سبھدرا جوشی ایم پی ہیں۔ کئی سال ہوئے آپ نے یہ تحریک شروع کی۔ ملک کے مختلف پردیشوں میں اس کے یونٹ قائم کئے۔ قومی ایکتا ٹرسٹ کے نام سے اشاعتی سلسلہ شروع کیا اور ایک میگزین بھی "سیکولر ڈیموکریسی" کے نام سے جاری کیا۔ جو انگریزی ہندی اور اردو تینوں زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔

انبالہ میں کنونشن کے مختلف اجلاس ہوئے۔ جن میں تحریک کے رہنما اور ڈیلیگیٹ صاحبان کے خیالات سننے کو ملے۔ رفا طور پر یہی اندازہ ہوا۔ کہ یہ حضرات دبی زبان سے مذہب کو فرقہ پرستی کے لئے ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے سرکار کے سیکولرازم کی پرزور حمایت اور موثر وضاحت کی۔ جس کا مفہوم آج تک یا تو موہوم ہے۔ یا ہر شخص اپنے صواب دید اور مفاد کے مطابق لیتا ہے۔ اس طریق کار سے ہمیں اطمینان نہیں ہوا۔ بلکہ ایسا محسوس ہوا۔ کہ یہ تحریک بھی ایک فرقہ بن رہا ہے جو اپنی موجودہ روش میں ترقی کر کے بالآخر مذہب دشمن رویہ اختیار کرلےگا۔ اور اس وقت دم لے گا۔ جب پورا ملک مذہب کو مکمل طور پر خیرباد کہہ کر لادین بن جائے گا۔

فرقہ پرستی کو ختم کرنے کے لئے یہ جو طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمارے خیال میں اس کی افادیت منفی ہے۔ مختلف مذاہب کی تخفیف یا توہین کر کے فرقہ واریت کو نہیں ختم کیا جاسکتا۔

ہمارے ملک میں فرقہ پرستی کی یوں تو بے شمار قسمیں ہیں لیکن دو قسمیں بڑی ہیں۔ ایک مذہبی فرقہ واریت، اور دوسرے سیاسی فرقہ واریت۔ مذہبی فرقہ واریت تو خود مذہب کے ماننے والوں کے درمیان موجود ہے۔ جس طرح اسلام یا ویدک دھرم میں متعدد فرقے پائے جاتے ہیں

ان فرقوں کے آپس میں بھاری اختلافات رہتے ہیں۔ بسا اوقات تشدد پر بھی اتر آتے ہیں۔ اور جنگ و جدال پر نوبت آجاتی ہے۔ اس فرقہ پرستی سے غالباً سرکار کو یا اس تحریک کا کام کرنے والوں کو کوئی دلچسپی نہیں۔

دوسری قسم سیاسی فرقہ پرستی، جیسے ہندو سکھ فرقہ پرستی، ہندو عیسائی یا مسلم عیسائی فرقہ پرستی، صوبائی و لسانی فرقہ پرستیاں، شمال و جنوب کی عداوت، قوم نسل، و گروہ کی عصبیت کسان و غیر کسان، دکان دار و غیر دکان دار کا اختلاف، گورت و پال کی فرقہ پرستی، رفیوجی و لوکل کی گروہ بندی، وغیرہ وغیرہ بہت سی فرقہ پرستیاں ہیں، جو ہمارے معاشرے میں پنپ رہی ہیں۔ سمپر دائکتا اور ودھی کمیٹی یا اس جیسی دوسری جماعتیں دراصل اسی قسم کی فرقہ پرستیوں کی مخالف ہیں۔ یہ فرقہ واریت ہندوستان میں زمانہ قدیم سے موجود ہے۔ اسی کمزوری کی بنا پر ہندوستان صدیوں تک غلام رہا ہے۔

مذہب قدیم ہے۔

انسانی زندگی کے گذارنے اور اس کے نظام کو بہتر طریقے پر چلانے کے لئے مذہب کا رواج ہوا۔ جسے انسانوں کا اکثریتی طبقہ مابعد الطبیعی شے سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے عروج کے لئے بہت سے انبیا مبعوث ہوئے۔ الہامی کتابیں نازل ہوئیں جن کے ذریعہ مختلف مذاہب کا رواج ہوا۔ تاریخ بتاتی ہے۔ کہ جس قدر مذاہب دنیا میں رائج ہوئے۔ ان کی ابتدا نہایت خوش آیند ہوتی تھی۔ لیکن جیسے جیسے وہ پرانے ہوتے جاتے تھے۔ اس کے ماننے والوں میں انتشار بے چینی اور اختلافات رونما ہوتے رہے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذاہب کی اصل شکل مسخ ہوگئی۔ حقیقتاً مذہب قدیم ہے۔ اور اس کی بنیاد ایک مابعد الطبیعی ضابطہ حیات پر رکھی گئی ہے۔ تاکہ انسان کی فکری و عملی طاقتوں کو کنٹرول میں کیا جاسکے۔ اور اس سے ایسی برائیوں کا ارتکاب نہ ہوسکے۔ جو انسانی معاشرہ میں خرابیاں پیدا کرتی ہیں۔

لالچ و خود غرضی معاشرہ کو تباہ کرتی ہے۔

تمام مذاہب کا مقصد یہی رہا ہے۔ کہ وہ انسان کی فکری و عملی قوتوں کو سماجی ضابطہ میں رکھ سکیں۔ لیکن چوں کہ انسان فطری طور پر لالچی پیدا کیا گیا ہے۔ اور جہد للحیات و تنازع للبقا کی فطری ضرورت کے لئے اس میں خود غرضی کا ہونا ضروری قرار پایا ہے۔ جس میں وہ عدم توازن کا شکار ہوتا ہے اور انسانی معاشرہ میں ایسی غلطیوں کا ارتکاب کرتا ہے۔ جس سے انسانی معاشرہ متاثر ہوتا ہے۔ جہد للحیات و تنازع للبقا کی فطری ضرورت میں عدم توازن آجانے کو ہم لالچ یا خود غرضی کہتے ہیں۔ فطری تقاضوں کے مطابق یہ دونوں چیزیں بری نہیں ہیں۔ دراصل ان کا عدم توازن برائی کی جڑ ہے۔ اور مذہب کا مقصد ان فطری تقاضوں کو توازن میں رکھنا ہے۔ انسان نے زندگی گذارنے کے لئے دور جدید میں جو قوانین مرتب کئے ہیں، مذہبی ضابطوں کی ترقی یافتہ شکل ہیں۔ مذہب میں انسانی ذہن کو برائی کے ارتکاب سے روکنے کے لئے مابعد الطبیعی تصورات ہیں۔ اور دور جدید نے قانون کی شکل میں ضابطہ فوجداری و دیوانی مرتب کئے ہیں۔ لیکن جہد للحیات و تنازع للبقا کے فطری تقاضوں نے دونوں کو ناکام بنایا ہے۔ الغرض آج غیر شعوری طور پر انسانیت اس بات کی کھوج میں پھر سرگرداں ہے۔ کہ معاشرہ انسانی کو کس طرح ہلاکت اور برائیوں سے محفوظ رکھا جائے۔

فرقہ پرستی کا پس منظر

ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ کہ فرقہ واریت ہمارے معاشرے میں زمانہ قدیم سے موجود ہے۔ اور اس کا بڑا سبب دراصل وہی انسانی فطری خواہشات ہیں۔ جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔

تاریخی روایات کے مطابق ہندوستان میں آریہ قوم کی آمد سے پہلے دوسری قومیں آباد تھیں۔ مگر جب آرین نسلیں آئیں۔ تو وہ قابض ہو گئیں۔ انھوں نے یہاں کے اصل باشندوں کو زیر کر کے جنوبی ہند کی جانب بھگا دیا۔ آریوں کی مقدس کتابیں، وید، براہمن، اپنشد، سوترہ، مہابھارت و رامائن وغیرہ میں جو تاریخی واقعات ملتے ہیں۔ وہ اختلافات سے بھرے ہیں۔ عام انسانی فطری تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے بڑی بڑی جنگوں کی داستانیں ان کتابوں میں موجود ہیں کورو و پانڈو دو الگ قبیلوں کے سردار تھے۔ کورو زیادہ مہذب تھے اور پانڈو جنگجو، کورو پہلے دب گئے۔ مگر انھوں نے ہوشیاری سے پانڈوؤں کو جوا کھیلنے کی دعوت دی۔ سیاست اور جنگ کے میدان میں جو کچھ انھوں نے ہارا تھا۔ وہ پانسے کے کھیل میں جیت لیا یہی نہیں بلکہ ان کو بارہ برس کے لئے وطن چھوڑنے پر مجبور کیا۔ پانڈوؤں کو ہار کا اتنا غم نہیں تھا جتنا کرشنا دروپدی کی بے عزتی کا افسوس ہوا۔ انھوں نے انتقام کا انتظام کیا اور کوروکشیتر کے میدان میں دوارکا کے راجہ کرشن جی کی مدد سے اٹھارہ دن تک جنگ کی جس میں انھیں کامیابی ہوئی۔

اجودھیا کے راجہ رام چندر جی راجہ دسرتھ کے لڑکے اور راج کے حق دار تھے لیکن ان کی سوتیلی ماں رانی کیکئی نے راجہ دسرتھ کو مجبور کیا۔ کہ انھیں جلاوطن کر دے۔ اور راج اس کے بیٹے بھرت کو سونپ دیا جائے۔ رام چندر جی نے اپنے باپ کے حکم کو تسلیم کیا۔ اور اپنی بیوی اور بھائی کے ساتھ بن باس اختیار کیا اس دوران میں راون دھوکے سے سیتا جی کو لے گیا۔ رام چندر جی لنکا پہنچے۔ اور ہنومان کی مدد سے راون کو شکست دے کر سیتا جی کو لے آئے بن باس کی مدت پوری ہونے کے بعد وہ وطن واپس پہنچے۔ تو ان کے بھائی بھرت نے راج ان کے حوالے کیا۔

شری کرشن جی اور رام چندر جی عظیم اوتار مانے جاتے ہیں۔ رامائن و مہابھارت مذہبی و اخلاقی تعلیم کا ذریعہ بنائی گئی ہیں بھگوت گیتا میں حق کی حمایت کی زبردست تلقین کی گئی ہے۔ ان کتابوں کا مقصد بہرحال صحیح انسانی زندگی کا خاکہ مرتب کرنا اور اس کو ان کے سانچے میں ڈھالنا ہے جس سے آئندہ نسلیں بہترین اور نمونہ کی زندگی گذار سکیں۔

ویدوں کا تقدس جب کم ہو گیا۔ اور انسان و کائنات کے وجود کے سرچشمہ تک پہنچنے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ تو بدھ دھرم نے جنم لیا۔ جو آرین تہذیب کے مناد برہمن کے خلاف دراصل کھلی ہوئی بغاوت تھی۔ اور انسان کی نفس پرستی، خود غرضی، اور شخصیت پرستی کی برائیوں کو دور کرنے کا بہترین علاج تھا۔ اس کے اثرات دیرپا اور دور رس ہوئے۔ اگرچہ روح اور مادہ کی ابدیت کا نظریہ پہلے سے موجود تھا لیکن گوتم بدھ نے اس کی واضح نشاندہی کی۔ کہ انسان کے احساسات اور تصورات کا تعلق اس کی روح سے نہیں بلکہ مادے کی بدلتی ہوئی دنیا کے مظاہر ہیں۔ وہ اپنے اس نظریہ میں اس قدر پختہ تھے۔ کہ انھوں نے خدا اور کسی مابعد الطبیعی مسئلہ پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ ان کا خیال تھا۔ کہ ریاضت کے ذریعہ نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ اور تیاگ اور تپسیا تمام خرابیوں کا علاج کر سکتا ہے۔

مندرجہ بیان سے ہمارا مقصد بدھ مذہب کے عقائد پر بحث کرنا نہیں ہے۔ بلکہ یہ بتانا ہے۔ کہ دراصل جہد للحیات اور تنازع للبقا کے فطری تقاضے خرابیاں پیدا کرتے رہے ہیں۔ جن کی اصلاح کے لئے مختلف مذاہب زمان و مکان کے حساب سے جنم لیتے رہے ہیں۔ چنانچہ بدھ دھرم کے جنم لینے کا پس منظر بھی دراصل یہی انسانی کمزوریاں ہیں۔ اس مذہب نے اس انسانی کمزوری کا بھاری نوٹس لیا ہے۔

ہندوستان میں آرین قوموں کی مذہبی و سیاسی نمائندگی برہمن کرتے تھے۔ جنوبی ہند کے لوگ ان کے سیاسی محاسبہ سے زیادہ پریشان ہوئے جس سے آج تک بھی ان میں برہمن کے خلاف نفرت پائی جاتی ہے۔ براہمنوں کے دور میں جب آریہ مشرق کی طرف بڑھے۔ اس وقت فرائض مقرر ہو گئے تھے۔ جو خاندان مذہبی پیشواؤں کا کام کرتے تھے۔ وہ کام برہمن ذات کے لوگوں کے سپرد ہو گیا۔ راج کا کام کرنے والے کشتری ہو گئے کھیتی باڑی اور تجارت کا کام کرنے والے ویش ہو گئے۔ اور باقی تمام شودر کہلائے۔ انسانیت کی اس پیشہ وارانہ تقسیم کے نتیجہ میں کچھ طبقوں کی بالادستی تو قائم ہو گئی مگر انسانیت میں ایک زبردست خلیج پیدا ہو گئی۔ جو معاشرہ میں نفرت پیدا کرنے کا موجب بنتی چلی گئی۔

برہمن کا دائرہ کار مذہب بن گیا۔ جس میں اس نے دل کھول کر تفریقات کو جنم دیا۔ کشتری نے راج پاٹ کی لڑائی لڑی چنانچہ آرین قوموں کی بے شمار نسلیں تومر، جادو، پرمار، سولنکی، کشواہہ وغیرہ ہندوستان کے مختلف حصوں پر راج پاٹ کرتی رہیں۔ ان میں آپس میں سخت سیاسی اختلافات تھے۔ وہ ایک دوسرے کی جان کے دشمن تھے۔ نسلی تفریقات کی بنا پر ہندوستان میں حکومتیں کمزور ہوتی چلی گئیں۔ اور بیرونی طاقتوں نے ہندوستان پر حملے شروع کر دیئے پہلی صدی ہجری میں سندھ کے راستے مسلمان حملہ آور ہوئے۔ انھوں نے آہستہ آہستہ بالآخر پورے ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ ان حملوں کے دوران مذہب کا جوش اور جذبہ یک طرفہ تھا۔ ہندوستان کے راجے مہاراجے نسلی تفریقات کا شکار تھے۔ ہندوستان پر بیرونی قبضہ ہونے کے بعد بھی انھیں اس امر کا احساس نہیں ہوا۔ کہ وہ اپنی ذاتی اغراض کو بالائے طاق رکھ کر اپنے ملک کا دفاع کریں۔

مسلمانوں کے نوصد سالہ دور حکمرانی میں بے شمار واقعات تاریخ میں ایسے ملتے ہیں۔ جب مسلمان بادشاہ دوسرے مسلمان بادشاہ سے ٹکرائے اور ہندو راجہ دوسرے ہندو راجہ سے ٹکرائے۔ یہ لوگ مذہبی بالادستی کے قائل نہ تھے۔ بلکہ صرف اپنے راج پاٹ یا سیاسی مفادات کی حفاظت کرتے تھے۔

شہاب الدین غوری کے عہد میں تومر اور چوہان نسلوں کی بھاری لڑائیاں ہوئیں جن میں شہاب الدین نے پرتھی راج کے خلاف تومروں کا ساتھ دیا تھا اسی طرح جے چند کا واقعہ ہے۔ لودھی بادشاہوں کی لڑائیاں مغل حکمرانوں سے ہوئیں۔ بابر کے خلاف پانی پت اور فتح پور سیکری میں جو جنگی محاذ قائم ہوئے۔ ان میں مسلم بادشاہ اور ہندو راجہ دوش بدوش ہو کر بابر کے خلاف لڑے تھے۔ اسی طرح مرہٹوں کے خلاف متعدد ہندو راجہ لڑتے رہے۔ خود مرہٹے اپنی بالادستی کے لئے ہندو راجاؤں کے خلاف لڑے۔۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار سے لے کر ۱۹۴۷ء کے یوم آزادی تک ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے راجاؤں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں کا جو کردار رہا۔ وہ اس پرانی تاریخ سے بھی بدتر تھا جس میں خود ہندو راجے اپنے ملک سے غداری کرتے رہے۔ انگریز نے خان بہادروں، رائے بہادروں اور سروں کی ایک کھیپ پیدا کر دی۔ ہندوستان کے راجے اپنی ریاستوں کو باقی رکھنے کے لئے ہندوستان کو غلامی سے نجات دلانے کے لئے تیار نہیں تھے۔ انگریز ہندوستان کے

عوام کی کمزوریوں سے واقف ہوگیا تھا۔ اس نے مختلف طریقے سے متعدد قسم کی فرقہ پرستیوں کو جنم دیا۔ ان میں مذہبی فرقہ پرستی بھی شامل تھی۔ وہ ایک طرف مسلمان کا ہمدرد بنتا تھا تو دوسری طرف ہندو کو آزادی کا سبق خود سکھارہا تھا۔ فرقہ پرستی پھیلانے کے لئے وہ سرکاری اثر رسوخ اور روپے کا بے دریغ استعمال کرتا تھا۔ انگریزی عہد میں افسران باقاعدہ مذہبی مناظرے، مجادلے، اور فرقہ وارانہ کشیدگیاں پیدا کرتے تھے۔

کانگریس نے آزادی کی تحریک شروع کی۔ تو اس میں بھی اختلاف رونما ہوا۔ سوراجیہ پارٹی بنی، مسلم لیگ نے جنم لیا۔ دو قومی نظریہ کا جنم ہوا وغیرہ وغیرہ۔

یہ ساری تاریخی تمہید ہمیں اس لئے بیان کرنا پڑی۔ کہ اصل میں فرقہ واریت کی بنیاد مذہب نہیں۔ بلکہ انسانی اغراض سیاست و اقتصاد ہیں۔ مذہبی فرقہ واریت لسانی و صوبائی عصبیت، نسلی و گروہی اختلاف، پیشہ ورانہ جھگڑے جتنی بھی فرقہ پرستی کی اقسام ہیں۔ موقعہ اور محل کے اعتبار سے سیاسی مقاصد کے لئے بطور آلہ کار استعمال کی جاتی ہیں۔ اور ہمارے عوام جن کی جذباتی وابستگی ان سیاسی یا اقتصادی مفادات کے ساتھ ہوتی ہے، فرقہ واریت کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ کسی مذہب کی تعلیمات میں ظلم، تشدد، دنگے، فساد، کا کھوج نہیں ملتا۔ اس لئے جو لوگ سیاسی فرقہ واریت کے سلسلے میں مذہب والوں کو بدنام کرتے ہیں۔ وہ مذہب کے اوپر ظلم کرتے ہیں۔

یہ سب کیوں ہے

ہمارے عوام مذہب سے دور ہیں۔ انھیں مذہبی تعلیم سے واقفیت نہیں۔ اگر وہ مذہب کو واقعی طور پر جانتے ہوتے۔ تو وہ مذہب کے نام پر دنگے فساد کرنے کی جرأت نہ کرتے۔ ان میں مذہب کے ساتھ جذباتی لگاؤ تو ہوتا ہے مگر حقیقی تعلیمات سے کوسوں دور ہیں۔ ایسے لوگ مذہب کے نام پر بآسانی بیوقوف بنائے جاسکتے ہیں۔

ماضی قریب میں آپ نے دیکھا۔ کہ ہندوستان میں اسلام کا نمائندہ محمد علی جناح کو سمجھ لیا گیا۔ اور جواہر لال کو ہندو (ویدک دھرم) کا۔ حالاں کہ ان دونوں شخصیتوں کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ دونوں رہنما خالصًا سیاسی تھے۔ جو لوگ ان سیاسی لیڈر ان کو مذہب کا نمائندہ سمجھ کر ان کے معتقد ہوئے انھیں بے وقوف ہی کہنا بہتر ہوگا۔ ایک سیاسی لیڈر ہندو، مسلمان، سکھ، یا عیسائی تو ہو سکتا ہے لیکن اسے ویدک دھرم، اسلام، سکھ مت، یا عیسائیت نہیں قرار دیا جاسکتا۔

جناح یا نہرو کی مثال یہاں اتفاقی طور پر آئی ہے۔ ہمارا مقصد ان تمام سیاسی رہنماؤں سے ہے۔ جو سیاسی کام کرتے ہیں۔ سیاسی تحریکیں چلاتے ہیں۔ انھیں چاہئے کہ وہ اپنی سیاسی اغراض کو پورا کرنے کے لئے مذہب کا استعمال نہ کریں۔ وہ اگر مذہب کا نام استعمال کر کے سیاسی طاقت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تو اس سے یہ بہتر ہوگا۔ کہ اپنی ریاست کے دستور میں تبدیلی کرائیں۔ اور ریاست کو مذہبی ریاست قرار دلوائیں۔ اور عوام کو بھی یہ سمجھ لینا چاہئے۔ کہ اگر وہ مذہب پر پورا عقیدہ رکھتے ہیں۔ تو مذہب کی عظمت کو برقرار رکھیں۔ اور کسی استحصال کرنے والے سیاسی لیڈر کے چکر میں نہ آئیں۔ یہ ایک بالکل سیدھا سادہ فارمولہ ہے۔ جو فرقہ واریت کو ختم کرسکتا ہے۔

غلط طریق کار

فرقہ واریت کے خلاف جو لوگ کام کرتے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ وہ مذہب کو برا کہتے ہیں لیکن غیر شعوری طور پر مذہب کی تخفیف ضرور کرتے ہیں۔ سیاسی فرقہ واریت کو ختم کرنے کا یہ موزوں طریقہ نہیں ہے تخفیف کرنے کے بجائے مذہب کی تعلیمات کو عام کرنا زیادہ مفید ثابت ہوگا۔

ہیں یہ اعلان کرنا چاہئے۔ کہ مذہب کا پیغام یہ ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے۔ ہندومت کا منشا یہ ہے۔ اور سکھ مت یہ چاہتا ہے۔ ہم اگر مذہب کی تخفیف کرتے ہے۔ اور لوگوں کو مذہب سے دور کرنے کی کوشش میں سرگرداں رہے۔ تو اس کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوگا۔ بلکہ اصل ہمارے ملک کے عوام بہرکیف مذہب کے دلدادہ ہیں۔ مذہب کی تخفیف سے ان کے دلوں میں فرقہ واریت کے خلاف کام کرنے والوں سے بد دلی پیدا ہوسکتی ہے ــــــ یہ ہیں۔ پھر وہ کسی صورت میں مذہب کے خلاف پروپیگنڈے کو برداشت نہیں کرسکتے۔

سرکار کا فرض

سرکار کا فرض یہ ہے۔ کہ معاشرہ کی بنیادی ضرورت کی طرف بھرپور توجہ دے۔ جو لوگ سرکار پر قبضہ کرنے کی خواہش اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ ان کی یہ کوشش ہوتی ہے۔ کہ وہ سماج میں پیدا ہونے والی برائیوں اور خامیوں کو نگاہ میں رکھیں۔ یہ لوگ پہلے ان کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اگر سرکار انھیں دور کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ تو وہ ان مسائل کو مختلف سیاسی نوعیت کی نعرہ بازیوں سے وابستہ کرلیتے ہیں۔ اور بالآخر عوام ایک جذباتی لگاؤ یا وابستگی پیدا کرکے جھگڑا کرا دیتے ہیں فساد کرانے کا یہی طریقہ ہے

آپ نے دیکھا کہ بمبئی میں کارپوریشن کے انتخابات سے پہلے ایک مسئلہ کھڑا ہوا۔ بندے ماترم کے متعلق ایک طبقے نے کہا کہ بندے ماترم میں چونکہ شرکیہ کلمات ہیں۔ اس لئے ان کے بچے اسے ادا نہیں کریں گے۔ سرکار نے اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں سوچا۔ دوسرے طبقہ نے پرچار کیا کہ دیکھو، یہ طبقہ کتنا فرقہ پرست ہے۔ قومی چیزوں کو اپنانے کے لئے تیار نہیں۔ نتیجہ میں کشیدگی ہوگئی۔ اس کے بعد ہی الیکشن ہوا۔ الیکشن میں انتہا پسند طاقتیں جو اس "بندے ماترم" کے ڈرامے کے پس منظر میں تھیں کامیاب ہوگئیں۔ یعنی مسلم لیگ اور شوسینا نے سیٹیں حاصل کرلیں۔ الیکشن کے بعد "بندے ماترم" کا معاملہ بھی رفع دفع ہوگیا۔ اور دونوں انتہا پسند پارٹیوں میں اتحاد ہوگیا۔

اسی طرح کی ایک مثال دہلی کارپوریشن کا الیکشن ہے۔ دہلی میں پارلیمنٹ کے چناؤ میں کانگریس نے بھرپور کامیابی حاصل کی ــــــ مگر کارپوریشن میں جن سنگھ نے کامیابی حاصل کرلی۔ مسلم لیگ نے بھی غیر معمولی ووٹ حاصل کیا۔ دنیا کو اس وقت بڑا تعجب ہوا۔ جب یہ دیکھا۔ کہ جن سنگھ اور مسلم لیگ کانگریس کے خلاف متحد ہیں۔ اور جناب ملہوترہ صاحب، محمد کویا اور ابراہیم سلیمان سیٹھ کے استقبال کے لئے پالم پر تشریف لے گئے ہیں۔ اس واقعہ میں دراصل جن سنگھ نے یہ طے کیا تھا۔ کہ کانگریس کے مقابلے میں اگر مسلم لیگ کو کچھ سیٹیں مل جائیں۔ تو انھیں کیا فرق پڑتا ہے۔ اس طرح سے ایک طبقہ بھی راضی ہوجائے گا۔ اور ایک بڑی حریف پارٹی کی طاقت کمزور ہوجائے گی۔ پنجاب کی تقسیم ہوئی۔ پنجابی صوبہ بن گیا۔ ایک طبقہ نے جوش میں ایک پارٹی کو جتایا۔ اس پارٹی کی گورنمنٹ بھی بن گئی۔ کچھ دن بعد دوسرے نے محسوس کیا۔ کہ وہ اقلیتی فرقہ بن گئے ہیں۔ اور ان کے ساتھ بھاری زیادتیاں ہو رہی ہیں۔ انھوں نے اتحاد و یگانگت کا ثبوت دے کر دوسری پارٹی کو ووٹ دیا۔ اب اس پارٹی کی حکومت قائم ہوگئی۔ چندی گڑھ کا مسئلہ خالص اقتصادی و سیاسی نوعیت کا معاملہ تھا۔ مگر اس میں طبقہ واریت پیدا کردی گئی۔ اس طرح کی اور بہت سی مثالیں ہیں۔ جو ہمارے بڑے ملک میں سامنے آتی رہی ہیں۔ کیوں کہ بھارت رنگارنگ اقسام کی زبانوں، دھرموں اور نسلوں کا ملک ہے۔ یہاں بے شمار تہذیبیں اور گروہ موجود ہیں۔ جن کے الگ الگ سیاسی اور سماجی اور اقتصادی مفادات ہیں ان کی وجہ سے آئے دن تماشے ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سب کیا ہے۔ محض سیاست کاری یا سیاسی فرقہ واریت ہے۔ مذہب کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ مندرجہ واقعات کے لئے سرکار کو ہرگز بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ فرض تو بہرحال سرکار کا ہے۔ کہ وہ یہ دیکھے کہ کس طبقہ کی کہاں کیا ضرورت ہے۔ اور سرکار دشمن طبقہ اس ضرورت یا خامی کو ہمارے خلاف کس طرح سے استعمال کرسکتا ہے۔

سرکار کی انتظامیہ مشینری میں جو لوگ کام کرتے ہیں۔ وہ ہمارے سماج ہی کی پیداوار ہیں۔ وہ کسی دوسرے ملک سے نہیں لائے گئے۔ ان کے سوچنے کا انداز بھی ہمارے عوام یا سماج سے ہرگز مختلف نہیں ہے۔ یہ لوگ مختلف فرقوں جماعتوں یا مذہب سے جذباتی وابستگی رکھتے ہیں۔ اصول کی بات یہ ہونی چاہئے کہ لادینی ریاست میں کام کرنے والے افسر کسی دھرم سے تعلق رکھنے والے نہیں ہونے چاہئیں۔ تبھی وہ لادینی جمہوریت کے صحیح تقاضوں کو پورا کر سکتے ہیں۔ جو لوگ مذہب سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ اور سیاسی فرقوں سے ان کی وابستگی ہے کسی طرح بھی غیر جانبدار نہیں ہو سکتے۔ فرقہ وارانہ فسادات کی جو رپورٹیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ ان میں اکثر یہی ہوتا ہے۔ کہ فلاں مقام پر واقعہ سرکاری افسران کی لاپرواہی سے ہوا۔ یا وہاں پر پولس تماشائی بنی رہی اور غنڈے لوٹ مار کرتے رہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

فرقہ وارانہ فسادات کے علاوہ بھی بہت سے مسائل ہیں۔ مثلاً زبانوں کی ترویج و ترقی، فنون کا ارتقا، ملازمتیں وغیرہ ان معاملات میں بھی نام نہاد مذہبی فرقہ واریت کا احساس ہوتا ہے، یا دلایا جاتا ہے۔ انتظامی مشینری میں یقیناً ایسے غیر ذمہ دار لوگ پائے جاتے ہیں۔ جو سرکار کی بنیادی سیکولر پالیسی کا لحاظ تو در کنار اس کی دھجیاں اڑاتے نظر آتے ہیں۔ ایسا وہ کہیں تو انتقامی جذبے کے ماتحت کرتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے ذہن میں دبے طور پر معاشرتی خرابیاں اور کمزوریاں موجود ہیں۔ اور کہیں ان کے ذاتی مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی افسر کا رشتہ دار یا سفارشی ملازمت کا طالب ہے۔ تو اس وقت وہ ہیر پھیر کر کے اپنے رشتہ دار کو ملازم رکھے گا۔ دوسرے امیدواروں کو نظر انداز کرے گا۔ چاہے وہ کسی مذہبی قومی یا گروہی طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں۔

اس لئے یہ ضروری ہوا کہ انتظامیہ میں کام کرنے والے لوگوں کی دماغی اصلاح کی جائے۔ سرکار کی لاپرواہی سے جہاں جہاں فرقہ وارانہ جھگڑے ہوتے ہیں۔ ان کی ذمہ داری دراصل فرقہ پرست افسران پر ہے۔ جو سرکار کی پالیسیوں پر یقین نہیں رکھتے۔ اور جب کوئی دنگا یا فساد ہو جاتا ہے۔ تو مذہبی فرقوں کو گالیاں دی جاتی ہیں حالانکہ افسران کو پہلے سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ فلاں جگہ کس قسم کی چنگاریاں سلگ رہی ہیں اور ان میں کس وقت شعلے نکلنے والے ہیں۔

نظام تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت

فرقہ پرستی کی جڑوں کو مضبوط کرنے کا ذمہ دار ہمارا نظام تعلیم بھی ہے۔ جو بدقسمتی سے ایسے ہاتھوں میں ہے۔ جو سیکولرازم کے منشا و مفہوم کو سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہیں ان کے ذہن پر دیو مالائی نظام کی چھاپ ہے۔ راشٹریتا کے نام پر یہ طبقہ نصاب کی کتابوں میں ایسی چیزیں شامل کرنے سے گریز نہیں کرتا جو ہماری بنیادی قومی پالیسیوں کے خلاف ہیں۔ ان کتابوں کی کوئی چھان بین نہیں کی جاتی۔ اور نہ یہ خیال رہتا ہے۔ کہ ان کتابوں کو مختلف مذاہب و قوموں سے تعلق رکھنے والے بچے پڑھیں گے۔ ان میں "اتفاقی نام" واقعات، تہوار، شخصیتیں بھی بالعموم مخصوص مذہب یا قوم سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہیں۔ ان تمام چیزوں کا نتیجہ نفسیاتی طور پر والدین کے ذہن پر غلط مرتب ہوتا ہے۔ ایک مذہب یا قوم سے متعلق چیزیں دیکھ کر ان کے جذبات بھڑک سکتے ہیں۔ اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کہ یہ نظام تعلیم کسی ایک مذہبی فرقہ کی جاگیر ہے۔ والدین چاہتے ہیں۔ کہ وہ اپنے بچوں کو ایسی چیزیں پڑھائیں۔ جو ان کی تہذیب، زبان، کلچر، مذہب پر آنچ نہ آنے دیں۔ وہ پرائیویٹ تعلیم کی طرف بھاگتے ہیں۔ جہاں ان کے بچوں میں علیحدگی پسندانہ رجحانات کو تقویت ملتی ہے۔ قریب قریب اسی قسم کا نظام تعلیم رائج ہے۔ جسے پسندیدہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ نہ تو سیکولر ہے، اور نہ مذہب پسند، افراط و تفریط کے نتیجہ میں سدھار کے بجائے خرابیاں بڑھتی جا رہی ہیں، اور ان لوگوں کو

جو سرکار کے مخالف ہیں یا اپنے ہتھکنڈوں کے ذریعے اقتدار پر تسلط جمانا چاہتے ہیں۔ سرکار کے اس نظام تعلیم کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے مواقع حاصل ہیں۔ ان کا پروگرام اقلیتی طبقات میں خوب مقبول ہے جس کے ذریعے سماج میں ایک ایسا ماحول بننے میں مدد ملتی ہے جس سے مختلف طبقات میں فرقہ وارانہ جذبات ابھریں۔ اور بالآخر فسادیاں دنگے ہوں۔ کتابوں میں تاریخی واقعات کے بیان کرنے میں بھی نہایت احتیاط سے کام لینا ضروری ہے۔ جو لوگ تاریخ مرتب کرتے ہیں۔ ان کے ذہن میں انتقامی جذبات مخفی ہیں۔ وہ نوصد سالہ مسلم دورِ حکومت کے متعلق کچھ باتیں کتابوں میں لکھ کر اپنے جذبات کو تسکین دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ طریقہ کسی بھی طرح مفید نہیں ہے۔ نئی نسلوں کے سامنے دھندلے ماضی کو دہرانے کا کوئی مفید اثر نہیں ہو سکتا۔ انھیں یہ بتانا چاہیئے۔ کہ ماضی میں ہم نے یہ غلطیاں کیں جن کے نتائج ہمیں بھگتنے پڑے کسی غیر ملکی حکمران کے خلاف بھی آج بھڑاس نکالنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ منطقی طور پر اگر آپ کسی پر حملہ کریں تو اس کا مقصد فریق مخالف کو کمزور کرنا یا حکومت کرنا ہی ہوگا۔ طاقت کے نشے میں آپ ظلم و جفا کاریاں بھی کر سکتے ہیں۔ مہارانا پرتاپ یا شیواجی کا ذکر کتابوں میں ضرور آنا چاہیئے۔ لیکن واقعات کی ترتیب میں اس بات کا لحاظ ضرور رکھنا چاہیئے۔ کہ ہماری قومی سیکولر پالیسی پر اس سے آنچ نہ آنے پائے۔ قومی کردار مجروح نہ ہو، اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم رہ سکے۔ تاریخ میں ایسے واقعات بھی عام ملتے ہیں۔ جن میں ہندی مسلمان بیرونی مسلم حملہ آوروں کے خلاف لڑے۔ اور ان کا مقصد اپنے ملک کی حفاظت کرنا تھا۔

ہمارے ملک میں یہ ذہنیت بھی عام ہے کہ ہندوستان صرف ایک طبقہ کا ملک ہے۔ ایک طبقہ کا ملک علیحدہ بن چکا ہے۔ یہ ذہنیت دراصل سیاسی فرقہ پرستوں نے ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کے دوران پیدا کی۔ ان کا مقصد اس وقت اپنے آپ کو ملک اور عوام کا ہمدرد و بہی خواہ ثابت کرنا تھا۔ یہ لوگ بالعموم انگریز کے حاشیہ بردار تھے۔ رجواڑوں نے اس ذہنیت کو پھیلانے میں خاص طور پر کام کیا۔ کیوں کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کے دوران اس پروپیگنڈا کو عام کرنا ان کی سستی شہرت کے حصول اور وفاداری کے لئے کافی تھا۔ اسی ذہنیت کے نتیجہ میں گاندھی جی کا قتل ہوا۔ ملکی تقسیم کو ہوئے سالوں گذر گئے ہیں مگر آج بھی کچھ لوگ اپنا وہی پرانا راگ الاپ رہے ہیں۔ انھوں نے تقسیم کی ذمہ داری ایسے لوگوں کے سر تھوپ دی۔ جو اس کے خلاف تھے۔ انھوں نے ان رہنماؤں کے خلاف بھی اوچھے ہتھیار استعمال کئے۔ جن کی زندگی کا مشن ہی تقسیم کی مخالفت تھا۔ اور ان رہنماؤں کو اپنا پیارا دکھایا۔ جنھوں نے تقسیم کو حقیقت کے طور پر تسلیم کیا اور ان کی اندرونی خواہش تھی، کہ تقسیم ہو۔

ہم بات نظام تعلیم میں اصلاح کی کر رہے تھے۔ بیچ میں ذہنیت والی بات اس لئے لائی گئی ہے۔ کہ نظام تعلیم جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ انہیں بھی اس ذہنیت کے لوگ موجود ہیں۔ یہ لوگ ہندوستانی نیشنلزم کے بجائے مخصوص نیشنل ازم کے داعی ہیں۔ اور اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ کہ وہ اپنے ملک و قوم کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔

نصاب کی کتابوں میں غیر سیکولر خیالات و جذبات کی اشاعت سے وقتی طور پر تسکین حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن ان خیالات سے جو ماحول پرورش پا رہا ہے اور نئی نسلوں میں جس طرح سے بیگانگی اور علیحدگی پسندانہ رجحانات پنپ رہے ہیں۔ وہ ملکی یک جہتی اور سالمیت کے لئے کسی طرح بھی مفید نہیں۔ ایک قوم کے بچے کو اگر دوسری ایسی قوم جو اس کے ملک میں رہتی ہے یا اس کے سماج یا معاشرہ کا حصہ ہے، اس قوم کے حالات، جذبات، خیالات، کلچر، زبان، عادات کی واقفیت نہیں۔ تو وہ کیا خاک آپس میں مل کر رہیں گی۔ بمبئی یا دہلی میں رہنے والا ایک طالب علم تو اپنے ماحول و سماج کو دیکھ کر اندازہ

کرلیتا ہے۔ کہ ہندوستان میں مختلف زبان مذہب اور کلچر رکھنے والے لوگ رہتے ہیں۔ لیکن کسی ایسے شہر میں رہنے والے بچے کو جہاں ایک ہی فرقہ کی آبادی ہو کیا معلوم، کہ ہندوستان کیا چیز ہے۔ اور وہاں کس قدر جذباتی ہم آہنگی یا قومی یک جہتی کی ضرورت ہے ——————— یہ ناواقف بچہ جب دہلی جا کر کسی برقعہ پوش خاتون کو دیکھے گا تو یہی کہے گا کہ یہ کیا اکھوتی سی ہے۔ اس کا ذکر وہ اپنے شہر یا گاؤں میں جا کر دوسرے لوگوں کے سامنے بھی کرے گا۔ کہ اس نے ایک عجیب جانور دہلی میں دیکھا ہے۔

جماعت سازوں کی تباہ کاریاں

ایک بہت غلط رواج ہمارے ملک میں یہ ہو گیا ہے۔ کہ کچھ لوگ مذہب کے پردے میں سیاست بازی کا کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ مذہب کے نام پر عوام کو اپنے گرد جمع کرتے ہیں۔ اور سیاسی مفادات حاصل کرتے ہیں۔ فرقہ پرستی پھیلانے میں ان لوگوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ ان کی جماعتوں کے جو دستور اور منشور ہیں۔ جو ہندوستان کی جنتا کو دھوکہ دیتے ہیں سرکار کا فرض ہے۔ کہ وہ اس طرح کی جماعت چلانے والوں کے کردار پر کڑی نگرانی رکھے۔ کسی مذہبی جماعت کو الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت دینا سیکولرازم کے منافی ہے۔ خود مذہب کا نام لینے والوں کو بھی مذہبی جماعتیں سیاسی مقاصد کے لئے استعمال نہیں کرنی چاہئیں۔

یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ کہ بعض سیاسی جماعتیں بھی مذہبی نعرہ لگاتی ہیں۔ اس طرح کی جماعت مذہبی جماعتوں سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ ان کا مقصد محض سیاسی سودا بازی ہے۔

یہ ہے ہندوستان میں فرقہ واریت کا پس منظر اس مسئلے کا زیادہ بہتر حل تو ہماری سرکار ہی کر سکتی ہے۔ جس کے ہاتھ پیر بھی لمبے ہیں۔ اور خرابیوں یا کمزوریوں کو دور کرنے کے ذرائع بھی موجود ہیں۔ مذہب کی تخفیف، یا مذہب دشمنی، فرقہ پرستی کے مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ اصل حل کے لئے ہمیں ان عوامل کا پتہ لگانا ہوگا۔ جو سماج میں فرقہ واریت کو جنم دیتے ہیں۔ جب تک عوام یا سرکار ان عوامل کی بیخ کنی نہیں کرتے۔ فرقہ واریت ختم نہیں ہو سکتی۔ ہمارا سماج جلتا رہے گا۔ قومی ترقی کے کاموں میں رکاوٹیں آتی رہیں گی۔ اور بین الاقوامی طور پر بھی ہماری پوزیشن مضبوط نہ ہو سکے گی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

اسلام

مکمل دین مستقل تہذیب

دو نظام اور دو تہذیبیں

ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہنمائی اور تعلیم کے لئے، اور اپنی ذات کی معرفت عطا کرنے اور اس کا صحیح تعارف کرانے کے لئے، جو عقل و قیاس سے ماوراء ہے، اور جس کی کوئی مثال اور نظیر اس دنیا میں موجود نہیں ہے، انبیاء علیہم السلام کے گروہ کو منتخب فرمایا۔ اپنے کلام اور پیغام کے ذریعہ پہلے ان کو، پھر ان کے ذریعہ اپنی مخلوق کو اپنی ذات و صفات کا صحیح اور مستند علم عطا فرمایا، اور اپنے منشاء اور احکام، اور زندگی گذارنے کے پسندیدہ طریقہ سے آشنا کیا، اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے :۔

اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم کو غیب پر مطلع کر دے، غیب کی باتیں بتانے کے لئے تو وہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے ۔

اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، اس کی بندگی کے صحیح قاعدے، اور زندگی گذارنے کے پسندیدہ طریقے کو معلوم کرنے کا ان پیغمبروں کی اطلاعات اور تعلیمات کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں، یہ عقل و فراست، قیاس آرائی، و طبع آزمائی، خواہشات اور قومی رسم و رواج کا میدان نہیں، اس کے لئے اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں کہ اس دنیا کا پیدا کرنے والا خود اس کی خبر دے، اور وہ اس کی خبر پیغمبروں ہی کے ذریعہ دیتا ہے، اس لئے اس علم و ہدایت کا ذریعہ صرف انبیاء علیہم السلام ہی ہیں، قیامت تک کے انسانوں کی ہدایت، طریقۂ زندگی کی صحت، اعمال کی قبولیت، اور انسانوں کی مقبولیت، اسی گروہ انبیاء کے ساتھ وابستہ کر دی گئی ہے، انھیں کے تعلیم کئے ہوئے عقائد، انھیں کی عطا کی ہوئی معرفت الٰہی، انھیں کے لائے ہوئے حقائق اور علوم، اور انھیں کا طریقۂ زندگی انھیں کی معاشرت اور اخلاق، اللہ تعالیٰ کو محبوب اور مقبول ہیں، اور سارے انسانوں کو ان کی اقتدا اور تقلید کرنے، اور ان کو اپنے لئے نمونہ اور امام بنانے کی ہدایت اور تاکید ہے، قرآن مجید میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ اپنے ان محبوب بندوں اور عالی مرتبہ پیغمبروں میں سے ایک بڑے گروہ کا نام بنام ذکر کرتا، اور ان پر اپنے انعامات گناتا ہے

یہ تھی ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم کے مقابلہ میں عطا کی، ہم جسے چاہتے ہیں بلند مرتبے عطا کرتے ہیں، حق یہ ہے کہ تمہارا رب نہایت دانا اور علیم ہے پھر ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ جیسی اولاد دی، اور ہر ایک کو راہ راست دکھائی ...

(وہی راہ راست جو) اس سے پہلے نوحؑ کو دکھائی تھی، اور اسی کی نسل سے ہم نے داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ کو (ہدایت بخشی) اس طرح ہم نیکو کاروں کو ان کی نیکی کا بدلہ دیتے ہیں، (اسی کی اولاد سے) زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور الیاسؑ کو (راہ یاب کیا) ہر ایک ان میں سے صالح تھا، (اسی کے خاندان سے) اسماعیلؑ، الیسعؑ، اور یونسؑ اور لوطؑ کو (راستہ دکھایا) ان میں سے ہر ایک کو ہم نے تمام دنیا والوں پر فضیلت عطا کی، نیز ان کے آباء و اجداد، اور ان کی اولاد، اور ان کے بھائی بندوں میں سے بہتوں کو ہم نے نوازا، انھیں اپنی خدمت کے لئے چن لیا، اور سیدھے راستہ کی طرف ان کی رہنمائی کی، یہ اللہ کی ہدایت ہے، جس کے ساتھ وہ اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتا ہے، رہنمائی کرتا ہے لیکن اگر کہیں ان لوگوں نے شرک کیا ہوتا، تو ان کا سب کیا کرایا غارت ہو جاتا وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی تھی، اب اگر یہ لوگ اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں، تو (پروا نہیں) ہم نے کچھ اور لوگوں کو یہ نعمت سونپ دی ہے، جو اس سے منکر نہیں ہیں :۔

اس شیریں اور دل آویز تذکرہ کے بعد جس کے لفظ لفظ سے محبت اور حلاوت ٹپکتی ہے، اپنے رسول کو مخاطب بناتے ہوئے دنیا کے ہر انسان کو خطاب کیا ہے :۔

اے محمدؐ وہی لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے، انھیں کے راستہ پر تم چلو، اور کہہ دو کہ میں (اس تبلیغ و ہدایت کے) کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، یہ تو ایک عام نصیحت ہے، تمام دنیا والوں کے لئے ۔

یہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کا وہ محبوب گروہ ہے، جس کی ہر بات اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے، عقائد و الٰہیات سے لے کر عادات و مرغوبات، اخلاق و معاشرت، اور تہذیب و وضع تک ان کی ہر چیز محبوب ہے، انھیں کے عقائد و اخلاق، اور تہذیب و معاشرت کے مجموعہ کو "اسلام" اور اس نظام زندگی اور تہذیب کو جو اس کے متوازی اور مقابل ہے "جاہلیت" سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔

دور ابراہیمی

پھر اس گروہ انبیاء میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنی محبوبیت اور نسل انسانی کی امامت سے سرفراز فرمایا، اور ان ہی کی اولاد میں سلسلۂ انبیاء کو

جاری کیا:۔

اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو اپنا خالص دوست بنالیا۔ (النساء۔۱۲۵)
(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا کہ میں تم کو لوگوں کا پیشوا بناؤں گا۔ (البقرہ۔۱۲۴)

ایک جگہ ان کی خصوصیات، ان کی انفرادیت، اور ان کے موحدین کے امام ہونے کا ذکر کرتے ہوئے ان کے طریقہ کی پیروی کی خاص طور پر تائید کی گئی ہے، فرمایا:۔

بے شک ابراہیمؑ ہی تھے، راہ ڈالنے والے حکم بردار اللہ کے، یکسو، اور مشرکوں میں سے نہ تھے، حق ماننے والے اس کے احسانوں کے اللہ نے ان کو منتخب کرلیا، اور چلایا سیدھی راہ پر، اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی خوبی دی تھی، اور وہ آخرت میں بھی اچھے لوگوں میں ہوں گے، پھر ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی کہ دین ابراہیمؑ کی پیروی کرو، جو بالکل یکسو تھے، اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔

ابراہیم علیہ السلام کی بعثت کے بعد سے انھیں کا دور امامت اور پیشوائی ہے، اور دور ابراہیمی قیامت تک قائم رہے گا، اسی دور ابراہیمی کے آخری پیغمبر محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اس دور کی آخری دینی امت "مسلمان ہیں، مسلمانوں کو خطاب کرکے صاف کہا گیا ہے:۔

اس نے تم کو پسند کیا، اور نہیں رکھی تم پر دین میں کچھ مشکل، دین ہے تمہارے باپ ابراہیم کا، انھوں نے تمہارا نام رکھا "مسلمان"، (حکم بردار)
(الحج۔۷۸)

اس امامت اور دعوت کی خصوصیت توحید خالص، اور شرک، اصنام پرستی، مظاہر پرستی، اور ہر مشرکانہ عقیدہ اور تخیل سے نفرت اور بیزاری ہے، قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کے وہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں، جو انھوں نے اپنے زمانہ کے مشرکین سے کہے۔

ہم تم سے اور جن کو تم اللہ کے سوا معبود سمجھتے ہو ان سے بیزار ہیں، ہم تمہارے منکر ہیں، اور ہم میں تم میں ہمیشہ کے لئے عداوت اور بغض ظاہر ہوگیا، جب تک تم ایک اللہ پر ایمان نہ لاؤ۔ (الممتحنہ۔۴)

اپنے اور اپنی اولاد کے متعلق ان کی تمنا اور دعا ان الفاظ میں منقول ہے:۔

مجھے اور میری اولاد کو اس سے دور ہی رکھ کہ ہم کبھی بت پرستی میں ملوث ہوجائیں:۔

نبوت محمدیؐ

دور ابراہیمی کے سب سے بڑے اور آخری پیغمبر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ ہی کی نسل میں عرب کی سرزمین اور مکہ کے اس شہر میں مبعوث فرمایا جہاں ان کے جد امجد حضرت ابراہیم نے خدا کا گھر (خانۂ کعبہ) اس لئے تعمیر کیا تھا، کہ وہ قیامت تک کے لئے توحید، اور ہدایت کا عالمی مرکز بنے، حضرت ابراہیمؑ نے جس سلسلہ کی ابتدا کی تھی، محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کی تکمیل فرمائی، اور اس کو آخری طور پر واضح، معین اور مکمل فرمادیا، اور اس دین و تہذیب کو دنیا کے گوشہ گوشہ تک پہونچادیا، آپ پر نبوت کے سلسلہ کا اختتام اور آپ کے ذریعہ انعام الٰہی کی تکمیل ہوگئی، اور اب دنیا میں ہدایت اور راہ یابی، اور آخرت میں نجات و کامیابی کا انحصار آپ ہی کی پیروی پر ہے، آپ کی وفات سے تقریباً تین مہینے پیشتر عرفہ کے دن عرفات کے میدان میں قرآن شریف کی یہ آیت نازل ہوئی:۔

آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کمل کردیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کردی، اور اسلام کو تمہارے لئے بحیثیت دین کے پسند کرچکا۔
(المائدہ۔۳)

اب آپ کے لائے ہوئے دین اور عقیدہ کو قبول کرنے، آپ کے طرز زندگی اور آپ کی پسند کی ہوئی تہذیب و معاشرت، اور آپ کے اخلاقِ حمیدہ کو اختیار کرنے سے صرف محبت الٰہی ہی نہیں بلکہ محبوبیت خداوندی کا وہ مقام حاصل ہوسکتا ہے، جس سے اونچا کوئی مقام نہیں، فرمایا گیا:۔

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے کہہ دیجئے اگر تم کو اللہ کے ساتھ محبت ہے تو میری چال چلو اللہ تم کو محبوب بنالے گا اور تم کو بخشا بخشایا بنادے گا۔ (آل عمران ۳۱)

اسلامی شریعت اور ابراہیمی تہذیب

اب دنیا میں جہاں تک ہدایت اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور قبولیت کا تعلق ہے سیدنا ابراہیم و محمد علیہما السلام کا ہی دور امامت ہے، عقائد بھی انھیں کے تلقین کئے ہوئے معتبر ہیں، ذات باری تعالیٰ اور اس کی صفات اور اس کی وحدانیت کا جو تصور اور عقیدہ انھوں نے تعلیم کیا ہے، وہی معیاری تصور اور صحیح عقیدہ ہے، اخلاق اور معاشرت اور تہذیب و تمدن کے جن طریقوں اور شعائر کو انھوں نے اختیار کیا وہی خدا کے نزدیک صحیح اخلاق و تہذیب، اور پسندیدہ اور مقبول معاشرت ہے، انھیں کی پسند کو اور میلان کو خدا نے پسند کیا، اور دوسروں کی پسندیدگی اور میلان پر ترجیح دی، اور اس پر اپنی تصدیق اور پسندیدگی کی مہر لگادی، جس چیز کی انھوں نے پابندی کی، اور جس کی طرف ان کی فطرت سلیم ہمیشہ کے لئے مائل ہوگئی، اسی کو خدا نے آخری دین کا شعار اور ہدایت یافتہ انسانوں کی تہذیب قرار دیا، اسی کو کبھی حدیث کی زبان میں "خصال فطرت" سے اور شریعت کی اصطلاح میں "سنت" سے تعبیر کیا جاتا ہے، انسان کے دونوں ہاتھ اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں لیکن داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر کیوں فضیلت ہے، اور اچھے کاموں میں اس کے استعمال کرنے کی کیوں ہدایت ہے؟ اس لئے کہ یہ انبیاء علیہم السلام کی عادت ہے اور ابراہیمی اور محمدی تہذیب کا شعار ہے، اسلامی معاشرت اور تہذیب میں جن چیزوں کو مسنون و مستحب، اور اسلامی شعائر قرار دیا گیا ہے، غور کرنے کے بعد ان سب کی حقیقت یہی نکلے گی کہ یہ انبیاء علیہم السلام کا شعار، اور ابراہیمی تہذیب کی علامت ہے۔

یہ تو میں نے سمجھانے کے لئے ایک چھوٹی سی مثال دی، ابراہیمی تہذیب اپنی

ایک جداگانہ شخصیت، اور اپنی ایک مستقل ہستی رکھتی ہے، اس کا مزاج، اس کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے پیمانے اور اس کے خط و خال دوسری تہذیبوں سے الگ اور جانے پہچانے ہیں، اس پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں، یہاں اس کی دو نمایاں خصوصیتوں کا ذکر کرتا ہوں جو ہر جگہ دیکھی جا سکتی، اور آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہیں ؛

صاف ستھرا رہنا، نہانا دھونا، اجلے اور صاف کپڑے پہننا، دنیا کی تمام تہذیبوں اور شائستہ اور سلیم الطبع انسانوں میں پایا جاتا ہے، اسلامی ابراہیمی تہذیب میں بھی اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس کو ایک مفرد لفظ "نظافت" سے ادا کیا جا سکتا ہے لیکن ایک چیز نظافت ہے، اور ایک چیز "طہارت" ہے، دونوں میں فرق ہے، اور جہاں تک مجھے معلوم ہے طہارت کا تخیل، ابراہیمی تہذیب کی خصوصیت ہے، اور وہ اس بارے میں جتنی ذکی الحس (SENSETIVE) واقع ہوئی ہے، اور اس کا معیار اس کے بارے میں جتنا بلند ہے، میرے علم میں کسی اور تہذیب اور نظام زندگی میں اس کی مثال نہیں ملتی، بدن اور کپڑے کی پاکی، استنجا پاک کرنا، کپڑے یا بدن پر پیشاب کی ایک چھینٹ پڑ جائے یا کوئی گندی چیز لگ جائے، تو اس کو پاک کئے بغیر نہ مسلمان نماز پڑھ سکتا ہے، اور نہ اس کو اطمینان حاصل ہو سکتا ہے، چاہے اس کے کپڑے دودھ کی طرح سفید اور اس کا بدن آئینہ کی طرح صاف شفاف ہو، یہی حکم پانی، کھانے، برتن، فرش، زمین اور ان سب چیزوں کا ہے، جو مسلمان کے استعمال میں آتی ہیں، "نجاست" اور "طہارت" کا یہ فرق اور تخیل، ابراہیمی و محمدی تہذیب کا شعار اور اس کی خصوصیت ہے۔

جانوروں کے گوشت کے استعمال کے بارے میں بھی اس کی شریعت اور قانون دوسرے قوانین اور رواجوں سے مختلف ہے، یہاں بھی نجاست اور طہارت، مردار و جائز، اور حرام و حلال کی تفریق ہے، کئی جانور اس کی شریعت میں، حرام اور دائمی طور پر ناقابل استعمال ہیں، عام طور پر یہ وہی ہیں، جن کو انسان کی فطرت صحیح اور ذوق سلیم ناپسند کرتا ہے اور جو حلال و جائز ہیں، ان کو بھی ذبح کرنے، اور ذبح کرتے وقت اللہ کے نام کے لینے کی شرط ہے، ورنہ وہ بھی مردار کے حکم میں ہوں گے، "طیبات" و "خبائث" اور حلال اور میتہ (مردار) کی یہ تفریق بھی اس تہذیب کے خصائص میں سے ہے۔

لازوال امامت اور عالمگیر دعوت

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے لئے لازوال امامت، لافانی دعوت، اور بقائے دوام کا فیصلہ فرمایا ہے، ان کی نسل میں اس نے نبوت، ولایت اور دینی رہنمائی کا منصب رفیع ہمیشہ کے لئے رکھ دیا ہے، ان کے پورے خاندان پر بلکہ ان کے ہر میدان پر حق کے لئے جہاد، باطل کا مقابلہ، خدا کی طرف دعوت، اور ہر طرح کی تند و تیز ہوائیں، اور متلاطم موجوں میں سفینۂ انسانیت کو پار لگانے کی ذمہ داری ہے، ان کا فرض ہے کہ حق کے اس چراغ کو کسی حال میں بھی بجھنے نہ دیں، یہ وہ بنیادی اور تعمیری محرک (FACTOR) ہے، جو انسانیت کی فلاح، تخریب سے اس کی حفاظت، اور جہنم سے نجات کے لئے کارفرما ہے، اس لئے آج ہماری دعوت اور صدا وہی ہونی چاہئے، جو اپنے عہد میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لگائی تھی، اور جس کو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لئے سند قبول دی ہے :۔

اور یہی بات (ابراہیمؑ) اپنے پیچھے اپنی اولاد میں چھوڑ گئے تاکہ وہ رجوع رہیں۔ (الزخرف۔ ۲۸)

یہ ابراہیمی، محمدی دعوت، بت پرستی اور شرک کی ضد اور اس کی ہر قسم اور ہر رنگ سے ناآشنا ہے، وہ اس کے کسی شعبہ اور گوشہ، یا شکل اور صورت کی روادار نہیں، افراد و اقوام کو سب سے بڑی وصیت اور نصیحت یہی ہے :۔

پس بچتے رہو بتوں کی گندگی سے اور بچتے رہو جھوٹی بات سے صرف ایک خدا کے ہو کر اور اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرا کر۔

(الحج ۳۰۔ ۳۱)

یہ دعوت، ہوس پرستی، دنیا کے حقیر و فانی ٹکڑوں کی طمع، مادیت سے عشق اور کرسی اور عہدہ کی کشمکش سے بالکل ناآشنا ہے، اس کا اصول اور عقیدہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے۔

یہ عالم آخرت ہم انھیں لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں، جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا، اور نیک نتیجہ متقی لوگوں کو ملتا ہے۔

(القصص۔ ۸۳)

یہ وہ دعوت ہے، جو انسان اور انسان میں، اور وطن اور وطن میں کوئی فرق روا نہیں رکھتی، اور رنگ و نسل، اور زبان کے معاملہ میں کوئی جانبداری نہیں برتتی، اور نہ کسی جارحیت (AGGRESSION) کی روادار ہے، اس کے نزدیک رنگ، نسل، زبان اور کلچر کی بنا پر کسی انسان کا کسی انسان سے نفرت کرنا، اس کی جان یا عزت کے درپے ہونا، اس کے لئے ظلم و سفاکی کو روا رکھنا، بت پرستی ہی کی ایک قسم جاہلیت کا نشان اور شعار اور دورِ وحشت و بربریت کی یادگار ہے۔

جب کافروں نے اپنے دلوں میں ضد کی اور ضد بھی جاہلیت کی۔

(الفتح ۲۶)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

میرے بعد بالکل کافر ہی نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن بے تکلف مارنے لگو۔

اس کے نزدیک سارے انسان آدم کی اولاد ہیں، اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے، کسی عربی کو عجمی پر، اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فوقیت نہیں، مگر صرف تقویٰ کی بنیاد پر :۔

لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تمہاری قوم، اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو اور خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے، جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

(الحجرات۔ ۱۳)

خاتم الانبیا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، کہ جس نے کسی عصبیت کی دعوت دی وہ ہم میں سے نہیں، جو عصبیت کے لئے لڑا وہ ہم میں سے نہیں، جو عصبیت پر مرا وہ ہم میں سے نہیں۔" آپ نے ایک موقعہ پر جب بعض لوگ انصار اور مہاجرین کے نام پر

نعرہ لگانے لگے تھے، یہ فرمایا کہ "اسے چھوڑ دو یہ بڑی گندی بات ہے۔"

اس دعوت کی اساس عقیدہ میں توحید پر، اجتماعی زندگی میں انسانیت کے احترام اور مساوات پر، اخلاقیات کے شعبہ میں تقویٰ، حیاء اور تواضع پر، میدان عمل میں آخرت کے لئے جدوجہد، اور جہاد و قربانی پر، میدان جنگ میں شجاعت کے ساتھ رحم دلی اور شفقت پر، اور انتظام حکومت کے دائرہ میں ہدایت کے پہلو کو مالیات و آمدنی پر ترجیح دینے اور خدمت لینے کے بجائے خدمت کرنے، اور نفع اٹھانے کے بجائے نفع پہونچانے پر ہے۔

یہ انسانیت کی سنجیدہ اور مخلصانہ خدمت، اور جاہلیت کے حملوں، اور گمراہ کن وتخریبی تحریکوں سے اس کی حفاظت میں پوری تاریخ میں ممتاز ہے، اور ساری دنیا میں اس کے حسین وجمیل آثار ونقوش قائم ودائم، اور ہر جگہ اس کی خیر و برکت عام ہے۔

کثرت میں وحدت

مٹی کی نسبت کے اعتبار سے جس کی ایک اصل اور حقیقت ہے جس کی ہمارے دل میں قدر اور محبت ہے، اور اسلام بھی اس سے انکار نہیں کرتا، اور اس کو ختم کرنے کا حکم نہیں دیتا، مٹی کی ان نسبتوں کے اعتبار سے جن کی اصل "منھا خلقناکم الخ" ہے، ہم بر ی ہیں، ہم ہندوستانی ہیں، ہم ترک ہیں، اور اسی اعتبار سے ہم سید ہیں، مغل ہیں، پٹھان ہیں لیکن ایمانی اور اخلاقی حیثیت سے، دماغی اور ذہنی حیثیت سے ہم ابراہیمی ہیں، ہم محمدی ہیں، اور ہم مسلم ہیں۔

ہم کو اپنی ابراہیمی ومحمدی صفت کا صاف صاف اظہار کرنا چاہئے، اس کا ثبوت دینا چاہئے کہ ہم ذہنی، ایمانی اور روحانی اعتبار سے، اور ان نسبتوں کی حیثیت سے جو زیادہ قیمتی ہیں، صرف ابراہیمی ہیں، صرف محمدی ہیں، صرف مسلمان ہیں، چاہے ہم ہندوستان میں رہتے ہوں، چاہے افغانستان میں، چاہے انڈونیشیا میں چاہے مشرق اقصیٰ کے رہنے والے ہوں، چاہے مغرب اقصیٰ (مراکش) کے ہم ابراہیمی محمدی ہیں، تمام دنیا سے نرالے اور انوکھے، ایک نئے قسم کے کنبہ کے اہم افراد ہیں، اپنی قومی اور لسانی حیثیت سے ہماری زبانیں کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہوں، ہم سب ایک ہیں، مراکش کے مسلمان، ملایا کے مسلمان، برما کے مسلمان، ہندوستان کے مسلمان، الجزائر کے مسلمان، سب کی ایک تہذیب ہے۔

ہوسکتا ہے کہ ہمارے لباس کے مختلف طریقے ہوں، مثلاً ہندوستان میں شیروانی پہنی جاتی ہے، لیکن دوسرے ملکوں کے مسلمان ہرگز اس کے پابند نہیں کہ یہ لباس پہنیں اسلام نے لباس کی تراش خراش، اور لباس کی کاٹ ایک طرح کی نہیں دی انبیاء علیہم السلام نے بھی یہ حکم نہیں دیا کہ ایک ہی طرح کے لباس پہنو، ہم دیکھتے ہیں کہ اگر دنیا بھر کے مسلمانوں کو کسی جگہ جمع کر کے دیکھا جائے تو ان کا لباس مختلف قسم کا ہوگا، یہ اختلاف تہذیب کا اختلاف نہیں کہلائے گا، اسلام سب کی اجازت دیتا ہے، بشرطیکہ ان حدود سے تجاوز نہ کیا جائے، جن کی تعیین انبیاء علیہم السلام نے کی ہے۔

ابراہیمی ومحمدی تہذیب کی حقیقت

ابراہیمی ومحمدی تہذیب دراصل انہیں حدود کا نام ہے، اور اسی وجہ سے وہ دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک مشترک ہوسکتی ہے، ان حدود کے اندر آزادی ہے، زندگی گذارنے کے لئے وسیع میدان ہے، ایک سلیم الفطرت انسان نہایت آسانی سے اس میں زندگی گذار سکتا ہے، لیکن حدود کا پابند رہنا پڑے گا، مرد ریشم نہ پہنیں، بے پردگی اور اسراف نہ ہو، پاجامہ یا لنگی ٹخنوں سے نیچے نہ ہو، گھٹنوں سے اوپر نہ ہو، بے حیائی نہ ہو، فضول خرچی نہ ہو، چنانچہ اس وسعت کی بناء پر ہماری وضع قطع کے سارے قدرتی اختلافات ابراہیمی ومحمدی تہذیب کی وحدت میں سما جاتے ہیں۔

حدود کے اشتراک کے اعتبار سے اگر ہم تہذیبی یکانگت دیکھنا چاہیں، تو اس کی ایک بہت واضح مثال ہے کہ برما، ملایا، انڈونیشیا کے مسلمان داہنے ہاتھ سے کھاتے ہیں، ہندوستان کے مسلمان بھی داہنے ہاتھ سے کھاتے ہیں، اور ساری دنیا کا مسلمان ہر اچھا کام داہنے ہاتھ سے کرتا ہے۔ بائیں ہاتھ سے صرف وہی کام کرتا ہے جن کا تعلق ضرورت یا فطرت کرتی ہے، یہ چیز ان حدود میں سے ہے جن کی تعیین انبیاء نے کی ہے ابراہیمی ومحمدی تہذیب میں ہر چیز کے کچھ حدود ہیں، ازدواجی زندگی کے کچھ ضوابط ہیں معاشرت کے بارے میں کچھ ہدایات ہیں، اس کے بعد ہمارا جو جی چاہے، غذائیں کھائیں ہم کو اختیار ہے، جس طرح پکائیں کھائیں، کوئی مخالفت نہیں کرے گا، اللہ تعالیٰ نے صاف ممانعت فرمادی ہے کہ کوئی کسی کے لباس پر مذاق نہ اڑائے، کسی کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کے طریقہ کا مذاق نہ اڑائے، کوئی کسی کی زبان کا مذاق نہ اڑائے۔

> کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے، ممکن ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں عورتوں سے (تمسخر کریں) ممکن ہے کہ وہ ان سے اچھی ہوں اور اپنے (مومن بھائی) کو عیب نہ لگاؤ، اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔ (الحجرات - ۱۱)

حب الوطنی اور ابراہیمی ومحمدی تہذیب میں کوئی تضاد نہیں

ہم کو ملک کی تعمیر اور ترقی میں حصہ لینا چاہئے، اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تعمیری صلاحیت کا ثبوت دینا چاہئے، ہم کو اپنی قابلیت، دیانتداری، انتظامی لیاقت، صداقت، استقامت، اور سیرت کی بلندی اور پختگی کا ثبوت دینا چاہئے، ہم اس طرح ملک کی خدمت کریں کہ ہماری افادیت محسوس ہو، اور ہمارے وجود کو اس ملک کے لئے ضروری، اور خیر و برکت کا موجب سمجھا جائے، اور اس طرح دوسرے عناصر سے آگے بڑھ جائیں۔

ہم کو اپنے ملک کی زبانوں کی طرف بھی پوری توجہ دینی چاہئے، ہم نہ صرف یہاں کی زبانیں پڑھیں، بلکہ ان میں ادبیت اور شاعری کے جوہر دکھائیں، یہاں تک کہ ہماری زبان سند اور معیار تسلیم کی جائے، ہم ان میں صاحب طرز، اور صاحب اسلوب . . . (تالیاں) مانے جائیں۔

ہم زبانیں جو چاہیں اختیار کریں، اور ان میں داد فصاحت وبلاغت دیں، مگر ابراہیمی تہذیب ہم پر یہ پابندی عائد کرتی ہے کہ جھوٹ نہ بولیں، ہمارا رسم الخط دائیں

طرف سے شروع ہو یا بائیں طرف سے، بائیں طرف سے لکھنے پر اسلام کی شریعت میں کوئی اعتراض نہیں، لیکن یہ پابندی ضروری ہے کہ ہم کسی طرف سے لکھیں، لیکن ہماری تحریر صداقت اور نیک نیتی پر مبنی ہو اس میں جھوٹ، فریب، اور ظلم و نا انصافی نہ ہو، بے حیائی اور فسق و فجور کی بات نہ ہو، جھوٹ، فریب، گناہ اور معصیت کی بات، اور ہر وہ چیز جس سے انسان پر ظلم ہوتا ہو، انسانیت ذلیل ہوتی ہو، دنیا میں بدامنی پھیلتی ہو، عربی یا فارسی رسم الخط میں لکھی جائے گی، وہ غلط ہو گی، خدا کی نافرمانی ہو گی، اس کے برخلاف حق و انصاف کی بات انگریزی یا دیوناگری میں لکھی جائے گی، جو بائیں طرف سے شروع ہوتی ہے، وہ پسندیدہ ہو گی، ثواب کی اور خدا کی خوشنودی کی بات ہو گی۔

عربی کے بعد تمام زبانیں برابر

عربی بے شک اسلام کی شریعت کی سرکاری زبان ہے، اس میں قرآن مجید نازل ہوا ہے، اسی میں نماز پڑھی جاتی ہے، اس کے بعد سب زبانیں برابر ہیں۔

یہ دوسری بات ہے کہ دائیں طرف سے شروع ہونے والی زبانوں میں اسلام کی تعلیمات کا ایک بڑا وسیع ذخیرہ ہے، اس لئے کہ دائیں طرف سے لکھنے والے سامی یا آریائی زبانوں میں ایسی نسلیں پیدا ہوئیں جن کو تاریخ میں اس کا طویل موقع ملا کہ وہ اسلام کی خدمت کر سکیں، انھوں نے اس زبان کے ذریعہ اسلام کو سمجھایا، اسلام کی تعلیمات کو منتقل کیا، اس لئے ہماری نگاہ میں ان زبانوں کی کسی حد تک اہمیت ہے، اسی بنا پر ہم ہندوستان کے اندر اردو کی حفاظت کرنا اور اپنی آئندہ نسلوں سے اس سے آشنا رکھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ لیکن اس سے زبانوں کے مرتبہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اور اس سے کسی زبان کی پابندی نہیں عائد ہوتی، البتہ اسلامی تہذیب یہ پابندی عائد کرتی ہے کہ ہم چاہے دائیں سے لکھیں یا بائیں سے اس میں کوئی جھوٹی دستاویز نہ ہو، اس میں کوئی افترا پردازی نہ ہو، دروغ نہ ہو، اور بد دیانتی نہ ہو، یہ ہے ابراہیمی و محمدی تہذیب کا خصوصی کردار، اور اس کا اصل پیغام، اور یہ ہے اس تہذیب کا حاصلہ آپ کی زندگی کی تشکیل میں۔

ہندوستانی مسلمان ہندوستان میں ابراہیمی و محمدی تہذیب کے حامل اور امین ہیں

ہندوستان کے اس ملک میں جہاں سیکڑوں تہذیبیں، مذاہب اور فلسفے پھلے پھولے اور اب بھی موجود ہیں، مسلمان ابراہیمی و محمدی تہذیب کے نمائندہ اور علم بردار ہیں، ان کے یہاں رہنے کا مقصد اسی دین و تہذیب کی بقاء اور حفاظت ہونی چاہئے، اور اسی میں اس ملت کی حفاظت، اور نصرت کا راز پوشیدہ ہے۔

ہندوستان میں جس کے غالب مذہب اور تہذیب نے بیسیوں مذاہب اور تہذیب کو اپنے مذہب اور تہذیب میں تحلیل کر دیا، اور ان کی انفرادیت اور امتیازات کو مٹا دیا، اسلام کے اپنی امتیازی شکل، اور اپنی جداگانہ تہذیب کے ساتھ اتنی طویل مدت تک باقی رہنے کا راز یہی ہے کہ اس نے تہذیب و خصائل ابراہیمی سے اپنا رشتہ قائم رکھا، اور اپنے مخصوص عقیدہ توحید و رسالت سے انحراف گوارا نہیں کیا، اب بھی اس کی حفاظت اسی طرح ممکن ہے کہ وہ اپنے مرکز سے اپنا رشتہ قائم رکھے، اور اپنے سرحدی خطا (LINE OF DEMARCATION) کو مٹنے نہ دے۔

ملت ابراہیمی کسی کا اجارہ نہیں

مصر، عرب، مکہ کے قریشی، یمن کے زیدی، مراکش کے حسینی، جاوا اور سماترا کے حضرمی کا جتنا، ملت ابراہیمی، اور شریعت محمدی پر حق ہے، اتنا ہی حق ہندوستان کے مسلمان، پاکستان کے مسلمان، ملایا کے مسلمان، اور افغانستان کے پٹھان کا بھی ہے، یہ حق کوئی نہیں چھین سکتا،

ایک ہاشمی قریشی کے مقابلہ میں جس نے اپنی بدقسمتی سے حضرت ابراہیم اور حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے اپنا رشتہ کاٹ دیا ہو، وہ برہمن زادہ ہزار درجہ افضل ہے۔ جس نے اپنا روحانی، ایمانی، اخلاقی، عقلی اور تہذیبی رشتہ سیدنا ابراہیم اور سیدنا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے قائم کر لیا۔

کیا خوب کہا سنوسی نے ایک روز شریف مکہ سے
تو نام و نسب کا حجازی ہے، پر دل کا حجازی بن نہ سکا

اگر ایک ہندوستانی کا دل حجازی ہے، تو اس ہاشمی سے ہزار درجہ اچھا ہے جو اپنے خاندان اور نسب پر یا جاہلیت عرب پر فخر کرتا ہے، جو ابوجہل اور ابولہب کی اولاد ہونے پر فخر کرتا ہے، اور ملت ابراہیم کی تہذیب اور خصوصیات سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

اسی بنا پر علامہ اقبال نے جو ایک نو مسلم خاندان کے چشم و چراغ تھے، ایک سید زادہ کو خطاب کرتے ہوئے دین و شریعت کی پیروی کی اس طرح تلقین کی:

میں اصل کا خاص سومناتی — آبا مرے لاتی و مناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد — میری کف خاک برہمن زاد
دیں مسلک زندگی کی تقویم — دیں سر محمد و براہیم
دل در سخن محمدی بند — اے پور علی ز بو علی چند؟

فانی رشتے

دنیا کے سب رشتے فانی ہیں، یہ تمام مادی رشتے باقی رہنے والے نہیں، نہ ہاشمی رہے گا نہ عربی، نہ ہندوستانی رہے گا نہ ملائی، نہ انڈونیشی رہے گا نہ جاوی، بس اللہ کا نام باقی رہے گا، اور اللہ کے لئے خلوص باقی رہے گا، نام و نسب کے اختلاف، اور خاندانوں کی کمتری اور برتری سب فانی اور ہیچ ہیں، اللہ تعالے کو دین عزیز ہے اخلاص اور للّٰہیت عزیز ہے، ابراہیمیت و محمدیت عزیز ہے، اور اس کے باقی رہنے کا اللہ نے فیصلہ کیا ہے ع۔

جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر!

ہمارے دو فیصلے

ہم مسلمانوں نے پورے عزم کے ساتھ سوچ سمجھ کر اپنے وطن ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے، ہمارے اس فیصلہ کو ارادۂ الہٰی کے سوا کوئی طاقت بدل نہیں سکتی، ہمارا یہ فیصلہ کسی کم ہمتی، مجبوری یا بے چارگی پر مبنی نہیں، ہم نے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔

ہمارا دوسرا فیصلہ یہ ہے (جو اپنے عزم اور قطعیت میں پہلے فیصلہ سے کسی طرح کم اور غیر اہم نہیں) کہ ہم اس ملک میں اپنے پورے عقائد، دینی شعائر، اور اپنی پوری مذہبی اور تہذیبی خصوصیات کے ساتھ رہیں گے، ہم ان کے کسی ایک نقطہ سے بھی دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں۔

اس ملک کے باشندے کی حیثیت سے ہمیں یہاں آزادی اور عزت کے ساتھ رہنے کا پورا حق حاصل ہے، یہ اس ملک کی جمہوریت اور دستور وآئین کا بھی فیصلہ ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم اپنی خصوصیات، اپنے عقائد وشعائر، اپنی زبان وتہذیب، اور اپنی ان چیزوں کو چھوڑ کر جو ہم کو عزیز ہیں، اس ملک میں رہیں، اس لئے کہ اس طرح رہنے سے یہ وطن، وطن نہیں، بلکہ ایک جیل خانہ اور قفس بن جاتا ہے جس میں گویا پوری قوم کو زندگی کی عزتوں، اور لذتوں سے محروم رکھ کر سزا دی جاتی ہے، ہمارا خمیر ضرور اس ملک کی خاک سے تیار ہوا ہے، اور یہ خاک ہم کو بہت عزیز ہے، لیکن ہماری تہذیب ابراہیمی ہے، اور مسلمان جس ملک میں بھی رہے گا، اس کی وطنیت خواہ کچھ ہو، اس کی تہذیب ابراہیمی ہوگی، ہم یہاں زندہ، اور باعزت انسانوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں، ہم اس ملک میں آزاد ہیں، اس کی تعمیر وترقی میں شریک، اور اس کی دستور سازی میں دخیل ہیں اس لئے اس کا کوئی سوال نہیں کہ ہم دوسرے درجہ کے شہریوں کی طرح زندگی بسر کریں، اپنے ملک میں آزادی کے ساتھ زندگی گزارنا ہر شخص کا فطری، انسانی، اخلاقی، اور قانونی حق ہے، اور اس حق کو جب بھی چھیننے کی کوشش کی گئی تو اس کے ہمیشہ سنگین نتائج نکلے۔

زندگی اور موت اسلام پر

اللہ تعالے نے مسلمانوں سے اس بات کا مطالبہ کیا ہے، کہ وہ اسلام وایمان پر قائم رہنے کی کوشش کریں، اسی پر زندگی گذاریں، اور جب موت آئے تو اسی دین وملت پر آئے۔

تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔

(آل عمران ـ ۱۰۲)

اسی کی وصیت ابراہیم ویعقوب علیہم السلام نے اپنی اولاد کو کی۔

اسی طریقہ پر چلنے کی ہدایت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو کی تھی، اور اسی کی وصیت یعقوبؑ نے اپنی اولاد کو کی، انھوں نے کہا تھا کہ "میرے بچو! اللہ نے تمہارے لئے یہی دین پسند کیا ہے، لہٰذا مرتے دم تک مسلم ہی رہنا۔"

(البقرہ ـ ۱۳۲)

شریعت اسلامی نے ایک مسلمان کے لئے پیدائش سے لے کر موت تک اس کے انتظامات کئے ہیں، اور ایسا ماحول تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے، جس میں مسلمان اس حقیقت کو فراموش نہ کرنے پائے، اس کو ہر وقت یاد رہے کہ اس کا تعلق اس دین وملت سے ہے، جس کے داعی ابراہیم ومحمد علیہما السلام تھے، جس کی بنیاد توحید پر ہے، اور وہ ایک الگ "امت" ہیں، مسلمان بچہ جس وقت پیدا ہوتا ہے، اس کے کان میں اذان دی جاتی ہے، اس کا اسلامی نام رکھا جاتا ہے، ناموں میں ان ناموں کو ترجیح دی گئی ہے، جن میں عبدیت وعہد کا اظہار ہے اس سے ابراہیمی سنتیں ادا کرائی جاتی ہیں اور جب وہ مرتا ہے، تو سب اس کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہوئے اپنے لئے اور سب مسلمانوں کے لئے دعا کرتے ہیں۔

اے اللہ ہم میں سے تو جس کو زندہ رکھے اس کو اسلام پر زندہ رکھیو اور جس کو تو موت دے تو اس کو ایمان کے ساتھ دنیا سے اٹھائیو۔

یہاں تک کہ قبر میں اتارتے ہوئے اور آخری ٹھکانے پر پہونچاتے ہوئے بھی یہی لفظ زبان پر ہوتے ہیں:

اللہ کے نام پر اور رسول اللہ کے دین وملت پر۔

اس سب کا مقصد اور پیغام یہ ہے کہ ہمیں اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، اور زندگی کی ہر منزل پر اس کو یاد رکھنا ہے، کہ ہم ملت ابراہیمی اور امت محمدی کے فرد، اور ایک مخصوص شریعت اور آئین ومسلک زندگی کے پیرو، اور خدا کے موحد اور وفادار بندے ہیں، ہماری زندگی بھی اسی آئین ومسلک کی وفاداری میں گذرے، اور ہمیں موت بھی اسی حال میں آئے، ہماری موجودہ نسلیں بھی اسی راستہ پر گامزن رہیں، اور ہماری آئندہ نسلیں بھی اسی صراط مستقیم پر چلیں۔

ملت ابراہیمی اور دین محمدی کی اس دعوت کو آج صراحت اور تعین کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت ہے، یہ اس تہذیب کی دعوت ہے جس کی بنا ابراہیم علیہ السلام نے ڈالی ہے، اور تکمیل وتجدید حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی ہے، اجتماع واخلاق میں اس کے کچھ معین اور خاص اصول ہیں، یہ فرد کی حریت اور فلاح کی ضامن ہے چند معین عقائد، معین اصولوں، اور معین کرداروں نے اس کو وجود بخشا ہے، یہ ابراہیم علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشترک دعوت اور میراث ہے، اور اس کے سوا کوئی تیسری چیز خدا کو قبول نہیں۔

نازک امانت

آج مسلمانوں کی قوت ایمانی کا بھی امتحان ہے، اور ذہانت کا بھی، قوت فیصلہ کا بھی امتحان ہے اور زندگی کی صلاحیتوں کا بھی، ہم کو ثابت کرنا ہے کہ ہم ایمان کے ساتھ زندہ رہنے کے اہل ہیں یا نہیں، ہم جہاں رہیں اس ملک کی خصوصیات اپنے اندر خوشی سے پیدا کریں، وہاں کی زبانیں سیکھیں، اور بچوں کو پڑھائیں، اپنا حصہ رسدی حاصل کریں، ملک کے نظم ونسق (ایڈمنسٹریشن) میں اپنے شایان شان حصہ لیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ داعی بھی رہیں، مومن بھی رہیں، توحید کا اعلان بھی کریں، اور پیغام پہونچانے والے بھی بنیں، خدا کے یہاں ہم سے سوال ہوگا کہ اللہ نے ہم کو سیکڑوں برس اس ملک میں باقی رکھا، لیکن حضرت ابراہیمؑ اور محمد رسول اللہ کی دعوت، اور آپ کا دین کیوں ہمارے

اندر محدود رہا، اس کو پھیلنا اور وسیع ہونا چاہئے تھا۔

قوم موسیٰ کی تقلید سے بچئے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل کا ایک عبرت انگیز واقعہ بیان کیا ہے، جس میں ہمارے لئے بہت بڑا سبق ہے، اس کو خود قرآن مجید کی زبان سے سنئے:۔

> بنی اسرائیل کو ہم نے سمندر سے گذار دیا، پھر وہ چلے اور راستہ میں ایک ایسی قوم پر ان کا گذر ہوا جو اپنے چند بتوں کی گرویدہ بنی ہوئی تھی، کہنے لگے "اے موسیٰ! ہمارے لئے بھی کوئی ایسا معبود بنادے جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں، موسیٰ نے کہا، تم لوگ بڑی نادانی کی باتیں کرتے ہو، یہ لوگ جس طریقہ کی پیروی کر رہے ہیں، وہ تو برباد ہونے والا ہے، اور جو عمل وہ کر رہے ہیں، وہ سراسر باطل ہے" پھر موسیٰ نے کہا، "کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود تمہارے لئے تلاش کردوں" حالانکہ وہ اللہ ہی ہے، جس نے تمہیں دنیا بھر کی قوموں پر فضیلت بخشی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ بنی اسرائیل کو اپنی صحیح معرفت عطا فرمائی اور توحید کی اس دولت سے نوازا جس سے بڑی کوئی دولت نہیں، ان کے اندر ایمان پیدا کیا، وہ یہ سمجھے کہ اللہ کے سوا اس دنیا میں کوئی پرستش اور بندگی کے لائق نہیں، اور اس کے سوا اس دنیا میں کسی کی حکومت نہیں، لیکن وہ ایسے ناقدرداں اور نادان تھے کہ انھوں نے ایک مرتبہ ایک میلہ دیکھا کہ جس میں خدا کے سوا اور ہستیوں کو لوگ پوج رہے تھے، اس منظر کو دیکھ کر ان کے منہ میں پانی بھر آیا، کہ اگر ہمارے لئے بھی ایسے ہی معبود تجویز کر دیئے جاتے جن کے سامنے ہم اپنے ذوق عبودیت کا اظہار کرتے تو کیسی رونق اور بہار ہوتی، انھوں نے کہا:۔

> "اے موسیٰ! ہمارے لئے بھی کوئی ایسا معبود بنادے جیسے ان کے لئے معبود ہیں۔ (الاعراف۔ ۱۳۸)

اے موسیٰ ذرا ہمارے لئے ایسے ہی کوئی ظاہری اور مجسم شکل میں معبود تجویز کر دیجئے، جیسا کہ ان کے پاس ہے، اپنے وقت کا موحدِ اعظم بولا: "تم پرلے درجہ کے نادان ہو، تمہاری عقل پر پتھر پڑے ہیں تمہیں نظر نہیں آتا۔؟"

جو یہ کر رہے ہیں، وہ خاک میں مل جانے والا ہے، وہ کچھ کام آنے والا نہیں، اس کے بعد انھوں نے ذرا سمجھا کر کہا:۔

> پھر موسیٰ نے کہا "کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود تمہارے لئے تلاش کروں؟ حالانکہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھیں دنیا بھر کی قوموں پر فضیلت بخشی ہے"
>
> (الاعراف ۔ ۱۴۰)

اللہ کے بندو! خدا تمہارے حال پر رحم کرے، خدا تمھیں عقل اور سمجھ دے، میں خدا کو چھوڑ کر تمہارے لئے اور کوئی خدا لاؤں؟ حالانکہ اس نے تم کو تمام دنیا پر اسی عقیدۂ توحید کی بنا پر فضیلت دی ہے، اور تم کہتے ہو کہ اس فضیلت دینے والے، احسان کرنے والے خدا کو چھوڑ کر جس نے فرعون کی غلامی سے تم کو نجات دی ہے کوئی عاجز اور بے اختیار خدا تمھارے سامنے لے آؤں۔

دائمی جدوجہد

ایک خصوصیت خاندان ابراہیمی کی یہ ہے کہ جہاں یہ رہے گا، حق کے لئے سینہ سپر رہے گا، توحید کی صدا بلند کرتا رہے گا، اللہ کے راستہ کی طرف سب کو بلاتا رہے گا، یہ یہ سعادت قیامت تک کے لئے ملت ابراہیمیؑ کے لئے مقرر اور مقدر ہو چکی ہے، جس نے اللہ کے نام کا جھنڈا بلند کیا، دنیا کے کسی گوشہ اور کسی حصہ میں آپ اگر سراغ لگائیں گے، اور تحقیق کریں گے۔ تو سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا رشتہ ملتا ہوگا، دنیا میں بار بار جنگیں ہوئیں، ماضی قریب میں دو عالمگیر جنگیں ہو چکی ہیں، اور وہ دنیا پر سخت تباہی لائیں، لیکن ان میں سے کوئی خاندان ابراہیمی کی جنگ نہیں تھی، اس جنگ میں خاندان ابراہیمی کی کوئی شاخ فریق نہیں تھی، یہ پیٹ کے لئے تھی، یہ بازاروں کے لئے تھی، مارکیٹ حاصل کرنے کے لئے تھی، حکومت اور اقتدار کے لئے تھی، یہ ہوا و ہوس کی جنگ تھی، اس لئے کہ یہ ملت ابراہیمی کی طرف سے نہیں لڑی گئی تھی۔

آج ساری دنیا میں جس کو دیکھیں گے، کہ وہ اللہ کے نام کی رٹ لگاتا ہے، خود بھی لیتا ہے، دوسروں کو بھی تلقین کرتا ہے؛ اگر تحقیق کریں گے تو وہ ابراہیمی ومحمدی نکلے گا اس کا تعلق دور سے یا قریب سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکلے گا، یا ان کی صلبی اولاد میں ہے، یا ان کے داعیوں اور منادیوں کے ذریعہ وہ ان کے معنوی خاندان میں داخل ہو چکا ہے، قیامت تک کے لئے توحید کا اعلان، قیامت تک کے لئے ایمان کی دعوت، قیامت تک کے لئے خوف خدا اور فکر آخرت کی دعوت، قیامت تک کے لئے دینی جدوجہد کو اللہ تعالیٰ نے خاندان ابراہیمیؑ کے سپرد کر دیا ہے، ہر جگہ ہر زمانہ میں، خاندان ابراہیمیؑ کا کوئی سرپھرا ملاح موجوں سے ٹکراتا رہے گا، دھارے کے خلاف کشتی کو چلاتا رہے گا، بازو شل ہو جاتے ہیں، ہتوار جواب دے جاتے ہیں، موجیں گستاخیاں کرتی ہیں، مگر خاندان ابراہیمیؑ کا ملاح ہے کہ: ع

> ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے۔!
> وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کا آخری پیغام

مسلمانوں کو اُمّت بننے کی دعوت

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب علیہ الرّحمۃ نے اپنے وصال سے تین دن پہلے یعنی ۲۶ ذیقعدہ (مطابق ۳۰ مارچ) منگل کے دن، بعد نماز فجر رائیونڈ (ضلع لاہور) میں ایک اہم تقریر فرمائی تھی۔ یہ آپ کی زندگی کی اہم آخری تقریر تھی۔

دیکھو میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، ساری رات مجھے نیند نہیں آئی اس کے باوجود ضروری سمجھ کے بول رہا ہوں، جو سمجھ کے عمل کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے چمکائے گا ورنہ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارے گا۔

یہ اُمّت بڑی مشقت سے بنی ہے اس کو اُمّت بنانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے بڑی مشقتیں اٹھائی ہیں اور اُن کے دشمنوں یہود و نصاریٰ نے ہمیشہ اس کی کوششیں کی ہیں کہ مسلمان ایک اُمّت نہ رہیں بلکہ ٹکڑے ٹکڑے ہوں، اب مسلمان اپنا اُمّت پنا (یعنی اُمّت ہونے کی صفت) کھو چکے ہیں، جب تک یہ اُمّت بنے ہوئے تھے چند لاکھ ساری دُنیا پر بھاری تھے، ایک پکا مکان نہیں تھا، مسجد تک پکی نہیں تھی، مسجد میں چراغ تک نہیں جلتا تھا، مسجد نبوی میں ہجرت کے نویں سال چراغ جلا ہے۔ سب سے پہلا چراغ جلانے والے تمیم داریؓ ہیں وہ ۹ھ میں اسلام لائے ہیں اور ۹ھ تک قریب قریب سارا عرب اسلام میں داخل ہو چکا تھا مختلف قومیں، مختلف زبانیں، مختلف قبیلے ایک اُمّت بن چکے تھے تو جب یہ سب کچھ ہو گیا۔ اس وقت مسجد نبوی میں چراغ جلا۔ لیکن حضورؐ جو نور ہدایت لے کر تشریف لائے تھے وہ پورے عرب میں بلکہ اس کے باہر بھی پھیل چکا تھا اور اُمّت بن چکی تھی، پھر یہ اُمّت دنیا میں اٹھی جدھر کو نکلی ملک کے ملک پیروں میں گرے۔ یہ اُمّت اس طرح بنی تھی کہ ان کا کوئی آدمی اپنے خاندان، اپنی برادری، اپنی پارٹی، اپنی قوم، اپنے وطن، اپنی زبان کا حامی نہ تھا، مال و جائداد اور بیوی بچوں کی طرف دیکھنے والا بھی نہ تھا بلکہ ہر آدمی صرف یہ دیکھتا تھا کہ اللہ و رسولؐ کیا فرماتے ہیں، اُمّت جب ہی بنتی ہے جب اللہ و رسولؐ کے حکم کے مقابلے میں سارے رشتے اور سارے تعلقات کٹ جائیں جب مسلمان ایک اُمّت تھے تو ایک مسلمان کے کہیں قتل ہو جانے سے ساری اُمّت ہل جاتی تھی اب ہزاروں لاکھوں گلے کٹتے ہیں اور کانوں پہ جوں نہیں رینگتی۔

اُمّت کسی ایک قوم اور ایک علاقے کے رہنے والوں کا نام نہیں ہے بلکہ سینکڑوں ہزاروں قوموں اور علاقوں سے جڑ کر اُمّت بنتی ہے، جو کوئی کسی ایک قوم یا ایک علاقہ کو اپنا سمجھتا ہے اور دوسروں کو غیر سمجھتا ہے وہ اُمّت کو ذبح کرتا ہے اور اس کے ٹکڑے کرتا ہے اور حضورؐ اور صحابہؓ کی محنتوں پر پانی پھیرتا ہے۔ اُمّت کو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پہلے خود ہم نے ذبح کیا ہے یہود و نصاریٰ نے تو اس کے بعد کٹی کٹائی امت کو کاٹا ہے۔ اگر مسلمان اب پھر اُمّت بن جائیں تو دُنیا کی ساری طاقتیں مل کر بھی ان کا بال بیکا نہیں کر سکیں گی۔ ایٹم بم اور راکٹ ان کو ختم نہیں کر سکیں گے لیکن اگر وہ قومی اور علاقائی عصبیتوں کی وجہ سے باہم اُمّت کے ٹکڑے کرتے رہے تو خدا کی قسم تمہارے ہتھیار اور تمہاری فوجیں تم کو نہیں بچا سکیں گی۔

مسلمان ساری دنیا میں اس لئے پٹ رہا اور مر رہا ہے کہ اُس نے اُمّت پنے کو ختم کر کے حضورؐ کی قربانی پر پانی پھیر دیا ہے۔ میں یہ دل کی باتیں کہہ رہا ہوں، ساری تباہی اس وجہ سے ہے کہ اُمّت اُمّت نہ رہی بلکہ یہ بھی بھول گئے کہ اُمّت کیا ہے اور حضورؐ نے کس طرح اُمّت بنائی تھی۔

اُمّت ہونے کے لئے اور مسلمان کے ساتھ خدائی مدد ہونے کے لئے صرف یہ کافی نہیں ہے کہ مسلمانوں میں نماز ہو، ذکر ہو، مدرسہ ہو، مدرسہ کی تعلیم ہو۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قاتل ابن ملجم ایسا نمازی اور ایسا ذاکر تھا کہ جب اس کو قتل کرتے وقت غصہ میں بھرے لوگوں نے اس کی زبان کاٹنی چاہی تو اس نے کہا سب کچھ کرو لیکن میری زبان مت کاٹو تاکہ زندگی کے آخری سانس تک میں اس سے اللہ کا ذکر کرتا رہوں۔ اس کے باوجود حضورؐ نے فرمایا کہ علی کا قاتل میری اُمّت کا سب سے زیادہ شقی اور بدبخت ترین آدمی ہوگا، اور مدرسہ کی تعلیم تو ابوالفضل اور فیضی نے بھی حاصل کی تھی اور ایسی حاصل کی تھی کہ قرآن پاک کی تفسیر بے نقط لکھدی، حالانکہ انھوں نے ہی اکبر کو گمراہ کر کے دین کو برباد کیا تھا۔ تو جو باتیں ابنِ ملجم اور ابوالفضل فیضی میں تھیں وہ اُمّت بننے کے لئے اور خدا کی غیبی نصرت کے لئے کیسے کافی ہو سکتی ہیں۔؟

حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت سیّد احمد شہیدؒ اور اُن کے ساتھی دینداری کے لحاظ سے بہترین مجموعہ تھے، وہ جب سرحدی علاقے میں پہنچے اور وہاں کے لوگوں نے ان کو اپنا بڑا بنا لیا تو شیطان نے وہاں کے کچھ مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ یہ

دوسرے علاقے کے لوگ، ان کی بات یہاں کیوں چلے۔ انھوں نے ان کے خلاف بغاوت کرائی، ان کے کتنے ہی ساتھی شہید کر دیئے گئے اور اس طرح خود مسلمانوں نے علاقائی بنیاد پر اُمّت پنے کو توڑ دیا، اللہ نے اس کی سزا میں انگریزوں کو مسلط کیا۔ یہ خدا کا عذاب تھا۔

یاد رکھو میری قوم اور میرا علاقہ اور میری برادری یہ سب اُمّت کو توڑنے والی باتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کو یہ باتیں اتنی ناپسند ہیں کہ حضرتِ سعدؓ بن عبادہ جیسے بڑے صحابی سے اس بارے میں جو غلطی ہوئی (جو اگر دب نہ گئی ہوتی تو اس کے نتیجہ میں انصار اور مہاجرین میں تفریق ہو جاتی) اس کا نتیجہ حضرت سعدؓ کو دنیا ہی میں بھگتنا پڑا۔ روایات میں یہ ہے کہ ان کو جنات نے قتل کر دیا اور مدینہ میں یہ آواز سنائی دی اور بولنے والا کوئی نظر نہ آیا۔

اس واقعہ نے مثال کر دی اور سبق دیا کہ اچھے سے اچھا آدمی بھی اگر قومیت یا علاقہ کی بنیاد پر اُمّت پنے کو توڑے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو توڑ کے رکھ دے گا۔

اُمّت جب بنے گی جب اُمّت کے سب طبقے بلا تفریق اس کام میں لگ جائیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم دے کے گئے ہیں اور یاد رکھو اُمّت پنے کو توڑنے والی چیزیں معاملات اور معاشرت کی خرابیاں۔ ایک فرد یا طبقہ جب دوسرے کے ساتھ ناانصافی اور ظلم کرتا ہے اور اس کا پورا حق اس کو نہیں دیتا یا اس کو تکلیف پہنچاتا ہے یا اس کی تحقیر اور بے عزتی کرتا ہے تو تفریق پیدا ہوتی ہے اور اُمّت پنا ٹوٹتا ہے، اس لئے میں کہتا ہوں کہ صرف کلمہ اور تسبیح سے امت نہیں بنے گی۔ امت معاملات اور معاشرت کی اصلاح سے اور سب کا حق ادا کرنے اور سب کا اکرام کرنے سے بنے گی بلکہ جب بنے گی جب دوسروں کے لئے اپنا حق اور اپنا مفاد قربان کیا جائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اپنا سب کچھ قربان کر کے اور اپنے پر تکلیفیں جھیل کے اس اُمّت کو بنایا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک دن لاکھوں کروڑوں روپے آئے اُن کی تقسیم کا مشورہ ہوا۔ اس وقت اُمّت بنی ہوئی تھی، یہ مشورہ کرنے والے کسی ایک ہی قبیلہ یا ایک ہی طبقہ کے نہ تھے بلکہ مختلف طبقوں اور قبیلوں کے وہ لوگ تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے اعتبار سے بڑے اور خواص سمجھے جاتے تھے، انھوں نے مشورہ سے باہم طے کیا کہ تقسیم اس طرح پر ہو کہ سب سے زیادہ حضورؐ کے قبیلہ والوں کو دیا جائے۔ اس کے بعد حضرتِ ابوبکرؓ کے قبیلہ والوں کو، پھر حضرتِ عمرؓ کے قبیلہ والوں کو، اس طرح حضرتِ عمرؓ کے اقارب تیسرے نمبر پر آئے۔ جب یہ بات حضرتِ عمرؓ کے سامنے رکھی گئی تو آپ نے اس مشورہ کو قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ اس امت کو جو کچھ ملا ہے اور مل رہا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے اور آپؐ کے صدقہ میں مل رہا ہے، اس لئے بس حضورؐ ہی کے تعلق کو معیار بنایا جائے جو نسب میں آپؐ کے زیادہ قریب ہوں اُن کو زیادہ دیا جائے جو دوم، سوم، چہارم نمبر پر ہوں ان کو اسی نمبر پر رکھا جائے، اس طرح سب سے زیادہ بنی ہاشم کو دیا جائے اس کے بعد بنی عبد مناف کو، پھر قصیٰ کی اولاد کو، پھر کلاب کو، پھر کعب کو پھر مرہ کی اولاد کو، اس حساب سے حضرت عمرؓ کا قبیلہ بہت پیچھے پڑ جاتا تھا اور اس کا حصہ بہت کم ہو جاتا تھا

مگر حضرت عمرؓ نے یہی فیصلہ کیا اور مال کی تقسیم میں اپنے قبیلہ کو اتنے پیچھے ڈال دیا۔ اس طرح بنی تھی یہ اُمّت!

اُمّت بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ سب کی یہ کوشش ہو کہ آپس میں جوڑ ہو پھوٹ نہ پڑے۔ حضورؐ کی ایک حدیث کا مضمون ہے کہ قیامت میں ایک آدمی لایا جائے گا جس نے دنیا میں نماز، روزہ، حج، تبلیغ، سب کچھ کیا ہوگا مگر وہ عذاب میں ڈالا جائے گا، اس کی کسی بات نے اُمّت میں تفریق ڈالی ہوگی، اس سے کہا جائے گا پہلے اپنے اس ایک لفظ کی سزا بھگت لے جس کی وجہ سے امت کو نقصان پہنچا، اور ایک دوسرا آدمی ہوگا جس کے پاس، نماز، روزہ، حج وغیرہ کی بہت کمی ہوگی اور وہ خدا کے عذاب سے بہت ڈر رہا ہوگا۔ مگر اس کو بہت ثواب سے نوازا جائے گا وہ خود پوچھے گا کہ یہ کرم میرے کس عمل کی وجہ سے ہے اس کو بتایا جائے گا کہ تو نے فلاں موقع پر ایک بات کہی تھی جس سے امت میں پیدا ہونے والا ایک فساد رک گیا اور بجائے توڑ کے جوڑ پیدا ہو گیا۔ یہ سب تیرے اسی لفظ کا صلہ اور ثواب ہے۔

اُمّت بنانے اور بگاڑنے میں جوڑنے اور توڑنے میں سب سے زیادہ دخل زبان کا ہوتا ہے، یہ زبان دلوں کو جوڑتی بھی ہے اور پھاڑتی بھی ہے زبان سے ایک بات غلط اور بے جا نکل جاتی ہے اور اس پر لاٹھی چل جاتی ہے اور پورا فساد کھڑا ہو جاتا ہے اور ایک ہی بات جوڑ پیدا کرتی ہے اور پھٹے ہوئے دلوں کو ملا دیتی ہے اس لئے سب سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ زبانوں پر تالا ہو اور یہ جب ہو سکتا ہے جب بندہ ہر وقت اس کا خیال رکھے کہ خدا ہر وقت اور ہر جگہ اس کے ساتھ ہے اور اس کی ہر بات کو سن رہا ہے۔

مدینہ میں انصار کے دو قبیلے تھے اوس اور خزرج ان میں پشتوں سے عداوت اور لڑائی چلی آ رہی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما کر مدینہ پہنچے اور سارے انصار کو اسلام کی توفیق ملی تو حضورؐ کی اور اسلام کی برکت سے اُن کی پشتوں کی لڑائیاں ختم ہو گئیں اور اوس و خزرج شیر و شکر ہو گئے۔ یہ دیکھ کر یہودیوں نے اسکیم بنائی کہ کسی طرح ان کو پھر سے لڑایا جائے۔ ایک مجلس میں جس میں دونوں قبیلوں کے آدمی موجود تھے، ایک سازشی آدمی نے اُن کی پرانی لڑائیوں سے متعلق کچھ شعر پڑھ کے اشتعال پیدا کر دیا، پہلے تو زبانیں ایک دوسرے کے خلاف چلیں، پھر دونوں طرف سے ہتھیار نکل آئے حضورؐ سے کسی نے جا کر کہا آپ فوراً تشریف لائے اور فرمایا کہ میرے ہوتے ہوئے تم آپس میں خون خرابہ کرو گے۔ آپ نے بہت مختصر مگر درد سے بھرا ہوا خطبہ دیا، دونوں فریقوں نے محسوس کر لیا کہ ہمیں شیطان نے ورغلایا، دونوں روئے اور گلے ملے اور یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

"اے مسلمانو خدا سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنا چاہئے اور مرتے دم تک پورے پورے مسلم اور خدا کے فرماں بردار بندے بنے رہو" جب آدمی ہر وقت خدا کا خیال رکھے گا۔ اس کے قہر و عذاب سے ڈرتا رہے گا اور ہر دم اس کی تابعداری کرے گا تو شیطان بھی اُسے نہیں بہکا سکے گا۔ اُمّت پھوٹ سے اور ساری خرابیوں سے محفوظ رہے گی۔

"اور اللہ کی رسی کو یعنی اس کی کتابِ پاک اور اس کے دین کو سب مل کر مضبوطی سے تھامے رہو یعنی پوری اجتماعیت کے ساتھ اور اُمّت پنے کی صفت کے ساتھ سب مل کر

دین کی رسی کو تھامے رہو اور اس میں لگے رہو اور قوم کی بنیاد پر یا علاقہ کی بنیاد پر یا زبان کی بنیاد پر، یا کسی اور بنیاد پر ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو اور اللہ کے اس احسان کو نہ بھولو کہ اس نے تمہارے دلوں کی وہ عداوت اور دشمنی ختم کر کے جو پشتوں سے تم میں چلی آرہی تھی تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور تمہیں باہم بھائی بھائی بنا دیا اور تم آپس میں لڑتے وقت دوزخ کے کنارے پر کھڑے تھے جس گرنے ہی والے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو تھام لیا اور دوزخ سے بچا لیا۔"

شیطان تمہارے ساتھ ہے اس کا علاج یہ ہے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جس کا موضوع ہی بھلائی کی اور نیکی کی طرف بلانا اور ہر برائی اور ہر فساد سے روکنا ہو۔

اُمّت میں ایک گروہ وہ ہو جس کا کام اور موضوع ہی یہ ہو کہ وہ دین کی طرف اور ہر قسم کے خیر کی طرف بلائے۔ ایمان کے لئے اور خیر اور نیکی کے راستہ پر چلنے کے لئے محنت کرتا رہے، نمازوں پر محنت کرے، ذکر پر محنت کرے، برائیوں اور معصیتوں سے بچانے کے لئے محنت کرے اور ان محنتوں کی وجہ سے اُمّت ایک اُمّت بنی رہے۔

جو لوگ ان ہدایتوں کے بعد بھی شیطان کی پیروی کر کے اور الگ الگ راہوں پر چل کے اختلاف پیدا کریں گے اور اُمّت کے اُمّت پنے کو توڑیں گے تو ان پر خدا کی سخت مار پڑے گی۔

دین کی ساری تعلیم اور ساری چیزیں جوڑنے والی اور جوڑنے کے لئے ہیں، نماز میں جوڑ ہے، روزہ میں جوڑ ہے، حج میں قوموں اور ملکوں اور مختلف زبان والوں کا جوڑ ہے، تعلیم کے حلقے جوڑنے والے ہیں، مسلمانوں کا اکرام اور باہم محبت اور تحفہ تحائف کا لین دین یہ سب جوڑنے والی اور جنت میں لے جانے والی چیزیں ہیں اور قیامت میں ان اعمال کے لئے محنتیں کرنے والوں کے چہرے نورانی ہوں گے اور ان کے برخلاف باہم بغض و حسد، غیبت، چغلخوری، توہین و تحقیر اور دل آزاری یہ سب پھوٹ ڈالنے والے اور توڑنے والے اور دوزخ میں لے جانے والے اعمال ہیں اور ان اعمال والے آخرت میں روسیاہ ہوں گے۔

"جنھوں نے پھوٹ ڈال کے اور پھوٹ والے اعمال کر کے اُمّت کو توڑا ہوگا، وہ قیامت کے دن قبروں سے کالے مونہہ اٹھیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ تم نے ایمان و اسلام کے بعد کفر والوں کا طریقہ اختیار کیا، اب تم یہاں دوزخ کا عذاب چکھو اور جو ٹھیک راستہ پر چلتے رہے ہوں گے ان کے چہرے نورانی اور چمکتے ہوئے ہوں گے اور وہ ہمیشہ اللہ کی رحمت میں اور جنت میں رہیں گے۔

میرے بھائیو دوستو! یہ سب آیتیں اُس وقت اتری تھیں، جب یہود نے انصار میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی تھی اور اُن کے دو قبیلوں کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر دیا تھا۔ اِن آیتوں میں مسلمانوں کی باہمی پھوٹ اور لڑائی کو کفر کی بات کہا گیا ہے اور آخرت کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے آج ساری دنیا میں اُمّت پنا توڑنے کی محنت چل رہی ہے، اس کا علاج اور توڑ یہی ہے کہ تم اپنے حضورؐ والی محنت میں لگا دو، مسلمانوں کو مسجدوں میں لاؤ، وہاں ایمان کی باتیں ہوں، تعلیم اور ذکر کے حلقے ہوں، دین کی محنت کے مشورے ہوں، مختلف طبقوں کے اور مختلف برادریوں کے اور مختلف زبانوں والے لوگ مسجدِ نبوی کے طریقہ پر ان کاموں میں جُڑیں۔ جب اُمّت پنا آئے گا۔ ان باتوں سے بچیں جن سے شیطان کو پھوٹ ڈالنے کا موقع ملے۔ جب تین بیٹھیں تو اس کا خیال کریں کہ چوتھا ہمارے ساتھ اللہ ہے، چار پانچ بیٹھیں تو ہمیشہ یاد رکھیں کہ پانچواں یا چھٹا اللہ ہمارے ساتھ ہی موجود ہے اور وہ ہماری ہر بات سن رہا ہے اور دیکھ رہا ہے کہ ہم اُمّت بنانے کی بات کر رہے ہیں یا اُمّت پنا توڑنے کی۔ ہم کسی کی غیبت اور چغلخوری تو نہیں کر رہے، کسی کے خلاف سازش تو نہیں کر رہے۔ یہ اُمّت حضورؐ کے خون اور رفاقتوں سے بنی تھی۔ اب ہم اپنی معمولی معمولی باتوں پر اُمّت کو توڑ رہے ہیں، یاد رکھو نماز جمعہ چھوڑنے پر بھی اتنی پکڑ نہیں ہوگی جتنی اُمّت کے توڑنے پر ہوگی۔ اگر مسلمانوں میں اُمّت پنا آجائے تو وہ دنیا میں ہرگز ذلیل نہ ہوں گے، روس اور امریکہ کی طاقتیں بھی ان کے سامنے جھکیں گی اور اُمّت پنا جب آئے گا جب "اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ" پر مسلمانوں کا عمل ہو یعنی ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے مقابلہ میں چھوٹا بننے اور ذلّت و تواضع اختیار کرنے کو اپنائے تبلیغ میں اسی کی مشق کرنی ہے جب مسلمانوں میں اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ" والی صفت آجائے گی تو وہ دنیا میں "اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِينَ" یعنی کافروں کے مقابلہ میں زبردست اور غالب ضرور ہوں گے چاہے وہ کافر یورپ کے ہوں یا ایشیا کے۔

میرے بھائیو دوستو! اللہ و رسول نے اِن باتوں سے شدّت اور سختی سے منع فرمایا ہے جن سے دلوں میں فرق پڑے اور پھوٹ کا خطرہ بھی ہو، دو دو چار چار الگ کانا پھوسی کریں اس سے شیطان دلوں میں بدگمانی پیدا کر سکتا ہے اس سے منع فرمایا گیا ہے اس کو شیطانی کام بتایا گیا۔

اسی طرح تحقیر اور استہزاء اور تمسخر سے منع فرمایا گیا۔ اس سے بھی منع فرمایا گیا کہ دوسرے کی کوئی برائی جو معلوم نہ ہو اس کو تجسس کر کے معلوم کیا جائے اور جو برائی کسی کی معلوم ہو گئی اس کو دوسروں کے سامنے ذکر کرنے سے منع فرمایا گیا، اور غیبت کو حرام کیا گیا، غیبت اس کا نام ہے کہ جو واقعی برائی کسی کی معلوم ہو اس کا ذکر کسی سے کیا جائے۔ یہ تحقیر اور تمسخر اور تجسس اور غیبت وہ چیزیں ہیں جو آپس میں تفرقہ پیدا کر کے اُمّت پنے کو توڑتی ہیں، ان سب کو حرام قرار دیا گیا اور ایک دوسرے کا اکرام و احترام کرنا جس سے اُمّت جڑتی بنتی ہے اس کی تاکید فرمائی گئی اور دوسروں سے اپنا اکرام چاہنے سے منع کیا گیا، کیوں کہ اِس سے اُمّت بنتی نہیں بگڑتی ہے، امت جب بنے گی جب ہر آدمی یہ طے کرے کہ میں عزّت کے قابل نہیں ہوں، اس لئے مجھے عزّت لینی نہیں بلکہ دوسروں کی عزّت کرنی ہے اور دوسرے سب لوگ اس قابل ہیں کہ میں ان کی عزّت کروں، ان کا اکرام کروں۔

اپنے نفسوں اور اپنی ذاتوں کو قربان کیا جائے گا تو اُمّت بنے گی اور امّت بنے گی تو عزّت ملے گی، عزّت اور ذلّت روس اور امریکہ کے نقشوں میں نہیں ہے بلکہ خدا کے ہاتھ میں ہے اور ان کے ہاں اصول اور ضابطہ ہے۔ جو شخص یا قوم، خاندان طبقہ چمکانے والے اصول اور اعمال لاوے گا اس کو چمکا دیں گے جو مٹنے والے کام کرے گا اس کو مٹا دیں گے۔ یہود نبیوں کی اولاد ہیں اصول توڑے تو اللہ نے ٹھوکر مار کے ان کو توڑ دیا۔ صحابہ کرامؓ بت پرستوں کی اولاد تھے، انھوں نے چمکانے والے اصول اختیار کئے تو اللہ نے اِن کو چمکا دیا، اللہ کی رشتہ داری کسی سے نہیں ہے اس کے ہاں اصول اور

باقی صـ۲۶ پر

شبیر احمد خاں غوری ایم اے

فلسفہ اسلام کی تشکیل

عام طور پر "فلسفہ اسلام" کا اطلاق اس نظام فکر پر ہوتا ہے جس کی یونانی فلسفہ نے مسلمان مفکرین کے یہاں آکر شکل اختیار کی اور جس کے علمبردار قدما میں کندی، فارابی اور بوعلی سینا اور متاخرین میں صدرائے شیرازی، میر باقر داماد اور ملا محمود جونپوری وغیرہم تھے لیکن اگر یہ لفظ کا غلط استعمال نہیں تو اس کا محدود معنوں میں استعمال ضرور ہے، جس کی تحدید وتضییق کے لئے شاید ہی کوئی سند جواز پیش کی جا سکے۔ اگر فلسفہ کے معنی "محبت حکمت یا حکمت" یا ایک منظم اور باقاعدہ نظام فکر" کے ہیں تو "فلسفہ اسلام" یا "اسلامی فلسفہ" کا مصداق وہ مجموعہ افکار ہونا چاہیے جو اسلام کی حقیقی تعلیمات کی روشنی میں ظہور پذیر ہوا اور "فلسفہ اسلام" کا اطلاق صرف انھیں مفکرین پر ہونا چاہیے جنھوں نے اسلام کے اصول تعلیم یعنی قرآن اور حدیث کی مدد سے پیروان اسلام کے لئے ایک ہمہ گیر اور خود مکتفی نظام فکر وعمل مدون کیا لیکن خدا معلوم ایسا کیوں نہیں ہوا۔ خیر "فلسفہ" تو ایک عجمی الاصل لفظ اور غیر اسلامی اصطلاح ہے اور اس کے مصداق میں کفر والحاد اور غیر اسلامی بنیادی نظریات (IDEALOGIES) سے وابستگی کی بو آسکتی ہے۔ لیکن "حکیم" اور "حکماء" تو عربی الاصل لفظ ہیں اور "حکمت" تو خود اسلامی آئیڈیالوجی کی رو سے انسان کے لئے سب سے بڑی نعمت اور "خیر کثیر" کا مصداق ہے کہ

ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیرا

اس لئے اسلامی مصطلحات کی غیرت ایمانی پر اس اصطلاح کو ناگوار اور نامقبول نہ ہونا چاہیے تھا۔ مگر "حکماء اسلام" کا لقب عرصہ دراز سے یونانی فکر انداز پر سوچنے والے مسلمان مفکرین کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ امام رازی جن کا زمانہ چھٹی صدی ہجری کا آخر ساتویں صدی کا آغاز ہے، "تفسیر کبیر" میں جا بجا "حکماء اسلام" بول کر فلسفہ یونان کے مسلمان ..... ماہرین کو مراد لیتے ہیں۔ ممکن ہے یہ اصطلاح چھٹی صدی ہجری سے بھی زیادہ قدیم ہو۔

اس غلط اصطلاح کے جو بھی وجوہ رہے ہوں، لیکن حق تو یہ ہے کہ یہ اصطلاح بے حد درجہ گمراہ کن اور اس کا ایک تکلیف دہ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جو لوگ اسلام کا تحقیقی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اور اس ناگزیر غلط فہمی کی بنا پر اسلام کا شاہکار اسی نام نہاد "فلسفہ اسلام" کو سمجھ لیتے ہیں اور مفکرین اسلام کا مصداق نام نہاد "حکماء اسلام" کی جماعت کو قرار دے لیتے ہیں تو وہ اسلام اور اسلامی فکر کی حقیقت سے بمراحل ناآشنا رہتے ہیں۔ اس سے تعلیم یافتہ طبقے میں اسلام کی تعلیم کے متعلق ایک گمراہ کن غلطی پھیل جاتی ہے اور اسلام میں جو ORIGINALITY اور اسلامی تعلیمات میں جو انفرادی خصوصیات ہیں، وہ نظر انداز ہو کر اسلامی فکر یونانی فلسفہ کا اسلامی چربہ (MUSLIM EDITION) نظر آنے لگتی ہے۔

یہ غلط فہمی صرف مابعد الطبیعیاتی والٰہیاتی مسائل ہی تک محدود نہیں رہتی، بلکہ قرآن ومعاشرت تک اس کا شکار ہو جاتے ہیں، ایک جانب "جزء الذی لا یتجزیٰ کا ابطال" "ہیولیٰ کا اثبات" "صورۃ وہیولیٰ کا تلازم" "افلاک وکواکب کے نفوس ناطقہ، عناصر کی تقسیم چہارگانہ اور اس قسم کے دوسرے مسائل جن پر تعلیم یافتہ حلقوں میں آج ہنسی اڑائی جاتی ہے اسلام کا فکری کارنامہ سمجھے جاتے ہیں۔ اور دوسری جانب اسلامی فقہ گولڈ زیہر وغیرہ مستشرقین کی قیاس آرائیوں کے طفیل میں رومن لا (ROMAN LAW) سے ماخوذ سمجھا جاتا ہے جو جاگیردارانہ نظام کے استحکام و استواری کے لئے وجود میں آیا تھا۔ حالانکہ اسلام اور اسلامی فقہ کسی غیر اسلامی نظام اور انسان دشمن ادارے کی حمایت وتائید کے لئے ظہور میں نہیں آئے لیکن اسلامی فقہ کو رومی قانون کا جانشین مقرر کر کے ان "تحقیق واکتشافات علمیہ" کے ٹھیکہ داروں نے اسلام پر جاگیرداری کے ظالمانہ وجابرانہ نظام کے حامی ہونے کا ٹھپہ لگا دیا۔ اور اس طرح اسلام کا مکمل نظام حیات توہمات وخرافات کا مجموعہ سمجھا جانے لگا۔

بہرکیف یہ مسئلہ خصوصیت کے ساتھ ارباب فکر ونظر کی توجہ کا محتاج ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نام نہاد "مسلم فلسفہ" کو جو مفکرین اسلام کے ایک ذہین اور رطباع طبقہ کی ذہنی کاوشوں کے طفیل میں ظہور پذیر ہوا تھا۔ ہرچند کہ اس کی اصل یونانی فلسفہ ہے اسلامی فکریا "فلسفہ اسلام" کے دائرہ اطلاق سے خارج کر دیا جائے بلکہ وقت کا اہم تقاضا یہ ہے کہ اسلامی فکر کے اس اہم اور حقیقی عنصر کو جس کا ماخذ اسلام کی صحیح تعلیمات ہیں۔ جس کا سرچشمہ کتاب اللہ اور سنت رسول ہے اور جو اسلامی معاشرہ کے نظام فکر وعمل کا قوام ہے اور جس نے اسلامی تہذیب وثقافت کے حدود متعین کر کے اسے اسلامی تہذیب وثقافت کہلانے کا مستحق بنایا ہے ایسے حقیقی اور اہم عنصر کو اسلامی فکر کی تبیین وتفصیل میں اس کا صحیح اور مناسب مقام دیا جائے اس کے ساتھ ساتھ دوسرے افکار کو بھی جن کا ماخذ غیر اسلامی ادارے ہیں لیکن جنھوں نے اسلامی تصورات (IDEALOGY) سے متصادم ہو کر وقت اور ماحول کے مطابق اپنے تبدیلی پیدا کر کے اپنے اصل اور ماخذ (یونانی فلسفہ) کے مقابلے میں انفرادی شان حاصل کر لی اور صحیح یا غلط طور پر اس انفرادیت کے وصف کو لفظ "اسلامی" کی صفت سے تعبیر کیا، ایسے ثانوی افکار کو بھی اسلامی فکر میں ان کے مناسب حال مقام دے کر "فلسفہ اسلام" کا ایک جامع اور ہمہ گیر نظام مرتب کیا جائے۔

اسلامی فکر کے عناصر حقیقی

حقیقی اسلامی فکر کا ماخذ قرآن و حدیث ہے ان دونوں کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے یعنی حقائق حکمیہ کا حضرت باری عزاسمہ کی جانب سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک مافوق الحسی (SUPER SENSUDUUS) طریقہ پر القا۔ ان حقائق حکمیہ کی روشنی میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آن کے بعد آن کے جانشینوں نے مسلمانوں کے واسطے ایک منظم اور ہمہ گیر نظام حیات مرتب کیا یہ نظام انسانیت کی تمام ذہنی و عملی، انفرادی و اجتماعی اور دینی و دنیوی ضرورتوں پر مشتمل تھا۔ حیات انسانی کا کوئی شعبہ نہیں جو اس کی ہمہ گیری سے بچ رہا ہو۔

۱۔ اس نظام حیات کا نام اسلام کی اصطلاح میں "فقہ" تھا اور اس پر بصیرت تامہ کے ملکہ کو "تفقہ فی الدین" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، جو اسلامی سماج میں ایک بہت ہی بڑا اعزاز تھا۔ سہولت تفہیم وتفہم کے لئے اس نظام کے تین جز سمجھ لیجئے اگرچہ فی الحقیقت یہ ایک ناقابل تقسیم و تجزیہ وحدت ہے اور اس کے مختلف اجزا میں واضح خط تفریق نہیں کھینچا جاسکتا۔ یہ تین اجزا حسب ذیل ہیں۔

ا۔ عبد و معبود کا تعلق جسے عبادات کہتے ہیں۔

ب۔ بندوں میں ایک دوسرے سے تعلق جسے معاملات کہتے ہیں، اور

ج۔ فرد یا افراد کا معاشرہ (من حیث الکل) سے تعلق جو عہد جدید کی سیاسیات اور انتظامیات عامہ (PUBLIC ADMINISTRATION) کے قریب قریب برابر ہے۔

عبادات کا مغز بلکہ پورے اسلامی نظام کا زبدہ "بندہ کا معبود کے متعلق ذہنی میلان" ہے یہی توحید ہے۔ یہی "راس الطاعات" ہے یہی ایمان ہے جس کے صلاح و فساد پر پورے دین کا بناؤ بگاڑ مبنی ہے۔ اسی لئے قدماء فقہا اس کی اہمیت کے پیش نظر بقیہ فقہی مباحث سے اسے ممتاز کرنے کے لئے اسے "فقہ اکبر" کہا کرتے تھے۔

۲۔ آغاز حال میں "فقہ اکبر" فقہ کے دوسرے مباحث سے علیحدہ مدون نہ ہوا تھا لیکن بعثت اسلام کو ایک صدی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ عجمی افکار نے اسلامی تعلیمات پر ہجوم بول دیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ قرآن اپنی جگہ پر جمع ہو چکا تھا اور مسلمان بڑی سختی سے اعتصام بالقرآن و تمسک بالسنت کے اصول پر قائم تھے، صحابہ آغوش نبوت میں پرورش پائے ہوئے تھے، اور رسالت کے فیضان تاثیر نے ہدایت کے بعد گمراہی و ضلالت کے لئے ان میں کوئی جگہ نہ چھوڑی تھی۔ تربیت نبوت نے اسلام اور نا اسلام کے پرکھنے کی بصیرت آن میں علی وجہ الکمال پیدا کر دی تھی۔ اس لئے وہ تو عجم کے نا اسلامی افکار سے متاثر نہ ہو سکے البتہ اگلی نسل میں وہ حضرات جو چند ہی دن ہوئے کہ مسلمان ہوئے تھے لیکن جن کے اعماق ذہن کی نا اسلامی افکار سے کلیتاً اصلاح نہ پائی تھی، بھٹکنے لگے، ایسے لوگوں کی اصلاح عقائد کے واسطے فقہ اکبر کی علیحدہ اور مستقل تدوین ضروری تھی بعد میں جب جبر و قدر اور تشبیہ و تعطیل کے افراط و تفریط نے اسلامی معاشرہ کو متاثر کرنا چاہا تو اس مستقل نظام و فکر جس کا نام فقہ اکبر تھا "علم التوحید والصفات" کا نام دیا گیا۔ بعد میں اس کی اصولی حیثیت کے پیش نظر اسے "اصول الدین" کہا جانے لگا۔

فقہ اکبر، علم التوحید والصفات اور اصول الدین ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں یعنی کلیات دین کے متعلق ایک مسلمان کا کیا ذہنی رجحان ہونا چاہئے۔ بالفاظ دیگر یہ ضروری عقائد کا نام ہے۔ ان عقائد پہ ایمان واجب ہے کیوں کہ ان کا ماخذ بیشتر حالات میں قرآن عزیز ہے۔ لہذا ان کے متعلق جحود و انکار تو ایک طرف ان کی صحت تسلیم میں تردد و تامل بھی موجب کفر ہے۔ بعض امور حدیث مشہور سے ثابت ہیں اور حدیث اصولی حیثیت سے قرآن ہی کی طرح واجب التسلیم ہے لیکن چونکہ بیشتر حالات میں اسناد کے ناقابل انکار صحت کی حد تک نہ پہونچنے کی بنا پر وہ قرآن کی طرح یقینی نہیں ہوتی۔ اس لئے ان عقائد پر بھی ایمان لانا چاہئے اور اگرچہ ان کا جحود و انکار کفر کے مترادف نہ ہو لیکن بدعت سیئہ تو ضرور ہے جو اکثر حالات میں منجر بکفر ہو سکتی ہے۔

بہرکیف عامۂ اہل اسلام ان عقائد کے کلیات پہ ایمان رکھتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی اختلاف ہے تو ان کی تفصیل و توجیہ میں۔ ایک جماعت جس نے صحابہ کرام کا شرف تلمذ حاصل کیا تھا، یہ تفصیل و توجیہ صحابہ کے قول کے مطابق کرتی تھی یا پھر اس تفقہ فی الدین کی روشنی میں جس کا ملکہ آسے صحابہ کرام کے فیضان صحبت سے حاصل ہوا تھا۔ یہ اہل السنت والجماعت تھے۔ آن کے دو طبقے تھے۔ پہلا طبقہ وہ تھا جس نے براہ راست صحابہ سے کسب فیض کیا تھا وہ تابعین کہلاتے ہیں۔ دوسرا طبقہ جس نے تابعین سے فیض حاصل کیا تھا، تبع تابعین کہلاتا ہے۔ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کا زمانہ بہترین زمانہ گنا جاتا ہے۔ فقہائے امت اور محدثین کرام انھیں میں پیدا ہوئے۔

ایک دوسرا گروہ تھا جو کلیات دین کی توضیح و توجیہ میں عجمی افکار سے متاثر ہوا تھا اور "عقلیت" (RATONALIOM) کا مدعی تھا، شیعہ خوارج مشبہ، معطلہ، قدریہ، جبریہ، مرجیہ وعیدیہ۔ ان "ہفتاد و دو ملت" فرقوں اور اہل السنت والجماعت کے فکری تصادم سے علم العقائد نے ایک نئی شکل اختیار کر لی۔ پہلے نفس عقیدہ کی تلقین ہوا کرتی تھی، اب جب کہ ہر فرقہ اس عقیدہ کے بارے میں اپنی توجیہ پر مصر تھا تو اس کی تائید و تشبیہ میں عقلی دلائل بھی پیش کرتا تھا۔ اس طرح اب نفس عقائد کی تعلیم و تلقین ہی پر اکتفا نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ دلائل و براہین سے اس کی مخصوص توجیہ کی تائید و تشیید کی جاتی تھی۔

اس کے نتیجے میں اسلامی فکر کے اندر ایک نئے علم کی بنیاد پڑی، اس کا نام "علم الکلام" رکھا گیا۔ مگر جیسا کہ اوپر بیان ہوا، یہ فکری اختلافات مختلف اسلامی فرقوں ہی میں محدود تھے، علامہ تفتازانی کے الفاظ میں یہ "متقدمین کا علم الکلام" تھا۔

اگلی صدی میں جب عباسی حکومت کے اندر عربوں کا اثر و نفوذ کم ہوا اور اسی نسبت سے عجمیوں کا اقتدار کاروبار سلطنت میں بڑھا تو حکومت کی بے جا رواداری اور حد سے بڑھی ہوئی مذہبی آزادی کے زیر اثر غیر اسلامی مذاہب کے پیشواؤں نے اصول اسلام اور کلیات دین کو بھی ہدف اعتراض بنانا شروع کیا۔ ظاہر ہے مخالفین و معترضین پر جو خود قرآن و حدیث کی صحت کو معرض بحث میں لا رہے تھے، قرآن و حدیث کے ذریعے کس طرح حجت قائم کی جا سکتی تھی یہ تو خود کو عقلیت کا پرستار بتاتے تھے لہذا ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے دربار خلافت سے معتزلہ کی ہمت افزائی کی گئی جو عقلی استدلال کے باب میں منجھ چکے تھے

بہرکیف اس طرح "اسلامی عقائد" (توحید، رسالت، معاد وغیرہ) کی تائید وتشیید کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا جو پہلے طریقے (کلام متقدمین) سے مختلف تھا۔ کلام متقدمین میں اصول اسلام اور کلیات دین موضوع بحث نہیں تھے، مگر نئے علم کلام میں خود اصول وکلیات بحث وتمحیص کا موضوع بن گئے پھر پہلے طریقے میں ایک بڑی حد تک قرآن اور کہیں کہیں حدیث نبویؐ سے استشہاد کیا جاتا تھا، مگر نئے علم الکلام میں سارا زور عقلی استدلال پر مرکوز ہو گیا۔ علامہ تفتازانی کہتے ہیں کہ یہ "متاخرین کا علم کلام" تھا، جن کا اکثر فلاسفہ کے ساتھ مجادلہ رہتا تھا اور یہ شکل ہنوز باقی ہے۔

اس طرح اسلامی نظام فکر کا دوسرا اہم جز علم کلام ہے۔ فقہ کے برخلاف، جس کی اسلامی معاشرہ کے استحکام کے لئے ضرورت ناگزیر ہے، علم الکلام بذاتہٖ ضروری نہیں ہے اس کی ضرورت اسلامی نظام فکر پر غیر اسلامی افکار کے ہجوم نے پیدا کر دی ہے، تاکہ اسلام کے اصولی نظریات (آئیڈیالوجی) اپنی جگہ پر مستحکم رہیں، کیوں کہ اس آئیڈیالوجی میں ذرا سا تزلزل بھی پورے اسلامی معاشرہ کو تہس نہس کر سکتا ہے۔

اس لئے جن علماء نے اسلامی معاشرے کی آئیڈیالوجی کو تزلزل کے خطرے سے مامون ومصئون اور بے نیاز سمجھا۔ انھوں نے علم کلام کی ضرورت کا کوئی احساس نہیں کیا اور چونکہ اس میں انہماک اصل مقصد سے دور ہٹا دیتا ہے اس لئے بعض علماء بالخصوص صدر اول کے فقہاء ومحدثین نے علم کلام کی انتہائی شدت کے ساتھ مذمت کی مگر جب آگے چل کر اسلام کے اصولی تصوّرات .... کو غیر اسلامی افکار کے ہجوم سے خطرہ کا اندیشہ لاحق ہوا تو پھر علماء متاخرین نے نہ صرف یہ کہ اس کے جواز کی اجازت دی بلکہ اس پر اقدام کے لئے امت کی ہمت افزائی کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیسری چوتھی اور پانچویں بلکہ چھٹی صدی ہجری کے مجددین ملت وہی بزرگ قرار دیئے گئے جو صف اوّل کے متکلمین میں شمار ہوتے ہیں یعنی امام ابوالحسن الاشعری، قاضی ابوبکر باقلانی، حجۃ الاسلام امام غزالی اور امام فخرالدّین رازی۔

اسلامی فکر میں بیرونی عوامل کا داخلہ

فقہ، فقہ اکبر اور علم کلام کی عقلی تائید وتشیید اسلامی فکر میں شمول ہونے کی مستحق ہیں لیکن فقہ وکلام کے علاوہ دو اور چیزوں کو بھی اسلامی فکر میں شامل کیا جاتا ہے ان میں سے ایک ہے اصطلاحی فلسفہ اسلام جو درحقیقت یونانی فلسفہ کا اسلامی ایڈیشن ہے اور دوسرا ہے عجمی تصوف (نہ کہ شریعت کا فرمودہ تقرب واحسان جسے عموماً تصوف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے) اس عجمی تصوف کی روح تو فیثاغورثیت، یونانی، یہودی فلسفہ، مسیحی رہبانیت اشراق (مجوسی آداب ریاضت) اور نوفلاطونیت کی معجون مرکب ہے۔ لیکن اس کا قالب قرآن وحدیث کے متشابہات اور اکثر حالات میں ضعیف وموضوع احادیث ہیں۔

بہرکیف یونانی فلسفہ اسلامی فکر میں دو راستوں سے داخل ہوا، ایک براہ راست ملکی سطح پر اور دوسرے غیر شعوری طور پر خانقاہوں کے ذریعے۔

ملکی سطح پر اسلامی فکر کے فلسفہ کے داخلے کا آغاز عباسی خلافت بالخصوص مامون الرشید کے زمانہ میں ہوا، جب کہ حسب روایت ابن الندیم آس (مامون الرشید) نے خواب میں ارسطو کو دیکھا تھا بعد میں اسلامی عبقریت نے خود مسلمانوں میں اس یونانی فلسفہ کے بڑے بڑے ماہرین پیدا کئے، جیسے کندی، فارابی، ابن سینا مشرق میں اور ابن ماجہ ابن طفیل اور ابن رشد مغرب میں۔ مگر قبول عام صرف اُسی نظام فکر کو حاصل ہوا جسے شیخ بوعلی سینا نے کچھ اپنے پیشروؤں کے افکار کی خوشہ چینی اور کچھ اپنی جودت قریحہ کی مدد سے مدون کیا تھا یہی ابن سینائی فلسفہ آج کے دن تک مشرق میں فلسفہ کے نام سے متداول ہے۔

رہا تصوف تو اگر اس کا ماحصل توجہ الی المعبود اور اس میں خلوص ہے تو توحید و عبودیت عین اسلام ہے کیوں کہ یہی تمام انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد وحید رہا ہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔ وما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الہ الا انا فاعبدون ؛

اسی طرح اخلاص فی الدّین عین روح اسلام ہے لیکن اگر یہ لاہوت وناسوت کے اسرار ورموز کی گرہ کشائی ہے تو اس بات میں حسبنا کتاب اللہ واجب العمل اصول ہے قرآن وحدیث صحیح کے ماوراء جو کچھ ہے وہ ایک "فلسفہ" ہے۔ مگر چونکہ اس کے غور وخوض میں اُن حضرات نے حصّہ لیا ہے جو مسلمان تھے اسلئے مشائی واشراقی فلسفہ کی طرح یہ عرفانی فلسفہ بھی اس کا مستحق ہے کہ جب مفکرین اسلام کی گوناگوں تفکیری سرگرمیوں کا جائزہ مرتب کیا جائے تو فلسفیانہ اور عرفانی سرگرمیوں کو بھی اس جائزے میں ان کا مقام دیا جائے البتہ یہ ضروری ہے کہ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہر فکری سرگرمی کے سلسلے میں یہ بتا دیا جائے کہ اسلامی فکر سے پہلے قبل اسلامی مفکرین میں یہ کس شکل میں ملتی تھی؟ پھر کس طرح اسلامی فکر میں داخل ہوئی اور پھر مختلف زمانوں میں مفکرین اسلامی نے اس کی ثروت میں کیا کیا اضافے کئے ؛

بقیہ : امت بننے کی دعوت

ضابطہ ہے۔

دوستو! اپنے کو اس محنت پر جھونک دو کہ حضورؐ کی اُمّت میں اُمّت پنا آجائے اس میں ایمان ویقین آجائے، یہ ذکر وتسبیح اور تعلیم والی، خدا کے سامنے جھکنے والی، خدمت کرنے والی، برداشت کرنے والی، دوسروں کا اعزاز واکرام کرنے والی اُمّت بن جائے نجویٰ نہ کرنے والی، نافرمانی نہ کرنے والی، اپنے بھائیوں اور ساتھیوں کی تحقیر وتمسخر اور تجسّس وغیبت نہ کرنے والی اُمّت بن جائے۔ اگر کسی ایک علاقہ میں بھی یہ محنت اس طرح ہونے لگے جس طرح ہونی چاہئے تو ساری دنیا میں بات چل پڑے۔

اب اس کا اہتمام کرو کہ مختلف قوموں، علاقوں اور طبقوں اور مختلف زبان والوں کو جوڑ جوڑ کر جماعتوں میں بھیجو اور اصول کی پابندی کراؤ پھر ان شاء اللہ اُمّت بننے والا کام ہوگا۔ اور شیطان اور نفس، خدا نے چاہا تو کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔

اس کے بعد حضرت مولانا نے دیہات میں محنت کرنے اور فضا بنانے پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا۔ اور حسب معمول دُعاء پر تقریر ختم ہوئی۔

جناب شمس تبریز خاں

اوقاف کا مسئلہ

وقف اسلامی قانون کا ایک اہم جزو اور مسلمانوں کی ملی زندگی کا ایک روشن رخ ہے۔ مسلمانوں نے ہر دور اور دیار میں اس کار خیر اور رفاہی WEL FARE پروگرام کو رواج دیا ہے۔ وقف صرف محتاجوں اور مفلسوں ہی پر نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ عوامی فائدہ اور رفاہ عام ——— اور سود و بہبود عامہ ——— قسم کی چیز ہوتی تھی۔ اس میں امیر و فقیر کی کوئی تخصیص نہ تھی۔

وقف کی تعریف یہ ہے کہ ملکیت باقی رکھتے ہوئے جائداد کا نفع سب کے لئے یا کسی خاص طبقے کے لئے خاص کر دیا جائے۔ ملکیت باقی رکھنے سے مراد فقط یہ ہے کہ تولیت و نگرانی صاحب وقف کے ذمہ ہوسکتی ہے۔ اور اگر وہ چاہے۔ تو کسی اور کو بھی متولی بنا سکتا ہے مگر وقف کو نہ بیچ سکتا ہے۔ نہ منتقل کر سکتا ہے نہ ہر وہ تصرف کر سکتا ہے۔ جو بحیثیت مالک اس کا حق تھا۔ اب ملکیت اس کے اختیار سے نکل کر خالص خدا کی ہوگئی۔ یہ دوسرے مذاہب میں بھی تھی۔ مگر اسلام نے اسے وسعت دے کر اولاد وغیرہ تک بڑھا دی۔ ۱۹۰۸ء میں گورنمنٹ نے اولاد کے وقف کو جب غلط قرار دیا۔ تو مولانا شبلی نے وقف کی ایک تحریک چلائی۔ اور بالآخر گورنمنٹ کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔ مولانا کا استدلال تھا۔ کہ قرآن نے جہاں کہیں نفقات کا ذکر کیا ہے وہیں ایک حقدار ذوی القربیٰ کو بھی قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ احادیث میں ابوطلحہ نے آنحضور کے مشورے سے بیرحاء اپنے چچازاد بھائیوں اور اقارب پر وقف کیا (بخاری) ایک بار آپ نے صدقات کی تمام مدوں پر اہل و عیال کے خرچ کو ترجیح دی۔ اور فرمایا۔ اعظمہا اجراً الذی انفقتہ علی اہلک (مسلم) اور بخاری میں ہے خیر الصدقۃ ماکان من ظہر غنی وابدا بمن تعول اچھا صدقہ وہ ہے۔ جو عیال کے خرچ سے فارغ ہوکر کی جائے۔ اور شروع عیال سے کرو۔ ام سلمہؓ کو آپ نے اپنے بیٹوں پر صرف کرنے کی اجازت دی۔ اور ثواب کی تصریح کی (متفق علیہ) حضرت ابن مسعود کی زوجہ کو آپ نے شوہر پر خرچ کرنے کی اجازت دی۔ اور دگنے ثواب کی صراحت فرمائی۔ (متفق علیہ، ترمذی، ابن ماجہ، نسائی) میں ہے مسکین کو دینا صرف صدقہ ہے اور اقربا کو دینا صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی، بخاری اور مسلم میں ہے۔ اذا انفق المسلم نفقۃ الیٰ اہلہ وھو یحتسبہا کانت لہ صدقۃ" بغرض ثواب اہل و عیال پر خرچ صدقہ ہے امام صاحب وقف کو صاحب وقف کی ملکیت سے خارج نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن صاحبین کے مسلک پر تمام ائمہ اور علما نے اتفاق کیا ہے اور اسے اجماع کا درجہ حاصل ہے۔ مولانا شبلی نے ان تمام فقہی روایتوں کو نقل کر دیا ہے۔ جن میں مختلف صحابہ اوقاف اور وقف کی نوعیت کا ذکر کیا ہے۔

وقف کی حیثیت کے بارے میں حضرت تھانوی فرماتے ہیں۔ کہ غیر مسلموں کے قبضہ سے بھی اس کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ وہ تو ہمیشہ کے لئے ربانی ملکیت کا جزو ہے خصاف کی کتاب احکام الوقف میں ہے۔ کہ اگر غصب کے بعد متولی کی وقف نے قیمت دے کر بھی وقف واپس لیا۔ تو وہ وقف ہی رہے گا۔ ملکیت نہیں بن جائے گا۔ جیسے غلام مدبّر کو کسی نے غصب کر لیا۔ تو اگر وہ خرید لیا جائے۔ تب بھی مدبر ہی رہے گا (صفحہ ۲۲۱) اسی لئے ہمارے فقہا نے کہا ہے۔ کہ کفار کے غلبہ کے بعد بھی مدبر غلام نہیں بنائے جاسکتے۔ (بحر ۵/۹۷) اسی طرح ہماری عام فقہی کتابوں میں ہے کہ غلبہ کے بعد بھی کفار ہمارے اوقاف کے مالک نہیں ہوں گے علامہ شامی نے لکھا ہے۔ کہ اگر مسجد ویران ہو جائے۔ تب بھی قیامت تک کے لئے وقف ہی رہتی ہے۔ اسے بیچنا یا استعمال میں لانا جائز نہیں۔ البتہ اس کا سامان یا فرنیچر دوسری مسجد میں لگایا جاسکتا ہے، لیکن زمین مسجد ہی کے حکم میں رہے گی۔

وقف عامہ کی صورت میں جیسے مسافر خانہ، مسجد، قبرستان، سبیل جیسی چیزوں سے مستفید ہونے میں امیر و غریب سب برابر ہیں۔ لیکن کسی نے اگر کھیت وقف کیا ہے۔ تو غلہ کے مستحق صرف غریب ہی لوگ ہوں گے۔ امیر اس صورت میں اس کے حقدار ہوسکیں گے۔ جب صاحب وقف نے ان کی صراحت کر دی ہو۔

طرفین کے ہاں وقف کے لئے اس کے ایسے مصارف کی تصریح بھی ضروری ہے۔ جو وقتی اور محدود نہ ہوں۔ بلکہ دائمی ہوں۔ اور امام ابو یوسف کہتے ہیں۔ کہ ہر حال میں وقف دوامی ہی ہوگا۔ طرفین کی دلیل یہ ہے۔ کہ وقف کا مطلب زوال ملکیت ہوتا ہے بغیر تملیک کے اور اس آخری شرط کے لئے دائمی ہونا ضروری ہے یعنی اب کوئی آدمی قیامت اس کا مالک نہیں بن سکتا۔ اس لئے بیع کی طرح اس میں بھی وقت کا تعین باطل ہے۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں۔ کہ دونوں صورتوں میں تقرب الی اللہ حاصل ہے۔ اس لئے جائز ہے۔ ویسے ان کے ہاں بھی وقف دوامی ہوگا۔ اس کا ذکر ہو یا نہ ہو۔ وقف کی نگرانی کے لئے صاحب وقف اور اس کے عزیز و اقارب ہی بہر حال قابل ترجیح ہوں گے۔ جب صاحب وقف کے لوگوں میں کوئی نہ رہے۔ تو قاضی شرعی اس میں دخل دے سکتا ہے۔

اس مسئلہ کے پیش نظر مفتی عزیز الرحمان صاحب مرحوم نے فتویٰ دیا۔ کہ انتظام وقف میں غیر مسلم گورنمنٹ کا دخل جائز نہیں۔ پارلیمنٹ میں ایک بل عرصے سے زیر غور ہے۔ کہ کیوں نہ ہندو مسلم اوقاف کو ایک ہی طرح کے قانون کے ماتحت کر دیا جائے لیکن سکھوں کو اس سلسلہ میں پہلے ہی مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ کہ ان کے اوقاف آزاد رہیں گے۔ یہ سمجھ میں

نہیں آتا۔ کہ جب سکھوں کا الگ نظام وقف گوارا کیا جاسکتا ہے تو سات کروڑ مسلمانوں کے لمبے چوڑے اوقاف کو کیوں نہیں برداشت کیا جاسکتا؟ یہ بھی عقل میں آنے والی بات نہیں کہ وقف کی صحیح نگرانی اور ہمدردانہ انتظام صاحبِ وقف کر سکتا ہے۔ یا سرکاری ملازم ان سب باتوں سے قطع نظر پرسنل لا کے دوسرے مسائل کی طرح وقف اس کا اہم جزء ہے اور اس میں مالی معاملہ اتنا نہیں۔ جتنا دینی اور اخلاقی ہے۔ یعنی وقف کا سارا دارومدار اس بات پر ہے۔ کہ وہ خدا کی ملکیت اور غریبوں اور عوام کا حق ہے۔ اور مسلمانوں کے نقطہ نظر میں اس کے خاص شرائط اور آداب اور اجر و ثواب کی باریک تفصیلات بھی ہیں جنھیں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ورنہ وقف کا مطلب ہی فوت ہو جائے گا۔ حاصل یہ کہ وقف ملت اسلامیہ کے معاشرتی نظام کا ایک حصہ ہے۔ اور ایک مذہبی مسئلہ جس کی تولیت اور نگرانی سے ایک مسلمان ہی عہدہ بر آ سکتا ہے۔ مسلمانوں کے کسی مذہبی رسم و رواج کو اگر کوئی غیر مسلم ادا نہیں کر سکتا۔ نہ وہ مخاطب اس کا محل ہے۔ تو وقف بھی کسی غیر مسلم کے نظم میں نہیں دیا جا سکتا۔ جو اس کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اوقاف اکثر مدرسوں مسجدوں خانقاہوں درگاہوں قبرستانوں اور یتیم خانوں وغیرہ کے لئے ہوتے ہیں۔ ان سب کا تعلق مسلمانوں سے ہوتا ہے۔ اس لئے کسی ایماندار غیر مسلم سے بھی کیسے امید کی جا سکتی ہے۔ کہ وہ کسی اختلاف کے وقت مذہبی نقطہ نظر سامنے رکھے گا۔ اور مسلمان متولیوں سے بہتر انتظام کر سکے گا۔ اور آخری بات یہ عرض کرنا ضروری ہے۔ کہ وقف کرنے والا کسی بے ایمانی کے بعد ہی معطل کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ متولی وہی رہے گا اس کا اختیار کوئی نہیں چھین سکتا۔ اور امام صاحب مسلک پر وقف کی تولیت بھی وراثتاً وارث کے پاس آئے گی۔

دفعہ ۱۱۰ کے تحت وقف کو آزاد رکھا گیا ہے۔ اور سکھ گوردوارے اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ تو مسلمان بھی اس کے مستحق ہیں۔

مولانا انور شاہؒ نے لکھا ہے۔ کہ امام ابو حنیفہ کے عہد میں اقارب سے مراد ہر رشتہ دار ہوتا تھا جس پر وقف کیا جا سکتا تھا۔ اسی طرح وقف سے وقف کرنے والا بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اور امام ابو یوسف کے مسلک پر وقف کے لئے کوئی متولی ہونا ضروری نہیں۔ بلکہ خود وقف کرنے والا بھی نگرانی کے لئے کافی سمجھا جائے گا۔ لیکن امام محمد کہتے ہیں۔ کہ ایک چیز جب ملکیت سے نکل گئی۔ تو اس کا دوسرا کوئی مالک ہوگا۔ دوسرے یہ کہ وہ صدقہ ہے۔ اس لئے قبضہ کرنا ضروری ہے۔ عام احناف کے ہاں ملکیت صاحبِ وقف کی باقی رہتی ہے۔ لیکن صاحبین کا قول یہی ہے۔ کہ ملکیت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔

امام ابو یوسف کہتے ہیں۔ کہ اسے مسئلہ اعتاق پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ کہ غلام پر دوسرے کا قبضہ ضروری نہیں۔ احناف کا مسلک یہی ہے۔ اور امام بخاری نے بھی اس کو اختیار کیا ہے۔ اس طرح امام ابو یوسف کے ہاں مصارف کی تعریج کے کسی نے کوئی وقف کیا تو صحیح ہوگا۔ اس طرح غیر منقسم جائداد کا وقف اگرچہ مختلف فیہ ہے لیکن مسجد کے لئے اگر ہو۔ تو بہر صورت وہ وقف صحیح ہو جائے گا۔

احناف کے ہاں مال غیر منقولہ جائداد وغیرہ کا وقف صحیح ہوتا ہے۔ لیکن منقولہ سامان یا روپے بھی اس کے تابع کر کے وقف میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ وقف کی ملکیت کے سلسلہ میں شاہ صاحب کہتے ہیں۔ کہ صحابہ اپنے اوقاف کے پھر دوبارہ مالک نہیں ہوئے اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وقف ملکیت سے نکلنے کے بعد واقف کی طرف نہیں لوٹ سکتا۔ ہاں صاحبِ وقف کے بعد اس کے وارث اور متولی ہوں گے۔ امام صاحب کا یہی مسلک ہے۔

اور امام ابو یوسف سے روایت ہے۔ کہ وقف کی تولیت وقف کرنے والے ہی کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ خواہ وقف کے وقت اس نے یہ شرط لگائی ہو یا نہ لگائی ہو اور انھیں سے ان کے تلمیذ ہلال الرائے بصری (م ۲۴۵ھ) کی روایت ہے۔ کہ اگر متولی پر بھروسہ نہ کیا جا سکتا ہو۔ تو وقف اس سے لے کر کسی دوسرے کو دیا جا سکتا ہے اسی طرح اگر وہ کسی اور کو والی بناتے ہوئے شرط کرتا ہے۔ کہ یہ وقف اس کی تولیت سے نکلے گا نہیں تو اس کا بھی کوئی اعتبار نہ ہوگا۔ اور شرائط کی خلاف ورزی کرنے پر دوسرا متولی مقرر کیا جا سکتا ہے۔

ایک اور مسئلہ یہ ہے۔ کہ صاحب وقف کی اولاد اگر محتاج ہو تو ان کی خبر گیری دوسرے لوگوں کی بہ نسبت زیادہ بہتر ہے۔ اور اگر وقف کا بعض حصہ فقیر اور بعض اولاد کے لئے خاص کر دیا ہے۔ تو دونوں کو ملایا بھی نہیں جا سکتا۔

اگر وقف میں اپنا حصہ بھی مشروط کرتا ہے۔ تو جائز ہے۔ اور اسے حسب ضرورت بغیر زیادتی کے خرچ کرنا جائز ہے۔

غصب کی صورت میں یہ حکم ہے۔ کہ امام غصب کا تاوان غاصب سے لیا جائے گا اور اگر اس نے اپنی طرف سے اضافہ کچھ کیا ہے۔ تو وقف ہی میں سے اس کی قیمت دی جائے گی۔ اور پھر یہ وقف بحال ہو جائے گا۔

اوقاف کا ختم کرنا یقیناً غلط ہے۔ لیکن اگر وقف کرنے والا وقف کے بہانے سے وارثوں اور دوسرے عزیزوں کو محروم کرنا چاہتا ہے۔ اور اس کی نیت ٹھیک نہیں تو مسلمان ذمہ داروں کو یا اس مسلمان حاکم کو جسے حکومت مقرر کرے۔ یہ اختیار ہے کہ اس وقف کو غلط قرار دے اور حق والوں کو حق دلائے شوکانی کہتے ہیں۔ کہ ہم نے ایسے لاتعداد وقف باطل کئے ہیں۔

نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں۔ کہ وقف کو ضرورتاً بیچا بھی جا سکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ وقف ختم ہو گیا۔ بلکہ اگر وقف کو خطرہ ہو۔ تو اسے فروخت کر کے قیمت اس کے مصالح میں لگائی جا سکتی ہے۔ جیسے کوئی مسجد گر رہی ہے۔ تو اس کا سامان فروخت کرنے کے سوا اور کوئی صورت نہیں۔ تو اس کی اجازت دینا ہوگی۔ یا خود صاحبِ وقف یا اس کی اولاد فقر و فاقہ سے اضطرار اور ہلاکت تک پہنچ جائیں اور وقف کے سوا اور کوئی ذریعہ آمدنی نہ ہو۔ تو سدِ رمق کے لئے بقدر ضرورت فروخت کی اجازت ہوگی۔ ایسے ہی اگر فقر و افلاس حد سے گذر گئے ہوں۔ تو اس کی اجازت دی جا سکتی ہے یا اگر وقف کو بیچ کر کسی دوسرے مناسب اور نفع بخش وقف کی صورت پیدا ہو سکتی ہے تو اسے بھی اپنایا جا سکتا ہے۔ (یہ واضح رہے کہ یہ مسلک شوکانی اور نواب صاحب کا ہے۔ دوسرے مذاہب کا اس سے پورا اتفاق ضروری نہیں)۔

صاحب در کہتے ہیں کہ وقف کی تبدیلی صاحبِ وقف کی شرائط ہی کے مطابق ہوگی ہے اور وہ بھی قاضی کی نگرانی میں متولی کو اختیار نہیں۔ کہ جب چاہے وقف میں تبدیلی کر دے۔ اور ابن عابدین کہتے ہیں۔ کہ اگر وقف بالکل بنجر اور لاحاصل ہو جائے۔ تو اسے

باقی ص۳۶ پر

سیما نظمی

باطل شکن، فاتحِ کوفہ و شام امام ہمام

حضرت زین العابدین علیہ السلام

حضرت امام زین العابدین علیہ السّلام مولائے کائنات حضرت علی علیہ السّلام کے پوتے اور شہید کربلا حضرت امام حسین علیہ السّلام کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ حضرت شہربانو شاہ ایران یزدجرد کی بیٹی تھیں اور ایران پر مسلمانوں کے متواتر کامیاب حملوں میں اسیر ہوکر مدینہ آئی تھیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کو حضرت علیؑ اور اپنی والدہ گرامی حضرت سیدہ فاطمہؑ سے بیحد انس تھا اور اسی بنا پر آپ نے اپنے سب صاحبزادوں کا نام علی اور سب صاحبزادیوں کا نام فاطمہ رکھا تھا۔ حضرت زین العابدین کا نام نامی بھی علی تھا جو شدید بخار میں مبتلا ہونے کے سبب کربلا کی جنگ میں شریک نہیں ہوتے۔

آپ کی ولادت باسعادت مدینہ منورہ میں ۵ رشعبان المعظم ۳۸ھ بروز پنجشنبہ ہوئی دو سال اپنے جدامجد حضرت علیؑ کے آغوش میں پرورش پائی، اس زمانہ میں حضرت ابن عباس جب آپ کو دیکھتے تھے تو "محبوب کے محبوب فرزند" کہہ کر خطاب فرماتے تھے۔ آپ کی ابتدائی زندگی میں زہد و تقویٰ اور عبادت و پرہیزگاری کا وہی ذوق نظر آتا تھا۔ جو خاندانِ رسالتؐ اور خانوادۂ اہلبیت کا طرۂ امتیاز۔

نگاہ مورخ نے آپ کی پہلی جھلک اس وقت دیکھی جب کربلا میں امام حسین علیہ السّلام کے خیام میں آگ لگی اور امام عالی مقام کی ہمشیرہ جناب زینبؑ نے جو کربلا کے مشن کی کامیابی کا عظیم الشان رکن ہیں، بخار میں بے ہوش بھتیجے کو بازو جھنجوڑ کر بیدار کیا اور فرمایا "اے میرے بھائی کی یادگار اٹھو، تم امامِ وقت ہو، بتلاؤ کیا حکم ہے ہم ان جلتے ہوئے خیموں میں جل کر مرجائیں یا خیموں سے باہر نکل کر اپنی اپنی جانیں بچائیں ؟"

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کو اگر امام حسین علیہ السلام سے منصب امامت ملا تھا تو وہ عزم و ارادہ اور صبر و تحمل بھی بیٹے کے دل میں وراثتاً منتقل ہوا تھا جو کربلا کے مجاہد کے ہر قدم میں نظر آتا ہے۔ حسین کے بیمار بیٹے نے جلتے ہوئے بستر پر کروٹ بدلی اور عصائے امامت ٹیک کر آہنی عزم و ارادہ کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ یہاں سے سیدالساجدین کا وہ عظیم الشان کام شروع ہوتا ہے جو باپ نے شہادت کے بعد سپرد کیا تھا۔

ابن زیاد کی بدبخت فوج نے گلے میں بھاری طوق ڈال دیا۔ پاؤں میں دوہری دوہری زنجیریں جکڑ دیں اور ہاتھوں میں مضبوط رسیاں باندھ دیں لیکن اس پیکرِ صبر و تحمل کے ماتھے پر بل نہ آیا جو بیٹا شدت مرض کی بنا پر باپ کے ساتھ شرف شہادت حاصل کرنے سے مجبور رہا تھا۔ وہ لٹے ہوئے حرم کے قافلہ سالار بن کر زندگی کا عظیم الشان جہاد کرتے ہوئے راہ حق میں آہستہ آہستہ بڑھنے لگا اور کروٹیں لیتی ہوئی زنجیروں سے ان نقوش اور نشانوں کو ابھارنے لگا۔ جن میں اسلام کا دھڑکتا ہوا دل تھا اور انسانیت کی تڑپتی ہوئی روح تھی۔

چلنے لگے پہنے ہوئے زنجیر کو عابدؑ
کھینچنے لگے ایمان کے جادہ کے نشاں اور

سیدالساجدین بڑھے اور بڑھتے رہے، کوفہ کا بازار آیا سخت اور شدید منزل لیکن سید سجاد اس باپ کے فرزند تھے جس نے خدا کی راہ میں کڑیل جوان بیٹے کی لاش اٹھائی تھی اور چھ ماہ کے بچے کے زخم گلو سے تیر کھینچ کر خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ وہ صبر و سکون کے ساتھ ان شدید منزلوں کو جھیلتے رہے، ان کے غم کی مدت طویل اور ان کی مصیبت کا زمانہ دراز ہے لیکن وقت کے ساتھ غم کی گردش جتنی تیز ہوتی گئی۔ سید سجاد علیہ السلام کے چہرے کا رنگ اتنا ہی کھلتا گیا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے والے باپ کا فرزند دربار ابن زیاد میں قتل کی دھمکی سن کر مرعوب نہیں ہوتا، وہ اپنی خاندانی شجاعت کی پوری شان اور اپنے گھر کی روایات کی عظمتوں کے ساتھ زنجیروں میں جکڑے ہوئے شیر کی طرح گرج کر جواب دیتا ہے۔

"ابن زیاد تو اب بھی ہمیں موت سے ڈراتا ہے حالانکہ تو خوب جانتا ہے کہ راہ حق میں ہم اس سے نہیں ڈرتے کہ موت ہماری طرف آرہی ہے یا ہم موت کی طرف جا رہے ہیں۔"

یہی ایک فقرہ جو ظلم و ستم کے خوفناک ماحول میں زبان سے ادا ہوا سید سجاد علیہ السلام کی عدیم المثال اور بے پناہ جرأت کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔

حقیقتاً کربلا کی لڑائی کربلا میں ختم نہیں ہوئی، انداز جنگ تو ضرور بدلا لیکن حق و باطل کا یہ معرکہ کربلا کے بعد بھی جاری رہا۔ کربلا میں حسینؑ اور عباسؑ کی تلوار نے آمریت باطل کے

پرچم برداروں کا خون بہایا تھا۔ لیکن جب امام زین العابدین علیہ السلام نے اس جنگ کی ساری اور قیادت سنبھالی تو خون بہانے کا وقت نہیں تھا آل ہاشم کی تلوار میان کے اندر جا چکی اور انداز جنگ بدلنا تھا جو بدلا گیا اور امام زین العابدین علیہ السلام نے ذوالفقار کا نہیں۔ تیغ زبان کا وار کیا جس نے خون نہیں آنسوؤں کا مینہ برسایا۔

لڑائی کا نتیجہ ایک ہی تھا یعنی یہ کہ اسلام زندہ ہوا اور پروان چڑھے لیکن امام زین العابدین علیہ السلام کا یہ زندہ کارنامہ ہے کہ وہ کوفہ جس نے حسینؑ کو شہید کرنے کے لئے فوجیں دی تھیں ایک بار غم اور درد کی تکلیف سے تڑپ اٹھا اور ظلم و ستم، جبر و تشدد اور انصافیوں کے خلاف بغاوت کی وہ بنیاد پڑ گئی جس نے کوفہ میں ابن زیاد کی ولایت اور شام میں یزید کی امارت کا تختہ الٹ دیا۔

الغرض بے پناہ جرأت، استقلال، عزم اور رحمت کے ساتھ امام زین العابدین علیہ السلام ہر منزل پر ناانصافیوں، ظلم اور تشدد کو شکست دیتے رہے، اور بالآخر خود یزید کو بھی قتل حسینؑ سے اپنی بے تعلقی کا یہ اظہار در اصل امام زین العابدین سجاد علیہ السلام کی مظلومیت کا وہ لافانی کارنامہ ہے جس نے "حسین" کی قربانی نے مقصد کی عظمت بھی ثابت کردی اور اسلام کی حقانیت بھی۔ اب خود قاتل قتل کے الزام سے بھاگ رہے تھے۔

صبر و تحمل اور شکر و قناعت کی اعلیٰ صفات عزم و ارادہ کی ناقابل شکست قوت اور عزت نفس کا زندہ احساس رکھنے والوں میں حضرت امام زین العابدین سجاد علیہ السلام کا درجہ بہت بلند ہے اور وہ نہ صرف یہ کہ سیادت کا ایک ایسا سرچشمہ ہیں جس سے نسل علیؑ و بتولؑ کے دھارے پھوٹے بلکہ اُن کی ذات گرامی رشد و ہدایت کا ایک سرچشمہ تھی جس سے اہل علم اور اہل ایمان اپنی تشنگی بجھاتے رہے۔ اور آج بھی ان کی ذاتِ گرامی ظلم و تشدد کے خلاف حق پرستی کا ایک نشان ہے چنانچہ امام زہری اور ابو حازم کہتے ہیں کہ "ہم نے آپ سے زیادہ افضل کسی کو نہیں پایا"۔ علامہ ذہبی اور امام ابن عیینہ کا قول ہے کہ "ہم نے کوئی قریشی آپ سے افضل نہیں دیکھا"۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ "آپ اہل فضل میں سے تھے"۔

آپ کی صداقت و عظمت کا ایک گواہ حجرِ اسود بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب حضرت ابن حنفیہ نے آپؑ کے سامنے دعویٰ امامت کیا تو حضرت امام زین العابدین سجاد علیہ السلام نے حجرِ اسود کو حکم قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر وہ میرے حق میں گواہی دے تو میں امام ہوں اور اگر آپ کے حق میں شہادت دے تو آپ امام ہیں۔ حضرت محمد بن حنیفہ اس امر پر رضامند ہو گئے۔ چنانچہ دونوں حضرات خانہ کعبہ میں تشریف لائے اور حجرِ اسود کے سامنے اپنا اپنا دعویٰ پیش کیا۔ جس نے گواہی دی کہ امام عالی مقام حضرت امام حسین علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے منصب امامت حضرت علی بن الحسین زین العابدین سجاد کو عطا کیا ہے۔ اس گواہی کے بعد حضرت محمد بن حنفیہ اپنے دعویٰ سے دستبردار ہو گئے۔

یہی نہیں بلکہ بلادِ اسلامیہ کے سبھی لوگ آپ کی عزت و عظمت کرتے تھے اور آپ کے علم و فضل کے معتقد تھے جس کے ثبوت میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک بار اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں ہشام بن عبدالملک حج بیت اللہ کے لئے آیا۔ اس سال حاجیوں کی بڑی کثرت تھی۔ چنانچہ وہ مجمع کے سبب حجرِ اسود تک پہونچنے اور بوسہ دینے سے مجبور ہو کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ ایک شخص آرہا ہے اور لوگ آسانی سے اس کے لئے راستہ چھوڑتے چلے آرہے ہیں۔ وہ کسی بھی دشواری کے بغیر آگے بڑھ رہا ہے اور لوگ اس کی تعظیم کر رہے ہیں۔ اس بات پر اسے غصہ آگیا اور لوگوں سے اس نے پوچھا "یہ شخص کون ہے؟" فرزدق نے جو عرب کا مشہور شاعر ہے یہ سن کر حضرت امام علیہ السلام کی مدح میں فی البدیہہ قصیدہ پڑھا (یہ وہ ہیں جن کے قدموں کو مکہ بھی پہچانتا ہے اور خانہ کعبہ اور حرم بھی پہچانتے ہیں)۔ ہشام اس قصیدہ کو سن کر فرزدق سے ناراض ہو گیا اور اس نے اسے قید کرا دیا۔

علم و فضل کے ساتھ حضرت زین العابدین سجاد علیہ السلام بے حد رحم دل بھی تھے کہا جاتا ہے کہ ایک بار آپ کسی راہ گذر سے گذر رہے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک قصاب بکری کو ذبح کرنے کے لئے چھری تیز کر رہا ہے۔ آپ یہ منظر دیکھ کر بے تاب و بے قرار ہو گئے۔ آپ نے پوچھا "کیوں بھائی! تو نے اس بکری کو پانی پلا لیا ہے؟" اس نے جواب دیا: "ابن رسول اللہ! میں نے اس کو پانی پلا لیا ہے"۔ یہ سن کر حضرت امام پر گریہ طاری ہوا۔ آپ نے فرمایا "افسوس کوفیوں نے میرے باپ کو پیاسا ذبح کر ڈالا"۔

اس واقعہ میں اگرچہ اس غم کی جھلک نظر آتی ہے۔ جو امام حسین علیہ السلام کی شہادت کو یاد کر کے ایک بیٹے کے دل میں قدرتی طور پر پیدا ہونی چاہیئے۔ لیکن غم کے پردہ کو اٹھا کر دیکھا جائے تو اس واقعہ کی بنیاد میں وہ جذبہ رحم نظر آئے گا جو رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے کو وراثتاً ملنا چاہیئے تھا۔

سخاوت کے باب میں یہ حال تھا کہ بہ نفس نفیس روٹیوں کا بورا پشتِ مبارک پر لاد کر لے جاتے تھے اور رات کی تاریکی میں اُن لوگوں تک پہونچاتے تھے جو محتاج اور محتاج تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس پیکر قناعت و توکل کے اپنے باورچی خانہ میں جو خود روزہ پر روزہ رکھتا تھا اور روزہ افطار کر کے ایک لقمہ نان سے زیادہ نوش نہ کرتا تھا۔ سو سو بکریاں ذبح ہو دونوں وقت محتاجوں کو تقسیم کی جاتی تھیں۔ اہل مدینہ کا یہ قول بھی تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے کہ جب تک حضرت امام زندہ رہے ہم پوشیدہ صدقہ سے محروم نہ رہے۔

عبادت کا ذوق یہ تھا کہ ایک رات میں ایک قرآن پاک ختم کرتے تھے اور ایک ایک ہزار رکعت نماز ادا کرتے تھے۔ نماز میں استغراق اور محویت کا یہ عالم تھا کہ ایک بار نماز پڑھتے ہوئے پائے مبارک سانپ نے کاٹ لیا اور آپ کو خبر نہ ہوئی، گھر میں آگ لگ گئی اور آپ نماز میں معروف رہے۔ . . . آپ کے صاحبزادے امام محمد باقر کمسنی میں کنوئیں میں گر پڑے اور آپ مشغولِ عبادت رہے۔ سانپ کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ شیطان تھا جو آپ کی نماز میں خلل ڈالنا چاہتا تھا۔ لیکن خدا کے فضل سے آپ محفوظ رہے اور شیطان اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا۔ اُسی روز سے آپ کا لقب "زین العابدین" ہو گیا۔ "صحیفہ سجادیہ" آپ کے وظائف کا مجموعہ ہے جو آئینہ معرفت بھی ہے اور فصاحت و بلاغت کا گلدستہ بھی۔

آپ کی ذاتِ گرامی سے بہت سے معجزے بھی ظاہر ہوئے مثلاً شہدائے کربلا کے دفن کے وقت زندانِ کوفہ سے آکر شرکت کرنا۔ عبدالملک بن مروان کے قید خانہ سے زنجیریں اور بیڑیاں اتار کر زندان کا دروازہ کھلے بغیر خود عبدالملک کے پاس پہونچنا اور

باقی ص۴۳ پر

ادارہ

سیر وسوانح

حضرت شیخ صدرالدینؒ صدر جہاں مالیریؒ

۱۴۳۴ء ——— ۱۵۰۸ء

پنجاب کے یہ عظیم صوفی بزرگ مالیر کوٹلہ کی ایک بڑی درگاہ میں آرام فرما ہیں۔ علاقہ کے ہندو مسلمان اور سکھ اس پیر کو حیدر شیخ یا صدر شیخ کے نام سے جانتے ہیں۔ اور ہزاروں کی تعداد میں عرس میلے جاتے اور سال میں ایکادشی کے موقعہ پر حاضری دیتے ہیں۔ اس مزار پر بلا مبالغہ غیر مسلموں کی بھاری تعداد جمع ہوتی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے۔ کہ اگر صدر شیخ ناراض ہو گئے۔ تو وہ مصائب میں گھر جائیں گے۔ ذیل میں ہم پنجاب کے اس عظیم پیر اور ریاست مالیر کوٹلہ کے بانی کے حالات درج کر رہے ہیں جس سے آپ یقیناً استفادہ کریں گے۔ ادارہ

حسب ونسب

حضرت شیخ صدرالدین عرف صدر جہاں رحمۃ اللہ علیہ ایک افغان نسل بزرگ تھے۔ آپ اور آپ کے والدین افغانستان سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ آپ کی نسل کے ابتدائی حالات کتاب "صدر یار جنگ" میں مختلف کتابوں کے حوالے سے درج کئے گئے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

اکثر مورخین پٹھانوں کی تاریخ حضرت یعقوب کے صاحبزادے یہودا سے ملاتے ہیں۔ جو الیا کے بطن سے تھے۔ اس سے سلسلہ نسب اس طرح چلا شروع اخنوخ، مہلب، تالع بنیس، طالوت، حضرت طالوت کے دو لڑکے برخیاہ اور یرمیاہ ہوئے اول الذکر کو حضرت داؤد نے امور سلطنت اور دوسرے کو فوجی انتظام سپرد کیا۔ پھر برخیاہ کا لڑکا آصف اور یرمیاہ کا افغنہ ہوا۔ جو افغانوں کا مورث اعلیٰ کہا جاتا ہے۔

تاریخ افاغنہ

حضرت خالد نے افغانوں کی ایک قوم کو اسلام کی دعوت دی۔ جو بخت نصر کے حملے کے بعد میں مقیم ہو گئی تھی۔ چنانچہ قیس نام کے ایک سردار اسلام لائے جن کے بارے میں مشہور ہے کہ حضور نے ان کا نام عبدالرشید رکھا۔ اور چونکہ یہ طالوت نسل سے تھے۔ اس لئے انہیں ملک کا خطاب بھی ملا۔ اب فتح مکہ میں یہ حضرت خالد کے ہمراہ تھے۔ اور ان کی بہادری سے متاثر ہو کر آنحضور نے انہیں بیہان کا لقب دیا۔ اور جہاز کے بنیادی تختہ کی طرح بتایا۔ ان کی وفات ۴۱ھ میں بتائی جاتی ہے۔ اور ان کا غور و کابل سے آنا بتایا جاتا ہے۔

(تاریخ گزیدہ و مجمع الانساب)

خان جہاں مصنف "مخزن افغانی" نے بھی قیس کا سلسلہ نسب اس طرح بتایا ہے۔ عام طور پر پٹھانوں کے بانیوں میں شاہ حسین غوری اور کرران کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اور قیس عبدالرشید کی شادی سارہ بنت خالد بن ولید سے بتائی جاتی ہے۔ جن کے ایک لڑکے سربن کے دو بیٹے شرف الدین و خیر الدین ہوئے۔ پہلے کی نسل میں شیروانی، ابدالی، اور درانی پٹھان ہوئے اور دوسرے کے تین فرزند ہوئے۔ کنڈ زمند کاسی مند کی نسل میں یوسف زئی، عثمان زئی، علی زئی، سدو زئی، خضر زئی، محمود زئی، وغیرہ خاندان ہیں۔

فرشتہ نے لکھا ہے۔ کہ افغان قبطی قوم سے ہیں۔ شاہ حسین غوری کی پرورش قیس ہی کے خاندان سے ہوئی۔ اور اس کے دو فرزندوں غلزئی و ابراہیم معروف بہ لودھی سے دونوں نسلیں چلیں۔ اور دوسری بیوی مہی نامی سے شیروانی نام کا لڑکا ہوا۔ لودھی کے بیٹے نیازی سیانی و تانی ہوئے سیانی کے لڑکے بڑھنگی سے زیتوں خیل، عمر خیل ہیں جس میں سلطان بہلول سکندر اور ابراہیم لودھی ہوئے اور دوسرے لڑکے اسماعیل کی نسل میں سور لوحانی پٹھان ہیں۔ لوحانی سے مروت، میا خیل، سی خیل، دوست خیل اور تتور وغیرہ ہیں۔

شیروانی خاندان

شیروانی فیروز شاہ حسین کے تین لڑکے ہوئے۔ سری پال، سینی، بلی پھر سری پال کے تین لڑکے ہوئے۔ جعفری، سوزنی، اور احمد سینی کے پانچ لڑکے ہوئے۔ حسن خیل، ہدیا خیل، ابو الفرح، ایبک، بوبک ان سب سے چند شاخیں نکلی ہیں۔ مگر سب شیروانی ہی کہی جاتی ہیں

عباس خاں شیروانی کہتے ہیں۔ کہ قیس عبدالرشید کے تین لڑکوں سربن عرف ابراہیم بٹن، غور رفشت میں بٹن کی اولاد میں بی بی متو زوجہ سید شاہ حسین سے غلزئی لودی اور شیروانی پیدا ہوئے پھر لودی کی اولاد میں سوری، نیازی، اور لوحانی ہوئے شیروانیوں کا وطن افغانستان کے جنوبی مغربی گوشہ میں کوہ سلیمان کے دامن میں تھا۔ اور یہ ایک ندی در ابن کے کنارے آباد تھے۔ اور لوحانیوں کے قریب ہی رہتے تھے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ ہمایوں کے زمانے ۱۵۳۰ء ۱۵۵۶ء کے درمیان سوریوں نے انھیں ایک لڑائی میں اور پھر یاں خیل، لوحانیوں، اور بختا وریوں کی لڑائی میں جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیا۔ اور ہندوستان کی طرف آگئے۔ ویسے سلطان محمود کی فوج کے ساتھ آنا بھی مستبعد نہیں، شہاب الدین غوری نے قندھار سے ملتان تک پٹھانوں کو خاص طور پر بسایا۔ فرشتہ کے بیان کے مطابق غیاث الدین بلبن کے عہد میں بدایوں کا گورنر ملک فیض شیروانی تھا۔ فیروز تغلق کے زمانے میں خانجہان لودھی بہرام خاں ماقی، ملک قمل خاں شیروانی، اور ملک ببر افغان مشہور تھے۔ محمود تغلق کے وقت میں جون ۱۳۹۷ء میں داؤد خاں نے رہتک میں ایک مسجد بنائی۔ تیمور کی فوج میں ملک یوسف شیروانی کا نام ملتا ہے۔ اس حملے کے دوران شیروانی کول اور جلالی تک چلے آئے تھے۔ پھر جب لودیوں کا ستارہ اقبال طلوع ہوا۔ اور سلطان شاہ دہلی کے بادشاہ سید خضر خاں کی طرف سے ۸۲۰ھ میں سرہند کا عامل مقرر ہوا۔ اور دولت خاں لودھی کو دوآبہ میں حاکم ضلع مقرر کیا۔ بہلول لودھی سلطان شاہ کا داماد تھا۔ ۸۵۵ھ میں جب وہ پنجاب کی مہم پر تھا۔ تو سلطان محمود شرقی نے دہلی پر حملہ کر دیا۔ جسے سکندر خاں شیروانی نے پسپا کیا۔ اسی کے لڑکے عمر خاں نے شیر خاں سوری کو جاگیر دی۔ جس سے سوری حکومت کی بنیاد پڑی۔ بہلول لودھی کے ۳۴ سرداروں میں ایک سردار میاں احمد خاں شیروانی بھی تھے۔ بہلول لودھی ہی کے عہد میں راپڑی ضلع مین پوری میں کچھ شیروانی افراد آباد ہوئے۔ حضرت ذکریا ملتانی رح کے پوتے حضرت رکن عالم ملتانی رح کے مرید صدر جہاں بن شیخ احمد شیروانی کے تقدس کی خبر سن کر سلطان بہلول نے ان سے ملاقات کی۔ اور اپنی دامادی میں لے لیا۔ اور کئی مواضعات جہیز میں دیے۔ جن سے ریاست مالیر بنی۔ اور ان کی چھٹی پشت میں بازخاں ... یا (بیزید خاں) شیروانی نے کوٹلہ بسا کر ریاست مالیر کوٹلہ بسائی۔

(از صدر یار جنگ صفحہ ۲۱-۲۲-۲۳)

حضرت شیخ صدر جہاں کے خاندانی و قدیم نسلی حالات کی تاریخ سابق ریاست مالیر کوٹلہ کے ریکارڈ اور حضرت کے خلفا و سجادہ صاحبان کے پاس بھی ملتی ہے۔ جس کے بعض گوشوں میں اگرچہ اختلاف موجود ہے۔ تاہم مندرجہ بالا اقتباس سے کافی مطابقت ہے۔ اس سلسلے میں جو مزید حالات ہمیں ملے ہیں۔ ان کا متن حسب ذیل ہے۔

شیروانی خاندان کی تاریخ کے سلسلے میں مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ شیخ حسین غوری کے دو بیوی تھیں۔ متو اور موہی، پہلی بیوی سے دو لڑکے غلزئی اور لودھی تھے۔ دوسری بیوی سے شیروانی پیدا ہوئے۔ جو شیروانی خاندان کے بانی ہیں۔
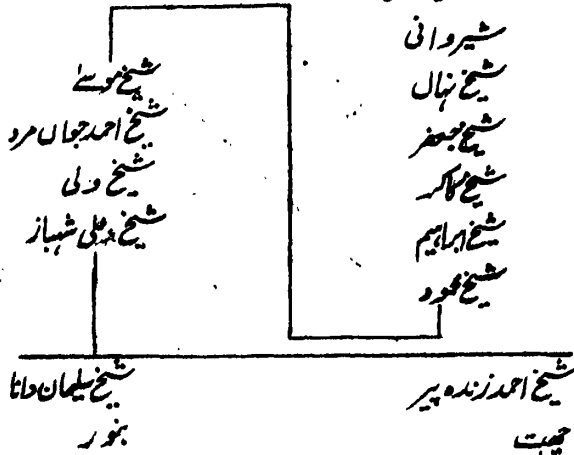
شیخ صدر الدین صدر جہاں مالیری ✤ خواجہ خضر چھپت بانی شیروانی خاندان علی گڑھ

بعض مورخین کا خیال اس طرف بھی گیا ہے۔ کہ شیروانی لفظ شیروان کی مناسبت سے کہا گیا ہے۔ کیونکہ یہ نسلیں شیروان سے نقل مکانی کر کے ہندوستان آئی تھیں۔ مورخین اس بات

۱۔ شیروانی نسل ہندوستان میں بہت بڑی عظمت کی حامل رہی ہے۔ اس نسل کے لوگوں نے پنجاب سے لے کر یوپی مدھیہ پردیش و بہار تک اپنی عظمت علم بلند کئے۔ علی گڑھ میں شیروانی نسل کے بہت سے علمی خاندان موجود ہیں جن کی علمی ملکی اور ملی خدمات پورے ہندوستان میں شہرت رکھتی ہیں۔ خاص طور پر علی گڑھ یونیورسٹی کے علمی و انتظامی معاملات میں اس خاندان کو کافی دخل رہا ہے۔

صدر یار جنگ نواب حبیب الرحمان خاں شیروانی ہندوستان میں ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کی ملی اور علمی خدمات کو ملت اسلامیہ کسی طرح بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ آپ تاحیات ندوۃ العلماء لکھنؤ رکن رہے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے آپ روح رواں تھے۔

کو تو مانتے ہیں۔ کہ ان کی آبادی کوہ سلیمان کے دامن میں کسی دراِبن مقام پر تھی مگر اس بات
پر اختلاف ہے۔ کہ دراِبن قصبہ تھا۔ یا ندی؟ کیونکہ بعض حضرات نے "دراِبن" کو قصبہ کے
بجائے ندی سے موسوم کیا ہے۔ اس لئے یہ بات ترین قیاس ہے۔ کہ اس مقام پر اس نسل
کے وطن کو شیروان کہا جاتا ہو۔ ہم نے اس خاندان کا جو شجرہ دیا ہے۔ اس میں ایک بزرگ
کا نام شیروانی بتایا گیا ہے۔ جہاں تک اس نام کی لفظی و معنوی حیثیت ہے۔ اس حساب سے
شیروانی کوئی نام نہیں ہو سکتا۔ اس میں یائے مناسبت ہے۔ جو قطعی طور پر شیروان کی طرف
نسبت ہے۔ اس لئے اس بات میں زیادہ وزن ہے۔ کہ شیروان کسی مقام کا نام ہے۔
جس سے ان نسلوں کو منسوب کیا گیا ہے۔ بیشتر نسلیں جو ہندوستان میں وارد ہوئی تھیں۔
انھیں غزنی، غوری، خلجی، سوری، لودھی وغیرہ کہا جاتا ہے۔ عین ممکن ہے۔ اس نسل کا خطاب
شیروانی ہو۔

اس نسل کے بہت بڑے بزرگ شیخ علی شہباز وارد ہند ہوئے تھے۔ جو شیخ صدر
جہاںؒ کے دادا ہیں۔ شیخ صدر جہاںؒ کے والد محترم شیخ احمد زندہ پیرؒ اور چچا شیخ سلیمان والا
شہنشاہ دہلی کے ہاں بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ اس بات کی شہادتیں بھی موجود ہیں۔
کہ سابق پٹیالہ ریاست کے قصبات چھت و بنور اور ان کے ملحقہ دیہات حضرت شیخ کے
والد اور چچا کے پاس تھے۔ جہاں ان بزرگوں کی قبریں بھی بتائی جاتی ہیں۔

ولادت

حضرت شیخ صدر جہاںؒ "دراِبن" کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق
آپ کا تولد ۱۴۳۴ء مطابق ۸۴۰ھ بمقام شیروان ہوا۔

اسرار افغانی کے مطابق جس وقت آپ کا تولد ہوا۔ تو گھر میں عجیب قسم کی روشنی
پھیل گئی تھی۔ پیدائش سے قبل آپ کی والدہ محترمہ نے ایک خواب دیکھا۔ کہ ایک شمع روشن
ہوئی۔ اور اس کے بعد وہ کسی دوسری جگہ پر چلی گئی جس کی تعبیر بزرگوں نے بتایا کہ ایک ایسا
بچہ تولد ہوگا۔ جو دوسرے ملکوں میں جا کر اپنا نام روشن کرے گا۔

تعلیم و تربیت

حضرت شیخ صدر جہاںؒ کی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی۔ عربی فارسی کی مزید تعلیم کے
لئے مولانا جمال الدین خراسانی سے زانوئے تلمذ حاصل کیا۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا
یحییٰ شہید ماہی، شیخ ادریس خراسانی، کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ آپ بچپن ہی سے مذہبی انسان
تھے۔ اس لئے آپ نے بہت جلدی روحانی کمالات حاصل کر لئے جس سے پورے افغانستان
میں آپ کی شہرت ہوگئی تھی۔ ان کمالات کی اشاعت کے لئے آپ ہندوستان تشریف
لائے۔

ہندوستان میں ورود مسعود

حضرت کے وارد ہندوستان ہونے کا پس منظر تو غالباً یہی ہے۔ کہ آپ کے بزرگ
پہلے ہندوستان تشریف لا چکے تھے۔ اور اس طرح سے آپ کا تعلق ملک سے ہوگیا تھا
لیکن دوسرا پس منظر یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ ان دنوں غیر ملکی شاہانِ اسلامیہ کے ہمراہ بزرگانِ
دین بھاری تعداد میں وارد ہندوستان ہوتے تھے۔ اور وہ تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے
تھے۔

حیات لودھی میں ہے۔

کہ آپ کو بچپن ہی سے ہندوستان میں آنے والے علماء و سیاح کی سوانح پڑھنے
کا شوق تھا۔ آپ کے اساتذہ کرام نے بھی سیاحی کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ لہٰذا تعلیم سے
فراغت کے بعد اس شوق کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کر کے اپنے وطن شیروان کو براستہ
درہ بہن خیر باد کہہ کر ہندوستان میں قدم رکھا۔ اور یہاں مختلف مقامات کی سیاحت
کی۔

حضرت کے وارد ہونے کے سن کے بارے میں اختلافات ہیں۔ تاریخ ریاست
پٹیالہ نے آمد کا سن ۱۴۶۹ء لکھا ہے۔ تاریخ مالیر کوٹلہ میں ۱۴۶۷ء درج ہے۔ میجر
جنرل سر ہنری واٹسن نے اپنے ایک مقالہ میں ۱۴۵۵ء لکھا ہے۔ حیات لودھی میں ۱۴۴۹ء
لکھا ہے۔ جو زیادہ قابلِ اعتبار ہے۔ کیونکہ اس کتاب میں آپ کی سیرت کے بارے
میں زیادہ مستند معلومات درج کی گئی ہیں۔

۱۴۴۹ء میں آپ پہلی بار ملتان تشریف لائے تھے۔ کیونکہ ان دنوں ہندوستان
میں ملتان علماء و مشائخ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ آپ حضرت شاہ رکن الدین سہروردی ملتانیؒ
کے حلقہ ارادت میں شامل تھے۔ فیوض و برکات حاصل کرنے کے بعد آپ کو حکم ہوا۔ کہ
آپ اپنے مشن کی اشاعت کریں۔

شیخ کا جھونپڑی میں قیام اور بھمسی

شیخ صدر جہاںؒ دریائے ستلج پار کر کے ایک جھونپڑی بنا کر اس میں مقیم ہوئے۔ اس
کے دوسری جانب "بھمسی" نامی گاؤں تھا۔ جو تاج بھیم سین کا آباد کیا ہوا بتایا گیا ہے
بھیم سین مہاراجہ یدھشٹر پانڈو کا بھائی تھا۔

جھونپڑی میں قیام کے دوران شیخ کے روحانی کمالات کی شہرت پورے ہندوستان
میں پھیل گئی تھی۔ ہندوستان کے کونے کونے سے بہت سے عقیدت مند شیخ کی زیارت کے
لئے جھونپڑی پر حاضری دیتے تھے۔ سرہند کے گورنر بہلول لودھی نے بھی حضرت شیخ کی
شہرت سنی۔ وہ بھی حضرت کے دیدار کے لئے آستانہ شیخ پر حاضر ہوا۔ اور اظہار عقیدت
کیا۔

سلطان بہلول لودھی کی حضرت سے عقیدت

حضرت شیخ صدر جہاںؒ سے بہلول لودھی کی عقیدت کے سلسلے میں مختلف واقعات
بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں پہلا واقعہ تو یہی ہے کہ حضرت شیخ جب جھونپڑی میں مقیم تھے
تو آپ کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ بہلول لودھی آپ کے روحانی کمالات کی
شہرت سن کر حاضر ہوا تھا۔ اور عقیدت و دعا کا خواہش مند ہوا۔

دوسرا واقعہ یہ بتلایا جاتا ہے۔ کہ بہلول لودھی مالیر کے مقام پر خیمہ زن تھا۔ کہ

اچانک ندی میں بہت بڑا سیلاب آگیا جس نے سلطان کے خیمے بھی بہا دئے ۔ اور بہت نقصان کیا۔ لیکن اسے اس وقت بڑا تعجب ہوا۔ جب یہ دیکھا کہ حضرت شیخ کی جھونپڑی صحیح سالم کھڑی ہوئی ہے ۔ اس واقعہ سے بہلول لودھی کے دل میں حضرت کی عقیدت زیادہ گہری ہوگئی ۔ وہ دوسرے دن شیخ کے آستانہ پر حاضر ہوا ۔ اور ان سے درخواست کی کہ وہ ان کی جنگ میں فتح وکامرانی کے لئے دعا کریں۔ حضرت نے انھیں خدا کے حکم سے کامیابی کا یقین دلایا۔

تیسرا عجیب وغریب واقعہ وہ ہے۔ جب بہلول لودھی نے حضرت شیخ کو بطور عقیدت ایک عمدہ گھوڑا اور کچھ زر نقد پیش کیا۔ آپ نے گھوڑا ذبح کر کے فقیروں کو کھلا دیا ۔ اور نقدی غریب محتاجوں کو تقسیم کردی ۔ بہلول نے جب یہ سنا تو وہ بہت پریشان ہوا ۔ بادشاہ نے ایک قاصد کے ذریعہ مطالبہ کیا۔ کہ شاہی گھوڑا واپس منگا رہے ہیں ۔ قاصد نے وہاں دیکھا کہ اس جیسے سینکڑوں گھوڑے وہاں موجود ہیں۔ وہ شاہی گھوڑے کو شناخت کرنے میں ناکام رہا ۔ اس نے حضرت سے اپنی ناکامی بیان کی ۔ اس پر حضرت نے آواز دی ۔ کہ شاہی گھوڑا حاضر ہو ۔ چنانچہ یہ گھوڑا خود بخود حاضر ہوگیا ۔ یہ واقعہ حضرت شیخ سے بہلول لودھی کی زبردست عقیدت کا باعث بنا ۔

حضرت شیخ کی شادیاں اور جاگیر

مندرجہ واقعات سے ظاہر ہے ۔ کہ سلطان بہلول لودھی کو حضرت شیخ صدر الدین صدر جہاںؒ سے گہری عقیدت وارادت پیدا ہو چکی تھی ۔ سلطان نے حضرت شیخ سے درخواست کی ۔ کہ وہ ان کی بیٹی کو اپنے نکاح میں لیں ۔

۱۴۵۴ء میں سلطان نے ملتان اور لاہور کی طرف روانگی اختیار کی ۔ وہ راستہ میں بطور عقیدت حضرت شیخ کے آستانہ پر حاضر ہوا ۔ شیخ سے ملاقات کے وقت اس نے دوبارہ درخواست کی ۔ کہ آپ میری لڑکی کو اپنے نکاح میں لیں ۔ چنانچہ بادشاہ بہلول لودھی نے اپنی بیٹی " تاج مرصع بیگم " کی شادی حضرت صدر جہاںؒ کے ساتھ کردی ۔ ۶۹ گاؤں جاگیر میں دیئے ۔ اور تین لاکھ روپیہ سالانہ کی گرانٹ لودھی سرکار کی طرف سے دینا منظور کی ۔ بہلول لودھی نے اپنے دستخط اور مہر کے ساتھ حضرت شیخ صدر جہاں کو یہ جاگیر دی تھی ۔ جس کی اصل سندات ودستاویزات بھی ریاست مالیر کوٹلہ کے سرکاری ریکارڈ میں موجود تھیں ۔ مگر ایک ہم کے موقعہ پر ریاست کا سرکاری ریکارڈ جلا دیا گیا ۔ جس میں یہ تاریخی یادداشتیں بھی تلف ہوگئیں ۔

حضرت شیخ کی ایک اور شادی ۱۴۵۸ء میں رائے بہرام بھٹی حکمران کپورتھلہ کی بیٹی سے ہوئی ۔ کیونکہ حضرت شیخ شمالی ہندوستان بالخصوص پنجاب میں دہلی سلطنت کے بہت قریبی سمجھے جاتے تھے ۔ پنجاب کی ریاستوں کے حکمران آپ کی بے حد عزت کرتے تھے ۔ اس شادی میں بھی بہت سا سامان حضرت کو ملا ۔

مالیر کوٹلہ

جو دیہات حضرت شیخ کو جاگیر میں ملے تھے ۔ یہی ریاست مالیر کوٹلہ کی شکل اختیار کر گئے ۔ ان میں غالباً مالیر کوٹلہ بھی شامل تھا ۔ روایات کے مطابق راجہ مالیر سنگھ نے بھم سی کے نزدیک ایک قلعہ تعمیر کیا تھا جس کا نام مالیر کوٹلہ رکھا ۔ مالیر قصبہ اس قلعہ کے نزدیک واقع تھا ۔ اس لئے جب حضرت شیخ صدر جہاں نے نئی تعمیرات کا سلسلہ قلعہ کے آس پاس کیا تو اس کا نام مالیر ہی رکھا گیا ۔ قلعہ اور اس کے آس پاس کی آبادی ۱۴۶۶ء میں مکمل ہوئی ۔ ریاست مالیر کوٹلہ کے قیام کا مختصر سا پس منظر یہی ہے ۔

حضرت صدر جہاںؒ کا خاندان ہی اس ریاست پر حکمران رہا ہے ۔ جن کو اپنے دور ہائے حکومت میں جنگی مہمات بھی سر کرنی پڑی ہیں ۔

روایت کے مطابق مالیر بستی کو کسی صاحب سنگھ بیدی نے تباہ کر دیا تھا ۔ حضرت شیخ کی چھٹی پشت میں نواب سیف الملک بایزید خاں نے مالیر کو دوبارہ آباد کیا تھا اور باقاعدہ حکومت کی بنیاد ڈالی ۔

حضرت شیخ صدر جہاں سے عوام کو بے پناہ عقیدت اور ارادت تھی ۔ اس کے پیش نظر نواب بایزید خاں نے حضرت صدر جہاںؒ کا مزار تعمیر کرایا ۔ جو آج تک مرجع خلائق ہے ۔

ذیل میں ہم ریاست مالیر کوٹلہ کے حکمرانوں کی فہرست مع عرصہ حکومت نقل کر رہے ہیں جو ریاست کے ریکارڈ سے حاصل کی گئی ہے ۔

نام	از	تا
شیخ صدر الدین صدر جہاںؒ	۱۴۵۴ء لغایت	۱۵۰۸ء
شیخ عیسیٰ	۱۵۰۸ء 〃	۱۵۳۸ء
خان محمد شاہ	۱۵۳۸ء 〃	۱۵۴۵ء
خواجہ مدید خاں	۱۵۴۵ء 〃	۱۵۶۶ء
نواب فتح محمد خاں	۱۵۴۵ء 〃	۱۶۰۰ء
نواب بایزید خاں	۱۶۰۰ء 〃	۱۶۵۹ء
نواب فیروز خاں	۱۶۵۹ء 〃	۱۶۷۲ء
نواب شیر محمد خاں	۱۶۷۲ء 〃	۱۷۱۲ء
نواب غلام حسین خاں	۱۷۱۲ء 〃	۱۷۱۷ء
نواب جمال خاں	۱۷۱۷ء 〃	۱۷۵۵ء
نواب شیخم خاں	۱۷۵۵ء 〃	۱۷۶۳ء
نواب بہادر خاں	۱۷۶۳ء 〃	۱۷۶۶ء
نواب عمر خاں	۱۷۶۶ء 〃	۱۷۸۰ء
نواب اسد اللہ خاں	۱۷۸۰ء 〃	۱۷۸۴ء
نواب عطاء اللہ خاں	۱۷۸۴ء 〃	۱۸۱۰ء
نواب وزیر خاں	۱۸۱۰ء 〃	۱۸۲۱ء
نواب امیر علی خاں	۱۸۲۱ء 〃	۱۸۴۶ء
نواب سکندر علی خاں	۱۸۴۶ء 〃	۱۸۵۷ء
نواب محبوب علی خاں	۱۸۵۷ء 〃	۱۸۷۱ء
نواب ابراہیم علی خاں	۱۸۷۱ء 〃	۱۹۰۸ء
نواب احمد علی خاں	۱۹۰۸ء 〃	۱۹۴۷ء
نواب افتخار علی خاں	۱۹۴۷ء 〃	تاحال

حلقہ ارادت

حضرت شیخ کا حلقہ ارادت بہت وسیع تھا۔ تاہم شاہ دوجان ان کے ایک بڑے عقیدت مند بزرگ تھے جن کا ذکر جیند گزیٹر ۱۹۰۶ء کے حوالہ سے کتابوں میں آیا ہے شیخ صدر جہانؒ نے شاہ دوجان کو جیند میں بھیجا ہوا تھا۔ ان کا انتقال ۱۴۹۴ء میں ہوا۔ جہاں آپ کا مزار مبارک ہے ۔

کرامات

آپ کی مشہور کرامات تو وہی ہیں۔ جو ہم نے بہلول لودھی کی حضرت سے عقیدت کے سلسلے میں نقل کی ہیں ۔ مزید واقعات اس طرح بیان کیے جاتے ہیں ۔

۱۔ حضرت ایک بار تالاب پر وضو فرما رہے تھے ۔ کہ جوتا تالاب میں گر گیا ۔ مریدوں کو بہت پریشانی ہوئی۔ حضرت نے مسکرا کر فرمایا۔ گھبراؤ مت ۔ یہ پانی خود ہی اسے واپس کر دے گا لوگوں نے دیکھا کہ تھوڑی دیر کے بعد یہ جوتا خود ہی کنارے پر آگیا تھا

۲ ۔ ایک بار آپ مریدین کے حلقہ میں بیٹھے ہوئے تھے ۔ کہ ایک افسر کچھ نذرانہ لے کر حاضر ہوا ۔ آپ نے اسے لینے سے انکار کر دیا اور حوض میں پھنکوا دیا تھا تھوڑی دیر میں کیا دیکھتے ہیں۔ کہ اشرفیوں کے بجائے خون کے دھبے پانی میں تیر رہے ہیں ۔ اور شعلے بنتے جا رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ کہ یہ حرام کمائی ہے ۔

تعلیمات

۱۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں۔ کہ خالق سبحانہ کا مجاور رہنا مخلوق کی مجاورت سے احسن و اولیٰ ہے۔ اکابرین دین کے مزارات کا مقصود یہ ہونا چاہیئے۔ کہ توجہ حق سبحانہ کی طرف ہو ۔ اور اس برگزیدہ ہستی کی روح کو خدا کی طرف کمال توجہ پیدا کرنے کا وسیلہ بنایا جائے ۔

۲ ۔ خاموشی تین صفات سے خالی ہونی ضروری ہے۔ خطرات کی نگہداشت یا دل کے ذکر کا مطالعہ جو گویا ہو گیا ہو ۔ یا ان حالات کا مشاہدہ جو دل پر گزرتے ہیں۔

۳ ۔ اہل اللہ کی صحبت میں زیادہ رہنا عقل کی زیادتی کا ذریعہ ہے ۔

۴ ۔ ہر سانس خدا کا ذکر کرو ۔ نہ جانے کب سانس کھنچ جائے ۔ اور پھر تم کو پچھتانا پڑے ۔ کہ ذکر نہ کر سکا ۔

۵ ۔ دو وقت اپنے اوپر پوری نگاہ رکھو ۔ بات کرتے وقت، اور کھاتے وقت ۔

۶ ۔ ایسی زبان سے دعا کرو ۔ جس سے گناہ نہ کیا ہو ۔ تاکہ وہ دعا درجہ قبولیت پائے ۔

۷ ۔ ہر مسلمان کے لئے فرض ہے ۔ کہ یہ علم ضرور حاصل کرے علم ایمان، نماز، روزہ، حج، خدمت والدین و ہمسایہ علم خرید و فروخت و حرام و حلال، ان کے بغیر انسان خراب ہوتا ہے ۔

۸ ۔ آپ عورتوں کو نصیحت فرماتے ۔ کہ تم مردوں کے ساتھ پانچ خصائل کام میں لاؤ ۱۔ دوام عفت ۲ ۔ اظہار کفایت در امور خانہ داری ۳ خاوند کو بنگاہ عزت دیکھنا ۴ ۔ فرمانبرداری کرنا اور ناچاقی سے بچنا ۔ ۵ عشرت میں خوبی کا اظہار

۹ ۔ حضرت فرماتے تھے ۔ کہ نیک عورت محبت و شفقت کے لحاظ سے والدہ کے مشابہ ہے ۔ اور قناعت و خدمت کے لحاظ سے لونڈی کے مشابہ ہے ۔

۱۰ ۔ آپ سے شاہ دوجانؒ نے دریافت کیا ۔ کہ انسانی مقبولیت کے لئے کونسی راہ اختیار کرنی بہتر ہے ۔ آپ نے فرمایا۔ سخاوت و عدالت پر سختی کا پابندی انسان کو مقبول بناتی ہے ۔ اور خدا کے نزدیک پہنچاتی ہے ۔

۱۱۔ آپ نے فرمایا ۔ بے علم کو دوست نہ بناؤ ۔ وہ تمہاری گمراہی کا باعث بن سکتا ہے ۔

۱۲ ۔ حضرت سے دریافت کیا گیا ۔ کہ اشرف المخلوقات میں بہترین نمونہ کون ہے آپ نے بے ساختہ فرمایا کہ فخر انسانیت حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے سوا کون ہو سکتا ہے ۔

۱۳ ۔ دنیا کی ہر ادنیٰ سے ادنیٰ شے خدائے تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کے وجود تقدس کو ثابت کرتی ہے ۔ اس کو نہ سمجھنے والا اندھا، بہرہ، اور کور ذہن ہے ۔

۱۴ ۔ آپ نے فرمایا ۔ کہ درویش اور خدا ترس انسان اپنے بھائی سے بھی زیادہ قابل توجہ ہے کیونکہ وہ شرعی علوم میں آگے ہے ۔ علماء کی قدر کرنا ہر مسلمان کا فرض اولین ہے میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں ۔ کہ تم علماء اور اہل علم کی قدر کرو ۔

وصال

حضرت شیخ صدر جہاں ۱۳ رمضان المبارک ۹۲۱ھ کو صبح نماز کے لئے بیدار ہوئے وضو کیا ۔ نماز سے فارغ ہوئے ۔ حسب دستور حجرہ میں بیٹھے تھے ۔ کہ طبیعت خراب ہو گئی ۔ آپ کو رہائشی حجرہ میں لیجایا گیا ۔ آپ کی طبیعت زیادہ گرتی چلی گئی ۔ آخر آپ اس دار فانی سے رحلت فرما گئے ۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

آپ کی نماز جنازہ کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں ۔ ایک یہ کہ شاہ سکندر نے پڑھائی ۔ شوکت افغانیہ میں ہے کہ شاہ دوجان نے پڑھائی جمع الانساب کے مطابق گو آپ کے بزرگ مولانا عبد القادر خراسانی نے پڑھائی ۔ جو آپ سے ملنے کے لئے تشریف لائے ہوئے تھے ۔

آپ کی تدفین آپ کے عبادت والے حجرہ میں عمل میں لائی گئی ۔ آپ کے خاندان کے دوسرے بزرگوں کے مزارات بھی یہاں موجود ہیں ۔

یادگاریں

بتایا جاتا ہے ۔ کہ آپ کی بعض یادگاریں ابھی تک موجود ہیں ۔ ان میں ایک جوتا، قلمی دستخط، اور خطوط کے علاوہ نہایت خوشخط آیۃ الکرسی والحمد شریف بھی مجاوروں کے

صاحبان کے پاس موجود ہیں ۔ تاریخی روایات سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ صاحب سنگھ بیدی کی مہم کے وقت بہت سی تاریخی چیزیں تلف ہو گئیں تھیں ۔ اور بہت سی یادگاریں حضرت نے پہلے ہی اپنے مریدوں میں تقسیم کر دی تھیں ۔ آپ کی بعض یادگاریں لاہور میوزیم اور پنجاب یونیورسٹی لاہور میں بھی بتائی جاتی ہیں ۔

عرس مبارک

ماہ رمضان المبارک کی ۱۳ ر ۱۴ ر تاریخ آپ کے مزار پر بڑی دھوم دھام سے عرس منایا جاتا ہے ۔ جس میں بہت بڑی تعداد میں مخلوق خدا جمع ہوتی ہے ۔ رات بھر قرآن خوانی، نعت خوانی، اور منقبت خوانی کا سلسلہ رہتا ہے ۔ ۱۴ ۔ کی صبح کو ختم ہوتا ہے ۔ آپ کے عقیدت مند اور مریدین ہند و پاک کے کونے کونے سے تشریف لاتے ہیں ۔ اس موقعہ پر لنگر کا انتظام بھی ہوتا ہے ۔

حضرت کے مزار پہ ہر ماہ چاند کی پہلی جمعرات کے دن بھی میلہ لگتا ہے جس میں بلا امتیاز مذہب و ملت بھاری تعداد میں لوگ جمع ہوتے ہیں ۔ اور عقیدت کے نذرانے پیش کرتے ہیں ۔ شرکا میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہوتی ہے جو ساری رات جاگ کر اپنی مرادیں پوری کرنے کے لئے دعا کرتی رہتی ہیں ۔ ان میں بعض اپنے ہمراہ مہ تینیں بھی لاتی ہیں ۔ جو حضرت کی تعریف میں گاتی اور بجاتی ہیں ۔

بڑا میلہ

ایک بہت بڑا میلہ ایکا دشی کے موقعہ پر عموماً ماہ جون میں لگتا ہے جس میں پنجاب ہریانہ ہماچل کے لوگ کثیر تعداد میں شریک ہوتے ہیں ۔ اس موقعہ پر بھاری اژدہام ہوتا ہے نوجوان مرد و عورتیں اس میلے میں جمع ہوتے ہیں ۔ بازاروں میں اور درگاہ کے آس پاس تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی ۔ اور نکلنا دشوار ہو جاتا ہے ۔ میلے میں غیر مسلموں کی بھاری تعداد ہوتی ہے جو دور دراز دیہات سے چل کر یہاں آتی ہے ۔

یہ لوگ اپنی فصل کے کاموں سے فارغ ہو کر دو دن تک اس میلے میں ناچتے گاتے اور ڈھولک بجاتے رہتے ہیں ۔ پوری رات جاگتے رہتے ہیں ۔ اور چوکی بھرتے ہیں ۔ درگاہ پر آتے ہی سلام کرتے ہیں ۔ اور جب جاتے ہیں ۔ تو سلام کر کے اور حضرت سے اجازت طلب کر کے جاتے ہیں ۔ ان کا خیال ہے ۔ کہ اگر یہ تمام آداب پورے نہ کئے جائیں ۔ تو حضرت ناراض ہو جائیں گے ۔ اور مرادیں پوری نہیں ہو سکیں گی ۔

مزار پر پیش کئے جانے والے نذرانوں میں ہاتھی گھوڑا، اونٹ، بیل، گائے، بھینس، گدھے، بکرے، مرغے، دنبے، کپڑے اناج مٹھائیاں روپیہ پیسے وغیرہ شامل ہوتے ہیں ۔

میلے میں شرکت کرنیوالے دیہاتی حضرت کے زبردست عقیدت مند ہیں ۔ وہ حضرت کے عتاب سے بھی بہت ڈرتے ہیں ۔ اپنی ہر مشکل یا ہر بیماری میں حضرت کے آستانہ پر حاضری دیکر ان سے نجات حاصل کر لینے کا عقیدہ ان کے دلوں میں بیٹھا ہوا ہے ۔ وہ حضرت شیخ کو حدر شیخ یا حیدر شیخ کہہ کر پکارتے ہیں ۔ میلے کا ایسا منظر بہت کم درگاہوں پر دیکھنے کو ملتا ہے ۔

بقیہ: زین العابدین

اس سے کہنا کہ میرے اور تیرے درمیان کونسی عداوت ہے، جو تو نے مجھے قید کر رکھا ہے؟ جانوروں کی زبان سمجھنا اور ایک ہرنی کی فریاد سن کر ایک قریشی سے اس کے بچہ کو رہا کرانا ۔ وضو کے وقت ہاتھوں سے موتیوں، زمرد اور یاقوت کے ٹکڑوں کا گرنا ۔

یہ معجزے تواتر کے ساتھ تاریخ کے صفحات میں بیان ہیں، جو خرق عادات ہیں . . . محیر العقول بھی ہیں ۔ یہ معجزے بے شک آپ کی جلالت شان پر دلالت کرتے ہیں ۔ لیکن فطرت انسانی پر وہ قابو اور وہ اختیار جو آپ نے پایا تھا سب سے بڑی کرامت تھی جو آپ ساری زندگی ظاہر فرماتے رہے اور مسلمانوں کے لئے عمل کا نمونہ بن کر ہدایت کرتے رہے کہ اگر تم حق کے راستہ پر ہو تو میرے پدر بزرگوار کی طرح اپنی جگہ پر کھڑے ہو جاؤ اور ظلم و ناانصافی کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دو ۔ آخری فتح تمہاری ہو گی ۔ چاہے تم مار ڈالے جاؤ یا تمہارا گھر برباد ہو جائے لیکن ایک دن آئے گا جب ظالم کی شکست ہو گی اور مظلوم کی فتح جیو تو عزت کی زندگی جیو اور مرو تو عزت کی موت ۔

یہی، وہ پیغام تھا جو امام عالی مقام امام حسین علیہ السلام نے امام زین العابدین علیہ السلام کو ساری دنیا میں عام کرنے کے لئے دیا تھا ۔ اور بے شک انھوں نے اس پیغام کو ساری دنیا میں عام کر دیا اور اپنے عظیم کام کی تکمیل کے بعد ۱۸ محرم الحرام ۹۴ھ یا ۹۵ھ کو مدینہ منورہ میں وفات پائی اور اپنے عم محترم امام حسن علیہ السلام کے پہلو میں جنت البقیع میں دفن ہوئے ۔ لیکن اب جنت البقیع میں تمام مزارات مقدس منہدم کر دیئے گئے ہیں ۔

آپ کے گیارہ صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں تھیں صاحبزادوں میں یوں تو سب ہی علم و فضل اور جود و سخا میں کامل اور ممتاز تھے ۔ لیکن آپ کی نسل حضرت محمد باقر حضرت زید، حضرت عبداللہ، حضرت حسین اصغر حضرت عمر اور حضرت علی سے چلی اور امامت کی فضیلتیں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کو ودیعت کی گئیں ۔

بشکریہ حسینی آواز

بقیہ: اوقاف کا مسئلہ

فروخت کر کے دوسرے وقف کا انتظام کیا جا سکتا ہے ۔ مفتی عزیز الرحمان صاحب فرماتے ہیں کہ متولی اپنی صوابدید اور وقف کے مصالح کے تحت ان میں تبدیلی و تصرف کر سکتا ہے ۔ شرط یہ ہے کہ روح وقف کے خلاف کوئی کام نہ ہو ۔ اور وقف کی حیثیت میں کوئی فرق نہ آئے ۔ شامی کہتے ہیں ۔ کہ صرف نفع کی زیادتی کی خاطر وقف کو بدلنا اور منتقل کرنا جائز نہیں کیا جا سکتا ۔ وارثوں اور عزیزوں کی حق تلفی نہ ہو حنفیہ کے ہاں بھی وقف کے لئے ایک شرط ہے جس کی خلاف ورزی نہیں کی جا سکتی ۔ جیسا کہ شامی وغیرہ میں تصریح ہے ۔

انیس حسن الدین احمد

خواجہ الطاف حسین حالی

پانی پت دہلی سے جانب شمال پچپن میل کے فاصلہ پر ایک تاریخی مقام ہے۔ اس قدیم بستی میں سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ چلی آتی ہے جو حضرت ابو ایوب انصاری صحابی رسول اللہ صلعم کی اولاد سے ہے۔ شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری پیر ہرات اسی خاندان کے بزرگ گزرے ہیں جن کا سلسلہ نسب حضرت ابو ایوب انصاریؓ تک پہنچتا ہے۔ اہل تصوف کے لئے ان کی تصانیف مایہ ناز ہیں۔ ۱۰۸۸ء میں ان کا وصال ہوا۔

تیرہویں صدی عیسوی میں خواجہ عبداللہ انصاری کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی ہرات سے ہندوستان آئے یہ سلطان غیاث الدین بلبن کا دور حکومت تھا جو قدیم اشراف خاندان کی بہت عزت کرتے تھے۔ اور ان کے فرزند شاہزادہ محمد بھی علماء و شعرا کے حد سے زیادہ قدر دان تھے سلطان نے انھیں چند دیہات پرگنہ پانی پت میں عنایت کئے اور منصب قضاۃ و صدارت و تشخیص بازار و تولیت مزارات بزرگان دین و خطابت عیدین ان سے متعلق کر دی۔ خواجہ ملک علی کا انتقال ۱۳۱۸ء میں ہوا۔ خواجہ ملک علی حضرت امیر خسرو کے ہم عصر تھے۔

والد کی طرف سے خواجہ الطاف حسین حالی اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کی والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی بیٹی تھیں جو سادات شہدا پور کے نام سے مشہور ہیں۔

خواجہ صاحب کے اجداد سلاطین کی طرف سے جو معاشیں عطا ہوتی رہیں ان پر قانع رہے اور کوئی ملازمت اختیار نہیں کی۔ آپ کے والد خواجہ ایزد بخش نے سب سے پہلے سرکار انگریزی کی ملازمت اختیار کی۔

مولانا حالی نے ۱۸۳۷ء میں پانی پت کی معرکہ خیز سرزمین میں جنم لیا۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت زوال سے ہمکنار ہو رہی تھی۔ اور ملک پر انقلاب کی گھٹائیں چھا رہی تھیں مشرقی حکومت تمدن، تعلیم، مذہب غرض ہر چیز تنزل کا شکار تھی۔

آپ کی ولادت کے بعد آپ کی والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا اور جس وقت آپ کی عمر نو سال کی تھی آپ کے والد نے انتقال کیا۔ بھائی بہنوں کی سرپرستی میں خواجہ صاحب کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ اولاً ان کو قرآن شریف حفظ کروایا گیا۔ اس کے بعد آپ نے سید جعفر علی مرحوم سے فارسی پڑھی اور مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری سے عربی صرف و نحو پڑھی۔ ۱۷ سال کی عمر میں آپ کی شادی ہوئی۔ اس کے بعد حصول تعلیم کا شوق آپ کو دہلی لے گیا دہلی کے قیام کے دوران میں غالب مرحوم سے ملنے کا موقع ملا ان کے شعر سن کر غالب نے ان سے کہا تھا۔

"اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے"۔

حالی مرزا غالب کے شاگرد تھے اور ان کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ ایسے سعادتمند شاگرد کم استادوں کو نصیب ہوتے ہیں جن کی وجہ سے استاد کی عظمت و شہرت میں اضافہ ہو۔

دہلی میں تعلیم کا آغاز ہوا ہی تھا کہ عزیزوں اور بزرگوں کے اصرار سے چار و ناچار ۱۸۵۵ء میں پانی پت واپس آنا پڑا۔ اس کے بعد ۱۸۵۶ء میں ضلع حصار میں دفتر کلکٹری میں ایک قلیل تنخواہ کی ملازمت پر آپ کا تقرر عمل میں آیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس کے ظالمانہ ردعمل کا قیامت خیز سانحہ پیش آیا۔ حصار میں بھی سخت واقعات پیش آئے اور سرکاری عمل داری اٹھ گئی تو آپ پانی پت واپس آئے اور چار سال تک پانی پت میں بغیر ملازمت کے گزرے۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات کا ان کے دل و دماغ پر ایسا گہرا اثر پڑا کہ وہ مدت العمر بے چین رہے۔ اس چار سال کے عرصہ میں آپ نے منطق، فلسفہ، حدیث اور تفسیر پر کتابیں پڑھیں اس زمانہ میں نواب مصطفیٰ علی خاں شیفتہ سے شناسائی ہو گئی اور ۷۔۸ برس تک ان کے ساتھ جہانگیر آباد میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ اس باہمی محبت نے شیفتہ کے مذاق شعر و سخن کو جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ کیا اور خود مولانا حالی کے طبعی میلان کو اجاگر کیا۔ شیفتہ شاعری میں مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور سیدھی سادی باتوں کو محض حُسنِ بیان سے دلفریب بنانے کو شاعری کا کمال تصور کرتے تھے۔

نواب شیفتہ کی وفات کے بعد مولانا کو پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ملازمت مل گئی۔ انگریزی سے اردو میں جو ترجمے ہوتے تھے ان کی عبارت کی درستی اور اصلاح کا کام مولانا سے متعلق تھا۔ مولانا نے لاہور میں تقریباً چار سال رہ کر یہ کام کیا۔ اگرچہ مولانا کو انگریزی ادب کی تحصیل کا موقع نہیں ملا تھا مگر اس ۴ سالہ تجربہ کی بنا پر بغیر کسی مغربی زبان کی تحصیل کے وہ مغربی مذاق ادب اور اسلوب سے کماحقہ، واقف ہو گئے تھے۔ مغربی ادب کی روح کو انھوں نے پا لیا تھا اس طرح انھوں نے گویا اردو میں انگریزی ادب کی ترجمانی کی ہے اور اپنے کلام اور تحریر میں مشرق و مغرب کو سمو دیا ہے۔

مولانا کی جو کتاب سب سے پہلے طبع ہوئی وہ "تریاق مسموم" ہے جو ۱۸۶۷ء میں شائع ہوئی۔ یہ پادری عماد الدین کی کتاب "ہدایت المسلمین" کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اسی طرح لاہور میں قیام کے دوران میں مولانا نے طبقات الارض کے فن پر ایک کتاب کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا یہ کتاب اصل میں فرانسیسی زبان میں لکھی گئی تھی اور اس کا ترجمہ

علیگڑھ میں ہوا تھا۔

لاہور میں شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد نے ادبی اصلاح کا کام شروع کیا اور اپنے ارادے کو پورا کرتے ہوئے ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے اہتمام سے ایک مشاعرہ کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا۔ اور جس سے جدید نظم گوئی کا آغاز ہوا یہ مشاعرہ مہینہ میں ایک بار منعقد ہوتا تھا۔ اور اس میں مصرع طرح کے بجائے شاعروں کو عنوانات دیئے جاتے تھے کہ اس مضمون پر جس طرح چاہیں اپنے خیالات ظاہر کریں۔ اس مشاعرہ کا مقصد یہ تھا کہ ایشیا کی شاعری کو جو عشق و مبالغہ سے بھر گئی ہے جہاں تک ممکن ہو سکے وسعت دی جائے اور اس کی بنیاد دقائق اور واقعات پر رکھی جائے۔ مولانا اس مشاعرہ کے صرف ۴ جلسوں میں شریک ہو سکے۔ اور چار نظمیں برکھا رت، نشاط امید، حب وطن اور مناظرہ رحم و انصاف لکھیں۔ ترکیب اور مضمون ہر دو لحاظ سے یہ نظمیں انقلاب آفریں تھیں۔

حالی نے ان نظموں میں مسلسل غزل گوئی اور مثنوی کو ایک خاص انداز سے استعمال کیا ہے اور ان میں کوئی عشقیہ قصہ نظم کرنے کی بجائے باقاعدہ مضمون پیش کیا ہے۔ اس طرح جدید اردو نظم کی ابتدا ہوئی۔

مولانا نے اس کے بعد جو نظمیں لکھیں ان کو مشاعرہ مذکورہ سے کچھ تعلق نہ تھا لیکن اردو نظم کی ابتداء اور تشکیل ہو چکی تھی۔ لاہور سے آکر مولانا اینگلو عربک سکول دہلی کے مدرس مقرر ہوئے یہاں انھیں ۶۰ روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ یہاں آکر بھی انھوں نے بطور خود ایک دو نظمیں اسی طرز کی جس کی تحریک لاہور میں ہوئی تھی لکھی۔

۱۸۷۰ء میں سرسید نے اپنا عظیم الشان اصلاحی کام شروع کیا اور "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ سرسید نہ صرف مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو عام کرنے کا درس دے رہے تھے بلکہ اس کو مسلمانوں کی بقا کے لئے ناگزیر سمجھتے تھے۔ اس تحریک سے حالی کی شاعری کو شعور اور مقصد ملا۔ چنانچہ سرسید نے اینگلو عربک سکول کی مدرسی کے زمانہ میں مولانا کو ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی پستی و تنزل کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو مفید ہوگی۔ خود حالی اس بارے میں لکھتے ہیں۔

"ناگاہ دیکھا کہ ایک خدا کا بندہ جو اسی میدان کا مرد ہے ایک دشوار گزار راستہ میں رہ نورد ہے . . . . قوم کے اس سچے خیر خواہ نے آکر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوان ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا شرم کی بات ہے۔"

چنانچہ مولانا نے ۱۸۷۹ء میں "مسدس مد و جزر اسلام" لکھی جو مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے۔ اس مسدس کو جو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی علی گڑھ کالج کے لئے چندہ جمع کرنے کے لئے جو جلسے ہوتے تھے ان میں مسدس کے حصے پڑھے جاتے تھے۔ خود سرسید نے اس نظم کے بارے میں لکھا ہے۔

"خدا جب حشر میں مجھ سے پوچھے گا کہ
دنیا سے کیا لایا؟ تو میرا جواب یہی ہوگا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں۔"

مولانا نے اس کے بعد اور نظمیں بھی لکھیں جن میں وہ ترکیب بند خاص طور پر قابل ذکر ہے جو مدرسۃ العلوم علی گڑھ پر ۱۸۸۰ء میں لکھا گیا۔

مولانا کی شاہکار نظمیں جس میں انھوں نے عورت کی زبردست حمایت کی ہے "چپ کی داد" اور "مناجات بیوہ" ہیں۔

یہ عورت کی عظمت خدمت اور ایثار کا اعتراف اور اس کی مظلومی کی فریاد ہیں۔

ان نظموں کے متعلق بابائے اردو مولوی عبدالحق نے لکھا ہے۔

"مناجات بیوہ" اور "چپ کی داد" ایسی نظمیں ہیں جن کی نظیر ہماری زبان میں کیا کسی زبان میں نہیں ملتی۔ ان نظموں کے ایک ایک مصرع سے خلوص، جوش ہمدردی اور اثر ٹپکتا ہے۔ یہ نظمیں نہیں دل و جگر کے ٹکڑے ہیں لکھنا تو بڑی بات ہے کوئی انھیں بے چشم نم پڑھ بھی نہیں سکتا۔"

۱۸۷۴ء میں لاہور میں قیام کے دوران میں مولانا نے عورتوں کی تعلیم کے لئے ایک کتاب قصہ کے پیرائے میں "مجالس النساء" کے نام سے لکھی اس کتاب میں ۹ باب ہیں جنھیں حالی نے "مجالس" لکھا ہے۔ ہر باب میں عورتوں کی معاشرتی زندگی سے بحث کی گئی ہے۔ دراصل یہ کتاب مولانا نذیر احمد کی "مراۃ العروس" اور "بنات النعش" سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے اور اس میں ارادی و غیر ارادی طور پر مولانا نذیر احمد کی بنا کردہ روش کی پیروی کی گئی ہے۔ "مجالس النساء" کو دیکھنے ہی سے پتہ چل جاتا ہے کہ حالی کو نثر میں بھی استادانہ درجہ حاصل ہونے والا ہے۔

مولانا نے ۱۸۹۳ء میں شاعری پر ایک مبسوط مقالہ "مقدمہ شعر و شاعری" کے عنوان سے لکھ کر اپنے دیوان کے ساتھ شائع کیا۔ اس مقدمہ نے بلاشبہ اردو تنقید میں ایک نئی مثال اور ایک نیا طرز قائم کیا۔

حالی نے سوچ سمجھ کر اپنی شاعری میں سادگی اختیار کی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ مروجہ اردو شاعری میں مبالغہ اور کذب و افترا حد سے زیادہ ہے۔

کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذب حق نما ہے
یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا

پھر اردو شاعری کے لئے عشق و محبت کے سوا اور موضوع بہت کم تھے حالی نے اسے حقیقی حسن و جمال اور زندگی کا موضوع دیا۔ اپنی شاعری کو مسلمانوں کی حیات نو کا سرچشمہ بنایا بقول محمود اکبر آبادی۔

حالی نے شعری وجاہت و روایت کے کہنہ ایوان ڈھا دیئے اور لفظی شعبدوں کے لات و منات توڑ پھوڑ کر رکھ دئے۔[1]

قدامت پسندوں کو یہ باتیں کب گوارا تھیں۔ جس طرح تحریک سرسید کے خلاف سارے ملک میں زبردست ردعمل ہو رہا تھا اسی طرح حالی کے خلاف بھی ایک طوفان شد و مد کے ساتھ اٹھا لکھنؤ اس کا مرکز تھا۔ اور اودھ پنچ اس مخالفت میں سب سے آگے تھا مولانا حالی نے اپنے مقدمہ میں مصنوعی اور خلاف فطرت شاعری کی جس قدر

---

[1] صحیفہ تاریخ ادب ص ۲۱ اودھ پنچ نے صرف حالی ہی کی مخالفت نہیں کی بلکہ اس کی زد سے داغ اور اقبال بھی نہیں بچ سکے۔

[ن]الیں دی ہیں ان کا کثیر حصہ لکھنو کے شعراء کے کلام سے لیا تھا۔ جس کا لازمی منشاء اودھ [پ]نچ کے نزدیک یہ تھا کہ لکھنؤ کے شعراء کی توہین ہے۔ ان خیالات کا دلوں میں اٹھنا [تھ]ا۔ کہ دیوان اور مقدمہ کے ایک ایک شعر اور ایک ایک سطر پر اعتراضات کی بوچھاڑ [ش]روع ہوگئی۔ [1]

ان اعتراضات کی بنیاد یہ تھی کہ :-

مولانا حالی کی شاعری کا مفہوم غلط ہے

جس کو وہ شاعری سمجھتے ہیں وہ محض قافیہ پیمائی ہے [2]

[غ]رض مسدس حالی کے جواب میں متعدد مسدس لکھے گئے اس کے علاوہ حالی کی ان تمام [ن]ظموں پر بھی اعتراضات ہوتے رہتے تھے جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں وغیرہ [م]یں پڑھے جاتے تھے۔ مخالفین نے ظریفانہ انداز اختیار کر لیا تھا۔

مسدس کی تصنیف اور سرسید کی طرف داری اور رفاقت کی وجہ سے مخالفت اور دشمنی کا ایک زبردست طوفان ملک میں ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا خالی خیالی و نامی جیسے سنجیدہ حریف ان کو زیر کرنے کو اکھاڑے میں آتارے گئے . . . مہینوں بلکہ برسوں ان پر نہایت سوقیانہ الفاظ میں آوازے کسے جاتے رہے۔ جب ۱۸۹۳ء میں دیوان اور مقدمہ شعر و شاعری شائع ہوا تھا تو اس نے پرستارانِ طرزِ قدیم کے خرمنِ عقل و ہوش پر بجلی کا کام کیا۔ وہ اپنے آپ میں نہ رہے۔ اور نہایت خلاف تہذیب اور بازاری الفاظ میں مولانا کو کوسنا شروع کیا۔ دیوان اور مقدمہ کی ایک ایک سطر پر فضول اور لایعنی اعتراضات کی بارش شروع کر دی اور مدتوں نہایت استقلال کے ساتھ اپنے اخلاق کا مظاہرہ کرتے رہے۔ اودھ پنچ لکھنو میں جو سلسلہ اعتراضات ۳۲ مہینہ تک شائع ہوتا رہا۔ اس کا عنوان یہ شعر تھا ؎

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے

میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے [3] مولانا حالی سب کچھ سنتے تھے اور پڑھتے تھے مگر نہایت صبر کے ساتھ برداشت کرتے تھے اور کبھی ایک مضمون بھی آپ نے ایسے لوگوں کے خلاف کسی اخبار میں نہیں لکھا [4]

مخالفت سہنے کا ان میں عجیب و غریب مادہ تھا کیسا ہی اختلاف ہو صبر کے ساتھ سہتے تھے خود کہتے ہیں ؎

کیا پوچھتے ہو کیوں کر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا (حالی)

حالی نے جو شمع روشن کی تھی اس کی حقیقت اور اس کے مستقبل سے وہ واقف تھے۔ ان کے پاس خلوص تھا اور اپنی تحریک کی کامیابی پر یقین تھا۔ چنانچہ انھوں نے پوچ اور اوچھے حملوں کا مقابلہ پر وقار طریقہ پر کیا۔ ان کی اس بردباری نے بالآخر تمام مخالفین کو پسپا کر کے چھوڑا۔ آج اردو ادب پر حالی کا سکہ بیٹھ چکا ہے۔ اور مخالفت کی صدا ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکی ہے۔

مولانا حالی نے "حیات سعدی" کے نام سے فارسی کے مشہور و معروف شاعر کے حالاتِ زندگی مقالے کی شکل میں ۱۸۸۶ء میں شائع کئے۔ اور ان کی نظم و نثر پر تنقیدی نظر ڈالی۔ اسی طرح ۱۸۹۷ء میں مرزا غالب کی سوانح یادگار غالب کے نام سے مرتب کی جس میں ان کی فارسی اور اردو نظم و نثر کا انتخاب شامل کیا۔ و نیز غالب کی شاعری پر تنقید بھی کی۔ ان دونوں کتابوں میں ان کے تنقیدی جوہر خوب کھلتے ہیں۔

جب مارچ ۱۸۹۸ء میں سرسید کا انتقال ہوا تو مولانا نے ان کے حالاتِ زندگی "حیات جاوید" کے نام سے لکھ کر شائع کئے یہ کتاب جو ان کا نثری شہکار ہے۔ واقعات، اسلوب بیان اور فصاحت زبان کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتی یہ اسلامی ادبیات میں پہلی سوانح عمری ہے جو علمی انداز میں لکھی گئی ہے۔ حالی نے ادب کے دو اہم شعبوں یعنی فن سوانح نگاری اور فن تنقید کو اردو زبان میں حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ پیش کیا "حیات سعدی"۔ "یادگار غالب" اور "حیات جاوید" یہ تینوں سوانح عمریاں اپنی خوبیوں کے لحاظ سے بے نظیر ہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ :-

سوانح عمری لکھنے کا علمی ڈھنگ بھی حالی نے نکالا ہے۔ یہ کتابیں لکھ کر انہوں نے بتا دیا کہ سوانح نگاری کے لئے کس وسعت نظر، قوت بیان اور صحیح ادبی ذوق کی ضرورت ہے۔ [5]

جہاں تک تنقید کا تعلق ہے فنِ تنقید ہمارے ادب میں مفقود تھا۔ اس کی بنیاد حالی نے ڈالی۔ اور اس میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ حالی بنیادی طور پر ایک نقاد تھے۔ اب تک ہماری زبان میں ایسا اعلیٰ نقاد پیدا نہیں ہوا۔ ان کی تنقیدی فکر ان کے ادبی کاموں میں سب سے نمایاں نظر آتی ہے۔

۱۸۸۷ء میں جب مولانا اینگلو عربک سکول دہلی میں مدرس تھے، نواب سر آسماں جاہ مدار المہام سرکارِ نظام اثنائے سفر شملہ، علی گڑھ کالج کے ملاحظہ کے لئے سرسید کی کوٹھی میں فروکش ہوئے۔ مولانا بھی اس وقت علی گڑھ گئے ہوئے تھے نواب سر آسماں جاہ نے بہ صیغہ امداد مصنفین ان کے لئے ۷۵ روپئے سکہ عثمانیہ ماہانہ کا وظیفہ مقرر فرمایا جو بعد میں سو روپئے کر دیا گیا۔ اس وظیفہ کی اجرائی میں سرسید کی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔ اس طرح مولانا بڑی حد تک فکر معاش سے مطمئن ہو گئے اور اس وقت سے آپ نے اینگلو عربک سکول دہلی سے علیحدگی اختیار کر لی۔

اِس کے بعد ۱۹۰۵ء میں بھی مولانا حالی اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں مرحوم کی سلور جوبلی میں شرکت کے لئے مدعو گئے گئے تھے۔ اور نظام کلب کے ایک حصہ میں ٹھہرائے

---

[1] گلدستہ پنچ مرتبہ پنڈت کشن پرشاد کومل [2] گلدستہ پنچ [3] اس کے علاوہ حسب ذیل شعر کے تحت بھی اعتراضات کئے جاتے تھے۔ د آبئنہ ہے سب حالت حالی مرے آگے۔ چلنے کی نہیں خام خیالی مرے آگے [4] اسمٰعیل پانی پتی تذکرہ حالی [5] سید محی الدین، سابق صدر کلیہ عثمانیہ اورنگ آباد۔

گئے تھے۔ اس طرح مولانا کی حیدرآباد آمد و رفت کا سلسلہ قائم ہوا اور حیدرآباد کی ادبی محفلوں میں بھی آپ نے وقتاً فوقتاً شرکت فرمائی آپ کے نواسے خواجہ غلام الثقلین بھی کچھ عرصہ گلبرگہ میں صدر مہتمم تعلیمات کی خدمت پر فائز رہے۔

مولانا اپنے آخری ایام اورنگ آباد جاکر خاص خاص علمی اور ادبی کاموں میں گزارنا چاہتے تھے لیکن ان کا ارادہ بارآور نہ ہوسکا۔

حالی کی خدمتِ قوم کا سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک کہ ضعف بصارت وضعف پیری نے انھیں بالکل ہی مجبور نہ کر دیا۔ دسمبر ۱۹۱۴ء میں ۷۸ سال کی عمر میں مولانا نے وفات پائی۔

حالی اردو کے پہلے ادیب اور شاعر ہیں جو نہایت جرأت وہمت کے ساتھ غزل کے تنگ کوچہ سے نکل کر شاعری کے دوسرے وسیع میدانوں میں نکل آئے۔ اور عہدِ جدید کی ترجمانی کرتے ہوئے ہماری شاعری کا رخ بدل دیا۔ انھوں نے سب سے پہلے قومی اخلاقی اور حکیمانہ شاعری کا آغاز کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا حالی جدید اردو شاعری کے بانی ہیں۔

حالی کے اسلوب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو اپنی تحریروں میں دخیل ہونے نہیں دیتے۔ بہ قول ڈاکٹر زور۔

> حالی نے ہرجگہ اپنے کو چھپانے کی کوشش کی ہے جس قدر ان کی تحریریں غیر شخصی ہیں ان کے ہم عصروں میں سے کسی کی نہیں۔

مولانا نے کبھی جاہ وجلال کی ہوس نہیں کی۔ ہر حال میں قانع رہے وہ کمزور اور بے بسوں کے زبردست حامی تھے۔ انھوں نے خاص کر عورتوں کی زبردست حمایت کی اور ان کی پستی اور زبوں حالی کی طرف توجہ دلائی۔ حالی کے ہندوستانی عورت پر بے شمار احسان ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ:

> "ہندوستانی عورت حالی کے احسانات سے کبھی سر نہ اٹھا سکے گی" [۱]

مولانا ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ تعصب ان میں نام کو نہ تھا۔ ہر ایک سے یکساں خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے۔ اور بڑے شگفتہ مزاج اور خوش طبع تھے۔

> "مولانا حالی کی سیرت دو ممتاز خصوصیتیں تھیں۔ ایک سادگی اور دوسری دردِ دل اور یہی شان ان کے کلام میں ہے ان کی سیرت ان کا کلام ایک ہے" [۲]

ان میں خلوص، ہمدردی، محبت اور انکسار کی صفات خاص طور پر نمایاں تھیں۔

مولانا حالی نے زندگی کے ہر شعبہ میں بے جا تقلید اور بے سروپا وضعداری کی شدت کے ساتھ مخالفت کی۔ وہ انگلوں کی تقلید کو مسلمانوں کے لئے نقصان دہ تصور کرتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

> "اے مسلمانو! تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ جو شئے تم کو ابھرنے نہیں دیتی وہ کیا ہے؟ اور جس کے سبب تم جنبش نہیں کر سکتے وہ کون سی بندش ہے؟ یاد رکھو وہ تمہاری بیہودہ تقلید ہے جس نے تم کو مذہبی امور ہی میں مجبور اور بے اختیار نہیں کیا بلکہ تجارت میں، زراعت میں، علم و ہنر میں، حرفہ اور پیشہ میں، غرض ہر کام میں تمہاری عقلوں پر پردہ اور ہر راہ میں تمہارے پاؤں میں بیڑی ڈال رکھی ہے۔" [۳]

حالی نے سرسید کے متعلق "حیاتِ جاوید" کے آخر میں جو لکھا ہے وہ خود ان پر بھی صادق آتا ہے۔

> جب تک زندہ رہا اپنے ہاتھ پاؤں، زبان، قلم جان اور مال سے ان کی (مسلمانوں کی) مدد کرتا رہا، اور جب مرگیا تو اپنی ہمت اور اپنے کام کی عظمت کا نقش لوگوں کے دلوں میں یادگار چھوڑ گیا تاکہ ان کی بھلائی کا کام جو اس نے ادھورا چھوڑا ہے اس کو سنبھال کر پورا کریں۔"

نعت

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا   مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا   وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ
خطا کار سے درگذر کرنے والا   بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا   قبائل کا شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
مسِ خام کو جس نے کندن بنایا   کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا   پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
ادھر سے ادھر پھر گیا رخ ہوا کا
وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی   عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگا دی   اک آواز میں سوتی بستی جگا دی
پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

"حالی"

---

[۱] محترمہ صالحہ عابد حسین [۲] مولوی عبدالحق [۳] اقتباس از مضمون زمانہ۔

مسدس حالی

تعصب

تعصب کہ ہے دشمنِ نوعِ انساں
بھرے گھر کئے سینکڑوں جس نے ویراں
ہوئی بزمِ نمرود جس سے پریشاں
گیا جس نے فرعون کو نذرِ طوفاں
گیا جوش میں بولہب جس کے کھویا
ابوجہل کا جس نے بیڑا ڈبویا

وہ یاں اک عجب بھیس میں جلوہ گر ہے
چھپا جس کے پردے میں اس کا ضرر ہے
بھرا زہر جس جام میں سر بسر ہے
وہ آبِ بقا ہم کو آتا نظر ہے
تعصب کو اک جزوِ دیں سمجھے ہیں ہم
تعصب کو خلدِ بریں سمجھے ہیں ہم

ہمیں واعظوں نے یہ تعلیم دی ہے
کہ جو کام دینی ہے یا دنیوی ہے
مخالف کی ریس اس میں کرنی بری ہے
نشاں غیرتِ دینِ حق کا یہی ہے
مخالف کی الٹی ہر اک بات سمجھو
وہ دن کو کہے دن تو تم رات سمجھو

قدم گر رہِ راست پر گر اس کا پاؤ
تو تم سیدھے رستے سے کترا کے جاؤ
پڑیں اس میں جو دقتیں وہ اٹھاؤ
تمہیں جس قدر ٹھوکریں اس میں کھاؤ
جو نکلے جہاز اس کا بچ کر بھنور سے
تو تم ڈال دو ناؤ اندر بھنور کے

اگر مسخ ہو جائے صورت تمہاری
بہائم میں مل جائے سیرت تمہاری
بدل جائے بالکل طبیعت تمہاری
سراسر بگڑ جائے حالت تمہاری
تو سمجھو کہ ہے حق کی اک شان یہ بھی
ہے اک جلوۂ نورِ ایمان یہ بھی

نہ اوضاع میں تم سے نسبت کسی کو
نہ اخلاق میں تم پہ سبقت کسی کو
نہ حاصل یہ کھانوں میں لذت کسی کو
نہ پیدا یہ پوشش یہ زینت کسی کو
تمہیں فضل ہر علم میں بر ملا ہے
تمہاری جہالت میں بھی اک ادا ہے

کوئی چیز سمجھو نہ اپنی بری تم
نہ ہو بات کو اپنی کرتے بڑی تم
حمایت میں ہو جب کہ اسلام کی تم
تو ہر بدی اور گنہ سے بری تم
بدی سے مومنوں کو مغفرت
تمہارے گنہ اور اوروں کی طاعت

مخالف کا اپنے اگر نام لیجئے
تو ذکر اس کا ذلت سے خواری سے کیجئے
کبھی بھول کر طرح اس میں نہ دیجئے
قیامت کو دیکھو گے اس کے نتیجے
گناہوں سے ہوتے ہیں گویا مبرا
مخالف پہ کرتے ہو جب تم تبرا

نہ سنی میں اور جعفری میں ہو الفت
نہ نعمانی و شافعی میں ہو ملت
وہابی سے صوفی کی کم ہو نہ نفرت
مقلد کرے نا مقلد پہ لعنت
رہے اہلِ قبلہ میں جنگ ایسی باہم
کہ دینِ خدا پہ ہنسے سارا عالم

کرے کوئی اصلاح کا گر ارادہ
تو شیطان سے اس کو سمجھو زیادہ
جسے ایسے مفسد سے ہے استفادہ
رہِ حق سے ہے برطرف اس کا جادہ
شریعت کو کرتے ہیں برباد دو لوگ
ہیں مردود شاگرد و استاد دونوں

حالی دا مسدس

> پنجاب نوں ایس گل دا وڈا فخر اے کہ سر شہاب الدین ہوراں نے خواجہ الطاف حسین حالی دی مسدس نوں پنجابی بولی دا روپ دِتا اے۔ اسی ایدا نمونہ اوقاف دے قاریئن لئی پیش کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

تعصب

پچھے دین دے کھوہنیاں گالیاں نے گھراں وسیاں نوں، اُجاڑ دتا
پرے اوس، نمرود، دی، توڑ دتی کانگ وِچ فرعون، نوں، واڑ دتا
ابوجہل دا، ڈوبیا، اوس بیڑا
اوہدی، اگ، بولہب، نوں ساڑ دِتا
ایہو، پکھ وِٹا کے، بھیس، پھر دا ویری رکیا، نہ پچھانے، آں
چھناں موصرے نال موہنہ تیک بھریا اسیں آب حیات پئے جاننے آں
بھانے ساڈڑے پکھ بن، دین ناہیں
اسیں نرک نوں سُرگ سیاننے آں
ساتوں، عالماں، اِہ سکھایا، اے جنتے، کم نے وِچ، جہان، یارو
کرو ریس نہ کدے، وی دشمناں دی اِہو دین، دی، انکھ تے، آن یارو
متوں گل نہ ٹھیک، جو کہے دشمن،
آکھے دیہوں نے رات، لئو جان یارو
سِدھے راہ بجے چل دا، اوہ، دِسے تُسیں راہ، نوں چھڈ، کراہ جاؤ،
اہدے وِچ جو اوکڑاں پین سہہ لئو ٹھیڈے، ٹھوکراں، لکھ، ہزار کھاؤ
اوہدا لنگھ جہاز بجے جائے بھوتی
تُسیں وِچ، گُمن بیڑی، جا پاؤ

بدل جے تُساڈڑی جائے صورت جائیے ہو جے خو حیوان ، دی ، جی
طبع ہور وی ہور جے ہو جائے رہے گت نہ جے اِنسان دی ، جی ،
تُسیں اِہ وی رب دی شان سمجھو
متوں ایس نوں جھلک ایمان دی جی

تُساں وانگ نہیں دوسرا کوئی بندا جیہی خودا ، ہور انساں ، ناہیں
کھانے نہیں سواد نے تُساں جیہے تُساں نال وی آن تے بان ناہیں
تُسیں طاق ہو ساریاں وِچ علماں
تُساں مور کھو آن تے کان ، ناہیں

کوئی چیز نہ آپنی ، بُری ، جانو ، اُچّی ، آپنی ، گل رکھاؤندے ، او
واہرو ہو جے دین دے تُسیں جاؤ چھُٹّ عیب تے پاپ تھوں جاوندے او
بدی آپ دی ، ہور دی بندگی ، نہ
تُسیں بھیڑ تھوں خوف نہ کھاوندے نے

ویری آپ نے دا جے ، نال آوے او ہنوں سو صلوات سُناوندے او
چھڈّ وچھل کے نہ اہ بری ، وادے نفع ویکھنا ، انت کیہہ پاوندے او
تُسیں پا کے لعنتاں دوجیاں ، نوں
بھاویں آپ نے پاپ گواوندے او

آوازار وہابیوں ، رہے ، صوفی شیعاں سنّیاں وِچ پیار ، ناہیں
منّے نہ امام جو ، لعنتی ، اے ، شافی ، جاندے ، حنفیاں یار ناہیں !
کعبہ اِکّ تے پھیر دی رہن لڑدے
کھِلی جنگ اے مار دا عار ناہیں

لگّے عیب نوں کرن جے ٹھیک کوئی کہوا وہ اُستاد شیطان ، دا ، اے
جیہڑا شخص کوئی اوہدے مگر لگّے آکھو اِ بھلّیا ، راہ ایمان دا ، اے
ہووَن رَتّے استاد شاگرد دونویں !!
اِہناں ڈوبیا دِین جہان دا اے !!

پروفیسر محمد مجیب

بدھ مت

پروفیسر محمد مجیب ملک کے ایک ممتاز محقق قلم کار ہیں۔ آپ نے تو ہندوستانی تمدن کے سلسلے میں بدھ دھرم کا تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ چونکہ مختلف مذاہب کی تعلیمات کا تقابلی مطالعہ ضروری ہے۔ اس لئے مناسب سمجھا گیا ہے۔ کہ یہ قیمتی مقالہ قارئین کی نذر کردیا جائے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اسے پسند فرمائیں گے۔ ادارہ

پس منظر

شروع کے اپنشدوں کی تعلیم اور آتما برہما کا چرچا عالموں اور علم دوستوں کے حلقوں تک محدود تھا مگر وہ ذہنی بیداری جس کی یہ علامتیں تھیں۔ بہت زیادہ پھیلی ہوئی تھیں۔ روشن خیال لوگ اس پرانے طریقے سے مطمئن نہیں رہے تھے۔ جس میں عبادت کا مقصد یہ تھا کہ انسان خوشی اور تندرستی کامیابی اور حکومت حاصل کرے۔ اور جس میں روحانی زندگی کی کل کائنات یہ تھی۔ کہ انسان دیوتاؤں کی تعظیم کرکے یا تپسیا کے ذریعہ انھیں قابو میں کرے اور ان سے اپنی خواہش پوری کرائے۔ لوگ محسوس کرتے تھے کہ روحانی زندگی اپنے الگ مقاصد رکھتی ہے۔ ان کی مذہبیت خارجی دنیا میں سہارے ڈھونڈنے کے بجائے دل کی دنیا میں تسلی کا سامان تلاش کرنے لگی تھی۔ اس طرح ایک بڑا ذہنی انقلاب عمل میں آیا۔ روایتی مذہب کی قدر کم ہوگئی۔ ویدوں کے تقدس کا عقیدہ، جس پر روایتی مذہب کا مدار تھا۔ کمزور ہوتا گیا۔ اور انسان و کائنات کے وجود کے سرچشمہ تک پہنچنے کا حوصلہ کیا جانے لگا۔ اس شوق و جستجو کے مقابلہ میں روزمرہ زندگی کے مشاغل بہت حقیر معلوم ہونے لگے۔ دنیا بے حقیقت ہوگئی۔ اس کی ہر نعمت ایک دھوکہ اس کی ہر تکلیف نادانی اور گمراہی کی سزا ٹھہرائی جانے لگی اور اس دنیا کے دکھ درد سے نجات پانے کا مسئلہ منظر عام پر آگیا۔ جیسے پانی پہاڑ کے سینے سے پھوٹ کر نکلتا ہے۔ ہر چشمہ ادھر بہتا ہے۔ جدھر زمین نیچی ملتی ہے۔ اور آخر میں کئی کئی چشموں کے ملنے سے دریا بنتے ہیں۔ ویسے ہی قدیم ہندوستان میں حق کی تلاش اور نجات کی آرزو اوہام پرستی اور حیوانی سکون کے بھاری پردوں کو چاک کرکے نکلی۔ اور لوگوں کو ان کے طبعی میلان کے مطابق ادھر ادھر لے جاتی رہی مگر چند شخصیتیں بھی پیدا ہوئیں۔ جن کے اور بہت سے میلانات اور عقائد مجسم اور ہم آہنگ ہوگئے جن کی تعلیم نے فکر اور عمل کے وہ میدان فراہم کئے۔ جو انسانوں کو پہلے نصیب نہ تھے۔ اور جنہوں نے زندگی کو اس طرح ایک ڈھرے پر لگا دیا جیسے دریا بھٹکتے ہوئے چشموں کو۔ ان قدیم رہنماؤں میں سب سے بڑی ہستی گوتم بدھ کی ہے۔

ان کے مذہب نے دوسروں کے مقابلوں میں بہت زیادہ فروغ پایا۔ اس وجہ سے ان کے زمانے کے اور ان سے پہلے کے رہنماؤں کی شخصیتیں ماند پڑ گئی ہیں۔ لیکن دینی روایات سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اس دور میں کئی ایک رہنما پیدا ہوئے۔ جن میں سے کسی نے ایک نیا عقیدہ یا نیا نظریہ رائج کیا۔ کسی کی یادگار صرف اس کی علمی یا روحانی عظمت ہے۔ گوتم بدھ سے کوئی دو سو برس پہلے یادو قبیلہ کے گرد واسدیو کرشن تھے جنہوں نے اس مذہب کی بنیاد ڈالی۔ جو بعد میں وشنو کہلایا۔ جین مت کے بزرگ وردھمان ...... مہاویر تھے۔ ذہنی بیداری اور بڑی شخصیتوں کا نمودار ہونا اس زمانے کے ہندوستان کی مخصوص صفت نہیں تھی۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ چین میں کنگ فیوٹے (کون فوشیس) ایران میں زرتشت، یونان میں فیثاغورث، سولن اور سقراط اسی دور میں پیدا ہوئے۔ اور اس طرح قریب قریب ساری دنیا میں بڑی بڑی اور اصلاحی تحریکوں کی ابتدا ہوئی یہ علامتیں تھیں اس کی کہ نوعِ انسانی ترقی کی ایک نئی منزل پر پہنچی ہے۔ اور اس کے نئے احساسات اور نئی روحانی ضروریات کے لئے مناسب زندگی کی نئی تشکیل لازمی ہوگئی ہے۔ دراصل اب انسان کا اخلاقی حس بیدار ہوا تھا۔ اور وہ محسوس کرنے لگا تھا۔ کہ اپنے دکھ اور سکھ، اپنے ارادے اور عمل اپنی تباہی اور نجات کا وہ خود ہی ذمہ دار ہے۔ اس لئے اس کے مذہب کو اخلاقی نصب العین کا حامل ہونا چاہئے۔ اور اس نصب العین کو پورے طور پر انفرادی اور اجتماعی زندگی پر حاوی ہونا چاہئے۔

ہندوستان میں اس ضرورت کو گوتم بدھ نے سب سے زیادہ واضح طور پر محسوس کیا۔ اور ان کی تعلیم کی بدولت ترقی کی بہت سی راہیں کھلیں۔ لیکن ایسی شخصیتیں جیسی کہ گوتم بدھ کی تھی۔ آپ ہی آپ کوئی نئی دنیا نہیں بنا دیتی ہیں۔ بلکہ اس مسالے سے جو انھیں موجود ملتا ہے۔ نئی زندگی کی تعمیر کرتی ہیں۔ بدھ مذہب کا سلسلہ اس زمانے کے اور اس سے پہلے کے قریب قریب تمام معقول اور معروف دینی اور فلسفیانہ تصورات سے ملتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے تہذیبی حالات سے بھی متاثر ہوا۔ اس لئے مناسب ہے

کہ اس پر بحث کرنے سے پہلے ہم اس وقت کے عام عقائد اور معاشرتی حالات پر نظر ڈال لیں۔

آتما اور برہما کی وحدت کا نظریہ برہمن علمار کے غور و فکر کا نتیجہ تھا۔ اور اگرچہ اس کے ساتھ یہ کہا جاتا تھا۔ کہ اس کی حقیقت ہر اس شخص پر ظاہر ہو سکتی ہے۔ جسے وجدان صحیح حاصل ہو۔ لیکن اس نظریہ کے ماننے والوں میں خالص علم کی خاص قدر تھی۔ وہ سب کو علم کا حقدار نہیں سمجھتے تھے۔ اور تہذیب نفس کے ان طریقوں کو جن کے ذریعہ وجدان صحیح پیدا کیا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے خاص حلقوں تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ برہمن علمار اور اس اصول زندگی کو جسے ہم برہمنیت کہہ سکتے ہیں۔ گنگا جمنا کی وادی کے مغربی حصے میں اقتدار حاصل تھا۔ اور اس علاقہ کی آبادی کے سوا اور تمام لوگ خواہ وہ برہمن ہی کیوں نہ ہوتے کمتر سمجھے جاتے تھے۔ وہ نہ اس قابل تھے۔ کہ ان سے میل جول رکھا جائے۔ نہ اس لائق کہ انھیں صحیح اور اعلیٰ علم سکھایا جائے۔ برہمن ذات کی فضیلت بھی جس طرح یہاں مانی جاتی تھی۔ اور کہیں تسلیم نہ کی جاتی۔ وحدت کے اس نظریے کی ضد اور غالباً اتنا ہی پرانا یہ نظریہ تھا کہ پرش اور پراکرتی یعنی روح و مادہ دونوں ابدی ہیں۔ اور وجود ان دونوں کے اتصال کا نتیجہ ہے۔ یہ نظریہ سانکھیا فلسفے کا بنیادی اصول ہے جس کی تکمیل گوتم بدھ کے زمانے کے بعد ہوئی لیکن یہ خیال بہت پہلے کا ہے۔ کہ روح مادے میں گرفتار ہوتی ہے۔ اور اسے آزاد کرانے کا صحیح طریقہ ہے۔ کہ ہم مادے کی صفات کو معلوم کریں۔ اور مادے پر قابو پاکر روح کو نجات دلانے کی تدبیر کریں یہ خیال بھی گوتم بدھ سے پہلے کا معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان کے احساسات اور تصورات کا تعلق اس کی روح سے نہیں ہے بلکہ یہ مادے کی بدلتی ہو دنیا کے مظاہر ہیں۔ سانکھیا فلسفے کے ان بنیادی اصولوں سے ملتی جلتی جوگ کی تعلیم تھی جس میں یہ فرض کر لیا گیا تھا۔ کہ نجات کے معنی روح کو مادے کی قید سے آزاد کرنا ہے۔ اور اس کی بنا پر جسم نفس اور ذہن کو قابو میں کرنے کی عملی ترکیبیں بتائی جاتی تھیں۔ گوتم بدھ کے زمانے میں یہ عام طور پر مانا جاتا تھا۔ کہ ریاضت کے ذریعہ نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ اور اس کا بھی سب کو یقین تھا۔ کہ انسان کو جسم پر قابو پانے کے صحیح طریقے معلوم ہوں۔ تو وہ چاہے تو پانی پر چل سکتا ہے۔ چاہے تو ہوا میں اڑ سکتا ہے۔ وہ یہ بھی کر سکتا ہے۔ کہ اپنے اوپر مسلسل وجد کی کیفیت طاری کر لے۔ اور اس طرح مادی زندگی کی بندشوں سے آزاد ہو جائے۔ سانکھیا جوگ اور اپنشدوں کی تعلیم میں کرم اور تناسخ کے عقیدے مشترک تھے۔ اور ان کے اور عوام کے تصورات کے درمیان ایک کڑی سی بن گئے تھے۔ کرم سے مراد ایک قانون تھا جس کے مطابق کائنات کا کام چلتا ہے۔ اور دیوتا ہو یا انسان کوئی اس کے عمل سے مستثنیٰ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یہ عقیدہ ہمیں ایک شاعرانہ خیال کی صورت میں رگوید میں ملتا ہے۔ برہمنوں نے چڑھاوے اور پوجا اور منتر کی قدر اور اہمیت کو بڑھانے کے لئے دعویٰ کیا۔ کہ مذہبی رسموں سے متعلق ہر فعل اپنا خاص اثر رکھتا ہے اور یہ رسمیں بالکل صحیح طریقے پر ادا کی جائیں تو ناممکن ہے کہ انہیں ادا کرنے والے کا مطلب پورا نہ ہو۔ رگ وید کے شاعرانہ تصور اور مذہبی پیشواؤں کے کاروباری اشتہار نے مل کر آہستہ آہستہ اس عقیدے کی شکل پائی۔ کہ کرم یعنی عمل کا ایک ہمہ گیر قانون ہے۔ انسان کے ہر فعل کا ایک اثر ہوتا ہے۔ اور وہ جو کچھ کرتا ہے اس کا نتیجہ ضرور دیکھتا ہے۔ تناسخ کے نظریہ نے جس کا ماخذ غالباً بہت پرانے زمانے کا یہ تصور تھا۔ کہ روحیں درختوں، جانوروں، وغیرہ میں مجسم ہو سکتی ہیں۔ اور ایک جسم کو چھوڑ کر دوسرے کو اپنا مسکن بنا سکتی ہیں۔ کرم کے قانون کے عمل کو اور واضح کر دیا۔ رفتہ رفتہ یہ بات بدیہی سمجھی جانے لگی کہ انسان اپنے اعمال کے مطابق سکھ اٹھانے اور دکھ سہنے کے لئے دنیا میں بار بار پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کی پیدائش اور موت کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ جب تک وہ صحیح علم اور صحیح عمل کی بدولت نجات حاصل نہ کرے۔

گوتم بدھ کی زندگی کے حالات

گوتم بدھ ساکیا قبیلے کے ایک سردار سدھودن کے لڑکے تھے۔ ان کی ماں کا نام مایا تھا۔ ساکیوں کا قبیلہ ہمالیہ کے دامن میں آباد تھا۔ اور کپل وستو اس کی راجدھانی تھی۔ گوتم بدھ کی ابتدائی زندگی کے حالات صحیح صحیح معلوم نہیں ہیں۔ ان کی مشہور سوانح عمریاں مہا وستو، للت وستر، اور بدھ چرت کئی سو برس بعد کی تصانیف ہیں۔ ان میں بدھ کی زندگی کا جو نقشہ ہے وہ روایتی ہے تاریخی نہیں ہے۔ مثلاً ان میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ بدھ کے متعلق پیشین گوئی کی گئی تھی۔ کہ یہ بڑے ہو کر یا تو شہنشاہ ہوں گے یا ساری دنیا کے رہنما جین روایات کے مطابق یہی پیشین گوئی مہاویر کے بارے میں کی گئی تھی۔ بدھ کے ماں باپ کا اہتمام کرنا۔ کہ وہ عیش و آرام کے عادی ہو جائیں ایسی ہی ایک روایت ہے۔ اور یہ قصہ کہ وہ سیر کے لئے نکلے تو انھوں نے ایک مرتبہ ایک بوڑھے آدمی کو پھر ایک بیمار پھر ایک چتا کو اور آخر میں ایک سادھو کو دیکھا۔ اور ان مناظر نے ان کی طبیعت کو دنیا سے پھیر دیا ایک استعارہ معلوم ہوتا ہے۔ بدھ متیوں کی ایک پرانی کتاب کے مطابق اپنے بچپن کے بارے میں گوتم بدھ نے خود کچھ باتیں بتائیں۔ جو ذیل کے اقتباس میں درج ہیں۔ غالباً اس حد تک ان کے لاڈ پیار سے پالے جانے کی روایت صحیح ہے اور اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ اس زمانے میں رئیس زادوں کی پرورش کس طرح ہوتی تھی۔

بھکشوؤ، میں بڑے پیار سے بڑی محبت سے، بے انتہا محبت سے پالا گیا میرے والد کے گھر میں میرے لئے کنول کے پھول تالابوں میں لگائے گئے۔ ایک تالاب میں نیلے پھول ہوتے ایک تالاب میں سفید، ایک تالاب میں گلابی پھول ان سب کا کھلنا میرے لئے تھا۔ اور بھکشوؤ میرے لئے خوشبو کی چیزیں خاص طور پر بنارس سے منگوائی جاتیں۔ میری پوشاک کے تینوں حصے بنارسی کپڑے کے ہوتے۔ سردی گرمی گرد و غبار اور خس و خاشاک کی تکلیف سے بچانے کے لئے میرے اوپر ہر وقت ایک سفید چھتری لگی رہتی۔ میرے رہنے کے لئے تین محل تھے ایک جاڑوں میں رہنے کے لئے ایک گرمیوں اور ایک برسات کے لئے برسات کے محل میں چار مہینے تک گانے والی عورتیں مجھے گھیرے رہتی۔ اور میں محل کے باہر نکلتا ہی نہ تھا بھکشوؤ، دوسرے گھرانوں میں نوکروں اور غلاموں کو لال چاول اور لال چاول کے پیچ کھانے کو دی جاتی تھی۔ میرے یہاں نوکروں اور غلاموں کو چاول ہی نہیں بلکہ چاول اور گوشت کھانے کو ملتا تھا۔

گوتم بدھ نے ایسی فضا میں پرورش پائی۔ اور مناسب عمر میں ان کی شادی ایک شریف گھرانے کی لڑکی یسودھرا سے کر دی گئی۔ ازدواجی زندگی کے لطف کو بڑھانے والا ایک لڑکا راہل بھی پیدا ہوا لیکن طبیعت، اور ذہنی قوی کی نشوونما کے ساتھ گوتم کی دل کی بے چینی بھی بڑھتی رہی۔ اور آخر میں انھوں نے گھر بار کو چھوڑا۔ اور اس حقیقت کی تلاش

میں نکلے۔ کہ جو مل جائے تو سب کچھ مل جاتا ہے۔ اور نہ ملے تو انسان ہر دولت اور نعمت کے ہوتے ہوئے بھی خالی ہاتھ رہتا ہے۔ گوتم بدھ کے گھر بار چھوڑنے سے ان کے والد اور ان کی بیوی کو بڑا صدمہ ہوا۔ یہ روایت تو صحیح نہیں ہے۔ کہ سدھودن راجہ تھے۔ اور چاہتے تھے کہ ان کے بعد ان کا لڑکا راج کرے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ وہ رئیس تھے۔ اور چاہتے تھے۔ کہ ان کا لڑکا ان سے بڑھ کر رئیس ہو۔ یسودھرا بھی رئیس عورتوں کے عام طریقے پر زندگی گذارنا چاہتی تھیں۔ گوتم بدھ اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہوئے پہلی مرتبہ اپنے آبائی شہر میں آئے۔ تو یسودھرا نے راہل کو ان کے پاس یہ سمجھا کر بھیجا۔ کہ اپنے والد سے کہئے۔ کہ مجھے میرا ورثہ دیجئے وہ شاید رئیس کو فقیر ہو جانے کا طعنہ دے رہی تھیں۔ گوتم بدھ نے راہل کو اپنا جیسا فقیر بنا لیا یسودھرا خود گوتم بدھ سے ملنے بھی نہیں گئیں۔ اور کہا کہ اگر ان کے دل میں میری کچھ قدر ہے تو وہ خود میرے پاس آئیں گے۔ گوتم بدھ نے ان کی خواہش پوری کی۔ اور خود ان سے ملنے کو گئے۔

گوتم کی طرح بہت سے لوگ حقیقت کی تلاش میں نکل چکے تھے۔ اور رہنماؤں کی کمی نہ تھی۔ دو معلموں کا جن کی گوتم نے شاگردی کی ذکر ملتا ہے۔ یہ آتما اور برہما اور مادے اور روح کی وحدت کو ماننے والے تھے۔ گوتم نے اس حقیقت کو ذہن نشین کیا۔ پھر پوچھا کہ اب آگے کیا ہے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ اس کے آگے کچھ نہیں ہے۔ سوا اس کے کہ اس حقیقت میں اور زیادہ پختہ یقین پیدا کیا جائے۔ تو وہ دوسرے مسلک کی تلاش میں دوسرے معلموں کے پاس گئے۔ دھیان کی مشق کرتے رہے۔ اور ریاضت و نفس کشی کو حد سے گذار دیا۔ ان کی تپسیا کی شدت کو دیکھ کر اور اس سے مرعوب ہو کر پانچ راہب ان کے چیلے بن گئے۔ لیکن سب کچھ کرنے کے بعد گوتم کو یقین ہو گیا۔ کہ ریاضت بھی بس ایک ذریعہ ہے منزل مقصود نہیں ہے۔ انھیں اپنی ساری محنت کو غلط اور بے سود قرار دینے میں کوئی تامل نہیں ہوا۔ اور انھوں نے اپنے چیلوں سے یہ صاف صاف کہہ بھی دیا۔ وہ یہ سمجھ کر کہ ان کے گرو کی طبیعت کمزور پڑ گئی ہے۔ ان سے الگ ہو گئے۔ اس کا گوتم کو بہت صدمہ ہوا۔ مایوسی کے عالم میں بھٹکتے ہوئے وہ ارویلا پہنچے اور یہاں وہ ایک درخت کے نیچے مراقبے میں بیٹھے تھے۔ جب ان پر وہ کیفیت طاری ہوئی جس کے بعد انھوں نے کہا۔ کہ میں بدھ ہو گیا ہوں۔ اور اس کا ارادہ ہو گیا ہوں۔ اور اس کا اعلان کیا۔ اس دنیا کی تاریکی میں ابدی حقیقت کا ڈنکا بجاؤں گا۔

گوتم بدھ قریب ۴۵ سال تک اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے رہے۔ اس زمانے میں کوئی ایسے واقعات پیش نہیں آئے جو بیان کرنے کے لائق ہوں۔ وہ اسی برس کے اور بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ جب ان کے ایک پیرو چنڈ لوہار نے ان کی اور ان کے ساتھیوں کی دعوت کی کھانوں میں گوشت بھی تھا۔ گوتم بدھ نے کہا کہ یہ گوشت صرف میں کھاؤں گا۔ باقی سب چیزیں تم دوسروں کو کھلاؤ گوشت کھانے کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ان کی آنتوں میں زہر پھیل گیا اور ان کو درد کی بڑی سخت تکلیف رہی۔ اس اندیشے میں کہ ان کے مرنے کے بعد لوگ چنڈا کو ملامت نہ کریں۔ انھوں نے اپنے خاص چیلے آنند سے کہا۔ کہ اگر چنڈا کو کبھی اس بات کا خیال آئے اور اس پر ندامت ہو۔ کہ بدھ اس کے یہاں کھانا کھا کر مرض الموت میں مبتلا ہو گئے تو تم اس سے کہنا کہ اس کھانے میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے بدھ کو قید حیات سے رہائی ملے۔ اور اس کے کھلانے والے کو بہت ثواب ملتا ہے۔ اس کے بعد گوتم بدھ کسی نارا گئے اور وہیں انھوں نے وفات پائی۔

گوتم بدھ کی تعلیمات

گوتم بدھ کی مثال کو سامنے رکھ کر یہ کہنا صحیح نہ ہوگا۔ کہ ریاضت سے کچھ حاصل ہی نہیں ہوتا۔ یہ سمجھنا بھی صحیح نہ ہوگا۔ کہ ان کے زمانے میں اور جتنے لوگ حقیقی علم کی تمنا رکھتے تھے وہ ناکام رہے۔ گوتم بدھ اور دوسروں میں بنیادی فرق یہ تھا کہ دوسرے اپنی تسلی چاہتے تھے اور انھوں نے ریاضت یا غور و فکر کے ذریعہ جو کچھ حاصل کیا۔ وہ ان کی تسلی کے لئے کافی تھا۔ گوتم بدھ اپنی تسلی سے زیادہ ایسے اصول دریافت کرنے کی فکر میں تھے جن سے دنیا کے دکھ درد کا علاج کیا جا سکے۔ اور اس مقصد کے حاصل کرنے میں کس وقت کوئی ان کی رہنمائی نہیں کر سکتا تھا۔ ہم آگے دیکھیں گے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے روحانی علم اور عقائد کو رد نہیں کیا۔ بلکہ شروع سے آخر تک اس پر زور دیتے رہے۔ کہ اہم اور غیر اہم حقیقی اور ضمنی مسائل میں فرق کرنا چاہئے۔ جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کو صحیح راہ پر لگانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اپنی تعلیم کا نچوڑ انھوں نے چار حقیقتوں کی شکل میں پیش کیا۔ • دکھ کا سبب • دکھ کا استیصال • دکھ کا استیصال کا طریقہ، پیدا ہونا دکھ ہے • بیمار ہونا دکھ ہے • جن چیزوں سے ہمیں محبت ہو ان کا موجود نہ ہونا دکھ ہے، جو کچھ ہم اپنے لئے چاہتے ہوں اس کا نہ ملنا دکھ ہے، گویا پہلی حقیقت جسے انسان کو ذہن نشین کر لینا چاہئے۔ وہ یہ ہے۔ کہ زندگی سراسر دکھ ہے اگر اس میں اتنی توفیق ہے۔ کہ وہ آپ بیتی اور جگ بیتی سے یہ سبق حاصل کر سکے۔ تو وہ پھر سوچے گا کہ دکھ کا سبب کیا ہے۔ گوتم بدھ نے بتایا کہ دکھ کا سبب وہ خواہشیں اور میلانات ہیں۔ جو انسان کو گھسیٹ کر اس دنیا میں لے آتے ہیں۔ جو اسے لطف اندوزی کی فکر میں سرگرداں رکھتے ہیں۔ اور زندہ رہنے اور بہتر سے بہتر زندگی گذارنے کے غیر شعوری ارادے کو پختہ کرتے رہتے ہیں۔ ہر پریشانی کی جڑ ناواقفیت ہے انسان کو دکھ کی ہمہ گیر حقیقت کا علم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اس کے اندر زندگی کی تشکیل کرنے والے میلانات پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ان کی وجہ سے وہ بار بار جنم لیتا ہے۔ اور رنج زوال اور موت کے پھندے میں پھنسا رہتا ہے دکھ کا استیصال ہو سکتا ہے اگر انسان کو اس حقیقت کا علم ہو جائے کہ زندگی ایک حالت پر قائم نہیں رہتی۔ یہ نام ہے بننے، بن کر مٹ جانے، اور پھر بننے کے ایک عمل کا جو معلوم نہیں کب اور کیسے شروع ہوا اور کب ختم ہوگا یہ عمل جاری ہے اور انسان خود بھی اسے جاری رکھتا ہے۔ اس لئے وہ خود ہی اپنے دکھ درد کا سامان پیدا کرتا ہے۔ لیکن وہ دکھ کا استیصال کر سکتا ہے۔ اگر وہ اپنے دل سے ان میلانات کو نکال دے جو اس کے وجود کے سلسلے کی پہلی کڑیاں ہیں۔ اور ان کڑیوں کو توڑ کر اپنے اندر سکون اور بے تعلقی کی ایسی کیفیت پیدا کر لے۔ کہ وجود کو قائم رکھنے والی قوتوں سے کوئی بھی عمل میں نہ آ سکے۔ یہ مقصد آٹھ اصولوں پر عمل کرنے سے حاصل ہوگا۔ جو دکھ کے استیصال کا ذریعہ ہیں۔ اور یہ صحیح طریقے پر برتے گئے۔ تو انسان کو نروان نصیب ہوگا یہ اصول ہیں۔

• خیالات کا صحیح ہونا • نیت کا صحیح ہونا • قول کا صحیح ہونا • عمل کا صحیح ہونا • ذریعہ کا معاش کا صحیح ہونا • جد و جہد کا صحیح ہونا • ذہن کا صحیح باتوں میں مشغول و منہمک رہنا۔

• دھیان کا صحیح ہونا۔

یہ ہے مہاتما گوتم بدھ کی تعلیم کا خلاصہ اور اسی کو وہ ۴۵ سال تک وعظ و نصیحت، استعارے اور تشبیہ کے ذریعہ لوگوں کے دلوں پر نقش کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ فلسفیانہ بحث کا شوق رکھنے والے اس مختصر سی تعلیم سے مطمئن نہیں ہو سکتے تھے جس میں کوئی بات پوری نہیں بتائی گئی تھی کسی دلیل سے پورے نتائج نہیں نکالے گئے تھے جس میں زندگی کی ابتدا کا بھید کھولا گیا تھا نہ اس کی انتہا کا۔ ہمارے دل میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں گوتم بدھ خدا کو مانتے تھے یا نہیں۔ سزا و جزا کے بارے میں ان کا کیا عقیدہ تھا۔ نجات یا نروان سے ان کا کیا مطلب تھا۔ ان بنیادی مسائل پر کوئی واضح تعلیم دیئے بغیر انھوں نے ایک مذہب کیسے قائم کیا۔ اپنے پیروؤں کے دل سے شکوک کیسے مٹائے۔ انھیں مطمئن کیسے کیا۔؟

ایک موقعہ پر گوتم بدھ نے اپنے ہاتھ میں ایک درخت کی چند پتیاں لیں۔ اور قریب کے جنگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔ کہ بتاؤ میرے ہاتھ میں زیادہ پتیاں ہیں) یا اس جنگل میں، انھوں نے جواب دیا کہ جنگل میں۔ اس پر گوتم بدھ نے کہا۔ کہ جو نسبت ان چند پتیوں کو جنگل کی پتیوں سے ہے۔ وہی نسبت میرے علم کے اس حصے کو جو میں نے تمہیں بتایا نہیں ہے۔ اس لئے کہ تم کو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ یہ روایت بدھ کے تعلیمی اور ان کے رعیے کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ انسان کو اپنی پوری اخلاقی اور روحانی ذمہ داری کا احساس ہو انھیں یقین تھا کہ یہ احساس پیدا اور زندگی پر حاوی ہوگیا تو انسان کی ذہنی اور ضروریات خود بخود پوری ہو جائیں گی فلسفہ روحانیت میں ڈوبا ہو تب بھی وہ مختلف خیالات اور نظریوں کا ایک ویرانہ ہوتا ہے رنج سے بھرا ہوا، تباہی سے ہیجان، اذیت سے "جو لوگ حواس کے ذریعہ اس حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ جو حواس سے بالاتر ہے وہ ان اندھوں کی طرح ہیں جنھوں نے ہاتھی کے بدن کو ٹٹول کر اس کی شکل کا اندازہ کرنا چاہا۔ ایک کا ہاتھ اس جانور کے سر پر پڑا۔ اس نے کہا کہ ہاتھی مٹکے کی طرح ہے ایک کا ہاتھ اس کے کان پر پڑا وہ چلایا کہ نہیں یہ سوپ کا سا ہے۔ ایک نے دانت کو چھو کر رائے دی کہ ہاتھی پھال کی طرح ہے غرض اس طرح سب قیاس آرائیاں کرتے رہے۔ ہاتھی کی شکل کا اندازہ کسی کو نہ ہوا۔ بس مفت میں ایک جھگڑا کھڑا ہوگیا۔ گوتم بدھ اپنے پیروؤں کو فلسفیانہ نظریوں اور بحثوں سے الگ رکھنا چاہتے تھے بھکشوؤ! جیسے بڑے سمندر کے پانی میں صرف ایک مزہ ہے۔ یعنی نمک کا مزہ، ویسے ہی بھکشوؤ، اس تعلیم اور (ہماری جماعت کی) اس تنظیم میں صرف ایک مزہ ہے اور وہ مزا ہے نجات کا۔ یہ تعلیم اور مقاصد کی پابندی تھی جو گوتم بدھ کامیابی کے لئے لازمی سمجھتے تھے۔ بحث کا شوق رکھنے والوں نے بہتیری کوشش کی۔ کہ وہ مختلف فیہ مسائل میں کچھ رائے دیں مگر وہ یا تو یہ کہہ دیتے کہ اس مسئلے کے بارے میں میں نے کوئی رائے نہیں دی ہے یا کوئی جواب ہی نہ دیتے۔

اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا۔ کہ گوتم بدھ نے اپنے زمانے کے تمام عقائد کو غلط ٹھہرایا یا نظر انداز کیا تناسخ اور کرم کا عقیدہ ان کی تعلیم میں شامل ہے خدائی کے تصور کو برہمنوں کے غور و فکر نے قدم بہ قدم پیچھے ہٹا دیا تھا پرانے دیوتاؤں کی شکلیں ماند پڑ گئی تھیں۔ اور برہما (یعنی حقیقت وجود) کے علاوہ صرف انسان ہی رہ گیا تھا جس میں عمل کی قوت اور عمل کا اختیار تھا۔ اور جس کے اندر اس کی طاقت تھی۔ کہ اپنے آپ کو اس دنیا، اس رنج و الم کے مقام سے الگ کر لے۔ اس لئے اگر گوتم بدھ نے خدا کا ذکر نہیں کیا اور انسان کے ارادے ہی کو اس کی نجات کا ذریعہ قرار دیا۔ تو یہ کوئی نیا مسلک نہیں تھا۔ برہمنیت اس راہ میں پیش قدمی کر چکی تھی۔ اولڈن برگ کا خیال ہے۔ کہ نروان کا تصور برہما کے تصور سے نکلا ہے۔ مگر دونوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ برہمنیت میں برہما کی حقیقت ایسی حاوی ہے کہ وجود کا سارا عالم اسی کے مقابلے میں ہیچ معلوم ہوتا ہے اور بدھ نے اس حقیقت کو اپنی تعلیم میں صرف اس حد تک مانا ہے کہ وجود کی قید سے رہائی ممکن ٹھہرائی جا سکے۔ روح کے بارے میں۔ . . . .
گوتم بدھ نے کوئی واضح عقیدہ پیش نہیں کیا۔ لیکن آتما (یعنی روح انسانی) کو ماننے والے برہمن علما بھی اس کا دعویٰ نہیں کرتے تھے۔ کہ۔۔ آتما کی حقیقت تصور سے بالاتر تھی۔ گوتم بدھ نے اسے کہنا بے کار سمجھا۔ بھکشوؤ! جب یہ ممکن نہیں کہ ایک شخصیت (یعنی روح یا آتما) اور اس شخصیت سے متعلق صفات ہمارے ذہن میں آجائیں اور ہم یقین کے ساتھ کہہ سکیں۔ کہ ہم نے اس کا جو تصور قائم کیا ہے وہ صحیح ہے۔ تو پھر کسی کا یہ عقیدہ رکھنا حماقت ہے یا نہیں۔ کہ میں نے دنیا کو اور اپنی شخصیت کو ٹھیک پہچان کر کہا ہے (میں جانتا ہوں کہ) مرنے کے بعد میرے وجود کی یہ شکل ہوگی۔ اور میں ہمیشہ بغیر کسی تغیر کے اسی مقام پر اور اسی شکل میں زندہ رہوں گا گوتم بدھ نے آتما کا عقیدہ رکھنے والے کو ایسے شخص سے تشبیہ دی ہے۔ جو ایک عورت پر عاشق ہے مگر جب اس سے پوچھا جاتا ہے کہ بتاؤ اس عورت کا کیا نام ہے۔ وہ کس خاندان، کس ذات کی ہے کہاں رہتی ہے اور اس کی صورت شکل، رنگ روپ کیا ہے تو وہ جواب دیتا ہے کہ یہ باتیں مجھے معلوم نہیں ہیں نے اسے دیکھا بھی نہیں ہے میں تو بس اس پر عاشق ہوں۔ گوتم بدھ آتما کے نظریے سے پوری طرح واقفیت رکھتے تھے ممکن ہے وہ اسے صحیح سمجھتے ہوں مگر وہ ایسی حقیقت کو جو علم اور نظریہ بن کر رہ گئی تھی اہمیت دینا روحانی مصلحت کے خلاف سمجھتے تھے کیوں کہ انھیں اندیشہ تھا کہ لوگ آتما اور برہما کی وحدت کے عقیدے سے مطمئن ہو کر بیٹھ رہیں گے۔ اور [illegible] اور نجات جیسے مقاصد کو بھلا دیں گے۔ اسی بنا پر وہ اس علم کو جس سے نجات حاصل ہوتی ہے اس علم سے الگ اور ممتاز کرتے رہے۔ جو اس مقصد کے لئے کارآمد نہیں یعنی ان دونوں (یعنی شکل اور غیر مشکل شخصیت) کے بارے میں ایک تعلیم دیتا ہوں۔ جس کا ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ یہ شخصیت قائم نہیں ہوتی اور اس طرح اگر کوئی میری تعلیم پر عمل کرے تو وہ ان برے خیالات کا جو پیدا ہو گئے ہیں استیصال کر دے گا۔ وہ میلانات جو پاک و صاف کرتے ہیں بڑھ جائیں گے اور یہ ممکن ہو جائے گا۔ کہ وہ عقل کل کے پورے کمال اور پوری شان کو روبرو دیکھے اور دوسرے کی مدد کی بغیر عقل کل کی صفات اپنے اندر پیدا کر لے۔

ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ گوتم بدھ (کرم) اعمال اور تناسخ کے عقیدوں کو صحیح مانتے تھے۔ [illegible] نے کہا۔ کہ بھکشوؤ! یہ جسم تمہارے جسم ہیں نہ دوسروں کے تمہیں تو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ گذشتہ زمانے کے اعمال ہیں۔ جو خواہش و اعمال کی وجہ سے مجسم ہو گئے ہیں مادی بقا کی آرزو کے سبب سے ایک وجود بن گئے ہیں۔ اور محسوس کئے جا سکتے ہیں لیکن انھوں نے کرم کے قانون کی وضاحت نہیں کی۔ اور یہ بھی صاف صاف نہیں بتایا۔ کہ تناسخ کیسے عمل میں آتا ہے اگر یہ فرض کیا جاتے۔ کہ انسان کی روح ایک ہوتی ہے۔ جو جسم کے فنا ہونے

ین نکلے۔ یہ کہ جو مل جائے تو سب کچھ مل جاتا ہے۔ اور نہ ملے تو انسان ہر دولت اور نعمت کے
ستے ہوتے بھی خالی ہاتھ رہتا ہے۔ گوتم بدھ کے گھر بار چھوڑنے سے ان کے والد اور ان کی
یوی کو بڑا صدمہ ہوا۔ یہ روایت تو صحیح نہیں ہے۔ کہ سدھودن راجہ تھے۔ اور چاہتے تھے
ہ ان کے بعد ان کا لڑکا راج کرے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ وہ رئیس تھے۔ اور چاہتے تھے۔ کہ
ن کا لڑکا ان سے بڑھ کر رئیس ہو۔ یسودھرا بھی رئیس عورتوں کے عام طریقے پر زندگی گذارنا
اہتی تھیں۔ گوتم بدھ اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہوئے پہلی مرتبہ اپنے آبائی شہر میں آئے۔ تو
سودھرا نے راہل کو ان کے پاس یہ سمجھا کر بھیجا۔ کہ اپنے والد سے کہئے۔ کہ مجھے میرا ورثہ دیجئے
ہ شاید رئیس کو فقیر بن جانے کا طعنہ دے رہی تھیں۔ گوتم بدھ نے راہل کو اپنا جیسا فقیر بنا لیا
سودھرا خود گوتم بدھ سے ملنے بھی نہیں گئیں۔ اور کہا کہ اگر ان کے دل میں میری کچھ قدر ہے
ہ وہ خود میرے پاس آئیں گے۔ گوتم بدھ نے ان کی خواہش پوری کی۔ اور خود ان سے ملنے
لے گئے۔

گوتم کی طرح بہت سے لوگ حقیقت کی تلاش میں نکل چکے تھے۔ اور رہنماؤں کی
ی نہ تھی۔ دو معلموں کا جن کی گوتم نے شاگردی کی ذکر ملتا ہے۔ یہ آتما اور برہما اور مادے
ور روح کی وحدت کو ماننے والے تھے۔ گوتم نے اس حقیقت کو ذہن نشین کیا۔ پھر پوچھا کہ اب
گے کیا ہے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ اس کے آگے کچھ نہیں ہے۔ سوا اس کے کہ اس حقیقت میں اور
یادہ پختہ یقین پیدا کیا جائے۔ تو وہ دوسرے مسلک کی تلاش میں دوسرے معلموں کے پاس
گئے۔ وہ دھیان کی مشق کرتے رہے۔ اور ریاضت و نفس کشی کو حد سے گذار دیا۔ ان کی تپسیا
ی شدت کو دیکھ کر اور اس سے مرعوب ہو کر پانچ راہب ان کے چیلے بن گئے۔ لیکن سب کچھ کرنے
کے بعد گوتم کو یقین ہو گیا۔ کہ ریاضت بھی بس ایک ذریعہ ہے منزل مقصود نہیں ہے۔ انھیں اپنی
ساری محنت کو غلط اور بے سود قرار دینے میں کوئی تامل نہیں ہوا۔ اور انھوں نے اپنے چیلوں
سے یہ صاف صاف کہہ بھی دیا۔ وہ یہ سمجھ کر کہ ان کے گرو کی طبیعت کمزور پڑ گئی ہے۔ ان سے
الگ ہو گئے۔ اس کا گوتم کو بہت صدمہ ہوا۔ مایوسی کے عالم میں بھٹکتے ہوئے وہ اروبیلا پہنچے اور
یہاں وہ ایک درخت کے نیچے مراقبے میں بیٹھے تھے۔ جب ان پر وہ کیفیت طاری ہوئی جس
کے بعد انھوں نے کہا کہ میں بدھ ہو گیا ہوں۔ اور اس کا ارادہ ہو گیا ہوں۔ اور اس کا ارادہ
کیا۔ اس دنیا کی تاریکی میں ابدی حقیقت کا ڈنکا بجاؤں گا۔

گوتم بدھ قریب ۴۵ سال تک اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے رہے۔ اس زمانے میں
کوئی ایسے واقعات پیش نہیں آئے جو بیان کرنے کے لائق ہوں۔ وہ اسی برس کے اور
بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ جب ان کے ایک پیرو چنڈ لوہار نے ان کی اور ان کے ساتھیوں
کی دعوت کی کھانوں میں گوشت بھی تھا۔ گوتم بدھ نے کہا کہ یہ گوشت صرف میں کھاؤں گا۔ باقی
سب چیزیں تم دوسروں کو کھلاؤ۔ گوشت کھانے کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ان کی آنتوں میں زہر پھیل گیا
اور ان کو درد کی بڑی سخت تکلیف رہی۔ اس اندیشے میں کہ ان کے مرنے کے بعد لوگ چنڈا
کو ملامت نہ کریں۔ انھوں نے اپنے خاص چیلے آنند سے کہا۔ کہ اگر چنڈا کو کبھی اس بات کا
خیال آئے اور اس پر ندامت ہو۔ کہ بدھ اس کے یہاں کھانا کھا کر مرض الموت میں مبتلا ہو گئے
تو تم اس سے کہنا کہ اس کھانے میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے بدھ کو قید حیات
سے رہائی ملے۔ اور اس کے کھلانے والے کو بہت ثواب ملتا ہے۔ اس کے بعد گوتم بدھ
کسی نارا گئے اور وہیں انھوں نے وفات پائی۔

گوتم بدھ کی تعلیمات

گوتم بدھ کی مثال کو سامنے رکھ کر یہ کہنا صحیح ہوگا۔ کہ ریاضت سے کچھ حاصل ہی
نہیں ہوتا۔ یہ سمجھنا بھی صحیح نہ ہوگا۔ کہ ان کے زمانے میں اور جتنے لوگ حقیقی علم کی تمنا رکھتے تھے
وہ ناکام رہے۔ گوتم بدھ اور دوسروں میں بنیادی فرق یہ تھا کہ دوسرے اپنی تسلی چاہتے تھے
اور انھوں نے ریاضت یا غور و فکر کے ذریعہ جو کچھ حاصل کیا۔ وہ ان کی تسلی کے لئے کافی
تھا۔ گوتم بدھ اپنی تسلی سے زیادہ ایسے اصول دریافت کرنے کی فکر میں تھے جن سے دنیا
کے دکھ درد کا علاج کیا جا سکے۔ اور اس مقصد کے حاصل کرنے میں اس وقت کوئی ان کی
رہنمائی نہیں کر سکتا تھا۔ ہم آگے دیکھیں گے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے روحانی علم اور
عقائد کو رد نہیں کیا۔ بلکہ شروع سے آخر تک اس پر زور دیتے رہے۔ کہ اہم اور غیر اہم حقیقی
اور ضمنی مسائل میں فرق کرنا چاہئے۔ جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کو صحیح راہ پر لگانے کی
قدرت رکھتے ہیں۔ اپنی تعلیم کا نچوڑ انھوں نے چار حقیقتوں کی شکل میں پیش کیا۔ • دکھ کا
سبب • دکھ کا استیصال • دکھ کا استیصال کا طریقہ، پیدا ہونا دکھ ہے • بیمار ہونا دکھ ہے
• جن چیزوں سے ہمیں محبت ہو ان کا موجود نہ ہونا دکھ ہے، جو کچھ ہم اپنے لئے چاہتے ہوں
اس کا نہ ملنا دکھ ہے، گویا پہلی حقیقت جسے انسان کو ذہن نشین کر لینا چاہئے۔ وہ یہ ہے کہ
زندگی سراسر دکھ ہے اگر اس میں اتنی توفیق ہے۔ کہ وہ آپ بیتی اور جگ بیتی سے یہ سبق
حاصل کر سکے۔ تو وہ پھر سوچے گا کہ دکھ کا سبب کیا ہے۔ گوتم بدھ نے بتایا کہ دکھ کا سبب
وہ خواہشیں اور میلانات ہیں۔ جو انسان کو گھسیٹ کر اس دنیا میں لے آتے ہیں۔ جو اسے
لطف اندوزی کی فکر میں سرگرداں رکھتے ہیں۔ اور زندہ رہنے اور بہتر سے بہتر زندگی
گذارنے کے غیر شعوری ارادے کو پختہ کرتے رہتے ہیں۔ ہر برائی کی جڑ ناواقفیت ہے
انسان کو دکھ کی ہمہ گیر حقیقت کا علم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اس کے اندر زندگی کی
تشکیل کرنے والے میلانات پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ان کی وجہ سے وہ بار بار جنم لیتا
ہے۔ اور رنج زوال اور موت کے پھندے میں پھنسا رہتا ہے دکھ کا استیصال ہو سکتا
ہے اگر انسان کو اس حقیقت کا علم ہو جائے کہ زندگی ایک حالت پر قائم نہیں رہتی۔ یہ
نام ہے بننے، بن کر مٹ جانے، اور پھر بننے کے ایک عمل کا جو معلوم نہیں کب اور کیسے
شروع ہوا اور کب ختم ہوگا یہ عمل جاری ہے اور انسان خود بھی اسے جاری رکھتا ہے۔
اس لئے وہ خود ہی اپنے دکھ درد کا سامان پیدا کرتا ہے۔ لیکن وہ دکھ کا استیصال کر سکتا
ہے۔ اگر وہ اپنے دل سے ان میلانات کو نکال دے جو اس کے وجود کے سلسلے کی پہلی
کڑیاں ہیں۔ اور ان کڑیوں کو توڑ کر اپنے اندر سکون اور بے تعلقی کی ایسی کیفیت
پیدا کر لے۔ کہ وجود کو قائم رکھنے والی قوتوں سے کوئی بھی عمل میں نہ آسکے۔ یہ مقصد آٹھ
اصولوں پر عمل کرنے سے حاصل ہوگا۔ جو دکھ کے استیصال کا ذریعہ ہیں۔ اور یہ صحیح طریقے
پر برتے گئے۔ تو انسان کو نروان نصیب ہوگا یہ اصول ہیں۔

• خیالات کا صحیح ہونا • نیت کا صحیح ہونا • قول کا صحیح ہونا • عمل کا صحیح ہونا • ذریعہ
معاش کا صحیح ہونا • جد و جہد کا صحیح ہونا • ذہن کا صحیح باتوں میں مشغول و منہمک رہنا۔

• دھیان کا صحیح ہونا۔

یہ ہے مہاتما گوتم بدھ کی تعلیم کا خلاصہ اور اسی کو وہ ۴۵ سال تک وعظ و نصیحت، استعارے اور تشبیہ کے ذریعہ لوگوں کے دلوں پر نقش کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ فلسفیانہ بحث کا شوق رکھنے والے اس مختصر سی تعلیم سے مطمئن نہیں ہو سکتے تھے جس میں کوئی بات پوری نہیں بتائی گئی تھی کسی دلیل سے پورے نتائج نہیں نکالے گئے تھے جس میں زندگی کی ابتدا کا بھید کھولا گیا تھا نہ اس کی انتہا کا۔ ہمارے دل میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں گوتم بدھ خدا کو مانتے تھے یا نہیں۔ سزا و جزا کے بارے میں ان کا کیا عقیدہ تھا۔ نجات یا نروان سے ان کا کیا مطلب تھا۔ ان بنیادی مسائل پر کوئی واضح تعلیم دیئے بغیر انھوں نے ایک مذہب کیسے قائم کیا۔ اپنے پیروؤں کے دل سے شکوک کیسے مٹائے۔ انھیں مطمئن کیسے کیا۔؟

ایک موقع پر گوتم بدھ نے اپنے ہاتھ میں ایک درخت کی چند پتیاں لیں۔ اور قریب کے جنگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔ کہ بتاؤ میرے ہاتھ میں زیادہ پتیاں ہیں) یا اس جنگل میں، انھوں نے جواب دیا کہ جنگل میں۔ اس پر گوتم بدھ نے کہا۔ کہ جو نسبت ان چند پتیوں کو جنگل کی پتیوں سے ہے۔ وہی نسبت میرے علم کے اس حصے کو جو میں نے تمہیں بتایا نہیں ہے۔ اس لئے کہ تم کو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ یہ روایت بدھ کے تعلیمی ہوا، اور ان کے رویئے کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ انسان کو اپنی پوری اخلاقی اور روحانی ذمہ داری کا احساس ہو انھیں یقین تھا کہ یہ احساس پیدا اور زندگی پر حاوی ہو گیا تو انسان کی ذہنی اور روحانی ضروریات خود بخود پوری ہو جائیں گی فلسفہ روحانیت میں ڈوبا ہو تب بھی وہ مختلف خیالات اور نظریوں کا ایک ویرانہ ہوتا ہے رنج سے بھرا ہوا، تباہی سے ہیجان، اذیت سے، "جو لوگ حواس کے ذریعہ اس حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ جو حواس سے بالاتر ہے وہ ان اندھوں کی طرح ہیں جنھوں نے ہاتھی کے بدن کو ٹٹول کر اس کی شکل کا اندازہ کرنا چاہا۔ ایک کا ہاتھ اس جانور کے سر پر پڑا۔ اس نے کہا کہ ہاتھی مٹکے کی طرح ہے ایک کا ہاتھ اس کے کان پر پڑا وہ چلایا کہ نہیں یہ سوپ کا سا ہے۔ ایک نے دانت کو چھو کر رائے دی کہ ہاتھی بھال کی طرح ہے غرض اس طرح سب قیاس آرائیاں کرتے رہے۔ ہاتھی کی شکل کا اندازہ کسی کو نہ ہوا۔ بس مفت میں ایک جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ گوتم بدھ اپنے پیروؤں کو فلسفیانہ نظریوں اور بحثوں سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ بھکشوو! جیسے بڑے سمندر کے پانی میں صرف ایک مزہ ہے۔ یعنی نمک کا مزہ، ویسے ہی بھکشوو، اس تعلیم اور (ہماری جماعت کی) اس تنظیم میں صرف ایک مزہ ہے اور وہ مزا ہے نجات کا۔ یہ تعلیم اور مقاصد کی حد بندی تھی جو گوتم بدھ کامیابی کے لئے لازمی سمجھتے تھے۔ بحث کا شوق رکھنے والوں نے بہتیری کوشش کی۔ کہ وہ مختلف فیہ مسائل میں کچھ رائے دیں مگر وہ یا تو یہ کہہ دیتے کہ اس مسئلے کے بارے میں میں نے کوئی رائے نہیں دی ہے یا کوئی جواب ہی نہ دیتے۔

اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا۔ کہ گوتم بدھ نے اپنے زمانے کے تمام عقائد کو غلط ٹھہرایا یا نظر انداز کیا۔ تناسخ اور کرم کا عقیدہ ان کی تعلیم میں شامل ہے خدائی کے تصور کو برہمنوں کے غور و فکر نے قدم بہ قدم پیچھے ہٹا دیا تھا پرانے دیوتاؤں کی شکلیں ماند پڑ گئی تھیں۔ اور برہما (یعنی حقیقت وجود) کے علاوہ صرف انسان ہی رہ گیا تھا جس میں عمل کی قوت اور عمل کا اختیار تھا۔ اور جس کے اندر اس کی طاقت تھی۔ کہ اپنے آپ کو اس دنیا، اس رنج و الم کے مقام سے الگ کر لے۔ اس لئے اگر گوتم بدھ نے خدا کا ذکر نہیں کیا اور انسان کے ارادے ہی کو اس کی نجات کا ذریعہ قرار دیا۔ تو یہ کوئی نیا مسلک نہیں تھا۔ برہمنیت اس راہ میں پیش قدمی کر چکی تھی۔ اولڈن برگ کا خیال ہے۔ کہ نروان کا تصور برہما کے تصور سے نکلا ہے۔ مگر دونوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ برہمنیت میں برہما کی حقیقت ایسی حاوی ہے کہ وجود کا سارا عالم اسی کے مقابلے میں ہیچ معلوم ہوتا ہے اور بدھ نے اس حقیقت کو اپنی تعلیم میں صرف اس حد تک مانا ہے کہ وجود کی قید سے رہائی ممکن ٹھہرائی جا سکے۔ روح کے بارے میں . . . . . گوتم بدھ نے کوئی واضح عقیدہ پیش نہیں کیا لیکن آتما (یعنی روح انسانی) کو ماننے والے برہمن علما بھی اس کا دعویٰ نہیں کرتے تھے۔ کہ۔ آتما کی حقیقت تصور سے بالاتر تھی۔ گوتم بدھ نے اسے لغو اور بے کار سمجھا۔ بھکشوو! جب یہ ممکن نہیں کہ ایک شخصیت (یعنی روح یا آتما) اور اس شخصیت سے متعلق صفات ہمارے ذہن میں آجائیں اور ہم یقین کے ساتھ کہہ سکیں۔ کہ ہم نے اس کا جو تصور قائم کیا ہے وہ صحیح ہے۔ تو پھر کسی کا یہ عقیدہ رکھنا حماقت ہے یا نہیں۔ کہ میں نے دنیا کو اور اپنی شخصیت کو ٹھیک پہچان کر کہا ہے (میں جانتا ہوں کہ) مرنے کے بعد میرے وجود کی یہ شکل ہوگی۔ اور میں ہمیشہ بغیر کسی تغیر کے اسی مقام پر اور اسی شکل میں زندہ رہوں گا۔ گوتم بدھ نے آتما کا عقیدہ رکھنے والے کو ایسے شخص سے تشبیہ دی ہے۔ جو ایک عورت پر عاشق ہے مگر جب اس سے پوچھا جاتا ہے کہ بتاؤ اس عورت کا کیا نام ہے۔ وہ کس خاندان، کس ذات کی ہے، کہاں رہتی ہے اور اس کی صورت شکل، رنگ روپ کیا ہے تو وہ جواب دیتا ہے کہ یہ باتیں مجھے معلوم نہیں میں نے اسے دیکھا بھی نہیں ہے میں تو بس اس پر عاشق ہوں۔ گوتم بدھ آتما کے نظریے سے پوری طرح واقفیت رکھتے تھے ممکن ہے وہ اسے صحیح سمجھتے ہوں مگر وہ ایسی حقیقت کو جو علم اور نظریہ بن کر رہ گئی تھی اہمیت دینا روحانی مصلحت کے خلاف سمجھتے تھے کیوں کہ انھیں اندیشہ تھا۔ کہ لوگ آتما اور برہما کی وحدت کے عقیدے سے مطمئن ہو کر بیٹھ رہیں گے۔ اور نجات اور نروان جیسے مقاصد کو بھلا دیں گے۔ اسی بنا پر وہ اس علم کو جس سے نجات حاصل ہوتی ہے اس علم سے الگ اور ممتاز کرتے رہے۔ جو اس مقصد کے لئے کارآمد نہیں۔ میں ان دونوں (یعنی شکل اور غیر مشکل شخصیت) کے بارے میں ایک تعلیم دیتا ہوں۔ جس کا ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ یہ شخصیت قائم نہیں ہوتی اور اس طرح اگر کوئی میری تعلیم پر عمل کرے تو وہ ان برے میلانات کا جو پیدا ہو گئے ہیں استیصال کر دے گا۔ وہ میلانات جو پاک و صاف کرتے ہیں بڑھ جائیں گے اور یہ ممکن ہو جائے گا۔ کہ وہ عقل کل کے پورے کمال اور پوری شان کو روبرو دیکھے اور دوسرے کی مدد کے بغیر عقل کل کی صفات اپنے اندر پیدا کر لے۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ گوتم بدھ (کرم) اعمال اور تناسخ کے عقیدوں کو صحیح مانتے تھے۔ ایک موقع پر انھوں نے کہا۔ کہ بھکشوو! یہ جسم تمہارے جسم ہیں نہ دوسروں کے تمہیں تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ گذشتہ زمانے کے اعمال ہیں۔ جو خواہش و اعمال کی وجہ سے مجسم ہو گئے ہیں۔ مادی بقا کی آرزو کے سبب سے ایک وجود بن گئے ہیں۔ اور محسوس کئے جا سکتے ہیں لیکن انھوں نے کرم کے قانون کی وضاحت نہیں کی۔ اور یہ بھی صاف صاف نہیں بتایا۔ کہ تناسخ کیسے عمل میں آتا ہے اگر یہ فرض کیا جائے۔ کہ انسان کی روح ایک ہوتی ہے۔ جو جسم کے فنا ہونے

پر بھی باقی رہتی ہے تو تناسخ کے یہ معنی ہو سکتے ہیں۔ کہ یہی روح جسم ہو جاتی ہے۔ لیکن روح کے وجود کو فرض کئے بغیر تناسخ کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ گوتم بدھ نے اس گتھی کو نہیں سلجھایا۔ انھیں فلسفہ او منطق سے مطلب نہیں تھا۔ انھوں نے اپنے خیال کو بس اس طرح بیان کیا۔ کہ کرم کے قانون نے ایک اخلاقی قوت کی شکل اختیار کر لی۔ جو ساری دنیا پر حاوی ہے۔ اور اسے اخلاقی اصلاح اور تہذیب نفس کا محرک بنا دیا کرم کے نظریے کے علمی ثبوت پیش کرنا انھوں نے اس لئے چھوڑ دیا جنھیں ذہنی کاوشوں کا زیادہ شوق تھا۔

گوتم بدھ نے روحانی جد و جہد کے مقصد اور کمال کے انتہائی درجے کو نروان قرار دیا نروان ایک اصطلاح ہے۔ جو بدھ سے پہلے رائج ہو گئی تھی۔ یہ اپنشدوں میں بھی ملتی ہے مگر اس کی جگہ آنند کا لفظ زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ گوتم بدھ نے ان تمام مسائل پر بحث کرنے سے پرہیز کیا۔ جو عام فہم نہ تھا۔ اس لئے نروان کا مفہوم بھی واضح نہیں کیا گیا۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ یہ مسرت کی ایک کیفیت ہے۔ جس کا اس عالم فانی سے کوئی تعلق نہیں۔ اور اس سبب سے اس میں اور دنیا کی تمام مسرتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے لیکن یہاں سوالوں کا جواب نہیں ہے۔ جو نروان کے بارے میں کئے جا سکتے ہیں نروان اگر ایک کیفیت ہے تو یہ وقتی ہوتی ہے یا مستقل، اگر اس کیفیت کے پیدا ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ انسان وجود کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ تو کیا اس رہائی سے مراد نیستی ہے یا وجود کی کوئی اعلیٰ شکل۔؟ گوتم بدھ اور ان کے کئی چیلوں نے جیتے جی نروان حاصل کیا۔ اس لئے اس سے مراد مادی نیستی یا فنا نہیں ہو سکتی لیکن کیا مرنے کے بعد وہ فنا ہو گئے؟ ہمارے زمانے کے محققوں میں پہلے یہ خیال عام تھا کہ نروان سے مراد فنا ہے۔ اکس میولر نے اس سے اختلاف کیا۔ اور جب اس مسئلے کی تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا۔ کہ بدھ مت کی قدیم اور مستند کتابوں سے یہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ کہ نروان فنا یا عدم وجود ہے۔ اور یہ بھی کہ وہ کامل مسرت کی کیفیت ہے۔ شروع زمانے کے بدھ مت بھکشوؤں کا عقیدہ تھا۔ کہ اس مسئلے کے متعلق کہ کوئی غیر فانی شخصیت یعنی (روح یا آتما) ہے یا نہیں گوتم بدھ نے کوئی تعلیم نہیں دی ہے ان کے عقیدت پیرو کو اس سوال کا جواب معلوم کرنے کی فکر نہیں ہوتی۔ وہ اس سوال کو اٹھاتا ہی نہیں لیکن دوسروں کو یہ سوال کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ گوتم بدھ کے ہم عصر، کوسل کے راجا، پسے ندی کا بھکشنی کھیما سے، جو بدھ کے پیرووں میں بہت ممتاز تھیں نروان کے متعلق ایک مکالمہ ہوا۔ پسے ندی کو اس پر بہت تعجب ہوا۔ کہ گوتم بدھ نے ایسے اہم مسئلے کو مبہم چھوڑ دیا ہے۔ مگر کھیما کے سمجھانے سے وہ بات سمجھ گیا۔ آخر میں کھیما نے کہا۔ کہ کامل انسان کی ہستی کا شمار دنیا کے اعداد میں نہیں کیا جا سکتا وہ اس سے آزاد (یعنی بالاتر) ہو جاتا ہے وہ بڑے سمندر کی طرح گہرا ہے۔ اس کی گہرائی ناپی نہیں جا سکتی۔ اس کی تہہ کا پتہ نہیں چلایا جا سکتا۔ یہ کہنا کہ کامل انسان موت کی منزل سے گزر گیا ہے صحیح نہیں ہوگا۔ یہ کہنا بھی ٹھیک نہ ہوگا کہ کامل انسان موت کی منزل کے اس طرف ہے نہ اس طرف۔" گوتم بدھ نے خود ایک مکالمے میں کہا ہے کہ میں نے یہ ظاہر نہیں کیا ہے کہ مرنے کے بعد ارہت (کامل انسان) کا وجود باقی رہتا ہے یا نہیں رہتا ہے، میں نے یہ بھی ظاہر نہیں کیا ہے۔ کہ وہ نہ وجود کے عالم میں ہوتا ہے نہ عدم کے۔ اس لئے کہ یہ ظاہر کرنے سے کوئی روحانی افادہ نہیں ہوتا۔ اس سے جذبات کی آگ نہیں بجھتی دل میں صحیح میلانات پیدا نہیں ہوتے۔ نروان حاصل نہیں ہوتا۔ گویا بحث یہاں پر ختم کر دی گئی۔ کہ جسے دکھ سے نجات پانے اور کامل علم کامل سکون، کامل مسرت حاصل کرنے کی آرزو ہو۔ وہ گوتم بدھ کے بتائے ہوئے پر چلے، یہ نروان کا سیدھا راستہ ہے۔ جس کسی نے نروان حاصل کر لیا۔ اسے سب کچھ ہی معلوم ہو جائے گا۔ اگر کسی کو نروان کی آرزو نہیں ہے۔ یا وہ بدھ مسلک پر چلنے کی اہمیت نہیں رکھتا۔ تو اسے نروان کا مطلب سمجھانے کی کوشش کرنا فضول کی دردسری ہے۔

بدھ مت سنگھ

نروان حاصل کرتے ہی گوتم بدھ نے اپنے عقائد کی تبلیغ شروع کر دی اور ان کا منشا تھا کہ جلد سے جلد مبلغوں کی ایک جماعت بنا کر اپنے دھرم کی اشاعت کریں۔ جب ان کے پیرووں کی تعداد ساٹھ سے اوپر ہو گئی۔ تو انھوں نے ان کو ہدایت دی۔ کہ دھرم کا پرچار کریں۔ جاؤ بھکشو عوام کے فائدے کے لئے ان کی بھلائی کے لئے رحم کے جذبے سے متاثر ہو کر ادھر ادھر دورے کرو۔ کوئی دو آدمی ایک طرف نہ جاؤ۔ اسی کے بعد قاعدہ بنا کہ جب کوئی نئے دھرم کو قبول کرے۔ اور بھکشو بننا چاہے تو وہ سر اور منہ کے بال منڈوا دے زرد کپڑے پہن کر ان بھکشوؤں کی قدم بوسی کرے۔ جن کے ہاتھ پر وہ ایمان لایا ہو۔ اور پھر چار زانو بیٹھ جائے، دونوں ہاتھ جوڑ کر سر سے اوپر اٹھائے۔ اور تین بار کہے کہ میں پناہ لیتا ہوں بدھ میں، میں پناہ لیتا ہوں دھرم میں، میں پناہ لیتا ہوں سنگھ میں۔" جو لوگ صرف عقیدت ظاہر کرنا چاہتے اور بھکشو نہ بنتے وہ اپاسک کہلاتے۔ ان کے لئے بدھ دھرم اور سنگھ میں پناہ لینے کا کلمہ تین مرتبہ پڑھنا کافی تھا۔ اس کے آگے گوتم بدھ نے سنگھ یعنی اپنے پیرووں کی جماعت کی کوئی اور تنظیم یا اسے فرقوں سے ممتاز کرنے کی کوئی اور تدبیر نہیں کی شاید وہ کوئی ایسی تنظیم کرنا مناسب بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی وفات سے پہلے ان سے درخواست کی گئی۔ کہ سنگھ کا کوئی انتظام کرتے جائیے۔ تو انھوں نے پوچھا کہ "سنگھ آخر مجھ سے کیا چاہتا ہے میں نے دھرم کی تعلیم دی ہے۔ اور اس میں کوئی حصہ عام یا کوئی مخصوص نہیں رکھا ہے۔ اس کے معاملے میں استاد کی طرح میں نے اپنی مٹھی میں چھپا کر نہیں رکھا ہے۔ اگر تم میں سے کوئی ایسا ہو جس کے دل میں یہ خیال رہتا ہو۔ کہ وہ سنگھ کی رہنمائی کرے گا یا سنگھ اس کا دست نگر ہے تو اسے چاہئے۔ یہ سنگھ کی تنظیم کے لئے قاعدے قانون بنائے اس طرح نہ تو سنگھ کا کوئی مرکز قائم ہوا ہے اور نہ اس کے لئے کوئی ایسے عہدہ دار مقرر کئے گئے جو اس کی نگرانی اور اس کی بھلائی کے لئے تدبیریں کرتے بھکشوؤں اور اپاسکوں (یعنی دنیادار پیرووں) کے درمیان بھی کوئی باضابطہ تعلق قائم نہیں کیا گیا، اور بھکشوؤں کی ضروریات پوری کرنا بالکل اپاسکوں کی توفیق پر چھوڑ دیا گیا۔ گوتم بدھ یہ چاہتے بھی نہیں تھے۔ کہ ان کے پیرو ان کی تعلیم کے سوا اور کوئی سہارا ڈھونڈیں اور ان کی آخری وصیت تھی کہ "تم آپ اپنے چراغ بنو۔ آپ اپنی پناہ بنو، کسی خارجی چیز کی پناہ نہ لو۔ دھرم پر قائم رہو۔ کہ وہ تمہارے لئے ایک چراغ ہے، دھرم کو سہارا جان کر اسے مضبوط پکڑ دو۔"

اصولاً گوتم بدھ کا رویہ بالکل صحیح تھا لیکن عملاً ان کے تفصیلات کو نظر انداز کرنا مفید ثابت نہ ہوا۔ اپاسک سینکڑوں برس تک ان اخلاقی اصولوں سے متاثر ہوتے رہے جن کی گوتم بدھ نے تعلیم دی تھی، پوجا اور مذہبی رسموں اور تقریبوں کے بارے میں ان کی جو رائے

تھی۔ وہ دوسرے مذاہب کے لوگوں سے زیادہ معقولیت رکھتی تھی۔ لیکن شادی بیاہ کا طریقہ کیا ہونا چاہیئے۔ بچے کی پیدائش کے وقت کیا کیا کرنا چاہیئے۔ مردوں کی تجہیز و تکفین کس طرح ہونی چاہیئے۔ مردوں کی روحوں کو سکون کس طرح پہنچانا چاہیئے۔ ان معاملات میں بدھ کی متیوں کی ہدایت کے لئے کچھ نہیں بتایا گیا۔ بیماری میں، مصیبت میں دنیاوی اندیشوں کو دور کرنے کے لئے چھوٹے غموں میں ایک دوسرے کی تسکین کے لئے، دنیا کی ان نعمتوں کو حاصل کرنے کے لئے جو اپاسکوں کے لئے جائز تھیں کیا کرنا چاہیئے، یہ بھی نہیں بتایا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ بدھ متی اپاسک دنیاوی زندگی میں پرانے مسلک پہ قائم رہے۔ ان کا باطن کسی قدر صاف ہو گیا۔ ظاہر وہی رہا جو پہلے تھا۔

عورتوں کا سنگھ

معلوم ہوتا ہے کہ گوتم بدھ کے زمانے میں عورتوں پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی اور وہ زندگی کے تمام مشاغل میں شریک ہو سکتی تھیں۔ بعد کو بدھ متیوں میں بھی عورت ذات کے متعلق حقارت آمیز باتیں کہی جانے لگیں۔ وہ بھی عورت کی دو انگلی چوٹری عقل اور اس کی گہری چالوں کی شکایت کرنے لگے۔ لیکن گوتم بدھ کا اپنا رویہ سراسر معقولات پر منحصر تھا۔ عورتیں ان کے دھرم کو بڑی تعداد میں قبول کرتی تھیں۔ مگر کسی کو گھر بار چھوڑ کر بھکشنی بننے کی دعوت نہیں دے گئی۔ جب گوتم بدھ سے پہلی مرتبہ عورتوں کا سنگھ قائم کرنے کی درخواست کی گئی تو انھوں نے انکار کیا لیکن آخر کو ان کے چیلے آنند نے اصولی بحث چھیڑی اور پوچھا۔ کہ کیا آپ کے خیال میں عورتیں اس قابل نہیں ہیں۔ کہ راہبوں کی زندگی بسر کر سکیں۔ کیا تہذیب نفس اور نروان ان کے لئے ممکن نہیں۔ تو وہ مجبور ہو گئے۔ اور اپنی سوتیلی ماں مہا پجاپتی کو، جنھوں نے یہ سوال اٹھایا تھا۔ عورتوں کا سنگھ قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے لئے قواعد زیادہ سخت تھے۔ اور ان کی حیثیت ہر لحاظ سے کم قرار دی گئی۔ انھیں انفرادی طور پہ دورہ کرنے یا اکیلے رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ بستیوں کے اندر ہی رہ سکتی تھیں، میل جول پر بھی بڑی پابندیاں تھیں لیکن یہ پابندیاں عورتوں کے لئے نہیں تھیں۔ گوتم بدھ سے ان کے چیلے آنند کا یہ دلچسپ مکالمہ ہوا۔

"حضور، ہمیں عورتوں کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے۔

اس طرح آنند، کہ جیسے تم انھیں دیکھتے ہی نہیں۔

اور اگر ہم انھیں دیکھ لیں تو کیا کرنا چاہیئے؟

ان سے باتیں نہ کرو۔"

لیکن حضور وہ خود ہم سے باتیں کریں۔ تو ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔

تب آنند، ہوشیار رہو۔

بدھ کی خصوصیات: اخلاقی ذمہ داری کا احساس

گوتم بدھ صرف ایک قسم کا معجزہ دکھانا چاہتے تھے اور وہ تھا تعلیم کا معجزہ، ان کا سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ انسان کی اخلاقی حس کو بیدار کریں۔ کہ وہ اس سدا بدلتی ہوئی دنیا کی ناقص اور محدود زندگی سے اپنے جنم کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا ارادہ کر لے اور آزاد اور کامل ہونے کی دھن میں لگ جائے۔ اس دھن کو خالی ایک شاعرانہ کیفیت نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ اصول اور قاعدے کے مطابق ایک اخلاقی اور عملی منصوبہ جسے ہر شخص کو اپنے لئے الگ پورا کرنا چاہیئے۔ گوتم بدھ نے موروثی اور روایتی علم کو بغیر جانچے ہوئے تسلیم کر لے اور بزرگوں کی تقلید پر اکتفا کرنے والوں کو اندھوں کی ایک قطار سے تشبیہ دی جس میں نہ اگلا رستے کو دیکھ سکتا ہے۔ نہ بیچ والا نہ پچھلا۔ بغیر جد و جہد کے خواہش مند کی مثال اس شخص کی سی ہے۔ جو دریا پار کرنے کی تدبیر نہیں کرتا۔ بلکہ ایک کنارے پر کھڑا ہو کر دوسرے کنارے کو اپنے پاس بلاتا ہے۔ گوتم بدھ کو ایسے لوگ مل گئے جنہوں نے اپنے پاؤں پکڑے ہونے کی ذمہ داری کو قبول کیا۔ اور یہ مان لیا۔ کہ اپنی ذات سے ہے ذات ہے جو برائی کرتا ہے بذات ہی کے ہاتھوں سے دکھ پہنچتا ہے۔ ذات یہ ہے جو برائی سے کرتی ہے۔ جو آدمی کو پاک کرتی ہے۔ آدمی خود ہی پاک یا ناپاک ہوتا ہے، کوئی دوسرا اسے پاک نہیں کرتا۔ اخلاقی ذمہ داری کے اصول کو اس طرح صاف صاف سمجھنے والوں سے کہیں زیادہ وہ لوگ تھے جنھوں نے دل سے محسوس کیا کہ گوتم بدھ کی تعلیم میں بڑی صداقت ہے۔ بدھ متی کتابوں میں عام طور پر جب کوئی شخص گوتم بدھ کی گفتگو یا نصیحت سے اثر لیتا ہے۔ تو وہ کہتا ہے کہ مجھے معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے ایک چیز کو جو گری پڑی تھی اٹھا کر سیدھا رکھ دیا، یا ایک چیز کو ظاہر کر دیا جو چھپی تھی۔ یا ایک بھولے بھٹکے کو رستہ بتا دیا، یا اندھیرے میں روشنی لے آیا کہ جو اندھا نہ ہو وہ چیزوں کو دیکھ سکے۔ یہ عقیدت ظاہر کرنے کے مقررہ کلمات ہیں کسی خاص شخص کے الفاظ نہیں لیکن ان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ گوتم بدھ کے معتقد محسوس کرتے ہیں کہ بدھ نے روحانیت اور اخلاق میں ایک توازن قائم کیا ہے۔ جو پہلے نہ تھا اور جب تک یہ توازن قائم نہ ہو انسان کا نقطہ نظر صحیح اور اس کی جد و جہد بار آور نہیں ہو سکتی۔ اخلاقی ذمہ داری کا بوجھ ہر شخص پر یکساں نہیں ڈالا گیا۔ جو لوگ بھکشو بنے۔ انھوں نے گویا اس کا ارادہ کیا تھا۔ کہ اسی جنم میں نروان حاصل کریں گے۔ اور گوتم بدھ سب کے لئے ایک اصول بتانے کے بجائے ہر بھکشو کو اس کی طبیعت کے مناسب تہذیب نفس اور دھیان کی تعلیم دیتے۔ جو لوگ دنیا کو تج کر بھکشو نہیں بن گئے تھے۔ وہ دھرم کے اصولوں کو جس حد تک ممکن ہوتا برتنے کی کوشش کرتے۔ یہ اصول اخلاقی اور روحانی جد و جہد کی ہر شکل پر حاوی مانے گئے مزید توضیح کی گئی، ان کے ماتحت اور اصول مرتب کئے گئے۔ اور اوامر و نواہی کی فہرستیں بنائی گئیں بھکشوؤں کے لئے ان کی پوری پابندی لازمی تھی۔ اپاسک اگر جاندار چیزوں کی جان لینے سے پرہیز کرتا جھوٹ نہ بولتا۔ نشے کی چیزوں سے پرہیز کرتا۔ اور حسب حیثیت ان لوگوں کی خدمت امداد یا سرپرستی کرتا۔ جنھوں نے دنیا کو تج دیا تھا۔ تو یہ اس کے لئے کافی تھا۔ وہ گویا راہ راست پر آ گیا تھا۔ اور نیک زندگی بسر کرنے کی اسے توفیق ہو گئی تھی۔ مگر نروان کا حصول اس نے کسی آئندہ جنم کے لئے اٹھا رکھا تھا۔ بدھ متی جانتے تھے کہ مورکھ چاہے جنم بھر پنڈت کی سیوا کرے اس کو دھرم کا گیان نہ ہوگا۔ جیسے چمچے کو کھانے کا مزہ نہیں ملتا۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ جو لوگ روحانی زندگی بسر نہیں کرتے۔ اور نیک اعمال کی دولت جمع نہیں کرتے وہ اس دنیا کی نعمتوں کو حسرت سے دیکھتے ہیں جیسے بوڑھے بگلے سوکھتے ہوئے تالاب میں سڑی گلی مچھلیوں کو۔ لیکن ان نیک اعمال کی بھی جن کا مقصد وجود کی قید کو توڑنا نہ ہو۔ ان کے نزدیک بڑی قدر تھی۔ جیسے پھولوں کے ڈھیر سے آدمی جتنے ہار چاہے بنا سکتا ہے۔ ویسے ہی ہر آدمی دنیا میں پیدا ہوتا ہے

بلائی کے کام کرسکتا ہے۔ اور جیسے کسی شخص کو جو بہت دن پردیس میں رہا ہو۔ اور وہاں سے خوش حال واپس آئے۔ ان کے عزیز دوست اور ہم مشرب خیر مقدم کرتے ہیں۔ ویسے ہی اس شخص کا جس نے نیک کام کئے ہوں مرنے کے بعد دوسری دنیا میں اس کے نیک اعمال استقبال کرتے ہیں۔ گویا وہ بھی ایک عزیز ہے جو گھر واپس آیا ہے۔

میانہ روی

بنارس کے ہرن باغ میں گوتم بدھ نے پہلی مرتبہ اپنے دھرم کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس خطبہ میں انھوں نے اعلان کیا۔ کہ میرا مسلک میانہ روی کا مسلک ہے۔

بھکشوؤ۔ دو طریقے ہیں۔ ایک دوسرے کی ضد جن سے اس شخص کو بچنا چاہئے جس نے دنیا ترک کر دیا ہے۔ یہ دونوں طریقے، جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

ایک تو وہ زندگی ہے جو لطف اندوزی شہوت پرستی کے لئے کر دی گئی ہو۔ یہ ذلیل شہوت ایسی طبعی ہوتی ہے بے ہودہ، ادنیٰ اور لاحاصل ہے اور دوسری طرف وہ زندگی ہے۔ جو نفس کو ایذا پہنچانے میں گزرے، یہ تکلیف دہ، ادنیٰ اور لاحاصل ہوتی ہے۔

اسی مسلک کو انہوں نے ایک شونوں کو نصیحت کرتے ہوئے ایک نہایت لطیف مثال کے ذریعہ سمجھایا۔

کیوں، سون، جب تم دنیادار تھے، بھکشو نہیں ہوئے تھے۔

اس وقت تمہیں ستار بجانا بہت اچھا آتا تھا۔

سچ ہے، حضور "

کیوں "سون، جب تمہارے ساز کے تار بہت کس جاتے تو کیا ان سے کوئی سُر نکلتا تھا۔ کیا ساز اس قابل ہوتا تھا کہ بجایا جاسکے۔

جی نہیں، حضور "

جی نہیں حضور "

اور کیوں، سون، اگر تمہارے ساز کے تار زیادہ کسے ہوتے۔ نہ ڈھیلے بلکہ اتنے کھنچے ہوتے جتنا کہ چاہئے، تو ستار سے کوئی سُر نکلتا تھا کہ وہ اس قابل ہوتا تھا کہ بجایا جاسکے۔

جی ہاں حضور۔

اسی طرح، سون، بہت سخت کوشش کرنے سے طبیعت پر زیادہ زور پڑتا ہے۔ بہت کم کوشش کرنے سے طبیعت پر زیادہ زور پڑتا ہے۔ بہت کم کوشش کرنے سے سستی پیدا ہوتی ہے۔

اس لئے، سون، تمہیں چاہئے۔ کہ اعتدال کے ساتھ جدوجہد کرنے میں ثابت قدم رہو۔ کوشش کرکے اپنی ذہنی قوتوں میں . ہمواری پیدا کرو۔

معقولیت

میانہ روی کے علاوہ گوتم بدھ کے مسلک کی ایک نمایاں خصوصیت اس کی معقولیت ہے۔ گوتم بدھ جانوروں کی قربانی کے خلاف تھے۔ اس لئے کہ انھیں یہ عقیدہ کہ جانوروں کو ذبح کرنے سے ثواب حاصل ہوسکتا ہے معقولیت کے خلاف معلوم ہوا۔ وہ یہ بھی ممکن نہیں سمجھتے تھے۔ کہ اشنان کرکے گناہوں کو دھویا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ اگر پانی میں یہ تاثیر ہوتی کہ گناہ کو دور کر دے۔ تو ساری مخلوق میں مچھلی اور مینڈک اور دریائی سانپ سے زیادہ نیک اور صاف اور ان سے بڑھ کر جنت کا حقدار کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ ان کی تعلیم تھی۔ کہ انسان کو گناہوں سے بچنا چاہئے۔ برہمنوں کی طرح یہ نہ سمجھنا چاہئے۔ کہ گناہ کی نجاست اشنان کرنے تازہ گوبر چھونے، آگ کا طواف کرنے یا سورج کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہونے سے دور ہوسکتی ہے۔ اس معقولیت کی ایک شکل یہ تھی کہ بدھ نے منطقی استدلال سے پرہیز کیا۔ اور ایسی مذہبی بحثوں کو فضول سمجھا۔ جو مذہب کے اصل مقصد یعنی تہذیب نفس اور نجات سے بے تعلق ہوں وہ محض نفس کشی کے خلاف تھے مگر تہذیب نفس کے لئے ان طریقوں کو برتتے تھے۔ جو ان کے زمانے میں دریافت کئے جاچکے تھے۔ وہ یہ مانتے تھے کہ ریاضت کے ذریعہ آدمی اپنے اندر غیر معمولی قوت پیدا کرسکتا ہے لیکن انھوں نے یہ بھی کہا۔ کہ میں کرامات دکھانے کے طریقے کے خطروں کو محسوس کرتا ہوں۔ اس لئے مجھے اُس سے نفرت ہے۔ گھن آتی ہے اور شرمندگی ہوتی ہے۔

انسانی ہمدردی

اخلاقی تعلیم کی تاثیر اور کامیابی بہت کچھ اس کے ______ رجحانات پر منحصر ہوتی ہے۔ گوتم بدھ اور ان کے پیرو بھکشو دنیا سے روٹھ کر الگ نہیں ہوئے تھے۔ وہ ان لوگوں کو گمراہ یا حقیر نہیں سمجھتے تھے۔ جنھیں اتنی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ کہ گھر بار کو تج دیں۔ گوتم بدھ نے اس بارے میں کہا کہ میں تنہائی میں بیٹھ کر دوستی اور ہمدردی کی قوت کو جو میرے من میں سمائی ہوئی ہے ساری دنیا میں پھیلاتا ہوں۔ ان کی اسی طاقت نے میرے ایک مست ہاتھی کو سرنگوں کر دیا جسے ان کے عزیز اور چیلے دیودت نے ان پر چھوڑ دیا تھا اسی قوت سے انہوں نے ملا قبیلے کے ایک سردار راوج کو اپنا معتقد بنالیا۔ ان کے ہر پیرو کا فرض تھا۔ کہ ان کی طرح دھیان کے ذریعہ اپنے دل میں دوستی اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کرے۔ اور گرد وپیش کی دنیا کو اس جذبے سے بسادے یہی اس کے لئے عبادت کا طریقہ تھا۔ برہمنوں کی تعلیم میں نیک عمل سے مراد رسموں کی صحیح تعلیم تھی۔ بدھ نے نیت کی نیکی کو عمل کا معیار بنایا۔ اور فیض پہنچانا اس کا مقصد ٹھہرایا۔ بدھ مت ایا سک پرانی رسموں کی پابندی کرتے تو اس کے ساتھ ایسے کام کرتے جن سے انسانوں اور جاندار مخلوق کو فیض پہنچتا۔ محبت اور ہمدردی کا چرچا بھی کرتے یہی خصوصیت تھی جس نے لوگوں کو مقام اور نسل، زبان و معاشرت کے فرق نظرانداز کرنا سکھایا۔ اور بدھ مذہب کو عالمگیریت کی وہ صفت بخشی جو اس سے پہلے کے کسی مذہب میں نہیں ملتی اور جس کی بدولت وہ آج تک قومیت کی بندشوں سے آزاد ہے۔

مساوات

مساوات کی جو تعلیم بدھ مذہب میں ملتی ہے۔ وہ کچھ اس کی معقولیت کا نتیجہ ہے کچھ انسانی ہمدردی کے جذبے کا۔ گوتم بدھ کے زمانے میں جو بہت سے مذہبی فرقے تھے

سنگھ میں داخل ہونے کے لئے ذات پات کی کوئی قید نہیں تھی۔ اور اس وقت یہ خیال عام تھا کہ نجات کا دروازہ ہر شخص کے لئے کھلا ہے۔ گوتم بدھ کے پیش نظر معاشرے کی اصلاح اور سماجی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ اس لئے کہ سماجی اداروں کی اصلاح یا معاشرتی انقلاب کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ انھوں نے بس اتنا کیا کہ ذات پات کو انسانیت کا معیار نہیں مانا۔ اور ان کے کئی مکالموں میں ثابت کیا گیا ہے۔ کہ برہمن وہ نہیں ہے جو کہ برہمن کا بیٹا ہو۔ بلکہ وہ جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔ جو خود راہ راست پر چلے اور دوسروں کی بھی رہنمائی کرے۔ مشرقی ہند میں برہمن سماج پر غالب ہوتے۔ تو یہ تعلیم خود بخود ایک انقلابی تحریک بن جاتی۔ چوں کہ برہمن یہاں اپنی فضیلت تسلیم نہیں کرا سکے تھے۔ اس لئے گوتم بدھ کی یہ تعلیم ذاتوں کی تقسیم کو اصولی حیثیت سے رد کرنے کے کام آتی رہی۔ لیکن وہ ذات کے خیال کو مٹا نہیں سکی۔

بھکشو؛ جیسے کہ بڑے دریا۔ ۔ ۔ گنگا جمنا، اچیروتی، سرجھومی، جب وہ بڑے سمندر میں گرتے ہیں۔ تو اپنے ناموں کو کھو دیتے ہیں۔ اور ان کا وہی ایک نام ہو جاتا ہے۔ جو کہ بڑے سمندر کا ہے ویسے ہی بھکشو۔ چاروں ذاتوں کے لوگ اشراف، برہمن، ویش اور شودر جب وہ اس تعلیم اور قاعدے کے مطابق جو بدھ نے بنایا ہے اپنے گھربار کو چھوڑ دیتے ہیں اور اس حیثیت کو اختیار کرتے ہیں جس میں کسی کا کہیں گھر نہیں ہوتا تو ان کا پرانا نام باقی رہتا ہے نہ خاندان، وہ صرف ایسے بھکشو کہلاتے ہیں۔ جو کہ ساکیا کے بیٹے (یعنی بدھ) کے پیرو ہیں۔ غالباً گوتم بدھ کے خاص چیلوں میں برہمنوں اور کشتریوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ لیکن سنگھ میں ذات یا پیشے کی بنا پر کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ سنگھ میں ادنیٰ ذات کے لوگ بھی تھے۔ اور حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اعلیٰ اور ادنیٰ ذات والوں کی نسبت خاص صحیح تھی۔ گوتم بدھ نے کسی ایک ذات یا ادنیٰ ذاتوں کے لوگوں میں اپنی تعلیم پھیلانے کی کوشش نہیں کی۔ اور جن پیروکاروں نے دنیا چھوڑ کر فقیری اختیار کی تھی۔ انھیں ذات پات کی بندشوں کو توڑنے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ میل جول میں گوتم بدھ ذات اور سماجی حیثیت کی پروا نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ دورہ کرتے ہوئے ویسالی کے قریب پہنچے۔ تو وہاں ایک مال دار طوائف امبپالی نے انھیں اور ان کے ساتھیوں کو اپنے باغ میں ٹھہرنے اور وہیں کھانا کھانے کی دعوت دی۔ گوتم بدھ نے دعوت قبول کر لی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ویسالی کے شرفا انہیں دعوت دینے آئے۔ اور انھیں بڑی حیرت ہوئی جب ان کی خاطر گوتم بدھ نے امبپالی کی دعوت کو رد کرنے سے انکار کر دیا۔ امبپالی نے بدھ اور بدھ کے ساتھیوں کو کھانا کھلایا۔ اور اس کے بعد اپنا باغ سنگھ کی نذر کر دیا۔ اس کا یہ نذرانہ بھی قبول کر لیا گیا۔

بدھ مذہب گوتم بدھ کے بعد

بدھ مذہب میں کتاب اور کتابی علم کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس سے یہ بڑا نقصان ہوا کہ عقائد کا تعین نہیں کیا جا سکا اور سنگھ کے اندر بہت جلد اختلاف پیدا ہو گئے۔ جو وقت کے ساتھ بڑھتے رہے۔ لیکن اس سے یہ بڑا فائدہ بھی ہوا کہ اس مذہب کی اشاعت ہر جگہ اور ہر طریقے سے کی جا سکی گوتم بدھ عام بول چال کی زبان میں وعظ کہتے اور نصیحت کرتے اور اپنا مطلب عام تجربے اور مشاہدے کی باتوں کا حوالہ دے کر ذہن نشین کراتے۔ بدھ مت کے پرچار کرنے والوں کی زبان کی وجہ سے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ کیوں کہ جو شخص جس جگہ کا ہوتا وہیں کی زبان بدھ کا پیغام عوام تک پہنچاتا۔ اس خیال نے کہ گوتم بدھ اس آخری جنم سے پہلے ہزاروں مرتبہ جنم لے چکے ہیں اور جن اخلاقی صفات کی بدولت انھوں نے نروان حاصل کیا۔ وہ انھوں نے پچھلے جنموں میں رفتہ رفتہ پیدا کیں۔ داستان گوئی کے لئے میدان صاف کر دیا۔ اور وہ قصے بیان کئے جانے لگے۔ جواب ہمیں جاتکوں میں ملتے ہیں ان میں کوئی واضح اور مرتب اخلاقی یا دینی تعلیم نہیں ہے۔ لیکن ان میں نیک کام کرنے کا شوق، فیاضی، ہمدردی اور ایثار کا وہ جذبہ ملتا ہے۔ جس کی گوتم بدھ نے تلقین کی تھی۔ یہ جذبہ بدھ متیوں کی خصوصیت بن گیا۔ اور اس نے بتدریج گوتم بدھ کو ہمدردی اور ایثار کا مجسمہ بنا دیا۔ تاریخ کے لحاظ سے ہم کہیں گے۔ کہ بدھ متی آہستہ آہستہ بدھ کی اصل تعلیمات کو بھلاتے اور ان سے دور ہوتے گئے۔ لیکن جو باتیں لوگوں کے ذہن میں محفوظ رہ سکی تھیں۔ ان میں بھی یہ قدرت تھی۔ کہ ہندوستان کو ایک نئی تہذیب کے زیور سے سنواریں۔ اور اسے حسن کی نئی ادائیں سکھائیں۔

رُباعیات

حق بات کی تائید کروں تو مجرم
حالات پہ تنقید کروں تو مجرم
تم جرم کی تخلیق کرو تو معصوم
میں جرم کی تردید کر دوں تو مجرم

خود پست ہیں، کردار بہت اونچا ہے
اقوام کا بازار بہت اونچا ہے
ہیں منحنی اس دور کے انسان تو کیا
تہذیب کا معیار بہت اونچا ہے

فضا ابن فیضی

ضیاء الرحمٰن الاعظمی، ایم۔اے
ملک عبدالعزیز یونیورسٹی مکہ مکرمہ

یورپ میں قرآن کریم

صلیبی جنگوں نے اہل یورپ کو اسلام اور مسلمانوں کے مسائل پر غور و فکر کرنے سے پہلے تیار کر دیا تھا بلکہ یوں سمجھئے کہ مشرق و مغرب میں نفرت کی ایک عظیم دیوار حائل ہو گئی تھی حالانکہ خلفاء عباسیہ خصوصاً ہارون رشید سے المانی امپائر شارلمان کے بڑے اچھے تعلقات تھے یہاں تک کہ تحفے تحائف کا آپس میں رواج تھا ہارون الرشید نے موتیوں کا ہار، عطر کی بھاری مقدار ریشمی جوڑے اور ایک عجیب و غریب گھڑی شارلمان کو ہدیہ میں بھیجی تھی۔ شارلمان نے ۷۹۵ء میں ایک وفد خلیفہ ہارون الرشید کی خدمت میں روانہ کیا اور خلیفہ سے درخواست کی کہ مقامات مقدسہ کی زیارت کے لئے مسیحیوں کو اجازت دے دی جائے نیز دار الخلافہ بغداد اور آخن میں دوستانہ تعلقات کی بھی خواہش ظاہر کی جس کو خلیفہ نے بڑی خوشی سے قبول کر لیا۔

سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں بعض مستشرقین اسلامی علوم کی طرف متوجہ ہوئے اور عربی زبان و ادب میں خاصی مہارت حاصل کرنے کے بعد تحقیق و تدقیق میں مشغول ہو گئے مثلاً یوہان یعقوب رایسکہ جو مستشرق سکاٹ لیز ________ کا شاگرد تھا اس نے عربی علوم کا بڑی گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ نیز عالم اسلام کی بے شمار زبانوں میں دست رس حاصل کی۔ اور اپنے شہر لیزگ ________ میں علوم عربیہ میں ریسرچ کے لئے ایک عظیم الشان ادارہ قائم کیا جو نہ صرف جرمنی بلکہ اس وقت سارے یورپ میں تنہا ادارہ تھا۔
اس طرح سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں اسلامی علوم اور اس کے متعلقات پر ایسی ایسی تحقیقات کی گئیں کہ بجا طور پر آج یورپ فخر کر سکتا ہے اور صحیح معنی میں یہی وہ زمانہ ہے جب نفرت و تعصب کی گھاٹیوں سے نکل کر صحیح معنی میں اسلامی تعلیمات کو عوام کے سامنے پیش کیا گیا۔

اسی زمانہ میں جرمنی میں عربی کے بڑے بڑے ضخیم معاجم لاطینی رسم الخط میں تیار کئے گئے اور عربی و فارسی مخطوطات پر بھی کام شروع کر دیا گیا حتی الامکان ان کو جرمنی زبان میں نقل کرنے کی کوشش کی گئی ۱۸۱۸ء میں جرمنی میں بون یونیورسٹی قائم ہوئی اور مستشرق زیتاج کو مشرقی زبانوں کا استاد مقرر کیا گیا اس نے عربی لاطینی قاموس بھی تیار کی جس پر آج بھی سب سے زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے اسی زمانے میں قرآن کریم کے الفاظ اور عربی اصطلاحات کی بڑی بڑی ضخیم فہرستیں تیار کی گئیں۔ مثلاً مستشرق فلوگل ________ کی کتاب "المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم" جو کشف الظنون کے بعد شائع ہوئی۔ انیسویں صدی عیسوی میں مستشرق عالم فلایشر ________ عربی مخطوطات کی طرف متوجہ ہوا جس کے ہاتھوں عجیب و غریب تحقیقات پایہ تکمیل کو پہنچیں جس کے عظیم کارناموں کی وجہ سے عمید الاستشراق العربی کا لقب دیا گیا۔

یہ سب کچھ قرآن عظیم کو اس کی اصل زبان میں سمجھنے کے لئے کیا گیا تھا تاکہ اس کے نور سے براہ راست روشنی حاصل کی جائے اور رشد و ہدایت کے لئے اسی کی طرف رجوع کیا جائے۔

تحقیق و تدقیق کا میدان مفردات قرآن تک ہی نہیں رہا بلکہ اس سے تجاوز کر کے علوم قرآن تک پہونچ گیا انیسویں صدی میں شان نزول و سورتوں کی ترتیب و آیتوں میں ربط اور مختلف قرآت پر بھی کتابیں لکھی گئیں۔ مثلاً مستشرق عالم نولڈکے نے ۱۸۶۰ء میں ایک کتاب لکھی جو قرآن سے متعلق مختلف موضوعات پر مشتمل ہے اس کا نام "تاریخ القرآن الکریم" رکھا گیا جس کی اہمیت کے پیش نظر اور اس فن میں واحد قابل اعتماد مرجع ہونے کی وجہ پر بجیشتر نے دوبارہ ۱۹۳۶ء میں شائع کرایا۔

جرمن مستشرقین کی کوشش صرف تصنیفات کی حد تک محدود نہیں تھیں بلکہ آگے چل کر انھوں نے مسلمانوں کی بعض تالیفات کو بھی شائع کرنے کا اہتمام کیا مثلاً "المختصر فی شواذ القرآن" ابن خالویہ "غایۃ النہایۃ فی طبقات القراء" ابن جزری "التیسیر فی القرآت" "والمقنع فی رسم مصاحف الامصار" ابو عمرو عثمان بن سعید الدانی کی تالیفات کو شائع کیا گیا ۱۵۳۰ء میں پاگانی آگے بڑھا اور قرآن مجید کا ترجمہ شائع کیا۔ لیکن پاپا پولس ثالث ۱۵۳۴ء۔ ۱۵۴۹ء نے اس کے تمام نسخوں کو جلا دینے کا حکم صادر کر دیا مگر جب پاپا الکسندر سابع کا دور آیا ۱۵۵۵ء تا ۱۵۶۱ء تو اس نے دوبارہ شائع کرنے کی اجازت دے دی اور پاپا پولس کے حکم کو کالعدم قرار دیا گیا نیز ترجمہ وغیرہ کی کھلی آزادی مل گئی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تحقیق کے مطابق اتلاف کرنے کا حکم دینے والا الکسندر سابع تھا۔

یورپین زبان میں قرآن کریم کا سب سے پہلا ترجمہ

پطرس ________ المتوفی ۱۱۵۶ء سب سے پہلا شخص ہے جس کے حکم سے قرآن کریم کا سب سے پہلا ترجمہ یورپین زبان میں تیار کیا گیا اور جس کی تکمیل ۱۱۴۳ء کے لگ بھگ ہوئی تکمیل کے بعد اس کو دیرطلائی کے رئیس برنرڈ ورس کی خدمت میں بھیج دیا گیا جس نے کنیسا میں لاہوتیت پر تحقیق کرنے کے لئے رکھوا دیا یہ دوسری صلیبی جنگ کے چار سال بعد کا واقعہ ہے اس ترجمہ کو تھیوڈر ________ نے بازل میں سے ۱۵۴۳ء میں طبع کرایا اور پھر اس سے اٹلی، جرمنی اور ہولنڈی زبان میں نقل کیا گیا۔

اس کے بعد ۱۵۵۰ء اور ۱۷۲۱ء میں ببلیا ٹدر کا ترجمہ لیسزن ________ سے شائع ہوا

وریہیں سے لاطینی زبان میں قرآنی رسم الخط کے ساتھ ۱۶۹۸ء میں دوسرا ترجمہ جوسٹس فریڈریکوس نے شائع کرایا۔

اور بعد میں یہی تراجم جرمنی اور ہولنڈی زبان میں بالترتیب ۱۶۱۶ء اور ۱۶۴۷ء میں ہامبورغ میں شائع ہوئے۔ ایک دوسرا ترجمہ لاطینی زبان میں لوdوس مراکشی کے ہاتھ سے ۱۶۹۸ء میں شائع ہوا یہ بھی عربی رسم الخط کے ساتھ تھا۔

جرمنی میں خدمت قرآن

مذہب کی تنگ نظری اور پاپائیت کے خطرناک حد تک تسلط نے اہل یورپ میں آزادی فکر کو جنم دیا صدیوں تک مذہبی غلامی نے ان کے افکار کو جس بے دردی سے کچلا تھا اس نے ان کو مذہب سے بغاوت کرنے پر آمادہ کر دیا اب وہ ہر میدان میں تحقیق و تفتیش کے لئے آگے بڑھے ان محققین میں سے بعض مشرقی علوم و ادب کی طرف لپکے اور کنیسا کے تصادم کے باوجود وہ علم و فن کے میدان میں آگے بڑھتے ہی رہے اور قرآن مجید کو المانی زبان میں نقل کرنے کا کام شروع ہو گیا دیکھتے ہی دیکھتے بے شمار تراجم بازار میں آ گئے۔

جرمنی میں سب پہلا لاطینی ترجمہ اسکویجر ________ کا ہے جو ۱۶۱۶ء میں شہر نوریبرغ میں شائع ہوا پھر ۱۶۹۴ء میں ہینکمان نے شائع کرایا جو ۵۶۰ صفحات پر مشتمل ہے جس میں ۸۰ صفحات کا مقدمہ ہے اس میں ہینکمان نے علوم شرقیہ اور لغۃ عربیہ پر ممتاز شخصیتوں کی آرا۔ کو جمع کر دیا ہے اور اہل یورپ کی غفلت اور عربی زبان و ادب سے بے نیازی پر بہت افسوس ظاہر کیا ہے۔ ہینکمان کی طباعت کے دو نسخے آج تک المانیا میں محفوظ ہیں ایک ہامبورغ کی پبلک لائبریری میں اور دوسرا ہامبورغ یونیورسٹی میں۔

اس کے بعد تو پھر جرمنی میں قرآن کریم کے بے شمار ایڈیشن نکلے مثلاً فردیرک... ________ کا ایڈیشن جو ۱۷۰۲ء میں شائع ہوا پھر سیل ________ کے انگریزی ترجمہ کو تھیو آرنولڈ ________ نے جرمنی زبان میں ۱۷۴۶ء میں شائع کرایا کہا جاتا ہے کہ جرمنی زبان میں سب سے کامیاب ترجمہ ہلیسین ________ کا ہے جو ۱۷۷۳ء میں طبع ہوا اسی ترجمہ کو تہذیب و تنقیح کے بعد جی وال ________ نے ۱۸۲۸ء میں شائع کیا البتہ جس ترجمہ کو سب سے زیادہ شائع ہونے کا موقع ملا وہ اولمان کا ہے جو ۱۹۵۳ء میں طبع ہوا۔

قرآن کریم کے مختلف نسخوں کی میوزیم

کہا جاتا ہے کہ میونیخ میں قرآن کریم کے مختلف نسخوں کو جمع کرنے کا ایک میوزیم ہے جس نے اپنی وسعت اور خدمات میں ساری دنیا کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اس میں ہر صدی کے نسخے جمع کئے گئے ہیں تاکہ قرآن اور اس کے متعلقات پر ریسرچ کرنے والوں کے لئے وافر مواد فراہم کیا جائے۔

اس میوزیم کا بانی مستشرق بریجشسپر ہے لیکن پایۂ تکمیل کو پہونچانے والا ڈاکٹر بریٹل ہے ان دونوں مستشرقوں نے بڑی محنت و کاوش سے اس کو بنایا ہے اسی سے ملحق ایک معہد بھی ہے جس میں قرآن کریم اور اس کے متعلقات کی تعلیم بھی دی جاتی ہے بعد میں میونیخ یونیورسٹی اور حکومت المانیا نے بھی اس کی وسعت اور ترقی کی طرف توجہ یہاں تک کہ ساری دنیا میں اپنے مقصد کا واحد میوزیم بنا کر چھوڑا۔

اس میوزیم میں قرآنی علوم سے متعلق ان کتابوں کے فوٹو گراف بھی ہیں جو اب تک شائع نہیں ہوئی ہیں ہاتھوں سے لکھے گئے ہزاروں قرآن مجید کے عکس موجود ہیں جو مختلف زمانوں میں مشرق و مغرب میں لکھے گئے۔ یہاں تک کہ پہلی صدی ہجری کے لکھے گئے قرآن کریم کے بھی بعض نمونے پائے جاتے ہیں ان مختلف زمانوں کے نسخوں کو جمع کرنے کا مقصد مقابلہ کرنا اور دیکھنا تھا۔ کہ اس میں کچھ تحریف و تبدیل تو نہیں کیا گیا نیز ہر زمانے کے رسم الخط پر بھی تحقیق کرنے والوں کو مواد مل جائے گا تفاسیر اور قرآنی علوم کے مخطوطات بھی کثیر تعداد میں محفوظ ہیں اسی لئے اس میوزیم سے لوگوں نے عجیب و غریب تحقیقات کی مثلاً کاغذ کی صنعت پر ریسرچ، تجلید کرنے پر ریسرچ، قرآن کی تزئین و تحسین پر ریسرچ وغیرہ۔ لیکن صد افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ قرآن عظیم کا بڑا ذخیرہ دوسری عالم گیر جنگ کی بھینٹ چڑھ گیا۔
۱۹۳۹ء۔ ۱۹۴۵ء

جرمنی میں ترجمہ کلام اللہ کی مکمل فہرست

۱۔ سلیمان شویجر۔ انھوں نے براہ راست عربی سے اٹلی زبان میں اور اٹلی سے جرمنی زبان میں ترجمہ کیا جو ۱۶۱۶ء، ۱۶۲۳ء، ۱۶۵۹ء اور ۱۶۶۴ء میں شائع ہوا۔

۲۔ یوحنا اندریاس انڈر۔ انھوں نے قرآن محمدی کے نام سے ۱۶۵۹ء میں شائع کیا۔

۳۔ یوحنا لانجہ۔ انھوں نے ۱۶۸۸ء میں شائع کیا۔

۴۔ ایغرہارڈ۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے ساتھ ترجمہ شائع کیا۔

۵۔ داؤد نیوٹر۔ اس نے "محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جدید مسجد" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں قرآن مجید کا المانی ترجمہ بھی شامل ہے۔ نیز قرآن پر بعض اعتراضات بھی کئے ہیں جو ۱۷۰۳ء میں شائع ہوئی۔

۶۔ تیوڈور آرنولڈ۔ انگریزی سے ترجمہ کیا جس کو جارج لیبو نے ۱۷۴۶ء میں مکمل کیا

۷۔ داؤد فریڈرک ماجرلین عربی زبان سے کیا گیا سب سے پہلا ترجمہ ہے جو فرانکفورٹ سے ۱۷۷۲ء میں چھپا۔

۸۔ فریڈرک ایرہارد بولس۔ یہ بھی براہ راست عربی سے ترجمہ کیا گیا جو ۱۷۷۳ء میں شائع ہوا اور ۱۷۷۵ء میں دوسرا ایڈیشن نکلا۔

۹۔ ادجسٹ۔ ترجمہ کا نام "تعلیم محمد" رکھا جو ۱۷۷۹ء میں شائع ہوا۔

۱۰۔ یوحنا کریسٹن۔ اس نے ترجمہ کا نام "چھوٹا قرآن" رکھا۔

۱۱۔ یوسف فون ہامر۔ قرآن کے بعض اجزا کا ترجمہ ہے جو جرمن اشعار میں کیا گیا ہے۔۔۔ ۱۸۰۷ء اور ۱۸۳۴ء۔

۱۲۔ فون روسنزویج۔ یہ چار آسمانی کتابوں پر مشتمل ہے تورات، زبور، انجیل اور قرآن پاک ۱۸۱۲ء میں شائع ہوا۔

۱۳۔ کونراد ہیلمبور۔ یہ قرآن کی بعض آیات کا ترجمہ ہے ۱۸۲۲ء میں شائع ہوا۔

۱۴۔ فریڈریک روگیرٹ ۔ کتاب کا نام "نموذج ترجمۃ القرآن" رکھا جو ۱۸۲۴ء میں شائع ہوا ۔ اس کے بعد مستشرق ادجسٹ مولیر نے بعض آیات کا ترجمہ ۱۸۱۸ء میں شائع کرایا جو دراصل فریڈریک کے ترجمے کی تلخیص ہے ۔

۱۵۔ ھ ۔ ھ ۔ تشوک ۔ کتاب کا نام "السنار فی العہد القدیم" ہے اس کتاب میں قرآن مجید کی بعض آیات کا ترجمہ درج کیا گیا ہے ۔

۱۶۔ موئیل فریڈریک جونڈوال ۔ کتاب کا نام "قرآن" رکھا جو فریڈریک بوسیں کے ترجمہ سے لیا گیا ہے ۔ ایک تاریخی مقدمہ بعض شروح اور فہرست پر مشتمل ہے ۱۸۲۶ء میں شائع ہوا ۔

۱۷۔ ل ۔ اولمان ۔ کتاب کا نام "قرآن" ہے جو اصل عربی سے مترجم ہے مختصر سی شرح بھی موجود ہے سب سے پہلی مرتبہ ۱۸۴۰ء میں کریفلڈ سے شائع ہوا پھر دوسری مرتبہ شہر میونخ سے ۱۹۵۸ء میں چھپا ۔

۱۸۔ جارج فریڈرک ڈاود ۔ اس کی تالیف کا نام ہے "محمد اور ان کی کتاب" جس میں حسب ذیل سورتوں کا ترجمہ شامل ہے ۔ ۲-۶-۱۱ ۲۵-۲۳- ۴۱-۴۴-۵۹-۶۱-۱۱۲ ۱۸۴۵ء میں شائع کیا ۔

۱۹۔ یوتوفیلس ۔ اس نے اپنی کتاب کا "مختارات من اشعر الشرق" رکھا جس میں مندرجہ ذیل سورتوں کا ترجمہ شامل ہے ۔ ۹۹-۱۰۴-۱۰۹ شہر لیبزخ میں ۱۸۵۳ء میں شائع کیا ۔

۲۰۔ الویس شبرنجر ۔ اس کی کتاب کا نام ہے "سیرۃ محمد اور ان کی تعلیم" اس میں بھی بعض آیتوں کے ترجمے ملتے ہیں جو برلین سے ۱۸۶۱ء میں طبع کرایا ۔

۲۱۔ س ۔ بلومنا و ۔ اس نے اپنی کتاب کا نام "کتاب مقدس تلمود اور قرآن میں اللہ اور انسان" ۱۸۶۵ء میں چھپی ۔

۲۲۔ مارتھن کلامرٹ ۔ ابتدا کی پچاس سورتوں کا المانی اشعار میں ترجمہ کیا نیز اس میں تمام مکی سورتوں پر ایک مبسوط مقالہ بھی شامل ہے جو ۱۸۹۰ء میں شائع ہوا ۔

۲۳۔ تھیوڈر ۔ براہ راست عربی سے ترجمہ ہے سن طبع ۱۹۰۱ء ۔

۲۴۔ ماکس ہننیغ ۔ مقدمہ کے ساتھ قرآن مجید کا ترجمہ بھی ہے ۔ ۱۹۰۱ء اور ۱۹۶۰ء اب دوبارہ ایک جدید مستشرق عالم انماری شیمل نے تحقیق وغیرہ کے بعد ۱۹۶۳ء میں شائع کیا ۔

۲۵۔ ایریخ بشیوف ۔ بعض سورتوں کے ترجمے پر مشتمل ہے ۔ ۱۹۰۷ء ۔

۲۶۔ اسس الشریعۃ المحمدیہ ۔ اس کا مولف مجہول ہے سن طبع ۱۹۰۴ ۔

۲۷۔ برطولیٹ ۔ نصوص دینیہ ۔ اس میں قرآن کی بعض آیات کا ترجمہ ہے سن طبع ۱۹۰۸

۲۸۔ یوسف صیل ۔ الدین الاسلامی ۔ اس میں بھی آیات کا ترجمہ ہے سن طبع 1915

۲۹۔ ارنسٹ ہارڈور "مختارات من القرآن" سن طبع 1915

۳۰۔ لازاروس جولڈشٹ میڈرت ۔ اس نے اصل عربی سے ترجمہ کیا سن طبع 1912 و ۱۹۲۲ ۔

۳۱۔ ٹوروف اور سکولیف ۔ ان دونوں نے مل کر قرآن کا ترجمہ کیا ۔

۳۲۔ محمود مختار باشا ۔ العالم الاسلامی فی ضوء القرآن والحدیث ۔ اس میں بعض سورتوں کا ترجمہ شامل ہے سن طبع ۱۹۱۵ء ۔

۳۳۔ ایڈورلٹمان ۔ مجموعۃ نصوص لطلاب تاریخ الادیان" اس میں بھی بعض سورتوں کا ترجمہ ہے ۔

۳۴۔ ہومرٹ "القرآن" سن طبع ۔ ۱۹۲۳

بقیہ :۔ تعلیم نسواں

متذکرہ بالا معروضات میں پیش کردہ بعض لوازم اور ان کے باہمی توازن پر نظر رکھتے ہوئے کسی تعلیمی ادارے کو اچھی طرح چلایا جا سکتا ہے ۔ آخر میں اتنا اور عرض کر دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ انتظامی معاملات اور اسکول کے نظم میں جن لوگوں کو جو فرائض تفویض ہوں اُن کی حد تک ان کا با اختیار ہونا بہت ضروری ہے ۔ اُن میں مداخلت کتنی ہی نیک نیتی سے ہو ان کو ناقابلِ اعتماد ٹھہرانے اور بے دست و پا کر دینے کے مترادف ہے جس کے بعد وہ جواب دہ نہیں رہتے ۔ اختیارات کا ایک سے زائد جگہوں پر مرتکز ہونا اس سے زیادہ برے نتائج پیدا کرتا ہے ۔ یہ تو انتظامی شرک ہے اور اس کی شریعت میں ناقابل معافی غلطی ۔ اختیارات کی تو فطرت میں ایک جگہ مرتکز ہونا ہے اس لئے شکر رنجیاں پیدا ہونگی اور نظم جیسی کوئی چیز باقی نہ رہے گی ۔ کوئی کارکن ذمہ دار ہوتے ہوئے بھی غلطی کر بیٹھے ، اگر وہ کسی حیثیت سے تباہ کن نہ ہو تو فوری مداخلت کے بجائے ناخوشگوار نتائج سامنے آنے پر اس کو اس طرف توجہ دلانا زیادہ موثر اور مفید ہوگا ۔ اگر کارکن احساس ذمہ داری سے بالکل عاری نہیں ہے تو اس نے اس سے پہلے ہی اپنی غلطی کا احساس کر کے اپنی اصلاح کر لی ہوگی ورنہ اصلاح بعد میں بھی ممکن ہے ۔ جا و بے جا مداخلت الٹا میں سرے سے کسی ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے یا کسی بھاری ذمہ داری کو بڑھ کر قبول کرنے یا ادارہ کی فلاح و بہبود کے لئے تجاویز پیش کرنے (جس میں مجوزہ پر ہی اس پر عمل درآمد کا بوجھ ڈال دیا جاتے) کا حوصلہ باقی نہیں رہ جاتا جہاں کام کرنے کی آزادی (اختیارات) نہیں وہاں سرے سے کوئی ذمہ داری نہیں ۔

بشکریہ البنات نئی دہلی ۔

گرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ

اقبال

جناب شریف احمد خاں

تعلیم نسواں

تعلیم نسواں کی اہمیت اور ضرورت کی وضاحت شاید غیر ضروری اور تضیع اوقات ہی ہو کیوں کہ اصولی طور پر اسے تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہیں ہوتا کہ ملک وقوم وملت کی قسمت کا انحصار تمام تر اس امر پر ہے کہ کل کے معمارانِ ملک وملت کن ماؤں کا دودھ پی کر اور کن کی گودوں میں پل کر جوان ہوتے ہیں اور اپنی ذمہ داریاں سنبھالتے ہیں۔ دنیا کے کاروبار چلانے اور بنی نوعِ انسان کی ایک کثیر تعداد کی قسمتوں کے فیصلے کرنے کے لئے جس شخصیت اخلاق و کردار کے افراد درکار ہیں وہ جاہل، کندۂ ناتراش اور خام کردار والی ماؤں کی پرورش و پرداخت میں پل کر جوان ہوں گے یا زیورِ تعلیم و تربیت سے آراستہ، شائستہ اور صاحبِ کردار ماؤں کی گودوں میں لیکن بڑی حیرت ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ عمل کی دنیا میں اس بارے میں ایک عام سرد مہری بلکہ مجرمانہ غفلت پائی جاتی ہے۔ وہ لوگ بھی جو لڑکوں کے لئے تعلیم کو ضروری سمجھ کر اس میں کوشاں ہوتے ہیں، لڑکیوں کے لئے اس کی کوئی اہمیت اور ضرورت نہیں سمجھتے۔ حالانکہ یہ عام تجربہ ہے کہ لڑکیوں میں حصولِ علم کا شوق اور اس کے لئے دل و جان سے کوشش لڑکوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ پائی جاتی ہے۔ ان کا حلقۂ کار محدود، اس لئے گھر سے باہر کی دنیا میں دل چسپیاں اور نقل وحرکت محدود اور نتیجہ کے طور پر ان سے بچنے والا وقت تمام تر حصولِ تعلیم کے لئے وقف رہتا ہے۔ پھر انھیں والدین کی کھلی مخالفت نہیں تو سرد مہری سے مستقل کشمکش کے ساتھ تعلیم کو جاری رکھنا ہوتا ہے اس لئے ان میں احساس ذمہ داری لڑکوں سے زیادہ ہوتا ہے، اور کامیابی کے لئے کوششیں بھی اسی حد تک میں نمایاں ہوتی ہیں۔ یہ امر بھی کچھ کم افسوسناک نہیں ہے کہ چوں کہ لڑکوں کی طرف سے تعلیم یافتہ شریکِ زندگی کا مطالبہ ہونے لگا ہے اس لئے بعض والدین محض شادی کے دیگر لوازم زیور، جہیز وغیرہ کی فہرست میں زیورِ علم کو شامل کر کے تعلیم و تربیت کے حقیقی مقصد سے یکسر صرفِ نظر کرتے ہوئے سند کے کسی طرح حصول میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ خاصے پڑھے لکھے اور متدین لوگوں کی اس قسم کی حرکتیں اور زیادہ افسوسناک ہیں۔

تعلیم نسواں ہی نہیں، مطلق تعلیم و تربیت کا صحیح مفہوم، ایسا نہیں، کہ لوگوں پر واضح نہ ہو۔ مگر دشواری یہ ہے کہ وہ ذہن میں مستحضر نہیں رہتا اور کچھ لوگ اسے کاسۂ گدائی سمجھ کر اپنی آئندہ نسلوں کو مہیا کر دینا چاہتے ہیں۔ لوگوں کے لئے تو عام تصور کے مطابق وہ حصولِ معاش خصوصاً ملازمت، چاکری یا غلامی میں گرفتار رہنے کا ذریعہ ہے ہی، لڑکیوں کے بارے میں بھی گفتگوؤں میں اس قسم کی باتیں سننے میں آتی ہیں کہ "خدا جانے لڑکی کو آئندہ کن حالات سے سابقہ پیش آئے، اگر پڑھی لکھی ہوگی تو اپنا اور بچوں کا پیٹ تو پال سکے گی۔ اور پھر اس معاشی دور میں جب تک گھر کا ہر فرد حصولِ معاش میں معاونت نہ کرے تو گرہستی کی گاڑی نہیں چل سکتی یا مطلوبہ معیارِ زندگی قائم نہیں رکھا جاسکتا اس لئے بھی ضروری ہے کہ اُسے کسی قابل بنا دیا جائے"۔ تعلیم نسواں کی اس ضمنی افادیت سے انکار تو نہیں کیا جاسکتا مگر یہ گھٹیا مقصد تو کسی ادنیٰ گھریلو صنعت یا حرفہ کے اختیار کرنے سے بھی حاصل ہو سکتا ہے جو عورتوں کو عام طور پر سکھا دیئے جاتے ہیں۔ تعلیم و تربیت کا اعلیٰ مقصد یعنی کردار سازی اس بری طرح آنکھوں سے اوجھل ہوا ہے کہ دنیا کے بہترین دماغ اور ماہرینِ تعلیم بھی انسانی زندگی کے حیوانی جز کو زیادہ سے زیادہ آرام دہ اور پُر کیف بنانے کے لئے تو تعلیم کے میدان میں اس کی ترقی کے لئے نت نئی تدبیریں سوچتے اور اختیار کرتے رہتے ہیں مگر اس کے روحانی اور اخلاقی وجود کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے، ان کو ترقی اور جلا دینے کو انھوں نے یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ اس کے بارے میں سوچتے تک نہیں۔ شاید شعوری طور پر وہ اس جز کو تسلیم ہی نہیں کرتے اور انسان اور کائنات میں اس مقام کے بارے میں ان کے تصورات انیسویں صدی میں ابھرنے والے گمراہ کن نظریات سے فلسفوں کی بنیادوں پر قائم ہیں۔ اس لئے اگر وہ انسان کو تمام تر ایک حیوانی وجود فرض کر کے اس کی مادی اور حیوانی ضروریات سے برتر کسی چیز کے لئے کوشاں ہوتے تو حیرت ہوتی۔ اقوام شرق کے پاس باقیات الصالحات کے طور پر جو کچھ ان کے قدیم سرمایہ سے مغرب کے فلسفوں سے تصادم کے بعد رہ گیا ہے اور جس کو ان میں سے تھوڑے سے لوگ اب بھی خلوص کے ساتھ سینوں سے لگائے ہوئے ہیں ان میں اسلام کے دیئے ہوئے تصورات بہت واضح ہیں اور ان کی روشنی میں حصولِ علم سارے مردوں اور عورتوں کے لئے بلا امتیاز ایک مقدس فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ قرآن نے اپنے ماننے والوں کو چل پھر کر دنیا کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے اور فکر اور عقل کو کام میں لانے کی دعوت پر اس قدر زور دیا کہ مسلمانوں نے حصولِ علم، مشاہدہ، مطالعہ اور غور و فکر اور علمی تحقیق کو بہت جلد اس مقام پر پہنچا دیا کہ وہ قومیں جو تہذیب شائستگی اور علوم و فنون میں اس وقت دنیا کی امامت کے منصب سے سرفراز تھیں ان کے سامنے گرد ہو کر رہ گئیں۔ انھیں حصولِ علم کی راہ میں ہر طرح کی صعوبتیں انگیز کرنے کی تلقین تمثیلی انداز میں اس طرح کی گئی تھی کہ وہ ضرورت متقاضی ہو تو، چین جیسے دور دراز ملک کا سفر اختیار کرنے سے بھی پہلوتہی نہ کریں۔ انھوں نے عملاً چین جا کر ثابت کر دیا کہ وہ علم و حکمت کے شیدائی ہیں اگرچہ انھیں چین سے علم و حکمت کا اکتساب نہیں کرنا تھا بلکہ قرآنی علم اور حکمت سے چینیوں کو بہرہ ور کرنا تھا۔ پھر حصولِ علم کا مقصد قرار دیا گیا ہے معرفتِ نفس یعنی خود کو پہچان کر اس کائنات میں اپنا مقام متعین کرنا اور پوری زندگی کو اس مقصد کے سانچے میں ڈھالنا جس کے لئے اسے پیدا کیا گیا ہے۔ معرفتِ نفس ہی معرفتِ خالق و مالکِ کائنات پیدا کرتی ہے جو خالق اور مالک ہی نہیں حاکم اور آمر بھی ہے

مخلوق اور مملوک ہوتے ہوئے ... ہونا ہی چاہئے اور اس کی عطا کردہ زندگی ہیں اپنے وجود کی انانیت کے تقاضہ (میری مرضی چلے گی) کے بجائے (تیری مرضی کے مطابق چلوں گا) پر عامل رہنا شانِ بندگی ہے اور اس کے برعکس رویّہ اور عمل مالک الملک کی مملکت میں بغاوت کے مترادف ہے اور صرف شیطان کو زیب دیتا ہے جس پر لعنت کرتے ہم کبھی نہیں تھکتے ۔ مالک کی مرضی کو تلاش کریں اور پھر اس پر پوری زندگی میں سختی سے جمے رہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کی دی ہوئی روشنی میں زندگی کے بارے میں اہم ترین حقائق اور ان کی بنیاد پر زندگی گذارنے کے لئے ہدایات کا اچھی طرح مطالعہ کریں کہ اس کے بغیر ہمارے لئے قدم قدم پر خطرات ہیں ہم صحیح راستے سے تھوڑا بھی ہٹ جائیں تو جذبات کی رو میں بہت دور نکل سکتے ہیں یہی حقیقی علم ہے جو ہمیں خود حاصل کرنا ہے اور پوری دیانت سے اپنی اگلی نسل کو منتقل کرنا ہے ۔ اس کے بغیر پوری زندگی اس دنیا میں بھی اور اس کے بعد آنے والی دنیا میں بھی برباد ہو جائے گی اور اس سے بڑے نقصان کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے ۔ اب رہا اپنے مادّی اور حیوانی وجود کی ضروریات پوری کرنے کے لئے اس زمین پر جدوجہد کا معاملہ تو اس کے لئے پہلے تو ہمیں اپنے اندر کے وجود کے اعلیٰ تر حصّے یعنی ذہنی اور روحانی وجود کا تابع رکھنا ہے جسے خود پہلے سے مرضی رب کا تابع بنا لیا گیا ہو ۔ اگر ایسا نہ ہو سکا تو یہ حیوان اُسے زندگی بھر کبھی ختم نہ ہونے والی سخت کشمکش میں الجھائے رکھے گا ۔ یہ کہ انسانیت کے حیوانی عنصر کی مزاحمت یکسر ختم ہو کر وہ مردہ ہو جائے ، نہ مطلوب ہے نہ مفید مگر یہ جس حد تک قابو میں رہے گا اسی حد تک زندگی پاکیزہ اور پرسکون ہو گی جسم کے تقاضے پورے کئے جائیں گے مگر جائز حدود کے اندر اور اس حد تک جو اس کے روحانی وجود کے لئے تباہ کن نہ ہو ۔ اس کے لئے ایک پورا ضابطۂ اخلاق مہیا کیا گیا ہے جو ہر قدم پر رہنمائی کر کے انسان کو راہ راست پر قائم رکھتا ہے ۔

ان اصولوں کی روشنی میں انسان مہذب و متمدن زندگی گذارنے کے لئے ہر وہ کام سیکھ کر اختیار کر سکتا ہے جس کی اس کے ضابطۂ اخلاق میں گنجائش ہو ۔ ایسے عام تجربات جو نوعِ انسانی نے اپنے ابتدائی دور سے اب تک جمع کئے ہیں علوم کہلاتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ان کی حیثیت ظن وتخمین ہی کی رہے گی خدائی علم سے ان کو کیا نسبت ، مگر بہرحال یہ مفید ہیں اور انسان انھیں حاصل کر سکتا ہے ان ہدایات کی روشنی میں جو ان کے لئے زندگی میں مشعلِ راہ ہیں نہ کہ وہ علوم اور ان کا وہ جز جو ہدایت کی روشنی سے بے نیاز ہو کر انسان نے اپنی جذبات سے بہت جلد مغلوب ہو جانے والی عقل پر اعتماد کر کے مرتب کئے ہیں ۔

اسلامی تعلیمات کی طرف ان مجمل اشارات کی روشنی میں تعلیم و تربیت کا مقصد بالکل واضح ہو کر ہمارے سامنے آجاتا ہے ۔ ہمارا اصلی اور حقیقی مقصد اور نصب العین تعلیم کے سلسلے میں معرفت اللہ اور معرفت نفس ہے جو ہمیں بندگیِ رب کی راہ پر چلا دے اور نتیجہ کے طور پر ہمارا رویّہ ذمہ دارانہ ہو اور ایک طرف ہمارا تعلق اگر خالق سے درست ہو تو دوسری طرف مخلوق سے بھی درست ہو ۔ اس کے لئے ہم دین کا علم حاصل کریں امتحانات پاس کرنے کے لئے نہیں جیسا کہ عام رواج ہے بلکہ اس کو زندگی میں برتنے کے لئے اور اس کے ساتھ ہی ہم اس مادی کائنات پر زیادہ سے زیادہ قابو پانے کے لئے علوم طبعی اور انسان اور اس کے تہذیب و تمدن سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے عمرانیات

... کا مطالعہ کریں مگر ...

... استعمال کریں کے ...

... اور ... قوم کی ... یا ...

طور پر متوقع ہیں اور جن ...

وجود میں آتی ہیں ۔ نوخیز نسل ...

مبتلا ہو جاتے ہیں ، عیسائیت کی تثلیث اور ریاضی کے ...

عیسائی بچوں کے حلق سے جبراً اتارنے کی کوشش کرتا ہے جب کہ ریاضی کے ضابطے میں شا...

اس فاش غلطی اور احمقانہ ریاضی پر سر امل جائے ۔ یہاں بھی معقولیت پسند ذہن توحید ...

الحاد کا ایک ساتھ قبول نہیں کر سکتا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے یہ غلط ، یا وہ غلط ، کا امکان ذ...

میں جگہ پا لیتا ہے ، پھر حکمران قوتوں کی سرپرستی کے باعث کفر و شرک و الحاد کے فلسفوں ...

بھرپور علوم اپنی دنیاوی وجاہت اور چمک دمک سے ذہنوں کو متاثر اور مرعوب کر ...

ہیں اور ان کے پیش کرنے والے پروفیسر یا لیکچرر کی بہتر شخصیت اور پیش کرنے کا ...

سائنٹیفک اور دلچسپ انداز دلوں کو موہ لیتے ہیں ۔ اس کے برعکس دینیات کے ...

میں جس شخصیّت اور جس انداز و زبان سے سابقہ پیش آتا ہے اور دنیاوی وجاہت ...

اعتبار سے جو ان کا مقام ہوتا ہے وہ پیش کردہ تعلیمات کا مقام بھی متعین کر دیتا ہے ا...

ذہین عنصر کے لئے فیصلہ مشکل نہیں رہ جاتا ۔ کمزور اور منفعل ذہن البتہ اس کشمکش ...

کبھی نہیں نکل پاتے ۔ ان میں اپنے شکوک و شبہات کے اعلان کی جرأت نہیں ہو...

لہذا تضاد اور دو رنگی کا شکار رہتے ہیں ۔ یا منافقت میں مبتلا ۔ اور معاشرہ کے لئے ...

ہونا تو کجا ، وہ انتہائی مضر ثابت ہوتے ہیں ۔ ان کی وفاداری میں استواری ناپید ہوتی ...

سرسید مرحوم نے اس کا تجربہ اپنے علی گڑھ میں کیا اور نتائج سب کے سامنے ہیں ۔ ذ...

عناصر کمیونزم پر فریفتہ یا اس سے کمتر درجہ میں الحاد اور متشدد قوم پرستی کے حامی بن کر ...

اور مریخان مرنج قسم کے لوگ زندہ اور مردہ دونوں اقتداروں کے سامنے سجدہ ریز ...

دولت پر بھی ان کی ناصیہ فرسائی اور نیاز مندیاں بے پایاں اور آستانہ ہائے قدر...

کے لئے بھی ان نیازیں اور نذریں وقف ملّت کے لئے اس سے زیادہ غیر مفید بلکہ مضر ...

شاید ہی کوئی رہا ہو جن کی اپنی کوئی فکر ، رائے اور شخصیت نہ ہو اور جو ہر سانچے میں ڈھل سکتے ہوں ۔

تقریباً ایسا ہی حال سیکولر تعلیم کے سیکولر اداروں کا بھی ہے جو انسان کو ...

... مذہب جو اس قسم کی تعمیر کے لئے ... ہی مردود ہو چکے ہوتے ہیں، ہماری نوخیز ... صحرا میں پاتی ہیں جہاں دنیا اپنے سارے ... کے استعمال کے لئے موجود ہے مگر سوائے اپنی محدود و ناقص ... جانے والی عقل کے اور کوئی رہنمائی موجود نہیں جو یہ بتا سکے ... غلط، کس میں بھلائی ہے اور کس طریقہ کار، رویہ اور اخلاقی طرز ... نقصان ہے۔ غرض وہ ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی اور تیسری غلطی کرنے ... جاتے ہیں اور بار بار گڑھوں کی نوعیت سے دھوکا کھا کر ان میں گر سکتے ہیں مگر سلامتی ... راہ نہیں پا سکتے۔ اس لئے یہ نظامِ تعلیم جو نتائج دنیا کے بیشتر ملکوں میں پیدا کر رہا ہے ... سے پوشیدہ نہیں۔ اس سیکولرازم کے ساتھ جہد للبقاء اور بقاءِ اصلح کے نظریات ... کی تعلیم اور پُر زور تبلیغ تعلیمی اداروں میں صرف حیاتیات تک محدود نہیں رہی ... بلکہ سیاست اور معیشت کے میدان میں داخل ہو کر اس نے جو گل کھلائے ... اس نے ہٹلر اور مسولینی اور نسلی اور قومی برتری کے دوسرے نسبتاً کم بدنام حامی پید... اور دنیا دو لرزہ خیز جنگوں سے ان ہی تصوّرات کی بدولت برباد ہو چکی ہے اور موجودہ ... کش، سرد اور کہیں گرم محدود جنگیں قیامِ امن کے نام پر دنیا کے سکون کو غارت کئے ... ہیں، اور جب تک یہ تصوّرات باقی ہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ جلد ختم ہونے والے ... نہیں، اس سے بدتر حالات متوقع ہیں۔

جو کچھ بین الاقوامی میدان میں ان تصورات کے تحت ظہور میں آیا ہے اور آرہا ہے وہی ... کچھ انسانی معاشروں اور ملکوں کی وسیع آبادیوں میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی ... چوری، بے ایمانی، غبن، رشوت ستانی حق تلفی، ظلم اور ناانصافی، آمیزش، ذخیرہ ... اندوزی اور چور بازاری وغیرہ کی شکل میں نظر آرہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ انسانی ... زندگی کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جانے والا ایک زہر ہے جس کے باعث زندگی تلخ ... اگرچہ یہ ترقی اور روشنی کا دور ہے، تاریکی کا نہیں، جیٹ طیاروں اور راکٹی توانائی ... دور ہے اور دولت اور اشیاءِ صرف اور سامانِ تعیش کی ایسی ریل پیل ہے جس سے ... آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں اور جو انسانی تاریخ کے کسی دور میں نہیں دیکھی گئی۔ اور یہ ... سب اس لئے ہے کہ انسان بگڑ گیا ہے۔ انسان ساز فیکٹریاں بگڑ گئی ہیں ماؤں کی گود ... میں بچے بجائے دودھ کے زہر پی کر پلتے اور اسی مسموم معاشرہ میں بڑھتے، جوان ہوتے ... اور انھیں بگڑے ہوئے اداروں میں ان اساتذہ سے تعلیم حاصل کرتے ہیں جو انھیں کی ... طرح مسموم، ماحول میں پل کر اور سیکولر اداروں میں تعلیم پا کر نکلے ہیں اور جن کے نزدیک ... کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہی ہے اور ہر دور میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ اگر خرابیاں کہیں ... نظر بھی آتی ہیں تو وہ جہالت اور دولت کی غلط تقسیم کا نتیجہ ہیں۔ دولت کی مبنی بر ... مساوات تقسیم اور تعلیم ... ہی آپ سے آپ دور ہو جائیں گی۔ چنانچہ جب ... نسل ... تعلیمی اداروں سے باہر نکلتی اور دنیا کے کاروبار سنبھالتی ہے ... انسانوں ... اخلاقی وصف ان میں موجود نہیں ہوتا جس کے بغیر میں ... اس ... مفادات وابستہ ہیں وہ ٹھیک ہے اور

ہونا چاہئے۔ چاہے مخلوقِ خدا کو اس سے کتنا ہی آزار پہنچے۔ کسی کی کیسی ہی حق تلفی ہوتی ہو، کسی کی جان یا آبرو پر بن جائے، کوئی فکر نہیں۔ ان کے سامنے صرف ذاتی مفاد اور حقوق طلبی ہوتی ہے۔ حقوق شناسی اور حقوق کی ادائیگی کا ان کو خیال بھی نہیں آتا۔

اس اخلاقی بے قیدی کی بدولت معاشرہ کی اکائی، خاندان، تباہ ہو رہا ہے جیسا کہ وہ مغرب میں اس سے پہلے تباہ ہو چکا ہے۔ ہر فرد اپنے ذاتی مفاد کے لئے کوشاں ہے اور اپنے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے لئے وہ سب کچھ کر گزرتا ہے، جس میں دوسروں کی خاطر ایثار یا تھوڑی سی رعایت اور سہولت کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ایسے حالات میں ہر ایک اپنے لئے ہوتا ہے کوئی کسی دوسرے کے لئے نہیں۔ باپ اپنے مفادات، اپنے عیش اور اپنے معیارِ زندگی کی فکر میں، بیوی اور اولاد کے لئے کوئی ایثار کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا، ماں اپنے بچوں کے مفاد اور ان کی پرورش اور پرداخت میں اپنی زندگی کھپانے کے بجائے انھیں کسی کو سونپ کر اس مکمل حریّت کے دور میں اپنے لئے آزاد ذریعہ معاش تلاش کرے گی تاکہ شوہر کی معاشی بالادستی اور غلامی سے نجات حاصل کرلے اور ماں کی محبت اور شفقت سے محروم بچے سیکولر تعلیم حاصل کرنے کے بعد کس اخلاق و کردار کے حامل ہوں گے، آسانی سے تصور کیا جاسکتا ہے۔ یہ لڑکے اور لڑکیاں زیورِ اخلاق و انسانیت سے آراستہ ہونے کے بجائے اپنے علم اور عقل کی مدد سے اپنی ہر حیوانی حرکت کے لئے سائنٹیفک توجیہ پیش کر کے جواز پیدا کرلیں گے اور تعلیم چونکہ ہمارے جیسے ترقی پذیر ملکوں میں عام نہیں ہے بلکہ خواندہ لوگوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے، اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ جو فطری طور پر معاشی برتری کے حامل ہوتے ہیں معاشرہ میں ایک کلاس کا اضافہ کر رہے ہیں جو خود کو عام سطح سے اس قدر بلند تصور کرتا ہے کہ عامۃ الناس کو انسانیت کا ادنیٰ درجہ دے کر بھی ان سے ربط رکھنے پر آمادہ نہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ عام لوگوں کو، جو چاہے بعض صورتوں میں علم و عقل اور اخلاق و کردار کے اعتبار سے ان سے بدرجہا بلند ہوں مگر ان کے کلاس کی سطح پر نہ ہوں، تو وہ ان کو ادنیٰ درجہ کی مخلوق سمجھ کر بقاءِ اصلح کے تصوّر کے تحت ان کے ساتھ اتنی ہمدردی بھی نہیں کرتے جتنی عام جانداروں کے سلسلے میں انسانوں سے مطلوب ہے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تعلیمی اداروں سے باہر آکر ان متکبرین کے کلاس میں اضافہ کرتے ہیں اور تو اور خود گھر سے خیرات شروع ہو جاتی ہے ممی ڈیڈی اگر صاحبزادی کے برابر تعلیم یافتہ نہیں ہیں تو وہ خادمہ کی طرح صاحبزادی کے ملاقاتیوں کے لئے چائے کی ٹرے لے کر حاضر ہوں گی اور صاحبزادی شرمندہ یا ممی کی احسانمند بھی نہ ہوں گی "ممی تو پرانے خیال کی ہیں، ہمارے پاس بیٹھتیں تو ہمیں اپنی دقیانوسی باتوں سے بور ہی کرتیں۔ اچھا ہوا وہ کچن ہی میں رہیں۔ ممی چائے بہت عمدہ بناتی ہیں" یعنی ان کا مقام وہی ہے۔ اسی طرح اگر ڈیڈی تعلیم یافتہ اور سرکار کوٹھی اور بھاری بینک بیلنس کے مالک نہیں ہیں تو وہ اپنی تمام مصروفیتوں کے باوجود گھر سے متعلق ساری خدمات انجام دیں گے اور سعادت مند اولاد اقبال صاحب ... اور صاحبزادیاں ان کا ... بنا ... اپنے ... تعلیم یافتہ ... سیاستداں ... سے بھی باپ کے مدمقابل بن جاتے اور ... کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں کہ وہ بوڑھا احمق انھیں دنیا میں ... کا ذریعہ

مخلوق اور مملوک ہوتے ہوئے انسان کو محکوم ہونا ہی چاہئے اور اس کی عطا کردہ زندگی ہیں اپنے وجود کی انانیت کے تقاضہ (میری مرضی چلے گی) کے بجائے (تیری مرضی کے مطابق چلوں گا) پر عامل رہنا شانِ بندگی ہے اور اس کے برعکس رویّہ اور عمل مالک الملک کی مملکت میں بغاوت کے مترادف ہے اور صرف شیطان کو زیب دیتا ہے جس پر لعنت کرتے ہم کبھی نہیں تھکتے ۔ مالک کی مرضی کو تلاش کریں اور پھر اس پر پوری زندگی میں سختی سے جمے رہیں ۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کی دی ہوئی روشنی میں زندگی کے بارے میں اہم ترین حقائق اور ان کی بنیاد پر زندگی گذارنے کے لئے ہدایات کا اچھی طرح مطالعہ کریں کہ اس کے بغیر ہمارے لئے قدم قدم پر خطرات ہیں ہم صحیح راستے سے تھوڑا بھی ہٹ جائیں تو جذبات کی رو میں بہت دور نکل سکتے ہیں یہی حقیقی علم ہے جو ہمیں خود حاصل کرنا ہے اور پوری دیانت سے اپنی اگلی نسل کو منتقل کرنا ہے ۔ اس کے بغیر پوری زندگی اس دنیا میں بھی اور اس کے بعد آنے والی دنیا میں بھی برباد ہو جائے گی اور اس سے بڑے نقصان کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے ۔ اب رہا اپنے مادّی اور حیوانی وجود کی ضروریات پوری کرنے کے لئے اس زمین پر جد و جہد کا معاملہ تو اس کے لئے پہلے تو ہمیں اپنے اندر کے وجود کے اعلیٰ تر حصّہ یعنی ذہنی اور روحانی وجود کا تابع رکھنا ہے جسے خود پہلے سے مرضی رب کا تابع بنا لیا گیا ہو ۔ اگر ایسا نہ ہو سکا تو یہ حیوان اُسے زندگی بھر کبھی ختم نہ ہونے والی سخت کشمکش میں الجھائے رکھے گا ۔ یہ کہ انسانیت کے حیوانی عنصر کی مزاحمت یکسر ختم ہو کر وہ مردہ ہو جائے ، نہ مطلوب ہے نہ مفید مگر یہ جس حد تک تابو میں رہیگا اسی حد تک زندگی پاکیزہ اور پرسکون ہوگی جسم کے تقاضے پورے کئے جائیں گے مگر جائز حدود کے اندر اور اس حد تک جو اس کے روحانی وجود کے لئے تباہ کن نہ ہو ۔ اس کے لئے ایک پورا ضابطۂ اخلاق مہیا کیا گیا ہے جو ہر قدم پر رہنمائی کر کے انسان کو راہ راست پر قائم رکھتا ہے ۔

ان اصولوں کی روشنی میں انسان مہذب و متمدن زندگی گذارنے کے لئے ہر وہ کام سیکھ کر اختیار کر سکتا ہے جس کی اس کے ضابطۂ اخلاق میں گنجائش ہو ۔ ایسے عام تجربات جو نوعِ انسانی نے اپنے ابتدائی دور سے اب تک جمع کئے ہیں علوم کہلاتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ان کی حیثیت ظن و تخمین ہی کی رہے گی خدائی علم سے ان کو کیا نسبت مگر بہرحال یہ مفید ہیں اور انسان انھیں حاصل کر سکتا ہے ان ہدایات کی روشنی میں جو ان کے لئے زندگی میں مشعلِ راہ ہیں نہ کہ وہ علوم اور ان کا وہ جز جو ہدایت کی روشنی سے بے نیاز ہو کر انسان نے اپنی جذبات سے بہت جلد مغلوب ہو جانے والی عقل پر اعتماد کر کے مرتب کئے ہیں ۔

اسلامی تعلیمات کی طرف ان مجمل اشارات کی روشنی میں تعلیم و تربیت کا مقصد بالکل واضح ہو کر ہمارے سامنے آ جاتا ہے ۔ ہمارا اصلی اور حقیقی مقصد اور نصب العین تعلیم کے سلسلے میں معرفت اللہ اور معرفت نفس ہے جو ہمیں بندگیِ رب کی راہ پر چلا دے اور نتیجہ کے طور پر ہمارا رویہ ذمہ دارانہ ہو اور ایک طرف ہمارا تعلق اگر خالق سے درست ہو تو دوسری طرف مخلوق سے بھی درست ہو ۔ اس کے لیے ہم دین کا علم حاصل کریں امتحانات پاس کرنے کے لئے نہیں جیسا کہ عام رواج ہے بلکہ اس کو زندگی میں رچانے بسانے کے لئے اس کے ساتھ ہی ہم اس مادی کائنات پر زیادہ سے زیادہ قابو پانے کے لئے علوم طبعی اور انسان اور اس کے تہذیب و تمدن سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے عمرانیات کا مطالعہ کریں ۔ مگر یہ سارے علوم وحیِ الٰہی کی روشنی میں کفر و شرک ، الحاد و طغیان (سرکشی) استکبار کے ساتھ زندگی میں من مانی کئے جانے سے پاک ہوں اور اگر بدقسمتی سے کسی پُر آشوب دور میں ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو کم از کم ان کی تعلیم ایسے اساتذہ کے ذریعہ ہونا چاہئے جو انھیں ناپختہ ذہنوں میں منتقل کرتے وقت ان غیر پسندیدہ عناصر سے ضرور پاک کر دیں جو ان نوعمروں کی اخلاقی اور روحانی صحت کے لئے تباہ کن ہو سکتے ہیں ورنہ ایک ساتھ دینی اور سیکولر علوم کی تعلیم یا پیوندکاری کی کوششیں وہی نتائج پیدا کریں گی جو ان سے فطری طور پر متوقع ہیں اور جن سے کفر و شرک و الحاد کو تقویت حاصل ہوتی ہے یا پھر دو رخی شخصیتیں وجود میں آتی ہیں ۔ نوخیز نسل کے صحیح الدماغ اور ذہین افراد سخت قسم کی ذہنی کش مکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں ، عیسائیت کی تثلیث اور ریاضی کے تضاد کی طرح جہاں دینیات کا استاد عیسائی بچوں کے حلق سے جبراً اتارنے کی کوشش کرتا ہے جب کہ ریاضی کے گھنٹے میں شاید اس فاش غلطی اور احمقانہ ریاضی پر سر پیٹ لیا جائے ۔ یہاں بھی معقولیت پسند ذہن توحید اور الحاد کو ایک ساتھ قبول نہیں کر سکتا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے 'یہ غلط' یا 'وہ غلط' کا امکان ذہن میں جگہ پاتا ہے ، پھر حکمران قوتوں کی سرپرستی کے باعث کفر و شرک و الحاد کے فلسفوں سے بھرپور علوم اپنی دنیاوی وجاہت اور چمک دمک سے ذہنوں کو متاثر اور مرعوب کرتے ہیں اور ان کے پیش کرنے والے پروفیسر یا لیکچرر کی بہتر شخصیت اور پیش کرنے کا . . . سائنٹیفک اور دل چسپ انداز دلوں کو موہ لیتے ہیں ۔ اس کے برعکس دینیات کے گھنٹے میں جس شخصیت اور جس انداز و زبان سے سابقہ پیش آتا ہے اور دنیاوی وجاہت کے اعتبار سے جو ان کا مقام ہوتا ہے وہ پیش کردہ تعلیمات کا مقام بھی متعین کر دیتا ہے اور ذہین عنصر کے لئے فیصلہ مشکل نہیں رہ جاتا ۔ کمزور اور منفعل ذہن البتہ اس کش مکش سے کبھی نہیں نکل پاتے ۔ ان میں اپنے شکوک و شبہات کے اعلان کی جرأت نہیں ہوتی لہٰذا تضاد اور دو رنگی کا شکار رہتے ہیں ۔ یا منافقت میں مبتلا ۔ اور معاشرہ کے لئے مفید ہونا تو کجا ، وہ انتہائی مضر ثابت ہوتے ہیں ۔ ان کی وفاداری میں استواری ناپید ہوتی ہے سرسید مرحوم نے اس کا تجربہ اپنے علی گڑھ میں کیا اور نتائج سب کے سامنے ہیں ۔ ذہین عناصر کمیونزم پر فریفتہ یا اس سے کمتر درجہ میں الحاد اور متشدد قوم پرستی کے حامی بن کر رہ گئے اور مرنجان مرنج قسم کے لوگ زندہ اور مردہ دونوں اقتداروں کے سامنے سجدہ ریز ، آستانہ دولت پر بھی ان کی ناصیہ فرسائی اور نیاز مندیاں بے پایاں اور آستانہ ہائے قدس کے لئے بھی ان نیازیں اور نذریں وقف ملّت کے لئے اس سے زیادہ غیر مفید بلکہ مضرت شاید ہی کوئی رہا ہو جن کی اپنی کوئی فکر ، رائے اور شخصیت نہ ہو اور جو ہر سانچے میں ڈھل سکتے ہوں ۔

تقریباً ایسا ہی حال سیکولر تعلیم کے سیکولر اداروں کا بھی ہے جو انسان کو انسان کے سوا اور سب کچھ بنا سکتے ہیں اور بنا دیتے ہیں جس طرح سیاسی سطح پر سیکولرازم ایک منفی تصور ہے اور اس حد تک بعض مخصوص معاشروں ، قوموں اور ملکوں کے لئے ان کے لاینحل مسائل بن سکتا ہے مگر اس منفی تصور پر کوئی تعمیر ممکن نہیں ہے اسی طرح کسی سیکولر نظام کی تعلیمی اسکیم میں عقائد کے اختلاف کی بدولت تو مناقشات کا امکان ختم یا بہت کم ہو جاتا ہے مگر اس تعلیمی اسکیم کے تحت تعلیم و تربیت پانے والوں کو بچوں کو کوئی مثبت تصور نہیں دیا

جس پر وہ اپنے اخلاق و کردار کی بنیاد رکھ سکیں اور دین و مذہب جو اس قسم کی تعمیر کے لئے بنیادیں فراہم کر سکتے تھے بنا بر فساد قرار پاکر پہلے ہی مردود ہو چکے ہوتے ہیں، ہماری نوخیز نسلیں خود کو ایک ایسے ویران اور لق و دق صحرا میں پاتی ہیں جہاں دنیا اپنے سارے ذرائع و وسائل کے ساتھ تو ان کے استعمال کے لئے موجود ہے مگر سوائے اپنی محدود و ناقص اور جذبات سے مغلوب ہو جانے والی عقل کے اور کوئی رہنمائی موجود نہیں جو یہ بتا سکے کہ کیا یہ صحیح ہے اور کیا غلط، کس میں بھلائی ہے اور کس طریقہ کار، رویہ اور اخلاقی طرز عمل میں برائی ہے، نقصان ہے۔ غرض وہ ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی اور تیسری غلطی کرتے چلے جا سکتے ہیں اور بار بار گڑھوں کی نوعیت سے دھوکا کھا کر ان میں گر سکتے ہیں مگر سلامتی کی راہ نہیں پا سکتے۔ اس لئے یہ نظام تعلیم جو نتائج دنیا کے بیشتر ملکوں میں پیدا کر رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس سیکولرازم کے ساتھ جہد للبقاء اور بقاء اصلح کے نظریات جن کی تعلیم اور پُر زور تبلیغ تعلیمی اداروں میں صرف حیاتیات تک محدود نہیں رہی ہے بلکہ سیاست اور معیشت کے میدان میں داخل ہو کر اس نے جو گل کھلائے ہیں اس نے ہٹلر اور مسولینی اور نسلی اور قومی برتری کے دوسرے نسبتاً کم بدنام حامی پیدا کئے اور دنیا دو لرزہ خیز جنگوں سے ان ہی تصوّرات کی بدولت برباد ہو چکی ہے اور موجودہ کشمکش، سرد اور کہیں گرم محدود جنگیں قیامِ امن کے نام پر دنیا کے سکون کو غارت کئے ہوئے ہیں، اور جب تک یہ تصوّرات باقی ہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ جلد ختم ہونے والے نہیں ہیں، اس سے بدتر حالات متوقع ہیں۔

جو کچھ بین الاقوامی میدان میں ان تصورات کے تحت ظہور میں آیا ہے اور آ رہا ہے وہی سب کچھ انسانی معاشروں اور ملکوں کی وسیع آبادیوں میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی بگاڑ، چوری، بے ایمانی، غبن، رشوت ستانی، حق تلفی، ظلم اور ناانصافی، آمیزش، ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری وغیرہ کی شکل میں نظر آ رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ انسانی زندگی کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جانے والا ایک زہر ہے جس کے باعث زندگی تلخ ہے اگرچہ یہ ترقی اور روشنی کا دور ہے، تاریکی کا نہیں، جیٹ طیاروں اور ایٹمی توانائی کا دور ہے اور دولت اور اشیاء صرف اور سامانِ تعیش کی ایسی ریل پیل ہے جس سے آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں اور جو انسانی تاریخ کے کسی دور میں نہیں دیکھی گئی۔ اور یہ سب اس لئے ہے کہ انسان بگڑ گیا ہے۔ انسان ساز فیکٹریاں بگڑ گئی ہیں ماؤں کی گودوں میں بچے بجائے دودھ کے زہر پی کر پلتے اور اسی مسموم معاشرہ میں بڑھتے، جوان ہوتے اور انھیں بگڑے ہوئے اداروں میں ان اساتذہ سے تعلیم حاصل کرتے ہیں جو انھیں کی طرح مسموم، ماحول میں پل کر اور سیکولر اداروں میں تعلیم پا کر نکلے ہیں اور جن کے نزدیک جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہی ہے اور ہر دور میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ اگر خرابیاں کہیں پائی بھی جاتی ہیں تو وہ جہالت اور دولت کی غلط تقسیم کا نتیجہ ہیں۔ دولت کی مبنی بر انصاف تقسیم اور تعلیم عام ہوتے ہی آپ سے آپ دور ہو جائیں گی۔ چنانچہ جب یہ نئی نسل اتنی اچھی تعلیم پاکر ان اداروں سے باہر نکلتی اور دنیا کے کاروبار سنبھالتی ہے تو پچھلے انسانوں میں پایا جانے والا کوئی اخلاقی وصف ان میں موجود نہیں ہوتا جس چیز میں اپنا یا اس گروہ یا پارٹی کا فائدہ ہو جس سے اپنے مفادات وابستہ ہیں وہ ٹھیک ہے اور ہونا چاہئے۔ چاہے مخلوقِ خدا کو اس سے کتنا ہی آزار پہنچے۔ کسی کی کیسی ہی حق تلفی ہوتی ہو، کسی کی جان یا آبرو پر بن جائے، کوئی فکر نہیں۔ ان کے سامنے صرف ذاتی مفاد اور حقوق طلبی ہوتی ہے، حقوق شناسی اور حقوق کی ادائیگی کا ان کو خیال بھی نہیں آتا۔

اس اخلاقی بے قیدی کی بدولت معاشرہ کی اکائی، خاندان، تباہ ہو رہا ہے جیسا کہ وہ مغرب میں اس سے پہلے تباہ ہو چکا ہے۔ ہر فرد اپنے ذاتی مفاد کے لئے کوشاں ہے اور اپنے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے لئے وہ سب کچھ کر گزرتا ہے، جس میں دوسروں کی خاطر ایثار یا تھوڑی سی رعایت اور سہولت کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ایسے حالات میں ہر ایک اپنے لئے ہوتا ہے کوئی کسی دوسرے کے لئے نہیں۔ باپ اپنے مفادات، اپنے عیش اور اپنے معیارِ زندگی کی فکر میں، بیوی اور اولاد کے لئے کوئی ایثار کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا، ماں اپنے بچوں کے مفاد اور ان کی پرورش اور پرداخت میں اپنی زندگی کھپانے کے بجائے انھیں کسی کو سونپ کر اس مکمل حریّت کے دور میں اپنے لئے آزاد ذریعہ معاش تلاش کرے گی تاکہ شوہر کی معاشی بالادستی اور غلامی سے نجات حاصل کر لے اور ماں کی محبت اور شفقت سے محروم بچے سیکولر تعلیم حاصل کرنے کے بعد کس اخلاق و کردار کے حامل ہوں گے، آسانی سے تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہ لڑکے اور لڑکیاں زیورِ اخلاق و انسانیت سے آراستہ ہونے کے بجائے اپنے علم اور عقل کی مدد سے اپنی ہر حیوانی حرکت کے لئے سائنٹیفک توجیہہ پیش کر کے جواز پیدا کر لیں گے اور تعلیم چونکہ ہمارے جیسے ترقی پذیر ملکوں میں عام نہیں ہے بلکہ خواندہ لوگوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے، اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ جو فطری طور پر معاشی برتری کے حامل ہوتے ہیں معاشرہ میں ایک کلاس کا اضافہ کر رہے ہیں جو خود کو عام سطح سے اس قدر بلند تصور کرتا ہے کہ عامۃ الناس کو انسانیت کا ادنیٰ درجہ دے کر بھی ان سے ربط رکھنے پر آمادہ نہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ عام لوگوں کو جو چاہے بعض صورتوں میں علم و عقل اور اخلاق و کردار کے اعتبار سے ان سے بدرجہا بلند ہوں مگر ان کے کلاس کی سطح پر نہ ہوں، تو وہ ان کو ادنیٰ درجہ کی مخلوق سمجھ کر بقاء اصلح کے تصور کے تحت ان کے ساتھ اتنی ہمدردی بھی نہیں کرتے جتنی عام جانداروں کے سلسلے میں انسانوں سے مطلوب ہے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تعلیمی اداروں سے باہر آکر ان متکبرین کے کلاس میں اضافہ کرتے ہیں اور تو اور خود گھر سے خیرات شروع ہو جاتی ہے۔ ممی ڈیڈی اگر صاحبزادی کے برابر تعلیم یافتہ نہیں ہیں تو وہ خادمہ کی طرح صاحبزادی کے ملاقاتیوں کے لئے چائے کی ٹرے لے کر حاضر ہوں گی اور صاحبزادی شرمندہ یا ممی کی احسانمند بھی نہ ہوں گی "ممی تو پرانے خیال کی ہیں، ہمارے پاس بیٹھتیں تو ہمیں اپنی دقیانوسی باتوں سے بور ہی کرتیں۔ اچھا ہوا وہ کچن ہی میں رہیں۔ ممی چائے بہت عمدہ بناتی ہیں"، یعنی ان کا مقام وہی ہے۔ اسی طرح اگر ڈیڈی تعلیم یافتہ اور کار کوٹھی اور بھاری بینک بیلنس کے مالک نہیں ہیں تو وہ اپنی تمام مصروفیتوں کے باوجود گھر سے متعلق ساری خدمات انجام دیں گے اور سعادت مند اور بلند اقبال صاحبزادے اور صاحبزادیاں ان کا ہاتھ بٹانا تو کجا، اپنے اخراجات یا نصف شب تک آوارہ گردی پر ادنیٰ روک ٹوک سے بھی باپ کے مدمقابل بن جاتے اور اس سے جواب طلب کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں کہ وہ بوڑھا احمق انھیں دنیا میں لاکر زحمت دینے کا ذریعہ

کیوں بنا جب کہ وہ ان کے اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اور نہ اتنا مہذب ہی ہے کہ مکمل آزادی اور مساوات کا مفہوم سمجھ سکتا اور ان کے ذاتی معاملات میں دخیل ہونے کی جسارت نہ کرتا آخر اولاد (خود ان کے بقول) ایک حادثہ ہی تو ہے جو دو افراد کی سازش اور خود غرضانہ عیش کوشی کے نتیجے میں پیش آگیا تھا۔ اولاد پر ان دونوں کا کیا احسان ہے؟ وہ تو ان کو زحمت میں مبتلا کرنے کے مجرم ہیں؟ یہ دونوں احمق اپنے صدیوں پرانے دین اور فرسودہ تہذیب کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تلقین کرتے نہیں تھکتے اور وہ بھی نئی نسل کے ان افراد کو جوان سے کہیں زیادہ علم و عقل والے ہیں اور دنیا اور اس کے معاملات کو ان سے کہیں بہتر سمجھتے اور ان سے نمٹ سکتے ہیں۔ آخر انھوں نے نئی نسل کو سمجھ کیا سکھا ہے۔؟" وغیرہ ذالک من الخرافات

اسلام کو تو وہ تعلیم مطلوب ہے جو چاہے علم کیمیا، طبیعات، حیاتیات، معاشیات اور سیاسیات وغیرہ کا منتہی نہ بناتی ہو مگر وحدتِ الٰہ اور وحدتِ آدم کی بنیاد پر انسان اور خدا اور انسان اور انسان کے درمیان صحیح تعلق کا شعور پیدا کرکے ان تعلقات کو درست اور استوار کرتی ہے جس پر خاندان اور معاشرہ کی اصلاح کا انحصار ہے اور جس کے فقدان کی بدولت موجودہ دور کی انسانیت کے رگ و پے میں ایک ایسا زہر سرایت کر گیا ہے جس کا کوئی موثر علاج دنیا کے دانش وروں کے پاس نہیں ہے اور ایک خرابی کو دور کرنے کی کوششیں بسا اوقات دوسری خرابیوں کو جنم دیتی ہیں۔ وہ تو انسان کو راست باز، بااخلاق، انسانیت کا ہمدرد اور اس کے کام آنے والا مخلص اور ایثار پیشہ، سب کے حقوق ادا کرنے والا اور اپنے حقوق پر اصرار نہ کرنے والا، سعادتمند اور اطاعت شعار اولاد، فرض شناس شوہر یا بیوی، دوسروں کے عیوب اور بدسلوکی سے صرف نظر کرتے ہوئے ان سے حسنِ سلوک سے پیش آنے والا، ایک ذمہ دار، پابند آئین و قانون شہری، غرض ایک اچھا انسان بنانے والی تعلیم اسلام کا مطمحِ نظر ہے چاہے وہ کسی یونیورسٹی کا فارغ نہ ہو، بلکہ انسانوں کی عطا کردہ کوئی بھی علمی سند نہ رکھتا ہو۔

یہ واضح ہو جانے کے بعد کہ موجودہ سیکولر سیاسی نظام میں سیکولر انداز کی تعلیم اپنی ساری ترقیوں کے باوجود انسانی ضروریات بالخصوص مسلمانوں کی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہے کیوں کہ وہ عنصر غائب ہے جو کردار سازی یا بالفاظِ صحیح تر، انسان سازی کر سکتا ہے اور وہ ہے مذہبی تعلیم۔

یہاں یہ بحث سرے سے مقصود نہیں ہے کہ لڑکیاں کون سے علوم حاصل کریں اور کس حد تک حاصل کریں یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے اور اس سے زیادہ توجہ کا محتاج ہے جس کا اب تک اسے مستحق سمجھا گیا ہے۔ لڑکوں کے لئے بھی زندگی کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لئے موجودہ دور کی تعلیم ان کو تیار نہیں کرتی۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے جس کا احساس عام طور پر پایا جاتا ہے میرے پیش نظر اس کا ایک دوسرا پہلو ہے۔ سب کے لئے بلا امتیاز اعلیٰ تعلیم کے دروازے کھلا رکھ کر ہم اپنے قومی، ملی اور ملکی وسائل و ذرائع کو برباد کر رہے ہیں۔ زیادہ قرین عقل اور ملکی اور قومی مفاد سے ہم آہنگ بات یہی ہے کہ خواندہ سب کو بنایا جائے حتیٰ کہ معذورین کو بھی خصوصی انتظام کے تحت اس حد تک بہرہ ور ہونے کا موقع ضرور دیا جائے۔ خواندہ بنانے کے معاملے میں اگر جبر کو بھی کام میں لانا پڑے، جو یہاں زیر پردہ نیکی ہوگی، تو اس سے بھی گریز نہ کیا جائے۔ مگر اس کے بعد سارے مراحل میں ہر مرحلے پر موثر چھلنیاں لگی رہنی چاہئیں جن سے ہو کر صرف وہی انسانی مواد گزر سکے جو اپنی قدرتی اور اکتسابی صلاحیتوں کی بنا پر اس سے اگلے مرحلے کی تعلیم کا بوجھ سنبھال سکے۔ بغیر کسی منصوبہ اور نشانہ کے افراد کا یوں ہی بے مقصد تعلیم حاصل کرتے رہنا، لڑکوں کا ملازمت کی فکر میں اور لڑکیوں کا شادی کے انتظار میں، اور بے جوڑ شعبہ ہائے زندگی سے متعلق مضامین میں امتحان پر امتحان دیئے جانا، بی ایس سی، بی ٹی، ایم اے، بی ایڈ، ایل ایل بی، جی وی ایس سی، تین تین مضامین میں ایم اے اور کسی ایک سے بھی خصوصی لگاؤ یا اس میں اتنی اچھی دستگاہ نہیں جو معاشرہ کے لئے مفید ہو، بہت بڑا قومی اور ملی نقصان ہے افراد کے وقت اور دولت کا ضیاع ہے اور ملک کی ترقی میں مزاحم۔ ہمارے ملک میں بہت عرصے سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور جلد از جلد اصلاح طلب ہے مگر اصلاح بہر حال اپنے وقت پر ہوگی اور سرکاری سطح پر ہوگی کیوں کہ یہ کام افراد اور اداروں کے بس کا نہیں ہے اور حکومت کے ہاتھوں بھی اسی وقت انجام پا سکتا ہے جب ملک کے سارے ذرائع و وسائل اور ساری صنعتوں اور حرفتوں پر سرکاری کنٹرول ہو جس کے بغیر عدم صلاحیت کی بنا پر اعلیٰ تعلیم سے روکے جانے والے افراد کو کام میں لگانا ممکن نہ ہوگا کسی جمہوری ملک میں پرائیویٹ سیکٹر حکومت کے ساتھ انھیں معاملات میں کلی تعاون کرتا ہے جو اس کے اپنے مفاد میں ہوں۔ ہمارے سامنے تو صرف یہ مسئلہ ہے کہ تعلیم نسواں عموماً اور مسلمان بچیوں میں خصوصاً مختلف مراحل میں کس طرح ہو تعلیم و تربیت ناقص رہے گی جب تک مائیں بچوں کو نرسری اسکول بھیجنے تک کسی درجہ میں ان کی تربیت نہ کر چکی ہوں۔ جاہل اور لاپروا ماں باپ کے بچے اساتذہ اور استانیوں کے لئے بڑی دشواریاں پیش کرتے ہیں۔ بہر حال موجودہ معاشرتی حالات جیسے کچھ ہیں ان میں کام کی ابتدا اس طرح کرنی ہوگی کہ جیسی طالبات اور مستقبل کی مائیں مطلوب ہیں ویسے نمونے اسکول میں مہیا کئے جائیں۔ اگر معیاری نہیں تو جو بہتر سے بہتر استانیاں تعلیم و تربیت کے لئے مل سکیں، جنھیں اپنے کام سے قلبی لگاؤ ہو اور وہ بچوں سے محبت اور ہمدردی رکھتے ہوتے، قوم و ملت کی امانت سمجھ کر انھیں حقیقی معنوں میں انسان بنانے اور دنیا کے لئے مفید ثابت ہونے کا عملی ثبوت دے سکیں نہ کہ صرف چند گھنٹوں کے لئے ادائیگی فرض سے مجبور ہو کر پابندی نظم کو انگیز کر لیں اور ذمہ داری کو ایک لبادہ کی طرح اوڑھ لیں مگر موقع ملتے ہی اسے اتار پھینکیں جیسا کہ اس وقت ملک کے بیشتر سرکاری، نیم سرکاری اور پرائیویٹ اداروں میں اساتذہ اور استانیوں کا حال ہے جن کی اکثریت کو اس پیشے کی محبت کھینچ کر نہیں لائی بلکہ گوناگوں مجبوریوں نے انھیں اس کے دامن میں پناہ لینے پر آمادہ کیا ہے اسی لئے وہ اس کے تقاضے بس قانونی حدود کے اندر پورا کرنے پر اکتفا کرتے ہیں اور جس کو بھی اس سے زیادہ آرام اور زیادہ معاوضے کا کام میسر آجائے وہ معماران ملک و ملت کی صف سے بلا تامل بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ تو ان کی خوش قسمتی اور طلبا کی بد قسمتی ہے کہ ان تھکے ہوئے افراد میں کم ہی اتنا حوصلہ ہوتا ہے کہ وہ اس (انکے بقول) آرام دہ اور سب سے کم وقت، محبت اور توجہ کا مطالبہ کرنے والے پیشہ سے غیر مطمئن ہو کر کسی اور میدان میں اپنی توانائیاں صرف کریں۔

معماروں کی ضرورت سب سے پہلے ہے مواد ان کے مقابلے میں کمتر اہمیت رکھتا ہے۔ اچھے معمار خراب اور کم میٹریل سے بھی کام لے کر اچھے نتائج برآمد کر سکتے ہیں یا دوسروں سے کرا سکتے ہیں۔ نصاب کی کتابیں اور تعلیمی کتابیں وغیرہ اساتذہ سے بہتر کوئی تیار کرنے والا نہیں ہوتا کیوں کہ طلبہ کی ذہنی ساخت اور ان کی ضروریات کو ان سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔ ماحول کی بڑی اہمیت ہے مگر حالات کے تحت جو کچھ میسر ہو اسے ہی زیادہ سے زیادہ

مفید اور موثر بنانا اساتذہ کا کام ہے بشرطیکہ اربابِ حل و عقد ان سے تعاون کرتے ہوئے انہیں کام کرنے کی پوری آزادی دیں اور خود ان میں باہمی تعاون کی بھی کمی نہ ہو۔ وہ خود اپنے کام کے لئے سازگار ماحول پیدا کر لیتے ہیں۔ تجربہ نے ثابت کیا ہے کہ لائق اساتذہ ناقص نصابی کتابوں، کم اور ناقص سامانِ تعلیم اور ناسازگار ماحول میں بھی طلبہ کو بہت کچھ فائدہ پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ لائق توجہ امر یہ ہے کہ اساتذہ اور استانیاں اس اندازِ فکر اور ان اصولوں سے پوری طرح متفق بھی ہیں جن کے مطابق مدرسہ چلانا ہے یا صرف ضرورت سے مجبور ہو کر اقرار کریں اور دل میں ان میں نفرت کرتے رہیں جو ان کے عمل سے ظاہر ہو۔ دکھاوے کی خاطر کبھی تھوڑی دیر کے لئے بکراہت عمل ہو بھی تو فوراً اس سے اعلان برات۔ ان کا اصلی رویہ عموماً اسلام کے بجائے جاہلیت کی نمائندگی کرنے والا ہوتا ہے اور یہ دورنگی ان کے طلبہ اور طالبات میں دورنگی پیدا کرتی ہے اور زیادہ جری عناصر کو کھلی بغاوت پر ابھارتی ہے اور نتائج ہر جگہ ہمارے سامنے ہیں۔

ہمیں بچیوں کی تعلیم اسلامی طرز پر مطلوب ہے۔ ہم نے نصابِ تعلیم میں اس کا پورا لحاظ رکھا ہے مگر دینی اور سیکولر علوم کی پیوندکاری کوئی آسان کام نہیں ہے اور کبھی کبھی بہت ہی مایوس کن نتائج پیدا کرتی ہے جیسا کہ اوپر تفصیل سے ذکر آ چکا ہے۔ اس کا ایک علاج اساتذہ اور اپنے گھر کے لوگوں کا اپنے دل و جان کی پوری آمادگی کے ساتھ کتابی علم اور زبانی تلقین کا خود عملی نمونہ بن کر بچوں یا بچیوں کے سامنے پیش کرتے رہنا ہے اور ساتھ ہی ساتھ انھیں حتی الوسع اس زہریلے، دشمنِ دین و ایمان، مگر بہت ہی دلکش، ماحول سے بچانا ہے جو اسکول میں کئے کام پر پانی پھیر دینے والا ہو۔ اسی لئے اسلامی تعلیمات کے لئے مثالی معاشرہ تو وہی ہوتا ہے جہاں سیکولر اور مذہبی کا جھگڑا مٹ گیا ہو اور زندگی میں قدم قدم پر تضاد نہ پائے جاتے ہوں، کہ اس ماحول میں نشو و نما پانے والا ذہن ان کی بدولت خلجان میں مبتلا ہو جائے تاہم عبوری دور میں ایک درمیانی راہ ان لڑکیوں اور لڑکوں کے لئے مہیا کی جا سکتی ہے جو برائی اور بھلائی میں تمیز نہ کر سکتے ہوں۔

سب سے مشکل کام گھروں کی پاکیزگی ہے جس کی ضرورت کا احساس سب کو ہے اور کبھی کوئی اس کے اعلان سے نہیں چوکتا مگر عملاً ہر شخص خود کو بے بس پاتا ہے۔ قائل خود اپنے گھر کی اصلاح نہیں کر پاتے۔ ضروری نہیں کہ اساتذہ اور استانیوں کے گھر اس خصوص میں دوسرے گھروں سے بہت بہتر ہوں۔ اس دشواری پر قابو پانا کسی ایسے ملک میں جہاں صنعتی تہذیب کو تیزی سے تسلط پا رہی ہو اور تعلیم عام نہ ہو، تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے ساتھ اس سے پہلے کی نسل کی اصلاح جو غیر محدود وسائل و ذرائع اور بے شمار ان تھک کوششوں کا مطالبہ کرتی ہیں ہمارے معاشرے میں بحالات موجودہ میسر آنا ممکن نہیں۔ والدین اور سرپرستوں کا تعاون حاصل ہونا تو درکنار وہ اساتذہ اور استانیوں کی بات کو درخورِ اعتنا بھی نہیں سمجھتے۔ اس میں مستثنیات شاذ و نادر وہاں ملیں گے جہاں وہ گروہ یا مختصر سا سماج پہلے سے کسی مقصد پر متفق ہو اور اس حد تک اس میں یکسانی پائی جاتی ہو ورنہ ظاہر ہے کہ محض اس مقصد کے لئے کوئی معاشرہ وجود میں لانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے معاشرہ میں یہ سرد مہری عام ہے اور ہماری ملت تو مجرمانہ حد تک اس باب میں اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہے۔ ان کا عملی رویہ ہمیں ہمارے بچوں کی مصیبت سے بچاؤ کا اعلان کرتا ہے۔ انھیں نہ تو مہلت ہے، نہ بچہ کی کی بات سنتے ہیں۔ اسکول انھیں سال بھر میں اوسطاً تین گھنٹے روزانہ میں نیک مہذب اور تعلیم یافتہ بنا دے۔ اساتذہ اور سرپرستوں کی کسی میٹنگ میں سرپرستوں کی حاضری اور ان کی لمبی چوڑی شکایات اور اسکول کی ہر چیز پر ان کی تنقید سے آگے بڑھ کر تنقیص اس زبوں حالی کی غماز ہوتی ہیں۔

نصاب کے سلسلے میں چند باتیں کہنی ہیں پہلی تو ہم بچوں پر چار زبانوں کے بوجھ کے بارے میں ہے۔ یہ تسلیم ہوتے ہوئے بھی کہ انسانی معاشرہ جیسے جیسے پیچیدہ ہوتا جاتا ہے اس کی تعلیمی ضروریات بھی اسی تناسب سے بڑھتی جاتی ہیں۔ اس کی نمایاں ترین مثال اس دور کے سائنسی علوم اور ریاضی کی زیادہ سے زیادہ معلومات ہیں جو عام پڑھے لکھے آدمی کے بھی ایک شعوری زندگی گزارنے کے لئے ضروری ہیں۔ ساتھ ہی زندگی ایک واحدہ یا ناقابلِ تقسیم اکائی ہوتے ہوئے اسے طلبار کے لئے سائنس اور آرٹس کے سربمہر خانوں میں تقسیم کر کے انھیں معاشرہ میں یک رخا بنانا کوئی دانائی کی بات نہیں۔ اس کی تلافی کے لئے بعض تعلیمی اداروں نے عمومی تعلیم کے نام سے سائنس کے طلبار کے لئے آرٹس کا ایک مختصر مگر جامع نصاب اور آرٹس والوں کے لئے سائنسی مضامین کی جامع معلومات تعلیم کے مختلف مراحل میں لازمی مضمون کی حیثیت سے رکھنے کا تجربہ کیا۔ اس ذیل میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نتائج قابلِ ذکر ہیں اور نتائج بہت شاندار نہیں تو امید افزا ضرور رہے ہیں۔ اس حد تک تو نصاب میں ہر مرحلہ پر تبدیلی یا ترمیم و اضافہ مفید ہو سکتے ہیں نہ یہ کہ ان سے بالکل صرفِ نظر کر لیا جائے مگر زبانیں تو پہلے ہی بدلے ہوئے حالات کے تحت دو سے بڑھ کر تین ہو گئی ہیں اور ان میں سہم پہنچنے والی دستگاہ پر برا اثر پڑا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں چاہے اس کی دستگاہ میں دوسرے عناصر بھی کارفرما ہوں۔ دوسری زبانوں کی افادیت اپنی جگہ ہوتے ہوئے بھی مادری زبان میں کمزوری ناقابلِ تلافی نقصان اور شرمناک کمزوری ہے۔ زیادہ زور اسی پر دینا چاہیئے جب اس میں اچھی لیاقت پیدا ہو جائے تو دوسری زبانوں کی طرف خصوصی توجہ ممکن ہے۔ عربی مسلمان بچوں اور بچیوں کے لئے ان کے ذہنی نقطۂ نظر سے ایک ناگزیر ضرورت ہونے پر بھی ایک ایسی زبان ہے جس کے لئے کوئی ماحول اس ملک میں میسر نہیں، نہ گھروں کے اندر نہ باہر۔ وہ کلاس روم اور کتاب کے سرورق کے درمیان محدود رہتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اسے کس مرحلے میں داخلِ نصاب کیا جائے اور اس پر کتنا زور دیا جائے دین کی تعلیم کے لئے ابتدائی مراحل میں دین کی زبان کا حصول ناگزیر نہیں۔ اس کا حصول تو اپنی زبان کے ذریعہ بہت اچھی طرح ممکن ہے۔ وسطانی مرحلہ تک اس دور میں عام معلوماتی مضامین کے معاملہ میں سرد مہری یا بالکلیہ ان سے صرفِ نظر بھی دانائی نہ ہو گی۔ فوقانی مرحلہ میں تو دوسری ضرورتوں سے مجبور ہو کر ان میں سے بعض کو بعض کے حق میں ترک کرنا ضروری ہو جاتا ہے مگر اس عمر اور مرحلے تک طلبہ اور طالبات ابتدائی ناگزیر معلومات حاصل کر چکے ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں کسی قدامت پسند رویہ کو کسی بھی تاویل سے صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ وسطانی مرحلے تک ریاضی سے مفارقت بھی ایک خلا پیدا کر دیتی ہے کیونکہ بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ طلبار اس مرحلے تک اب بہت کم سیکھ پاتے ہیں۔ اسے انگیز کرنا بھی صحیح نہ ہو گا۔

بقیہ ۔ صفحہ [illegible] پر

ہوں بنا جب کہ وہ ان کے اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اور نہ آتنا مہذب ہی ہے کہ مکمل آزادی اور مساوات کا مفہوم سمجھ سکتا اور ان کے ذاتی معاملات میں دخیل ہونے کی جسارت نہ کرتا اولاد (خود ان کے بقول) ایک حادثہ ہی تو ہے جو دو افراد کی سازشں اور خود غرضانہ عیش کوشی کے نتیجہ میں پیش آگیا تھا۔ اولاد پر ان دونوں کا کیا احسان ہے؟ وہ تو ان کو زحمت میں مبتلا کرنے کے مجرم ہیں۔ یہ دونوں احمق اپنے صدیوں پرانے دین اور فرسودہ تہذیب کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تلقین کرنے نہیں تھکتے اور وہ بھی نئی نسل کے ان افراد کو جو ان سے کہیں زیادہ علم و عقل والے ہیں اور دنیا اور اس کے معاملات کو ان سے کہیں بہتر سمجھتے اور ان سے نمٹ سکتے ہیں۔ آخر انھوں نے نئی نسل کو سمجھ کیا رکھا ہے۔ ۹، وغیرہ ذالک من الخرافات

اسلام کو تو وہ تعلیم مطلوب ہے جو چاہے علم کیمیا، طبیعات، حیاتیات، معاشیات اور سیاسیات وغیرہ کا منتہی نہ بناتی ہو مگر وحدتِ الٰہ اور وحدتِ آدم کی بنیاد پر انسان اور خدا اور انسان اور انسان کے درمیان صحیح تعلق کا شعور پیدا کر کے ان تعلقات کو درست اور استوار کرتی ہو جس پر خاندان اور معاشرہ کی اصلاح کا انحصار ہے اور جس کے فقدان کی بدولت موجودہ دور کی انسانیت کے رگ و پے میں ایک ایسا زہر سرایت کر گیا ہے جس کا کوئی موثر علاج دنیا کے دانش وروں کے پاس نہیں ہے اور ایک خرابی کو دور کرنے کی کوششیں بسا اوقات دوسری خرابیوں کو جنم دیتی ہیں۔ وہ تو انسان کو راست باز، بااخلاق، انسانیت کا ہمدرد اور اس کے کام آنے والا مخلص اور ایثار پیشہ، سب کے حقوق ادا کرنے والا اور اپنے حقوق پر اصرار نہ کرنے والا، سعادت مند اور اطاعت شعار اولاد، فرض شناس شوہر یا بیوی، دوسروں کے عیوب اور بدسلوکی سے صرف نظر کرتے ہوئے ان سے حسنِ سلوک سے پیش آنے والا، ایک ذمہ دار، پابند آئین و قانون شہری، غرض ایک اچھا انسان بنانے والی تعلیم اسلام کا مطمح نظر ہے چاہے وہ کسی یونیورسٹی کا فارغ نہ ہو، بلکہ انسانوں کی عطا کردہ کوئی بھی علمی سند نہ رکھتا ہو۔

یہ واضح ہو جانے کے بعد کہ موجودہ سیکولر سیاسی نظام میں سیکولر انداز کی تعلیم اپنی ساری ترقیوں کے باوجود انسانی ضروریات بالخصوص مسلمانوں کی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہے کیوں کہ وہ عنصر غائب ہے جو کردار سازی یا بالفاظ صحیح تر، انسان سازی کر سکتا ہے اور وہ ہے مذہبی تعلیم۔

یہاں یہ بحث سرے سے مقصود نہیں ہے کہ لڑکیاں کون سے علوم حاصل کریں اور کس حد تک حاصل کریں یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے اور اس سے زیادہ توجہ کا محتاج ہے جس کا اب تک اسے مستحق سمجھا گیا ہے۔ لڑکوں کے لئے بھی زندگی کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لئے موجودہ دور کی تعلیم ان کو تیار نہیں کرتی۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے جس کا احساس عام طور پر پایا جاتا ہے۔ میرے پیش نظر اس کا ایک دوسرا پہلو ہے۔ سب کے لئے بلا امتیاز اعلیٰ تعلیم کے دروازے کھلے رکھ کر ہم اپنے قومی، ملی اور ملکی وسائل و ذرائع کو برباد کر رہے ہیں۔ زیادہ قرین عقل اور ملکی اور قومی مفاد سے ہم آہنگ بات یہی ہے کہ خواندہ سب کو بنایا جائے حتیٰ کہ معذورین کو بھی خصوصی انتظام کے تحت اس حد تک بہرہ ور ہونے کا موقع ضرور دیا جائے۔ خواندہ بنانے کے معاملے میں اگر جبر کو بھی کام میں لانا پڑے، جو یہاں ناپسندیدہ نیکی ہوگی، تو اس سے بھی گریز نہ کیا جائے۔ مگر اس کے بعد سارے مراحل میں ہر مرحلے پر موثر چھلنیاں لگی رہنی چاہئیں جن سے ہو کر صرف وہی انسانی مواد گزر سکے جو اپنی قدرتی اور اکتسابی صلاحیتوں کی بنا پر اس سے اگلے مرحلے کی تعلیم کا بوجھ سنبھال سکے۔ بغیر کسی منصوبہ اور نشانہ کے افراد کا یوں ہی بے مقصد تعلیم حاصل کرتے رہنا، لڑکوں کا ملازمت کی فکر میں اور لڑکیوں کا شادی کے انتظار میں، انمل بے جوڑ شعبہ ہائے زندگی سے متعلق مضامین میں امتحان پر امتحان دیئے جانا، بی ایس سی، بی ایڈ، ایم اے، بی ایڈ، ایل ایل بی، جی وی ایس سی، تین تین مضامین میں ایم اے اور کسی ایک سے بھی خصوصی لگاؤ یا اس میں اتنی اچھی دستگاہ نہیں جو معاشرہ کے لئے مفید ہو، بہت بڑا قومی اور ملی نقصان ہے افراد کے وقت اور دولت کا ضیاع ہے اور ملک کی ترقی میں مزاحم۔ ہمارے ملک میں بہت عرصے سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور جلد از جلد اصلاح طلب ہے مگر اصلاح بہر حال اپنے وقت پر ہوگی اور سرکاری سطح پر ہوگی کیوں کہ یہ کام افراد اور اداروں کے بس کا نہیں ہے اور حکومت کے ہاتھوں بھی اسی وقت انجام پا سکتا ہے جب ملک کے سارے ذرائع و وسائل اور ساری صنعتوں اور حرفوں پر سرکاری کنٹرول ہو جس کے بغیر عدم صلاحیت کی بنا پر اعلیٰ تعلیم سے روکے جانے والے افراد کو کام میں لگانا ممکن نہ ہوگا کسی جمہوری ملک میں پرائیویٹ سیکٹر حکومت کے ساتھ انھیں معاملات میں کلی تعاون کرتا ہے جو اس کے اپنے مفاد میں ہوں۔ ہمارے سامنے تو صرف یہ مسئلہ ہے کہ تعلیم نسواں عموماً اور مسلمان بچیوں میں خصوصاً مختلف مراحل میں کس طرح ہو تعلیم و تربیت ناقص رہے گی جب تک مائیں بچوں کو نرسری اسکول بھیجنے تک کسی درجہ میں ان کی تربیت نہ کر چکی ہوں۔ جاہل اور لاپرواہ ماں باپ کے بچے اساتذہ اور استانیوں کے لئے بڑی دشواریاں پیش کرتے ہیں۔ بہر حال موجودہ معاشرتی حالات جیسے کچھ ہیں ان میں کام کی ابتدا اس طرح کرنی ہوگی کہ جیسی طالبات اور مستقبل کی مائیں مطلوب ہیں ویسے نمونے اسکول میں مہیا کئے جائیں۔ اگر معیاری نہیں تو جو بہتر سے بہتر استانیاں تعلیم و تربیت کے لئے مل سکیں، جنھیں اپنے کام سے قلبی لگاؤ ہو اور وہ بچوں سے محبت اور ہمدردی رکھتے ہوتے، قوم و ملت کی امانت سمجھ کر انھیں حقیقی معنوں میں انسان بنانے اور دنیا کے لئے مفید ثابت ہونے کا عملی ثبوت دے سکیں نہ کہ صرف چند گھنٹوں کے لئے ادائگی فرض سے مجبور ہو کر پابندی نظم کو انگیز کرلیں اور ذمہ داری کو ایک لبادہ کی طرح اوڑھ لیں مگر موقع ملتے ہی اسے اتار پھینکیں جیسا کہ اس وقت ملک کے بیشتر سرکاری، نیم سرکاری اور پرائیویٹ اداروں میں اساتذہ اور استانیوں کا حال ہے جن کی اکثریت کو اس پیشے کی محبت کھینچ کر نہیں لائی بلکہ گوناگوں مجبوریوں نے انھیں اس کے دامن میں پناہ لینے پر آمادہ کیا ہے اسی لئے وہ اس کے تقاضے بس قانونی حدود کے اندر پورا کرنے پر اکتفا کرتے ہیں اور جس کو بھی اس سے زیادہ آرام اور زیادہ معاوضے کا کام میسر آجائے وہ معماران ملک و ملت کی صف سے بلا تامل بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ تو ان کی خوش قسمتی اور طلباء کی بدقسمتی ہے کہ ان تھکے ہوئے افراد میں کم ہی اتنا حوصلہ ہوتا ہے کہ وہ اس (انکے بقول) آرام دہ اور سب سے کم وقت، محنت اور توجہ کا مطالبہ کرنے والے پیشہ سے غیر مطمئن ہو کر کسی اور میدان میں اپنی توانائیاں صرف کریں۔

معماروں کی ضرورت سب سے پہلے مواد ان کے مقابلے میں کمتر اہمیت رکھتا ہے۔ اچھے معمار خراب اور کم میٹریل سے بھی کام لے کر اچھے نتائج برآمد کر سکتے ہیں یا دوسروں سے کرا سکتے ہیں۔ نصاب کی کتابیں اور تعلیمی کتابیں وغیرہ اساتذہ سے بہتر کوئی تیار کرنے والا نہیں ہوتا کیوں کہ طلبہ کی ذہنی ساخت اور ان کی ضروریات کو ان سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔ ماحول کی بڑی اہمیت ہے مگر حالات کے تحت جو کچھ میسر ہو اسے ہی زیادہ سے زیادہ

مفید اور موثر بنانا اساتذہ کا کام ہے بشرطیکہ اربابِ حل وعقد ان سے تعاون کرتے ہوئے انھیں کام کرنے کی پوری آزادی دیں اور خود ان میں باہمی تعاون کی بھی کمی نہ ہو۔ وہ خود اپنے کام کے لئے سازگار ماحول پیدا کر لیتے ہیں۔ تجربہ نے ثابت کیا ہے کہ لائق اساتذہ ناقص نصابی کتابوں، کم اور ناقص سامانِ تعلیم اور ناسازگار ماحول میں بھی طلبہ کو بہت کچھ فائدہ پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ لائق توجہ امر یہ ہے کہ اساتذہ اور استانیاں اس اندازِ فکر اور ان اصولوں سے پوری طرح متفق بھی ہیں جن کے مطابق مدرسہ چلانا ہے یا صرف ضرورت سے مجبور ہو کر اقرار کریں اور دل میں ان میں نفرت کرتے رہیں جو ان کے عمل سے ظاہر ہو۔ دکھاوے کی خاطر کبھی تھوڑی دیر کے لئے بکراہت عمل ہو بھی تو فوراً اس سے اعلانِ برأت۔ ان کا اصلی روپ عموماً اسلام کے بجائے جاہلیت کی نمائندگی کرنے والا ہوتا ہے اور یہ دورنگی ان کے طلبہ اور طالبات میں دورنگی پیدا کرتی ہے اور زیادہ جری عناصر کو کھلی بغاوت پر ابھارتی ہے اور نتائج ہر جگہ ہمارے سامنے ہیں۔

ہمیں بچیوں کی تعلیم اسلامی طرز پر مطلوب ہے۔ ہم نے نصابِ تعلیم میں اس کا پورا لحاظ رکھا ہے مگر دینی اور سیکولر علوم کی پیوندکاری کوئی آسان کام نہیں ہے اور کبھی کبھی بہت ہی مایوس کن نتائج پیدا کرتی ہے جیسا کہ اوپر تفصیل سے ذکر آ چکا ہے۔ اس کا ایک علاج اساتذہ اور اپنے گھر کے لوگوں کا اپنے دل و جان کی پوری آمادگی کے ساتھ کتابی علم اور زبانی تلقین کا خود عملی نمونہ بن کر بچوں یا بچیوں کے سامنے پیش کرتے رہنا ہے اور ساتھ ہی ساتھ انھیں حتی الوسع اس زہریلے، دشمنِ دین و ایمان، مگر بہت ہی دلکش، ماحول سے بچانا ہے جو اسکول میں کئے کام پر پانی پھیر دینے والا ہو۔ اسی لئے اسلامی تعلیمات کے لئے مثالی معاشرہ تو وہی ہوتا ہے جہاں سیکولر اور مذہبی کا جھگڑا مٹ گیا ہو اور زندگی میں قدم قدم پر تضاد نہ پائے جاتے ہوں کہ اس ماحول میں نشو و نما پانے والا ذہن ان کی بدولت خلجان میں مبتلا ہو جائے تاہم عبوری دور میں ایک درمیانی راہ ان لڑکیوں اور لڑکوں کے لئے مہیا کی جا سکتی ہے جو برائی اور بھلائی میں تمیز نہ کر سکتے ہوں۔

سب سے مشکل کام گھروں کی پاکیزگی ہے جس کی ضرورت کا احساس سب کو ہے اور کبھی کوئی اس کے اعلان سے نہیں چوکتا مگر عملاً ہر شخص خود کو بے بس پاتا ہے۔ قائل خود اپنے گھر کی اصلاح نہیں کر پاتے۔ ضروری نہیں کہ اساتذہ اور استانیوں کے گھر اس خصوص میں دوسرے گھروں سے بہت بہتر ہوں۔ اس دشواری پر قابو پانا کسی ایسے ملک میں جہاں صنعتی تہذیب تو تیزی سے تسلط پا رہی ہو اور تعلیم عام نہ ہو، تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے ساتھ اس سے پہلے کی نسل کی اصلاح جو غیر محدود وسائل و ذرائع اور بے حد بیداری کے ساتھ ان تھک کوششوں کا مطالبہ کرتی ہیں ہمارے معاشرے میں بحالات موجودہ میسر آنا ممکن نہیں۔ والدین اور سرپرستوں کا تعاون حاصل ہونا تو درکنار وہ اساتذہ اور استانیوں کی بات کو درخورِ اعتنا بھی نہیں سمجھتے۔ اس میں مستثنیات شاذ و نادر وہاں ملیں گے جہاں وہ گروہ یا مختصر سا سماج پہلے سے کسی مقصد پر متفق ہو اور اس حد تک اس میں یکسانی پائی جاتی ہو ورنہ ظاہر ہے کہ محض اس مقصد کے لئے کوئی معاشرہ وجود میں لانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے معاشرہ میں یہ سرد مہری عام ہے اور ہماری ملت تو ہر مانہ حد تک اس باب میں اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہے۔ ان کا عملی رویہ ہمیں ہمارے بچوں کی معیبت سے بچاؤ کا اعلان کرتا ہے۔ انھیں نہ تو مہلت ہے، نہ بچے کی کی بات سنتے ہیں۔ اسکول انھیں سال بھر میں اوسطاً تین گھنٹے روزانہ میں نیک مہذب اور تعلیم یافتہ بنا دے۔ اساتذہ اور سرپرستوں کی کسی میٹنگ میں سرپرستوں کی حاضری اور ان کی لمبی چوڑی شکایات اور اسکول کی ہر چیز پر ان کی تنقید سے آگے بڑھ کر تنقیص اس زبوں حالی کی غماز ہوتی ہیں۔

نصاب کے سلسلے میں چند باتیں کہنی ہیں پہلی تو کم عمر بچوں پر چار زبانوں کے بوجھ کے بارے میں ہے۔ یہ تسلیم ہوتے ہوئے بھی کہ انسانی معاشرہ جیسے جیسے پیچیدہ ہوتا جاتا ہے اس کی تعلیمی ضروریات بھی اسی تناسب سے بڑھتی جاتی ہیں۔ اس کی نمایاں ترین مثال اس دور کے سائنسی علوم اور ریاضی کی زیادہ سے زیادہ معلومات ہیں جو عام پڑھے لکھے آدمی کے بھی ایک شعوری زندگی گزارنے کے لئے ضروری ہیں۔ ساتھ ہی زندگی ایک واحدہ یا ناقابلِ تقسیم اکائی ہوتے ہوئے اسے طلبار کے لئے سائنس اور آرٹس کے سربمہر خانوں میں تقسیم کر کے انھیں معاشرہ میں یک رخا بنانا کوئی دانائی کی بات نہیں۔ اس کی تلافی کے لئے بعض تعلیمی اداروں نے عمومی تعلیم کے نام سے سائنس کے طلبار کے لئے آرٹس کا ایک مختصر مگر جامع نصاب اور آرٹس والوں کے لئے سائنسی مضامین کی جامع معلومات تعلیم کے مختلف مراحل میں لازمی مضمون کی حیثیت سے رکھنے کا تجربہ کیا۔ اس ذیل میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نتائج قابلِ ذکر ہیں اور نتائج بہت شاندار نہیں تھا امید افزا ضرور رہے ہیں۔ اس حد تک تو نصاب میں ہر مرحلہ پر تبدیلی یا ترمیم و اضافہ مفید ہو سکتے ہیں نہ یہ کہ ان سے بالکل صرفِ نظر کر لیا جائے مگر زبانیں تو پہلے ہی بدلے ہوئے حالات کے تحت دو سے بڑھ کر تین ہو گئی ہیں اور ان میں ہم پہنچنے والی دستگاہ پر برا اثر پڑتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں چاہے اس کی دستگاہ میں دوسرے عناصر بھی کارفرما ہوں۔ دوسری زبانوں کی افادیت اپنی جگہ ہوتے ہوئے بھی مادری زبان میں کمزوری ناقابلِ تلافی نقصان اور شرمناک کمزوری ہے۔ زیادہ زور اسی پر دینا چاہیئے جب اس میں اچھی لیاقت پیدا ہو جائے تو دوسری زبانوں کی طرف خصوصی توجہ ممکن ہے۔ عربی مسلمان بچوں اور بچیوں کے لئے ان کے دینی نقطۂ نظر سے ایک ناگزیر ضرورت ہونے پر بھی ایک ایسی زبان ہے جس کے لئے کوئی ماحول اس ملک میں میسر نہیں، نہ گھروں کے اندر نہ باہر۔ وہ کلاس روم اور کتاب کے سرورق کے درمیان محدود رہتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اسے کس مرحلے میں داخلِ نصاب کیا جائے اور اس پر کتنا زور دیا جائے۔ دین کی تعلیم کے لئے ابتدائی مراحل میں دین کی زبان کا حصول ناگزیر نہیں۔ اس کا حصول تو اپنی زبان کے ذریعہ بہت اچھی طرح ممکن ہے۔ وسطانی مرحلہ تک اس دور میں عام معلوماتی مضامین کے معاملہ میں سرد مہری یا بالکلیہ ان سے صرفِ نظر بھی دانائی نہ ہوگی۔ فوقانی مرحلہ میں تو دوسری ضرورتوں سے مجبور ہو کر ان میں سے بعض کو بعض کے حق میں ترک کرنا ضروری ہو جاتا ہے مگر اس عمر اور مرحلے تک طلبہ اور طالبات ابتدائی ناگزیر معلومات حاصل کر چکے ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں کسی قدامت پسند رویہ کو کسی بھی تاویل سے صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ وسطانی مرحلے تک ریاضی سے مفارقت بھی ایک خلا پیدا کر دیتی ہے کیونکہ بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ طلبار اس مرحلے تک اب بہت کم سیکھ پاتے ہیں۔ اسے انگیز کرنا بھی صحیح نہ ہوگا۔

بقیہ ۔ صفحہ ۷۵ پر

اقبال احسان ایم۔اے۔بی۔ایس سی

جنگ اقتصادیات کے آئینہ میں

اکونومکس ایک ایسا علم ہے جسے انسان کی زندگی کے ہر شعبہ میں دخل ہے۔ اسی طرح کسی ملک کی ترقی یا تنزلی کا بھی اس ملک کی اکونومی سے قدیمی رشتہ ہے۔

موجودہ دور میں جنگ خرچیلے ہوتے ہیں۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ جنگیں انٹرنیشنل ہوگئی ہیں۔ ہر ایک بڑا طاقتور، مال دار ملک چھوٹے چھوٹے کئی ملکوں کی حفاظت کی قسم کھاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس حفاظت لفظ کی آڑ میں ایک بڑا ملک دوسرے بڑے ملک سے اپنی دشمنی کا انتقام لیتا ہے۔

جنگ کس قدر قیمتی ہوتی ہے اس کے بارے میں پروفیسر پگو نے ایک جگہ کہا ہے کہ ہم سرکاری طریقوں سے MONEY CAST کا تو پتہ لگا سکے ہیں لیکن انسانوں کے ذریعہ بہایا گیا خون، ان کے آنسو، لاکھوں جانیں اور جائداد کے بے جا نقصان کی اصل قیمت REAL CAST کا پتہ نہیں لگا سکتے۔

جنگ کے انجام خطرناک ہوتے ہیں اور اس کا اثر انفلیشن کی شکل میں ملک میں کافی دقت پیدا کر دیتا ہے۔ یعنی ضروری اشیاء کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ اور غریب لوگوں کی زندگی پریشان کن ہو جاتی ہے۔ سرکار بھی اس خرچہ کو پورا کرنے کے لئے نئے نئے ٹیکس لگاتی ہے۔ جنتا کی اچھائی کاموں کے پروگراموں کو کافی عرصہ کے لئے ٹال دیا جاتا ہے۔

ایک بار امریکہ کے سابق صدر آئی جن ہاور نے کہا تھا، ہر بندوق جو بنائی جاتی ہے ہر ایک پانی کا جہاز جو بنایا جاتا ہے، ہر ایک راکٹ جن کا استعمال کیا جاتا ہے آخری نقطہ میں اس چوری کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو بھوکوں کے یہاں کی جاتی ہے جن کو کھانا نہیں ملتا جن کو ٹھنڈ لگتی ہے اور پہننے کو کپڑے نہیں ملتے۔

انھوں نے آگے کہا تھا کہ آج کل کے بمباری کرنے والے جہاز کی قیمت ہے تیس سے بھی زیادہ شہروں میں اینٹوں سے بنا ہوا اسکول دو بجلی پیدا کرنے والے کارخانہ جن سے اتنی بجلی پیدا ہو کہ ساٹھ ہزار سے زیادہ رہنے والے باشندوں کے شہروں میں بجلی کو پورا کرے دو شاندار اسپتال اور پچاس میل لمبی کنکریٹ کی سڑک۔

اوپر لکھے ہوئے ایک اتنے بڑے ملک کے صدر کے بیان سے ظاہر ہے کہ جنگ ہونے سے ملک کی اکونومی کس طرح تلملا اٹھتی ہے۔

جنگ کے اس عظیم نقصان کو پورا کرنے کے لئے حکومت مندرجہ ذیل طریقہ استعمال کرتی ہے۔

ٹیکس لگاکر

دورۂ جنگ میں زیادہ سے زیادہ آمدنی کرنے کے لئے حکومت یا تو نئے ٹیکس لگاتی ہے اور پرانے ٹیکسوں کی دروں میں بھی بڑھوتری کر دیتی ہے۔ اور حکومت اس بات کا بغیر خیال رکھتے ہوئے کہ پبلک پر اس بڑھوتری کا کیا اثر پڑے گا۔ ٹیکسوں کو کافی حد تک بڑھائے جاتی ہے۔ اس سلسلے میں حکومت کا کہنا یہ ہوتا ہے کہ ان ٹیکسوں کا اثر غریب لوگوں پر کم پڑتا ہے کیوں کہ وہ اپنی جان کی بازی لگاکر حکومت کی مدد کرتے ہیں جب کہ مالدار آدمی ٹیکس دے کر۔

آدم اسمتھ جو ٹیکس لگاکر جنگ کا خرچہ پورا کرنے کے خلاف تھے ایک جگہ کہتے ہیں کہ دو اور دو مل کر چار نہیں ہوتے وہ پانچ بھی ہو سکتے ہیں اور تین بھی، پھر ٹیکسوں کی وصولی میں بھی کافی وقت لگتا ہے جب کہ حکومت کو اس وقت خرچ کرنے ہوتے ہیں۔ پروفیسر سلیمن بھی ایڈم اسمتھ کے خیالات سے متعلق تھے انھوں نے کہا کہ جنگ کے خرچہ اس قدر وسیع ہوتے کہ اگر ملک کے سارے بڑے بڑے کارخانے کے فائدوں کو ضبط کر لیا جائے تو بھی حکومت جنگ کے خرچ پورے نہ ہو سکیں گے۔

جنتا سے قرض لے کر

حکومت کی ایک دوسری پولیسی یہ ہوتی ہے کہ حکومت جنتا سے پیسہ لینے کے لئے نئے نئے مکتوب قرضہ جاری کر دے جن کے لوٹانے پر کچھ فائدہ ملے یا بینک میں سود کی مد بڑھا دے۔ اس طرح کافی رقم حکومت کے پاس اکٹھی ہو سکتی ہے۔

قیمتی اضافہ یا انفلیشن

جب حکومت ٹیکس لگانے پر بھی یا قرضہ لے کر بھی لڑائی کے خرچہ کو پورا نہیں کر سکتی تو وہ ایک نیا طریقہ استعمال کرتی ہے ایک تو یہ کہ وہ اپنی سینٹرل بینک کو نئے نوٹ چھاپنے کی اجازت دے دے یا سیدھے ہی وہ بینکوں سے ادھار لینا شروع کر دے۔

پروفیسر وکیل نے آخری طریقہ کار کو ایک ڈاکو سے مشابہت دیتے ہوئے بتایا کہ عوام

بقیہ ص [illegible] پر

ڈاکٹر سید عبداللہ ایم اے ڈی لٹ

فارسی زبان — اور گورونانک

فارسی اور اردو زبانوں کی ترویج و ترقی میں ہندو سکھ صوفی، ادیب، اور شاعروں کا بھاری حصہ رہا ہے۔ اس سلسلہ میں جناب ڈاکٹر صاحب نے جو تحقیقاتی مقالہ لکھا ہے۔ اس میں حضرت بابا نانک کی فارسی دانی کا تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ (ادارہ)

اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے کہ گروجی نے فارسی زبان کہاں تک پائی تھی۔ اس سلسلے میں مورخین کے خیالات درج کئے جاتے ہیں، بابر نامہ میں جو بابر کی خود نوشتہ سوانح عمری ہے بابا نانک کے متعلق ایک حرف موجود نہیں۔

اکبر نامہ وغیرہ میں ہندوؤں کے ایک فرقے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جس کو سیتش کے نام سے پکارا گیا ہے۔ اس کے علاوہ عہد اکبری کی تاریخیں بابا نانک کے حالات سے یکسر خالی نہیں۔ توزک جہانگیری میں بھی بابا نانک کا ذکر نہیں۔ فارسی کی سب سے پرانی کتاب جس میں سکھوں اور بابا نانک کے حالات قدرے تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ وہ غالباً . . . "دبستان مذاہب" ہے لیکن اس کتاب میں بھی گروجی کی تعلیم کے مسئلہ پر کچھ زیادہ نہیں لکھا گیا۔ اس لئے یہ کتاب بھی ہمارے مقصد کے حصول کے لئے چنداں مفید نہیں۔

تاریخ پنجاب مصنفہ غلام محی الدین بوٹے شاہ میں لکھا ہے۔

"چنانچہ از اشعار ہندی و فارسی آں کہ نظم آوردہ ہمیں طرز معلوم می شود"

یعنی مصنف کے نزدیک ان کے اشعار فارسی زبان میں موجود ہیں۔

بہار گلشن "کا مصنف یوں رقم طراز ہے۔

"بیاں کمالاتش از تقریر و تحریر مستغنی ہے"

منشی سوہن لال نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں ایک تاریخ عمدۃ التواریخ کے نام سے لکھی ہے۔ یہ مصنف لکھتا ہے۔

"از اشارات و کنایات علم فارسی نیکو مطلع"

میکالف صاحب نے سکھ مذہب پر ایک مبسوط کتاب چھ ضخیم مجلات میں تحریر کی ہے صاحب موصوف کا بیان ہے۔ کہ

میں نے اس کتاب میں سکھوں کے خیالات و روایات کا خاص طور پر خیال رکھا ہے۔ اور ہر چیز نہایت شدید سکھ نقطہ نگاہ سے تحریر کی گئی ہے جس میں میں نے اپنی طرف سے کسی تنقید و جرح کی کوشش نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے معجزات و خوارق کا ذکر کتاب کے طول و عرض میں بڑی کثرت کے ساتھ کیا ہے۔

پس اگر اس کتاب کو تمام سکھ قوم اصل آواز اور فیصلہ سمجھیں تو غالباً بے جا نہ ہوگا۔ صاحب موصوف کے نزدیک یہ امر بالکل غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم سکھ مذہب کے بانی کو علم سے بے بہرہ ثابت کریں۔ آگے چل کر صاحب موصوف لکھتے ہیں۔ کہ ہمارے پاس نہایت کافی داخلی شہادتیں موجود ہیں۔ جو خود گروجی کے کلام میں ہیں۔ جن سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ گروجی نے فارسی تعلیم حاصل کی تھی۔ صاحب موصوف نے ایک اور دلیل یہ دی ہے۔ جو ہمارے نزدیک قابل قبول نہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ بولا رنے جو کہ تلونڈی کے محافظ تھے۔ گرونانک کے والد سے وعدہ کیا تھا۔ کہ اگر وہ تھوڑی بہت فارسی تعلیم حاصل کر لیں۔ تو ان کو شاہی ملازمت میں داخل کرنے کی کوشش کی جائے۔

یہ دلیل ہمارے لئے اس لئے مسلم نہیں۔ کہ اس وقت تک سرکاری دفاتر ہندی زبان میں ہوا کرتے تھے۔ اس لئے ملازمت حاصل کرنے کے لئے کسی کو فارسی عربی کی ضرورت نہیں محسوس ہو سکتی تھی۔

آگے چل کر صاحب موصوف لکھتے ہیں۔

کہ گرنتھ صاحب میں اکثر فارسی کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اور چند فارسی کے پورے شعر بھی ملتے ہیں۔

ہم اس امر کو ایک مسلم حقیقت خیال کرتے ہیں۔ کہ وہ فارسی کے ایک اچھے عالم تھے۔ اور غالباً اسی مطالعہ کتب فارسی نے ان کے دماغ میں عام اولوالعزمی کا جذبہ پیدا کیا تھا۔ صاحب موصوف نے بعض اور دلائل بھی دئے ہیں۔ جن کو ہم سر دست نظر انداز کرتے ہیں۔ کنگھما کی ہسٹری دی سکھس ایک بلند پایہ کتاب ہے۔ اس میں لکھا ہے۔ کہ ہمارے پاس یہ یقین کرنے کے لئے کافی دلائل موجود ہیں۔ کہ گورونانک نے اپنے آپ کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذاہب عقائد سے واقف کر لیا تھا اور ان کو مسلمانوں اور ہندوؤں کی کتابو

سے عام واقفیت تھی ۔

نیگس صاحب انسائیکلوپیڈیا آف تھکس ،، میں لکھتے ہیں ۔ عام طور پر سکھ روایات کو قابل تسلیم نہیں قرار دیا جاسکتا ۔ ان کے نزدیک گرنتھ صاحب پنجابی ہندی اور فارسی اشعار کا مجموعہ ہے ۔ گورو نانک صاحب کی تعلیم کے متعلق ان کی تحقیق یہ ہے ۔ کہ نو سال کی عمر میں انہوں نے فارسی پڑھی ۔

جنم ساکھی ۱۸۷۱ مطبوعہ لاہور کی روایت ہے ۔ کہ گرو نانک جی نے کچھ ترکی بھی پڑھی ۔ ٹرمپ صاحب کا خیال ہے کہ ترکی سے مراد فارسی ہے ۔ جو اس وقت مسلمانوں کی زبان تھی ٹرمپ صاحب کی تحقیق ہے ۔ کہ گرنتھ صاحب میں نانک کے کچھ اشعار فارسی ملتے ہیں ۔ اگرچہ معلوم ہوتا ہے ۔ کہ ان کی فارسی دانی معمولی درجے کی تھی ۔ صاحب موصوف لکھتے ہیں ۔ کہ جنم ساکھی مطبوعہ لاہور میں سے یہ الفاظ دیدہ دانستہ نکال دیئے گئے ہیں ۔ کہ ان کو فارسی (ترکی) سے واقفیت تھی ۔

ڈاکٹر گوکل چند نارنگ اپنی کتاب ٹرانسفارمیشن آف دی سکھ ،، میں گورو نانک صاحب کی تعلیم کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کی تعلیم باقاعدہ نہیں تھی ۔ اس امر کے ثابت کرنے کے لئے وہ ذیل کی دلائل دیتے ہیں ۔

۱ ۔ نانک کی دوسرے مذاہب کی تنقید عالمانہ نہیں ۔

۲ ۔ یہ قول کہ ان کا پہلا استاد مسلمان تھا ۔ مسلمان مورخین کا تصرف معلوم ہوتا ہے ۔ جو یہ چاہتے ہیں ۔ کہ گرو جی کی آئندہ عظمت کا سہرا تعلیمات اسلام کے سر باندھیں ۔

۳ ۔ فارسی کی ضرورت اس لئے بھی نہیں پڑ سکتی تھی ۔ کہ دفاتر کی زبان ہندی تھی

۴ ۔ پنتھ پرکاش میں لکھا ہے ۔ کہ گرو جی کا پہلا استاد گوپال پنڈت تھا ۔ جو سکول کا معلم تھا ۔

۵ ۔ یہ امر بھی ممکن ہے ۔ کہ نانک سید حسن درویش کے سامنے بیٹھے ہوں ۔ لیکن اس میں شبہ ہے کہ ان کو فارسی میں یا سنسکرت میں کوئی نظر پیدا ہوئی یا نہیں ۔

لیکن یہاں یہ سوال نہیں کہ نانک کی عظمت کس قوم کی تعلیم کی وجہ سے پیدا ہوتی تھی ۔۔۔ یہاں تاریخ کا سوال ہے ۔ جس کے ذریعہ ہم یہ بتانا چاہتے ہیں ۔ کہ گرو جی کس قدر فارسی جانتے تھے ۔ یہاں تک ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ اکثر مصنفین کی رایوں کا خلاصہ ہے اب ذیل میں تین طریقوں سے ہم اس مسئلہ پر روشنی ڈالنا چاہتے تھے ۔ جس کا تعلق خاص طور پر مسلمانوں کے ساتھ ہے ۔ پھر گرنتھ صاحب کے بارے میں اپنی لسانی تحقیق پیش کریں گے اور بالآخر ایک مختصر خاتمہ کے ساتھ مضمون کو ختم کر دیں گے ۔

ٹرمپ صاحب کے پاس جو جنم ساکھی ہے ۔ وہ ان کے بیان کے مطابق سب سے پرانی جنم ساکھی ہے ۔ اس میں کوئی خوارق اور دور از عقل معجزات نہیں ۔ گرو جی کے سیدھے سادے حالات مرقوم ہیں ۔ ٹرمپ صاحب بجا فرماتے ہیں ۔ کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ جنم ساکھیوں کے بیانات میں اختلاف پیدا ہوتا گیا ۔ حتیٰ کہ سب سے زیادہ مختلف وہ ہے ۔ جو لاہور میں طبع ہوئی ۔ ہم ذیل کے شذرے میں صرف ٹرمپ صاحب کی ترجمہ جنم ساکھی کی روایات پر اعتبار کریں گے ۔

گرو نانک جی تلونڈی میں پیدا ہوئے ۔ ان کی پیدائش ۸۷۵ھ مطابق ۱۴۶۹ء میں بعہد سلطنت بہلول لودھی ہوئی ۔ ان کے والد تلونڈی میں پٹواری تھے ۔ یاد رہے کہ اس زمانے ملازمت حاصل کرنے کے لئے کسی فارسی عربی لیاقت کی ضرورت نہیں تھی ۔ ہندی دفتر کی زبان تھی ۔ اور اس زبان میں تھوڑی بہت مہارت سے ملازمت حاصل ہو سکتی تھی ۔

باباصاحب کی ابتدائی تعلیم کے متعلق مختلف بیانات ہیں ۔ پنتھ پرکاش میں لکھا ہے کہ گرو جی نے گوپال پنڈت کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا ۔ مگر بہت جلد وہاں سے اٹھ آئے ۔ آدی گرنتھ میں پنڈت صاحب کے ساتھ معمے کے رنگ میں مکالمہ موجود ہے اکثر مصنفین سیرالمتاخرین کی اس روایت پر اعتبار کرتے ہیں کہ آپ کے پڑوس میں سید حسن نام ایک درویش رہا کرتے تھے ۔ ان کو گرو جی سے بے حد الفت تھی ۔ انھوں نے گرو جی کو فارسی زبان میں تعلیم دینا شروع کی ۔ میکالف صاحب نے فارسی معلم کے ساتھ جو مکالمہ گرو جی کا ہوا تھا ۔ وہ درج کیا ہے ۔ مگر وہ رکن الدین قاضی کے ساتھ ہوا ۔ اس میں سید درویش کا نام نہیں آتا ۔ ٹرمپ صاحب نے اس امکان کو تسلیم کیا ۔ کہ گرو جی نے سید حسن سے کچھ استفادہ کیا ہو ۔ ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کا خیال ہے ۔ کہ گرو جی کو فارسی اور سنسکرت ہر دو زبانوں میں کوئی زیادہ دسترس حاصل نہ تھی ۔ لیکن شاگردی کے معاملہ میں ہر دو امکانات کو تسلیم کرتے ہیں ۔ اکثر مورخین کو اس امر سے کہ وہ اپنی زبان میں بے تکلف فارسی کے الفاظ بولتے ہیں ۔ یہ خیال پیدا ہوا ہے ۔ کہ انھوں نے ضرور کسی استاد سے فارسی حاصل کی ہوگی ۔

بٹالہ میں آپ کا بہنوئی جے رام دولت خاں لودھی کے مودی خانے میں ملازم تھا ۔ بیان ہے کہ وہاں آپ نے ملازمت اختیار کی ۔ مگر طبیعت سے مجبور ہو کر ملازمت ترک کر دی ۔ کہتے ہیں کہ دولت خاں آپ کا بہت احترام کرتا تھا ۔ فقراء کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے کا ذکر بے حد طویل ہے ۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے ۔ وہ ہندو مسلمان کے امتیاز سے بالا تھے ۔ مسلمان فقراء کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے ۔ تاریخ پنجاب وغیرہ میں ان تمام اولیاء اللہ کا نام لکھا ہے جن کی خدمت میں بابا نانک تشریف لے گئے ۔

بابرنامے میں گرو جی کا ذکر کہیں نہیں آتا تھا ۔ البتہ گرنتھ صاحب میں ایک مقام پر بابر بادشاہ کا ذکر آتا ہے ۔ نیز جنم ساکھی مترجمہ ٹرمپ صاحب بھی تفصیلی ملاقات کے ذکر سے خالی ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ بابر کے ساتھ گرو جی کی ملاقات کے افسانے بھی اکثر و بیشتر موضوع ہیں ۔

رائے بولار کو آپ سے ...... بہت عقیدت تھی ۔ یہ بھٹی ذات کے مسلمان راجپوت تھے ۔ گرو جی کے ساتھ ان کے تعلقات بہت مخلصانہ تھے ۔

ٹرمپ صاحب لکھتے ہیں ۔ کہ باباصاحب کا سفر مکہ محض افسانہ ہے ۔ اور اس میں کوئی اصلیت نہیں ۔ لیکن معلوم ہوتا ہے ۔ کہ افغانستان اور ایران وغیرہ کا سفر آپ نے کیا اور وہاں کے فقراء و صلحا سے ملا کئے ۔ اکثر معاملات میں تبادلہ خیال ہوتا تھا ۔ آپ کے ہم سفر لوگوں میں ایک مردانہ " رباب " تھے ۔ جو ہر مقام پر آپ کے ساتھ گئے ۔

میں نے گذشتہ واقعات میں صرف ان باتوں کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق مسلمانوں کے

ساتھ تھا۔ اس ترتیب وتعین سے ہمارا ایک مقصد ہے۔ جس کا ذکر ہم اس مضمون کے خاتمہ پر کریں گے۔ ہم اب گروگرنتھ صاحب کا مطالعہ کریں گے۔ تاکہ ہم گرو نانک کی فارسی میں دست رس کا حال معلوم کر سکیں۔

گروگرنتھ صاحب کے پہلے محلے یعنی حصّے کی تحقیق سے جو گرو نانک صاحب کی تصنیف ہے معلوم ہوتا ہے۔ کہ پنجابی اشعار میں فارسی الفاظ بکثرت استعمال کئے گئے ہیں۔ صرف "جپ جی" پر ہی نظر ڈالی جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ ان اشعار میں فارسی کے لفظ بلا تکلف آئے۔ مثلاً۔

کیو سچیا ں ہوئیے کیو کوڑے تٹے پال
حکم رجائی چلنا نانک لکھیا نال

گروگرنتھ صاحب لاہور ۱۹۱۶ء ص ۱

حکم۔ بمعنی عام
رجائی۔ بمعنی رضا

گاوے کو جاپے دسے دُور
گاوے کو دیکھے حادرا حدور

ایضاً

حادر۔ حاضر
حدور۔ حضور

جنی نام دھیایا گئے مسقت نال الخ

مسقت۔ مشقت

کھٹ ترسی مکھ بولنا مارن ناد گئے

ترسی۔ ترشی۔

صفحہ ۲۲ و ما بعد پر تقریباً ہر شعر میں فارسی عربی کے لفظ موجود ہیں۔ مثلاً سفیدی، برکمان، ذات، نظر (ندر) بادشاہ (پاتشاہ) زور، شمار، بدفعلی (بدفیلی) غائبانہ (گیبانہ) وغیرہ۔

ٹرمپ صاحب اور دیگر محققین نے بابا نانک کے چند خالص فارسی اشعار کا ذکر کیا ہے۔ اس قسم کے اشعار جن میں فارسی گرامر کا پورا لحاظ رکھا گیا ہو۔ ________

________ یا جن کو کسی طرح فارسی کا شعر کہا جا سکتا ہو بہت کم ہیں۔ میرے زیر نظر جو اشعار ہیں۔ ان کی نوعیت یہ ہے کہ فارسی کے کچھ الفاظ ایک جگہ جمع کر دیئے ہیں۔ جن کے جوڑنے کے لئے یا تو کوئی چیز موجود نہیں۔ یا بعض اوقات پنجابی گرنتھ کی اصلی زبان کے ایک دو لفظ شعر کے اندر رکھ دیئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر گروگرنتھ صاحب کا صفحہ ۶۵ ملاحظہ ہو۔

۲۔ صادق صبوری صادقاں صبر توسہ (توشہ) ملائکاں
دیدار پورے . . . . الخ ایضاً ص ۱۰۵

پہلا مصرعہ سارا عربی فارسی الفاظ کا مجموعہ ہے۔

۳۔ صدق کر سجدہ من کر مقصود
جیدھر دیکھا تیدھر موجود

ایضاً

۴۔ قدرت ہے قیمت نہ پائے
جا قیمت پائے کہی نا جائے

ایضاً

۵۔ مہر مسیت صدق مصلی حق حلال قرآن
سرم سنت سیل روجا (روزہ) ہو مسلمان
کرنی کعبہ سچ پیر کلمہ کرم نواج (نماز)
تسبی (تسبیح) سانت الخ ایضاً ص ۱۰۹

اس مثال میں اکثر الفاظ عربی کے ہیں۔

نیز چند اشعار فارسی کے پورے بھی ملتے ہیں۔ لیکن وہ بھی ایسے نہیں۔ جو ہمارے لئے ایک سند کا کام دے سکیں۔ بلاشبہ وہ مذکورہ بالا مثالوں کی نسبت زیادہ صاف اور واضح ہیں لیکن ایک دو اشعار کا موجود ہونا چنداں قوی دلیل نہیں ہے۔

ایک عرض گفتم پیش تو در گوش کن کرتار
حقا کبیر کریم تو بے عیب ________ پروردگار
دنیا مقام فانی، تحقیق دلے دانے
ہم سر موئے عزرائیل گرفت، دل ہیچ نہ دانی
زن، پسر، پدر، برادران کس نیست دستگیر
آخر بیفتم کس ندارد، چوں شود تکبیر
شب روز گشتم در ہوا کردم بدی خیال
گاہے نہ نیکی کار کردم ہم ایں چنیں احوال
بدبخت ہم چو بخیل غافل بے نظر بے باک
نانک بگوید جن ترا تیرے چاکراں پہ خاک

(راگ تلنگ محلہ پہلا)

ہمیں کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے صرف اتنی ہی مثالیں کافی ہوں گی۔ گرنتھ صاحب کے مطالعہ لسانی سے جس نقطہ پر پہنچا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ پہلے تو بقول ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کے گرو جی کی دوسرے مذاہب کی تنقید عالمانہ نہیں۔ ان کی زبان کا وہ انداز نہیں جو دوسرے مذاہب کے ایک جید عالم کا ہو سکتا ہے۔

دوم:۔ یہ کہ اگر محلہ اول میں جتنے فارسی الفاظ موجود ہیں ان سب کو جمع کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بابا صاحب کے ذہن میں فارسی کے بہت کم الفاظ موجود ہیں۔

سوم:۔ جتنے الفاظ موجود ہیں۔ وہ بالکل عام سے ہیں۔ بظاہر وہ الفاظ عام زبان کے اندر رائج ہو چکے تھے۔ یا اگر رائج نہ بھی ہوئے تھے۔ تو گرو جی نے اکثر مسلمان فقراء کے ساتھ ملاقاتوں میں اخذ کئے ہوں گے۔

غرض صرف گروگرنتھ صاحب میں فارسی الفاظ کا موجود ہونا ہمارے نزدیک اس بات کی کافی اور موثر دلیل نہیں۔ کہ گرو نانک فارسی زبان کے ایک بلند پایہ عالم تھے۔

جیسا کہ میاں الف صاحب نے تحریر کیا ہے۔ تاوقتیکہ ان کی فارسی دانی کے حق میں اس سے بہتر دلیل نہ مل سکے۔ جو تمام ارباب نظر کے نزدیک حجت قاطع ہو۔ زبان میں غیر ملکی الفاظ کا آنا بالکل معمول اور عام بات ہے۔ آج ورنیکلر میں اور عوام کی زبان میں انگریزی کے صدہا الفاظ بے تکلف موجود ہیں۔ صرف ان الفاظ کا موجود ہونا ہمیں اس فیصلے پر نہیں پہنچاتا۔ کہ کوئی شخص اس زبان کا ماہر مان لیا جائے۔

گرونانک جی کی فارسی تصنیفات

معارف نے فہرست کتب خانہ آصفیہ کے حوالہ سے لکھا ہے۔ کہ بابا نانک نے علم اخلاق و تصوف پر دو تین کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً ۱۔ الہیٰ نامہ ۲۔ دل طلب ۳۔ مناجات در بحر طویل۔ راقم نے ایک خط لائبریرین آصفیہ لائبریری کے نام لکھا جس میں ان سے ان کتابوں کے صحیح حالات بہم پہنچانے کی درخواست کی۔ اس کے جواب میں جو خط ان کی طرف سے موصول ہوا۔ اس کا متن حسب ذیل ہے۔

> دل طلب اور الہیٰ نامہ ہر دو رسالوں کے مصنف کا نام معلوم نہیں۔ دل طلب نظم میں ہے۔ اور الہیٰ نامہ نثر میں ہے۔ ان ہر دو رسالوں کو بابا نانک سے کوئی تعلق نہیں۔ فہرست میں غلطی سے ان کو بابا صاحب کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہوئی۔ کہ یہ دونوں رسالے ایک مجموعہ رسائل میں شامل تھے۔ جن کے آخر میں بابا نانک شاہ کی مناجات ہے فہرست نگار نے غلطی سے تمام رسالوں کو بابا نانک شاہ کی جانب منسوب کر دیا ہے۔ غرض دل طلب اور الہیٰ نامہ ہر دو بابا نانک شاہ کی تصانیف نہیں ہیں۔ باقی رسالہ مناجات کا معاملہ تو وہ گورو نانک کی جپ جی کا ترجمہ ہے جو کسی نے بارہویں صدی ہجری کیا ہے۔

مندرجہ بیان سے اندازہ ہوا۔ کہ بابا نانک کی کوئی تصنیف فارسی میں موجود نہیں جن محققین نے بابا نانک کے عالم ہونے پر زور دیا ہے۔ اکثر نے صرف اس وجہ سے زور دیا ہے۔ کہ گرو گرنتھ صاحب میں فارسی کی آمیزش ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کوئی دلیل نہیں دی۔

جہاں تک ہمارا خیال ہے۔ گرو نانک صاحب فارسی کے بڑے عالم تو نہ تھے مگر وہ فارسی ضرور جانتے تھے۔ جن کو وہ گرو گرنتھ صاحب میں وقتاً فوقتاً استعمال کرتے ہیں۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ کہ بابا نانک نے کئی ملازمین شاہی کے ساتھ ملاقاتیں کیں۔ ان کی ہندا اور رما در اسے ہند مسلمان مشائخ کے ساتھ صحبتیں رہیں۔ اکثر مسلمان مریدان سے فیض حاصل کرتے تھے۔ ان حالات میں ان کی زبان میں فارسی عربی زبان کے الفاظ کا آجانا لابدی اور ناگزیر تھا۔

بقیہ ۔ جنگ اقتصادیات کے آئینہ میں

ہی انسانوں کے حقوق کو اس فرق کے ساتھ چھینتے ہیں کہ ڈاکو تو ظاہر ہے لیکن انفلیشن ظاہر نہیں ہوتا۔ ڈاکو ایک وقت میں ایک انسان یا ایک خاندان کو برباد کرتا ہے جب کہ طریقہ سے پورا ملک متاثر ہوتا ہے۔ انھوں نے آگے کہا کہ ایک ڈاکو کو تو کبھی نہ کبھی عدالت میں آنا ہی پڑتا ہے جب اگر سرکاری طریقہ کار مان کر جائز مانا جاتا ہے۔ وطن کے باشندوں کی اپنے ملک سے محبت فطری بات ہے لیکن دورہ جنگ میں یہ پیار اور قربانی کافی بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے اپنی آبرو و جائداد کی حفاظت اور ملک کی عزت بچانے کے لئے ہر انسان ہر قسم کی قربانی کے لئے اپنے کو تیار پاتا ہے اور خدمات بھی پیش بھی کرتے ہیں۔

ایک معمولی سوال اوپر لکھی ہوئی باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے پیدا ہوتا ہے۔ کیا جنگ سے پیدا ہوا یہ بے وقتی نقصان ٹیکس سے ادھار لے کر نئے نوٹ چھاپ کر بینک کے سود کی در بڑھا کر یا لوگوں کی اپنی قرض سے روپیہ دینے سے پورا ہو سکتا ہے تو اس کا جواب نفی میں ملے گا کیوں کہ۔

جب سرکار ٹیکس لگاتی ہے تو وطن کے باشندوں پر ان کے کام کرنے اور بچت کر لی طاقت، عادت پر اثر پڑتا ہے۔ جس سے ملک کی اکونومی پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ کیوں کہ لفظ ٹیکس کو عام طور پر تھوپنا کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے تھوپی ہوئی کوئی چیز آدمی کی مرضی کے خلاف ہوتی ہے اس لئے اس کا دل اس کو کرنے کے لئے انکار ہی کرتا ہے یوں قانون کا ڈر سماج کا خوف اس کام کو کرا دے وہ دیگر بات ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ ٹیکس کی چوری بھی ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ٹیکس ادا کرنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے جب حکام اس حد کو پار کر دیتے ہیں تو اس کا نتیجہ کبھی کبھی انقلاب کی شکل لیتا ہے اور اگر یہ بھی نہیں تو عوام کی بے چینی سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔

جب حکومت ادھار کا سہارا لیتی ہے تو ادھار دینے کی بھی ایک معیار ہے۔ اس سے زیادہ حکومت ادھار بھی نہیں لے سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ قرض دینے کی ہمت بچت پر منحصر ہے اور بچت اس ملک کے باشندوں کی آمدنی پر منحصر ہے اس سے ظاہر ہوا کہ ملک کے انسانوں کی آمدنی جتنی زیادہ ہوگی۔ اتنی ہی وہ بچت کر سکیں گے۔ اور جتنی زیادہ ہوگی۔ اتنا زیادہ قرض حکومت کو مل سکے گا۔ لیکن ایک غریب ملک کیلئے جنگ چھڑ جانا یا جنگ چھیڑنا کس قدر مشکل ہے اس کا اندازہ اس کے باشندہ ہی لگا سکیں گے۔

جنگیں ہمیشہ دو ملکوں، دو حصوں، دو جماعتوں میں ہوتی ہے اور ہر ایک پارٹی جنگ کی شروعات دوسری پارٹی کے سر پر تھوپتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر پارٹی جنگ سے دور رہنا چاہتی ہے۔ لیکن اس کی مجبوری اس کے حالات ہوتے ہی ایسے ہیں کہ اسے ان عناصر کا کہنا ماننا پڑتا ہے جو دوگھروں میں آگ لگا کر خوش ہوتے ہیں اور اس آگ سے اپنے دل کی سردی کو تاپتے ہیں یہی ان کی تجارت ہے اسی میں ان کی کرسی اور ان کے ملک کا بڑا پن محفوظ رہ سکتا ہے۔ کاش ہر ملک کے حکام اپنے وطن کے اکونومسٹ سے صلاح لے سکتے!

دنیا کا کوئی بھی عقلمند انسان اس فیصلہ سے انکار نہیں کر سکتا کہ جنگ کسی مسئلہ کو حل نہیں کر سکتی ہے لڑائیاں ہمیشہ کشیدگی بڑھاتی ہے دو دلوں کو دور رکھتی ہے۔

مجھے ایک علم اقتصادیات کا طالب علم ہونے کے بعد یہ کہنے میں کوئی ہچک نہیں ہے کہ اکونومکس کے آئینہ میں اگر جنگ دیکھی جائے، اور اس کے کیمرہ سے جنگ کے نقصانات کا فوٹو دنیا کے سامنے رکھا جائے تو اسے دیکھ کر انسانیت لرز جائے گی۔

خدا کرے، ہر ملک جنگ سے دور رہے۔ آمین

فضا ابن فیضی

دانش ور کہلاتے ہیں اب فکر و نظر سے عاری لوگ
اپنے دور کی اس پستی پر چپ ہیں کیوں معیاری لوگ

ساغر ساغر پیاس کے شعلے، مرہم مرہم زخم کی آنچ
ہم جیسے معصوموں سے بھی کر گئے دنیاداری لوگ

ان کے وقار و وزن کے آگے خود میزان پشیمان ہے
ظرف کے کتنے ہلکے نکلے پتھر جیسے بھاری لوگ

اپنے ہی پہلو میں آخر نشتر بن کر تیر گئے
کب تک بیٹھے کرتے زخمی خوابوں کے دلداری لوگ

اس کے بدن کا ہنستا سورج دردہمارا جانے ہے
ہم چمکیلی دھوپ کے گاہک سائے کے بیوپاری لوگ

گونگے، بہرے، کنکر، پتھر، ہیروں کے مسجود ہیں اب
دفن کر آئے کس مٹی میں، جیون کی خودداری لوگ

دیکھیں درد کی شبنم بن کر مژہ مژہ یہ کب بکھرے
پی تو گئے ہیں پھول سمجھ کر، شعلے کی چنگاری لوگ

کب ملبوس کا چم خم اس کی عریانی کو ڈھانپ سکا
کر نہ سکے اب تک زخم تہذیب کی پرداری لوگ

پتھر پتھر ڈھونڈھ رہے ہیں، اپنے گمشدہ چہروں کو
آگئے تیشے کی منزل تک خال و خط کے پجاری لوگ

غالب و بیدل کے افسوں میں غرق ہیں سر سے پاؤں تلک
کیا سمجھیں گے سادہ سادہ لفظوں کے پرکاری لوگ

فکر و فن کا ورثہ بھی ہے مستقل اک آزار فضاؔ!
سونپ گئے ہیں مجھ کو عذاب آگہی دہشیاری لوگ

حمد

اک حقیقت لاتعیّن اک تعیّن بے مثال
اک تصوّر لاتصوّر اک تخیّل بے خیال

اک نہایت لانہایت اک تعدّد لا حدود
اک تفکّر لاتفکّر اک تجدّد لا وجود

وہ تہی دستی کہ جس کی دست رس میں بیدرنگ
ان گنت سیّارہ ہائے نور وجنّت ہائے رنگ

وہ زیاں کاری کہ ہر سود و زیاں سے بے نیاز
وہ زبوں حالی کہ خود اسباب صد سامانِ ناز

اسمِ بیزار مسمیٰ نام محروم نشاں
اختیار بے تصرّف احتمال بے گماں

وہ خلائے محض جس کی وسعتوں میں بے شمار
کائناتِ کائنات و روزگارِ روزگار

ایک امرِ بے اولی الامر اک ورائے ماورا
اِک مرادِ بے ارادہ اک سوائے ماسوا

• قصد بے سمتِ تعیّن، سمت بے قصدِ جہات
ایک ذات بے تعلّق ایک وصفِ لاصفات

ایک دریا بے تلاطم ایک دنیا بے ظہور
ایک نشرِ بے قیامت ایک حشرِ بے نشور

شامِ حیرت بے ابد اور صبحِ تحیّر بے ازل
وہ ازل ہا در تسلسل وہ ابدہا در بغل

ایک ضبط بے محابا ایک نظام بے نظام
فکرِ ماقبلِ تفکّر نطق مافوقِ کلام

کوئی اَن دیکھی تجلّی کوئی ان جانی امنگ
اِک نوا بے ساز و نغمہ اک ادا بے حسن و رنگ

غیب خود جس کے مظاہر سے ہراساں وہ ظہور
عقل خود جس کے تفکّر سے گریزاں وہ شعور

حسن خود جس کو پرکھ سکتا نہیں ایسا جمال
عشق خود جس کو سمجھ سکتا نہیں ایسا وصال

ہجر جس کے پیچ و خم میں مبتلا ایسا فراق
شوق کو خود جس کا اندازہ نہیں وہ اشتیاق

ایک جوہر جلوہ آرا اک عرض صورت پذیر
ایک نفسِ مطمئنہ انفس و آفاق گیر

کیفیّت بے شکل و صورت کمیت بے کیف و کم
وہ عدم اندر عدم اندر عدم اندر عدم

جناب رفیق الدین صدیقی مدیر پیام دہلی

فنّی تعلیم کی سہولتیں

ذیل میں ان اداروں کے نام درج کئے جا رہے ہیں جو ٹیکنیکل اور سائینٹفک تعلیم مخصوص برانچوں میں دیتے ہیں جو طلبا انٹر یا پری یونیورسٹی سائنس سے پاس کر چکے ہوں وہ ان اداروں میں اپنی طبیعت کے رجحان اور آئندہ مستقبل کے لئے مقررہ کئے گئے پروگرام اور ملازمت کے مطابق ان کالجوں میں داخلہ لے کر انجینئرنگ اور ٹیکنولوجی کی ڈگری حاصل کر سکتے ہیں داخلہ کے لئے ان کالجوں سے پراسپکٹس منگا کر معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

نوٹ: داخلہ کی یہ فیگر گزشتہ کی ہیں۔ اب ان میں اضافہ بھی کیا گیا ہے۔

سول میکنیکل اور الیکٹریکل انجینئرنگ کالج

اسٹیٹ	نام کالج	داخلہ کی گنجائش
	دہلی پولی ٹیکنیک دہلی	۲۶۰
	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی	۲۷۰
	حوض خاص۔ نئی دہلی	
پنجاب	گرونانک انجینئرنگ کالج لدھیانہ	۱۸۰
״	پنجاب انجینئرنگ کالج چنڈی گڑھ	۳۶۰
״	تھاپر انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی پٹیالہ	۱۸۰
راجستھان	برلا کالج آف انجینئرنگ پلانی	۳۰۰
״	فیکلٹی آف انجینئرنگ یونیورسٹی آف جودھپور	۳۱۰
یوپی	انجینئرنگ کالج بنارس ہندو یونیورسٹی وارانسی	۳۵۰
״	دیال باغ انجینئرنگ کالج آگرہ	۷۰
״	کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنولوجی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ	۲۴۰
״	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی کانپور	۲۰۰
״	موتی لال نہرو کالج آف انجینئرنگ الہ آباد	۲۵۰
״	ایم ایم مالویہ انجینئرنگ کالج گورکھپور	۱۲۰
کشمیر	ریجنل انجینئرنگ کالج سری نگر	۲۵۰
آسام	آسام انجینئرنگ کالج جھالوکھاری گوہاٹی	۲۱۰
״	جورہاٹ انجینئرنگ کالج۔ جورہاٹ	۱۲۰

اسٹیٹ	نام کالج	داخلہ کی گنجائش
مغربی بنگال	بنگال انجینئرنگ کالج سل پور۔ ہاوڑہ	۴۰۰
״	کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنولوجی۔ جادو پور یونیورسٹی کلکتہ	۵۳۰
بہار	برلا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی میسرہ۔ رانچی	۳۰۰
״	مظفر پور انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی مظفر پور	۱۸۰
״	بھاگل پور انجینئرنگ کالج۔ بھاگل پور	۱۲۰
״	ریجنل انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی۔ جمشید پور	۲۵۰
״	بہار کالج آف انجینئرنگ پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ	۱۸۰
״	بہار انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی سندری	۲۴۶
اڑیسہ	یونیورسٹی کالج آف انجینئرنگ۔ برلا	۱۸۰
״	ریجنل انجینئرنگ کالج روڑکیلا	۲۵۰
مغربی بنگال	ریجنل انجینئرنگ کالج درگا پور	۲۵۰
״	جل پے گوری کالج آف انجینئرنگ۔ جل پے گوری	۱۵۰
مہاراشٹر	کالج آف انجینئرنگ اورنگ آباد	۱۵۰
״	کالج آف انجینئرنگ پونا	۴۰۰
״	وکٹوریہ جوبلی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ بمبئی	۱۸۰
״	والچند کالج آف انجینئرنگ۔ سانگلی	۱۵۰
״	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی پووالی۔ بمبئی	۴۴۰
״	وسویسرایا ریجنل کالج آف انجینئرنگ۔ ناگپور	۲۵۰
״	کالج آف انجینئرنگ کراد	۱۵۰

اسٹیٹ	نام کالج	داخلہ کی گنجائش
مہاراشٹر	سردار پٹیل کالج آف انجینیرنگ بمبئی	۱۲۰
گجرات	برلا بھاودیالیہ وبھہ ودیا نگر۔ کیرا	۳۰۰
"	ایم ایس یونیورسٹی فیکلٹی آف ٹیکنولوجی اینڈ انجینیرنگ بڑودہ	۳۹۵
"	ایل ڈی کالج آف انجینیرنگ۔ احمد آباد	۳۰۰
"	ایل ڈی کالج آف انجینیرنگ۔ سورت	۲۵۰
مدھیہ پردیش	گورنمنٹ انجینیرنگ کالج	۳۱۰
"	انجینیرنگ انسٹی ٹیوٹ گوالیار	۱۸۰
"	ایس جی ایس ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ اندور	۲۴۰
"	گورنمنٹ کالج آف ٹیکنولوجی اینڈ انجینیرنگ بھوپال	۲۵۰
"	سمراٹ اشوک ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ ودیشر	۱۲۰
آندھرا پردیش	کالج آف انجینیرنگ حیدرآباد	۱۸۰
"	کالج آف انجینیرنگ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد	۴۲۵
"	کالج آف انجینیرنگ آندھرا یونیورسٹی والٹر	۱۵۰
"	ریجنل کالج آف انجینیرنگ ورنگل	۲۵۰
"	ایس وی یونیورسٹی کالج آف انجینیرنگ تروپاٹھی	۱۲۰
کیرالہ	کالج آف انجینیرنگ ٹریونڈرم	۳۳۰
"	انجینیرنگ کالج تریچور	۱۸۰
"	ٹی کے ایم انجینیرنگ کالج کیولن	۱۶۰
"	این ایس ایس انجینیرنگ کالج پال گھاٹ	۱۳۰
"	ایم اے کالج آف انجینیرنگ کوٹھامنگلم	۱۲۰
"	ریجنل انجینیرنگ کالج کودی کوڈے	۲۵۰
مدراس	اے سی کالج آف انجینیرنگ اینڈ ٹیکنولوجی کیرے کوڈی	۱۸۰
"	کالج آف انجینیرنگ اناملائی نگر	۱۲۰
"	کالج آف انجینیرنگ گنڈی	۳۳۵
"	کوئمبٹور انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی کوئمبٹور	۱۹۰
"	گورنمنٹ کالج آف ٹیکنولوجی۔ کوئمبٹور	۲۲۰
"	تھیاگاراجا انجینیرنگ کالج مدورائی	۱۸۰
"	پی ایس جی کالج آف ٹیکنولوجی پیلامیدو کوئمبٹور	۲۲۰
"	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی مدراس	۳۰۰
میسور	بی ڈی ٹی انجینیرنگ کالج دیون گیری	۱۲۰
"	بی ایم سی انجینیرنگ کالج بنگلور	۱۱۰
"	بی وی بی کالج آف انجینیرنگ اینڈ ٹیکنولوجی ہبلی	۱۲۰
"	یونیورسٹی کالج آف انجینیرنگ۔ بنگلور	۲۱۰
"	نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف انجینیرنگ میسور	۱۴۰
میسور	انجینیرنگ کالج گلبرگہ	۱۲۰
"	مینی پال انجینیرنگ کالج مینی پال	۲۴۰
"	کرناٹک ریجنل انجینیرنگ کالج سورت کال	۲۵۰
"	ایم انجینیرنگ کالج حسن	۱۸۰
"	ایم ایس آر کالج آف انجینیرنگ بنگلور	۱۸۰
"	پی ای ایس کالج آف انجینیرنگ مانڈلیہ	۱۸۰

آرکیٹیکچر

اسٹیٹ	نام کالج	داخلہ کی گنجائش
دہلی	اسکول آف پلاننگ اینڈ آرکیٹیکچر۔ دہلی	٦۰
"	وی مین پالی ٹیکنک۔ دہلی	
پنجاب	چندی گڑھ کالج آف آرکیٹیکچر۔ چندی گڑھ	۳۰
بنگال	بنگال انجینیرنگ کالج سب پورہ۔ ہاوڑہ	۵۰
"	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی۔ کھڑک پور	٦۰
مہاراشٹر	جے۔ جے کالج آف آرکیٹیکچر۔ بمبئی	٦۰
"	گورنمنٹ پالی ٹیکنیک ناگپور	۳۰
"	سرو سولسوریا ریجنل کالج آف انجینیرنگ ناگپور	
آندھرا پردیش	گورنمنٹ کالج آف فائن آرٹ آرکیٹیکچر حیدرآباد	۴۵
اترپردیش	یونیورسٹی آف روڑکی۔ روڑکی	٦۰
"	وی مین پالی ٹیکنیک۔ علی گڑھ	
گجرات	ایم ایس یونیورسٹی بڑودہ	۲۰
مدراس	اسکول آف آرکیٹیکچر مدراس یونیورسٹی۔ مدراس	

کیمیکل انجینیرنگ

اسٹیٹ	نام کالج	داخلہ کی گنجائش
دہلی	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی حوض خاص نئی دہلی	
پنجاب	ڈپارٹمنٹ آف کیمیکل انجینیرنگ اینڈ ٹیکنولوجی پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ	
راجستھان	برلا کالج آف انجینیرنگ پلانی	
اترپردیش	یونیورسٹی آف روڑکی۔ روڑکی	
"	کالج آف ٹیکنولوجی۔ بنارس ہندو یونیورسٹی	
"	ایچ بی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کانپور	
"	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی کانپور	
بہار	بہار انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی سندری	
اڑیسہ	ریجنل انجینیرنگ کالج روڑکیلا	
بنگال	کالج آف انجینیرنگ اینڈ ٹیکنولوجی جادوپور کلکتہ	
"	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی کھڑک پور	

مہاراشٹر	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی پووائی بمبئی
گجرات	ایم ایس یونیورسٹی بڑودہ
مدھیہ پردیش	گورنمنٹ کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنولوجی ۔ رائے پور
آندھرا پردیش	ڈپارٹمنٹ آف کیمیکل ٹیکنولوجی ۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد
"	جے وی ڈی کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنولوجی ۔ والٹیر
مدراس	ڈپارٹمنٹ آف کیمیکل ٹیکنولوجی انامَلائی یونیورسٹی ۔ انامَلائی نگر
	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی مدراس ۔

مائننگ انجینئرنگ

راجستھان	فیکلٹی آف انجینئرنگ جودھ پور یونیورسٹی ۔ جودھ پور
اترپردیش	کالج آف مائننگ اینڈ میٹلرجی بنارس یونیورسٹی ۔
مدھیہ پردیش	گورنمنٹ کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنولوجی رائے پور ۔
آندھرا پردیش	کالج آف انجینئرنگ عثمانیہ یونیورسٹی ۔ حیدرآباد
بہار	انڈین اسکول آف مائنز اینڈ اپلائیڈ جیولوجی ۔ دھن باد
"	گری ڈیہہ اور کارگالیہ بہار
مدراس	کالج آف انجینئرنگ گنڈی مدراس
مغربی بنگال	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی کھڑگ پور
"	بنگال انجینئرنگ کالج بوٹانک گارڈن ۔ ہاوڑہ
بنگلور	جے اکوپیشنل انسٹی ٹیوٹ بنگلور
اڑیسہ	نیشنل کول ڈولپمنٹ کارپوریشن مائننگ اسکول ۔ تالچیر

ٹیلی کمیونیکیشن انجینئرنگ

راجستھان	برلا کالج آف انجینئرنگ ۔ پلانی
اترپردیش	یونیورسٹی آف روڑکی ۔ روڑکی
بہار	بہار انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی ۔ سندری
بنگال	بنگال انجینئرنگ کالج سب پورہ ۔ ہاوڑہ
"	کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنولوجی جادوپور یونیورسٹی ۔ کلکتہ
"	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی کھڑگ پور
مہاراشٹر	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی ۔ بمبئی
"	کالج آف انجینئرنگ پونا
مدھیہ پردیش	گورنمنٹ انجینئرنگ کالج جبل پور
آندھرا پردیش	کالج آف انجینئرنگ ورنگا پٹنم ۔ کوکناڈا ۔
"	کالج آف انجینئرنگ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد
مدراس	کالج آف انجینئرنگ گنڈی
میسور	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس بنگلور ۔

ایرونائیکل انجینئرنگ

مدراس	مدراس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی کورم پیٹ
میسور	نیشنل ایرونائیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۔ بنگلور
اترپردیش	سول ایوی ایشن ٹریننگ سینٹر الہ آباد
مغربی بنگال	ایرٹیکنیکل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کلکتہ
آندھرا پردیش	کالج آف انجینئرنگ ورنگا پٹنم کوکناڈا

فلائنگ کلب دلی ۔ جالندھر ۔ کلکتہ ۔ پٹنہ ۔ بمبئی ۔ مدراس ۔ اندور جے پور ۔ ناگ پور ۔ کانپور اور بنگلور ۔

آٹوموبائل انجینئرنگ

مدراس	مدراس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی ۔ کرومپیٹ
"	اے ایچ کالج آف ٹیکنولوجی کوئمبٹور
"	ٹوراوڈا پولی ٹیکنک ۔ مدراس
پنجاب	گورنمنٹ میٹل ورک انسٹی ٹیوٹ انبالہ سٹی
اترپردیش	ٹیکنولوجی کالج دیال باغ آگرہ
میسور	کرناٹک پولی ٹیکنک ۔ منگلور
مہاراشٹر	گورنمنٹ انجینئرنگ کالج ناگپور
گجرات	ایل ایس پرمکھیہ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ سورت

میٹلرجی

اترپردیش	یونیورسٹی آف روڑکی ۔ روڑکی
"	کالج آف مائننگ اینڈ میٹلرجی بنارس ہندو یونیورسٹی ۔ بنارس
"	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی ۔ کانپور
مہاراشٹر	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی ۔ کانپور
"	ریجنل کالج آف انجینئرنگ پونہ
مدراس	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی ۔ مدراس
بہار	بہار انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی ۔ سندری
"	ریجنل انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی جمشید پور
"	بھاگل پور انجینئرنگ کالج ۔ بھاگلپور
اڑیسہ	ریجنل کالج آف انجینئرنگ روڑکیلا
مدھیہ پردیش	گورنمنٹ کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنولوجی ۔ رائے پور
میسور	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس ۔ بنگلور
بنگال	بنگال انجینئرنگ کالج سب پورہ ہاوڑہ
"	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی کھڑگ پور

ریڈیو انجینئرنگ اپلائیڈ فزکس ۔ الیکٹرونکس

اترپردیش گورنمنٹ پالی ٹیکنک ۔ رامپور
〃 جے ۔ کے انسٹی ٹیوٹ آف اپلائیڈ فزکس ۔ الہ آباد یونیورسٹی ۔ الہ آباد
میسور جے اکوپیشنل انسٹی ٹیوٹ بنگلور
مغربی بنگال ڈپارٹمنٹ آف اپلائیڈ فزکس کلکتہ یونیورسٹی ۔ کلکتہ
〃 انسٹی ٹیوٹ آف ریڈیو فزکس اینڈ الیکٹرانکس، کلکتہ یونیورسٹی کلکتہ
مدراس مدراس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی کرومپیٹ ۔ مدراس
مہاراشٹر ایس سی واڈیا انسٹی ٹیوٹ آف الیکٹریکل ٹیکنولوجی ۔ پونا
〃 سینٹ ایکسویئر ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ بمبئی
راجستھان اے ۔ وی پرمیکھ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ راجکوٹ
آندھرا پردیش جے ۔ کے ۔ ڈی کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنولوجی آندھرا یونیورسٹی والٹیر

ساؤنڈ انجینئرنگ اینڈ سینماٹوگرافی

مہاراشٹر اسٹیٹ ایکسویئر ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ بمبئی ۔
میسور جے کوپیشنل انسٹی ٹیوٹ منگلور
مدراس سینٹرل پولی ٹیکنک ۔ مدراس
〃 گورنمنٹ اسکول آف ٹیکنولوجی مدراس

ہائی وے انجینئرنگ

مدراس کالج آف انجینئرنگ گنڈی مدراس
〃 کالج آف انجینئرنگ اننت پور مدراس
〃 کالج آف انجینئرنگ وزیگاپٹنم کوکناڈا

میرین انجینئرنگ اینڈ نیول آرکیٹکچر

کالج آف انجینئرنگ وزیگاپٹنم کوکناڈا
مغربی بنگال میرین انجینئرنگ کالج کلکتہ
〃 انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی کھڑک پور

پروڈکشن انجینئرنگ

بہار بہار انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی ۔ سندری

ریفریجریشن انجینئرنگ

مغربی بنگال اسکول آف انڈین سوسائٹی آف ریفریجریشن انجینئرز کلکتہ

شوگر ٹیکنولوجی

اترپردیش نیشنل شوگر انسٹی ٹیوٹ کانپور

لیدر ٹیکنولوجی

اترپردیش ٹیکنیکل کالج دیال باغ آگرہ
مدراس الاگاپا چیٹر کالج آف ٹیکنولوجی یونیورسٹی آف مدراس
〃 انسٹی ٹیوٹ آف لیدر ٹیکنولوجی مدراس
〃 کالج آف ٹیکنولوجی گنڈی مدراس
مہاراشٹر گورنمنٹ لیدر ورکنگ اسکول باندرہ بمبئی
مغربی بنگال کالج آف لیدر ٹیکنولوجی کلکتہ
سینٹرل لیدر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۔ ادیار

آئل ٹیکنولوجی

مہاراشٹر لکشمی نرائن انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی ناگپور
〃 ڈیپارٹمنٹ آف کیمیکل ٹیکنولوجی بمبئی یونیورسٹی
مدراس آئل ٹیکنولوجیکل انسٹی ٹیوٹ ۔ اننت پور

پیٹرولیم ٹیکنولوجی

بہار انڈین اسکول آف مائنز دھن باد
مغربی بنگال انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی کھڑک پور

فیول ٹیکنولوجی

اترپردیش کالج آف مائننگ اینڈ میٹلرجی بنارس ہندو یونیورسٹی ۔ مدراس

سلیکیٹ ٹیکنولوجی

اترپردیش کالج آف ٹیکنولوجی بنارس ہندو یونیورسٹی وارانسی

کریمک ٹیکنولوجی

مغربی بنگال بنگال کریمک انسٹی ٹیوٹ کلکتہ

جوٹ ٹیکنولوجی

مغربی بنگال انسٹی ٹیوٹ جوٹ ٹیکنولوجی ۔ کلکتہ

سوپ اینڈ کوسمیٹک ٹیکنولوجی

	اسکول آف ٹیکنولوجی ساگر یونیورسٹی ۔ ساگر
اترپردیش	کالج آف ٹیکنولوجی بنارس ہندو یونیورسٹی ۔ وارانسی

پینٹ اینڈ پلاسٹک ٹیکنولوجی

مہاراشٹر	ڈپارٹمنٹ آف کیمیکل ٹیکنولوجی بمبئی یونیورسٹی ۔ بمبئی

ٹیکسٹائل ٹیکنالوجی

مغربی بنگال	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی کھڑک پور
ہریانہ	ٹیکنولوجیکل انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکسٹائل بھوانی
اترپردیش	گورنمنٹ سینٹرل ٹیکسٹائل انسٹی ٹیوٹ کانپور
〃	گورنمنٹ سینٹرل ویونگ انسٹی ٹیوٹ بنارس کینٹ
〃	کالج آف ٹیکسٹائل ٹیکنولوجی سہسرام پور
〃	کالج آف ٹیکسٹائل ٹیکنولوجی برہام پور
مہاراشٹر	وکٹوریہ جوبلی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ بمبئی
〃	ڈپارٹمنٹ آف کیمیکل ٹیکنولوجی بمبئی ۔ یونیورسٹی بمبئی
گجرات	فیکلٹی آف ٹیکنیکل انجنیئرنگ ایس ایم یونیورسٹی بمبئی
مدراس	اے ۔ سی کالج آف ٹیکنولوجی گنڈی ۔ مدراس
میسور	ایس کے ایس جے ٹیکنولوجی انسٹی ٹیوٹ احمد آباد
دہلی	دہلی پولی ٹیکنک ۔ دہلی
گجرات	آر سی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ احمد آباد
〃	کالابھون ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ بڑودہ
کیرالہ	انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکسٹائل ٹیکنولوجی ۔ ٹریونڈرم
پنجاب	پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکسٹائل ٹیکنالوجی ۔ امرتسر
	مودی کالج پٹیالہ

میڈیسن اینڈ سرجری

ملک میں ۱۵ میڈیکل کالج جو گورنمنٹ سے منظور شدہ ڈگری کورس پڑھاتے ہیں ۔ اس کورس کی میعاد ۵½ سال تک ہوتی ہے اس کے علاوہ ایک یا دو سال کے پوسٹ گریجویٹ ٹریننگ بمبئی ۔ کلکتہ ۔ مدراس پٹنہ ۔ آندھرا اور دہلی یونیورسٹی میں ہوتی ہے ۔

نئی دہلی	مولانا آزاد میڈیکل کالج ۔ نئی دہلی	۶۰	سیٹیں
〃	لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج فار ویمن نئی دہلی	۷۰	〃
〃	آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس نئی دہلی	۵۰	〃
اترپردیش	کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ	۱۵۰	〃
〃	ایس این میڈیکل کالج آگرہ	۷۰	〃
اترپردیش	جی ایس وی ایم میڈیکل کالج کانپور	۱۰۰	سیٹیں
مدراس	مدراس میڈیکل کالج پارک ٹاؤن ۔ مدراس	۳۴۵	〃
〃	کرسچین میڈیکل کالج مدورائی	۱۰۰	〃
〃	مدورائی میڈیکل کالج مدورائی	۱۰۰	〃
〃	اسٹینلے میڈیکل کالج مدراس	۱۱۰	〃
〃	کرناٹک میڈیکل کالج ۔ ہبلی	۸۰	〃
〃	پانڈیچری میڈیکل کالج ۔ پانڈیچری	۸۰	〃
پنجاب	میڈیکل کالج امرتسر	۸۰	〃
〃	کرسچین میڈیکل کالج ۔ لدھیانہ	۸۰	〃
〃	گورنمنٹ میڈیکل کالج پٹیالہ	۸۰	〃
〃	میڈیکل انسٹی ٹیوٹ چنڈی گڑھ		〃
مہاراشٹر	گرانٹ میڈیکل کالج بمبئی	۱۲۰	〃
〃	نائر ہوسپٹل ڈینٹل کالج بمبئی	۶۰	〃
〃	ایس جی ایس میڈیکل کالج بمبئی	۸۴	〃
〃	ٹوپی والا نیشنل میڈیکل کالج بمبئی	۶۲	〃
〃	میڈیکل کالج ناگپور	۰	〃
〃	بی جے میڈیکل کالج پونا		〃
آندھراپردیش	آندھرا میڈیکل کالج وزیگاپٹنم	۱۲۰	〃
〃	گنٹور میڈیکل کالج گنٹور	۱۲۵	〃
〃	ایس ۔ آر ۔ ایم میڈیکل کالج کاکناڈہ	۱۰۰	〃
〃	گاندھی میڈیکل کالج حیدرآباد	۸۰	〃
〃	عثمانیہ میڈیکل کالج ۔ حیدرآباد	۱۲۵	〃
〃	کرنول میڈیکل کالج کرنول	۸۰	〃
〃	گورنمنٹ میڈیکل کالج اورنگ آباد	۴۰	〃
آسام	آسام میڈیکل کالج ڈبرگڑھ	۱۰۰	〃
بہار	بہار میڈیکل کالج دربھنگہ	۱۰۲	〃
〃	پی ڈبلیو میڈیکل کالج پٹنہ	۱۲۸	〃
گجرات	بڑودہ یونیورسٹی میڈیکل کالج بڑودہ	۶۰	〃
〃	بی جے میڈیکل کالج اسرسا ۔ احمد آباد	۱۰۰	〃
راجستھان	ایم پی شاہ میڈیکل کالج جام نگر	۶۰	〃
〃	ایس ایم میڈیکل کالج جے پور	۱۰۰	〃
کیرالہ	میڈیکل کالج کوزی کوڈے	۱۰۰	〃
〃	میڈیکل کالج تریونڈرم	۱۰۴	〃
مدھیہ پردیش	میڈیکل کالج جبل پور	۷۰	
〃	گاندھی میڈیکل کالج بھوپال	۱۰۰	〃

ریاست	کالج	سیٹیں
مدھیہ پردیش	جی آر میڈیکل کالج گوالیار	۹۰ سیٹیں
،،	ایم جی ایم میڈیکل کالج اندور	۹۰ ،،
میسور	بنگلور میڈیکل کالج بنگلور	۱۰۰ ،،
،،	کستوربا میڈیکل کالج منی پال	۱۲۰ ،،
،،	میسور میڈیکل کالج میسور	۱۰۰ ،،
اڑیسہ	ایس ۔ سی ۔ بی میڈیکل کالج کٹک	۱۰۰ ،،
مغربی بنگال	کلکتہ نیشنل میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کلکتہ	۱۰۰ ،،
،،	میڈیکل کالج ۔ کالج اسٹریٹ کلکتہ	۱۰۰ ،،
،،	این ۔ ایس ۔ میڈیکل کلکتہ	۱۰۱ ،،
،،	آر جی کے میڈیکل کالج بال گاچھیہ روڈ کلکتہ	۱۲۸ ،،
،،	بی ۔ ایس میڈیکل کالج بنکورہ	۵۰ ،،

اس کے علاوہ ملک میں ۸۰ سے زائد مندرجہ ذیل یونانی آیورویدک کالج و اسکول میں جہاں پر دیسی طریقہ علاج کے ساتھ ساتھ ایلوپیتھک طریقہ علاج کا بھی مطالعہ کرایا جاتا ہے۔ گاؤں، دیہات اور قصبات میں یہاں کے پاس شدہ طلباء کے لئے کافی میدان ہے اور ہر سال ہزاروں کی تعداد میں طلباء انسٹی ٹیوٹ کورسز کو پاس کرکے حکیم، وید اور ڈاکٹر بن کر اپنی روزی پیدا کرتے ہیں۔

یونانی اور آیورویدک کالج

ریاست	کالج
آندھرا پردیش	آندھرا میڈیکل کالج وشاکھاپٹنم
،،	گورنمنٹ آیورویدک کالج حیدرآباد آیوروید وشارد
،،	نظامیہ گورنمنٹ طبی کالج حیدرآباد طبیب مستند
آسام	آسام آیورویدک کالج گوہاٹی
بہار	اے ایس کے آیورویدک کالج بیگوسرائے مونگیر
،،	گورنمنٹ آیورویدک کالج پٹنہ
،،	گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ
،،	ایس جی آیورویدک مہاودیالیہ ۔ بھوجی
،،	وائی این اے اے آیورویدک کالج بھاگل پور
مہاراشٹر	اے ویدک ودیالیہ ستارہ
،،	اے ویدک ودیالیہ پونا
،،	آیورویدک مہاودیالیہ احمد نگر
،،	آیورویدک مہاود پونا
،،	آیورویدک مہاودیالیہ ناگپور
،،	آر ٹی آیورویدک مہاودیالیہ آکولہ
،،	آر اے پی آیورویدک میڈیکل کالج ورلی ۔ بمبئی
مہاراشٹر	آر ۔ میڈیکل سکول میو ہوسپٹل کمپاؤنڈ ناگپور
،،	ایس پی آیوروید مہاودیالیہ کپالرمل مل بمبئی
،،	ایس آیوروید مہاودیالیہ جلنا اورنگ آباد
،،	ایس آیوروید مہاودیالیہ سیان ۔ بمبئی
،،	ایس آیوروید مہاودیالیہ ناسک
،،	سی ای ایم ڈینٹل کالج بمبئی
،،	ودربھا آیوروید مہاودیالیہ امراوتی
،،	ایس این ڈی ٹی کالج فار ویمنز بمبئی (نرسنگ)
گجرات	بی جے میڈیکل کالج احمد آباد
،،	گورنمنٹ آیورویدک کالج ناندید
،،	جے ایس ایم جی آیورویدک میڈیکل کالج نانڈیاد
،،	او ایچ این آیورویدک مہاودیالیہ سورت
،،	ایس جے پی آیوروید ودیالیہ بھاؤنگر
،،	ایس وی ایس جنرل ہسپتال ایلس برج احمد آباد
،،	ایس آیوروید مہاودیالیہ اجوا روڈ بڑودہ
دہلی	آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج ۔ نئی دہلی
،،	جامعہ طبیہ گلی قاسم جان دہلی
مدھیہ پردیش	اے آیوروید مہاودیالیہ اجین بھشاگا اچاریہ
،،	گورنمنٹ آیورویدک کالج گوالیار
،،	اے آیوروید مہاودیالیہ اندور بھشاگا اچاریہ
،،	آر کے ایس آیوروید کالج بیابانی اندور
مدراس	کالج آف انٹگریٹڈ میڈیسن مدراس
اڑیسہ	جی آیوروید ودیاپیٹھ پوری
،،	ایس سی بی میڈیکل کالج کٹک
پنجاب	آریہ میڈیکل اسکول لدھیانہ
،،	ڈی آیورویدک کالج جالندھر
،،	گورنمنٹ آیورویدک کالج پٹیالہ
،،	آیوروید وشو بھارتی صدر شہر
ہریانہ	آیورویدک کالج ۔ رہتک
،،	آیورویدک کالج کوروکشیتر
راجستھان	گورنمنٹ آیورویدک کالج جے پور
،،	گورنمنٹ آیورویدک کالج اودے پور
،،	ایس ایچ آیورویدک کالج رتن گڑھ
،،	ایس بی آر آیورویدک کالج رتن سیکر
،،	ایس آر ایس آیورویدک کالج ودھانے

راجستھان	راجپوتانہ طبیہ کالج۔ جے پور
〃	ایس ایس ڈی آیوروید مہاودیالیہ بیکانیر
میسور	گورنمنٹ کالج آف انڈین میڈیسن میسور
اترپردیش	ارجن درشانند آیورویدک کالج وارانسی
〃	ارجن آیوروید ودیالیہ ورانسی
〃	آیورویدک کالج اٹاوہ (باندہ)
〃	آیورویدک کالج دہرہ دون
〃	بلدیو آیورویدک کالج بڑاگاؤں ورانسی
〃	بندیلکھنڈ آیورویدک کالج جھانسی
〃	گوروکل یونیورسٹی آیورویدک کالج کانگڑی۔ (سہارنپور)
〃	ایل ایچ آیورویدک کالج پیلی بھیت
〃	میرٹھ آیورویدک کالج نوچندی
〃	رشی کیش آیورویدک کالج ہردوار
〃	تکمیل الطب کالج لکھنؤ
〃	یونانی میڈیکل کالج آباد
〃	اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ
〃	کالج آف آیوروید ورانسی
مغربی بنگال	آیوروید پر استھان ایچ مکرجی روڈ کلکتہ
〃	ڈی۔ این۔ ڈی ہومیوپیتھک میڈیکل کالج اپر سرکلر روڈ کلکتہ
〃	جے بی اے آیورویدک کالج راجا دینیدر اسٹریٹ کلکتہ
〃	پی اینڈ ایچ میموریل ہومیوپیتھک کالج اینڈ ہوسٹل نار بندر روڈ کلکتہ
〃	اسکول آف ٹراپیکل میڈیسن کلکتہ
〃	شیام داس ویدشاستر پیٹھ
〃	بنگال ایلن ہومیوپیتھک کالج اینڈ ہوسٹل بو بازار مدناپور
〃	ویدک پاٹھ شالہ کونٹالی مدناپور
〃	وشواناتھ آیوروید مہاودیالیہ کلکتہ

ڈینٹل سرجری

مہاراشٹر	سی۔ ای۔ ایم ڈینٹل کالج بمبئی
〃	نائر ہوسپٹل ڈینٹل کالج۔ بمبئی
مغربی بنگال	کلکتہ ڈینٹل کالج کلکتہ
مدراس	مدراس میڈیکل کالج مدراس
اترپردیش	ڈینٹل کالج اینڈ ہوسٹل۔ کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ
پنجاب	ڈینٹل کالج امرتسر
	گورنمنٹ ڈینٹل کالج پٹیالہ

فارمیسی

آندھرا پردیش	جے وی ڈی کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنولوجی۔ والٹیر
گجرات	ایل ایم کالج آف فارمیسی احمد آباد
مہاراشٹر	ڈپارٹمنٹ آف کیمیکل ٹیکنولوجی بمبئی۔ یونیورسٹی بمبئی
〃	ڈپارٹمنٹ آف فارمیسی ناگپور یونیورسٹی ناگپور
مدھیہ پردیش	ڈپارٹمنٹ آف کیمسٹری ساگر یونیورسٹی ساگر
مدراس	مدراس میڈیکل کالج پارک ٹاؤن مدراس
راجستھان	برلا کالج آف سائنس کامرس اینڈ فارمیسی پلانی
اترپردیش	کالج آف ٹیکنولوجی بنارس ہندو یونیورسٹی ورانسی
بنگال	کالج آف ٹیکنولوجی جادو پور یونیورسٹی کلکتہ
پنجاب	ڈپارٹمنٹ آف فارمیسی پنجاب یونیورسٹی چندی گڈھ
〃	میڈیکل کالج امرتسر
دہلی	ہمدرد کالج آف فارمیسی تغلق آباد دہلی

ویٹرنری سائنس اینڈ اینیمل ہسبنڈری

آندھرا پردیش	آندھرا ویٹرنری کالج تروپتی
〃	یونیورسٹی کالج آف ویٹرنری سائنس اینڈ اینیمل ہسبنڈری۔ حیدرآباد
بہار	بہار ویٹرنری کالج پٹنہ
مہاراشٹر	بمبئی ویٹرنری کالج پریل۔ بمبئی
کیرالہ	ویٹرنری کالج مناتھی۔ تریچور
مدھیہ پردیش	ایم بی کالج آف ویٹرنری سائنس اینڈ اینیمل ہسبنڈری مہاؤ (جبل پور)
〃	ویٹرنری کالج حضرت گنج گوالیار
مدراس	مدراس ویٹرنری کالج وپیرائے مدراس
اڑیسہ	اڑیسہ کالج آف ویٹرنری سائنس اینڈ اینیمل ہسبنڈری کٹک
پنجاب	پنجاب کالج آف ویٹرنری سائنس اینڈ اینیمل ہسبنڈری حصار
راجستھان	راجستھان کالج آف ویٹرنری سائنس اینڈ اینیمل ہسبنڈری بیکانیر
اترپردیش	یوپی کالج آف ویٹرنری سائنس اینڈ اینیمل ہسبنڈری متھرا

ڈیری سائنس

پنجاب	ڈیری سائنس کالج نیشنل ڈیری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کرنال

نرسنگ

دہلی	کالج آف نرسنگ دہلی یونیورسٹی۔ دہلی
مہاراشٹر	ایس این ڈی ٹی کالج فار ویمن۔ بمبئی

ریسرچ

فرسٹ کلاس سائنس پوسٹ گریجویٹ یا ڈاکٹریٹ حاصل کئے ہوئے افراد کو مزید تحقیق و کھوج کرنے کے لئے ۹۰۰ روپے ماہوار فیلوشپ پر مندرجہ ذیل اداروں میں جگہ دی جاتی ہے جو ۳ سے ۵ سال تک چلتی ہے۔

نئی دہلی	نیشنل فزیکل لیبارٹری ہل سائڈ روڈ نئی دہلی
"	سینٹرل روڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی
آندھرا پردیش	جیو فزیکل انسٹی ٹیوٹ حیدر آباد
"	ریجنل ریسرچ لیبارٹری حیدر آباد
بہار	میٹرولوجیکل لیبارٹریز جمشید پور
"	فیول ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دھن باد
"	مائننگ ریسرچ اسٹیشن دھن باد
مہاراشٹر	کیمیکل لیبارٹریز پونہ
"	سینٹرل پبلک ہیلتھ انجینئرنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ناگپور
"	ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈامینٹل ریسرچ بمبئی
میسور	ایروناٹیکل لیبارٹریز ۔ بنگلور
"	سینٹرل فوڈ ٹیکنولوجیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میسور
"	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس بنگلور
اترپردیش	نیشنل بوٹانیکل گارڈن لکھنؤ
"	بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ رڑکی
اترپردیش	ڈرگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ
"	سینٹرل میڈیسنل پلانٹ آرگنائزیشن لکھنؤ
"	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف پٹرولیم دہرہ دون
"	ہرکورٹ بٹلر ٹیکنولوجیکل انسٹی ٹیوٹ کانپور
گجرات	سینٹرل سالٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بھاؤنگر
مدراس	الیکٹروکیمیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۔ کیراکوڈی
"	لیدر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مدراس
پنجاب	سائنٹفک انسٹرومنٹ آرگنائزیشن چنڈی گڑھ
راجستھان	الیکٹرو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پلانی
مغربی بنگال	سینٹرل گلاس اینڈ سرامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کلکتہ
"	سینٹرل میکنیکل انجینئرنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ درگاپور
"	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف بائیوکیمسٹری اینڈ ایکسپیریمنٹل میڈیسن کلکتہ
"	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف نیوکلیئر فزکس ۔ کلکتہ
"	بوس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کلکتہ
"	زولوجیکل سروے آف انڈیا کلکتہ
"	بوٹانیکل سروے آف انڈیا کلکتہ
جموں اینڈ کشمیر	ریجنل ریسرچ لیبارٹریز ۔ جموں
آسام	ریجنل ریسرچ لیبارٹریز ۔ جورہاٹ
مغربی بنگال	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی کھڑگ پور

مقالہ نگار حضرات سے گذارش

"اوقاف"، میگزین ایک اسلامی علمی میگزین ہے۔ جس کے لئے معیاری علمی مقالات درکار ہیں۔ مقالہ و مضامین نگار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ اپنی تخلیقات اوقاف کو بھیجیں اور حسب ذیل امور کا لحاظ رکھیں۔

۱۔ مضامین یا نظم علمی، تاریخی، اصلاحی، ادبی ہونے چاہئیں۔ اختلافی مضامین سے احتراز کیا جائے۔

۲۔ اوقاف کے انتظام اور ان کے استعمال سے متعلق مضامین، اطلاعات، پالیسی اور پروگرام خاص طور پر شریک اشاعت ہوں گی۔

۳۔ مضامین صاف اور کاغذ کے ایک طرف لکھے ہوئے ہوں۔

۴۔ جو مضامین اوقاف کے معیار کے مطابق نہیں ہوں گے، شریک اشاعت نہیں کئے جائیں گے۔

۵۔ مختلف وقف بورڈوں، سنٹرل وقف کونسل اور اسلامی تقریبات سے متعلق تصاویر بھی شائع کی جائیں گی۔ ان تصاویر کے ساتھ مختصر رپورٹ آنی ضروری ہے۔

کامیابی کی طرف

انتظار نہ کیجئے

"زندگی کا مقصد یہ دیکھنا نہیں۔ کہ دور دھندلکوں میں کیا نظر آتا ہے۔ بلکہ جو سامنے موجود ہے۔ اسے انجام دینا چاہئے"

اس اصول کا مقصد انسان کو با عمل بنانا ہے۔ کیوں کہ عمل ہی ایک ایسی چیز ہے۔ جو آدمی کو کامیابی سے ہم کنار کر سکتی ہے بعض لوگ خیالات کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے اور تصورات کی دنیا میں گم ہو کر اپنے آپ کو بے عمل کاہل اور سست بنا ڈالتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ عمل ہی نتائج کا بانی ہے۔ آپ کا ہر عمل بہر حال ایک نتیجہ کا پیش خیمہ ہے۔ جو آپ کو کسی نہ کسی منزل سے ضرور ہمکنار کرے گا۔

عمل کے لئے انتظار کرنا فالتو ہے۔ فوراً فیصلہ کیجئے۔ نتیجہ کے منتظر رہئے۔ آپ کی قوت فیصلہ بھی آپ کی دشمن بن سکتی ہے۔ اگر آپ نے اس سے بروقت کام نہیں لیا کیوں کہ فیصلہ ہی عمل کا محرک بنتا ہے۔ لوگ انتظار ہی میں آج کا کام کل پر چھوڑنے سے زندگی کی دوڑ میں ایک دن پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اس لئے آج کے کام کو آج ہی کیجئے۔ اور اگر وقت ملے تو کل کے کام کو بھی آج ہی ختم کر دینے کی کوشش کیجئے۔ انتظار ہرگز نہ کیجئے۔ انتظار آپ کا دشمن ہے۔ کامیابی کی کنجی صرف عمل ہے۔ وہ بھی انتظار کے بغیر۔

ماضی کو بھول جایئے

عمل کرتے وقت ماضی کے جھرونکوں میں نہ جھانکئے۔ یہ آپ کے بڑھتے قدم پیچھے کھینچ سکتے ہیں۔ آپ کو روک سکتے ہیں خطرات کے گرد گھما سکتے ہیں۔ بے عمل بنا سکتے ہیں گڑے ہوئے مردوں کو اکھاڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ گزشتہ کل کو فراموش کر دیجئے۔ آپ کا مستقبل "آج" کے ہاتھ میں ہے۔ کل ایک خواب ہے۔ جس کی تعبیر آپ آج ہی بنا سکتے ہیں۔ جو آدمی اچھے مستقبل کے لئے بے قرار ہے۔ اسے تضیع اوقات، ذہنی تفکرات، پریشانیاں نظر انداز کرنا ہوں گی۔ ٹما کرشا سلر فرماتے ہیں۔

عمدہ مستقبل کے لئے بہتر طریقہ یہ ہے۔ کہ ہم اپنی پوری صلاحیت، ذہانت، فطانت طاقت ارادہ اور جوش کو آج ہی کام میں لا کر کاموں کو بہتر طریقے پر انجام دینے میں ابھی لگ جائیں۔ صرف یہی طریقہ ہے۔ جس کے ذریعہ ہم کامیاب مستقبل تک پہنچ سکتے ہیں۔

زمانے کی گردش جاودانہ   حقیقت صرف ایک، باقی
کسی نے دوش دیکھا نہ فردا   فقط امروز ہے تیرا زمانہ

ایک بھوکے فلسفی نے اپنے تجربات کی روشنی میں لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے۔
کہ کل کی کوئی فکر نہ کرو۔ آپ کے لئے صرف آج کی فکر کافی ہے۔

اس فلسفہ کا مقصد دراصل یہی ہے۔ کہ انسان کو عمل کرنا چاہیئے۔ اور وہ بغیر انتظار کئے۔ یہ مقصد ہرگز نہیں۔ کہ آپ اپنی کل کے لئے کوئی پروگرام ذہن میں نہ بنائیں۔

ایک امیر البحر کا کہنا ہے۔

اگر کوئی جہاز ڈوب جائے۔ تو میں اسے واپس نہیں لا سکتا........ اگر یہ ڈوب رہا ہے۔ میں اسے نہیں بچا سکتا میں ماضی کے متعلق پریشان ہونے کے بجائے مستقبل کے مسائل کے متعلق سوچنے پر اپنا وقت زیادہ اچھی طرح صرف کر سکتا ہوں۔ اگر میں ان چیزوں کے سامنے جھک جاؤں۔ تو میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔

کامیاب زندگی کے لئے ماضی کو فراموش کیجئے۔ اور جاندار مستقبل کے لئے آج ہی عمل شروع کر دیجئے۔

عمدہ سوچئے

عمدہ سوچئے۔ عمدہ نتائج کا انتظار کیجئے۔ برا سوچئے۔ بدبختی کا انتظار کیجئے۔ جنگ ہو یا امن اچھے اور برے سوچ بچار میں یہ فرق ہے۔ کہ اچھا سوچ بچار میں علتوں اور نتیجوں پر غور کرتا ہے۔ اور منطقی اور تعمیری منصوبہ بندی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے برعکس برا سوچ وچار اکثر اعصابی کشمکش اور شکست پر منتج ہوتا ہے۔

بعض لوگ غلط تفکرات اور غیر ضروری مسائل پر سوچتے رہتے ہیں۔ اور حیران و پریشان ہو کر اپنی نیند حرام کر لیتے ہیں۔ ذہنی سکون برباد کر لیتے ہیں۔ تفکرات کے سیاہ بادل انہیں گھیر رکھتے ہیں۔ ان کی قوت فکر و عمل برباد ہوتی رہتی ہے۔ اور مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

بعض لوگ ان تفکرات کی وجہ سے بیمار رہنے لگتے ہیں۔ آخر کار بیماری یا کسی بیماری میں مبتلا ہو کر عالم فانی کو سدھار جاتے ہیں۔ ہمارے اسپتالوں میں پچاس فیصدی بیمار اعصابی اور اعصابی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یہ مریض تفکرات میں گھر کر اپنی صحت تباہ کر لیتے ہیں۔ آج کل گیس کی بیماری عام ہے۔ جس کا بھاری سبب ذہنی پریشانیوں سے معدہ کا معطل ہو جانا ہے۔

دنیا میں ہر شخص کامیاب زندگی گذار سکتا ہے۔ وہ اطمینان مسرت استقلال اور محبت سے ہم کنار ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنے سوچنے کے انداز کو قابو میں رکھے۔

عقل مند انسان کے لئے ہر دن نیا ہے۔ اسے کبھی مایوسی نہیں ہوتی۔ وہ نہ کبھی گھبراتا ہے ور نہ پریشان ہوتا ہے۔ اس کے تفکرات آنے والے مستقبل کے لئے پروگرام بدلتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی فکر کو کبھی ضائع نہیں ہونے دیتا۔ اپنے وقت کا صحیح استعمال کرتا ہے۔

ایک وقت میں صرف ایک دن کے لئے زندگی بسر کرنا اتنا مشکل نہیں ہے۔ آپ گذشتہ کل کو فراموش کر کے آئندہ کل کے بارے میں متردد نہ ہوں۔ ہر صبح آپ سے مطالبہ کرے گی۔ کہ آپ کا دن نیا دن ہے۔

تنہائی، محرومی، مایوسی اور ناکامی کے خیالات کو مٹ آنے دیجئے اپنی قوت ارادہ سے ان پر قابو پایئے۔ خوش رہئے۔ زندگی سے پیار کیجئے۔ ایک فلاسفر کا کہنا ہے۔ قانون تغیر کے سوا ہر چیز تغیر پذیر ہے۔ اس نے کہا۔ کہ آپ ایک ہی دریا میں دو دفعہ قدم نہیں رکھ سکتے دریا کا راستہ ہر گھڑی بدلتا ہے۔ اس آدمی کا بھی یہی حال ہے۔ جو اس میں قدم رکھتا ہے۔ زندگی ایک غیر مختتم تغیر ہے حقیقت صرف آج ہے۔ غیر مختتم، متغیر اور غیر یقینی دھند میں لپٹے ہوئے مستقبل کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے آج کی زندگی کے حسن کو کیوں خراب کیا جائے۔ آپ کی غلط سوچ سے آپ کی زندگی اور مستقبل تباہ ہو سکتا ہے۔ ہندوستانی ڈرامہ نگار کالیداس لکھتے ہیں۔

دیکھو اس دن کو کیوں کہ اس میں زندگی ہے۔ اس مختصر سفر میں پوشیدہ ہیں۔ آپ کی زندگی کی۔ لازوال حقیقتیں۔ شاندار نہایتیں، ترقی کی برکتیں، حرکت کی عظمتیں۔ حکمرانی کی رفعتیں، ماضی رنگین خواب ہے۔ اور فردا ایک رنگین سراب۔ زندگی کی صرف آج۔!

آپ کی کل کو حسین بناتی ہے۔
دعوت شباب دیتی ہے۔
رباب کی تاریں کھینچتی ہے
آج کا دن گذارئے۔ اگر زندہ رہنا ہے۔ تو اسی کو نہ جانے دو۔!
یہی ہے میرا صبح کو سلام
سلام صبح، نوید صبح، آداب صبح۔ پیام صبح۔

افکار میں تردد سے بچئے۔ تردد آپ کو عمل سے روکتا ہے۔ اچھی فکر فکر کرنے کے لئے مفید ہے دوسرے انسانوں کے مفید ہے۔ کائنات کے لئے مفید ہے۔

آپ کو موہوم خطرات عمل سے روکتے ہیں۔ وہ آپ کو ناکامی کی پیشن گوئی کرتے ہیں۔ مگر آپ کی اچھی فکر ناکامی کے بدترین نتائج سے ضرور آگاہ کرتی ہے۔ آپ مقابلہ کے لئے اپنے کو تیار کیجئے۔ موہوم خطرات بھاگ جائیں گے۔ اور آپ مسرت محسوس کریں گے۔ کہ آپ نے بے عمل نہ بن کر اپنے کو بدترین نتائج سے دوچار ہونے سے روک لیا ہے۔

افکار و پریشانیاں، تردد، کامیابی کے دشمن ہیں۔ وہ آپ کے دماغ کو خالی نہیں رہنے دیتے۔ آپ کی ذہنی یکسوئی کو قتل کر دیتے ہیں۔ دماغ ادھر ادھر ٹھوکریں کھاتا پھرے گا۔ آپ کسی فیصلے پر نہیں پہنچیں گے۔ آپ کی قوت فیصلہ ہی آپ کو عمل کے لئے آمادہ کرتی ہے۔ صرف یہی آپ کے تمام مبہم خطرات سے محفوظ رکھتی ہے۔

اگر آپ بدترین نتائج کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لیں۔ تو آپ کو فی الفور تسکین ہوگی۔ صحیح دماغی سکون بدترین اور مشکل چیز کو حاصل کرنے کے بعد ہوتا ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے اس کا مطلب غالباً اخراج قوت ہے۔ لاکھوں لوگ اپنی قیمتی زندگی پریشانیوں اور الجھنوں کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ اگر وہ ان سے بچ نکلیں۔ تو وہ نہ صرف اپنے لئے مفید ثابت ہوں گے بلکہ دنیا کے لئے بھی ان کی افادیت غیر معمولی ہوگی۔ بدترین کو قبول کرنے سے کبھی انکار نہ کیجئے۔ یہ آپ کے لئے کیمیا ہے۔ بدتر کو بہتر بنانے کی کوشش کیجئے۔ قسمت کی نعمت کا انتظار کرنے کے بجائے تجربے کے ساتھ گتھم گتھا ہو جایئے۔ آپ مزید پریشانیوں سے بچ جائیں گے۔ بے عملی، کج فکری پریشانیوں کو دعوت دیتی ہے۔ دنیا کے کامیاب انسانوں کی زندگی کا فلسفہ صرف یہی ہے۔ کہ انھوں نے بدترین کو قبول کیا۔ بڑے بڑے سائنس دان اگر تساہل کی زندگی گذارتے تو سائنس اور فنون کی عظیم ترقیات کسی طرح نہ ہو سکتی تھیں۔

سکون و اطمینان کے ساتھ بدترین کو بہترین بنانے کی کوشش کیجئے۔ آپ لاشعوری طور پر بدترین ہی کو قبول کر کے کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ جب ایسا ہے۔ تو کامیابی حاصل کرنے کے لئے اسے شعوری طور پر ہی قبول کرنا شروع کر دیجئے۔

خوف اور ذہنی پریشانیاں

انسانی پریشانیوں کا اصل موجب خوف ہے۔ جو ایک چھپی ہوئی قوت ہے۔ یہ جذبہ انسان کو مختلف خطرات سے بچاتا ہے۔ اگر ہمارے اندر خوف کا جذبہ پوشیدہ نہ ہو تو ہمارا زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا۔ ہم اپنی زندگی خود اپنے ہاتھوں ختم کر دیں گے۔ مگر یہ چھپا ہوا جذبہ جہاں انسان کو زندگی بخشتا ہے۔ وہاں زندگی میں اس کی ناکامیوں کا باعث بھی بنتا ہے۔

ذہنی پریشانی کی سب سے بڑی علت خوف ہی ہے۔ یہ پریشانی انسان کو اعصابی کشمکش کا شکار بنا دیتی ہے۔ جو معدے کے اعصاب پر اثر انداز ہوتی ہے۔ معدے کی ترشی کو معتدل سے غیر معتدل بنا کر معدی امراض کے لئے جگہ ہموار کر دیتی ہے۔ یہ خوف معدی امراض کے علاوہ اختلاج قلب، خون کا دباؤ میں بھی مبتلا کرتا ہے۔ ایسے امراض جو ڈر، خوف فکر، پریشانی، نفرت، شکست، مایوسی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی علاج طب کے پاس نہیں ہے۔ جذباتی امراض کا علاج تقریباً جدید طبی سائنس میں بھی ناممکن ہے۔ ان امراض کی تعداد میں خوفناک اضافہ ہو رہا ہے۔

جنون کی بہت سی علتیں ہیں۔ لیکن اس کے بڑے اسباب میں خوف اور فکر بنیادی عناصر ہیں۔ دہشت زدہ، افسردہ، پریشان حال انسان بہرکیف نفسیاتی دباؤ میں مبتلا ہو کر پاگل ہو جاتے ہیں۔ وہ دماغی طور پر ماحول کے بے رحم واقعات سے نمٹنے کے لئے نااہل ثابت ہوتے ہیں۔ پسپائی اختیار کر کے تخیلات کی دنیا میں پناہ لیتے ہیں۔ اور اس طرح وہ اپنی پریشانیوں کا حل تلاش کرتے ہیں۔ مگر یہ حل انھیں نہیں ملتا۔ وہ ذہنی طور پر پسپا ہو کر بیمار ہو جاتے ہیں۔

مہلک جذبات کا آپ کی زندگی پر حاوی ہونا خطرناک ہے۔ بری عادات کو اپنے اوپر غالب کر لینے کا مطلب اپنے سے دشمنی کرنا ہے۔ غلط جذبات غیر محسوس طریقے پر ہماری

بقیہ ص ۹۷ پر

دردِ سر

> دردِ سر (صداع) ایک عالمی بیماری ہے۔ جو ساری دنیا میں پائی جاتی ہے۔ طبی کتابوں میں اس کی لگ بھگ ۲۴ اقسام بیان کی گئی ہیں۔ جن میں بعض سخت خطرناک ہوتی ہیں۔ دردِ سر عموماً دیر پا اور عسیر العلاج ہوتے ہیں۔
> (ادارہ)

ایک دردِ سر تو وہ ہوتا ہے، جو کام سے بچنے کے لئے معقول عذر کا کام دیتا ہے اس دردِ سر سے کام کو اکثر واسطہ پڑتا ہے، لیکن دوسری طرف دردِ سر در حقیقت ایک عالمگیر بیماری ہے۔ اس زمانے میں بہت کم لوگ ہیں جو اس بیماری کے پے در پے حملوں سے محفوظ رہتے ہوں اور جس وقت اس کا حملہ ہوتا ہے انسان اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کرتا ہے۔ دردِ سر کے وقت صرف ایک خیال ہوتا ہے کہ اس تکلیف سے کس طرح نجات حاصل کی جائے۔ بعض اوقات تو دردِ سر اس قدر شدید ہوتا ہے کہ انسان سر پھوڑ کر یا اپنے سر میں گولی مار کر بھی اس کے چنگل سے رہائی حاصل کرنے کے لئے آمادہ نظر آتا ہے۔

اور جب دردِ سر رفع ہو جاتا ہے تو انسان مطمئن ہو کر بیٹھ رہتا ہے یا آئندہ اس سے محفوظ رہنے کے لئے کسی معالج سے اس کے اسباب دریافت کرتا ہے، مگر اکثر اس کے جواب سے وہ مطمئن نہیں ہوتا اور طبی تدابیر اختیار کرنے کے بعد بھی دردِ سر کا حملہ پھر ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ دردِ سر کے مسئلہ کی طرف جدید سائنس کا التفات نہیں ہے۔ بہت بڑے پیمانے پر اس مرض کی ریسرچ جاری ہے اور سالہا سال سے ہزاروں پہلوؤں سے اس کا مطالعہ ہو رہا ہے لیکن ابھی تک کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا ہے۔

حالیہ تحقیقات کے نتائج سے ثابت ہوا ہے کہ امریکہ میں دس میں سے چھ افراد دردِ سر کی شکایت میں مبتلا ہیں، جو اس آفت سے نبرد آزمائی میں روزانہ چار کروڑ بیس لاکھ اسپرین کی گولیاں استعمال کرتے ہیں۔ دوسری دوائیں اس کے علاوہ ہیں۔ غیر شادی شدہ لوگ شادی شدہ لوگوں کے مقابلہ میں دردِ سر کی ابتلا کا زیادہ شکار ہیں۔ زیادہ تعلیم کے معنی زیادہ دردِ سر کے ہیں۔ کسان لوگ دفتر کے ملازمین کے مقابلہ میں دردِ سر سے محفوظ ہیں۔ جوان افراد بڈھوں سے زیادہ دردِ سر کی شکایت کرتے ہیں۔ یہ ساری معلومات دلچسپ تو ضرور ہے لیکن محض بے سود ہے۔ ان اعداد و شمار پر طنز کرتے ہوئے ایک طبی ماہر نے کہا، "دردِ سر کا بہترین علاج یہ ہے کہ اسکول کے قریب نہ پھٹکا جائے۔ اسّی یا نوّے سال کا بوڑھا کسان نوجوانوں سے زیادہ خوش نصیب ہے اور بقیہ سب بدنصیب ہیں یہ سارنل یونیورسٹی میڈیکل کالج کے پروفیسر آنجہانی ڈاکٹر ہیرلڈ نے تو دردِ سر پر ریسرچ کو یہاں تک پہنچایا ہے کہ انھوں نے رضاکاروں پر دردِ سر کو حسب مرضی گھٹانے اور بڑھانے کی مشق کی۔ انھوں نے کھوپڑیوں کی سرجری کی اور دماغ کے خلاؤں میں چھوٹے چھوٹے غبارے داخل کئے۔ دماغ کو برقی تحریک پہنچائی اور دماغ کی خون کی رگوں کے ساتھ عجیب عجیب کارستانیاں عمل میں لائے۔ انھوں نے خون کی رگوں کو پھیلانے والی دوائیں استعمال کیں اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ "ایک بڑا دن" دردِ سر کی بہت سی اقسام کی بنا ہے۔

اس ہمہ گیر تشخیص کے اسباب میں جو چیز نابود ہے وہ یہ ہے کہ بعض لوگوں پر برے دن کیوں مصیبت بن کر پھٹ پڑتے ہیں اور دوسرے کیوں محفوظ رہتے ہیں؟ ایک مضبوط اعصاب کا آدمی دردِ سر میں مبتلا ہوئے بغیر عام نفسیاتی بحران کا مقابلہ کر سکتا ہے، لیکن دوسرا شخص ایسا نہیں کر سکتا تو ضرور اس میں کوئی نقص ہے۔ تشخیص کے وقت سینکڑوں چیزیں نظر سے اوجھل ہو سکتی ہیں اور انھیں بے حقیقت سمجھ کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے جیسے گھٹیا غذا، تازہ ہوا کی کمی، ورزش کی کمی اور اسی قسم کی کثیر چیزیں، جو جسم کے افعال کی باقاعدگی کے لئے ضروری ہیں۔ بیرونی اسباب تو کثیر التعداد انسانوں کے لئے مشترک اور یکساں ہوتے ہیں۔ داخلی حالات میں البتہ فرق ہوتا ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو ہر لمحہ شدائد سے دوچار رہتے ہیں لیکن انھیں دردِ سر نہیں ستاتا۔

ماہیت

دردِ سر خون کی رگوں کے پھیل جانے (اتساع عروق دمویہ) کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے لیکن آخری تحقیق یہ ہے کہ خون کی کشادہ رگیں دردِ سر کے اسباب میں سے صرف ایک سبب کو ظاہر کرتی ہیں۔ اب یہ دریافت ہوا کہ اعصاب کے سروں سے درد کا مادہ نکل کر ساسیر میں آتا ہے مادہ خود دردِ سر نہیں پیدا کر سکتا، بلکہ اگر رگوں کی کشادگی کے ساتھ ساتھ خارج ہو تو دردِ سر پیدا کرتا ہے۔

اگر آپ دردِ سر میں مبتلا ہو جائیں تو سر پہ الزام نہ رکھئے۔ دماغ کبھی دردِ سر پیدا نہیں

کشتا۔ دماغ میں تو کسی قسم کی حس نہیں ہوتی۔ البتہ دماغ میں پانچ حساس رقبے ہیں۔ ان کے علاوہ شریانیں، وریدیں اور اعصاب ہیں، جن میں حس ہوتی ہے۔ اگر ان میں سے کسی کو دبایا یا کھینچا جائے یا ان میں ورم ہو جائے تو وہ پھول جائیں تو شاید خون کے رگوں کے پھیل جانے کی وجہ سے سر میں درد ہو جاتا ہے۔ یہ حالت کیسے پیدا ہوتی ہے۔

شدید اقتصادی سماجی جنسی الجھن جذباتی قوت برداشت سے باہر شدید دردسر کا باعث بن جاتی ہے۔ ان محرکات کا احساس مرض میں مبتلا ہونے کے بعد ہوتا ہے۔

دانت پیسنا:

نفسیاتی عوامل کے علاوہ دردسر مخصوص طبعی اور جسمانی حالات سے بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے دردسر کا علاج آسان ہے، کیوں کہ سبب کو رفع کر کے دردسر کو رفع کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ آپ کا معالج اچھا سراغ رساں ہو۔ دانت پیسنا یا بتیسی کا بھنچ جانا دردسر کے عام اسباب میں سے ہے۔ یہ بات عموماً تیز مزاج اور درشت طبع لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ درد سر کے بہترین امیدوار ہوتے ہیں۔ بعض لوگ نیند میں دانت پیستے ہیں اور اپنی اس کیفیت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ دانت پیسنے سے کنپٹی کے جبڑے کے عضلات اور حرکات کو منظم کرنے والے عضلات میں کھنچاؤ پیدا ہو جاتا ہے اور اس کیفیت کے زیادہ دیر تک قائم رہنے سے کھوپڑی کے رقبہ میں آکسیجن کم ہو جاتی ہے اور وہ مواد جس پر آکسیجن نے عمل نہ کیا ہو اعصاب کے سروں میں خلش پیدا کر دیتا ہے مزید برآں عضلات کو کھینچے اور ساخت کو سہارا دینے والے رباطات پر زور پڑنے لگتا ہے۔ اس کا علاج آسان ہے۔ ایسے مریضوں کے دانتوں میں ایک پلاسٹک کی پلیٹ لگا دی جاتی ہے۔ اس تدبیر سے ستاسی مریضوں کا درد چار سے چھ ہفتوں کے اندر چلا گیا۔

دوسرے اسباب:

ایک لڑکی کی پیشانی میں درد رہتا تھا اور معمولی سی جسمانی حرکت مثلاً سیڑھیوں پر چڑھنے سے بڑھ جاتا تھا۔ اس کے پورے منہ کا ایکسرے لیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کے دو دانت (اینابِ) خراب ہیں۔ ان کے نکال دینے سے درد رفع ہو گیا۔ ایک دانت کا دباؤ ناک کے راستے عصب پر پڑ رہا تھا اور اس کی تحریک سر کے سامنے کے اعصاب تک پہنچ رہی تھی۔

پچیس فی صد لوگوں میں آنکھ کی وجہ سے دردسر ہوتا ہے۔ آنکھ سے مسلسل کام لینے یا گلائی کوما سے اس قسم کا درد پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر درد مسلسل رہتا ہو اور اس کی وجہ سمجھ میں نہ آتی ہو تو آنکھ کا معائنہ ضروری ہو جاتا ہے۔

بہت سی جدید اور طاقتور دواؤں کے پہلوی اثر کے نتیجے میں دردسر کی پیدائش آج کل ایک عام بات ہو گئی ہے باربیچوریٹس کے طویل عرصے تک استعمال کرنے سے اکثر مزمن دردسر کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک زمانے میں حساسیت کو رفع کرنے والی دوائیں تنفس، نزلہ و زکام اور کسل وغیرہ کا تریاق سمجھی جاتی تھیں اور آج کل بھی یہ چائے پانی کی طرح استعمال ہو سکتی ہیں اور نسخے کے بغیر ہر جگہ دستیاب ہو سکتی ہیں۔ برٹش میڈیکل جرنل ۱۲ مئی ۱۹۵۱ء میں لکھا ہے کہ رضاکاروں کی ایک جماعت کو مضاد حساسیت (اینٹی الرجک)

دوائیں خفیف مقدار میں دی گئیں۔ اس کے نتیجے میں ایک چوتھائی سے زیادہ آدمی مزمن دردسر میں مبتلا ہوئے۔

شوروقروح اور ورزش:

شوروقروح (پھوڑے پھنسی) سے بھی مزمن دردسر کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے مریض کل مریضوں کے تقریباً دس فی صد ہوتے ہیں۔

ورزش کی کثرت سے بھی عروق دمویہ پھیل کر دردسر پیدا کر دیتی ہیں جگر پر شراب سے زیادہ سریع اثر اور کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا۔ الکحل اور عصبی تناؤ دردسر کے عام اسباب میں سے ہیں۔

اگر دردسر کے سبب کا پتہ نہ چلتا ہو تو کمر کے نچلے حصے کے درد کا ضرور جائزہ لینا چاہئے دردِ کمر کے علاج سے دردسر میں بھی افاقہ ہوتا ہے۔

اگرچہ عام طور پر اس کا خیال نہیں کیا جاتا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ مبرز کی سوجن اور سوزش سے سر اور گردن میں درد کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ رحم اور خصیۃ الرحم کا التہاب بھی دردسر کا موجب ہوتا ہے۔ اس لئے صرف درد رُبا اور مخدر دواؤں سے کام لینا بازیچہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ لازمی ہے کہ سبب کو دریافت کرنے کی بار بار کوشش کی جائے اور سبب کو صحیح طور پر متعین کر کے علاج کیا جائے۔

دیکھنا یہ چاہئے کہ سر میں درد کا مقام کون سا ہے پیشانی، سر کا بالائی حصہ یعنی تالو گردن کی پشت یا کوئی اور مقام۔ درد کا حملہ کس وقت ہوتا ہے؟ درد آہستہ آہستہ رفع ہوتا ہے یا دفعتاً درد دن میں کس وقت ہوتا ہے؟ کیا ورزش، تکان اور حرکت سے بڑھتا ہے؟ یا درد کھانے کے بعد بڑھتا ہے یا خلو معدہ میں ہوتا ہے؟ کیا دردسر تشنج یا ام الصبیان (صرع) وغیرہ کے دوروں سے تعلق رکھتا ہے؟ کیا دردسر کے ساتھ متلی، کانوں کا بجنا یا بصارت وغیرہ میں خرابی وغیرہ شکایات پائی جاتی ہیں؟ خاندان میں دردسر کی تاریخ، ان کے علاوہ اور بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔ چناں چہ ہضم کی خرابی، قبض اور نزلہ بھی دردسر کے عام اسباب میں سے ہیں۔

درد اگر شدید ہو تو عام ڈاکٹر زیادہ تر ایسی دوا دیتے ہیں جو خون کی رگوں کو سکیڑ دیتی ہے۔ مثلاً ارگوٹامین ٹارٹریٹ، لیکن اس سے عارضی فائدہ ہوتا ہے اور دوا کی ایک خوراک کے بعد دوسری خوراک کی ضرورت بڑھ جاتی ہے تاکہ درد رکا رہے۔ ایسی دوا نقصان رساں ہوتی ہے اور بعض اوقات نہایت خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

عام دوائیں:

دردسر کا جادو اثر اور فوری علاج ہمیشہ نقصان دہ ہوتا ہے۔ اسپرین اور باربیچوریٹس کے نقصانات سے عام طور پر لوگ واقف ہو چکے ہیں۔ ان سے سبب رفع نہیں ہوتا بلکہ اور مستحکم ہوتا ہے اور ان کے پہلوی اثرات خود درد سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ ایسی دوائیں کی جب عادت پڑ جاتی ہے تو پھر نہیں چھوٹتی۔

آج کل دردسر کے عجیب سے عجیب تر علاج رائج ہیں اور سرجری سے لے کر مالش تک اور ایسی دواؤں کا استعمال جو دماغ میں نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتا ہے، دردسر کے ازالہ

میں تدابیر شامل ہیں۔ دردِ سر میں برف کی تھیلی سر پہ رکھنے کی پرانی تدبیر بھی متروک نہیں ہوتی ہے۔

علاج:-

دردِ سر کی تکلیف کے ازالہ کے لئے بہت سی چیزوں کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے ہاضمہ اور نظامِ اعصاب پر غور کرنا چاہئے۔ اگر قبض ہو تو مناسب غذا سے اس کا تدارک کیا جائے۔ صبح سے اپنی حالت کا مطالعہ شروع کیا جائے اور سونے کے وقت تک جاری رکھا جائے۔ صبح اٹھتے ہی کیا حالت ہے اور اس میں بتدریج کیا تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔ دیکھنا چاہئے کہ کیا نیند پوری ہوتی ہے۔ آپ کس وقت سوتے اور کب جاگتے ہیں۔ نیند میں غفلت ہوتی ہے یا بے چینی رہتی ہے۔ آپ کا بستر نرم ہے یا سخت، تکیہ آپ کیسا لگاتے ہیں۔ کس وضع پر زیادہ تر سوتے ہیں۔ آپ کی غذا کیا ہے۔ ناشتے میں آپ کیا استعمال کرتے ہیں۔ آپ کا کام کس قسم کا ہے۔ دماغی پریشانیوں کا کیا حال ہے۔ اختلاجِ قلب و اضطراب، خفقان، تشنج وغیرہ عوارض ہیں یا نہیں خون کی کمی تو نہیں پائی جاتی ہے حساسیت میں تو مبتلا نہیں ہیں۔!

اگر آپ کا طبیب آپ سے ان چیزوں کے متعلق سوال نہ کرے تو آپ کو خود یہ تمام باتیں بیان کرنا چاہئیں۔ یہ تمام کیفیات غذا میں مناسب تبدیلی، آرام و ورزش اور حفظ صحت کی دوسری تدابیر سے زائل ہو سکتی ہیں۔ طبیب کا فرض ہے کہ وہ ان امور میں مریض کو مناسب ہدایات دے۔ اس مختصر مضمون میں ان ساری ہدایات کو بیان نہیں کیا جا سکتا، جو دردِ سر کے ایک مریض کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ ہم یہ تو دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہر قسم کا درد محض ان تدابیر سے رفع ہو سکتا ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ دردِ سر کی اکثر اقسام حفظِ صحت کے عام اصولوں کو مدِ نظر رکھنے سے زائل ہو سکتی ہیں۔

بقیہ - نفسیات

زندگیوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جن سے بظاہر ہمیں سکون ملتا ہے۔ لیکن وہ ہماری عملی زندگی کو مفلوج بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ جو لوگ منشیات کے عادی ہیں۔ وہ اپنے غلط جذبات کی تسکین نشہ آور چیزوں سے کرتے ہیں۔ آپ نے ایسے لوگوں کی زندگی کو تباہ ہوتے دیکھا ہے۔ ان لوگوں میں عمل کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ اور زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہتی۔ موجودہ دور کا ہپی ازم اس کی سب سے بڑی مثال ہے۔

اگر کوئی شخص طبعاً ضدی اور اڑیل ہے۔ اور بدقسمتی سے وہ افکار و پریشانیوں کا شکار ہو گیا ہے۔ تو نفسیاتی طور پر ایسا شخص سماج میں غیر معمولی حرکات کا باعث بن سکتا ہے۔ ایسے آدمی کے جذبات میں خود اعتمادی کامیابی اور فتح یابی کے رجحانات پیدا کئے جانے ضروری ہیں۔ ورنہ وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو سکتا ہے۔ اور دوسرے انسانوں کو تباہ کر سکتا ہے

خوف اور پریشانی کے مہلک ترین امراض سے بچنے کی کوشش کیجئے۔ ذہنی توازن کو قائم رکھئے۔ شہرۂ آفاق امراض کا شکار ہونے سے احتراز کیجئے۔ جو لوگ پریشانیوں کا علاج نشہ آور چیزوں سے کرتے ہیں۔ وہ سخت دھوکہ میں ہیں۔ وہ لوگ اگر عمل کا راستہ اختیار کریں۔ تو ان کی زندگیوں میں بھاری سکون ہوگا۔ سکون صرف عمل سے ملتا ہے۔ شہرت عمل سے ملتی ہے۔ یکسوئی عمل سے ملتی ہے۔

موجودہ دور کا ہپی ازم جو اصل میں سکون کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ غلط سماجی نظام کی پیداوار ہے۔ یہ لوگ عموماً بے عمل ہیں۔ سماج میں اگر توازن کو برقرار رکھا جائے اور اس بات کا مداوا تلاش کیا جائے۔ کہ ایسے بے راہ انسانوں کو نفسیاتی مطالعہ کے بعد زندگی کی صحیح لائنیں بتائی جائیں۔ اور ان کی نفسیاتی رہنمائی ہو۔ تو یہ بے کار، اور معاشرہ کی لعنت ہپی انسانی دنیا کے لئے نہایت مفید آدمی بن سکتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں خوف راسخ ہو چکا ہے۔ اس خوف کی وجہ سے ان کی قوتِ فیصلہ بیکار ہو گئی ہے۔ اور اس طرح سے وہ سماج کے لئے لعنت بن گئے ہیں۔

قرآن کا فلسفہ ہے۔ لیس للانسان الا ما سعیٰ۔ اس آیتِ کریمہ میں انسان کو بھرپور عمل کی دعوت دی گئی ہے۔ جن لوگوں نے اسلام میں تصوف مراقبہ اور رہبانیت کی طرح ڈالی ہے۔ وہ شریعتِ اسلامی کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ اسلام نے کلیسائی نظام پر بھرپور چوٹیں کی ہیں۔ یہ ایک بے عملی کا نظام تھا۔ جس پر چوٹ کرتے ہوئے واضح الفاظ میں کہا گیا۔ لا رہبانیۃ فی الاسلام۔ اس سے خدانخواستہ ہمارا یہ مقصد نہیں ہے۔ کہ ہم صوفیائے کرام اور اولیا اللہ کے عمل کی توہین کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے۔ کہ اسلامی روح عمل اور مسلسل عمل کے لئے متقاضی ہے۔ اسلام میں عبادات، اخلاقِ حسنہ، انسانی مساوات ہمدردی کے ذریعہ سکون کی تلاش حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ان سب چیزوں کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر عمل سے ہے۔

کرتا۔ دماغ میں تو کسی قسم کی حس نہیں ہوتی۔ البتہ دماغ میں پانچ حساس رقبے ہیں ان کے علاوہ شریانیں، وریدیں اور اعصاب ہیں، جن میں حس ہوتی ہے۔ اگر ان میں سے کسی کو دبایا یا کھینچا جائے یا ان میں ورم ہو جائے تو وہ پھول جائیں تو شاید خون کے رگوں کے پھیل جانے کی وجہ سے سر میں درد ہو جاتا ہے۔ یہ حالت کیسے پیدا ہوتی ہے۔

شدید اقتصادی سماجی جنسی الجھن جذباتی قوت برداشت سے باہر شدید درد سر کا باعث بن جاتی ہے۔ ان محرکات کا احساس مرض میں مبتلا ہونے کے بعد ہوتا ہے۔

دانت پیسنا:

نفسیاتی عوامل کے علاوہ درد سر مخصوص طبی اور جسمانی حالات سے بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے درد سر کا علاج آسان ہے، کیوں کہ سبب کو رفع کر کے درد سر کو رفع کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ آپ کا معالج اچھا، سراغ رساں، ہو۔ دانت پیسنا یا بتیسی کا بھینچ جانا درد سر کے عام اسباب میں سے ہے۔ یہ بات عموماً تیز مزاج اور درشت طبع لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ درد سر کے بہترین امیدوار ہوتے ہیں۔ بعض لوگ نیند میں دانت پیستے ہیں اور وہ اس کیفیت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ دانت پیسنے سے کنپٹی کے چبانے کے عضلات اور حرکات کو منظم کرنے والے عضلات میں کھنچاؤ پیدا ہو جاتا ہے اور اس کیفیت کے زیادہ دیر تک قائم رہنے سے گردش کے رقبہ میں آکسیجن کم ہو جاتی ہے اور وہ مواد جس پر آکسیجن نے عمل نہ کیا ہو اعصاب کے سروں میں خلش پیدا کر دیتا ہے مزید برآں عضلات کو کھینچنے اور ساخت کو سہارا دینے والے رباطات پر زور پڑنے لگتا ہے۔ اس کا علاج آسان ہے۔ ایسے مریضوں کے دہانوں میں ایک پلاسٹک کی پلیٹ لگا دی جاتی ہے۔ اس تدبیر سے ستاسی مریضوں کا درد چار سے چھ ہفتوں کے اندر چلا گیا۔

دوسرے اسباب:

ایک لڑکی کی پیشانی میں درد رہتا تھا اور معمولی سی جسمانی حرکت مثلاً سیڑھیوں پر چڑھنے سے بڑھ جاتا تھا۔ اس کے پورے منہ کا ایکسرے لیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کے دو دانت (انیاب) خراب ہیں۔ ان کے نکال دینے سے درد رفع ہو گیا۔ ایک دانت کا دباؤ ناک کے راستے عصب پر پڑ رہا تھا اور اس کی تحریک سر کے سامنے کے اعصاب تک پہنچ رہی تھی۔

پچیس فی صد لوگوں میں آنکھ کی وجہ سے درد سر ہوتا ہے۔ آنکھ سے مسلسل کام لینے یا گلائی کوما سے اس قسم کا درد پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر درد مسلسل رہتا ہو اور اس کی وجہ سمجھ میں نہ آتی ہو تو آنکھ کا معائنہ ضروری ہو جاتا ہے۔

بہت سی جدید اور طاقت ور دواؤں کے پہلوی اثر کے نتیجے میں درد سر کی پیدائش آج کل ایک عام بات ہو گئی ہے باربیچوریٹس کے طویل عرصے تک استعمال کرنے سے اکثر مزمن درد سر کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک زمانے میں حساسیت کو رفع کرنے والی دوائیں تنفس، نزلہ و زکام اور کسل وغیرہ کا تریاق سمجھی جاتی تھیں اور آج کل بھی بیچارے پانی کی طرح استعمال ہو رہی ہیں اور نسخے کے بغیر ہر جگہ دستیاب ہو سکتی ہیں۔ برٹش میڈیکل جنرل (۱۲ مئی ۱۹۵۱ء) میں لکھا ہے کہ رضاکاروں کی ایک جماعت کو مضاد حساسیت (اینٹی الرجک)

دوائیں خفیف مقدار میں دی گئیں۔ اس کے نتیجے میں ایک چوتھائی سے زیادہ آدمی مزمن درد سر میں مبتلا ہوئے۔

بثور و قروح اور ورزش:

بثور و قروح (پھوڑے پھنسی) سے بھی مزمن درد سر کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے مریض کل مریضوں کے تقریباً دس فی صد ہوتے ہیں۔

ورزش کی کثرت سے بھی عروق (وریدیں) پھیل کر درد سر پیدا کر دیتی ہیں جگر پر شراب سے زیادہ سریع اثر اور کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا۔ الکحل اور عصبی تناؤ درد سر کے عام اسباب میں سے ہیں۔

اگر درد سر کے سبب کا پتہ نہ چلتا ہو تو کمر کے نچلے حصے کے درد کا ضرور جائزہ لینا چاہئے درد کمر کے علاج سے درد سر میں بھی افاقہ ہوتا ہے۔

اگرچہ عام طور پر اس کا خیال نہیں کیا جاتا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ مرض کی سوجن اور سوزش سے سر اور گردن میں درد کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ رحم اور خصیۃ الرحم کا التہاب بھی درد کا موجب ہوتا ہے۔ اس لئے صرف درد رُبا اور مخدر دواؤں سے کام لینا بازیگری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ لازمی ہے کہ سبب کو دریافت کرنے کی بار بار کوشش کی جائے اور سبب کو صحیح طور پر متعین کر کے علاج کیا جائے۔

دیکھنا یہ چاہئے کہ سر میں درد کا مقام کون سا ہے، پیشانی، سر کا بالائی حصہ یعنی تالو، گردن کی پشت یا کوئی اور مقام۔ درد کا حملہ کس وقت ہوتا ہے؟ درد آہستہ آہستہ رفع ہوتا ہے یا دفعۃً درد دن میں کس وقت ہوتا ہے؟ کیا ورزش، تکان اور حرکت سے بڑھتا ہے؟ یا درد کھانے کے بعد بڑھتا ہے یا خلو معدہ میں ہوتا ہے؟ کیا درد سر تشنج یا ام الصبیان (صرع) وغیرہ کے دورے سے تعلق رکھتا ہے؟ کیا درد سر کے ساتھ، متلی، کانوں کا بجنا یا بصارت وغیرہ میں خرابی وغیرہ شکایات پائی جاتی ہیں؟ خاندان میں درد سر کی تاریخ، ان کے علاوہ اور بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔ چناں چہ ہضم کی خرابی، قبض اور نزلہ بھی درد سر کے عام اسباب میں سے ہیں۔

درد اگر شدید ہو تو عام ڈاکٹر زیادہ تر ایسی دوا دیتے ہیں جو خون کی رگوں کو سکیڑ دیتی ہے۔ مثلاً ارگوٹامین ٹارٹریٹ، لیکن اس سے عارضی فائدہ ہوتا ہے اور دوا کی ایک خوراک کے بعد دوسری خوراک کی ضرورت بڑھ جاتی ہے تاکہ درد سر کا رہے۔ ایسی دوا نقصان رساں ہوتی ہے اور بعض اوقات نہایت خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

عام دوائیں:

درد سر کا جادو اثر اور فوری علاج ہمیشہ نقصان دہ ہوتا ہے۔ اسپرین اور باربیچوریٹس کے نقصانات سے عام طور پر لوگ واقف ہو چکے ہیں۔ ان سے سبب رفع نہیں ہوتا بلکہ اور مستحکم ہوتا ہے اور ان کے پہلوی اثرات خود درد سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ ایسی دواؤں کی جب عادت پڑ جاتی ہے تو پھر نہیں چھوٹتی۔

آج کل درد سر کے عجیب سے عجیب تر علاج رائج ہیں اور سرجری سے لے کر مالش تک اور ایسی دواؤں کا استعمال جو دماغ میں نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتا ہے، درد سر کے ازالے

میں تدابیر شامل ہیں ۔ دردِ سر میں برف کی تھیلی سر پر رکھنے کی پرانی تدبیر بھی متروک نہیں ہوئی ہے ۔

علاج :

دردِ سر کی تکلیف کے ازالے کے لیے بہت سی چیزوں کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے ۔ سب سے پہلے ہاضمہ اور نظامِ اعصاب پر غور کرنا چاہیئے ۔ اگر قبض ہو تو مناسب غذا سے اس کا تدارک کیا جائے ۔ صبح سے اپنی حالت کا مطالعہ شروع کیا جائے اور سونے کے وقت تک جاری رکھا جائے ۔ صبح اٹھتے ہی کیا حالت ہے اور اس میں بتدریج کیا تبدیلی محسوس ہوتی ہے ۔ دیکھنا چاہیئے کہ کیا نیند پوری ہوتی ہے ۔ آپ کس وقت سوتے اور کب جاگتے ہیں ۔ نیند میں غفلت ہوتی ہے یا بے چینی رہتی ہے ۔ آپ کا بستر نرم ہے یا سخت ، تکیہ آپ کیسا لگاتے ہیں ۔ کس وضع پر زیادہ تر سوتے ہیں ۔ آپ کی غذا کیا ہے ۔ ناشتے میں آپ کیا استعمال کرتے ہیں ۔ آپ کا کام کس قسم کا ہے ۔ دماغی پریشانیوں کا کیا حال ہے ۔ اختلاجِ قلب و اضطراب خفقان ، تشنج وغیرہ عوارض ہیں یا نہیں خون کی کمی تو نہیں پائی جاتی ہے حساسیت میں تو مبتلا نہیں ہیں ۔!

اگر آپ کا طبیب آپ سے ان چیزوں کے متعلق سوال نہ کرے تو آپ کو خود یہ تمام باتیں بیان کرنا چاہئیں ۔ یہ تمام کیفیات غذا میں مناسب تبدیلی ، آرام و ورزش اور حفظِ صحت کی دوسری تدابیر سے زائل ہو سکتی ہیں ۔ طبیب کا فرض ہے کہ وہ ان امور میں مریض کو مناسب ہدایات دے ۔ اس مختصر مضمون میں ان ساری ہدایات کو بیان نہیں کیا جا سکتا ، جو دردِ سر کے ایک مریض کے لیے ضروری ہوتی ہیں ۔ ہم یہ تو دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہر قسم کا درد محض ان تدابیر سے رفع ہو سکتا ہے ، لیکن یہ ضرور ہے کہ دردِ سر کی اکثر اقسام حفظِ صحت کے عام اصولوں کو مدِ نظر رکھنے سے زائل ہو سکتی ہیں ۔

اشتراکات

سالانہ ——— ۱۰ روپے

شمارہ ——— ۲ روپے ۵۰ پیسے

سکریٹری پنجاب وقف بورڈ میگزین ۲۵ سوا ٹیل مارگ انبالہ

بقیہ ۔ نفسیات

زندگیوں میں داخل ہو جاتے ہیں ۔ جن سے بظاہر ہمیں سکون ملتا ہے ۔ لیکن وہ ہماری عملی زندگی کو مفلوج بنا کر رکھ دیتے ہیں ۔ جو لوگ منشیات کے عادی ہیں ۔ وہ اپنے غلط جذبات کی تسکین نشہ آور چیزوں سے کرتے ہیں ۔ آپنے ایسے لوگوں کی زندگی کو تباہ ہوتے دیکھا ہے ۔ ان لوگوں میں عمل کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں ۔ اور زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہتی ۔ موجودہ دور کا ہپی ازم اس کی سب سے بڑی مثال ہے ۔

اگر کوئی شخص طبعاً ضدی اور اڑیل ہے ۔ اور بد قسمتی سے وہ افکار و پریشانیوں کا شکار ہو گیا ہے ۔ تو نفسیاتی طور پر ایسا شخص سماج میں غیر معمولی حرکات کا باعث بن سکتا ہے ۔ ایسے آدمی کے جذبات میں خود اعتمادی کامیابی اور فتح یابی کے رجحانات پیدا کئے جانے ضروری ہیں ۔ ورنہ وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو سکتا ہے ۔ اور دوسرے انسانوں کو تباہ کر سکتا ہے

خوف اور پریشانی کے مہلک ترین امراض سے بچنے کی کوشش کیجئے ۔ ذہنی توازن کو قائم رکھئے ۔ شہرۂ آفاق امراض کا شکار ہونے سے احتراز کیجئے ۔ جو لوگ پریشانیوں کا علاج نشہ آور چیزوں سے کرتے ہیں ۔ وہ سخت دھوکہ میں ہیں ۔ وہ لوگ اگر عمل کا راستہ اختیار کریں ۔ تو ان کی زندگیوں میں بھاری سکون ہوگا ۔ سکون صرف عمل سے ملتا ہے ۔ شہرت عمل سے ملتی ہے ۔ یکسوئی عمل سے ملتی ہے ۔

موجودہ دور کا ہپی ازم جو اصل میں سکون کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے ۔ غلط سماجی نظام کی پیداوار ہے ۔ یہ لوگ عموماً بے عمل ہیں ۔ سماج میں اگر توازن کو برقرار رکھا جائے اور اس بات کا مداوا تلاش کیا جائے ۔ کہ ایسے بے راہ انسانوں کو نفسیاتی مطالعہ کے بعد زندگی کی صحیح لائنیں بتائی جائیں ۔ اور ان کی نفسیاتی رہنمائی ہو ۔ تو یہ بے کار ، اور معاشرہ کی لعنت ہپی انسانی دنیا کے لئے نہایت مفید آدمی بن سکتے ہیں ۔ ان کے ذہنوں میں خوف راسخ ہو چکا ہے ۔ اس خوف کی وجہ سے ان کی قوتِ فیصلہ بیکار ہو گئی ہے ۔ اور اس طرح سے وہ سماج کے لئے لعنت بن گئے ہیں ۔

قرآن کا فلسفہ ہے ۔ لیس للانسان الا ما سعیٰ ۔ اس آیتِ کریمہ میں انسان کو بھرپور عمل کی دعوت دی گئی ہے ۔ جن لوگوں نے اسلام میں تصوف مراقبہ اور رہبانیت کی طرح ڈالی ہے ۔ وہ شریعتِ اسلامی کے ساتھ انصاف نہیں کرتے ۔ اسلام نے کلیسائی نظام پر بھرپور چوٹیں کی ہیں ۔ یہ ایک بے عملی کا نظام تھا ۔ جس پر چوٹ کرتے ہوئے واضح الفاظ میں کہا گیا ۔ لا رہبانیۃ فی الاسلام ۔ اس سے خدانخواستہ ہمارا یہ مقصد نہیں ہے ۔ کہ ہم صوفیائے کرام اور اولیا اللہ کے عمل کی توہین کرنا چاہتے ہیں ۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے ۔ کہ اسلامی روح عمل اور مسلسل عمل کے لئے متقاضی ہے ۔ اسلام میں عبادات ، اخلاقِ حسنہ ، انسانی مساوات ہمدردی کے ذریعہ سکون کی تلاش حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے ۔ ان سب چیزوں کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر عمل سے ہے ۔

مسائل حاضرہ

آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے اجلاس منعقدہ

سری نگر کی چند قراردادیں

آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس مورخہ ۲۳ ستمبر ۶۷ء کو سری نگر میں منعقد ہوا طب یونانی کی ترقی کے لئے اجلاس حسب ذیل قراردادیں منظور کیں۔ جو ریاستی سرکاروں اور حکومت ہند کی بھاری توجہ کی محتاج ہیں۔

ادارہ

تجویز نمبر ۱۔

آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا یہ جلسہ مندرجہ ذیل اطبائے کرام کی وفات حسرت آیات پر اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کرتا ہے اور ان کی وفات کو فن طب کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان سمجھتا ہے۔۔ یہ اجلاس ان اطبائے کرام کے پس ماندگان سے اپنی پوری ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

۱۔ جناب حکیم عاقل خاں صاحب دہلی
۲۔ جناب حکیم صدرالدین صاحب انصاری
۳۔ جناب حکیم سندر سنگھ صاحب جموں
۴۔ جناب حکیم سید احمد جمیل شاہ صاحب قادری۔ دہلی۔
۵۔ جناب حکیم سعادت اللہ خاں صاحب امروہہ
۶۔ جناب حکیم صالح محمد خاں صاحب شیروانی۔ علی گڑھ
۷۔ جناب نندلال صاحب مرادآباد

تجویز نمبر ۲۔

آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا یہ جلسہ اس بات پر اپنے گہرے رنج اور تشویش کا اظہار کرتا ہے کہ سری نگر کے یونانی طبیہ کالج کے داخلے ہنوز بند ہیں جب کہ جموں کے آیورویدک کالج کے داخلے سال رواں سے دوبارہ جاری ہوگئے ہیں۔ یہ جلسہ جموں وکشمیر کے وزیر اعلیٰ عزت مآب سید میر قاسم صاحب کی توجہ ان کی اس یقین دہانی کی طرف مبذول کرتا ہے جو انھوں نے گزشتہ سال اگست میں کانفرنس کے وفد کو کرائی تھی کہ جموں کے آیورویدک کالج کے داخلے کھلتے ہی سرینگر کے یونانی کالج کے داخلے کھول دیئے جائیں گے اور ان سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے وعدہ کو پورا کریں اور سرینگر کے یونانی طبی کالج کے داخلوں پر سے پابندی ہٹانے کے احکامات جاری کریں تاکہ کم ازکم آئندہ تعلیمی سال سے کالج دوبارہ اپنا کام شروع کردے۔ وادی کشمیر میں جو طب یونانی کا ہمیشہ گہوارہ رہا ہے یونانی طبی کالج کو بند کردینا طب یونانی کے ساتھ زیادتی ہی نہیں بلکہ ریاست کے ایک قیمتی ورثہ کو ختم کردینے کے مترادف ہے۔

تجویز نمبر ۳۔

آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا یہ جلسہ ہندوستان کے تمام صوبجات کی حکومتوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ طب یونانی کی تعلیم کا بھی اس طرح انتظام کیا جائے جیسے دوسری طبوں کی تعلیم کا بندوبست ہے۔

تجویز نمبر ۴۔

آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا یہ جلسہ تمام اطباء سے درخواست کرتا ہے کہ وہ تنظیم کو مضبوط کرنے کے لئے اپنے اپنے علاقوں میں صوبائی شاخوں کو فعال بنانے اور ضلعی یونٹوں کو قائم کرنے کے لئے جدوجہد کریں اور جماعت کو فعال اور مضبوط بنانے کے لئے مناسب سرمایہ فراہم کرنے میں تعاون دیں۔

تجویز نمبر ۵۔

آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا یہ جلسہ تمام صوبائی حکومتوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ڈرگس ایکٹ کی یونانی طب سے متعلق دفعات کے مناسب نفاذ کے لئے کسی یونانی طبیب کو بطور مشیر مقرر کرے۔

تجویز نمبر ۶

آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا یہ جلسہ (منعقدہ ۲۳ ستمبر ۱۹۷۳ء بمقام سرینگر) اس بات پر اپنے گہرے رنج اور تشویش کا اظہار کرتا ہے کہ کانفرنس کی طرف سے پیہم مطالبہ کے باوجود حکومت ہند نے مرکزی وزارت صحت میں طب یونانی کے لئے اب تک ہمہ وقتی علیحدہ ایڈوائزر کا تقرر نہیں کیا ہے۔ کانفرنس کو یہ یقین ہے کہ طب یونانی کی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ایڈوائزر کا تقرر نہ ہو۔ اس باعث کانفرنس اپنے ہر جلسہ میں اس مطالبہ کا اعادہ کرتی رہی ہے۔ یہ جلسہ حکومت ہند سے ایک بار پھر مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مزید تاخیر کے بغیر مرکزی وزارت صحت میں علیحدہ ہمہ وقتی ایڈوائزر کا تقرر کرے۔

تجویز نمبر ۷

آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا یہ جلسہ اس بات پر اپنے گہرے رنج اور افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ صوبائی حکومتوں نے صدیوں میں طب یونانی کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو ختم کرنے کے لئے کوئی قدم ابھی تک نہیں اٹھایا ہے جن کے متعلق کانفرنس کے بنگلور سیشن نے اہم قرار دادیں منظور کی تھیں جو ان صوبائی حکومتوں کو بھیجی گئی تھیں۔ کئی صوبوں میں بعد میں اطباء کے وفود بھی ذمہ داران حکومت سے ملے لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ لہٰذا یہ اجلاس ایک بار پھر صوبائی حکومتوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اپنے اپنے صوبہ میں طب یونانی کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو ختم کریں۔ جس کی صرف یہی صورت ہے کہ بنگلور میں پاس شدہ قرار دادوں میں اٹھائے گئے مسائل کو حل کیا جائے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

(الف) بورڈ آف آیورویدک اینڈ یونانی سسٹمز آف میڈیسن میں کسی حکیم کا بطور جوائنٹ رجسٹرار تقرر۔

(ب) کسی کوالیفائڈ حکیم کا بطور جوائنٹ ڈائریکٹر آف ہیلتھ تقرر تاکہ وہ یونانی طب کے فروغ کے لئے جامع منصوبے بنائے اور اپنی نگرانی میں ان پر عمل درآمد کرائے۔

(ج) بعد میں یونانی طب کے لئے علیحدہ رقومات کا تعین۔

(د) ہر صوبہ میں کم از کم ایک طبیہ کالج کا قیام تاکہ یونانی طب کی تعلیم کا مناسب انتظام ہو۔

(ہ) گورنمنٹ فری ڈسپنسریوں کا شہری اور دیہی علاقوں میں انتظام۔

(و) رجسٹریشن کے موجودہ طریقہ کار کو آسان بنایا جائے۔

(ز) جن صوبوں میں طبیہ کالج موجود ہیں لیکن ان کا الحاق کسی یونیورسٹی یا بورڈ سے نہیں ہوا ہے ان کے الحاق کے لئے فوری کارروائی اور ان کے لئے مناسب گرانٹ کی منظوری۔

(ح) تمام صوبوں اور مرکز میں ڈرگس ایکٹ کی ان دفعات کے مناسب نفاذ کے لئے جو طب یونانی سے متعلق ہیں ایک طبیب کا بطور اعزازی منیجر تقرر ہو۔

تجویز نمبر ۸

آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا یہ اجلاس شدت سے اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ جدید اطبا کی ایک بڑی تعداد اپنے کو حکیم کے بجائے ڈاکٹر کہلانے نسخے پیڈ اور بورڈ پر ڈاکٹر لکھنے کو زیادہ پسند کرتی ہے۔ یہ بات اطباء کے لئے احساس کمتری اور شرم کا باعث ہونے کے علاوہ طب یونانی کے تحفظ و بقا کے لئے بھی خطرہ کا باعث ہے۔

یہ اجلاس حاملین طب اور خاص طور پر آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی صوبائی و ضلعی شاخوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ مقامی طور پر ایسے ان تمام اطبا کو جو اپنے کو حکیم کے بجائے ڈاکٹر لکھتے ہوں اور علاج و معالجہ میں دیسی ادویات پر مکمل طور پر ایلوپیتھک ادویات کو ترجیح دیتے ہوں ان کو اخلاقی طور پر آمادہ و مجبور کرے۔ و نیز یہ اجلاس سنٹرل کونسل کے یونانی ممبران سے بھی درخواست کرتا ہے کہ وہ کوئی ایسا ضابطہ اخلاق وضع کرے کہ جس سے اس طرح کے رجحان کا سدباب ہو سکے۔

تجویز نمبر ۹

آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا یہ جلسہ منعقدہ سری نگر حکومت یوپی سے پر زور مطالبہ کرتا ہے کہ یونانی شعبہ کے حقوق کی حفاظت کے لئے ایک طبیب و حکیم ہی کا بحیثیت ڈپٹی ڈائریکٹر تقرر کرے۔

پارلیمنٹری اُردو کمیٹی کی جدّوجہد کو کامیاب بنائیے!

سکریٹری اردو کمیٹی کی اپیل

یہ خوشی کی بات ہے کہ اردو زبان کے سلسلے میں اب حالات تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں۔ مخالفین اردو کے رویئے میں تبدیلی نظر آرہی ہے اور ایک ایسی فضا قائم ہوتی جارہی ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان کے ساتھ اب مزید ناانصافی نہ ہوگی بلکہ جو کچھ ناانصافیاں ہوچکی ہیں ان کو دور کرکے اردو زبان کے لئے بھی دوسری ہندوستانی قومی زبانوں کی طرح پھیلنے والی ترقی کرنے کے سارے ذرائع مہیا کئے جائیں گے۔ حکومت ہند کو سفارشات پیش کرنے کی خاطر گجرال کمیٹی فروغِ اردو کمیٹی کے نام سے قائم ہوچکی ہے اور وہ ملک کے مختلف علاقوں کا دورہ کررہی ہے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ اردو زبان کو پھر سے کس طرح آباد کیا جائے۔

ماہ مئی کے شروع میں پارلیمنٹ کے چند ممبران نے پارلیمنٹ کے ممبران پر مشتمل ایک فورم قائم کیا ہے تاکہ اردو کی حمایت میں آواز بلند کی جاسکے۔ اور اردو بولنے والوں کو ان کی روزمرہ کی زندگی میں زبان کی بنا پر جو مشکلات پیش آتی ہیں اور سرکاری کاموں میں اردو زبان کو نظرانداز کرنے کے باعث جو شکایات پیدا ہوتی رہتی ہیں ان سے حکومت کو واقف کراتے اور ان شکایات کی طرف متوجہ کراتی رہے۔ اس فورم کا نام پارلیمنٹری اردو کمیٹی ہے۔ اب تک صرف ۷۰ ممبر پارلیمنٹ کے ممبران میں سے بن چکے ہیں۔ جب کہ کل ممبران پارلیمنٹ کی تعداد ۵۲۰ لوک سبھا میں ہے اور ۲۵۰ کے قریب راجیہ سبھا میں ہے۔

اردو بولنے والوں سے درخواست ہے کہ اپنے اپنے حلقے کے ممبران پارلیمنٹ کو راضی کریں کہ وہ بھی پارلیمنٹری اردو کمیٹی کے ممبر بن جائیں تاکہ حکومت کو بتایا جاسکے کہ بہت بڑی تعداد ممبران پارلیمنٹ کی اس فورم کے ساتھ ہے، اور یہ فورم عوام کے نمائندوں کی نمائندہ جماعت ہے جس کے مطالبے کو اب مزید نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ آج کل پارلیمنٹ کے ممبران پارلیمنٹ کے بند رہنے کی وجہ سے اپنے اپنے حلقوں میں ہی دورہ کررہے ہیں جب تک پارلیمنٹ بند رہے گی۔ یہ بہترین موقع ہے کہ اردو بولنے والے ہر جگہ اپنے اپنے پارلیمنٹری حلقوں میں کئی کئی جلسے منعقد کریں۔ اپنے اپنے ممبر پارلیمنٹ کو مدعو کریں اور ان کے سامنے میمورنڈم کی شکل میں اس مطالبے کو رکھیں۔ اور ان پر دباؤ ڈال کر ان کو راضی کریں کہ پارلیمنٹ کے کھلتے ہی اور دہلی پہنچتے ہی وہ فورم کے صدر پنڈت آنند نرائن ملا صاحب سے ملیں اور ان کو اپنے عملی تعاون کا یقین دلائیں۔ پارلیمنٹری اردو کمیٹی کے خزانچی نرینا سنگھ وشِشٹ صاحب کو اپنا سالانہ چندہ عنایت فرمائیں اور کمیٹی کے جنرل سکریٹری مولانا اسحاق سنبھلی، جناب عارف عثمان اور شری ست پال کپور صاحبان سے مل کر یوپی، بہار، دہلی، مدھیہ پردیش، راجستھان، ہریانہ اور آندھرا پردیش کی ریاستوں کے لئے ایک لائحہ عمل متعین کریں تاکہ ان ریاستوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوسکے۔

ایسے جلسوں کی اطلاع ہر اخبار میں دی جائے اور جو میمورنڈم اردو والے اپنے اپنے ممبران پارلیمنٹ کو دیں، اس کی ایک ایک نقل:

۱۔ سکریٹری اردو کمیٹی ۹۱، ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳،

۲۔ پنڈت آنند نرائن ملا، صدر پارلیمنٹری اردو کمیٹی، نئی دہلی،

۳۔ شری اندر کمار گجرال، صدر فروغ اردو کمیٹی، نئی دہلی، اور

۴۔ شریمتی اندرا گاندھی، وزیر اعظم ہند۔

کی خدمت میں بھیجیں تاکہ ہر طرف اردو والوں کی عوامی جدوجہد سے لوگ باخبر ہوسکیں۔ کوشش اس بات کی ہونی چاہئے کہ ہر پارلیمنٹری حلقے میں جب جلسے منعقد کئے جائیں تو دوسری قومی زبانوں کے بولنے والے بھی کثیر تعداد میں شریک ہوں اور میمورنڈم پر ان کے دستخط بھی شامل ہوں تاکہ پارلیمنٹ کے ممبران عوام کے اور خاص طور سے اپنے ووٹروں کے مطالبے کو نظرانداز نہ کرسکیں۔

مجھے اور میرے ساتھیوں کو یقین ہے کہ اردو زبان جو ملک کے تقریباً تین کروڑ افراد کی مادری زبان ہے جو بولنے والوں کی تعداد کے مطابق ہندوستان کی چھٹی بڑی زبان ہے۔ جس میں شاندار ادبی سرمایہ موجود ہے جس کے لکھنے والوں میں ہر قوم و مذہب، علاقے اور فکر کے لوگ شامل ہیں، اور جو ہندو مسلم مشترکہ کلچر کی نفیس ترین پیداوار ہے، اب مزید تعصب کا شکار نہ رہے گی اور جن ریاستوں میں وہ پیدا ہوئی پلی، بڑھی اور پروان ہوئی، دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل . . . . کرسکے گی۔

آل انڈیا اردو ایڈیٹرز کانفرنس لکھنؤ میں

مولانا عثمان فارقلیط کا خطبۂ صدارت

بارہ دری قیصر باغ لکھنؤ میں ۷ ار نومبر ۱۹۷۳ء کی شام کو اردو صحافیوں کی کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی اس تاریخی اجلاس میں ملک کے ۲۴ صوبوں کے ساڑھے چار سو مندوبین شریک اجلاس ہوئے اس موقع پر اردو زبان اور صحافیوں کا مقدمہ پیش کرنے کے لئے مایۂ ناز بزرگ صحافی اور ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی مدظلہ کے علاوہ اردو صحافت کے سرتاج حضرت مولانا محمد عثمان فارقلیط بھی اپنی بیماری اور ضعیف العمری کے باوجود تشریف فرما تھے ذیل میں جناب عثمان فارقلیط کا خطبۂ صدارت نقل کر رہے ہیں ۔

میرا تعلق اردو اخبار نویسوں کی اس نسل سے ہے جس میں اخبارات ایک مقصد کی حیثیت رکھتے تھے اور اخبار نویسی ادائیگی فرض کا ایک ذریعہ ہوا کرتی تھی۔

آج زمانہ بدل گیا ہے اور اسی کے ساتھ قدریں بھی تبدیل ہو چکی ہیں۔ آج اخبارات ایک صنعت میں بدل چکے ہیں اور اخبار نویسی ایک پیشہ قرار پا چکی ہے۔ زمانہ کے اس فاصلہ کا فرق کئے بغیر اگر آپ نے میرا انتخاب اس اجلاس کی صدارت کے لئے کیا ہے تو اس کے لئے میں ہرگز قصور وار نہیں ہوں، خود آپ بھی اس کے لئے قصور وار نہیں ہیں بلکہ آپ کی محبت نے آپ کو یہ کشمکش مول لینے پر آمادہ کیا ہے مثل مشہور ہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے، اسی اندھی محبت نے آپ کو بھی نشانہ بنایا ہے اور میں بھی اس کا شکار ہوا۔

میں ہمیشہ سے گوشہ نشین رہا ہوں؛ اجتماعات کی صدارت الگ رہی، ان میں شرکت کے لئے بمشکل اپنے آپ کو آمادہ کر پایا ہوں مگر آپ سب کے لئے بے پایاں خلوص نے میرے لئے انکار کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔ مجھے آپ نے جو منصب سونپا تھا اس کا تقاضا ہے کہ میں کچھ آپ سے عرض بھی کروں۔ میں کچھ باتیں اپنے دور کی اقدار کے مطابق عرض کروں گا اور کچھ آپ کے دور کے مطابق کہوں گا۔ ان میں جو باتیں آپ کو پسند آئیں انھیں قبول کیجئے اور جو ناپسند ہوں انھیں مسترد کر دیجئے ۔

قربانیوں کا دور

جب اخبارات مقصد کی ترجمانی کیا کرتے تھے اور اخبار نویسوں کے لئے یہ کام ایک مشن کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس زمانہ میں اصل معیار یہ رہتا تھا کہ مقصد سے وفاداری کی خاطر کون زیادہ سے زیادہ قربانی دیتا ہے۔ مقصد کی وفاداری کہنے کو تین لفظوں کی ایک اصطلاح سہی مگر اس کی وسعت بے پناہ تھی ۔ اس زمانہ میں انگریزی حکومت اپنی اتھاہ گہرائی بے اندازہ اور لامحدود طاقت کے بل بوتے پر ہماری سرزمین پر قابض تھی جس کو کچھ بے بس مظلوموں نے چیلنج کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس وقت چیلنج کرنے والی صف بندی بہت محدود تھی۔ یہی چند سیاسی شخصیتیں تھیں اور چند اخبارات تھے جنہوں نے یہ لوہا لینے کی ٹھانی تھی۔ حکومت کی ساری مشینری اور اس کے ہر طرف پھیلے ہوئے ایجنٹ قدم قدم پر ہماری راہ میں بھاری رکاوٹیں کھڑی کرتے رہے عوام میں بے بسی کے مبہم احساس نے مایوسی کی کیفیت پیدا کر رکھی تھی بس گنے چنے افراد اور چند اخبارات دشمن کے تمام وار اپنے سینے پر سہتے رہے اور مسکرا کر آگے بڑھتے رہتے تھے اردو اخبارات اس صف میں آگے آگے تھے ۔ اور یہ کوئی لائق فخر نہیں بلکہ قابل شکر بات ہے کہ ان کی قربانیاں سب سے زیادہ تھیں۔ میرے سینے میں اس دور کی صحافت کی زندہ یادیں اب تک محفوظ ہیں اور جو بھی میرے ہم عصر موجود ہوں گے وہ گواہی دیں گے کہ اس زمانہ کی اردو صحافت نے کیسے کیسے جواہر پارے پیدا کئے ۔ یہ مولانا محمد علی اعلان حق کر رہے ہیں اور مولانا آزاد ایک نئی روح بیدار کر رہے ہیں، یہ مولانا حسرت موہانی وہ مولانا ظفر علی خاں، مہر، سالک، مظہر علی اظہر، قاضی عبدالغفار، مولانا مودودی، مولانا ثناء اللہ غرض موتیوں کی ایک لڑی ہے جس میں ہر ایک کی خوبصورتی، وزن اور قیمت کا کوئی جواب مشکل ہی سے کسی اور زبان کی صحافت میں پیدا ہو سکا ہے ۔

اللہ اللہ وہ کیا دور تھا۔ محمد علی کے گھر میں دو دو وقت چولھا نہیں جل سکا۔ ابوالکلام قرض خواہوں میں گھرے بیٹھے ہیں ظفر علی خاں کی ضمانتوں پر ضمانتیں ضبط ہو رہی ہیں۔ حسرت موہانی اپنے ہاتھ سے کتابت کر کے اور اپنے ہاتھ سے پریس چلا کر اخبار چھاپ رہے ہیں۔ ادھر پورا ملک ان کی تحریروں کو پڑھنے اور ان کے پیغام پر عمل کرنے کے لئے مضطرب ہے۔ ان کا لکھا پتھر کی لکیر اور ان کے اشارے اہل ملک کی تقدیر کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس دور کے صحافیوں کا قلم توڑا جا سکتا تھا۔ اور اسے بار بار توڑا بھی گیا۔ لیکن اس کو موڑنا محال تھا کتنی ہی بار یہ سماں سامنے آیا کہ ؎

دل ضبط زباں ضبط تاثر ضبط فغاں ضبط ٭ ہر سوز نہاں ضبط ہے ہر ساز نہاں ضبط

فنانس ایکٹ ۱۹۷۲ نے دفعہ ۱۱ و ۱۲ (اے) اور ۱۳ میں بہت سی تبدیلیاں کی ہیں جو مجموعی طور سے مندرجہ ذیل ہیں۔ (الف) دفعہ ۱۱ کی شرائط کو مد نظر رکھتے ہوئے عطیات کو بھی آمدنی شمار کیا جائے گا۔

انکم ٹیکس سے استثنا ختم ہو جائے گا۔ اگر آمدنی سے واقف یا اس کے رشتہ دار بشمول ازدواجی رشتہ دار وغیرہ فائدہ اٹھا رہے ہوں یا اسے استعمال کر رہے ہوں۔

یہ استثنا اس وقت بھی ختم ہو جائے گا اگر وقف کی جائداد یا اس کی آمدنی کو واقف یا اس کے رشتہ دار کو منتقل کر دی جائے بشرطیکہ یہ آمدنی ایک ہزار روپے سے زائد ہو۔ (دفعہ ۱۳ (۳)

۱۵ اگست ۱۹۷۳ سے پہلے پہلے انکم ٹیکس کمشنر کے یہاں تمام اوقاف کا رجسٹریشن ہونا ضروری ہے۔ (فارم ۱۰ (اے) اس مدت میں مزید توسیع ہو سکتی ہے۔ (ملاحظہ ہو دفعہ ۱۲ (ا)

اگر آمدنی ۲۵ ہزار روپے سے زائد ہو تو آڈٹ کرانا اور آڈٹ رپورٹ کو ٹیکس ریٹرن کے ساتھ داخل کرنا ضروری ہے۔ (دفعہ ۱۲ (اے)

اگر وقف کی آمدنی اور عطیات وغیرہ ٹیکس کی حد سے متجاوز ہو جاتے ہیں تو ریٹرن داخل کرنا ضروری ہے۔ (فارم ۳ (اے)

آئندہ شمارے میں

- اوقاف میں اصلاحی اقدامات
- زعیم مشرق کو خراج عقیدت
- امیر شریعت حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری
- برھما اور ابراہیم
- اور دوسرے مقالات
- تصاویر، فیچر، اور اطلاعات

ادارہ

بقیہ - اردو کانفرنس

کچھ عجیب اتفاق ہے کہ لکھنؤ میں ہی اردو اخبارات کے ایڈیٹروں کی پہلی اردو کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ یہ اب سے ۵۷ سال پہلے دسمبر ۱۹۱۶ء کی بات ہے۔ جب منشی رچھپال سنگھ شیدا دہلوی ایڈیٹر ہندوستان، لاہور کی صدارت میں اس طرح کی ایک کانفرنس کا انعقاد ہوا اس وقت کی مشکلات پر غور و خوض کیا گیا۔ اب پھر اسی لکھنؤ کو اردو ایڈیٹروں کی پہلی آل انڈیا کانفرنس کی مہمان نوازی کا موقعہ ملا ہے۔ اس کانفرنس میں یوپی، دہلی، ہریانہ، پنجاب، جموں و کشمیر، ہماچل پردیش، مہاراشٹر، میسور، آندھرا، تامل ناڈو، بنگال، اڑیسہ اور بہار کے نمائندے شریک ہیں اور ان کی موجودگی سے اس بات کا ثبوت پیش کر رہے ہیں کہ دستور میں مندرج پندرہ زبانوں میں سے اردو کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ خدا کرے آپ اپنی وسعت کے شایان شان اس زبان کی صحافت کو ترقی کی راہوں پر ڈالنے کا کوئی اچھا منصوبہ بنا سکیں۔ اگر آپ نے ایسا کر لیا تو میرا یقین ہے کہ یہ ایک ایسا کارنامہ ہوگا جس کو عرصہ تک یاد کیا جاتا رہے گا۔

قلم کی آبرو

میں آپ سے معذرت خواہ ہوں کہ اشاروں ہی اشاروں میں بات کرنے کے باوجود میں نے آپ کا کافی وقت لے لیا ہے۔ آخر میں آپ سے اتنی گذارش کرنا اور ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ قلم کی آبرو کے محافظ ہیں آزادی افکار اور آزادی ضمیر ایسی دولت ہے جس کی ہر قیمت پر حفاظت کیجئے۔ یہی صحافت کی اصل متاع ہے جس کو جان سے بھی زیادہ عزیز رکھنے کی کوشش کیجئے۔ آپ اندیشوں کے طوفان اور لالچ کی ترغیبات میں گھرے ہوتے خدا نہ کردہ اگر آپ کا اس شاہراہ میں قدم پھسل گیا تو آپ اپنے ساتھ پورے سماج کا اعتماد مجروح کر دیں گے۔ اور یہ ایک ایسا حادثہ ہوگا جس کی تلافی برسوں تک ممکن نہ ہو سکے گی۔ مجھے ہرگز خطرہ نہیں کہ آپ کا قدم پھسل جائے گا مگر ضعیفی کے دور میں کبھی کبھی اندیشے اور وسوسے پریشان کرنے لگتے ہیں۔ اس لئے اپنوں سے ان کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں ہے

میری دعا ہے کہ آپ کی یہ کانفرنس کامیاب ہو اور اس کے ذریعے اردو صحافت کو نئی توانائی عطا ہو۔ پچھلے ۲۵ سال میں اردو صحافت پر جو کچھ بیت چکی ہے میں نہیں چاہتا کہ اس کے شکوہ و ماتم میں آپ اپنا وقت صرف کریں۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب تو یہ سوچ کر قدم بڑھایئے کہ آپ کو ایک زندہ زبان کی زندہ صحافت کے ترجمان کی حیثیت سے پیش قدمی کرنا اور مسابقت کے میدان میں اپنا مقام حاصل کرنا ہے۔

ایک اداریہ

اوقاف کا صحیح مصرف تعلیم ہے مسلمانوں کی پسماندگی دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان میں اعلیٰ تعلیم کو عام کیا جائے۔ اور ان میں ہونہار طلبا کو وظائف دیئے جائیں۔ مندرجہ اداریہ میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی پسماندگی کی بڑی وجہ یہی ہے کہ بطور کمیونٹی تعلیمی لحاظ سے پیچھے رہ گئے۔ انھوں نے تعلیم حاصل کرنے کے لئے زیادہ سرگرمی بھی نہیں دکھائی اور نہ ہی ان موقعوں کا صحیح فائدہ اٹھایا گیا جو کہ اس سلسلے میں حاصل کئے جاسکتے تھے خاص طور پر تکنیکی اور دیگر پیشوں سے متعلقہ تعلیم کی طرف بہت کم توجہ دی گئی۔ اسی وجہ سے مقابلہ کے امتحانوں کے لئے بہت کم مسلمان تیار ہوتے ہیں، چاہے یہ سرکاری ہوں یا پرائیویٹ، اور پھر جتنے بھی مقابلہ کے امتحانوں میں حصہ لیتے ہیں، ان میں سے کم کامیاب ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اچھی ملازمت حاصل کرنے کے لئے دشواریاں پیش آتی ہیں، کنبہ پروری امتیاز و جانب داری سے کام لیا جاتا ہے لیکن پھر بھی یونین پبلک سروس کمیشن یا دیگر مقابلے کے امتحانوں میں اتنے کم مسلمانوں کے حصہ لینے کی وجہ صرف یہی نہیں ہوسکتی۔

بہت برس پہلے مرحوم پروفیسر ہمایوں کبیر نے اس مسئلہ کا تجزیہ کیا تھا، وہ بھی بجا طور پر اسی نتیجہ پر پہنچے تھے کہ جب تک ہندوستان کے مسلمان اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں تعلیم حاصل کرنے کے قابل نہ بنالیں، وہ سرکاری یا پرائیویٹ مقابلہ کے امتحانوں میں پیچھے ہی رہیں گے۔

اس کا ازالہ کرنے کے لئے انھوں نے مسلم وقف بورڈوں کو تجویز پیش کی تھی کہ وہ اپنے ذرائع کا ایک حصہ اس قسم کی انسٹی ٹیوٹ کھولنے پر لگائے جس سے مسلمانوں کو تکنیکی مختلف پیشوں سے متعلقہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملے اور خاص طور پر نوجوان مسلمانوں کی توجہ اس طرف مبذول ہوسکے۔ بدقسمتی سے ان کی اپیل پر کوئی اثر نہ ہوا چنانچہ آج بھی وہی صورت حال ہے جو دس پندرہ برس پہلے تھی۔

اس دوران میں ایک مرتبہ پھر ڈاکٹر سید ظالد رشید صاحب نے اپنے آرٹیکل کے ذریعہ مسلمانوں کی ترقی کے لئے اسی طرح کے طریقہ کار کی حمایت کی ہے اور وقف بورڈوں سے ویسی ہی اپیل کی ہے۔

انھوں نے خاص طور پر اوقاف کی بدنظمی اور غفلت کی طرف توجہ دلائی ہے۔

نامکمل جائزہ کے مطابق بھی ملک بھر میں اوقاف کے پاس ۱۰۰ کروڑ روپے کا سرمایہ موجود ہے اس بناء پر اُن کو ہر سال ۵ کروڑ روپے کی آمدنی ہے۔ یہ بہت بڑی رقم ہے، اس سے کوئی منکر نہیں ہوسکتا کہ اوقاف کو بہت سی ذمہ داریاں نبھانا پڑتی ہیں، اس کے باوجود بھی کل سرمایہ کا پانچواں حصہ مسلمانوں میں تکنیکی و مختلف پیشوں کی تعلیم کو فروغ دینے پر صرف کرنا آسانی سے ممکن بنایا جاسکتا ہے۔

علاوہ ازیں بیکاری سے بچانے کے واسطے نئے پروجیکٹ کھولے سکتے ہیں۔ اس میں بہت نظر کی ضرورت ہے، اس سے واقف کی آمدنی میں اضافہ ہوسکتا ہے اور کام مہیا کرنے کے لئے نئے مواقع فراہم ہوسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ملک کے مختلف حصوں میں پولی ٹیکنک انسٹی ٹیوٹ اور ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کھول کر وقف بورڈ مسلم کمیونٹی کو بہت فائدہ پہنچا سکتا ہے، اس سلسلہ میں پہل کرتے ہوئے بہت بڑی تعداد میں ٹریننگ سینٹر کھولے جانے چاہئیں۔ اس طرح سے مسلمان تعلیم یافتہ بن سکیں گے اور خصوصی شعبوں میں مہارت حاصل کرسکیں گے، قابل مستحق اور خصوصاً غریب طلبا کی حوصلہ افزائی کے لئے وظائف مقرر کئے جائیں۔

اگر اس طرح کے پروگرام کا آغاز کیا جائے تو مسلمانوں کے لئے کام کرنے کے بہت سے راستے کھل جائیں گے، بے کاری کے خلاف کمیونٹی کو تقویت حاصل ہوگی۔

جتنے زیادہ امیدوار مقابلہ کے امتحانوں میں حصہ لینے لگیں گے، اسی تناسب سے وہ چنے بھی جاسکیں گے۔ جو مقابلہ کے امتحانوں میں بیٹھنے کے خواہش مند نہ ہوں انھیں اپنا روزگار کرنے کا موقع مل سکے گا۔ اسکا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم کا ذمہ ان کی اپنی کمیونٹی کے سر ہی ہونا چاہئے اور حکومت اس میں ہاتھ نہ بٹائے بلکہ اس کا مقصد یہی ہے جو کہ وہ کمیونٹی کے لوگ اپنے لئے کر رہے ہیں۔ ایسی کوششوں میں اضافہ کرکے مسلم عوام کی بہبودی کے مسائل حل کرنے میں آسانی ہوگی۔ ایسے اقدامات کو فرقہ وارانہ رنگ کسی بھی صورت میں نہیں دیا جانا چاہئے۔ تمام نئے انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ سب کے لئے کھلا ہے لیکن زیادہ نشستیں اسی کمیونٹی کے لئے مقرر رہنی چاہئیں جو اُن کو چلا رہی ہیں۔ اوقاف کو اس قسم کا فنڈ قائم کرنا چاہئے جس کی رو سے ان انسٹی ٹیوٹ سے پاس ہونے والے طالب علموں کو قرضہ دیا جاسکتا ہے، جسے وہ نئے کاروبار میں استعمال کرسکیں یا اس سے نئی صنعت چلاسکیں۔

مندرجہ بالا معاملات پر نہایت سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اوقاف کی رقم ہندوستان کے مسلمانوں کی ترقی کے لئے ہی استعمال ہونی چاہئے۔

مرکزی حکومت، صوبائی حکومتوں اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا بھی فرض ہے کہ وہ ایسی تمام انسٹی ٹیوٹ کی حسب معمول امداد کریں۔ سب سے اہم بات یہی ہے کہ اس سلسلے میں پہل کی جائے نئی بنیادیں قائم کی جائیں اور پرانی عادات و مقررشدہ دستوروں کے مطابق محض واویلا کرنے پر ہی اکتفا نہ کرلی جائے۔

(ہندوستان ٹائمز)

رپورتاژ

درگاہ پیرانِ کلیر شریف میں دارالعلوم صابریہ کا قیام!

خان حاجی ودود علی خاں صاحب ریسیور وقف درگاہ حضرت مخدوم علاؤ الدین علی احمد صابرؒ پیران کلیر شریف کی دعوت پر دارالعلوم صابریہ کے قیام کے سلسلہ میں مورخہ ۹ ستمبر بعد نماز ظہر درگاہ شریف میں ایک جلسۂ مشاورت زیر صدارت محترم جناب شبیر احمد صاحب انصاری منعقد ہوا۔ جلسہ کے اغراض و مقاصد درگاہ شریف میں ایک ایسے دینی مدرسہ کا قیام جس میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہائی اسکول اور دستکاری سکھانے کا کام بھی شامل ہوگا جلسۂ مشاورت میں تحصیل روڑکی اور ضلع سہارنپور کے مختلف مقامات کے تقریباً ڈیڑھ سو سے زائد معززین نے شرکت فرمائی۔ جلسہ کا آغاز تلاوت کلام سے ہوا۔ سب سے پہلے حاجی حافظ محمد اسلم صاحب سابق چیرمین ضلع پریشد سہارنپور نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ جب سے حاجی ودود علی خاں صاحب ریسیور نے درگاہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا ہے حالات بتدریج بہتر اور سدھرتے چلے جا رہے ہیں۔ انھوں نے سابق ریسیور صاحب کا بھی مختصر طور پر ذکر کیا کہ کس طرح اس وقت حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے تھے۔ موجودہ ریسیور جناب حاجی ودود علی خاں صاحب کے اس عظیم الشان اصلاحی اقدام پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے زبردست خراج تحسین ادا کیا کہ موصوف نے عرس میں طوائفوں کے ناچنے گانے پر پابندی لگا کر عرس کو ہر قسم کی غنڈہ گردی اور فواحشات سے پاک کر دیا۔ آپ کا یہ ایک عظیم کارنامہ ہے اب دوسرے اقدام پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس پر آشوب زمانہ میں دینی تعلیم اور دنیوی تعلیم اور دستکاری مسلمانوں کے لئے کس قدر اہمیت رکھتی ہے کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس پر مفصل روشنی ڈالتے ہوئے اس کی زبردست تائید فرمائی کہ درگاہ شریف میں ایسا ادارہ ضرور قائم ہونا چاہئے ازاں بعد حافظ صاحب موصوف نے حاضرین سے اس سلسلہ میں بھرپور تعاون دینے کی اپیل کی۔ حافظ صاحب کے بعد جناب حاجی ودود علی خاں صاحب ریسیور درگاہ نے گلا خراب ہونے کے باوجود مجلس مشاورت سے خطاب فرمایا کہ حافظ صاحب محترم نے اپنی تقریر میں مفصل طور سے مدرسہ کے اغراض و مقاصد اور ضرورت پر کافی روشنی ڈال دی اب اس بارے میں زیادہ کچھ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ مجھے تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ایسی متبرک جگہ جہاں ساڑھے چھ سو سال پہلے حضرت مخدوم پاکؒ نے گولر کھا کر آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرتے ہوئے فاقے کر کے کفر کے اس گڑھ میں تبلیغ دین اور اشاعتِ اسلام کا فرض ادا کیا اور انھیں کے فیوض و برکات کے طفیل میں آج اس علاقہ میں حلقہ بگوشانِ اسلام زبردست تعداد میں موجود ہیں۔ لیکن انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہم نے ان کے اسوۂ حسنہ کو بھلا دیا۔ ان کے پیغام فراموش کر دیا۔ انتہائی عالم استغراق کے باوجود جس ولی کامل کی تمام زندگی میں ایک وقت کی نماز بھی قضا نہیں ہوئی۔ آپ کی درگاہ میں شب و روز رہنے والے اور قرب و جوار والے دن رات یا صابر یا صابر پکارنے والے حضرت صابر کے اس دین سے بے بہرہ ہیں۔ جس کے لئے صابر علیہ الرحمۃ نے دنیا کی ہر لذت سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔

آج ضرورت ہے کہ حضرت مخدوم پاکؒ کے اس مشن کو پھر زندہ کیا جاوے اب زیادہ تر زائرین یہاں اپنی دنیوی اور ذاتی اغراض کو لے کر آتے ہیں۔ روحانی فیض حاصل کرنے اور اپنی اصلاح کی کسی کو جستجو اور فکر نہیں۔ یہ دین سے لاتعلقی اور عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ ایسے حالات میں ضروری ہوا کہ یہاں ایک دینی تعلیم کا مدرسہ قائم کیا جاوے جس میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلیم اور دستکاری سکھانے کا انتظام ہو۔ لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لئے دارالعلوم صابریہ کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے۔ میرا گلا آٹھ نو ماہ سے خراب ہے۔ میری آواز بیٹھی ہوئی ہے۔ اس لئے میں نے مختصراً کچھ گذارشات آپ کی خدمت میں عرض کی ہیں۔ میں آپ حضرات کا انتہائی مشکور ہوں کہ آپ نے اپنی مصروفیات کے باوجود میری درخواست پر یہاں تشریف لانے کی زحمت گوارہ فرمائی۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اپنے قیمتی مشورہ سے مستفید فرمائیں خصوصاً دستکاری کے متعلق کہ کونسی دستکاری موزوں رہے گی۔ فی الحال ابتدائی دینی تعلیم اور پرائمری تعلیم شروع کی جا رہی ہے۔ انشاء اللہ اگلے سال جولائی [illegible]ء سے ہائی اسکول تک کی تعلیم کا انتظام ہو جائے گا۔ اس کے بعد حاجی محمد عمر صاحب سگریٹ والے بابو احمد حسن صاحب وکیل روڑکی۔ صوفی مقصود احمد صاحب پردھان انوار صاحب اور غلام صابر صاحب وغیرہ حضرات نے اپنی تجویزیں پیش کیں۔ اور اظہار خیال کیا اور اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا کافی بحث مباحثہ کے بعد لکڑی کی صنعت سکھانے کا فیصلہ ہوا۔ بعض حضرات نے مالی تعاون کے لئے بھی پیش کش کی۔ اور بعض باتوں کی مزید وضاحت چاہی۔ ریسیور صاحب نے مزید وضاحت کی اور فرمایا کہ میں آپ کے اس جذبہ کی انتہائی قدر کرتا ہوں جو آپ نے مالی تعاون کے لئے فرمایا۔ لیکن چونکہ ابھی صرف پرائمری کی تعلیم اور ابتدائی دینی تعلیم کے لئے انتظام کیا جا رہا ہے اور اس کے اخراجات کے لئے وقف مد کا مکے بجٹ میں رقم مخصوص کی گئی ہے لہٰذا اس وقت تو درگاہ سے ہی ابتدائی اخراجات کئے جائیں گے۔ آخر میں دعا کے بعد جلسہ کی کارروائی ختم ہوئی

درگاہ امام ناصرؒ میں عرس کے موقع پر
مولانا خلیل الرحمٰن ممبر پنجاب وقف بورڈ سامعین سے خطاب کر رہے ہیں

پنجاب کے مشہور آریہ سماجی لیڈر لالہ جگت نرائن۔ مدیر ہند سماچار جالندھر درگاہ امام ناصرؒ میں
جناب غضنفر علی خاں اسسٹنٹ سکریٹری پنجاب وقف بورڈ استقبال کر رہے ہیں۔

درگاہ امام ناصر جالندھر میں محفل قوالی

سہ ماہی

آپ کے
عظیم خاندان
کی مجاہدانہ
مساعی سے
عرب و
عجم میں
شیخ الاسلام
محمد
بن عبدالوہابؒ
کی تحریک
تجدید و
احیائے دین
اور
دعوتِ سلفیہ
کامیاب ہوئی

امام المسلمین جلالۃ الملک المعظم فیصل بن عبدالعزیز آل سعود

یکے از مطبوعات پنجاب وقف بورڈ

اوقاف

سہ ماہی

جلد ۲	اپریل، جولائی ـــــــ ۱۹۷۴ء	شمارہ ۳۔۲

اشتراکات

سالانہ ـــــــــ ۱۰ روپے

شمارہ ـــــــــ ۲ روپے ۵۰ پیسے

مجلہ اوقاف سہ ماہی ـــــــ ۵۰ سردار پٹیل مارگ انبالہ کینٹ

ترسیل زر کا پتہ

سکریٹری پنجاب وقف بورڈ (میگزین) ۵۰ سردار پٹیل مارگ انبالہ کینٹ

محتویات

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر حکیم اجمل خاں نے پنجاب وقف بورڈ کی جانب سے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی سے چھپوا کر ۵۰ سردار پٹیل مارگ انبالہ کینٹ سے شائع کیا۔

مُدیر

فکریات

اوقاف میگزین کا زیرِ نظر شمارہ اپنی چالو روش سے کچھ مخالف ہو گیا ہے۔ جس کی ایک جنسی وجوہات ہیں لیکن ہمیں امید ہے۔ کہ قارئین کرام جریدے کے اس اتفاقی انداز کو بھی پسند فرمائیں گے۔

اس شمارہ کی ایک اہم پیش کش "شیخ الاسلام حضرت محمد بن عبد الوہابؒ" کی عظیم اسلامی شخصیت پر سیر حاصل مقالہ ہے جس میں شیخ الاسلام کی زندگی کے حالات ان کی دینی دعوت، اور عقائد پر خود انہی کے انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے یعنی میرا مطلب ہے۔ ہندوستان میں رائج اصطلاح "وہابیانہ انداز" میں اِ مقالہ بذا میں جہ شیخ الاسلام کے عقائد کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس حصہ کو ملت کا ایک مخصوص حصہ حیرت واستعجاب کی نگاہوں سے دیکھ سکتا ہے۔ لیکن اس سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ شیخ الاسلام کی سیرت کے بعض پہلو اوجھل رہ جاتے اگر ہم انھیں مقالہ میں اسی انداز میں نہ دیتے۔ اس کے لئے ہم بہرحال معذرت خواہ ہیں۔ سوانحی خاکے کو ایک ہی اشاعت میں دیا جانا ضروری تھا۔ تاکہ قارئین ..... ایک ہی نشست میں استفادہ کر سکیں۔ اور ایک قیمتی سوانحی دستاویز کو اپنے پاس محفوظ رکھ سکیں۔

یہ ملی میگزین کی بہت بڑی بدقسمتی ہوتی۔ کہ وہ اپریل کے شمارہ میں زعیم مشرق حکیم الامت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کو خراج عقیدت پیش کرنے سے محروم رہ جاتا ——— اس لئے بھاگ دوڑ کر کے کچھ تصاویر، مقالات، نظمیں، اور مضامین حاضر خدمت کر دیئے گئے ہیں۔ جو انشاء اللہ آپ کو پسند آئیں گے۔

اب آپ دانائے راز سے اسرار و رموز، خودی و بے خودی، خود آگہی و خودداری، کی باتیں کیجئے۔!

دِگر دانائے راز آید کہ ناید

گذشتہ شمارہ میں ہم نے فرقہ واریت اور اس کے مالہ وماعلیہ کا تفصیلی جائزہ لیا تھا۔ اس ضمن میں ملک کے موجودہ مروجہ نظام تعلیم پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی، اور اس امر کی نشاندہی خاص طور پہ کی تھی کہ ہمارا قومی نصاب تعلیم بھاری تبدیلیوں کا محتاج ہے موجودہ نصاب ہائے تعلیم کو کسی طرح بھی قومی نصاب تعلیم قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ہمیں مسرت ہے کہ ہریانہ سرکار نے اس طرف انتہائی مناسب اقدامات کئے ہیں: حال ہی میں دوسری جماعت کے لئے جو ہندی کتاب شائع کی ہے۔ اس کو قومی تعلیمی انداز و مزاج سے ہم کنار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو ایک اچھے مستقبل کی آئینہ دار ہے، امید کی جاتی ہے، کہ محکمہ تعلیم اصلاحی اقدامات جاری رکھے گا۔

ہم مرکزی سرکار اور دوسری ریاستی سرکاروں کے محکمہ ہائے تعلیم اور وزارت ہائے تعلیمات سے درخواست کریں گے۔ کہ وہ قومی یکجہتی، اور ملکی قومی مزاج کو سامنے رکھ کر نصاب تعلیم مرتب کرائیں گے۔ تاکہ نژاد نو بدترین سماجی برائیوں سے محفوظ رہ سکے اور ان کے ہاتھوں ملک کا مستقبل شاندار و جاندار بن سکے۔ ہریانہ کی سپریم اکتاد رودھی کمیٹی نے بھی نصاب کی اصلاح کے لئے ایک کمیٹی بنائی ہے۔ جو خامیوں کی نشاندہی کرے گی۔

ہندوستانی ملت اسلامیہ کا ایک اہم مسئلہ مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت ہے۔ موجودہ نظام ہائے تعلیم میں سخت افراط و تفریط ہے۔ دینی تعلیم حاصل کرنے والے طلبا ملکی و دنیاوی تعلیم سے محروم ہیں اور ملکی و دنیاوی تعلیم حاصل کرنے والے طلبا دینی تعلیم سے بیگانہ ہیں۔ یہ طریق تعلیم ملی مفادات کے منافی ہے۔ عرصہ ہوا۔ جناب محمد یونس سلیم صاحب ایم پی سابق نائب وزیر ریلوے و اوقاف، ورکن سنٹرل وقف کونسل نے اس سلسلے میں ایک تعلیمی سکیم کا خاکہ پیش کیا تھا۔ اس سکیم پر بعض اصحاب فکر سے آراء بھی حاصل کی گئی تھیں لیکن نہ جانے بعد میں وہ کہاں فائلوں میں دب کر رہ گئی۔ ہم پھر یاد دلانا چاہتے ہیں۔ کہ ملی نقطہ نظر سے یہ مسئلہ نہایت اہم ہے۔ جو ملی مفکرین اور دانش وروں کے لئے بھاری توجہ کا محتاج ہے۔ اور مذہب، تہذیب، اور قومی تمدن کی بقا و تحفظ کے لئے از حد ضروری ہے ______ اس لئے ایسے ادارے قائم کئے جائیں جو اس ضرورت کو پورا کرسکیں۔ اور ایسا طریق تعلیم رائج کیا جائے۔ جو دینی و دنیاوی تعلیم کے تقاضوں کو پورا کرسکے۔

ملک میں جو ادارے پہلے سے تعلیمی کام کر رہے ہیں۔ ان کی تعلیمی خامیوں کو دور کر کے مطلوبہ نظام تعلیم رائج کیا جائے۔ ایسے طلباء کی حوصلہ افزائی کی جائے جو اس اندازِ تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہوں، اور اس کے حصول کے لئے کوشاں ہوں۔

اردو زبان کی تعلیم کو سرکار کی عدم توجہی کی بناء پر بعض حضرات نے جذباتی مسئلہ بنا دیا ہے، جس سے اردو کے کاز کو بھاری نقصان پہنچا ہے۔ اور جذباتیت نمایاں ہونے کی بنا پر اردو زبان کو مسلمانوں کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔

مگر دیکھنے کی بات یہ ہے۔ کہ یہ مسئلہ جذباتی نہیں۔ بلکہ ملک کی ایک زبان اور ایک تہذیب کے زندہ و پائندہ رہنے کا مسئلہ ہے۔ ملک کا وہ طبقہ جو اردو زبان اور اردو تہذیب کو پسند کرتا ہے۔ اور جس کی تعداد مردم شماری کے مطابق تین کروڑ بتائی گئی ہے، اس کا سب سے پہلا اور بڑا فرض ہے کہ وہ اس زبان کی تعلیم کے حصول کے لئے مناسب اقدامات کرے۔ خود بھی عملی طور پر اس کے لئے جدوجہد کرے۔ اور مرکزی و صوبائی سرکاروں کو بھی اس بات کے لئے مجبور کرے۔ کہ اردو زبان اور اردو تہذیب کی ہر ممکن حفاظت کی جائے۔

اوقاف کا یہ تیسرا شمارہ ہے۔ ہم اگرچہ اس کا زیادہ پروپیگنڈا اور اشتہار بازی نہیں کر پائے۔ لیکن اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ کہ میگزین ہندوستان میں وقف یا اوقاف سے متعلق بیشتر افراد اور اداروں کے ہاتھوں میں پہنچ سکے۔

ہم نے تمام متعلقین سے میگزین، خطوط، اور بالشافہ ملاقاتوں کے ذریعہ استدعا کی ہے۔ کہ تمام ایسے مسائل پر جو وقف یا اوقاف کے انتظام، اصلاح و ترقی سے تعلق رکھتے ہوں میگزین کو اشاعت کے لئے بھیجے جائیں مگر ہر طرف سرد مہری ہے۔ ہم پھر استدعا کیا چاہتے ہیں۔ کہ وقف کے ذمہ داران خصوصاً سکریٹری صاحبان اس طرف توجہ فرمائیں۔ اور اس ملی میگزین کو مفید سے مفید تر بنانے میں ہم سے تعاون کریں۔

مولانا عبدالسلام رحمانی

بے شک خدا ہی کو قیامت کا علم ہے۔ اور وہی بارش نازل کرتا ہے۔ اور اسی کو معلوم ہے کہ ماؤں کے رحم میں کیا پرورش پا رہا ہے۔ اور کسی کو بھی یقینی علم نہیں کہ کل وہ کیا کرے گا، اور یہ بھی کوئی نہیں جانتا کہ اس کی موت کہاں آئے گی، وہ صرف اللہ کی ذات ہے جسے سب کچھ معلوم ہے اور وہی ہر چیز کی خبر رکھتا ہے۔

(سورۂ لقمان آیت ۲۴)

ابن المنذر نے حضرت عبداللہ بن عباس کے مشہور شاگرد عکرمہ سے روایت کی ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قیامت کب آئے گی۔؟ اور ہمارے علاقہ میں قحط ہے بارش کب ہوگی۔؟ اور میری بیوی حاملہ ہے وہ لڑکا جنے گی یا لڑکی۔؟ اور یہ تو مجھے معلوم ہے کہ میں نے آج کیا کیا ہے مگر یہ بتادو میں کل کیا کروں گا۔؟ اور یہ تو مجھے معلوم ہے کہ میں کہاں پیدا ہوا ہوں۔ تم یہ بتادو کہ مروں گا کہاں۔؟

ان سوالات کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت واضح فرمائی کہ نبی کو ان چیزوں کی کیا خبر، یہ تو غیب کی باتیں ہیں جنھیں صرف اللہ جانتا ہے۔

اللہ ہی کی ذات ہے جسے ہر ظاہر و باطن کی خبر ہے۔ اسی نے ذرہ ذرہ کو وجود بخشا ہے اور وہی ساری کائنات کا خالق ہے اسی کو علم ہے کہ اس کائنات پہ کیا گزرا ہے اور کیا گزرنے والا ہے اور اب تک کیا ہوا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ وہی ہے جس نے اس پوری کائنات کو پیدا کیا ہے اور اسی کو ان کے معاملات کی تدبیر اور ان کے حالات کی نگہبانی کرنی ہے۔

یہ اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ ہے کہ ہر ظاہر و باطن کی خبر اور ذرہ ذرہ سے آگاہی خدا کے سوا کوئی نہیں رکھتا پھر کون ہے جو جلوت و خلوت میں ہماری خبر گیری کرے اور کیسے ہمارے تمام ظاہری و باطنی رنج و الم کا علم ہے اور کون ہے جو ہمارے ہمہ وقتی احساسات سے باخبر ہے کہ ہماری فریاد رسی کرے اور دستگیری فرمائے۔

وہی خدائے برتر ہے جس کا علم ہر چیز کو محیط ہے اور علم کی یہ وسعت اسی ذات کبریا کے لئے زیبا ہے۔ ہر ظاہر و باطن کا علم اور خدائی دونوں میں ایک ایسا گہرا تعلق ہے کہ قدیم ترین زمانے سے انسان نے جس ہستی میں خدائی کے کسی شائبے کا گمان کیا ہے اس کے متعلق یہ خیال ضرور کیا ہے کہ اس پر سب کچھ روشن ہے اور کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ گویا انسان کا ذہن اس حقیقت سے بدیہی طور پر آگاہ ہے کہ قسمتوں کا بنانا اور بگاڑنا، دعاؤں کا سننا، حاجتیں پوری کرنا اور ہر طالب امداد کی مدد کو پہونچنا صرف اسی ہستی کا کام ہو سکتا ہے جو سب کچھ جانتی ہو اور جس سے کچھ بھی پوشیدہ نہ ہو اسی بنا پر تو انسان جس کو بھی خدائی اختیارات کا حامل سمجھتا ہے اسے لازماً عالم الغیب بھی سمجھتا ہے کیوں کہ اس کی عقل بلا ریب شہادت دیتی ہے کہ علم اور اختیارات باہم لازم و ملزوم ہیں۔ اب اگر یہ حقیقت ہے کہ خالق اور مدبر اور مجیب الدعوات اور رازق خدا کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے، جیسا کہ یہ اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے تو آپ سے یہ بھی حقیقت ہے کہ عالم الغیب بھی خدا کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔

اور انسان کے علم کا تو حال یہ ہے کہ جن معاملات سے انسان کی قریب ترین دلچسپیاں وابستہ ہیں انسان ان کے متعلق بھی کوئی علم نہیں رکھتا۔ جیسا کہ اس آیت میں بیان ہوا کہ تمہاری خوشحالی و بدحالی کا بڑا انحصار بارش ہے مگر اس کا سررشتہ بالکل اللہ کے ہاتھ میں۔ جب جہاں جتنی چاہتا ہے برساتا ہے اور جب چاہتا ہے روک لیتا ہے تم قطعاً نہیں جانتے کہ کہاں کس وقت کتنی بارش ہوگی اور کون سی زمین اس سے محروم رہ جائے گی۔ یا کس زمین پر بارش الٹی نقصان دہ ہو جائے گی۔ تمہاری اپنی بیویوں کے پیٹ میں تمہارے اپنے نطفے سے حمل قرار پاتا ہے جس سے تمہاری نسل کا مستقبل وابستہ ہوتا ہے مگر تم نہیں جانتے کہ کیا چیز اس پیٹ میں پرورش پا رہی ہے اور کس شکل میں کن بھلائیوں یا برائیوں کو لئے ہوئے وہ برآمد ہوگی۔ تم کو یہ تک پتہ نہیں ہے کہ کل تمہارے ساتھ کیا کچھ پیش آنا ہے۔ ایک اچانک حادثہ تمہاری تقدیر بدل سکتا ہے مگر ایک منٹ پہلے بھی تم کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔ تم کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ تمہاری اس زندگی کا خاتمہ آخرکار کہاں کس طرح ہوگا۔ یہ ساری معلومات اللہ نے اپنے ہی پاس رکھی ہیں اور ان میں سے کسی کا علم بھی تم کو نہیں دیا۔ ان میں سے ایک ایک چیز ایسی ہے جسے تم چاہتے ہو کہ پہلے سے تمھیں اس کا علم ہو جائے تو پھر اس کے لئے پیش بندی کر سکو لیکن تمہارے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ ان معاملات میں اللہ ہی کی تدبیر اور اسی کی قضا پر بھروسہ کرو۔ اسی طرح دنیا کے اختتام کی ساعت کے معاملے میں بھی اللہ کے فیصلے پر اعتماد کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے۔ اس کا علم بھی نہ کسی کو دیا گیا ہے نہ دیا جا سکتا ہے۔

یہاں ایک بات اور بھی اچھی طرح سمجھ لینی ضروری ہے کہ اس آیت میں امور غیب کی کوئی فہرست نہیں دی گئی ہے یہاں تو ابن المنذر والی مذکورہ روایت کے مطابق ایک سائل کے ان امور غیب کا جواب دیا گیا ہے جو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کئے تھے نیز جن سے کہ انسان کی نہایت گہری اور قریبی دلچسپیاں وابستہ ہیں اور انسان ان سے بے خبر ہے۔ اس آیت سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ صرف یہی پانچ امور غیب ہیں جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ حالانکہ غیب نام ہی اس چیز کا ہے جو مخلوقات سے پوشیدہ اور صرف اللہ پر روشن ہو اور فی الحقیقت

مولانا عبدالسلام رحمانی

ایک روایت

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تین آدمی (علی وعبداللہ بن عمرو بن عاص وعثمان بن مظعون رضی اللہ عنہم) ازواج مطہرات کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کا حال معلوم کرنے کے لئے آئے۔ جب ان حضرات کو آپ کی عبادت کا علم ہوا تو انھیں (بے پناہ عبادت کا جو شوق وحوصلہ تھا اس کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی) عبادت کی مقدار کم نظر آئی۔ وہ کہنے لگے ہم کو بھلا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات سے کیا نسبت ہو سکتی ہے آپ تو بخشے بخشائے ہیں آپ کے لئے اتنی ہی عبادت بہت ہے پھر ایک صاحب بولے کہ میں تو پوری پوری رات نماز پڑھوں گا ایک لمحہ بھی نہ سوؤں گا۔ دوسرے نے کہا اور میں تو ہمیشہ روزہ رکھوں گا کسی دن بھی بے روزہ نہ رہوں گا۔ تیسرے نے کہا میں تو عورتوں سے کنارہ کش رہوں گا کبھی شادی نہ کروں گا (تاکہ عبادت میں کوئی رکاوٹ نہ ہو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ان تینوں حضرات کی اس گفتگو کی خبر ہوئی تو آپ نے ان سے فرمایا کیا تم ہی لوگوں نے ایسا کہا ہے؟ خدا کی قسم میں تم سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ متقی و پرہیزگار ہوں لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور بے روزہ بھی رہتا ہوں۔ نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ اور عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں پس جس نے میرے طریقے سے اعراض کیا وہ میری ملت سے خارج ہے۔ (بخاری و مسلم)

اس حدیث کے مطالعہ سے کئی باتیں واضح طور پر معلوم ہوئی ہیں۔

۱۔ صحابہ کرام جو واقعی اسلام کا نمونہ تھے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طور طریق جاننے اور اس کے مطابق عمل کرنے کے کس قدر حریص تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کا روزانہ مشاہدہ کرنے کے باوجود ازواج مطہرات سے بھی پوچھا کرتے تھے تاکہ وہ آپ کی کسی سنت پر عمل کرنے سے محروم نہ رہ جائیں۔ بعض ایسی روایات بھی آتی ہیں کہ اس زمانے کے بچے بھی اس ارادہ سے آپ کے پاس رات گزارتے تھے تاکہ معلوم ہو کہ رات میں آپ کیا کیا عبادت کرتے ہیں اور معلوم کر کے وہ بھی آپ کے طریقے کی اتباع کریں۔

۲۔ نیکیوں سے ان کی دلچسپی اور حوصلہ کا یہ عالم تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ عبادت کرنا چاہتے تھے اور اپنی زندگی کا ہر لمحہ وہ عبادت میں گزارنے کا شوق و حوصلہ رکھتے تھے۔ بعض ایسے واقعات بھی مروی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت زیادہ عبادت سے روک رہے ہیں اور وہ اللہ کے بندے زیادہ عبادت کی اجازت حاصل کرنے کے لئے آپ سے بار بار منت و سماجت کر رہے ہیں۔ سچ ہے جن لوگوں کے دلوں میں اللہ کا خوف سمایا ہوتا ہے اور آخرت بنانے سنوارنے کی انھیں فکر ہوتی ہے وہ نیکیوں کے اسی طرح حریص ہوتے ہیں اور عبادت کا شائق جو حوصلہ اسی درجہ ہوتا ہے، سورہ مومنون کی وہ آیتیں پڑھئے جن میں کہا گیا ہے کہ "جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ شرک نہیں کرتے اور اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے وہ نیکیوں کی طرف لپکتے ہیں اور اس میں سب سے آگے نکل جانا چاہتے ہیں"۔

۳۔ تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے نہ آپ سے زیادہ کسی کے دل میں اللہ کا ڈر ہو سکتا ہے نہ آپ سے بڑھ کر کوئی متقی و پرہیزگار ہو سکتا ہے۔ وہ شخص انتہائی بدباطن و ملعون ہے جو اپنے بارے میں یا کسی کے بارے میں یہ سمجھے کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اللہ کا خوف اور تقویٰ و پرہیزگاری ہے۔

۴۔ خشیت الٰہی اور تقویٰ و پرہیزگاری کا ہرگز یہ تقاضا نہیں ہے کہ انسان دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر زندگی کے سارے لمحات روزہ نماز میں گزار دے۔ بلکہ خشیت و تقویٰ ہی کا تقاضا ہے کہ انسان صرف حقوق اللہ ہی نہیں بلکہ سارے حقوق کی ادائیگی کا خیال رکھے جس میں اپنے آرام کا خیال۔ اہل و عیال کا خیال۔ اپنے کاروبار کا خیال۔ پاس پڑوس رشتہ و تعلقات کا خیال غرض تمام اہل حقوق کا خیال اور ان کے حقوق کی ادائیگی کی فکر لازمی ہے۔

بقیہ صفحہ ۲۰ پر

محی الدین احمد

شیخ الاسلام امام محمدؒ بن عبد الوہاب رحؒ

ریگزار عرب نجد کے علاقہ جبل یمامہ کی وادی میں جو وادی حنیفہ بھی کہلاتی ہے ــــــــ مسیلمہ کذاب نے خروج کیا، جس نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی اور مسلمانوں سے قتال کیا بالآخر حضرت سیف اللہ خالد بن ولیدؓ کی تلوار سے واصل جہنم ہوا۔

اس کے ٹھیک گیارہ سو سال بعد اسی وادی حنیفہ سے حضرت شیخ الاسلام محمدؒ بن عبد الوہاب رحمۃ اللہ علیہ کا ظہور ہوا جنھوں نے ان تمام بدعات خرافات۔ ضلالت وشرک کو، جو مسلمانوں میں پھیل گیا تھا، دُور کر کے اسلام کو قرونِ اُولیٰ کے اسلام کے مطابق بنادیا اور وہ فائز المرام ہوئے "

مندرجہ صدر عبارت میری نہیں اور نہ کسی مسلمان کی ہے بلکہ " امین ریحانی "، مشہور شامی عیسائی کی ہے جس کی کتاب "تاریخ نجد الحدیث وملحقاتہ" بہت مشہور ہے اور یہ اسی کتاب کی ابتدائی سطور کا ترجمہ ہے۔

اب ایک دوسرے عیسائی مصنف لوتھراپ اسٹاڈرڈ **Lothrap Staderd** کی کتاب "نیو ورلڈ آف اسلام" **New World of Islam** کے صفحات ۲۱ و ۲۰ کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔ ...

" دیگر تمدنی امور کی طرح مذہب کی حالت بھی بے حد پستی میں تھی۔ تصوف کے توہمات نے اسلامی تعلیم توحید کو بری طرح مات دیدی تھی۔ مساجد ویران پڑی تھیں جاہل عوام اُن سے دُور بھاگتے تھے۔ تعویذ گنڈے اور مالا کے چکر میں پڑ کر اور بے ہودہ اور نیم دیوانے فقیروں سے بھلائی پہونچانے کی امید میں اعتقاد رکھتے تھے بڑے بڑے گنبد والی قبروں پر زیارت کے لئے جاتے تھے اور ان کی پرستش اللہ تعالیٰ کے پاس سفارش کرنے والے تصور کر کے کرتے تھے۔ ان جاہلوں کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ کی بزرگی وبرتری کے باعث اس کی بارگاہ میں بلا واسطہ وذریعہ کے کوئی دعا قبول ہی نہیں ہوسکتی۔ قرآن شریف کی تعلیم سے نہ صرف یہی کہ بے اعتنائی برتی جاتی تھی بلکہ اس کی خلاف ورزی کھلے بندوں کی جاتی تھی شراب نوشی، اور افیون کا استعمال آزادانہ ہوتا تھا۔ زنا اور فواحش شرمناک حد تک ترقی کر گئے تھے ــــ افسوس تو یہ ہے کہ مقامات مقدسہ مکہ معظمہ ومدینہ منورہ بھی اس قسم کی بداعمالیوں کا مرکز بن گئے تھے۔ حج جس کو اللہ تعالےٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرائض میں داخل فرمایا تھا اس میں صدہا بدعتیں داخل کر کے ایک رسمی سفر بنادیا گیا تھا غرض کہ اصلی اسلام کی زندگی ختم ہوچکی اور اس کی جان نکل چکی تھی۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پھر اس دنیا میں تشریف لاتے تو اپنے پیرؤں کی باطل پرستی، شرک کفر اور بدعات کو دیکھ کر نفرت اور بیزاری کا اظہار فرماتے۔

اس دور گمراہی وضلالت میں قلب دشت عرب سے ایک آواز بلند ہوئی جس کا مقصد مسلمانوں کو صحیح راستہ پہ لگانا اور پچھلے زمانہ کے اسلام کو زندہ کرنا تھا جس نے خوابیدہ مسلمانوں کو چونکا دیا۔ یہ آواز اس مشہور مصلح اور مجددِ اسلام کی تھی جس کا نام

محمد بن عبدالوہابؒ تھا جس نے اسلامی دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک ایک لہر دوڑا دی۔ اور یہیں سے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوتا ہے۔"

یہ تھا مسٹر لوتھراپ اسٹاڈرڈ کا بیان۔ لیکن غور کیا جائے تو یہ نشاۃ ثانیہ بھی عارضی ہی ثابت ہوئی۔ آج ہندوستان کا مسلمان ابھی اسی حالت میں ہے جس کی تصویر اوپر کھینچی گئی ہے۔ غرض دنیا میں اسلام کی تو یہ حالت تھی لیکن عرب کے اندرونی حصص خصوصاً نجد اور اس کے اطراف کی حالت تو بہت زیادہ ابتر تھی۔ صدہا بدعات اور مشرکانہ رسوم داخل عقائد تھے نجد کا کوئی مقام ایسا نہیں تھا جہاں کوئی نہ کوئی قبر یا آستانہ نہ ہو شرک و بدعت کا بازار گرم رہتا تھا۔ خود وادی حنیفہ میں مقام جبیلہ پر زید بن خطاب کی قبر پر جو معرکہ یمامہ میں شہید ہوئے تھے پرستش ہوتی تھی۔ درعیہ میں بھی بعض صحابہ کے نام کی فرضی قبریں بنا کر ان پر نذر و نیاز چڑھائی جاتی تھی، کہیں ضرار ابن ازور کی قبر بنائی جا کر اس کی پوجا شروع کر لی گئی سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ کہ بلدۃ الفدا میں ایک قدیم درخت کے ساتھ مایوس الاولاد عورتیں عجیب اور شرمناک حرکات کرتی تھیں۔ اور اس پر طرح طرح کی چیزیں بطور نذر چڑھائے جاتے تھے اور جانور بطور قربانی ذبح ہوتے تھے۔ درعیہ کے قریب ایک پہاڑی کے درہ پر طرح طرح کی بدعات ہوتی تھیں۔ اور ان میں نہ صرف جاہل عوام ہی مبتلا تھے بلکہ اہل علم اور مقتدایان مذہب بھی محض اپنی نذر و نیاز کی آمدنی بڑھانے کے لئے مزید ایجاد و اختراع کرتے رہتے تھے۔

جو چند اصحاب فقہ و حدیث سے واقف تھے وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کر کے ان بھڑوں کے چھتہ کو چھیڑنا نہیں چاہتے تھے جب برائیوں کی حالت اس انتہا کو پہونچ چکی تو قدرت کو ان کی اصلاح منظور ہوئی۔

جس طرح بعثت نبوی سے پہلے عرب کی حالت تھی اور جن ناموافق حالات میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہوتے تھے اسی طرح نجد کی اس بگڑی ہوئی حالت میں ایک عاشق سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصلاح و تجدید دین کا بیڑہ اٹھاتا ہے۔ لیکن افسوس کہ یہ بدبخت قوم آج بجائے اس کا احسان ماننے کے اس کو برائی سے یاد کرتی ہے۔ قوم کے یہ محسن اعظم محمد بن عبدالوہاب تھے جن کی سیرت آپ آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

ولادت اور خاندان

نجد کے مشہور شہر عیینہ میں شرفا شہر کا ایک علمی گھرانا تھا۔ عبدالوہاب ایک مشہور عالم تھے اور عیینہ میں عہدہ قضاۃ پر مامور تھے۔ عبدالوہاب کے بھائی ابراہیم بن سلیمان اور ان کے بیٹے عبدالرحمٰن بن ابراہیم بھی فقہ و ادب تفسیر و حدیث میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے اور ان کے دادا سلیمان بن علی بن مشرف تو سارے علمائے نجد میں ایک خاص حیثیت کے مالک تھے اور بڑے بڑے جید علماء ان کی شاگردی باعث فخر خیال کرتے تھے۔

عبدالوہاب اور ان کے بھائی علاوہ قضاۃ کے درس و تدریس کا بھی شغل رکھتے تھے۔ اطراف کے باشندے اور تشنگان علم ان کی درسگاہ میں فقہ ادب تفسیر حدیث کا درس لینے کے لئے آتے تھے۔

اسی علمی گھرانے میں ۱۱۱۵ھ مطابق ۱۷۰۳ء میں حضرت شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ پیدا ہوئے ان کا شجرہ نسب حسب بیان امین مدنی حسب ذیل ہے محمد بن عبدالوہاب بن محمد بن سلیمان بن علی بن مشرف بن احمد بن راشد بن برید بن محمد بن قاسم بن شداد بن حنظلہ بن مالک بن تمیم بن اد بن طابخہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان اس سلسلہ میں ۲۰ پر جن نزار کا نام ہے ان کے دو بیٹے تھے ایک مضر دوسرے ربیعہ مضر سے شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کا خاندان ہے اور ربیعہ سے موجودہ شاہان نجد و حجاز آل سعود کا، اس طرح بیس پشتوں میں شاہان سعودیہ کا نسب حضرت شیخ الاسلام کے نسب میں مل جاتا ہے۔

اسلم جیراج پوری نے اپنی کتاب تاریخ نجد میں حضرت شیخ الاسلام کا حسب ذیل نسب نامہ دیا ہے۔ محمد بن عبدالوہاب بن سلیمان بن

علیؒ بن محمد بن احمد بن راشد بن بُرید بن محمد بن برید بن مشرف بن عمرو بن معضار بن ریس بن زاخر بن محمد بن علی بن وہب التمیمی۔ معلوم نہیں کہ ان کا ماخذ کیا ہے کیوں کہ انھوں نے صراحتاً کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ البتہ اجمالی طور پر دیباچہ میں روضۃ الافکار والافہام قلمی از حسین بن غنام عنوان المجد فی تاریخ النجد از عثمان بن عبداللہ تاریخ نجد از سید محمود شکری الالوسی بغدادی اور ملوک العرب از امین الریحانی کو اپنا ماخذ بیان کیا ہے۔ فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں کہ۔

"شیخ الاسلام کے ہم قبیلہ بعض بقایا بنی تمیم خلیج عجم کے ساحل پر ناحیہ زبید میں سکونت پذیر ہیں"۔ ہم کو جو نسب نامہ جات حضرت شیخ الاسلام کے ملے تھے وہ دونوں ہی درج کر دیئے گئے ہیں۔ امین الریحانی نے جو نسب نامہ دیا ہے وہ بعض قرائن سے صحیح معلوم ہوتا ہے۔

بچپن اور ابتدائی تعلیم

حضرت شیخ الاسلام پر جس قدر بھی مواد موجود ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دیگر ہونہار بچوں کی طرح جو آگے چل کر کسی خاص شخصیت کے مالک بننے والے ہوں آپ نے بھی اسی طرح نشو ونما پائی ذہانت اور قوت حافظہ کا یہ عالم تھا کہ دس ہی سال کی عمر میں حفظ قرآن مجید سے فارغ ہو گئے۔ چونکہ اس زمانہ میں عام مدارس کا وجود نہیں تھا اس لئے گھر ہی پر اپنے والد سے جو خود بھی اپنے وقت کے زبردست عالم تھے اور بعض رسائل فقہ و تفسیر کے مصنف بھی تھے، فقہ تفسیر حدیث اور دیگر علوم کا درس حاصل کرتے تھے۔

شیخ الاسلام کے والد حضرت شیخ عبدالوہاب اپنے لڑکے کی ذہانت فہم و فراست اور ذوق حصول علم سے بہت خوش تھے اور کم عمری میں حافظ ہو جانے نیز تبحر علمی کی وجہ سے اس قدر متاثر تھے۔ کہ ہر نماز میں انہی کو امام بناتے۔

شادی اور سفر حج

مصنف کتاب تاریخ نجد امین الریحانی ناقل ہے کہ بارہ سال ہی کی عمر میں آثار بلوغت دیکھ کر حضرت شیخ الاسلام کے والد نے ان کی شادی کر دی مصنف نے شادی کا سنہ نہیں لکھا ہے۔ چوں کہ شیخ کی ولادت ۱۷۰۳ء میں ہوئی تو شادی کا سال ۱۷۱۵ء قرار دیا جا سکتا ہے۔ نکاح کے بعد حضرت... شیخ الاسلام نے فریضہ حج سے فراغت حاصل فرمائی مدینہ منورہ میں دو ماہ قیام فرمایا اور وطن واپس آکر عیینہ میں اپنے والد سے فقہ حنبلی کی تعلیم میں مصروف رہے۔ لیکن اس تشنہ کام علم کو تنگنائے نجد کیا کافی ہو سکتا تھا۔ علم کی تلاش و جستجو میں مصائب سفر برداشت کرنے پر آمادہ ہوئے۔

علم کی راہ میں سفر

۱۱۳۵ھ میں حضرت شیخ الاسلام حجاز مقدس پہونچ کر دوبارہ حج سے مشرف ہوئے اس کے بعد مدینہ طیبہ پہونچ کر وہاں کے علماء سے تحصیل و اکتساب علم میں مشغول ہو گئے۔ اس زمانہ میں مدینہ طیبہ میں دو بزرگ ہستیاں ایسی تھیں جن کے علم و فضل کا جواب دنیائے اسلام میں نہ تھا۔ ان میں ایک حضرت عبداللہ بن ابراہیم بن سیف نجدیؒ (مجمعہ واقع نجد) جو ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔

دوسرے حضرت شیخ محمد حیات سندھیؒ تھے۔ ثانی الذکر علم حدیث کے متبحر عالم تھے۔ حضرت شیخ عبداللہ بن ابراہیمؒ کے توسط سے جن سے حضرت شیخ الاسلام کے غالباً وطنی تعلقات تھے۔ حضرت شیخ الاسلام نے حضرت شیخ محمد حیات سندھیؒ کی خدمت میں زانوئے تلمذ طے کیا۔ اور بہت جلد ان کے مخصوص شاگردوں کے حلقہ میں شامل ہو گئے اور کافی عرصہ تک حضرت ممدوح سے استفادہ فرمایا۔

ان ہر دو بزرگوں کے علاوہ حضرت شیخ الاسلام مدینہ طیبہ کے دیگر اہل علم شیوخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کی علمی صحبتوں سے استفادہ کرتے رہے لیکن باقاعدہ تلمذ صرف حضرت شیخ محمد حیات سندھیؒ سے ہی حاصل رہا۔

ا مصر کے مشہور مورخ و ادیب ڈاکٹر ناصر الدین اسد کی مرتبہ تاریخ نجد مصنفہ حسین بن غنام کا شجرہ یوں ہے محمد بن عبدالوہاب بن سلیمان بن علی بن محمد بن احمد بن راشد بن برید بن محمد بن برید بن مشرف التمیمی۔

مدینہ منورہ میں تحصیل علوم وحدیث سے فارغ ہونے کے بعد شیخ الاسلام محمد مجموعی کی شہرت علم سن کر بصرہ پہونچے اور چند روز اُن سے ادب کا درس حاصل فرمایا۔

امین ریحانی صاحب تاریخ نجد کا بیان ہے کہ بصرہ میں اہل تشیع اور دیگر بدعت پرست لوگوں کو غیر مشروع اعمال کرتے دیکھ کر حضرت شیخ الاسلام نے اپنے اعتقاد کے موافق اس کی تردید شروع کی جس پر قبر پرست وباطل پسند طبقہ مشتعل ہو گیا، رفع شر و دفع فساد کی خاطر حضرت شیخ الاسلام اور ان کے استاد شیخ محمد مجموعی نے قصبہ زبیر کو ہجرت فرمائی۔

حضرت شیخ الاسلام یہاں سے بغرض تحصیل تعلیم مزید شام بھی جانا چاہتے تھے لیکن مالی حالات سازگار نہ تھے لہذا بعد تکمیل تعلیم اپنے وطن نجد کو واپس تشریف فرما ہو کر انکے والد کے پاس جو اس وقت عیینہ کی جگہ حریملا کے قاضی تھے اقامت فرما ہوتے۔

دعوت توحید و اصلاح عقائد

یوں تو حضرت شیخ الاسلام کو ابتداہی سے شرک بدعات اور تمام فسق وفجور سے جو دین کے نام پر مسلمانوں میں رائج ہو گئے تھے نفرت تھی۔ زمانہ طالب علمی میں حضرت شیخ عبداللہ بن ابراہیم اور مولانا محمد حیات سندھیؒ کی صحبت اور تربیت نے اس پر جلا دیدی اسی لئے زمانہ طالب علمی ہی میں جہاں موقع ملتا ان غیر اسلامی امور سے مسلمانوں کو روکنے کی کوشش فرماتے صحیح راستہ پیش کرتے قرآن وحدیث اور ائمہ سلف کے اقوال سے شرک بدعت وغیرہ کی برائیاں بتلاتے اور ثابت کرتے لیکن ایک عام گمراہی میں نوخیز طالب علم کی آواز صدا بصحرا ہوکر رہ جاتی اور حضرت شیخ الاسلام کے دل پر بڑا صدمہ ہوتا۔ یہ عاشق سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل سنت والجماعت مسلمانوں کو سنت نبوی سے دور اور ابوجہل و ابولہب کی سنت پر عمل پیرا دیکھتا تو دل مسوس کر رہ جاتا۔ ایک بار وہ اپنے استاد کے ساتھ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے سامنے حجرہ مبارک پر جہلا کی مشرکانہ حرکات کو دیکھ کر حضرت شیخ محمد حیات سندھیؒ سے دریافت فرمایا کہ ان جہلا کی مشرکانہ حرکتوں کی نسبت آپ کا کیا خیال ہے جو خاص روضہ مطہرہ کے سامنے طرح طرح کی بدعات کر رہے ہیں شیخ نے جواب دیا: یہ سب بے ہودہ اعمال ہیں اور باطل وغلط ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔

ایک اور وقت حضرت شیخ عبداللہ بن ابراہیمؒ سے اسی رد بدعت اور انسداد شرک کے سلسلہ میں گفتگو تھی حضرت ممدوح نے فرمایا کہ تمہیں وہ ہتھیار دکھلاؤں جو میں نے اہل مجمعہ (نجد) کے لئے تیار کیا ہے۔ حضرت شیخ الاسلام نے فرمایا ضرور۔ اس پر وہ ان کو ایک کمرہ میں لے گئے جہاں ہر طرف کتابوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ اور ان کی جانب اشارہ کر کے فرمایا یہی وہ ہتھیار ہیں جو میں نے فراہم کئے ہیں۔ (یہاں اہل مجمعہ نجد سے حضرت شیخ عبداللہ بن ابراہیمؒ کی مراد اہل شرک وبدعت ساکنان نجد ہیں۔م)

بصرہ میں بھی اس قسم کی نصائح اور تردید شرک وبدعت کرتے رہتے تھے اب وطن پہونچ کر حریملا میں علی الاعلان انسداد شرک وبدعت پر تقاریر کرنے لگے۔

جس طرح دنیا میں ہوتا آیا ہے کہ ہر مصلح کو جاہل عوام کے ہاتھوں مصائب برداشت کرنا پڑے اسی طرح بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی حضرت شیخ الاسلام کو بھی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا یہاں جہلا و عوام کے علاوہ وہ علمائے سو ربھی ان کے مخالفت پر اٹھ کھڑے ہوئے جو ان جہلا کے مشرکانہ اعمال کے باعث پرورش پا رہے تھے۔ سال ہا سال کی جڑ پکڑی ہوئی برائیاں اس قدر آسانی سے چھوٹنے والی نہ تھیں۔ غرض شیخ الاسلام کو کسی ایک کی مخالفت کا ڈر نہ تھا بلکہ ساری قوم سارا ملک ان کا دشمن ہو گیا تھا۔

اور تو اور خود بھائی اور حقیقی بھائی سلیمان بن عبدالوہاب بھی مخالف ہو گئے اور شیخ کی تردید میں ایک رسالہ بھی لکھا لیکن بہت جلد اپنے اعمال

مشرکانہ سے تائب ہوکر شیخ الاسلام کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ خود شیخ الاسلام کے والد کو بھی ان کا غلو فی المذہب ناپسند ہوا اور بعض مسائل میں حضرت شیخ الاسلام اور ان کے والد کے درمیان مناظرہ بھی ہوا (تاریخ نجد اسلم جیراج پوری) مخالفت کا سبب ظاہر تھا۔ بدوی قبائل اس لئے ان کے دشمن ہوگئے تھے کہ وہ اُن سے لوٹ غارت گری چوری ڈاکہ وغیرہ چھڑانا چاہتے تھے۔ مجاوران قبور متولیان اوثان باطلہ اس لئے ناخوش تھے کہ حضرت شیخ الاسلام کی دینی دعوت کی وجہ سے ان کی آمدنی کے ذریعے مسدود ہوگئے تھے۔ علمائے سوء اور شیوخ طریقت اس لئے ناراض تھے کہ وہ پیری مریدی کی نذر و نیاز سے محروم ہو رہے تھے جاہل عوام ان سے اس لئے بیزار تھے کہ وہ ان کے باپ دادا کے وقت کے معتقدات کے مخالف اور انھیں غیر مشروع زیارتِ قبور سے روکتے ذبیحہ باسمِ غیر اللہ کے کھانے سے منع کرتے اور ان نام نہاد درگاہوں زیارت کدوں اور شرک و بدعات کے آستانوں پر جہاں مذہب اور دین کے نام پر ہر قسم کا فحش اور فسق و فجور ہوتا تھا روکتے تھے۔ اس گروہ مخالفین میں سب ہی تھے۔ یہاں تک کہ ان کے عزیز و اقارب تک ان کے درپئے آزار ہوگئے خود ان کے والد کو بھی اس طرح علی الاعلان شرک و بدعت کی تردید ناپسند ہوئی لیکن حضرت شیخ الاسلام اپنے والد کے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی اعلائے کلمۃ الحق کی راہ میں اٹھایا ہوا قدم پیچھے نہ ہٹا سکے۔ البتہ دعوت و تبلیغ کا سلسلہ دھیمی رفتار سے چلتا رہا۔ رکا نہیں۔ پھر بھی علاقہ نجد کے مشہور شہروں جیسے عُیینہ۔ درعیہ۔ حُریملا ریاض وغیرہ میں حضرت شیخ الاسلام کی شہرت پھیل گئی اور دعوت و تبلیغ اعلائے کلمۃ الحق پھیلنے پھولنے لگی۔ حریملا جہاں حضرت شیخ الاسلام مقیم تھے وہاں کے کچھ با اثر لوگ حضرت شیخ کی تعلیم سے متاثر ہوکر ان کی تحریک کے پُرجوش معاون بن گئے اور وہ جگہ جگہ جاکر شیخ کی تعلیمات پھیلانے لگے اس طرح حضرت شیخ الاسلام کی دعوت و تبلیغ آہستہ آہستہ نجد میں پھیلتی چلی گئی۔

۱۱۵۳ھ میں ان کے والد شیخ عبدالوہاب کا انتقال ہوگیا تو اب حضرت شیخ الاسلام کو کوئی رکاوٹ نہیں رہی اس لئے یہاں سے ان کی تبلیغ میں گرمی پیدا ہوئی۔

ہجرت اولیٰ اور عیینہ

یہ بھی قدرت کا ایک عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح صاحب اسوۂ حسنہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ و اشاعت دین کی پاداش میں جملہ مصائب سہنے کے بعد وطن سے مہاجرت بھی اختیار کرنی پڑی اسی طرح اس عاشق سنت کو بھی اس سنت کی پیروی نصیب ہوئی۔ شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ ایک طرف تو ارباب شرک و بدعت حضرت شیخ الاسلام کے مخالف تھے تو دوسری طرف حُریملا میں دو مختلف قبیلے سرداری کے لئے باہم دست و گریبان تھے۔ اُن میں ایک قبیلہ جس کے پاس غلاموں کی ایک بڑی جماعت تھی جن کو حمیان کہا جاتا ہے یہ غلاموں کی جماعت گویا ایک بے قاعدہ فوج کی حیثیت اختیار کر گئی تھی یہ غلام شہر میں جاکر شر و فساد لوٹ مار ظلم و جور و غنڈہ گردی کرتے پھرتے تھے جب حضرت شیخ الاسلام کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے انؑ حرکات سے باز رکھنے کی کوشش کی جس پر وہ مشتعل ہوگئے اور ایک شب حضرت شیخ الاسلام کو قتل کرنے کی نیت سے دیوار پھاند کر گھر میں داخل ہوئے لیکن حضرت ممدوح کی خدمت میں اس وقت بعض شاگرد اور دیگر لوگ موجود تھے جنھوں نے ان غلاموں کو پکڑ لیا۔ اور بقیۃ السیف ڈر کر بھاگ نکلے[1]۔ جب حالت یہاں تک پہونچ گئی تو حضرت شیخ الاسلام نے حُریملا کو چھوڑ دینا ہی مناسب سمجھا۔ چوں کہ حضرت شیخ الاسلام کا منشا اسلام کو قرون اولیٰ کے اسلام کی شان میں دیکھنا تھا اس کے لئے ضروری تھا کہ پوری قوم پورا ملک ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو اس واسطے ایک ایسا مقام زیر غور تھا جو کسی مقامی حاکم کے زیر نگین ہو، اور وہ حاکم اولو العزم بلند خیال بھی ہو ان حالات کے تحت حضرت شیخ الاسلام نے عُیینہ کو منتخب

---

[1] عنوان المجد مطبوعہ مطبع سلفیہ مکہ معظمہ۔ ص۹ تاریخ النجد امین الریحانی صفحہ ۲۷ مطبع علمیہ بیروت۔

فرمایا جہاں کا حاکم عثمان بن معمر شیخ الاسلام کی دعوت حق سے متاثر ہو چکا تھا۔ اس لئے حضرت شیخ الاسلام نے ۱۱۵۷ھ مطابق ۱۷۴۴ء میں عیینہ کو ہجرت فرمائی۔ امیر عیینہ نے استقبال کیا یہاں شیخ الاسلام نے امیر کی بہن اور زادی جوہرہ بنت عبداللہ بن معمر سے نکاح فرمایا جس سے رشتہ دارانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ حضرت شیخ الاسلام نے عثمان بن معمر کو یقین دلایا کہ اگر تم اعلائے کلمۃ الحق پر کربستہ ہو جاؤ تو مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ابھر دے گا اور تم کو سارے نجد پر غالب کر دے گا اور تمام اہل نجد تمہارے زیر حکم ہوں گے۔

غرض کہ عیینہ پہونچ کر حضرت شیخ الاسلام کو ذاتی اثر و رسوخ کے علاوہ ایک حکومت کی تائید بھی حاصل ہو گئی اور تبلیغ کے راستہ میں اب کوئی خاص مشکل حائل نہ رہی اور بڑی حد تک تیزی آگئی۔ یہاں سے حضرت شیخ الاسلام نے عملی کام کا آغاز فرمایا۔ اس علاقہ میں درخت کی جو پوجا ہوتی تھی اس کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا۔ اور مقام جبیلہ میں زید بن خطاب کی قبر پر بڑا شاندار گنبد بنا دیا گیا تھا اس کو مسمار کر کے زمین کے برابر کر دیا اس گنبد کی مسماری اور انہدام کا واقعہ عنوان المجد میں حسب ذیل بیان کیا گیا ہے وہ خالی از دلچسپی نہیں اس لئے اس کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے۔

"ایک دن حضرت شیخ الاسلام نے امیر عیینہ عثمان بن معمر سے فرمایا کہ اب ہم اس قبر کو جس کی بنیاد باطل پر رکھی گئی ہے منہدم کرنا چاہتے ہیں لیکن اہل جبیلہ کہیں مزاحم نہ ہوں اس لئے آپ ہمارے ہمراہ چلیں تاکہ اس کو مسمار کیا جا سکے اس پر عثمان بن معمر حاکم عیینہ نے چھ سو سواروں کا دستہ ساتھ لے کر شیخ الاسلام کے ساتھ کر دیا جب اہل جبیلہ کو معلوم ہوا کہ قبر منہدم کیا جانے والا ہے تو وہ قوت کے ساتھ روکنے کی تیاری کرنے لگے لیکن موحدین کی قوت کو کافی دیکھ کر ہٹ گئے۔ عثمان نے کہا کہ میرے آدمی قبر کے انہدام سے خائف[1] ہیں تو حضرت شیخ الاسلام نے فاس (ہتھوڑا یا سبل) خود اپنے ہاتھ میں لے کر قبر کو گرانا شروع کیا اور تھوڑی ہی دیر میں گنبد کو زمین کے برابر کر کے کامیاب واپس ہوئے۔ اس واقعہ سے اطراف و اکناف کے جہلا میں خوف و ہراس کی ایک لہر دوڑ گئی اور وہ رات بھر بڑی بے تابی سے انتظار کرتے رہے کہ دیکھئے اس جسارت کی پاداش میں جو شیخ الاسلام نے حضرت زید بن خطاب کی مرقد کے ساتھ کیا ہے اُن پر کیا عذاب الٰہی نازل ہوتا ہے لیکن صبح ہو گئی اور کوئی عذاب الٰہی یا حضرت زید بن خطاب کی طرف سے کوئی سزا نہ ملی تو لوگ نہ صرف بہت مایوس ہوئے بلکہ ایک بڑی تعداد تازگی ایمان کے ساتھ جماعت اہل حق میں شامل ہو گئی۔"

یہ اور اسی طرح دیگر بدعات کے اڈے اسی زمانہ میں منہدم کر دیئے گئے بلدۃ الفدا کے اس پرانے درخت کو بھی جڑ مول سے قطع کرا دیا جس سے مایوس الاولاد عورتیں ہمکنار ہوتی تھیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس درخت کی جس کا ذکر اوپر ہوا ہے کوئی شکل تقدس کی معلوم نہیں ہوتی کہ کیوں اس کو مقدس مان لیا گیا تھا ممکن ہے کہ اس کے سایہ میں کوئی نام نہاد بزرگ آرام لئے ہوں یا کوئی اور وجہ ہو۔ لیکن اس درخت کے تقدس کا کیا ٹھکانہ جس کے نیچے حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے آرام فرمایا جس پر ٹیک لے کر آپ نے اصحاب سے وہ بیعت لی جس کا نام بیعت رضوان ہے جس کا ذکر خود قرآن مجید میں ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ لیکن جب اس کے ساتھ مسلمان غیر شرعی تعظیم اور خلاف احکام اسلام امور کرنے لگے یا ایسا کرنے کا احتمال پیدا ہو گیا تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس درخت کو بھی کاٹ کر پھینک دیا۔ لیکن حیرت ہے کہ آج تک ان کو کوئی وہابی کہنے والا پیدا نہیں ہوا۔ جو کام حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا وہی حضرت شیخ الاسلام نے بھی کیا۔

یہ صرف چند امور کا اجمالی ذکر تھا لیکن نجد کی حالت یہ تھی کہ قدم قدم پر مشکلات، ہر جگہ رکاوٹیں کیا عالم کیا جاہل سب کے سب بدعات و مشرکانہ رسوم میں گرفتار تھے بعض بعض تو اپنے شرک و جہالت پر اس قدر پختہ تھے کہ بلا مبالغہ ان کی اصلاح کی کوشش کرنا شیطان کو راہ راست

---

[1] جس طرح فتح طائف کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ وہ بت خانہ جس کی پرستش اہل طائف کرتے تھے منہدم کر دیا جائے تو بوجہ خوف طائف کے نومسلم اسکے لئے آمادہ نہیں ہوتے تھے اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ سے راسخ العقیدہ مسلمان روانہ فرمائے جنھوں نے اس بتخانہ کو منہدم کر دیا تھا۔

پر لانے کی کوشش کے برابر تھا لیکن آفریں ہے حضرت شیخ الاسلام کی ہمت پر کہ ان کے عزم و استقلال میں ذرّہ بھر بھی فرق نہیں آیا اور وہ طاقت و مستعدی سے اپنے مشن کی تکمیل میں لگے رہے۔

عیینہ میں شیخ الاسلام نے اصلاح کا دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ امیر عثمان بن معمر کو پابند کیا کہ وہ نماز باجماعت کا احیا کریں اور خود امیر امام جماعت ہو۔ تارکین صلوٰۃ اور دیگر امور شرعیہ کی خلاف ورزی کی صورت میں حد شرعی کا نفاذ کیا جائے۔ امیر عیینہ کی حکومت میں طرح طرح کے ٹیکس وصول ہوتے تھے حضرت شیخ الاسلام نے ان سب کو یک قلم موقوف فرما کر صرف زکوٰۃ اور خمس کا حسب شریعت اسلامیہ اجرا فرمایا۔ یہ سب امور امیر عثمان بن معمر کو سپرد فرما کر حضرت شیخ الاسلام نے علمی خدمت اور دعوت و ارشاد کا کام جاری رکھا۔ ان کی پہلی کتاب موسوم بہ کتاب التوحید اسی زمانہ کی تصنیف کی جاتی ہے۔ جس کا ذکر آئندہ باب تصانیف میں آئے گا۔ اس کے علاوہ بعض رسائل اور چند طویل او رمدلل خطوط بھی جو آگے چل کر رسالہ جات کی شکل میں جمع ہو گئے وہ بھی اسی زمانہ میں لکھے گئے تھے۔

عیینہ سے ہجرت یا ہجرت ثانیہ

عیینہ میں حضرت شیخ الاسلام اسی طرح اپنے تبلیغی کام میں مصروف تھے اور کامیابی بھی ہو رہی تھی کہ یہاں ایک واقعہ پیش آگیا جس کی صراحت ابن غنام نے روضۃ الافکار و الافہام میں کی ہے اس کا اختصاراً مطلب درج ذیل ہے۔

ایک دن ایک شادی شدہ عورت نے جو زنا کی مرتکب ہوئی تھی حضرت شیخ الاسلام کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے گناہ کا اقرار کیا۔ حضرت شیخ الاسلام کے بار بار جرح کرنے پر ہر بار اعتراف کرتی رہی آخر کار حضرت شیخ الاسلام نے حسب احکام شرع شریف رجم کا حکم دیا۔ امیر عیینہ عثمان بن معمر نے ____________ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ شیخ کے اس حکم کی تعمیل کی، پہلا پتھر خود عثمان بن معمر نے مار کر حد رجم کی افتتاح کی۔

اس واقعہ نے اُن حلقوں میں جو شراب خوری زنا اور دیگر منہیات شرعیہ کے خوگر تھے پریشانی پھیلادی اور انھوں نے حضرت شیخ الاسلام کے خلاف جوڑ توڑ شروع کر دی ان میں کچھ لوگ سلیمان بن محمد حاکم احسار و قطیف کے پاس پہونچے اور اس کو آمادہ کیا کہ وہ حضرت شیخ الاسلام کے خلاف موثر قدم اٹھائیں۔ چوں کہ سلیمان عیاش طبع اور آوارہ مزاج شخص تھا اس نے بھی خیال کیا کہ اجراء احکام شرع اس کی بڑھتی ہوئی آزادی اور رنگین طبعی کی راہ میں رکاوٹ ہوگی اس نے فوری طور پر اس کا انسداد ضروری سمجھا اور عثمان بن معمر کے پاس اپنا سفیر اس پیام کے ساتھ روانہ کیا کہ حضرت شیخ الاسلام کو یا تو قتل کر دو یا اپنے علاقہ سے نکال دو ورنہ تم کو جو خراج ہماری جانب سے بارہ سو اشرفی ادا کیا جاتا ہے وہ بند کر دیا جائے گا۔

یہ اطلاع پہونچنے کے بعد عثمان بن معمر تشویش میں پڑ گیا ایک طرف تو اس کو حضرت شیخ کی حمایت کا وعدہ یاد تھا اور یہ عرب کی خصوصیات میں ہے کہ وہ اپنے وعدہ کو بہر حال ایفا کرنا ضروری تصور کرتے ہیں دوسری جانب طمع دنیا دامن کشاں تھی کہ یکدم بارہ سو اشرفی سے ہاتھ دھونا پڑ رہا ہے۔ غرض کہ حاکم عیینہ عجب مخمصہ میں پڑ گیا اور آخر کار اس پر طمع دنیا غالب آئی اور اس نے سلیمان بن محمد کی سفارت کا حال حضرت شیخ الاسلام پر ظاہر کر کے کہا کہ سلیمان بن محمد نے آپ کو قتل کرنے کی نسبت حکم دیا ہے لیکن میری مروت اس کی مقتضی نہیں کہ میں آپ کی حمایت کا وعدہ کر کے آپ کو اپنے گھر میں قتل کر دوں اس لئے آپ جس قدر جلد ممکن ہو میرے علاقہ سے کہیں اور تشریف لے جائیں۔

حضرت شیخ الاسلام نے عثمان بن معمر کو تسلی دی اور فرمایا کہ دیکھو عثمان میں جس چیز کی طرف لوگوں کو بلا رہا ہوں وہ کوئی

نئی چیز نہیں ہے یہ وہی کلمۂ لا الٰہ الا اللہ ہے جس کی تعلیم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی میں ارکان اسلام کی پابندی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سوا کوئی دوسری تعلیم نہیں دے رہا ہوں۔ اگر تم اسلام کا دامن مضبوطی سے پکڑ لو تو تم کو اللہ تعالےٰ تمہارے دشمنوں پر غالب کرے گا۔ تم کو سلیمان بن محمدؒ سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں لیکن عثمان بن محمد پر اس گفتگو کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اس نے اپنی فوج کے ایک سوار کو جس کا نام فرید الظفری تھا حکم دیا کہ حضرت شیخ الاسلام کو حدود عیینہ سے باہر نکال دے اور خفیہ طور پر اس کو یہ حکم بھی دیا کہ جوں ہی عیینہ کے حدود سے حضرت شیخ الاسلام باہر پہونچیں انھیں ..... قتل کر دیا جائے۔ اس خفیہ حکم کا ذکر صرف کتاب عنوان المجد میں ہے۔ بقیہ دیگر کتب سوانح اس باب میں ساکت ہیں بہرحال ٹھیک دوپہر کے وقت ریگزار عرب کی تپتی دھوپ میں تن تنہا حضرت شیخ الاسلام ہاتھ میں صرف ایک مروحہ (پنکھا) لئے ہوئے پا پیادہ عیینہ سے نکلے اور آپ کے پیچھے فرید الظفری گھوڑے پر سوار تھا۔ حضرت شیخ الاسلام کی زبان مبارک پر یہ آیت مبارکہ تھی جس کا ورد فرماتے ہوئے راستہ طے فرما رہے تھے "وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ" یہ حضرت شیخ الاسلام کی دوسری ہجرت ہے اور اسی ہجرت کے بعد سے حضرت شیخ الاسلام کی تمام کامیابیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ غرض کہ راستہ میں فرید نے حضرت شیخ الاسلام پر وار کرنا چاہا تو خود اسی کا بیان ہے کہ کسی غیبی طاقت نے اس کا ہاتھ روک لیا اور اس پر کچھ ایسا رعب و خشیت طاری ہوئی کہ وہ وہاں سے بھاگ کر عیینہ پہونچ گیا کیوں کہ اس کو خود اپنی زندگی خطرہ میں محسوس ہونے لگی۔ عنوان المجد فی تاریخ النجد[۱] میں یہ واقعہ تفصیل سے درج ہے جس نے ہم نے اختصاراً درج کیا ہے۔

یہاں ہم ناظرین کی توجہ ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس واقعہ کی جانب مبذول کرانا چاہتے ہیں جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ معظمہ سے نکل جانے کی خبر سن کر مشرکین مکہ نے ایک اعلان جاری کیا کہ جو کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کر کے لائے اس کو ایک سو سرخ اونٹ انعام میں دئے جائیں گے۔ انعام کی لالچ میں کئی لوگ تلاش میں روانہ ہوئے۔ اتفاقاً سراقہ بن مالک حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچنے میں کامیاب ہوا لیکن جب قریب پہونچا تو اس کے گھوڑے کے پاؤں ریت میں دھنس گئے۔ اس نے عاجزانہ دعا کی التماس کی آپ نے دعا فرمائی تو فوراً رہائی میسر آگئی۔ رہا ہوتے ہی اس کی نیت بدلی اور وہ گرفتار کرنے کی تدبیر کرنے لگا لیکن جونہی اس نے ایسا ارادہ کیا پھر اس کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے اس طرح اس نے تین بار توبہ شکنی کی اور ہر بار ایسا ہی ہوتا رہا تیسری بار اس نے صادق دل سے توبہ کیا اور یہ وعدہ کیا کہ جو بھی اس طرف آتا ہوا ملے گا اس کو پلٹا کر لے جائیگا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ یہ امر واقعہ ہے۔ جو بھی خدا کی راہ میں اپنے کو سپرد کر دیتا ہے تو خدا تعالےٰ خود اس کی حفاظت فرماتا ہے۔ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

درعیہ میں ورود

غرض کہ عیینہ سے حضرت شیخ الاسلام درعیہ کے ارادہ سے روانہ ہوئے تھے اور اپنے شاگرد اور معتقد احمد بن سویلم کے گھر مہمان ہوئے ایسے مقدس مہمان کو پا کر وہ ایک طرف تو خوش تھا دوسری جانب اس کو تشویش بھی تھی کہ دیکھئے امیر درعیہ محمدؒ بن سعود کیا کہتے ہیں کیوں کہ سلیمان بن محمد امیر احسار و قطیف نے آپ کے قتل کا حکم دے رکھا ہے اسی خوف سے عثمان بن معمر نے آپ کو اپنے علاقہ سے نکال دیا ہے معلوم نہیں کہ یہاں کس طرح گذرے۔ امیر درعیہ محمدؒ بن سعود کا منشار ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہوا۔ شیخ الاسلام نے یہ معلوم کر کے احمد بن سویلم کو تسکین دی کہ فکر نہ کرو عنقریب اللہ تعالےٰ مجھ کو اور تم کو کشادگی اور نجات عطا فرمائے گا۔

امیر محمد بن سعود کی بیعت

درعیہ میں احمد بن سویلم کا گھر مرکز دعوت و تبلیغ بن گیا۔ اور حضرت شیخ الاسلام نے یہاں درس و تدریس کا آغاز فرمایا۔ لوگ امیر کے خوف سے چھپ چھپ کر آتے اور شیخ کے درس و ارشاد سے مستفید ہوتے لیکن صورت کوئی اطمینان بخش نہیں تھی ہر وقت کھٹکا تھا کہ سلیمان بن محمد یا عثمان بن معمر کوئی سفارت یہاں بھی نہ روانہ کرے۔ ادھر حضرت شیخ الاسلام اس فکر میں تھے کہ کسی طرح امیر درعیہ سے سلسلہ جنبانی کریں۔ اور ان کو اس تحریک احیاء سنت کا معاون بنایا جائے۔ اتفاق سے امیر محمد بن سعود کے دو بھائی مشاری و ثنیان حضرت شیخ کے حلقہ درس میں شامل ہونے کے لئے آئے حضرت شیخ الاسلام نے ان سے اپنا منشاء ظاہر فرمایا اس پر انھوں نے امیر کی حرم محترم موضیٰ بنت ابی وہطان کو آمادہ کیا کہ وہ امیر سے اس خصوص میں گفتگو کرے اور ان کو اس تحریک احیائے دین اعلاء کلمۃ الحق کے معاون بننے پر آمادہ و راضی کرے۔ چوں کہ حضرت شیخ الاسلام کے علم و فضل کی شہرت قریب قریب ساری نجد میں پھیل چکی تھی اور امیر درعیہ کی حرم محترمہ بھی ان سے ناواقف نہ تھیں بلکہ ایک حد تک وہ حضرت شیخ الاسلام کی غائبانہ معتقد بھی تھیں اس لئے اس نے فوراً امیر کو اس تحریک کا سرپرست بنانے کا تہیہ کر لیا۔ بالآخر ایک دن موقعہ پاکر اس نے امیر سے کہا کہ "اللہ تعالےٰ نے یہ نعمت گھر بیٹھے تمہارے پاس روانہ فرمائی ہے اس کا شکر ادا کرو اٹھو اور فوراً اس تحریک کی مدد کرو تاکہ تمہاری دنیا اور عاقبت دونوں سنور جائیں" امیر محمد بن سعود باوجود امیر ہونے کے نہایت متقی اور پارسا بھی تھے اور اپنے حسن اخلاق اور کریم النفسی میں بھی سارے نجد میں شہرت رکھتے تھے۔ اپنی بیوی کی گفتگو سے بہت متاثر ہوئے اور حضرت شیخ الاسلام کو طلب کر کے ملنا چاہا لیکن اپنے بھائیوں اور دیگر معتقدین کے اصرار پر مجبور ہو کر خود ہی حضرت شیخ الاسلام کے مکان پر پہونچے اور ملاقات کی۔ اخلاق و عقیدت سے پیش آئے حضرت شیخ الاسلام نے امیر کے سامنے مختصر سی تقریر فرمائی اور بتلایا کہ اہل نجد جملہ برائیوں میں جو زمانہ جاہلیت میں عربوں میں رائج تھیں مبتلا ہو گئے ہیں ان کی اصلاح و نیز اعلائے کلمۃ الحق امر بالمعروف نہی عن المنکر جہاد کی فضیلت بیان فرما کر کہا کہ آپ کی تائید و نصرت اور آپ کے ہاتھوں سے احیاء سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہو تو بہت اچھا ہے حضرت شیخ الاسلام کی تقریر سے امیر بہت متاثر ہوئے اور بے ساختہ پکار اٹھے کہ اے شیخ یہ تو بلاشبہ اللہ اور اس کے رسول کا بتلایا ہوا صحیح راستہ ہے۔ میں آپ کی اطاعت اور مخالفین توحید سے جہاد کے لئے تیار ہوں۔

غرض کہ امیر محمدؒ بن سعود حضرت شیخ الاسلام کے معاون ہو گئے اور حضرت شیخ الاسلام سے فرمایا کہ اگر اللہ تعالےٰ نے ہم کو فتح دی تو آپ ہمارا ساتھ نہ چھوڑیں یہ شرط بالکل ایسی ہی تھی کہ جس طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں انصار مدینہ نے پیش کی تھی۔ اتفاق ملاحظہ ہو کہ اس عاشق سنت نبوی کو بھی قدم قدم پہ اتباع سنت نبوی کے مواقع نصیب ہو رہے ہیں" ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ اس پر شیخ الاسلام نے ارشاد فرمایا کہ بسر و چشم مجھے یہ شرط منظور ہے۔ اور امیر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا کہ آج سے میرا خون تمہارا خون اور میری تباہی تمہاری تباہی ہے۔

دوسری شرط امیر نے یہ پیش کی کہ اہل درعیہ کی زراعت پر میں نے مال گذاری کا محصول عائد کر رکھا ہے جس سے حکومت درعیہ کو کافی آمدنی ہوتی ہے۔ اس محصول کو آپ منسوخ نہ فرمادیں اس شرط پر شیخ نے فرمایا کہ خیر آگے دیکھا جائے گا مستقبل قریب میں اللہ تعالےٰ آپ کو فتوحات اور غنایم سے اس قدر سرفراز فرمائے گا کہ اس حقیر آمدنی کا خیال بھی آپ کے دل میں نہ آئے گا۔

اس طرح یہ شرائط طے پانے کے بعد حضرت شیخ الاسلام نے درعیہ میں علی الاعلان امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض ادا کرنا شروع کر دیا امیر درعیہ کا بیعت کرنا ہی تھا کہ اس کی شہرت سارے اقطاع نجد میں آناً فاناً ہو گئی اور لوگ جوق در جوق حصول علم و تجدید ایمان و اصلاح اعمال کے لئے

درعیہ میں آنے لگے۔ امین الریحانی مصنف کتاب تاریخ نجد نے حضرت شیخ الاسلام کے ورود درعیہ کے بعد درعیہ کی جو حالت ہو گئی تھی اس کا نقشہ بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے، وہ لکھتا ہے: "شیخ الاسلام کے تشریف آوری سے قبل شہر درعیہ بہت چھوٹا سا قصبہ تھا جس میں گنے چنے مکانات تھے اور اسباب رزق و معیشت بہت محدود تھے۔ زراعت بقدر ضرورت تجارت برائے نام اور صنعت و حرفت مفقود تھی لیکن حضرت شیخ کی تشریف آوری کے بعد جب کہ مختلف اقطاع عرب سے وفود و تلامذہ آنے لگے اور وہ وہیں بسنے لگے تو وہ حضرت شیخ الاسلام کی خدمت میں حاضر ہو کر تحصیل علم درس و تدریس کے ساتھ ساتھ اپنے فرصت کے وقت صنعت و تجارت میں مشغول رہتے اس طرح صرف بارہ سال ہی کے عرصہ میں درعیہ مملکت عرب کے بڑے بڑے شہروں میں شمار ہونے لگا۔ اقطاع عرب سے یمن۔ عمان۔ حجاز، عراق، و شام وغیرہ غرض ہر جگہ کے باشندے صناع دستکار وغیرہ شامل تھے۔

مورخ ابن بشر نے درعیہ کو سعود بن عبدالعزیز کے دور حکومت میں دیکھا تھا وہ اپنے مشاہدات اس طرح قلمبند کرتا ہے۔

"ایک دن درعیہ کے حسن منظر کی تعریف میں نے امیر کے روبرو کی، امیر نے ارشاد فرمایا کہ بلند جگہ سے شہر کا مشاہدہ کرو۔ میں اس وقت امیر سعود کے ایک محل میں تھا جو بہت عمدہ قصور شاہی میں سے تھا اور جس کا نام طریف تھا میں نے اس کے مشرقی جانب دیکھا تو سلسلہ مکانات تھے جس میں شیخ الاسلام کے اہل خاندان رہتے تھے اور اس کے مردانہ حصہ علیحدہ تھے اور زنانہ حصہ دوسری جانب، یہیں سلطان کا خزانہ بھی تھا جس میں سونا چاندی نایاب اور بیش قیمت ہتھیار تھے ایک جانب اونٹ اور بکریوں کے تھان تھے مکانات کے سلسلہ کے ختم ہونے پر بازار کا سلسلہ شروع ہوتا تھا جو محل سلطانی کے شرقی اور غربی جانب دور تک چلا گیا تھا جس میں کپڑے اور دیگر اقمشہ زیور ہتھیار غرض ہر قسم اور ہر ملک کی مصنوعات بغرض فروخت بھری پڑی تھیں۔"

یہ سب حضرت شیخ الاسلام کے قدوم کی برکت تھی جو امیر درعیہ اور اہل درعیہ کو نصیب ہوئی۔ اب جب کہ ہر طرح کی فراغت اور اطمینان نصیب ہوا تو حضرت شیخ الاسلام تبلیغ و اشاعت دین میں زور شور سے مصروف ہو گئے۔ یوں تو حضرت شیخ الاسلام کے شاگردوں اور معتقدوں کی فہرست بہت طویل ہے لیکن ان میں جو ممتاز ہستیاں تھیں ان کے ناموں کی فہرست مصنف روضۃ الافکار و الافہام نے یہ دی ہے۔ امرا میں امیر محمدؐ بن سعود اور ان کے ہر سہ برادران غرمان۔ مشاری۔ و ثنیان۔ اہل علم میں احمد بن سویلم عیسیٰ بن قاسم۔ محمد الحزیمی۔ محمدؐ بن حسین عبداللہ بن مشیر حمد بن حسین یہ لوگ گویا سابقون الاولون کی تعریف میں داخل ہیں اسی لئے ان کی اولاد آج تک دربار سلطانی میں خاص اکرام و اعزاز کی مستحق ہے۔

شہر درعیہ کی جو حالت حضرت شیخ الاسلام کی تشریف آوری کے بعد ہو گی اور جس کا ہلکا سا خاکہ ہم نے اوپر حسب بیان امین الریحانی و ابن بشیر دیا ہے دیکھ کر امیر عیینہ عثمان بن معمر کی آنکھیں کھلیں اور وہ اپنے پچھلے طرز عمل پر از حد نادم و پشیمان ہو کر حضرت شیخ الاسلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور انتہائی خوشامد کے ساتھ معذرت خواہ ہوا اور واپس عیینہ چلنے کی درخواست کی۔ حضرت شیخ الاسلام نے جو خلق نبوی کا نمونہ اور فدائے اسوۂ حسنہ تھے اس کے تمام خطایا کو معاف فرماتے ہوئے عیینہ واپس چلنے کی نسبت جواب دیا کہ اس خصوص میں امیر محمدؐ بن سعود سے معاہدہ ہو چکا ہے۔ اس لئے اگر وہ اجازت دیں تو میں تمہارے ساتھ عیینہ چل سکتا ہوں ورنہ میں ان کا ساتھ از روئے معاہدہ کسی طرح نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ صاف جواب سن کر عثمان بن معمر خود امیر درعیہ محمد بن سعود کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضرت شیخ الاسلام کو عیینہ جانے کی اجازت دیں لیکن امیر محمد بن سعود اس نعمت غیر مترقبہ کو اپنے گھر سے کسی بھی قیمت پر علیحدہ کرنے کو تیار نہیں ہوئے بالآخر ابن معمر بے نیل و مرام واپس ہوا۔

چوں کہ حضرت شیخ الاسلام کی دعوت کا حلقہ روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا دور دور سے طالبان حق و شائقان علم دین جوق در جوق آنے لگے ان کے قیام و طعام کا انتظام حضرت شیخ ہی کو کرنا پڑتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آمدنی محدود و اخراجات زیادہ شیخ الاسلام ہمیشہ مقروض رہنے لگے۔ امیر عیینہ پہلے ہی سے معتقد تھا۔ درمیان میں سلیمان بن محمدؐ کی وجہ سے کچھ بگاڑ ہو گیا تھا لیکن بہت جلد وہ راہ راست پر آ گیا اور ۱۱۵۸ھ میں پھر

حضرت شیخ الاسلام کی خدمت میں حاضر ہوکر تجدید بیعت کی، اس کے بعد کے سال ۱۱۹۵ھ میں اہل حریملا نے بھی بیعت کی الغرض جو اُمرا حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوکر بیعت کرتے وہ اپنے حدودِ حکومت کا خمس و زکوٰۃ کی آمدنی حضرت شیخ کی خدمت میں پیش کرتے اور وہ بے دریغ حسب سنت رسول اللہ اسی وقت راہِ خدا میں صرف فرما دیتے حضرت کی اس کشادہ دستی اور دریا دلی کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ آتا وہ اسی وقت راہ مولا میں لٹا دیتے اپنے پاس ایک حبہ بھی نہیں رکھتے اس پر بھی کمی کا تکملہ قرض سے کیا جاتا یہاں تک کہ ۱۱۸۷ھ میں جب شاہان درعیہ نے ریاض فتح کیا تو اس وقت حضرت شیخ الاسلام کے ذمہ چالیس ہزار روپے قرض واجب الادا تھا جو حسب بیان فلبی مصنف **Arabia** ریاض کے غنیمت سے ادا کیا گیا۔ فتح ریاض کے بعد حضرت شیخ الاسلام نے سیاسیات سے بالکل کنارہ کشی اختیار فرمائی اور امیر عبدالعزیز بن محمد بن سعود کو جو ۱۱۷۹ھ میں اپنے والد محمد بن سعود کے انتقال کے بعد امیر درعیہ ہوئے تھے بیت المال کا انتظام مکمل طور پر سپرد فرما دیا اور اپنی پوری توجہ دینی تعلیم اور تصنیف و تالیف کی طرف مبذول فرمائی۔

اب تک شیخ کی توجہ کا مرکز صرف نجد کا علاقہ ہی تھا جب یہ راہ راست پر آچکا تو حضرت شیخ الاسلام نے دیگر بلاد عرب کی طرف بھی توجہ فرمائی حجاز یمن شام عراق وغیرہ کے علماء امراء شیوخ و قضاۃ کو تبلیغی خطوط لکھے اور ان کو احیائے دین و اتباع سنت کی طرف توجہ دلائی لیکن اس دور ضلالت وجہالت میں بہت کم لوگ حضرت شیخ الاسلام کی دعوت پر لبیک کہتے زیادہ تر لوگ ان کی دعوت کی تضحیک و تحقیر پر آمادہ ہو گئے۔ اور جواب میں ان پر ایسی ایسی تہمتیں اور بہتان تراشے جن سے حضرت شیخ الاسلامؒ کا دامن بالکل پاک تھا۔ ذیل میں حضرت شیخ الاسلام کے ایک خط کا ترجمہ دیا جاتا ہے جو حضرت ممدوح نے عبدالرحمٰن بن عبداللہ سویدی کے نام لکھا ہے جو اس عہد کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے حضرت شیخ الاسلام کی نسبت طرح طرح کی افواہیں سن کر جو ان کے مخالفین نے مشہور کر رکھی تھیں خود حضرت شیخ الاسلام سے حقیقت حال دریافت فرمائی تھی۔ ہم کو اس امر کا افسوس ہے کہ حضرت عبدالرحمان بن عبداللہ السویدی کا خط دستیاب نہ ہو سکا کسی بھی تاریخی کتاب میں اس خط کی نقل درج نہیں ہے صرف حضرت شیخ الاسلام نے اس خط کا اور اسی قبیل کے دوسرے استفسارات کا جواب دیا ہے وہ یا تو رسائل کی شکل میں یکجا کر دیئے گئے ہیں یا کسی تاریخی کتاب میں ان کی نقل درج ہے چنانچہ مندرجہ ذیل خط کتاب عنوان المجد سے ترجمہ کرکے درج کیا گیا ہے۔

• الحمد للہ میں متبع سلف ہوں نہ کہ متبدع۔ میرا دین وہی ہے جو اہل سنت والجماعت یعنی سلف صالح کا تھا یا ائمہ اربعہ اور ان کے مقتدیوں کا۔ میں نے لوگوں کو توحید کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اولیاء و صلحاء مدفون کو پکارنے اور ان سے التجا کرنے کو منع ضرور کیا ہے قبروں پر نذر و نیاز چڑھانے اور سجدہ و طواف کرنے سے بے شک روکا ہے کیوں کہ یہ سب اللہ کے حقوق ہیں جو کسی ولی کو حاصل نہیں، نہ نبی کو، نہ فرشتہ مقرب کو، یہی وہ تعلیم ہے جو تمام انبیاء اول سے آخر تک دیتے رہے ہیں اور اسی پر اہل سنت والجماعت قائم ہیں۔ سب سے پہلے جس فرقہ نے اسلام میں شرک داخل کیا وہ روافض ہیں، جنھوں نے حضرت علی کو حل مشکلات پکارنا آغاز کیا۔

میں جس جگہ ہوں وہاں کے لوگ میری بات مانتے ہیں البتہ محض امراء کو یہ امر ناگوار ہے۔ میں نے اپنے معتقدین کو پابند کیا ہے کہ وہ نماز باجماعت پڑھیں زکوٰۃ وغیرہ جملہ فرائض بہ پابندی ادا کریں منہیات شرعی منکرات شراب، چوری، زنا، وغیرہ سے بچیں چوں کہ یہ باتیں ہر شخص کے پاس جو عقل سلیم رکھتا ہو پسندیدہ ہیں اس لئے اس پر تو وہ کچھ نہ کہہ سکے، لیکن میری توحید کی تعلیم کو انھوں نے عوام وجہلا کے سامنے غلط طریقہ پر پیش کیا اور طرح طرح کے بہتان و افتراء تراش کر جاہل طبقہ میں مجھے بدنام کرنے لگے۔ منجملہ ان میں سے ایک یہ بھی ہے جو آپ نے اپنے خط میں تحریر فرمایا ہے اور جس کا جواب آپ نے مجھ سے مانگا ہے کہ میں سوائے اپنے متبعین

کے سب کو کافر تصور کرتا ہوں۔ اور ان کے نکاحوں کو درست نہیں مانتا۔

مجھے حیرت ہے کہ کیوں کر کسی عقلمند آدمی کے دماغ میں یہ بات آسکتی ہے کہ کوئی مسلمان ایسا کہے گا اس قول سے اللہ کو شاہد گردان کر میں اپنی برأت کا اظہار کرتا ہوں۔ یہ تو وہی کہہ سکتا ہے جس کے دماغ میں فتور ہو، اہل غرض سے خدا پناہ میں رکھے۔

یہ اور ایسے ہی لوگوں نے مجھ پر تہمت لگائی ہے کہ میں یہ کہتا ہوں کہ اگر مجھ میں قدرت ہوتی تو میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار پاک کے اوپر جو گنبد بنایا گیا ہے اس کو منہدم کر دیتا۔ دلائل الخیرات کا جلا دینا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے سے منع کرنا بھی میری جانب منسوب کیا گیا ہے جو سراسر کذب و بہتان ہے۔ نہ میں نے ایسا کیا ہے اور نہ کہا ہے لیکن باوجود ان تمام تہمتوں افترا پردازیوں کے بھی کتاب وسنت پر ایمان رکھنے اور کتاب اللہ اور اسوۂ حسنہ پر ایمان رکھنے اور اس کی نصرت وحمایت کے سوا مسلمان کو چارہ نہیں یہ اللہ کا عہد ہے اور اس کو کسی طرح اور کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑا جا سکتا خواہ کوئی خوش ہو یا ناراض۔ تکفیر اہل قبلہ کی بابت جو آپ نے ذکر فرمایا ہے سو میں ضرور اس شخص کو کافر تصور کرتا ہوں جو جان بوجھ کر دین حق سے روگردان ہو جائے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن وتوہین کرے یا اُن کی تعلیمات کی طرف آنے سے روکے یہی لوگ میرے نزدیک کافر ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ امت اسلامیہ کا بڑا حصّہ ایسا نہیں ہے۔

ہم نے جو مقام حاصل کیا ہے وہ اپنی جان وآبرو کی حفاظت کے لئے اگر کوئی ہم پر حملہ کرتا ہے تو جزاء سیئۃ سیئۃ بمثلہا کے مطابق ہم بھی اس سے جنگ وقتال جائز تصور کرتے ہیں "۔

حضرت شیخ الاسلام نے ایک دوسرے خط میں علماء قصیم کو بھی اسی قسم کا جواب تحریر فرمایا ہے جس میں ان تمام الزام وبہتانوں سے برأت کی ہے اس میں تحریر فرماتے ہیں۔

"میں اللہ تعالیٰ کو شاہد قرار دے کر کہتا ہوں کہ میرا وہی عقیدہ ہے جو فرقہ ناجیہ اہل سنت وجماعت کا ہے، یعنی اللہ ملائکہ کتب رسل بعث بعد الموت اور تقدیر پر ایمان رکھتا ہوں صفات الہیہ کو بلا تحریف وتعطیل کے اسی طرح مانتا ہوں جس طرح وہ کتاب اللہ و احادیث نبوی میں بیان کی گئی ہیں نہ ان کی نفی کرتا ہوں اور ان کے الفاظ میں تحریف اور نہ ان کو مخلوق کی صفات سے تشبیہ دیتا ہوں۔ قرآن شریف کی نسبت میرا عقیدہ یہ ہے کہ وہ کلام الٰہی غیر مخلوق ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے نیز میرا ایمان ہے کہ مشیت اور تقدیر سے عالم کی کوئی شے خارج نہیں ہے اور تمام امور بہ تدبیر الٰہی صادر ہوتے ہیں اور کوئی اس کی تقدیر کے حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ موت کے بعد جن امور کی مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے یعنی عذاب وثواب قبر اعادہ ارواح حشر ونشر جنت ودوزخ ملائکہ وغیرہ وغیرہ ان سب کو برحق تصور کرتا ہوں۔

نبی صلی اللہ کی شفاعت پر ایمان رکھتا ہوں کہ وہی اولین شافع ہوں گے اور اس کے منکر کو گمراہ اور بدعتی تصور کرتا ہوں لیکن یہ
باذن ورضائے الٰہی ہو گی اور کوئی شفاعت مشرکین کے کام نہ آئے گی۔

ت کا بھی قائل ہوں کہ مومنین کو اپنے رب کا دیدار آخرت میں نصیب ہوگا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین
تت تک مسلمان نہیں سمجھتا جب تک کہ وہ آپ کی رسالت پر ایمان نہ لائے۔ اور اس امت میں سب سے
ر کرتا ہوں آپ کے بعد حضرت عمر فاروق رضؓ کو ان کے بعد حضرت عثمان ذی النورین رضؓ بن عفان کو اور
رضوان اللہ علیہم اجمعین کو سمجھتا ہوں ان کے بعد اہل بدر اور پھر تمام صحابہ، جملہ اصحاب رسول اللہ
کے لئے دعائے مغفرت وبلندی مدارج کرتا ہوں۔ اولیاء اللہ کی کرامات کا اور ان کے

مکاشفات کا قائل ہوں لیکن معبودیت کے کسی حق کا ان کو مستحق نہیں گردانتا۔ نکوکار کے لئے امید نجات رکھتا ہوں اور بدکار کے لئے عذاب الٰہی سے ڈرتا ہوں لیکن قبل از وقت کسی مسلمان کے لئے جنتی یا دوزخی ہونے کا حکم نہیں لگاتا۔ میں کسی مسلمان کو کافر نہیں کہتا۔ نماز ہر امام کی اقتدا میں خواہ وہ نیک ہو یا بد جائز سمجھتا ہوں جہاد دجّال کے ورود تک بدستور فرض ہے ائمہ مسلمین کی اطاعت کو امت کے لئے واجب تصوّر کرتا ہوں تاوقتیکہ وہ کسی معصیت کا حکم نہ دیں۔

جو شخص خلافت کے منصب پر فائز ہو جائے خواہ وہ بزور شمشیر ہی کیوں نہ ہو اور لوگ اس کے ساتھ جمع ہو کر اس کی خلافت پر راضی ہو جائیں تو وہ خلیفہ ہے اور اس کی اطاعت واجب ہے۔ اہل بدعت سے قطع تعلق کر لیتا ہوں تا آں کہ وہ توبہ کر لیں۔

میں تصدیق۔ اقرار، وعمل، تینوں کو ایمان کا جزو مانتا ہوں اور اس میں اطاعت سے زیادتی اور معصیت سے کمی ہو جانے کا قائل ہوں ایمان کے بہتّر شعبے ہیں۔ جس میں سب سے بڑھ کر شہادت توحید اور سب سے کمتر راستہ سے تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا ہے اور حسب توجیہ شریعت مطہرہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو واجب سمجھتا ہوں۔

ابن الحیم نے مجھ پر جو جو الزام عائد کئے ہیں مثلاً یہ کہ میں مذاہب اربعہ کی کتابوں کو باطل تصور کرتا ہوں یا یہ کہ چھ صدیوں سے ملت اسلامیہ میرے خیال میں گمراہی میں رہی ہے یا میں مجتہد ہونے کا دعویٰ رکھتا ہوں، تقلید سے خارج ہوں اور اختلاف علماء کو رحمت کی جگہ لعنت کہتا ہوں یا جو لوگ ایسا ماضی سے توسل کریں ان کو یا مصنف قصیدہ بردہ کو کافر سمجھتا ہوں یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر اطہر والدین و اولاد کی قبروں پر بغرض زیارت جانے کو حرام جانتا ہوں، یا غیر اللہ کی قسم کھانے والوں یا ابن عربی یا ابن الفارضؒ کو کافر قرار دیتا ہوں، دلائل الخیرات جلا دیتا ہوں اور روض الریاحین کو روض شیاطین کہتا ہوں ان سب کا جواب صرف یہی کافی کہ سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ۔

اب رہی یہ بات کہ میں کہتا ہوں کہ کسی شخص کا اسلام کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ کلمہ طیبہ کے معنی نہ سمجھے یا تقرب لغیر اللہ کے لئے نذر ماننا کفر اور ذبیحہ حرام ہے یہ مسائل حق ہیں میں اس کا قائل ہوں اور ان پر کتاب وسنت سے پختہ دلائل رکھتا ہوں جن کو انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ کسی فرصت کے وقت شرح وبسط سے لکھوں گا۔"

یہ تو مخالفین اور ان کے جواب کی صراحت تھی لیکن چند سعید فطرت جنھوں نے دعوت شیخ پر لبیک کہا ان میں مضامین کے متبحر عالم محمد بن اسمٰعیل امیر سب سے پیش پیش تھے۔ انھوں نے حضرت شیخ الاسلام کی مدح میں ایک نہایت ہی فصیح وبلیغ قصیدہ تحریر فرمایا جو اہل علم واہل نظر میں بہت مقبول ہے جو درج ذیل ہے۔

سَلَامٌ عَلٰى نَجْدٍ وَمَنْ حَلَّ بِالنَّجْدِ وَاِنْ كَانَ تَسْلِيْمِيْ عَلَى الْبُعْدِ لَا يُجْدِيْ

اس قصیدہ میں حضرت امیر نے حضرت شیخ الاسلام کی مدح توحید کی تعلیم۔ بدعات کا رد اور اس کے ساتھ تصوّف کے عقیدہ وحدت الوجود کی خوب خوب دھجیاں اڑائی ہیں اس دعوت نامہ کے پہلے سے بھی خود امیر محمد بن اسمٰعیل تبلیغ توحید رد بدعت کی تعلیم میں مصروف تھے۔ ان کا رسالہ تطہیر الاعتقاد قابل دید ہے۔

یہاں ہم کو یک گونہ تعجب ہوتا ہے کہ ایک مسئلہ میں حضرت امیر اور حضرت شیخ الاسلام میں خفیف سا اختلاف ہے یعنی قبر پرستوں اور دیگر بت پرستوں میں حضرت امیر محمد بن اسمٰعیل کوئی فرق نہیں خیال فرماتے اور دونوں کو یکساں کافر خیال کرتے ہیں۔ لیکن حضرت شیخ الاسلام اس مسئلہ میں ذرا نرم ہیں یعنی حضرت شیخ الاسلام اتمام حجت شرط قرار دیتے ہیں اور بعد تبلیغ وافہام وتفہیم کے بھی اگر وہ اپنے شرک وقبر پرستی پر مصر رہیں تو پھر

ان کے کفر پر فتویٰ دیتے ہیں لیکن حیرت ہے کہ جہلاء اس قدر غالی کی نسبت تو کچھ نہیں کہتے اور حضرت شیخ الاسلام کی نسبت جو اس مسئلہ میں معتدل ہیں وہابی نام دیتے اور طرح طرح سے بدنام کرتے ہیں جہالت کے کرشمے بھی عجب ہوتے ہیں۔

اس تبلیغ عام کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ حضرت شیخ الاسلام کے بھائی سلیمان بن عبدالوہاب جو اپنے والد کے انتقال کے بعد ان کی جگہ حریملا کے قاضی ہو گئے تھے۔ ۱۱۹۰ ہجری میں تائب ہو کر حضرت شیخ الاسلام کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ یہ دعوت کے ابتدائی ایام میں حضرت شیخ الاسلام کے مخالف ہو گئے تھے۔ وجہ اختلاف مصنف روضۃ الافکار والافہام نے حسد بتلایا ہے ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو کیوں کہ حضرت شیخ الاسلام کیا بلحاظ علم و دانش کیا بلحاظ زہد و تقویٰ سارے خاندان میں کیا سارے نجد میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے اس لئے دیگر افراد خاندان کا جو علم وفضل اثر و رسوخ میں شیخ کے برابر نہ ہوں ان کا بغض و حسد رکھنا فطرت انسانی کے موافق ہے۔ ان سلیمان بن عبدالوہاب نے ایک رسالہ بھی جس کا نام صواعق الالٰہیہ تھا حضرت شیخ الاسلام کی تردید میں لکھا تھا جس کا ذکر دیگر مخالفین کی تصانیف کے ساتھ آئے گا۔

الغرض جب ان مسلسل کامیابیوں کے بعد اطراف و اکناف کی فضا موافق ہو گئی تو حضرت شیخ الاسلام نے اقطاع عرب کے مسلمانوں کو جمع کر کے ان کے سامنے اپنی دعوت پیش کی اور ایک موثر خطبہ دیا جس سے توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ اس کے بعد حضرت شیخ الاسلام نے جگہ جگہ مبلغین کو روانہ فرما کر سارے نجد کو توحید و اتباع سنت کی دعوت سے روشناس کرا دیا۔

جہاد کا آغاز

حضرت شیخ الاسلام کے درعیہ میں اقامت گزیں ہونے کے تیسرے سال سے یعنی ۱۱۵۹ ہجری میں دہام بن دواس امیر ریاض نے مخالفت شروع کی اور حسب سنت ابوجہل موحدین کی جماعت پر ظلم و سختی شروع کی جب اس کی چیرہ دستیاں حد سے بڑھ گئیں تو حضرت شیخ الاسلام کو بھی اس کی جانب توجہ کرنی پڑی۔ جس طرح آغاز اسلام کے وقت مشرکین مکہ مسلمانوں پر نت نئے مظالم ڈھاتے تھے اسی طرح دہام بن دواس نے بھی موحدین کو صرف اتباع شیخ کی وجہ سے ستانا اور برباد کرنا شروع کیا اب مجبوراً موحدین کو بھی اس کا انسداد کرنا ضروری ہو گیا۔ لہٰذا حضرت شیخ الاسلام نے بھی اپنے پیروں کو جہاد فی سبیل اللہ کی اجازت دے دی، اجازت کا ملنا ہی تھا کہ امیر محمد بن سعود اور ان کے بیٹوں اور بھائیوں اور دیگر متبعین شیخ نے باقاعدہ جہاد شروع کر دیا۔ نہ صرف حاکم ریاض بلکہ نجد کے علاقہ کی دوسری چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی اپنی ہستی خطرہ میں پا کر حضرت شیخ الاسلام اور جماعت موحدین کی مخالف ہو گئی تھیں۔ آخر کار ۱۱۸۷ھ میں ریاض مکمل طور پر فتح ہو گیا اور دہام بن دواس نے بھاگ کر جان بچائی تو اس وقت سے یہ چھوٹے چھوٹے علاقہ جات کے امراء لڑائی کی قوت اپنے میں نہ پا کر حضرت شیخ الاسلام کی زبانی مخالفت پر اتر آئے اور قسم قسم کی افترا پردازی اور بہتان تراشی کرنے لگے اس قسم کی تمام مخالفتوں کا ذکر آگے آئے گا۔

حضرت شیخ الاسلام کی وفات

۱۲۰۶ھ مطابق ۱۷۹۲ء عالم اسلامی کے لئے بڑا ہی رنج فزا سال تھا مسلسل ۵۰ سال کی دعوت و تبلیغ کے بعد حضرت شیخ الاسلام نے اپنی دعوت کی کامیابی خود اپنی مبارک آنکھوں سے دیکھ لی اور اپنے لگائے ہوئے چمن کو خوب پھلتا پھولتا دیکھ لیا اور حسب بیان روضۃ الافکار والافہام شوال ۱۲۰۶ مطابق جون ۱۷۹۲ء میں یہ آفتاب رشد و ہدایت پورے پچاس سال تک سارے عالم کو منور کر کے غروب ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ

متبعین و معتقدین اور شاگردوں کے لئے یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا لیکن مشیت ایزدی سے کیا چارہ۔ حضرت شیخ اسلام کے شاگرد ابن

غنام مصنف روضۃ الافکار و الافہام نے ایک پُر درد مرثیہ لکھا۔ مطلع ہے۔

الی اللہ فی کشف الشدائد نفزع ۔

ولیس الیٰ غیر المھیمن مفزع

شیخ الاسلام کی وفات سے ان کی دعوت و تبلیغ پر کچھ اثر نہیں پڑا۔ ان کے شاگرد اور اولاد نے آپ کی دعوت تبلیغ اور حلقہ درس کو جاری رکھا اور الحمد للہ آج تک جاری ہے۔

حضرت شیخ الاسلام کی مبارک حیات میں یہ بات بھی لائق ذکر ہے کہ حضرت شیخ نے دعوت و تبلیغ کا آغاز ایسے وقت میں کیا جب کہ نجد کا سارا علاقہ شرک و ضلالت کے قعر مذلت میں پڑا ہوا تھا دعوت کی ابتدائی ایام ہی سے مخالفتیں بھی شروع ہو گئی تھیں پچاس سال کی مسلسل محنت و کوشش سے شیخ کی دعوت و تبلیغ نے وہ کامیابی حاصل کی کہ ان کی وفات سے قبل سارے کا سارا نجد ان کے تبعین کے زیر نگین تھا سلطان محمد سعود اور ان کے انتقال کے بعد ان کے لائق فرزند سلطان عبدالعزیز بن محمد نہ صرف امور دینی میں حضرت شیخ الاسلام کو اپنا پیشوا تصور کرتے تھے بلکہ حکومت اور ریاست کے معاملات میں بھی ان کو اپنا بالادست مانتے تھے سارے کا سارا مال غنیمت ان کے قدموں پر لا کر ڈال دیتے تھے لیکن حضرت شیخ نے نہ کبھی ان کی امارت و ریاست میں دخل دیا اور نہ کوئی دنیوی حکومت و امامت کی خواہش کی، جب تک ضرورت رہی بیت المال کی نگرانی و انتظام کرتے رہے اور جب اطمینان ہو گیا کہ خود امیر موجب شریعت محمدیؐ عمل پیرا ہیں تو اس سے بھی الگ ہو گئے اور اپنے شغل درس و تدریس، دعوت و ارشاد میں منہمک ہو گئے اور آخر وقت تک اسی میں مصروف رہے۔

حضرت شیخ الاسلام کی اولاد و پس ماندگان

حضرت شیخ الاسلام کی ایک شادی بچپن میں بعمر ۱۲ سال ہوئی تھی۔ دوسرا نکاح حضرت شیخ نے جوہرہ بنت عبداللہ بن معمر سے بمقام عیینہ کیا تھا۔ اور تیسرا نکاح حضرت نے حسب بیان **H. G. Bridges** اس کی کتاب خلاصہ تاریخ وہابیہ **A Bief History of Wahabia** سلطان محمد بن سعود امیر درعیہ کی صاحبزادی سے فرمایا تھا۔ ان ہر سہ حرم سے حضرت شیخ کو بہت سی اولاد ہوئی لیکن اکثر کا انتقال حضرت شیخ الاسلام کے سامنے ہی ہو چکا تھا۔ حضرت شیخ الاسلام کے انتقال کے وقت حسب بیان اسلم جیراج پوری صاحب مصنف تاریخ نجد چار صاحبزادے موجود تھے جن کے نام حسین۔ عبداللہ علیؓ۔ ابراہیم ہیں لیکن مصنف تاریخ نجد امین الریحانی نے ایک نام حسن کا بھی اضافہ کیا ہے اور شجرہ نسب حسب ذیل دیا ہے۔ دیکھو تاریخ نجد امین ریحانی

شجرہ حضرت شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ
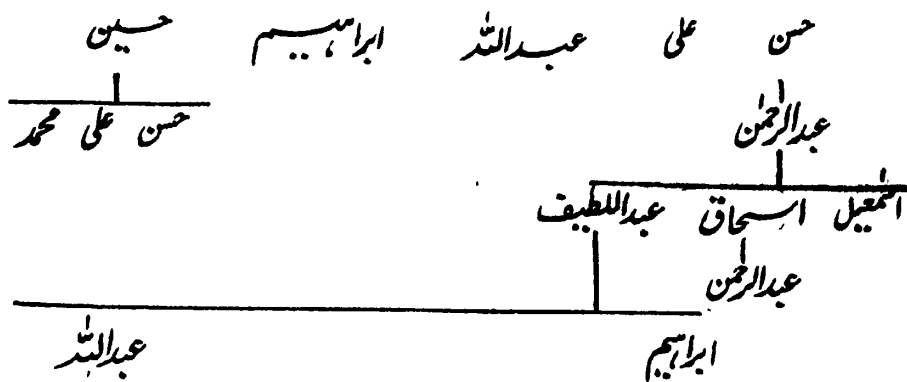
مولانا مسعود عالم صاحب ندوی نے بھی اپنی کتاب میں حضرت شیخ الاسلام کے چار صاجزادے ہی لکھے ہیں۔

ان میں حسین جو شیخ الاسلام کے بڑے فرزند تھے ان کے زمانہ حیات ہی میں درعیہ میں خدمت قضاء پر مامور تھے۔ شیخ کے جانشین تسلیم کیئے گئے اور درعیہ کی جامع مسجد کی امامت بھی انھیں کے سپرد کی گئی۔ ان کی وفات ۱۲۲۴ھ میں ہوئی۔ امین ریحانی نے ان کے تین بیٹوں کے نام لکھے ہیں حسن۔ علی و محمدؒ لیکن اسلم جیراج پوری نے ان کے علاوہ عبد الرحمٰن اور عبد الملک بھی ان کے صاجزادے بتلائے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ ان میں عبد الرحمٰن اپنے علم و عمل کے لحاظ سے بہت مشہور رہے اور امیر ترکی بن عبد اللہ کے عہد حکومت میں ریاض کے قاضی القضاۃ اور شیخ الاسلام کے عہدہ پر مامور رہے۔

دوسرے بیٹے عبد اللہ بھی عالم اور بعض کتب کے مصنف تھے۔ عبد الملک بھی حوطہ کے قاضی تھے اور حسین کے تمام صاجزادے عبد الرحمٰن حسین، عبد الملک وغیرہ سب اپنے چچازاد بھائی عبد الرحمٰن بن حسن بن محمدؒ بن عبد الوہاب کے شاگرد تھے۔

شیخ الاسلام کے دوسرے صاجزادے عبد الرحمٰن بن محمدؒ بن عبد الوہاب بھی بڑے پایہ کے عالم تھے اپنے بڑے بھائی حسین بن محمدؒ کی وفات کے بعد یہی ان کے جانشین سمجھے جاتے تھے۔ خود حسین بن محمد بھی ان کے علم و فضل سے متاثر تھے۔ ۱۲۱۸ھ میں سعود بن عبد العزیز کے فتح مکہ کے موقعہ پر یہ بھی سلطان کے ساتھ تھے۔ فتح مکہ کے موقعہ پر جو رسالہ سلطان نے جماعت اہل توحید کے عقائد سے متعلق و نیز ان افتراء پردازیوں کی تردید میں جو معاندین اہل توحید نے پھیلا رکھی تھیں، اہالیان مکہ میں تقسیم کروایا تھا اس کے مصنف یہی تھے۔ ۱۲۳۳ھ میں سقوط درعیہ کے وقت مصری افواج کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے ان کے دو بیٹے سلیمان اور علی بھی اسی وقت شہید ہو گئے۔ اپنے والد کی حیات ہی میں درعیہ اور فتح مکہ کے بعد مکہ معظمہ کے قاضی رہے۔ امیر عبد العزیز کی مجلس میں بخاری شریف کا درس ان کے سپرد تھا۔ حضرت شیخ الاسلام کی کتاب التوحید کی شرح بھی آپ نے تحریر فرمائی تھی جس کی نسبت مسعود عالم صاحب ندوی نے لکھا ہے کہ وہ نامکمل رہی لیکن اسلم جیراج پوری تحریر فرماتے ہیں کہ مکمل ہو کر ۱۳۱۱ھ میں مطبع انصاری دہلی میں چھپی تھی۔ بہر حال یہ مسلم ہے کہ یہ بہت سی کتب رسالہ جات کے مصنف تھے سقوط درعیہ کے وقت یہ شہید ہوتے تو اہل مصر نے ان کی لاش کے ساتھ پوری درندگی کا ثبوت دیا کہ لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے۔

علی بن شیخ الاسلام بھی اپنے علم و فضل کے اعتبار سے بہت ممتاز تھے ان کی خدمت میں بھی قضاء کا عہدہ پیش کیا گیا تھا لیکن انھوں نے علمی خدمت کو قضاء کی خدمت پر ترجیح دے کر حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کی سنت کی پیروی فرمائی اپنے نامور باپ کی مسند درس دارشاد کو رونق دی بہت سے لوگ ان سے تفسیر فقہ اور حدیث کا درس حاصل کرتے تھے ان کے ایک صاجزادے محمدؒ بڑے نامی عالم ہوئے ہیں۔

شیخ الاسلام کے چوتھے صاجزادے ابراہیم بھی علم و عمل میں اپنے بھائیوں سے کم نہیں تھے انھوں نے بھی کوئی خدمت حکومت کی قبول نہیں فرمائی درس و تدریس ان کا مشغلہ تھا۔

غرض کہ حضرت شیخ الاسلام کے جملہ صاجزادگان اور ان کی اولاد اور اولاد در اولاد سب کی سب نے علم و فضل میں اپنے نامور باپ دادا کی پوری پوری پیروی کی اور آج تک اس خاندان میں علم و عمل کی وہی خصوصیات باقی ہیں جو حضرت شیخ الاسلام اور ان کے فرزندان کے وقت تھیں چنانچہ اس وقت بھی ریاض۔ مکہ مکرمہ۔ مدینہ طیبہ اور جہاں جہاں سعودی حکومت قائم ہے وہاں کی قضاء۔ و منصب درس و افتاء اسی خاندان کے پاس ہے۔

شیخ الاسلام کی دعوت و تبلیغ

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہابؒ کی تعلیمات پر ہم اگر ایک اجمالی نظر ڈالیں تو ہم کو نظر آتا ہے کہ حضرتؒ نے کوئی نئی بات نہیں پیش کی دعوت قرآن کی صحیح تعلیم اور سنت نبوی کی پوری پوری پیروی چاہتے تھے کہ مسلمان برائے نام نہیں بلکہ حقیقت میں مسلمان بن جائیں۔ ان میں وہی ایمان اور اسلام پیدا ہو جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں تھا ان کی خواہش اور آرزو تھی کہ اسلام اور مسلمانوں کو اسی شان میں دیکھیں جس طرح حضرت فاروق اعظم کے زمانہ میں تھا، وہ کلمہ توحید کے اقرار لسانی و تصدیق قلبی کے ساتھ ساتھ تصدیق بالعمل کی بھی ضرورت محسوس فرماتے تھے جس طرح کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو زبان سے تو ایک کہتا ہے لیکن دل سے یقین نہیں کرتا تو اس کا اسلام مکمل نہیں اور نہ ایمان صحیح ہوتا ہے۔
ٹھیک اسی طرح اقرار قلب و لسان کے ساتھ عمل سے بھی اس کو ثابت کرنا ضروری خیال کرتے تھے وہ اس طرح کہ عبادت کا مرجع صرف خدائے قدوس کی ذات کو قرار دیا جائے اور اگر کوئی دیگر لوازم عبادت مثلاً نذر۔ قربانی۔ استغاثہ۔ سجدہ دعا وغیرہ کو سوائے خدا کے کسی اور شخص خواہ ولی ہو یا پیغمبر کوئی بت ہو یا علم تعزیہ جھنڈا وغیرہ کے لئے جائز رکھتا ہے تو یہ گویا اپنے عمل سے اپنے اقرار لسانی اور تصدیق قلبی کی تکذیب کرتا ہے اس کا یہ عمل منافقت اور شرک کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے اور خالص توحید اسلامی کے منافی ہے اس کو حضرت شیخ الاسلام نے روکا ہے۔ اگر یہی وہابیت ہے تو انہی امور سے ائمہ اربعہ نے بھی روکا اور حرام قرار دیا ہے جس کی صراحت آئندہ صفحات میں کی جائے گی۔
اگر حضرت شیخ الاسلام کی تصانیف دیکھی جائیں یا ان پر جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں ان کو پڑھا جائے، عام اس کے کہ ان کے مخالفین نے لکھی ہوں یا موافقین نے ہم کو اس میں ایک ہی بات نظر آتی ہے وہ یہ کہ انھوں نے توحید اور تطہیر اعتقاد کو اپنی تعلیم کی بنیاد قرار دیا ہے۔ دیگر اوامر و نواہی وغیرہ آپ کی تعلیمات میں ثانوی درجہ رکھتے ہیں۔ اور درحقیقت ہونا بھی یہی چاہئے جب تک ایمان مکمل نہ ہو اور توحید پر یقین نہ ہو تو اعمال کیا کام دے سکتے ہیں کسی بت پرست کافر یا مشرک کی نماز، روزہ اس کو کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکتا۔
اسی لئے حضرت شیخ الاسلام نے اپنی ہر تصنیف میں توحید پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ ان تمام اعمال و افعال اور اعتقادات کی بُرائی نہایت شرح و بسط سے فرمائی ہے جس میں شرک کا ادنیٰ سا بھی شائبہ ہو ان کو یہ دیکھ کر سخت صدمہ ہوتا تھا کہ وہ قوم جو دنیا کو توحید کا سبق دینے کو نکلی تھی چند ہی صدیوں میں اس قدر بدل گئی کہ اس کے اعمال میں اور دیگر مشرکین کے اعمال میں فرق کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ توحید کا سبق بھول گئی اور دوسری اقوام میں اس طرح مل گئی کہ کبھی توحید سے آشنا نہ تھی۔ اسی صدمہ کی وجہ تھی کہ ان کی آواز دل کی گہرائیوں سے نکلتی تھی اور دل میں گھر

کرتی تھی۔

اب ہم شیخ الاسلام نے جن امور کو منافی توحید قرار دے کر ان کی مذمت فرمائی ہے ان کو اختصاراً ذیل میں درج کرتے ہیں ــــــ

استغاثہ

استغاثہ کے معنی ہیں مدد چاہنا غیر اللہ مثلاً اولیا، صلحا، مدفون کی قبروں پر جو لوگ جا کر اپنی مشکلات میں مدد چاہتے ہیں یہ استغاثہ لغیر اللہ کی تعریف میں آتا ہے۔ حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ کا قول ہے ۔

در بلا یاری مخواہ از ہیچ کس — زاں کہ نبود جز خدا فریاد رس

غیر حق را ہر کہ خواند اے پسر — نیست در دنیا از و گمراہ تر

اور حضرت بایزید بسطامیؒ کا قول ہے ۔

"استغاثۃ المخلوق بالمخلوق کاستغاثۃ المسجون بالمسجون" یعنی مخلوق کا کسی مخلوق سے امداد طلب کرنا ایسا ہے جیسے کوئی قیدی کسی دوسرے قیدی سے امداد طلب کرے۔ دیگر اولیا، وغیرہ کا کیا سوال جب کہ خود ذات رسالت پناہی نے اپنی ذات مبارک کی نسبت ارشاد فرمایا ہے ۔

" اِنَّهُ لَا يُسْتَغَاثُ بِیْ ـــ وَاِنَّمَا يُسْتَغَاثُ بِاللّٰهِ تَعَالٰى "

مجھ سے امداد طلبی نہ کرو ۔ استغاثہ و فریاد تو خدائے تعالےٰ سے کی جانی چاہیئے۔ خلاصہ اس بحث کا یہ کہ استغاثہ عن المخلوق خواہ زندہ ہو یا مردہ قبر ہو یا تعزیہ علم ہو یا جھنڈا ولی ہو یا مجذوب یہ بت ہو یا شیطان۔ جن ہو یا فرشتہ کسی سے بھی جائز نہیں اسلامی توحید کے خلاف اور قطعاً حرام ہے۔ اور اسی پر چاروں ائمہ فقہ کا فتویٰ ہے ۔

دعا

یہ استغاثہ کی دوسری صورت ہے ۔ یا غوث یا علی۔ یا خواجہ وغیرہ کہنا کسی مخلوق کا دیگر مخلوق کو مصیبت کے وقت دفع ضرر یا جلب منفعت کی غرض سے یاد کرنا، پکارنا اسلامی تعلیم توحید کے سراسر خلاف ہے ۔ ائمہ اربعہ کا بھی یہی مذہب ہے اور حضرت شیخ الاسلام کا بھی یہی مسلک ہے۔ قرآن کریم کی ہدایت ان کے لئے حجت ہے ۔" وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۔ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ "

اور جن لوگوں کو تم پکارتے ہو وہ تو ایک کھجور کی گٹھلی کے بھی مالک نہیں (یعنی وہ تم کو کچھ نہیں دے سکتے) اگر تم ان کو پکارو تو وہ تمہاری پکار سن بھی نہیں سکتے اور اگر بفرض محال سن بھی لیں تو جواب نہیں دے سکتے اور قیامت کے دن تمہارے شرک سے اپنے آپ کو بری قرار دیں گے ۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے ۔

اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِى الْقُبُوْرِ، اللہ تعالےٰ تو جس کو چاہے سنا سکتا ہے لیکن تم مدفونین کو کچھ نہیں سنا سکتے ۔ اور پھر ایک جگہ ارشاد باری ہے ۔

"اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى " تم مُردوں کو کچھ نہیں سنا سکتے ۔

اس قدر صاف نصوص کلام الہیٰ کے بعد اب کسی مزید ثبوت کی ضرورت نہیں کہ اولیا، مدفون کو پکارنا دعا کرنا استغاثہ کرنا قطعاً حرام ہے۔

ذبیحہ باسم غیر اللہ

ذبیحہ باسم غیر اللہ کے دو اقسام ہیں ایک تو یہ کہ بوقت ذبح سوائے خدا کے کسی اور کا نام لیا جائے۔ تو یہ بالاتفاق قطعاً حرام ہے۔ دوسری صورت یہ کہ کسی ولی۔ بزرگ۔ پیر پیغمبر وغیرہ کے نیاز و تقرب کے لئے ذبح کیا جائے تو یہ بھی بالاتفاق حرام ہے خواہ اس پر بوقت ذبح خدا کا نام لیا جائے یا نہ لیا جائے کیوں کہ اس میں نیت تقرب لغیر اللہ کی ہی ہے۔ فقہ حنفیہ کی مشہور کتاب در مختار میں درج ہے۔

ذبح لقدوم الامیر ونحوہ کواحد من العظماء یحرم لانہ اھل بہ لغیر اللہ ولو ذکر اسم اللہ علیہ ولو ذبح للضیف لا یحرم لانہ سنۃ الخلیل علیہ السلام واکرام الضیف اکرام اللہ تعالیٰ۔

اگر کسی امیر کی آمد پر بطور صدقہ ذبح کیا جائے تو یہ اہل بہ لغیر اللہ کی تعریف میں آکر حرام ہو جاتا ہے خواہ اس پر بوقت ذبح اللہ کا نام لیا جائے یا نہ لیا جائے، لیکن اگر مہمان کی ضیافت کے لئے ذبح کیا جائے تو وہ حرام نہیں ہوتا کیوں کہ اس میں نیت مہمان کی ضیافت کی ہے تقرب کی نہیں جو سنتِ ابراہیم خلیل اللہ ہے اور مہمان کا اکرام اللہ تعالےٰ کے اکرام کی تعریف میں ہو کر باعث ثواب ہوتا ہے یہی حکم فقہ حنفیہ کی دیگر کتب معتبرہ فتاویٰ عالمگیری مطالب المومنین وغیرہ میں انھیں الفاظ میں درج ہے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدثؒ خلف حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحبؒ اپنے فتاویٰ صفحہ ۵۶ میں منشی شوکت علی صاحب رام پوری کے سوال کے جواب میں فرماتے ہیں "فرمان خداوند تعالیٰ وما اھل بہ لغیر اللہ کے یہ معنی ہیں کہ دوسرے وہ جانور جن کے متعلق شہرت دیدی گئی کہ وہ غیر خدا کے لئے ہے اب وہ غیر خدا کوئی بت ہو، یا ناپاک روح، جن ہو یا شیطان۔ پیر ہو یا پیغمبر یہ سب حرام ہیں حدیث میں آیا ہے کہ غیر خدا کے تقرب کے لئے ذبح کرنے والا ملعون ہے اگرچہ وہ بوقت ذبح خدا کا نام ہی کیوں نہ لے جب اس جانور کو شہرت دے دی کہ یہ فلاں کے لئے ہے تو پھر بسم اللہ کہنے سے کیا فائدہ کیوں کہ یہ جانور تو غیر اللہ کے نام پر منادی ہو چکا تو گندگی اس میں سرایت کر گئی اور ایسی سرایت ہوئی کہ مردار سے بھی زیادہ، کیوں کہ مردار تو بغیر خدا کا نام لئے ہی جان دیدے اور یہ جانور غیر خدا کے لئے ٹھہرا کر مارا گیا اور یہ تو عین شرک ہے۔ جب خباثت اس میں سرایت کر گئی تو پھر خدا کا نام لینے سے حلال کیوں کر ہو سکتا ہے جس طرح کتے یا سور کو اگر باسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کریں تو وہ حلال نہیں ہو سکتا یہی شکل اس جانور اُھلّ لغیر اللہ کی بھی ہے" ایک دوسری جگہ حضرت شاہ صاحب موصوف ارشاد فرماتے ہیں فتاویٰ جلد ۱ صفحہ ۵۶ "ما اھلّ بہ لغیر اللہ قرآن شریف میں چار جگہ آیا ہے اس میں غور و تامل کرنا چاہئے کہ اللہ تعالےٰ نے ہر جگہ اھل لغیر اللہ ہی فرمایا ہے ذبح لغیر اللہ نہیں ارشاد فرمایا اس میں نکتہ یہ ہے کہ غیر خدا کے لئے منادی کرنے کے بعد بسم اللہ کہہ کر بھی ذبح کرنے سے وہ جانور حلال و ماکول اللحم نہیں ہو سکتا۔ اور اُھلّ کو ذبح پر محمول کرنا لغات و محاورہ عرب کے خلاف بھی ہے اھلال کے معنی کسی محاورہ شریعت یا عبادت میں ذبح کے نہیں آئے اس لئے اگر یہاں بالفرض اُھلّ کو ذبح کے معنوں میں تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی ذبح لغیر اللہ ہی ہوگا۔ ذبح باسم غیر اللہ کہاں سے سمجھا گیا لہٰذا حاصل اس بحث کا یہ کہ اھلال کو بمعنی ذبح لینا اور پھر لغیر اللہ کو باسم غیر اللہ مراد لینا بالکل قرآن مجید کی تحریف کے لگ بھگ پہونچا دیتا ہے۔ صاحب تفسیر نیشا پوری نے صراحت کی ہے کہ اگر کوئی مسلمان کوئی جانور ذبح کرے اور اس ذبح سے غیر اللہ کا تقرب مقصود ہو تو وہ مرتد ہو جاتا ہے اور اس کا ذبیحہ مرتد کا ذبیحہ ہے"

تیسرا فتویٰ حضرت ممدوح کا صفحہ ۲۳ پر ملاحظہ ہو "تفسیر بیضاوی اور دیگر تفاسیر میں جو ذکر ہے کہ ما اھلّ بہ لغیر اللہ او مشرکین بوقت ذبح وغیرہ اپنے بتوں کا نام زور سے پکارتے تھے سو یہ ان مشرکین کی عادت تھی اور اسی پر ان لوگوں نے بیان کیا ہے اور اسی وجہ سے ان قدیم مفسرون نے ما ذکر اسم غیر اللہ اور ما قصد بذبحہ التقرب الیٰ غیر اللہ میں فرق نہیں کیا اس کی وجہ بھی صاف تھی کہ اس زمانہ کے مشرک کفر میں بالکل بے لوث اور خالص تھے وہ جب غیر اللہ کے تقرب کی غرض سے کسی جانور کو ذبح کرتے تو اس کا نام بوقت ذبح لیتے تھے اس کے برعکس اس زمانہ کے مشرک اسلام

اور شرک کو مخلوط کر دیتے ہیں یہ لوگ تقرب لغیر اللہ کے لئے تو جانور ذبح کرتے ہیں اور ذبح کے وقت نام لیتے ہیں اللہ کا مشرکین عرب کا معاملہ تو صاف اور واضح وصریح کفر تھا اور ان مسلمان مشرکین کا کفر اسلام کے پردہ میں ہے "

اس موقعہ پر ایک دلچسپ چیز لائق ذکر ہے کہ کتاب تبرئۃ الشیخین مطبوعہ مصر کا حاشیہ علامہ سید رشید رضا ایڈیٹر "اخبار المنار" مصر نے تحریر فرمایا ہے اس کے حاشیہ صفحہ ۲۴ پر تحریر فرماتے ہیں۔

زمانہ جاہلیت کے مشرک لغات عرب سے واقف تھے اس لئے وہ ہر اس چیز کو جس کو وہ پوجتے تھے بے تکلف اِلٰہ کہتے تھے کیوں کہ لغات عرب میں اس لفظ کے یہی معنی ہیں لیکن اس زمانہ کے مشرک لغات صحیحہ سے عدم واقفیت کی بنا پر اس تصور میں کہ اسلام نے معبودان ماسوا اللہ کو الٰہ کہنے سے منع فرمایا ہے اس لئے وہ ہر قبر علم تعزیہ وغیرہ کو الٰہ تو نہیں کہتے لیکن مراسم عبودیت سب وہی ادا کرتے ہیں جو مشرک اپنے بتوں کیلئے کرتے تھے اس طرح زمانہ جاہلیت کے مشرک صرف دین پر ظلم کرتے تھے لیکن اس زمانہ کے مشرک دین اور لغت دونوں پر ظلم کرتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب نے فتاوی کے جلد ۱ صفحہ ۶۰ پر ایک واضح بات لکھی ہے جو حلت وحرمت ذبیحہ لغیر اللہ کا بین ثبوت اور فیصلہ کن جواب ہے ارشاد فرماتے ہیں کہ "بعض مسلمان جہلا اس جگہ کج فہمی سے یوں کہتے ہیں کہ پکا ہوا گوشت خیرات کر کے مُردوں کو ثواب پہونچانا تو بے شبہ درست ہے اور ہم بھی ان جانوروں کو ذبح کر کے یہی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو ان کی نیت وعمل کو جانچنے کے لئے یہی کافی ہے کہ ان سے سوال کیا جائے جب غیر خدا کے لئے یہ جانور نذر کر کے ذبح نہیں کر رہے ہو تو بجائے ذبح کے اسی مقدار میں بازار سے گوشت خرید کر اور اس کو پکا کر فقراء کو کھلا دو تو کیا اس سے تمہاری نذر[1] پوری ہو جائے گی یا نہیں۔ اگر کہیں کہ ہو جائے گی تو یہ اپنے کہنے میں سچے ہیں اور اگر کہیں کہ بغیر جانور ذبح کئے نہیں پوری ہوتی تو یہاں صاف یہی نیت معلوم ہوتی ہے کہ تقرب لغیر اللہ کے لئے یہ ذبیحہ ہے جو قطعاً حرام اور صریح شرک ہے۔

اسی طرح ذبیحہ باسم غیر اللہ سے حضرت شیخ الاسلام نے منع فرمایا ہے ان کے دلائل بھی وہی ہیں جو حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں فقہ حنفی کی معتبر کتاب "در مختار" فتاوی عالمگیری وغیرہ وغیرہ میں یہ بحث صراحت سے موجود ہے اگر حضرت شیخ الاسلام نے اس ذبیحہ باسم غیر اللہ سے روکا ہے تو کوئی نیا کام نہیں کیا۔ حضرت مولانا شاہ عبد العزیز رح نے بھی روکا ہے امام ابو حنیفہ رح نے بھی روکا ہے بقیہ ہر سہ ائمہ نے بھی روکا ہے اگر اس عمل سے حضرت شیخ الاسلام وہابی ہیں تو متذکرہ صدر بزرگ بھی کیوں نہ وہابی کہلائے جائیں۔

نذر لغیر اللہ

نذر ونیاز خالص خدائے بزرگ وبرتر کا حق ہے اس کی صراحت فقہ وشرع میں ہے اور اس کی نسبت ایسی احادیث بھی وارد ہوتی ہیں "نذر تقدیر کو بدل نہیں سکتی البتہ اس حیلہ سے اللہ تعالے بخیل کا مال خرچ کرواتا ہے" بہر حال یہ حق خاص خدائے تعالے کا ہے غیر اللہ کے لئے خواہ وہ کوئی ہوں انبیاء ہوں کہ اولیاء صحابی ہوں کہ مجذوب غرض کوئی ہوں ان کی نذر ونیاز بہ نیت تقرب قطعاً حرام ہے اس پر بھی وہی دلائل ہیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں۔

توسل

یہ بڑا نازک مسئلہ ہے اور اس کو سمجھنے میں اہل بدعت کو بہت ہی مغالطہ اور تسامح ہوا ہے اس کی صراحت ذرا وضاحت کے

---

[1] گو نذر لغیر اللہ بھی حرام ہے جس کی بحث آئندہ آئے گی۔

ساتھ کی جانی مناسب ہے۔

وسیلہ دو معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ ایک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا وسیلہ سو یہ فرض ہے اس توسل بغیر نہ تو ایمان مکمل ہوتا ہے اور نہ اسلام کامل ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیت۔ یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوا إِلَیْهِ الْوَسِیلَةَ وَجَاهِدُوا الخ اسی وسیلہ کی طرف اشارہ کرتی ہے دوئم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا و شفاعت کا وسیلہ سو یہ تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں اس وسیلہ سے کام لیا گیا جو بلاشبہ جائز تھا اور پھر انشاء اللہ تعالےٰ قیامت میں شفاعت کا وسیلہ حاصل ہوگا۔ زندگی مبارک کے بعد صورت اولیٰ بھی باقی نہیں رہی اس پر یہ دلیل ہے کہ جب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے خلافت کے زمانہ میں امساک باران کے موقعہ پر نماز استسقار کے بعد دعا کے وقت حضرت فاروق اعظم نے صحابہ کرام کے سامنے جو پیچھے فدائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے فرمایا تھا" خداوندا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک میں ہم پر جب قحط سالی ہوتی تھی تو ہم تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ لاتے تھے اور تو ہمیں سیراب فرماتا تھا۔ اب چوں کہ وہ ہم میں موجود نہیں اس لئے ہم لوگ تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کا وسیلہ پکڑتے ہیں جو تیرے نبی کے بعد ہم میں سب سے زیادہ محترم ہیں تو ہمیں سیراب فرما۔"

اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ بعد وفات بھی جائز ہوتا تو حضرت فاروق اعظم جیسا شخص جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سن کر جوش محبت میں بے اختیار تلوار لے کر اٹھے کہ جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے کہے گا میں اس کو قتل کر دوں گا۔ ایسا فدائی اور اس مجمع کے سامنے جس میں تقریباً سب کے سب اسی طرح کی عقیدت و محبّت رکھتے تھے بجز ذات آنحضرت کے کسی دوسرے کا وسیلہ ہرگز نہ پکڑتے خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہستی ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہی کیوں نہ ہوں۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ عمل ہمارے لئے حجّت ہے۔ کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ بعد وفات نہیں لیا جا سکتا تو پھر دیگر اولیاء صلحاء کا کیا ذکر ائمہ[1] اربعہ و نیز امام ابن تیمیہ کے یہاں مکروہ تحریمی بیان کیا گیا ہے۔

لیکن بعض علماء جیسے شیخ عز الدین بن عبد السلام یا امام شوکانی سبکی وغیرہ نے جواز کی کوشش کی ہے تو ظاہر ہے کہ ائمہ محدثین کے فتاوے کے مقابل ان حضرات کی رائے قابل لحاظ نہیں ہو سکتی۔ اس لئے حضرت شیخ الاسلام وسیلہ کے مسئلہ میں حضرت امام ابو حنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے مسلک پر ہیں۔ لہٰذا اگر حضرت شیخ الاسلام پر اعتراض ہو سکتا ہے تو ائمہ متذکرہ پر بھی وہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے۔

استعاذہ

پناہ ڈھونڈھنا۔ بجز خدائے تعالےٰ کے کسی دوسرے کی پناہ چاہنا خواہ جس کی پناہ چاہی جائے وہ کوئی ہو اور کسی مرتبہ کا ہو منافی توحید ہے اس کی ممانعت قرآن مجید میں یوں آئی ہے۔ إِنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِنَ الْإِنْسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِنَ الْجِنِّ فَزَادُوهُمْ رَهَقًا ۔

بعض انسانوں میں سے اجنّہ سے پناہ تلاش کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کو گھمنڈ اور زیادہ ہو گیا۔ اس نص صریح کے بعد بھی اگر حضرت شیخ الاسلام نے مسئلہ استعاذہ کی نفی کی تو کیا بُرا کیا۔

زیارت قبور

زیارت قبور سے کوئی مسلمان جو خود کو مسلمان کہتا ہو منع نہیں کر سکتا خواہ وہ بدعتی ہو یا موحد، شیعہ ہو یا سنی یا کوئی اور لیکن یہاں یہ نکتہ یاد رکھنا چاہئے کہ

---

[1] اس مسئلہ میں بعض علماء کا اختلاف ہے۔

زیارت قبور کے بہاں دو طریقہ مروج ہو گئے ہیں ایک مسنون اور دوسرا اہل بدعت کی ایجاد، اس لئے مسنون طریقہ زیارت قبور کی تو کوئی بھی مخالفت نہیں کر سکتا اور وہ طریقہ یہ ہے کہ جب جی چاہے اس وقت یا ۱۵ شعبان شب برات کے موقعہ پر نصف شب کے وقت (کیوں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس تاریخ مدینہ طیبہ کے قبرستان بقیع پر بغرض دعا مغفرت تشریف لے جاتے تھے) اپنے عزیز اقارب والدین وغیرہ کی قبروں پر جائیں اور مرحومین کے لئے دعاء مغفرت کریں اور خصوصیت کے ساتھ وہی دعائیں جو احادیث اور کتب فقہ میں درج ہیں پڑھیں اور مدفونین کی حالت سے عبرت حاصل کریں۔ تو یہ طریقہ مسنون ہے اور اس زیارت سے نہ کوئی روک سکتا ہے اور نہ اس کو ناجائز بتلا سکتا ہے بلکہ اس قسم کی زیارت قبور کو منع کرنے والا بدعتی گمراہ اور احکام شرع کا نافرمان کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

دوسرا طریقہ بدعی ہے اس کا طریقہ صاحب مجالس الابرار نے حسب ذیل بیان فرمایا ہے ملاحظہ ہو کتاب مذکور مجلس ۱۷ صفحہ ۳۵۸ ۔ قبروں کی زیارت دو طریقہ کی ہے شرعی اور بدعی، شرعی زیارت کی حضور انور نے اجازت دی ہے جس سے دو غرض اغراض حاصل ہوتے ہیں ایک زیارت کرنے والے کو عبرت اور دوسرا فائدہ مدفونین کو زائر کی دعا مغفرت اور سلام کا۔ دوسری قسم کی زیارت جو بدعی ہے اس زیارت کا مقصد قبر کے پاس نماز پڑھنا، قبر پہ چادر و پھول چڑھانا، طواف، سجدہ، بوسہ، استغاثہ، دعا و نذر برائے رزق او لاد ادائے دین اور بلیات وغیرہ ذبیحہ باسم غیر اللہ وغیرہ وغیرہ ہے سو یہ شرک ہے جس طرح دیگر بت پرست اپنے بتوں کے لئے کرتے ہیں اور یہ سب امور ان ہی بت پرستوں سے اخذ کر کے ان پر یہ اہل بدعت عمل پیرا ہیں۔ یہ سب امور بالاتفاق علماء حرام ہیں۔ اور یہ امور نہ تو صحابہ کرام کے عہد میں کئے گئے نہ تابعین کے زمانہ میں اور نہ تبع تابعین وائمہ اربعہ کے وقت لہٰذا یہ سب حرام اور بدعت ہیں۔

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی تو اس معاملہ میں بہت زیادہ سخت ہیں تفہیمات الٰہیہ جلد ۲ صفحہ ۴۵ پر ارشاد فرماتے ہیں جو کوئی اجمیر کی طرف یا سالار غازی مسعود کی قبر پر بغرض طلب حاجات و کشادگی رزق جائے تو وہ گنہ گاری میں زانی و قاتل سے بھی بدتر ہے اور اس شخص کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی خود ساختہ اور تراشیدہ بت کی پوجا کرتا ہے یا لات وغیرہ کو پکارتا ہے اور حجۃ اللہ البالغہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ "مقابر اولیاء چلہ جات وقبہائے مقبور وغیرہ سب جگہوں کی زیارت منع کر دینے کے قابل ہے"۔

پھر اگر حضرت شیخ الاسلام نے اسی غیر مشروع اور مبتدعانہ زیارت قبور سے منع فرمایا تو کیا برا کیا حضرت شیخ الاسلام نے بھی وہی کہا اور کیا ہے جو دیگر علماء حق نے کیا اور کہا ہے پس حضرت شیخ الاسلام کا عمل اور مسلک علماء سوء۔ اور جاہل اہل بدعت کے خلاف سہی لیکن علمائے حق اور فقہا کے ہرگز خلاف نہیں ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لَا تَتَّخِذُوْا قَبْرِیْ مَسْجِدًا میری قبر کو سجدہ گاہ نہ بناؤ یعنی میری قبر کو سجدہ نہ کرو۔ فرما کر غیر اللہ کو سجدہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ سجدہ غیر اللہ کے متعلق کلام مجید میں ہے۔ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ ، چاند سورج کو سجدہ نہ کرو بلکہ سجدہ اللہ ہی کے لئے ہے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگر غیر خدا کو سجدہ جائز ہوتا تو میں ہر عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔ ایک دوسری حدیث ہے جس میں صحابہ نے فرمایا تھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیاصرہ روم و کسریٰ ایران کے درباری اور بطارق ان کو سجدہ کرتے ہیں اور آپ کا مرتبہ دینی و دنیوی ہر اعتبار سے ان سے بڑا ہے پس آپ ہم کو بھی اجازت دیجئے کہ ہم آپ کو سجدہ کریں اس پر آپ نے فرمایا کہ سجدہ خاص اللہ بزرگ و برتر کا حق ہے کسی انسان کو دوسرے انسان کا سجدہ حرام ہے ان کے سوا اور بھی احادیث اس خصوص میں موجود ہیں اور ہم صرف ان تین پر اکتفا کرتے ہیں۔ اب ہم ان اہل تاویل سے کیا یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ وہ جو سجدہ عبادت و سجدہ تعظیمی میں فرق ثابت کر کے یہ کہتے ہیں کہ سجدہ عبادت دوسرے کو ناجائز ہے سجدہ تعظیمی جائز ہے

توکیا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن سجدوں سے منع فرمایا ہے کیا وہ عبادتی سجدہ تھے کا تتخذوا قبری مسجداً میں جولا ہے وہ بلحاظ نحو لا نفی جنس ہے جس میں ہر قسم کا سجدہ داخل ہوسکتا ہے اگر ان اہل تاویل کا یہ منشا ہے وہ سجدہ ہائے تعظیمی وعبادتی کا فرق جانتے ہیں اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہیں جانتے تھے تو اس کا فیصلہ ناظرین ہی فرمادیں کہ یہ خیال وزعم ان کو کہاں پہونچا رہا ہے۔

حلف لغیر اللہ

غیر خدا کی قسم کھانا بھی توحید کی روح کے خلاف ہے اس خصوص میں کئی احادیث وارد ہوئی ہیں اور یہ مسئلہ بہت صاف اور بلا اختلاف ائمہ چاروں مسالک میں حرام ہے۔ پس شیخ الاسلام نے اس مسئلہ میں بھی فقہا کی اتباع فرمائی ہے۔

یہ تھے وہ اختلافی مسائل جن کو حضرت شیخ الاسلام نے منافی توحید تصور فرماکر ان کی پرزور تردید فرمائی زبانی تقاریر میں ان کی برائی بتلائی تصانیف میں ان کے خلاف قلم اٹھایا اور نص قرآنی احادیث نبوی اقوال ائمہ سے ان کے باطل وحرام ہونے کے پختہ دلائل پیش کئے جن پر اہل باطل وبدعت نے تاویلات کا ملمع چڑھاکر جواز کے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی اس کی خوب قلعی کھولی لیکن اہل بدعت اپنی تاویلات کو تارعنکبوت کی طرح ٹوٹتے دیکھ کر اور تو کچھ نہ کرسکے گالیاں اور افترا پردازیاں بہتان تراشی وغیرہ پر اتر آئے لیکن ع

نور خدا ہے کفر کی ظلمت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

چراغے را کہ یزدان برفروزد
کسے کو تف زند ریشش ــــــ بسوزد

حضرت شیخ الاسلام کا مذہب

بموجب صراحت بالا ماہرے ناظرین پر یہ واضح ہوچکا ہوگا کہ شیخ الاسلام کا مذہب ٹھیٹ توحید پرستانہ تھا اور فروعات میں وہ امام احمد بن حنبل کے مسلک کے پیرو تھے۔ ان کو اجتہاد کا دعویٰ بھی نہ تھا۔ لیکن اس پر بھی ان کو کوئی حدیث صحیح یا عمل سلف صالح ایسا مل جاتا جو فروعات میں حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کے خلاف ہوتو وہ حدیث شریف پر عمل کو ترجیح دیتے اور اپنا مسلک ترک کردیتے چنانچہ وہ خود تحریر فرماتے ہیں ملاحظہ ہو ہدیۃ السلف صفحہ ۹۹

وامامذهبنا فمذهب الامام احمد بن حنبل امام اهل السنة فی الفروع ولا ندعی الاجتهاد واذا ماصحت لنا سنة صحیحة عن رسول الله صلی الله علیه وسلم عملنا ولا نقدم علیها قول احد کائنا من کان۔

ہمارا مذہب فروع کی حد تک امام اہل سنت والجماعت امام احمد بن حنبل کا مذہب ہے اور اگرچہ ہم کو اجتہاد کا دعویٰ نہیں تاہم ہم کو اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی صحیح حدیث مل جاتے تو ہم اس پر عمل کرتے ہیں اور حدیث صحیح پر کسی کے قول کو مقدم نہیں کرتے خواہ وہ کوئی ہو۔

یہاں یہ امر وضاحت طلب ہے کہ مذہب اہل حدیث جو ہندوستان میں رائج ہے اور جو تمام اربعہ میں سے کسی کی تقلید ضروری نہیں تصور کرتے ان کا مسلک بھی قریب قریب اہل توحید نجد کی طرح ہے فرق صرف تقلید وعدم تقلید کا ہے مذہب اہل حدیث بھی یہی ہے کہ کسی مسئلہ میں کوئی حدیث موجود ہے اور اس پر ائمہ اربعہ میں سے کسی نے عمل بھی کیا ہے تو وہ مسئلہ ان کے نزدیک صحیح ہے لیکن جناب اسلم جیراج پوری صاحب نے (جو خود بھی اہل حدیث تھے) موحدان نجد اور اہل حدیث ہند میں ــــــ دو اختلافی مسائل نکالے ہیں جن کو ہم بالکل انہی کے الفاظ

میں درج کرتے ہیں۔

وہ قبر پرستوں پر اس قدر سخت ہونے کے باوجود ہم کو علمائے نجد پر تعجب ہے کہ دو عقیدوں میں وہ عوام الناس کے ہم خیال ہیں یعنی حیات النبی[1] اور سماع موتی۔ حالانکہ یہ دونوں بھی قرآن کے برخلاف ہیں۔ جہاں تک ہم کو ان کی کتابوں سے معلوم ہو سکا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات برزخیہ پر بجز اس قیاس کے کہ جب شہداء کو حیات حاصل ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو ان سے افضل ہیں کیوں کر نہ حاصل ہوگی اور کوئی دلیل نہیں رکھتے لیکن یہ مسئلہ عقائد کا ہے جس میں قطعاً گنجائش نہیں ہے علاوہ ازیں یہ قیاس بھی مع الفارق ہے کیوں کہ قرآن میں شہداء کو احیاء کہا گیا ہے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت خصوصیت سے تصریح کر دی ہے کہ "اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ۔" پھر میت کا قیاس احیاء پر باطل نہیں تو اور کیا ہے۔

مشرکین عرب کے معبودان غیر اللہ جن میں شہادت قرآنی محض انبیاء بھی ہیں ان کی نسبت سورۂ نحل میں ہے: "اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ وَّمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ" قرآن سے نہ صرف ان کے حیات وشعور کی نفی کی گئی ہے بلکہ جا بجا علم و اجر وغیرہ دیگر آثار حیات کی بھی نفی کی ہے۔ عدم سماع کے متعلق سورہ فاطر میں ہے۔ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ۔ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ"۔

کہ ان نصوص صریحہ کے ہوتے ہوئے بھی جن کے خلاف ایک لفظ بھی قرآن میں نہیں ہے کوئی روایت خواہ اس کے راوی جبرئیل و میکائیل ہی کیوں نہ ہوں یا ابن القیم کی کتاب الروح میں چند بزرگوں کے خوابوں کی شہادت کیا قابل سماعت ہو سکتی ہے۔؟

عہد صحابہ میں جیسا کہ خود بخاری شریف میں مروی ہے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو روایت پر ٹوکا تھا اور قرآن کی آیت[2] کی بناء پر سماع موتیٰ کی مخالفت فرمائی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید میں اہل نظر کے لئے عالم برزخ کے متعلق مکمل تعلیم موجود ہے لیکن افسوس ہے کہ اس مختصر کتاب میں اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں کسی مناسب موقع پر ہم انشاء اللہ تعالیٰ شرح و بسط سے اس کو لکھیں گے اور شہداء کے احیاء اور انبیاء کے اموات ہونے کا راز اچھی طرح کھولیں گے۔" تاریخ نجد از اسلم جیراج پوری حاشیہ صفحہ ۶۵

تقلید و عدم تقلید جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے اور ان دو مسئلوں کے سوا اہل توحید نجد و اہل توحید ہند و اہل حدیث کے عقائد و اعمال اصول و فروعات اس قدر ملتے جلتے ہیں کہ فرق کرنا مشکل ہے حق یہ ہے کہ سرچشمہ اسلام یعنی سنت نبی علیہ السلام کو دونوں نے مضبوطی سے تھاما ہے اس لئے دونوں کا راستہ[3] ایک ہے۔

حضرت شیخ الاسلام کی دعوت و تبلیغ پر ایک اجمالی نظر ڈالنے اور آپ کے فقہی مسلک پر روشنی ڈالنے کے بعد ہم قارئین کرام سے دریافت کرتے ہیں کہ ان میں کیا کمی اور کیا اضافہ ہے جو اسلام کی تعلیم اور تلقین توحید کے مغائر و معارض ہو؟ جس کی بناء پر اہل توحید نجد اور حضرت شیخ الاسلام کے متبعین کو "وہابی" کے لقب سے نوازا گیا ہے۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت کا دعویٰ رکھنے والے ——— جو علانیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی خلاف ورزی کر کے اور آپ کے لاتے ہوئے مکمل دین میں جس کی شہادت خدائے تعالیٰ نے اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ فرما کر دی ہے طرح طرح کی ایجادات کر کے آپ کی روح انور کو صدمہ نہیں پہونچا رہے ہیں آخر اس کا کیا جواب ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے ان کا حسن کرشمہ ساز کرے

---

[1] یہ ہر دو مسائل تاریخ نجد الوسی میں صفحہ ۱۴۴ پر درج ہیں۔ [2] انك لاتسمع الموتیٰ پارہ ۲۰۔ [3] علمائے نجد اور ہندوستان کے علمائے اہل حدیث کا مسلک ایک ہونے کی بناء پر ہندوستان میں اہل حدیث کو وہابی کا نام دیا گیا ہے۔ بعض اہل تقلید بھی ——— اپنے کو وہابی کہتے ہیں۔

دعوت شیخ کی مخالفت اور اس کے اسباب

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

دعوت توحید کے خلاف پروپیگنڈا

حضرت شیخ الاسلام نے جوں ہی دعوت و تبلیغ کا آغاز کیا اسی وقت سے ان کی تحریک کے مخالفین بھی پیدا ہو گئے تھے وجہ ظاہر ہے کہ برسوں سے جو جو معائب و معاصی لوگوں میں گھر کر چکے تھے وہ ان کو آسانی سے چھوڑ نہیں سکتے تھے اور شیخ الاسلام ان سے چھڑانے پر مصر تھے۔ پشت در پشت کے باطل عقائد ابوجہل و ابولہب سے کب چھوٹے تھے جو ان ابوجہل و ابولہب صفت مسلمان مشرکوں سے چھوٹیں گے۔ اس لئے انھوں نے بھی وہی کیا جو اس سے قبل مشرکین مکہ نے کیا تھا۔

لیکن یہی ایک واحد سبب نہیں تھا بلکہ ایک سے زیادہ اسباب حضرت شیخ الاسلام کی تبلیغ کے سد راہ تھے اور سب سے زیادہ سیاسی وجوہ شیخ الاسلام کی دعوت کی مخالفت میں سرگرم عمل رہے ہیں۔ بادقسمتی سے صرف ایک نہیں تین تین حکومتیں اس کار خیر میں حصہ لیتی رہی ہیں شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ ۱۱۵۷ھ میں جس وقت حضرت شیخ الاسلام عیینہ سے ہجرت فرما کر درعیہ میں تشریف فرما ہوئے اور امیر درعیہ سلطان محمد بن سعود نے شیخ کی دعوت و اعلائے کلمۃ الحق کی تبلیغ پر لبیک کی اس کے بعد حضرت شیخ الاسلام کی تبلیغ میں تیزی آگئی۔ مخالفین توحید نے جب یہ دیکھا تو انھوں نے چاہا کہ اس تحریک کو قوت کے ساتھ روک دیں چنانچہ امیر ریاض نے اس معاملہ میں پہل کی۔ دہام بن دواس نے جو امیر ریاض تھا سب سے پہلے تو موحدین کو حضرت شیخ الاسلام کی اتباع کے جرم میں تنگ کرنا شروع کیا اور ان پر نت نئے مظالم ڈھاتے مجبوراً شیخ الاسلام نے بھی جزاء سیئۃ سیئۃ بمثلھا پر عمل کرتے ہوئے قوت کا جواب قوت سے دینے کی اجازت دی۔ اب امرائے درعیہ نے اپنے ہم مذہبوں کی حمایت میں تلوار اٹھائی اور ۱۱۵۹ھ میں امیر درعیہ نے دہام بن دواس کو سزا دینے کے لئے اس پر فوج کشی کی اور ملکی سی گوشمالی کے بعد واپس ہوئے لیکن یہ سلسلہ ۲۵-۳۰ سال چلتا رہا بالآخر ۱۱۸۷ھ میں ریاض کو مکمل طور پر موحدین نے فتح کر لیا۔ اس دوران میں جو قوت بھی حضرت شیخ الاسلام کی راہ میں حائل ہوئی اس کو قوت کے ساتھ ہٹا دیا گیا گویا یہاں سے باقاعدہ جہاد کے سلسلہ آغاز ہو گیا اور اگرچہ کہ یہ جہاد صرف ان ہی طبقات پر کیا گیا جو دعوت توحید کی مخالفت تلوار سے کر رہے تھے لیکن اس کا سلسلہ اتنا بڑھا کہ ۱۲۰۰ھ تک سلطان نجد کا قبضہ پورے نجد پر ہو گیا اور آہستہ آہستہ حجاز مکہ مکرمہ مدینہ طیبہ پر بھی ان کا فاتحانہ قبضہ ۱۲۱۸ھ میں ہو چکا تھا۔ چوں کہ حجاز کا سالم علاقہ اور نجد کا بیشتر حصہ سلاطین عثمانیہ کے زیر اقتدار تھا اس لئے سلاطین ترک کو موقعہ ملا کہ نجدی سلاطین پر فوج کشی کرے اس کے لئے اس نے محمد علی پاشاہ خدیو مصر کو جو سلطنت ترک کا ماتحت تھا حکم دیا کہ موحدین کو حجاز سے نکال دیں چنانچہ یہاں سے موحدین نجد و سلطنت عثمانیہ ترکی میں باقاعدہ جنگ کا آغاز ہو گیا۔ حکومت مصر نے جو اس جنگ کی سربراہ کار تھی ہتھیار کے ساتھ ساتھ پروپیگنڈا اور رشوت

سے بھی کام لیا۔ چنانچہ اس خصوص میں برک ہارٹ بڑی وضاحت کے ساتھ اپنی کتاب **Travels in Arabia** کے صفحہ ۹۶ پر لکھتا ہے :

مصریوں کی جانب بدویوں کی توجہ اور ہمدردی حاصل کرنے میں رشوت کا سب سے بڑا دخل تھا "

اسی طرح برنجس اپنی کتاب **A Brief History of Arabia** کے صفحہ ۲۰۲ پر رقم طراز ہے کہ ۔

" محمد علی پاشا نے فوجی قوت سے زیادہ روپیہ کی قوت سے عرب کو فتح کیا "

ان کے علاوہ اکثر یورپین مصنفوں نے اس رشوت اور پروپیگنڈا کی تصریح کی ہے لیکن ہم نے صرف دو حوالہ جات پر اکتفا کیا ہے جن حضرات کو مزید کاوش ہو وہ فلبی، ہورس ہوگارتھ، باڈیا وغیرہ کی تصانیف ملاحظہ فرما دیں۔ اس طرح ترکی اور مصری حکومتیں حکومت نجد سے متصادم ہوئیں۔

اسی دوران میں حکومت نجد کا قبضہ سواحل بحیرہ عرب کے مقامات عمان وغیرہ پر بھی ہو گیا تھا۔ مقام راس الخیمہ بھی نجدی موحدین کے زیر اقتدار تھا اس مقام پر قبیلہ جواسم آباد تھا جس کا پیشہ بحری قزاقی تھا اور ان کی تاخت زیادہ تر تجارتی جہازوں پر ہوتی تھی جو خلیج فارس سے گذرتے تھے اگرچہ حکومت نجد بھی روک تھام کرتی تھی لیکن ان کے پاس بحری قوت نہ ہونے کی وجہ خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔

ان بحری قزاقوں کی تاخت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہاز بھی نہ بچ سکے۔ اسی لئے ۱۲۲۴ھ میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک بحری بیڑہ اس بحری قزاقی کے انسداد کے لئے بمبئی سے روانہ کیا جس نے ان بحری قزاقوں کے مسکن راس الخیمہ پر حملہ کر کے اس کو جلا دیا برک ہارٹ نے اس حملہ کا ذکر کیا ہے لیکن اس نے غلطی سے یہ تصور کیا کہ یہ حملہ نجدی قوت پر کیا گیا تھا۔ **J. L. Barkhardt Travels in Arabia**

دوسری وجہ سلطنت برطانیہ کی اہل توحید نجد کے خلاف ہونے کی یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی خلیج فارس پر اپنا اثر و اقتدار بڑھانا اور قائم رکھنا چاہتی تھی لیکن خلیج فارس کے بیشتر عربی سواحل پر نجدی قبضہ تھا اس لئے حکومت برطانیہ کو اس خصوص میں خاص کامیابی نہیں ہو رہی تھی غرض کہ ان معاملات کو سلجھانے اور ہر دو حکومتوں کے پاس اتحاد و خیر سگالی پیدا کرنے کی غرض سے حکومت برطانیہ نے ۱۷۹۹ء میں رینانڈ **Reinand** کو سفیر بنا کر دربار سلطان نجد میں بھیجا تھا جس کو ایک حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی چنانچہ، ہوگارتھ **D. G. Hogarth** نے اپنی کتاب موسوم بہ **The Penetration of Arabia** کے صفحہ ۱۰۴ و ۱۰۵ پر اس سفارت کا ذکر کیا ہے ۔

اگرچہ ہوگارتھ نے عارضی کامیابی بیان کی ہے لیکن یہ کامیابی بھی چند روزہ تھی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار خلیج فارس کی راہ میں حکومت نجد اخیر تک حائل رہی ۔

یہ تو بیرونی امور تھے اندرونی طور پر بھی حکومت برطانیہ کو ہندوستان میں ایک ایسا واقعہ پیش آگیا کہ اس کو وہابیوں سے مشکوک کرنے اور ان کے خلاف ہو جانے کا موقع دے دیا جس کی تفصیل یہ ہے کہ یہاں ہندوستان کی حالت بھی مذہب کے اعتبار سے دوسری جگہوں سے کم نہ تھی بلکہ ان سے بدرجہا بدتر تھی مقامی بت پرست اقوام کی صحبت نے ان کو اور ان کی توحید پرستی کو اس درجہ مسخ کر دیا تھا کہ ان ہر دو اقوام میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہ اگر بتوں کو پوجتے تھے تو یہ قبروں کو پوجتے تھے غرض اعمال و اعتقاد ہر دو اعتبار سے یہاں کے مسلمان انتہائی پستی میں تھے ان کی اصلاح کے لئے حضرت سید احمد بریلوی شہیدؒ نے تہیہ کیا حضرت ممدوح کے خلیفہ مولانا محمد اسمٰعیل شہید دہلوی بھی تبلیغ توحید و احیاء سنت میں اپنے شیخ کے دوش بدوش مصروف رہے مختصر یہ کہ ہر دو بزرگوں نے تعلیم توحید ردبدعت و شرک کے ساتھ ساتھ پنجاب و کشمیر کی سرحد پر جہاد کا بھی آغاز فرما دیا چوں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے یہ بالکل ناقابل برداشت تھا کہ مسلمانوں میں جوش جہاد باقی رہے اس لئے انھوں نے یہ دیکھ کر کہ ان کے اور اہل توحید نجد کے اعمال و عقائد میں ایک گونہ مشابہت ہے ان کا ٹانڈا بھی اہل توحید نجد سے ملا دیا۔ اور دوسری طرف ان کو قوت سے کچلنے میں مصروف رہے ۔

ہم نے ابھی جو بیان کیا ہے کہ ان مجاہدانِ ہند اور اہل توحید نجد کے عقائد میں مماثلت دیکھ کر دعوت اہل توحید نجد کا شبہ انگریزوں کو ہوا اس کی صراحت سر ولیم میور، ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی تصانیف میں موجود ہے ۔

قارئین کرام کو مزید معلومات اِس خصوص میں مطلوب ہوں تو ہمارے ہندوستانی مسلمان **Our Indian Musalmans**
مصنفہ ڈبلیو ولیم ہنٹر ملاحظہ فرمادیں۔ اس میں یہ تفصیلی بحث ملے گی۔ اس کے علاوہ جس قدر انگریزی تصانیف جن میں حضرت سید احمد صاحب شہید بریلوی او
شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ نجدی پر کچھ لکھا گیا جو اس میں حضرت سید احمد شہید کی تحریک کو نجدی تحریک اعلائے کلمۃ الحق کی شاخ تسلیم کیا گیا ہے
غرض یہ بھی انگریزوں کے وہابیت عام کے خلاف ہونے کی ایک وجہ تھی۔

تیسری اور اہم وجہ تفصیل کی محتاج ہے اس لئے اس کو ہم ذرا وضاحت سے بیان کرنا مناسب تصور کرتے ہیں۔

اگر ہم قوموں کے عروج و زوال پر غور کریں تو ہم کو نظر آئے گا کہ اس قوم کی ترقی کا انحصار جذبہ دینی یا جذبہ وطنی پر ہے جس کی وجہ سے وہ قوم کسی ترقی
شاہراہ پر گامزن ہوتی اور جب یہ جذبات مردہ ہو جاتیں تو اس قوم میں انحطاط و اضمحلال کے آثار شروع ہو جاتے ہیں اور وہیں سے اس کا زوال شروع ہو
ہے۔ مسلمان بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھے وہ بھی اسی قومی و دینی جذبہ کے تحت اٹھے تھے اور اعلائے کلمۃ الحق کرتے ہوئے اسپین سے ہند چینی تک
اپنا جھنڈا گاڑ دیا تھا۔ مرور زمانہ سے یہ جذبات قومی اور غیرت دینی ختم ہو گئے اور مسلمان حاکم کی جگہ دیگر اقوام کے محکوم بن گئے۔

اس راز کو جب یوروپین اقوام نے معلوم کیا تو انھوں نے ہر ذریعہ سے اپنے قومی جذبات کو ابھارنے کی کوشش شروع کر دی۔ فرق صرف اتنا
کہ مسلمان نے اپنی قومیت کی بنیاد دین و مذہب پر رکھی اور یورپ نے اپنی قوم کی بنیاد وطن پر۔ جیسا کہ اوپر آیا ہے کہ مسلمانوں کے جذبات قومی مردہ ہو چکے
تھے اب وہ اس قدر بے حس ہو گئے تھے کہ ان میں دوست اور دشمن کی تمیز تک باقی نہیں رہی تھی۔ اور جو کوئی ان کو ان کے ماضی کی یاد دلانا اور جذ
قومی کو بیدار کرنا چاہتا اسی کو اپنا دشمن تصور کرنے لگتے تھے۔ اور ادھر اقوام یورپ اس فکر میں تھے کہ مسلمان اِس خواب شیریں سے کبھی بیدار نہ ہوں او
اس کا یہ جذبہ مذہبی ہمیشہ کے لئے ہی مردہ ہو جائے اس کے لئے انھوں نے سینکڑوں جتن کئے۔ کہیں تو انھوں نے مسلمانوں کی غلط تاریخ لکھی اور ا
کے نامور بزرگوں کو اس رنگ میں پیش کیا کہ مسلمان خود اپنے بزرگوں سے متنفر ہو جائیں کہیں مسلمانوں کے مذہب کو ہدف ملامت بنایا اور ایسے ایسے
غلط اور جھوٹے اعتراض کئے کہ مذہب حقیر نظر آنے لگے۔ اس خصوص میں ہم مارگولیوتھ کی کتاب **Life of Mohammad** اور دیگر مصنفین یور
کی کتب سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پیش کریں گے جو ہمارے دعویٰ کی بین دلیل ہے۔ مارگولیوتھ کی کتاب سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت قابل
ذکر ہے کہ کوئی بات یا واقعہ اگر ایسا ہو کہ جس میں کسی اعتراض کی قطعاً گنجائش نہ بھی ہو تو وہ بھی اپنی لفاظی سے اس رنگ میں پیش کرتا ہے کہ وہ کم از کم بدنما
بدمنظر نظر آنے لگے۔ یہ سب اسی لئے کہ مسلمان اپنے دین سے برگشتہ ہو جائیں اور ان کے قومی جذبات فنا ہو جائیں۔

ان احتیاطوں کے باوجود بھی اگر مسلمانوں میں کوئی ایسا دردمند دل رکھنے والا پیدا ہو جائے جو ان کو ان کے ماضی کی یاد دلا کر ان کو ذوق عمل کی دعو
دے تو فوری جہاں قوت حاصل ہے وہاں قوت سے ان کو کچل دیا جاتا جیسے ہندوستان میں حضرت مولانا سید احمد شہیدؒ اور ان کے پیروؤں کے ساتھ ہو
مصر میں سید محمد مہدی سوڈانی اور طرابلس الغرب کی سنوسی تحریک کے ساتھ عمل کیا گیا۔ لیکن جہاں قوت نہ ہو وہاں مخالف پروپیگنڈا کی مہم آغاز کی جا
تاکہ عوام اپنے محسن کو دشمن تصور کرنے لگیں اور خیر خواہ کو بدخواہ سمجھیں۔

شیخ الاسلام نے جب احیائے سنت اور ردِ شرک و بدعت کی تعلیم کا آغاز کیا تو یورپ چونک پڑا وجہ یہ تھی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
بھی اوّل اوّل صرف توحید کی تعلیم اور شرک کی تردید فرمائی تھی ٹھیک اسی طرح حضرت شیخ الاسلام نے بھی شرک اور مشرکانہ اعمال وعقائد پر ضرب لگا
شروع فرمایا۔

یہاں یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جہاں خدائے تعالےٰ نے مسلمانوں کو خلافت ارضی دینے کا وعدہ فرمایا ہے وہیں ایک شرط بھی لازمی گردا
ہے یعنی۔ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا۔
یعنی صرف میری ہی عبادت کرو اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ ظاہر ہے کہ شرک کا لازمی نتیجہ مرعوبیت محکومیت ہے جس کی تصدیق

آیت سے ہوتی ہے ۔

سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا اَشْرَکُوْا بِاللّٰہِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ سُلْطَانًا ۔

ہم ان لوگوں کے دلوں میں اغیار کا رعب پیدا کر دیں گے جنھوں نے شرک کا ارتکاب کیا ہے ۔

مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا اصلی سبب بھی یہی ہے کہ وہ اسلام کی سیدھی سادی توحید کو چھوڑ کر اور یونان و مصر کے فلسفہ اور ویدانت کے معجون مرکب سے جس کا نام تصوف رکھ چھوڑا تھا متاثر ہو کر شرک و قبر پرستی کی لعنت میں گرفتار ہو گئے ۔ اور یہ بات تاریخ کی مسلمہ ہے کہ تصوف کی ابتدا ہی مسلمانوں کے زوال کا نقطہ آغاز ہے ۔

اس موقع پر مجھے مسٹر برنارڈ شا کا قول یاد آتا ہے وہ کہتے ہیں کہ یورپ نے دین کا دامن چھوڑا اور ترقی کرنے لگے ۔ اس کے برخلاف مسلمانوں نے دین کا دامن چھوڑا وہ تنزلی کی طرف چلے گئے ۔ اس کا یہ کہنا کس قدر حقیقت پر مبنی ہے اگر متذکرہ صدر آیات کی روشنی میں اس قول کو جانچا جائے تو اس کی صحت پوری طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے ۔

غرض ایسے وقت میں حضرت شیخ الاسلام نے دعوت توحید اور تردید شرک و بدعت کی آواز بلند کی تو حریف اقوام نے اس کوشش کی نظر سے دیکھا اور جب یہ نظر آیا کہ حضرت شیخ الاسلام کے متبعین کی جہادی سرگرمیاں بھی بڑھ رہی ہیں تو ان کو مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا خوف دامن گیر ہوا ۔ لیکن قوت سے اس تحریک کو دبانا ان کے لئے ممکن نہ تھا اور یہ بھی دیکھا کہ ترکی و مصری حکومتیں ان کے منشاء کو بخوبی پورا کر رہی ہیں تو اس میں ان کو الجھنے کی بالکل ضرورت نہ تھی اس لئے زبانی پروپیگنڈا کی مہم میں حصہ لینا ضروری تصور کیا ۔

اس کارِ خیر میں یوں تو سب ہی اقوام یورپ شریک ہیں جرمن بھی فرنچ بھی اسپینش بھی اور اٹالین بھی لیکن انگریز اس معاملہ میں سب سے زیادہ پیش پیش رہے اور ان کی خوش قسمتی سے وقت سازگار ملا اور بقول علامہ مشرقی کے شب اسلامیاں آمد بروز ۔ مرد جعفر زندہ روح او ہنوز ۔ ایسے لوگ جن میں روح "جعفر" و "صادق" حلول کر گئی تھی میسر آ گئے جو "آقا" کے وظیفہ کے بل بوتے پر خم ٹھوک کر میدان میں کود پڑے

یہ تھے سیاسی وجوہ جس کو تفصیل سے اوپر درج کیا گیا ان کے ماسوا حسب ذیل امور بھی حضرت شیخ الاسلام کی مخالفت میں سرگرم عمل تھے ۔

حضرت شیخ الاسلام نے جو تعلیم توحید و رد شرک دی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان خرافات کے اڈے ویران ہو جائیں چنانچہ یہی ہوا بھی، اس طرح ان درگاہوں خانقاہوں اور عاشور خانوں کے متولی و مجاور جن کا پیشہ ہی ان شرکوں سے نذر و نیاز کے نام پر روزی کمانا تھا اپنے ذریعہ معاش کو مسدود ہوتے دیکھ کر حضرت شیخ کے مخالف ہو گئے ۔ اور یہ سلسلہ کسی ایک مقام تک محدود نہ تھا ۔ مکہ معظمہ ۔ مدینہ منورہ ۔ عراق، شام، فلسطین مصر ۔ ایران ۔ افغانستان، ہندوستان، غرض ہر جگہ جہاں مسلمان بستے ہیں موجود تھا اور حرمین شریفین میں جو اہل اسلام کا روحانی مرکز ہے ایک بڑی جماعت کا گذر اسی قسم کی معاش پر تھا جنھوں نے کہیں تو مولد النبی ۔ کے نام سے کوئی جگہ بنائی تھی کہیں کسی اور نام سے غرض یہ لوگ اپنا ذریعہ معاش معرضِ خطر میں دیکھ کر حضرت شیخ الاسلام کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے ۔

ان کے علاوہ سب سے خطرناک دشمن حضرت شیخ الاسلام کا وہ گروہ شیوخ طریقت اور مرشدان باطل کا تھا جن کا پیشہ عوام کو امور دینی سے غافل رکھ کر خود کو مذہب کا ٹھیکہ دار بنانا اور مریدوں کی نذر و خیرات پر شاہانہ زندگی گذارنا تھا حضرت شیخ الاسلام کی تعلیم سے راست ضرب انہیں پر پڑتی تھی اس لئے یہ گروہ حضرت شیخ الاسلام کے خلاف ہرزہ سرائی میں سب سے سبقت لے گیا اور اب تک اپنے اسی شغل میں مشغول ہے ۔

۱؎ تصوف نے مسلمانوں میں بے عملی کی راہیں ہموار کیں اور جو قوم بے عمل ہو جاتی ہے ۔ وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتی ۔

الغرض ان اسباب کی بناء پر حضرت شیخ الاسلام کی مخالفت کی گئی اور حکومت مصر کے ابتدائی حملوں کے وقت ہی سے جماعت موحدین کو وہابی کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ جو بر خود غلط تھا۔ کیوں کہ اگر حضرت شیخ الاسلام کے مذہب کو ایک علیحدہ مذہب فرض بھی کر لیا جائے تو بانی مذہب کا نام تو محمد تھا عبدالوہاب ان کے والد تھے جو بقول صاحب تاریخ نجد علم جیراج پوری بیٹے کے عقائد کے خلاف بھی تھے تو اسی صورت میں اس جماعت کا نام صحیح طور پر محمدی ہو سکتا تھا وہابی نام رکھنا خود نام رکھنے والوں کی عقل و سمجھ کا دیوالیہ پن ہے ۔۔۔۔ جس طرح حضرت شیخ الاسلام ہر کام میں سنت نبوی کے پورے پورے تابع ہیں بالکل اسی طرح ان کے مخالفین بھی سنت ابولہب و ابوجہل کی پوری پوری پیروی کرنا ضروری تصور کرتے ہیں ٹھیک اسی طرح اوائل اسلام میں مشرکین مکہ نے بھی مسلمانوں کا نام صابی رکھا تھا۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ بہرحال جماعت موحدین کا نام وہابی رکھ دیا گیا لیکن ہم کو کسی تاریخ میں اس کا صریح حوالہ نہیں مل سکا کہ اول اول یہ نام کس نے رکھا تھا اور کب یہ نام رکھا لیکن قرائن بتلاتے ہیں کہ حضرت شیخ الاسلام کی زندگی ہی میں یہ نام رکھ دیا گیا تھا کیوں کہ صدیۃ السنیۃ میں عمران بن رضوان کے ایک قصیدہ میں یہ لفظ موجود ہے عمران صاحب نے حضرت امام شافعی کے اس شعر کو خفیف سی ترمیم سے اپنا لیا ہے۔ حضرت امام فرماتے ہیں۔ ان کان رفضا حب آل محمد ؞ فلیشھد الثقلان انی رافضی اس کو عمران بن رضوان نے حسب ذیل بنالیا ہے

ان کان تابع احمد امتوھبا ؞ فانا المقر بانني وھابی صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اقسام اقسام کی غلط بیانیاں تہمت تراشیاں افترا پردازیاں کی گئیں صدہا الزام عائد کئے گئے اور وہ سب کچھ کیا گیا جو وہ کر سکتے تھے۔

ان مفتریوں کی فوج کا ہراول سلیمان بن محمد بن احمد بن علی بن لحیم تھا جس نے حضرت شیخ کی زندگی ہی میں افترا پردازیاں شروع کر کے اس کار خیر کا افتتاح کیا تھا۔ اس نے ایک خط کے ذریعہ جس کی تمام دنیائے اسلام میں اشاعت کی گئی تھی حضرت شیخ پر بہت سی افترا پردازیاں کی تھیں جس کے جواب میں اول اول تو شیخ الاسلام نے ایک خط کے ذریعہ جو اس کتاب کے صفحہ ۱۷ پر نقل ہوا ہے تردید فرمائی اس کے بعد ایک رسالہ کے ذریعہ بھی جواب دیا ہے۔

اسی طرح محمد بن عبدالرحمٰن۔ احمد بن علی۔ عبداللہ بن عیسیٰ ابن فیروز وغیرہم زیادہ پیش پیش ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان کی تصانیف میں افترا، بہتان وغیرہ تو کم لیکن مغلظات فحش گالیاں اس کثرت سے بھری پڑی ہیں کہ ان کے نقل کی تہذیب و شرافت اجازت نہیں دیتی۔ کس قدر افسوسناک ذہنیت ہے بے پناہ بغض مخالفت کے جوش میں اندھے ہو کر انھوں نے وہ طریقہ اختیار کیا جو مسلمان کے لئے بے حد شرمناک اور اسلامی تہذیب و شرافت پر ایک بدنما دھبہ ہے۔ غرض یہ فحش گوئی ان کے عجز کی کھلی دلیل ہے اور یہ امر واقعہ ہے کہ توحید اتباع سنت کی تعلیم کی وہ تردید کب کیا سکتے تھے اگر کوئی جھوٹی بات گھڑ کر مشہور بھی کر دیتے تو تردید کی جا سکتی تھی اور کی گئی لیکن ان گالیوں کا جواب وہ عاشق سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کیا دیتا خود اس کے آقائے نامدار محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تو ابوجہل ابولہب عتبہ و شیبہ کی گالیوں کا جواب نہیں دیا تھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صبر فرمایا تھا۔ شیخ الاسلام نے بھی صبر فرمایا۔

اب ہم یہاں ان اکاذیب و افترا کا اجمالی ذکر کریں گے۔ جو حضرت شیخ الاسلام پر ان کے مخالفین و معاندین نے عائد کئے۔

ادّعاء نبوت

الدرر السنیہ صفحہ ۱۹۴ "محمد بن عبدالوہاب کے حالات سے پتہ لگتا ہے کہ وہ نبوت کا دعویٰ رکھتے ہیں لیکن ایسا کرنے کی ان کو جرات نہیں ہوتی"۔

اس الزام کی تردید تو حضرت شیخ الاسلام کی زندگی ہی میں ہوئی اور خوب ہوئی۔ لیکن یہ ایک ایسا بیہودہ الزام ہے کہ اس کو کوئی سنجیدہ اور

قل سلیم رکھنے والا شخص کبھی باور نہیں کر سکے گا۔ ان کے حالات بتلاتے ہیں کہ وہ ایک اٹل اور مضبوط عزم کے مالک تھے اور اگر وہ ایسا کرنا چاہتے تو دنیا کی کوئی قوت ان کو ان کے ارادہ سے باز نہیں رکھ سکتی تھی لیکن نبوت تو کیا وہ باوجود ایک بلند پایہ عالم ہونے کے اجتہاد تک کا دعویٰ بھی نہیں رکھتے تھے ۔ ہدیۃ السنیہ صفحہ ۹۹ پر ملاحظہ فرمائیں "

وَ اما مذھبنا فمذھب الامام احمد بن حنبل امام اھل السنۃ فی الفروع ولا ندعی الاجتھاد و اذا حصلت لنا سنۃ صحیحۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عملنا ولا نقدم علیھا قول احد کائنا من کان ۔

یعنی ہمارا مذہب فقہی فروعات میں امام اہل سنت امام احمد بن حنبل کا مذہب ہے اور ہم کو اجتہاد کا دعویٰ نہیں تاہم جب ہم کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی سنت مل جائے تو ہم اس پر عمل کرتے ہیں اور اس پر کسی کے قول کو ترجیح نہیں دیتے خواہ وہ کوئی ہی کیوں نہ ہو ۔ اسی طرح صیانۃ الانسان صفحہ ۴۸۱ پر ہے ۔

یعنی ہم اجتہاد کے اہل نہیں اور نہ ہم کو اس کا دعویٰ ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ بعض فروعی مسائل میں اگر کوئی مسئلہ کتاب و سنت کی واضح دلیل کے ساتھ سامنے آجائے اور جس کی تنسیخ بھی کسی دیگر قوی تر نص سے نہ ہوئی ہو اور ائمہ اربعہ میں سے کسی نے اس کو اختیار کیا ہو تو ہم اس پر عمل کرتے ہیں اور اس مسئلہ کی حد تک اپنا مسلک ترک کر دیتے ہیں "

اس کے بعد ناظرین کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ الزام ادعائے نبوت کی کیا حقیقت تھی ۔

تکفیر و قتال مسلمین

حضرت شیخ الاسلام کے خلاف دوسرا الزام یہ عائد کیا گیا ہے کہ وہ تمام اہل قبلہ کی تکفیر کرتے ہیں اور ان پر جہاد کرنا جائز تصور کرتے ہیں ۔ یہ الزام بھی حضرت شیخ الاسلام کی زندگی ہی میں عائد کیا گیا تھا اور مخالفین نے اس کا جواب بھی پالیا تحریری بھی اور عملی بھی لیکن یہ الزام بھی ان مفتریان باطل کو کچھ ایسا پسند آیا ہے کہ ہر اہل بدعت جو بھی حضرت شیخ الاسلام کے خلاف آواز بلند کرنا چاہتا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسی الزام کا آسرا لے کر کھڑا ہو۔ اس کا شافی جواب تو حضرت شیخ الاسلام نے متعدد بار دیا ہے ملاحظہ ہو۔ تبریۃ الشیخین الامامین ۔

واذا کنا لا نکفر من عبد الصنم الذی علی قبر الاحمد بدوی وعلی القبہ عبد القادر (جیلانی) وامثالھم لاجھال جھلھم وعدم منبھم فکیف نکفر من لم یشرک باللہ ولم یھاجر الینا ولم نکفر ،

یعنی جب کہ ہم ان قبر پرستوں کی تکفیر نہیں کرتے جو اپنی جہالت اور عدم واقفیت کی وجہ سے احمد بدوی یا عبد القادر جیلانی کی قبروں کی پرستش کرتے ہیں تو پھر ہم ان لوگوں کی تکفیر کس طرح کر سکتے ہیں جنھوں نے اس طرح کا ارتکاب نہیں کیا اور نہ کسی کفر کا کام کیا اور ہجرت کر کے ہماری طرف نہیں آئے اس الزام کے عائد کرنے میں جہلا کو ایک غلط فہمی ہوئی ہے ۔ اس لئے اس کی وضاحت یہاں کی جاتی ہے ۔

فقہ حنفی کے سوا بقیہ ہر سہ ائمہ کا متفقہ فتویٰ ہے کہ سستی سے نماز ترک کرنے والا کافر ہے ۔ چونکہ حضرت شیخ الاسلام فقہ حنبلی کے پیرو ہیں اور اس فقہ کا بھی یہی فتویٰ ہے اس لئے وہ اگر تارک صلوٰۃ کو کافر تصور کریں تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہر شافعی ہر مالکی اور ہر حنبلی ایسا ہی تصور کرنے پر شرعاً مجبور ہے لہٰذا اس فتویٰ کفر کے تنہا حضرت شیخ الاسلام ذمہ دار نہیں ۔

تارک صلوٰۃ کے بعد مقابر پرست جھنڈا و تعزیہ پرست ہیں ان کی نسبت حضرت شیخ الاسلام کے معاصر اور ہم خیال حضرت علامہ امیر محمد بن اسمٰعیل یمانی کا فتویٰ ہے کہ "بت پرستوں اور قبر پرستوں و دیگر اوثان باطل کی پرستش کرنے والوں میں کوئی فرق نہیں یہ دونوں کافر ہیں " تطہیر الاعتقاد صفحہ ۱۲ (علامہ امیر محمد بن اسمٰعیل یمانی ۔

لیکن حضرت شیخ الاسلام اس مسئلہ میں بہت حد تک نرم ہیں اور عام طور پر کفر کا فتویٰ دینے کے بجائے اتمام حجت شرط لازمی قرار دیتے ہیں۔
ملاحظہ ہو۔ تبرئۃ الشیخین الامامین صفحہ ۸۶

ترجمہ

شیخ الاسلام نے ان مُردہ پرستوں کی تکفیر کی ہے جو اولیاء اللہ اور نیکوکار بندوں سے مرادیں مانگتے ہیں اور جو تبلیغ و حجت اور طریق حق کے سمجھانے کے بعد بھی اپنے شرک سے باز نہیں آتے اور نہ صرف یہی کیا بلکہ انھوں نے قتال میں بھی پیش قدمی کی، تب حضرت شیخ الاسلام نے بھی ان سے قتال کیا ان کا خون لیا، ان کا مال لوٹا کیوں کہ کتاب وسنت اور ائمہ سلف کا اجماع سب اس کی تائید میں ہے۔

دوسری جگہ الہدیۃ السنیہ صفحہ ۳۲ پر ہے۔

ترجمہ۔ یہ اور اُن جیسے دوسرے لوگ جو اولیاء اور نیکوکار بندوں کی پرستش کرتے ہیں اور ان سے استغاثہ و دعا کرتے ہیں ان کے بارے میں ہمارا فتویٰ یہ ہے کہ تبلیغی حجت ختم ہو جانے کے بعد بھی اگر وہ اپنے شرک پر قائم و مصر رہیں تو ہم ان پر شرک کا حکم لگاتے اور ان کو کافر تصور کرتے ہیں ''

ان حالات میں جو اوپر بیان ہوئے ہیں حضرت شیخ الاسلام کا ایسے لوگوں کو کافر تصور کرنا اور ان پر جہاد کرنا اور وہ بھی کہ قتال کی ابتدا بھی مخالفین نے ہی کی ہو کوئی نئی بات نہیں تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی مانعین زکوٰۃ پر جہاد فرمایا تھا حالانکہ وہ جملہ ارکانِ اسلام بجالانے کے مصر تھے صرف زکوٰۃ سے معذوری ظاہر کرتے تھے جب صرف ایک فریضہ کا ترک کفر کے حدود میں داخل کر سکتا ہے تو پھر شرک جیسے عمل پر اور وہ بھی بعد اتمام حجت وتفہیم وتبلیغ اگر جہاد کیا جائے تو اعتراض کا کیا موقعہ ہو سکتا ہے۔ اگر حضرت شیخ الاسلام کے اس عمل پر کسی کو اعتراض کی جرأت ہو سکتی ہے تو اس کو اولاً حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر بھی اعتراض کرنے کی جرأت کرنی چاہئے۔

ہم نے کہیں لکھا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام کے ایسے فتوے سے جُہلاء کو تکفیر عمومی کو دھوکہ ہوا ہے لیکن اس الزام تراشی میں سب ہی شامل ہیں جاہل بھی، عالم بھی اور وہ بھی جو کہ خود کو مدعی علم تصور کرتے ہیں یہ سلسلہ حضرت شیخ الاسلام کی زندگی سے اس وقت تک برابر چل رہا ہے۔ شیخ کا ہر مخالف اِس الزام کو دھراتا ہے چنانچہ دیوبند کے شیخ الحدیث علامہ انور شاہ فیض الباری علی صحیح البخاری میں ایک جگہ حاشیہ پر تحریر فرماتے ہیں ''

اما محمد ابن عبد الوھاب النجدی فانہ کان رجل بلیداً قلیل العلم فکان سارع الی الحکم بالکفر۔

ترجمہ۔ محمد بن عبد الوہاب تو ایک کم فہم اور کم علم شخص تھے۔ اس لئے وہ کفر کا فتویٰ دینے میں بہت عجلت کرتے تھے کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ علامہ انور شاہ جیسے شخص جو ہندوستان میں (باہر کی نسبت میں کچھ عرض نہیں کر سکتا) اچھے عالم سمجھے جاتے تھے ایسا لکھ گئے جو صریحاً شیخ کے عمل کے خلاف ہے معلوم ہوتا ہے علامہ انور شاہ صاحبؒ نے نہ تو حضرت شیخ الاسلامؒ کی تصانیف مطالعہ کی ہیں اور نہ ان کے تلامذہ کی۔ حضرت کا پایہ علم تفسیر حدیث فقہ میں اس قدر بلند ہے کہ اس پر کسی تنقید کی گنجائش نہیں آپ کا عمل اور متعدد تصانیف اس کی شہادت کے لئے کافی ہیں۔

ا ہندوستان کے بعض علماء کے سلسلہ میں عموماً........اور کتاب فیض الباری علی صحیح البخاری پر خصوصاً جو تنقید اخبار المنار مصر میں کی گئی ہے وہ ظاہر کرتی ہے کہ علماء بلاد عرب کا ان علما کی نسبت بلحاظ ادب عربی و بلحاظ معلومات فقہی کیا خیال ہے۔ ع ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی۔

حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں۔

گر نہ بیند بروز شب پرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

انہدام قبہ جات و مقابر

یہ الزام الزام نہیں حقیقت ہے لیکن اس کو گروہ مخالف نے رنگ چڑھا کر حاشیہ آرائی کر کے اور نمک مرچ لگا کر چٹپٹا کر دیا ہے۔ ع

ذرا سی بات تھی اندیشہ نے جسے
بڑھا دیا ہے فقط زیب داستاں کے لئے

غرض کہ سب نے حقیقیاً مسلمان مورخین نے تو اس کا کوئی ذکر نہیں کیا البتہ چند معاندین نے یورپین مصنفوں کی طرح رنگ آمیزی کر کے پیش کیا ہے۔
Bluart, Murgolioth, Bridges, Huges, Philbi, Burkardt.

یہ صحیح ہے کہ مقابر پر جو قبہ جات خلاف احکام شرع بنائے گئے تھے اور جہاں ہر قسم کی بدعتیں مشرکانہ افعال جہالت اور نا مشروع حرکات ہوتی تھیں وہ البتہ گرائے گئے تو یہ بھی کوئی نیا کام نہیں ہوا الہدیۃ السنیۃ حاشیہ صفحہ ۴۹ پر علامہ رشید رضاؒ تحریر فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ نے لکھا ہے کہ ان کے زمانہ میں امراء نا مشروع بنی ہوئی قبروں کو علماء کے نصوص کے مطابق منہدم کر دیا کرتے تھے۔

ابن حجر ہیثمی کتاب الزواجر صفحہ ۱۲۱ میں یوں فرماتے ہیں ان قبروں پر جو قبہ تعمیر کئے گئے ہیں ان کو فوری منہدم کر دینا چاہئے کیونکہ یہ مسجد ضرار سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔

غرض یہ بزرگ تو کتابوں میں لکھ گئے حضرت شیخ الاسلامؒ نے ان کو عملاً کر دکھایا۔ سیدنا حضرت عمر فاروق رضؓ نے شجر بیعت رضوان جس کا قرآن پاک میں ذکر ہے، ——— اس پر خلاف احکام نبوی عمل ہوتا دیکھ کر اسے جڑ سے کاٹ دیا تھا اگر حضرت شیخ الاسلام یہ عمل کر کے وہابی مشہور ہوتے ہیں تو یہی خطاب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو بھی دیا جانا چاہیئے۔

البتہ قبہ نبوی کے انہدام کا الزام جس کو متذکرہ صدر یورپین مصنفین نے مبالغہ کی حد تک پہونچا دیا ہے سراسر کذب جھوٹ افتراء اور بہتان ہے قبہ نبویؐ اپنی تعمیر کے وقت سے آج تک جوں کا توں موجود ہے۔

انکار حدیث

یہ الزام بڑا دلچسپ اور جھوٹ میں اپنا جواب آپ ہے زمانہ نے آج تک اس سے بڑا جھوٹ نہ سنا ہوگا ——— یہ الزام لگانے والا پہلا مفتری مصنف مصباح الانام ہے جو کتاب مذکورہ کی صفحہ ۵-۶ پر رقم طراز ہے کہ وہ حدیث شریف سے صرف اسی قدر لیتے ہیں جس قدر ان کے اغراض کے لئے ضروری ہے۔ اس الزام کے عائد کرنے میں مفتری نے یہ غور نہیں کیا کہ جس شخص کا حال یہ ہو کہ سنت نبوی پر جان تک فدا کرنے میں دریغ نہ ہو اس پر یہ الزام لگایا جائے تو بجز اس مفتری یا معاندین کو جوش عناد نے پاگل بنا دیا ہو کوئی صحیح الدماغ شخص یقین کیوں کر کرے گا۔ چنانچہ اسی حوالے سے فضل رسول بدایونی نے اپنی کتاب تصحیح المسائل در تردید فرقہ نجدیہ از زال میں اسی الزام کو دہرایا ہے۔ کتاب کا نام خود ظاہر کرتا ہے کہ مصنف کس اخلاق اور کس قماش کا شخص ہوگا۔ ایسے شخص کا جواب دینے کی کوشش کرنا خود کو بھی اسی طبقہ میں شمار کرنے کے برابر ہوتا ایسے لوگوں کا جواب حضرت شیخ سعدی کے مشورہ کے موافق صرف خموشی ہے یہ وہ اشخاص تھے جو خود کو مسلمان کہتے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۵ دوسری طرف ایک عیسائی پادری مصنف ڈکشنری آف اسلام اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"وہابیت کو اسلام کا پروٹسٹنٹ فرقہ کہنا بجا ہوگا اگرچہ کہ اس میں اور فرقہ پروٹسٹنٹ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پروٹسٹنٹ فرقہ کے لوگ صحف سماوی کو بنیادی تعلیم تصور کر کے روایتی بیانات کو مسترد کر دیتے ہیں لیکن ان کے برخلاف وہابی فرقہ کے لوگ قرآن مجید کے بعد احادیث نبوی کو بھی بنیادی تعلیم کا جزو تصور کرتے ہیں۔"

مَا شَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَاءُ

حکیم سنائیؒ نے شاید اسی موقع کے لئے فرمایا تھا۔ گرفتہ احرام و مکی خفتہ در بطحا ایک مسلمان مفتری کا ایک جھوٹی بات حضرت شیخ الاسلامؒ کی نسبت لکھنا اور ایک متعصب عیسائی کا اس کی تردید کرنا جھوٹے مسلمان کے منہ پر تھوکنے کے برابر ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین اور تحقیر کا الزام

مخالفین توحید نے یہ الزام اس زور شور سے عائد کیا اور اس کا چرچا کیا کہ جاہل عوام نے یہ بات وحی الٰہی کی طرح مان لی کہ موحدین آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بڑے بھائی کے برابر تعظیم کا مستحق خیال کرتے ہیں یا آپ کی توہین و تحقیر کرتے ہیں خود راقم الحروف نے یہ بات کئی ایسے حضرات کی زبانی سنا ہے کہ ان کو اس طرح کہنے سے قبل عالم کم از کم سمجھدار تصور کرتا تھا معلوم نہیں کہ مخالفین جھوٹ پر اس قدر دلیر کیوں ہو گئے اور یہ خدا کو کیا جواب دیں گے یہ الزام حضرت شیخ الاسلامؒ کی وفات کے بعد لگایا گیا تھا اور حضرت شیخ الاسلامؒ کے صاحبزادہ حضرت شیخ عبداللہ بن محمد بن عبدالوہابؒ نے سنہ ۱۲۱۸ھ میں جب کہ سلطان سعود بن محمدؒ نے مکہ معظمہ کو فتح کر کے وہاں کے لوگوں میں موحدین نجد کے عقائد کے متعلق جو رسالہ تقسیم کرایا تھا اس میں اس قسم کی تمام غلط بیانیوں افتراء اور جھوٹ کی تردید فرمائی ہے محمود شکری الالوسی نے کتاب تاریخ نجد صفحہ ۴۰ تا ۴۹ میں اس رسالہ کی نقل درج فرمائی ہے اس کا ضروری اقتباس ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

ترجمہ

اور ہم پر .... جو جھوٹ دشمنوں نے مشہور کیا ہے یعنی یہ کہ ہم قرآن مجید کی تفسیر اپنی رائے سے کرتے ہیں اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے صرف اسی قدر سنتے ہیں جو ہماری سمجھ اور ضرورت کے موافق ہو اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک کو گھٹانے کے لئے ہم یہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر میں ایک بوسیدہ ہڈی کے برابر ہیں اور ہمارے ہاتھ کا عصا آپ سے زیادہ فائدہ بخش ہے معاذ اللہ اور یہ کہ ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے منکر ہیں اور قبر اطہر کی زیارت سے منع کرتے ہیں یا تمام عالم کے مسلمانوں کی تکفیر علی الاطلاق کرتے ہیں تو ان تمام اور ان جیسی دوسری تہمتوں کی نسبت ہمارا صرف ایک ہی جواب ہے کہ سبحانک ھذا بہتان عظیم۔ خداوند تو پاک ہے اور ہم پر یہ بہت بڑا بہتان لگایا گیا ہے۔

اس جواب کے بعد مزید کچھ لکھنا بے سود ہوگا کیوں کہ کسی مسلمان اور راسخ العقیدہ مسلمان کا جو مشرک و بدعتی نہ ہو قرآن پاک کی آیت مبارک درمیان میں رکھ کر اپنی برات کرے تو ہر مسلمان کو یقین کرنا ہی چاہئے البتہ منافقین اس سے مستثنیٰ ہیں اسلئے اس خصوص میں مزید کچھ لکھنا غیر ضروری ہے۔

اس موقعہ پر ہم اہل نظر سے کیا یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین و تحقیر کرنے والے پیروان سنت ہو سکتے ہیں یا تارکان سنت کیا آپ کے بتلائے ہوئے دین میں طرح طرح کی جدید بدعتیں ایجاد کر کے گویا عملاً آپ کی تعلیم کو ناقص قرار دینے والے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کر رہے ہیں یا وہ موحد جو آپ کے احکام پر بلا چون و چرا گردن جھکا دیتے ہیں کیا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کو صدمہ پہونچانے والے توحید پرست ہو سکتے ہیں یا تصوف کی تاویلات بارد کا آسرا لے کر قبر پرستی کرنے والے حضرات ونیز کیا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت

کے مستحق آپ کے بتائے ہوئے طریقہ پر نماز باجماعت قائم کرنے اور جملہ ارکان اسلام کو کماحقہ ادا کرنے والے مسلم ہو سکتے ہیں یا قوال کی ڈھولک و مزار پر ناچنے والے ؟ ۔ اس کا فیصلہ ناظرین پر چھوڑا جاتا ہے ۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کی تعلیم کے خلاف معاندین کی کتب

حضرت شیخ الاسلامؒ کے خلاف مخالفین و معاندین نے جو کچھ لکھا اس میں سے حسب ذیل کتب مشہور ہیں اور عام طور پر دستیاب ہوتے بھی ہیں جیساکہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ توحید اور اتباع سنت کے خلاف تو وہ کیا کہتے اور کیا لکھتے البتہ جھوٹے الزام غلط افتراء اور سب سے بڑھ کر مغلظات و فحش گالیاں بکنے میں اپنا ہنر خوب خوب ظاہر کیا ہے ۔ اس کے منجملہ حسب ذیل کتب جن کی تفصیل درج ذیل ہے ان سب میں تقریباً وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے فرق صرف طرز نگارش اور انداز بیان کا البتہ ہے ۔

۱ ۔ صلح الاخوان ۔ اس کا مصنف داؤد بن سلیمان بن جرجیس ہے جو سب سے پہلا مفتری ہے اس نے حضرت شیخ الاسلام کی زندگی ہی میں افترا انگیزیاں شروع کر دی تھیں اور حضرت شیخ الاسلامؒ نے اس کا جواب بھی دیا تھا اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً اس کے جوابات دیئے جاتے رہے ۔ تاریخ نجد الالوسی کے صفحات ۴۹ تا ۲ ۷ پر اسی داؤد بن سلیمان اور حضرت علامہ عبداللطیف بن حسین بن محمد بن عبدالوہابؒ کا ایک مناظرہ درج ہے جو دلچسپ اور معترض کے مسکت جواب ہونے کی وجہ اختصاراً درج کرتے ہیں اس سے ممکن ہے کہ ناظرین کو اندازہ ہو سکے کہ معاندین توحید کس قسم کے اعتراض اہل توحید پر کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں ۔ داؤد بن سلیمان نے پہلا اعتراض یہ کیا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شام و یمن کے لئے دعا فرمائی اور صحابہ کے تین بار عرض کرنے پر بھی نجد کے لئے دعا نہ فرمائی بلکہ یہ فرمایا تھا کہ وہاں زلزلے اور فتنے ہوں گے ۔

اس کا جواب علامہ عبداللطیف نے حسب ذیل دیا ہے کہ کسی مقام کا افضل یا خراب ہونا اس کے باشندوں پر منحصر ہوتا ہے جس جگہ کے لوگ عالم باعمل ہوں اور پابند شرع شریف ہوں وہ جگہ بہرحال بہتر تصور کی جائے گی ۔ اہل نجد کے جملہ قبائل بزمانہ خلافت راشدہ روم و ایران کے معرکوں میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ تاریخ کے صفحات میں آج تک محفوظ ہیں ۔ تم کو یہ حدیث تو معلوم ہی ہو گی کہ اہل نجد میں سے جب بنی تمیم اپنے صدقات لے کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا تھا کہ یہ میری قوم کے صدقات ہیں کیوں کہ قبیلہ قریش اور قبیلہ تمیم میں قدیم سے رشتہ دارانہ تعلقات قائم تھے ۔ پھر ان کی فضیلت میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ دجال کے حق میں میری امت کے سب لوگوں سے زیادہ سخت ہوں گے یہ تو ہوئے ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمام اہل عرب کے جو فضائل ہیں ان میں اہل نجد بھی برابر کے شریک ہیں کیوں کہ وہ خالص عرب ہیں تعجب تو یہ ہے تم اہل عراق ہم پر مسیلمہ کذاب کی وجہ سے طعن کرتے ہو ۔ یہاں تو خیر ایک مسیلمہ کذاب گذرا ہے لیکن عراق وہ جگہ ہے جہاں صدہا فتنہ اور زلزلے گذر چکے ہیں خارجی وہیں پیدا ہوئے ۔ جہمیہ ۔ شیعہ ۔ روافض کا ظہور وہیں سے ہوا ۔ معتزلہ کا الحاد اسی سرزمین کی پیداوار ہے تصوف کی صدہا بدعتیں ، وحدۃ الوجود کا عقیدہ فنافی اللہ فنافی الشیخ وغیرہ کی من گھڑت ایجادات وہیں ایجاد ہوئیں ۔ قرامطہ اور نصیری وہیں جنم لئے مختصر یہ کہ وحدت اسلامی کے پارہ پارہ کرنے والے جس قدر آفات ہو سکتے تھے ان کا منبع عراق ہی ہے کیا تم کو طبرانی کی وہ حدیث یاد نہیں جس میں روایت کی گئی ہے کہ شیطان عراق میں داخل ہوا تو وہاں قضائے حاجت کیا شام پہونچا تو نکالا گیا اور مصر پہونچا تو وہاں پھولا پھلا ۔ اسلام سے پہلے بھی عراق آتش پرستی اور گاؤ پرستی کا مخزن رہ چکا ہے اگر تم کہو کہ اسلام نے عراق کو فتح کر کے اس کو تمام الائشوں سے پاک کر دیا ہے تو کیا وہی اسلام نجد کو پاک نہیں کر سکتا ۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث مذکورہ اس طرح روایت ہوتی ہے " هناك الزلازل والفتن واشار الى العراق ، یعنی وہاں زلزلے اور فتنے ہوں گے فرما کر اشارہ عراق ، یعنی مشرق کی سمت فرمایا تھا اور حافظ ابن حجر نے اس حدیث میں نجد سے عراق مراد لیا ہے (نجد زبان عربی میں سطح مرتفع کو کہتے ہیں) اور جامع کبیر میں امام طبرانی نے بھی جس طریق سے اس حدیث کی روایت کی ہے اس میں

بھی عراق کی صراحت ہے۔ سب سے زیادہ صحیح مسلم کی وہ روایت ہے جس میں بعض اہل عراق نے حضرت ابن عمرؓ سے فتویٰ دریافت کیا تھا کہ محمد کا خو
پاک ہے یا ناپاک۔ اس پر آپ نے جواب دیا تھا کہ تم لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں کو تو خوب چھان بین کرتے ہو لیکن امام حسین کو بلا تامل قتل کر کے بڑے
بڑے گناہ بے دھڑک کئے جاتے ہو پھر عراق کی جانب اشارہ کر کے فرمایا تھا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ فتنہ اس طرف نکلے گا
اب تم ائمہ حدیث کی تصریحات ونیز واقعات پیش آمدہ کی روشنی میں غور کرو تو تم کو نظر آئے گا کہ نجد سے مراد تمہارا عراق ہے ہمارا نجد نہیں۔ دوسرا اعتراض
یہ تھا کہ موحدین نجد تمام مسلمانوں کو کافر تصور کرتے ہیں اور ان سے قتال جائز تصور کرتے ہیں۔
اور تیسرا اعتراض زیارت قبور سے منع کرنا اور گنبدوں کو منہدم کرنا تھا سو ان ہر دو اعتراضات کا جواب وہی دیا گیا جو ہم نے صفحہ ۲۴ کتاب ہذا پر درج کی

۲- الصواعق الالٰهيه فی الرد علی الوهابيه ——— مصنف شیخ سلیمان بن عبد الوہاب۔ یہ حضرت شیخ الاسلام کے
بھائی تھے — حسد کی وجہ سے اپنے بھائی کے مخالف ہو گئے تھے اور تائب ہو کر تلافی مافات بھی کر دی لیکن مخالفین شیخ کے ہاتھ ایک اچھا فاصا ہتھیار
آگیا کہ وہ اس رسالہ کا تو خوب مزے لے کر ذکر کرتے ہیں لیکن تائب ہونے کا بالکل ذکر نہیں کرتے اس رسالہ میں گروہ مخالفین نے بہت کچھ ایزاد بھی کر لیا ہے۔ خود
اس کا نام ظاہر کرتا ہے کہ اس رسالہ کا نام بھی بعد میں تراشا گیا ہے کیونکہ یہ رسالہ شیخ الاسلام کی دعوت و تبلیغ کے اوائل زمانہ میں لکھا گیا تھا اور وہابی کا خطاب
اس وقت تک جماعت موحدین کو عطا نہیں ہوا تھا۔

۳- الصواعق الرعود۔ از عبد الله بن داؤد الزبيري الحنفی

۴- مصباح الانام وجلاء الظلام۔ مصنف السيد احمد عبد الله الحداد

۵- الفصل الخطاب فی رد ضلالات ابن عبد الوهاب۔ مصنف احمد القبانی البصری

۶- كشف النقاب عن عقائد ابن عبد الوهاب۔ سید داؤد علی نقوی — مطبوعہ مطبع حیدرآباد ۱۳۲۵ھ

۷- كشف الحجاب عن عبد الوهاب ۱۳۵۱ھ مصنف غلام حسین قلمی کلام علی ص ۲۰۱

یہ وہ علماء شیعہ کی تصانیف ہیں ۱۸/ ذی الحجہ ۱۲۱۶ کو سلطان عبد العزیز بن سعود نے کربلا پر جو حملہ کیا تھا یہ کتب اسی کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہیں
فرسودہ الزام اور بہتانوں کو دہرایا گیا ہے اور غیر متعلقہ احادیث سے ان مفروضات کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے بعد وہی پرانا حربہ
دشنام طرازی و فحش نگاری اختیار کی ہے۔ جس وقت موحدین نجد نے بعض سیاسی مصلحتوں کی بنا پر کربلا پر حملہ کر کے وہاں کی مقابر و گنبد جن پر مراسم شرک
ادا ہوتے تھے منہدم کر کے کامیاب ہوتے اس وقت شاہ ایران فتح علی شاہ قاچار نے سلطان نجد کو دھمکی آمیز خط لکھا تھا کہ وہ ایک لاکھ فوج کے ساتھ قلب
پر فوج کشی کرے گا۔ لیکن چونکہ اب سے گیارہ سو سال پہلے بھی آتش پرستان ایران موحدین عرب کی تلوار کی دھار دیکھ چکے تھے اور ایک نہیں کئی
لاکھ افواج چند ہزار عربوں کے مقابلہ میں آکر ناکام ہوئی تھی لہذا اب کی بار بھی علم و تعزیہ پرست اہل ایران کا موحدین نجد کے مقابلہ میں آنا۔ مَنْ جرب المجرب
حلت به الندامة کا مصداق ہوتا لہذا شاہ ایران کا یہ خواب پریشان شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اب رہا گالیاں دے کر دل کی بھڑاس نکالنا تو جس قوم کے ا
کی زبان سے خلفائے راشدین جیسی مقدس ہستیاں نہ بچ سکیں۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نہ بچ سکیں۔ حضرت سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی
کو نہ چھوڑا ہو وہ حضرت شیخ الاسلام کی شان میں لب کشائی کریں تو ان کو معذور تصور کرنا چاہیئے دشنام بمذہبے کہ طاعت باشد۔ مذہب معلوم و اہل مذہب

تصانیف حضرت شیخ الاسلام

ہمارا ارادہ تھا کہ حضرت شیخ الاسلام کی تعلیم کے ضمن ہی میں ان کے تصانیف کا بھی ذکر کر دیں لیکن ہم نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ حضرت کی تصانیف سے اہل
بہت کم واقف ہیں اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ آپ کی تصانیف پر تبصرہ کے ساتھ ان کا کچھ اقتباس بھی پیش کریں تاکہ قارئین کرام کو اندازہ ہو جائے کہ
کی تصانیف کس پایہ کی ہیں۔ اس لئے ایک علیحدہ باب اس کے لئے قائم کیا گیا۔

ہمارا ارادہ ہے کہ بعض خاص تصانیف کا اردو ترجمہ بھی نذر ناظرین کریں انشاء اللہ اگر وقت اور موقع تو ملے تو اس ارادہ کی تکمیل بھی ہوگی۔

یوں تو حضرت شیخ الاسلام کی تصانیف بڑی اور چھوٹی ملا کر جن میں رسالہ جات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ ۲۰ تک پہونچتی ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام کا پایہ علم و فضل میں بہت بلند تھا لیکن باایں ہمہ آپ کی تصانیف بالکل سیدھی سادی محدثانہ اصول پر ہیں ان میں نہ تو فلسفیانہ موشگافیاں ہیں اور نہ متصوفین کی طرح دعاوی و رکاکات۔ قرآن مجید کی آیات ہیں ان کی تائید میں احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے بعد اُن سے جو جو مسائل یا اوامر و نواہی مستخرج ہوتے ہیں ان کو صاف صاف پیش فرمایا ہے نہ حذف نہ ایزاد نہ تاویل نہ تحریف جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو بات ان کے قلم سے نکلی وہ دل سے نکلی اور دل میں اتر گئی ہر نظر تاثیر میں بنی ہوتی ہے۔ کیوں نہ ہو انھوں نے کوئی بات اپنی طرف سے کہی نہیں صرف فرمودہ خدا اور ارشاد رسول نقل کرتے چلے گئے ہیں۔

لیکن افسوس تو یہ ہے آپ کی اکثر تصانیف ہندوستان میں یا تو پہونچی ہی نہیں یا اگر پہونچیں تو اس سے بہت کم لوگوں نے استفادہ کیا بعض لوگ تعصب کی وجہ سے ان کو پڑھنا پسند نہیں کرتے اور ایسے مفید نصائح سے محروم ہیں۔

کتاب التوحید

سب سے پہلے ہم کتاب التوحید کا ذکر کریں گے اس کتاب میں کلام مجید اور احادیث نبوی صلے اللہ علیہ وسلم میں توحید اور انسداد شرک و باطل پرستی کی جو تعلیم دی گئی ہے اس کا خلاصہ یکجا جمع کر دیا گیا ہے ترتیب یہ ہے کہ کسی مسئلہ میں اس کی نسبت جو آیات قرآنی موجود ہیں ان کو ایک جگہ درج فرمایا ہے اس کے بعد احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے جس قدر احادیث صحیحہ دستیاب ہوئیں وہ درج کی گئی ہیں اس کے بعد ان آیات و احادیث سے جو مسائل مستخرج ہوتے ہیں ان کو درج کیا گیا ہے۔

مسائل الجاھلیۃ

حضرت شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کی یہ دوسری تصنیف ہے اس میں انھوں نے اپنے ایک سو اکیس [۱۲۱] ایسے مسائل کا انتخاب کیا ہے جو زمانہ جاہلیت میں مشرکین عرب میں رائج تھے جن کی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مخالفت فرمائی تھی۔ اس کتاب کی ترتیب ایسی ہے کہ اولاً مسائل پر آیات قرآنی نقل دیئے گئے ہیں اس کے بعد احادیث پیش کئے گئے۔ اس کے بعد دوسرا مسئلہ لیا گیا ہے اس کتاب میں بھی مصنف نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا ہے بس قرآن و حدیث جو کہتے ہیں وہ پیش کر دیا گیا ہے دیباچہ کتاب مذکور ملاحظہ ہو۔

یہ وہ مسائل ہیں جن پر مشرکین عرب زمانہ جاہلیت میں عمل پیرا تھے اور جن کی مخالفت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی پس جو شخص ان میں سے کسی مسائل کو اب بھی کرتا ہو تو وہ گویا دین جاہلیت پر ایمان رکھتا ہے جو اس کے نقص ایمان کی دلیل ہے جیسے ارشاد باری تعالےٰ ہے، وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ "جن لوگوں نے باطل پر ایمان رکھا اور اللہ تعالےٰ سے کفر کیا وہ یقیناً گھاٹے میں ہیں"

اب ہم بطور نمونہ کتاب مذکور سے ایک دو مسئلے نقل کرتے ہیں ناظرین اندازہ کریں گے۔ یہ کتاب کس پایہ کی ہے۔

مسئلہ صلحاء و اولیاء کو پکارنا

صلحاء و بزرگان مرحومین کو پکارنا خدائے تعالےٰ سے دعا کرتے وقت ان بزرگوں کو بھی شریک کرنا اس نیت سے کہ یہ اللہ تعالےٰ کے دوست ہیں اور ہماری سفارش اللہ تعالےٰ کے پاس کریں گے اس کے متعلق اللہ بزرگ و برتر کا یہ فرمان ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ط وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ

اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی۔ اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ بَیْنَھُمْ فِیْ مَاھُمْ فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ۔ (سورہ زمر)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔ وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَالَا یَضُرُّھُمْ وَلَا یَنْفَعُھُمْ وَیَقُوْلُوْنَ ھٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰہِ یعنی اللہ تعالے کے سوا دوسروں کی عبادت کرتے اور کہتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ تعالے کے پاس ہماری سفارش کریں گے۔

یہ ان بڑے مسائل میں سے ہے جن پر ایمان کا دارومدار ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شدت سے مخالفت فرمائی ہے اور یہی وہ مسئلہ ہے جس سے آدمی کا رجحان طبع کہ اس کا میلان اسلام کی جانب ہے یا کفر کی جانب شناخت کیا جاسکتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ شرک کے بالکل نزدیک پہونچ دیتا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرک پر جنت حرام اور دوزخ واجب ہونے کی خبر دی ہے۔

۱۳۔ تقلید ایام جاہلیت کا دین یہی تھا کہ ان کے بزرگ جو سب کفار تھے ان کی تقلید کی جائے چنانچہ ارشاد باری ہے۔ وَکَذٰلِکَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ فِیْ قَرْیَۃٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْھَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّۃٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِھِمْ مُّقْتَدُوْنَ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُکُمْ بِاَھْدٰی مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَیْہِ اٰبَآءَکُمْ قَالُوْٓا۔ الخ اور جب ہم نے ایک شہر میں اپنا پیغمبر بھیجا (یعنی مکہ معظمہ میں) جو ان کو اللہ سے ڈراتا تھا تو وہاں کے لوگوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آباواجداد کو اسی دین پر پایا تھا اور ہم ان ہی کی پیروی کریں گے۔"

سورہ اعراف میں ایک دوسری جگہ ارشاد باری ہے۔ وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا اَوَ لَوْ کَانَ اٰبَآؤُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَھْتَدُوْنَ۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس پر عمل کرو تو ان مشرکین نے کہا کہ ہم تو وہی کریں گے جو ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں بحالیکہ ان کے باپ دادا نہ سمجھ بوجھ رکھتے تھے اور نہ ہدایت یافتہ تھے۔

اس رسم جاہلیت کا پھندا ابھی تک اپنی پوری شدت سے مسلمانوں کی گردنوں میں پڑا ہوا ہے لوگ سنّت کو توڑ ے جہالت کے ساتھ ترک کر دیتے ہیں لیکن باپ دادا کے زمانہ کے رسم ورواج نہیں چھوڑتے۔

مسئلہ ۱۴ اس خصوص میں مشرکین عہد جاہلیت اور یہود ونصاریٰ زمانہ جاہلیت میں برابر کے شریک تھے اس کی نسبت باری تعالے کا ارشاد ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّھْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔"

اے ایمان والو اکثر پیشوایان مذہب یہود ومقتدایان دین بھی لوگوں کا مال غلط طریقہ سے کھاجاتے ہیں اور لوگوں کو راہ حق سے بھٹکا دیتے ہیں۔ پھر ارشاد ہے یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ غَیْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَھْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا کَثِیْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ اے اہل کتاب اپنے دین میں مبالغہ نہ کیا کرو اور اس قوم مقتداؤں کی پیروی نہ کیا کرو جو گمراہ ہوگئے ہوں اور جو خود گمراہ ہوں وہ دوسروں کو بعد گمراہی کے کیا رہنمائی کرسکتے ہیں۔ کلام پاک کے احکام کے لحاظ سے گمراہ عالم کی اتباع سے منع کیا گیا ہے اور عہد جاہلیت کی رسم آج بھی رائج ہے بہ نام نہاد مسلمان جو ان جاہل مرشدوں کی اتباع کرتے ہیں جن کی گذر بسر ہی مزاروں کے نذر اور چندوں پر ہے کیا ایسے پیران عظام ومرشدان برحق اور شیوخ طریقت یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ۔ کی تعریف میں داخل ہیں۔ پس ہمارے مرشدان کامل کو اپنی شکل ان مذکرہ آیات کے آئینہ میں دیکھنی چاہئے۔

ریک احیائے دین وسیاست

حضرت شیخ الاسلامؒ کی سیرۃ کے ساتھ ساتھ جب تک آل سعود کی تاریخ اور ان کے کارنامے نہ لکھے جائیں اس وقت تک شیخ الاسلام کی سیرۃ مکمل
ہیں کہی جا سکتی اس کی وجہ یہ ہے کہ اشاعت سنت اور رد بدعات کے سلسلہ میں جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں حضرت شیخ الاسلام کو بار بار رکاوٹیں پیش آتی ہیں جب
ب کوئی طاقتور ہاتھ اشاعت دین میں کام نہ کرے اس وقت تک کامیابی مشکل ہوتی ہے اتفاق سے امیر درعیہ محمد بن سعود کے دل میں ایمان کی روشنی پیدا
تی جو نہ صرف اس وقت کے امرائے نجد میں بلکہ سارے عرب میں اپنی اولوالعزمی جرأت وشجاعت اور حسن خلق وکریم النفسی کے لئے مشہور تھے۔ اپنے
اپنے اغیار بھی ان کے ان اوصاف کی تعریف میں رطب اللسان ہیں ملاحظہ ہو۔ کتاب Arabia by Philbi

Encyclopaedia of Islam by D. S. Margoliouth

ہمارا خیال تھا کہ حضرت شیخ الاسلام کی سیرۃ کو صرف سیرۃ اور ان کی دعوت وتبلیغ اعلائے کلمۃ الحق کی حد تک محدود رکھیں لیکن حضرت شیخ الاسلام کے حالات
ر ساتھ ساتھ سلاطین آل سعود کی تاریخ اور ان کی کارگذاریاں کچھ اس طرح وابستہ ہوگئی ہیں کہ ان کا جدا کرنا مشکل ہے اس طرح دین وسیاسات کا چولی دامن
ساتھ اس امر کا مقتضی ہے کہ سیاست اور اس کے متعلقہ واقعات بھی ساتھ ساتھ پیش کئے جائیں اس کے لئے آل سعود کی تاریخ پر بھی توجہ کرنا ضروری ہوگیا لیکن
ل کہ یہ حضرت شیخ الاسلام کی سیرۃ ہے تاریخ نجد نہیں۔ اس لئے اس میں سے وہی امور ہمارے موضوع بحث رہیں گے جو سیرت شیخ یا دعوت احیائے دین
ے متعلق ہوں دیگر سیاسی امور کو ہماری بحث سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

یر محمد بن سعود

امیر محمد بن سعود کا انتقال ۱۱۷۹ھ میں ہوا اور جن کے زمانہ میں حضرت شیخ الاسلام درعیہ میں تشریف لائے آل سعود کے پہلے امیر تھے جو شیخ الاسلام کی
علیم سے متاثر ہو کر ان کی نصرت اور احیائے دین کی تحریک کے پرجوش معاون ہوتے ہم اس سے قبل ذکر کر چکے ہیں کہ امرائے نجد نے یا توحسد کی وجہ سے
خلاف عقائد کی بنا پر موحدین سے چھیڑ چھاڑ شروع کردی تھی اور امیر ریاض دہام بن دواس پہلا امیر تھا جس نے اہل توحید کو تلوار اٹھانے پر مجبور کردیا۔ پس
ں سے موحدین کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ صرف یہی ایک فتنہ نہ تھا بلکہ اسی دہام بن دواس نے جس کے ساتھ امرائے آل سعود نے زمانہ گذشتہ
ں بارہا احسانات کئے تھے ان احسانات کو بھلا کر رئیس احساء عریعر قرملی کو آمادہ کیا کہ درعیہ کے امیر کی بڑھتی ہوئی قوت توڑنے میں اس کی مدد کرے
نچہ اس کو ساتھ لے کر امیر ریاض کئی بار درعیہ کے خلاف آمادہ پیکار رہا لیکن ہر بار موحدین کو فتح اور مخالفین کو ہزیمت ہوئی۔ ان کے بعد نجران کے اہل بدعت
ں توحید کے مقابلہ پر آئے لیکن ناکام ہوگئی۔ اسی طرح دیگر امرائے نجد امیر درعیہ سے اسی اختلاف عقیدہ کی بناء پر برسرپیکار رہتے تھے۔ غالباً انہی کے اثر
تحریک کی بنا پر شرفائے مکہ نے بھی جو عام عقائد کے لحاظ سے اہل توحید کے خلاف تھے متبعین شیخ کو حج سے روک دیا اور مکہ معظمہ میں ان کے داخلہ پر پابندی
ہ کر دی گئی چنانچہ ۱۱۶۲ھ میں مسعود بن سعید شریف مکہ نے موحدین نجد کو جو حج کو گئے تھے گرفتار کر کے قید کردیا جن میں سے بہت سے قیدی سختی زنداں کی

تاب نہ لاکر شہید ہو گئے۔ اب اہل توحید نجد کو حج کو جانے میں مشکل پیدا ہو گئی اس لئے امیر محمد بن سعود نے ایک وفد طلب اجازت عام برائے حج وزیارت اور علمائے حرم سے عام اختلافی مسائل پر گفتگو کرنے کے لئے روانہ کیا۔ لیکن افسوس کہ علماء حرم نے مصالح دنیوی کو اغراض دین پر مقدم رکھتے ہوئے نہایت افسوسناک رویہ اختیار کیا اور شریف مکہ مسعود بن سعید نے اپنی شرافت کا ثبوت یہ دیا کہ جملہ اراکین وفد کو گرفتار کر کے حوالہ زندان کر دیا جن میں سے چند لوگوں نے مشکل سے اپنی جان چھڑائی اور بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ اس پر بھی کبھی کبھی موقتی اجازت حج موحدین کو مل جاتی تھی۔ چنانچہ ۱۱۸۲ھ و ۱۱۸۵ھ و ۱۱۹۷ھ میں مختص اجازتیں ملی تھیں جو صرف اُن ہی سنین کی حد تک محدود تھیں لیکن ۱۲۱۸ھ سے قبل جب کہ سلطان عبد العزیز بن محمد نے مکہ معظمہ کو فتح کر کے اس پر قبضہ نہ کر لیا کبھی بھی آزادانہ حج کی اجازت موحدین کو نہ مل سکی۔

۱۱۷۹ھ میں سلطان محمد بن سعود کا انتقال ہو گیا اور ان کے نامور اور بلند حوصلہ فرزند عبد العزیز بن محمد ان کی جگہ امیر درعیہ ہوتے تو انھوں نے چند تحائف کے ساتھ پھر ایک وفد شریف مکہ کے پاس روانہ کیا۔ اس وقت احمد بن سعید شریف مکہ تھا جو دیگر شرفائے مکہ کے برخلاف حسن خلق میں مشہور تھا چنانچہ اس نے وفد کی پذیرائی بطریق مناسب کی اور فرائض میزبانی بوجہ احسن انجام دیئے اور وفد نے علمائے حرم سے بعد بحث و مباحثہ یہ ثابت کر دیا کہ ان کے عقائد فقہ حنبلیہ کے بالکل موافق ہیں۔ لیکن بعض غالی اہل بدعت کی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے حصول اجازت حج میں اراکین وفد کو کامیابی نہ ہو سکی۔

اب اہل توحید نجد اور شرفائے مکہ میں بھی عسکری ٹکراؤ شروع ہو گیا ایک مرتبہ ۱۱۸۳ھ میں شریف مکہ کا ایک دستہ فوج جو موحدین نجد سے ٹکرایا جس میں موحدین کو فتح ہوئی اور سردار لشکر منصور گرفتار کر لیا گیا سردار کے گرفتار ہوتے ہی بے سری فوج بھاگ نکلی۔ لیکن جب سلطان عبد العزیز بن محمد کے پاس قیدی پیش ہوا تو سلطان نے یہ معلوم کر کے کہ یہ شریف مکہ کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے فوری بلا اخذ فدیہ رہا کر دیا اور نہایت اعزاز کے ساتھ اس کو مکہ معظمہ روانہ کر دیا۔

شریف مکہ نے اس احسان کا بدلہ اتارنے کے لئے ۱۱۸۳ھ میں اہل توحید کو حج و زیارت کی ایک سالہ اجازت دی جس کی وجہ سے موحدین میں ایک مسرت کی لہر دوڑ گئی اور بہت کافی تعداد میں موحدین نے اس سال فریضہ حج ادا کیا۔

یہ اجازت اگرچہ صرف ایک سال ہی کے لئے تھی لیکن اس سے آئندہ گفتگو مصالحت کے لئے راستہ ہموار ہو گیا۔ چونکہ شریف مکہ احمد بن سعید خوش اخلاق اور سنجیدہ امیر تھا اور علمائے نجد سے پہلے بھی اس کی ایک ملاقات ہو چکی تھی اور وہ بڑی حد تک اُن سے متاثر بھی ہو چکا تھا۔ اس لئے اس نے ۱۱۸۵ھ میں امیر عبد العزیز بن محمد سے خواہش کی کہ کسی عالم کو یہاں روانہ کیا جائے جو علمائے مکہ سے گفتگو کر کے اُن کو مشرب اہل توحید پر بعد بحث و مباحثہ مطمئن کر سکے اس درخواست پر سلطان نے بمشورہ حضرت شیخ الاسلام شیخ عبد العزیز بن الحصین کو انتخاب کیا اور ان کو صدر وفد بنا کر مکہ معظمہ روانہ کیا۔ چنانچہ یہ وفد مکہ معظمہ پہنچ کر علمائے حرم سے جن میں گورنمنٹ عثمانیہ کے منتخب کردہ مفتی عبد الوہاب بن حسن اور ان کے علاوہ مقامی علماء یحییٰ بن صالح اور عبد الغنی بن ہلال تھے مناظرہ فرمایا۔ مسائل تکفیر مسلمین، انہدام قبہ جات اور استغاثہ عن المخلوق کے مسائل زیر بحث رہے۔ اس مناظرہ میں علمائے حرم لاجواب ہو گئے اور شریف احمد بن سعید پر ان کا اچھا اثر پڑا اور وہ وفد کے خیالات سے بہت زیادہ مطمئن ہو گیا۔ لیکن علمائے سوء نے واویلا مچایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شریف احمد بن سعید جو موحدین نجد کا طرفدار ہو گیا تھا منصب امارت سے معزول کر دیا گیا اور امتناع حج کے احکام بدستور قائم رہے۔

۱۱۹۷ھ میں مکہ معظمہ میں اور دیگر اقطاع عرب میں شدید قحط نمودار ہو گیا۔ اس موقعہ پر سلطان نجد نے سرور بن مساعد کو جو اس وقت شریف مکہ تھا گھوڑے اور دیگر اشیا بطور ہدیہ روانہ کئے۔ اس عطیہ سے متاثر ہو کر شریف مکہ نے موحدین کو حج کی اجازت دی مگر افسوس کہ عام قحط سالی کی وجہ صرف (۳۰۰) حجاج ہی اس اجازت سے فائدہ حاصل کر سکے۔

یہ سرور بن مساعد خود کو مکہ معظمہ کا آزاد اور خود مختار حاکم سمجھنے لگا تھا اور اپنے آپ کو گورنمنٹ عثمانیہ کی گرفت اور اقتدار سے آزاد تصور کرتا تھا اہل توحید کے خلاف امتناع حج کو بھی اس نے اپنی برتری منوانے کا ایک ذریعہ خیال کیا تھا۔ غالباً اس کو یہ دھوکا ہوا جس طرح عہد جاہلیت میں قریش تولیت کعبہ کی وجہ تمام عرب میں برتر تصور کئے جاتے تھے اسی طرح امارتِ مکہ کی وجہ اس کو بھی وجہ امتیاز حاصل ہو گیا ہے اس لئے اس نے نجد وعسیر کی سہولت پر

بھی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی۔ اس کے بدلہ میں اہل نجد نے اُن حجاج کے قافلوں کو جو عراق و ایران سے نجدی حکومت کے حدود میں سے گذر کر آتے تھے روک دیا یہ امر شریف مکہ کی طاقت سے باہر تھا کہ اُن قافلوں کو حفاظت کے ساتھ راستہ طے کرنے کا انتظام کر سکے۔ مختصر یہ کہ اس کی جھڑپ نے مکہ معظمہ کی تجارت کو بالکل ہی ماند کر دیا جس کا تمام تر دار و مدار اُن قافلوں پر تھا جو خشکی کی راہ آتے تھے اور اب راستہ محفوظ نہ ہونے کی وجہ سے نہ تو ایران سے کوئی قافلہ آ رہا تھا اور نہ بغداد سے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجار مکہ نے شریف سرور بن مساعد کو مجبور کرنا شروع کیا کہ اہل نجد سے تعلقات استوار کریں اب سرور بن مساعد کو ہار ماننا ہی پڑا اور اہل توحید کو پھر ایک بار حج کا موقعہ نصیب ہوا۔

۱۲۰۲ھ میں سرور بن مساعد فوت ہو گیا اور عبدالمعین بن مساعد اس کا جانشین ہوا لیکن کچھ ہی دنوں بعد غالب بن مساعد کے بھائی نے اس کو معزول کر کے خود شریف مکہ بن گیا اسی شریف غالب کے عہد میں اول اول اہل مصر نے سلطنت عثمانیہ کے اشارہ سے اہل نجد پر فوج کشی کی۔ غالب اگرچہ اس کشمکش سے بے تعلق رہنا چاہتا تھا لیکن بچ نہ سکا بہر حال غالب نے امارت مکہ پر فائز ہونے کے ساتھ ہی امیر نجد عبدالعزیز بن محمد سے خواہش کی کہ کوئی عالم پھر روانہ کیا جائے تاکہ اُن سے عقائد اہل توحید پر گفتگو اور تبادلہ خیالات ہو سکے۔ سلطان عبدالعزیز بن محمد نے نہایت خوشی سے اس دعوت کو قبول فرما کر پھر انہی شیخ عبدالعزیز بن المعین کو جو پہلے وفد میں بھی بحیثیت صدر وفد شریک تھے امیر وفد بنا کر روانہ فرمایا۔ شریف مکہ نے وفد کا پرتپاک استقبال کیا۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ نتیجہ وہی ہوا جو پہلے بھی چند مرتبہ ہو چکا تھا علماء مکہ مقابلہ پر آتے اور اہل توحید کے دلائل قاطعہ سے مسکت جواب پا کر حق بات تسلیم تو کی۔ لیکن خلوت میں شریف مکہ کو ورغلایا کہ ان کے دلائل مان کر ان کے عقائد تسلیم کر لینا گویا امیر نجد کے مطیع ہونے کے مترادف ہے اور امیر نجد کی اطاعت قبول کرنا مکہ کی امارت سے خاتمہ کے مترادف ہوگا یہ بات غالب کے دل میں کچھ ایسی بیٹھی کہ وہ قبول حق سے باز رہا۔ شیخ عبدالعزیز امیر وفد نے اصرار بھی کیا کہ مقامی علماء کی ایک مجلس ترتیب دے کر مباحثہ کرایا جائے آپ حکم بنیں اور ہمارے اور ان کے دلائل سماعت فرما کر کوئی فیصلہ کریں لیکن مقامی علماء کی جرات نہ ہوئی کہ علمائے حق کے سامنے آئیں انھوں نے حسب بیان ابن غنام مصنف روضۃ الافکار یہ جواب دیا کہ "ان وہابیوں کے ساتھ گفتگو بیکار ہے ان کے عقائد ہمارے اسلاف کے عقائد کے بالکل برخلاف ہیں۔ اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا عَلٰٓی مِلَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ۔"

ہم نے اپنے باپ داداؤں کو اس طریقہ پر چلتے دیکھا ہے اور ہم تو انہی کی پیروی کریں گے خواہ حق کچھ ہی کیوں نہ ہو غرض کہ یہ وفد بھی ناکام لوٹا نہ تو اجازت حج ملی اور نہ کوئی اور صورت مفاہمت پیدا ہوئی اس کا نتیجہ لازمی یہ تھا فریقین میں جو چھیڑ چھاڑ چلی آ رہی تھی وہ باقی رہے۔

چوں کہ سلطان عبدالعزیز بن محمد نے نجد کے اندرونی علاقہ میں فتوحات کرتے ہوتے ساحل بحر خلیج فارس تک قابض ہو گئے تھے ان کا یہ بڑھتا ہوا اثر دیکھ کر شریف غالب نے پھر ایک بار مصالحت کی کوشش کی اور سلطان کو لکھا کہ موحدین نجد کے مذہب سے اہل حرم کو روشناس کرنے کے لئے پھر کسی عالم کو روانہ کیا جائے سلطان عبدالعزیز نے جو ایسے مواقع کے منتظر ہی رہتے تھے فوری اس دعوت کو قبول فرمایا اور احمد بن ناصر بن عثمان بن معمر کو رئیس وفد بنا کر روانہ فرمایا۔ اور اراکین وفد نے خانہ کعبہ پہونچ کر عمرہ ادا کیا پھر سلطان نجد کے تحائف وصول لے کر شریف مکہ کے پاس پہونچے شریف کے مواجہ میں ایک تاریخی مباحثہ و مناظرہ ہوا جس کا ذکر فلبی Philbi نے اپنی کتاب Arabia میں صفحات ۷۱ و ۷۲ پر کیا ہے۔ اس مباحثہ میں بطور خاص مسائل شفاعت۔ استغاثہ من المخلوق اور تارک صوم کی تکفیر موضوع بحث رہے علماء نجد نے اپنے دلائل ایک رسالہ کی شکل میں تحریر کر دیئے جو بعد میں "الفواکہ العذاب فی الرد علیٰ من لم یحکم بالسنۃ و الکتاب" کے نام سے چھپ گیا ہے۔ مگر اس مباحثہ کا انجام بھی حسب سابق رہا۔ علماء حرم کو اپنے باپ دادا کے اعتقاد کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہ ہوا اور یہ ان کی پرانی عادت بھی تھی تاآنکہ مکہ فتح نہ ہو جائے وہ راہ راست پر آنے والے نہ تھے۔

اب شریف غالب نے دیکھا کہ مصالحت ممکن نہیں خود اس کی قوت اتنی نہیں کہ اہل توحید کی بڑھتی ہوئی قوت کا مقابلہ کر سکے۔ اس لئے اس نے باب عالی کی کنڈی کھٹکھٹائی اور سلطنت عثمانیہ کو متوجہ کیا کہ اہل نجد کی قوت کو توڑا جائے۔ باب عالی نے سلیمان پاشا گورنر بغداد کو حکم دیا کہ نجد پر فوج کشی کریں

اس کی تعمیل میں انھوں نے پیش قدمی کی اور احساء کا محاصرہ کر لیا جس کی اطلاع ملتے ہی سلطان عبدالعزیز اپنی پوری تیاری کے ساتھ نکلے۔ چوں کہ پاشا کے لشکر میں زیادہ تر قبیلہ خزاعل کے شیعہ تھے جو امیر نجد کی آمد کی خبر پاتے ہی بھاگ نکلے اب بادشاہ کے پاس اس قدر قوت نہ تھی کہ وہ بقیہ لشکر کے ساتھ سلطان عبدالعزیز بن محمد سے ٹکر لے سکیں لہذا سلیمان بادشاہ بے نیل و مرام واپس لوٹے اس کے بعد شریف غالب ۱۲۱۲ھ میں مکمل تیاری کے ساتھ اہل نجد پر حملہ آور ہوا اور خرمہ نامی ایک قصبہ کے قریب یہ لڑائی ہوئی مقام کے نام کی نسبت سے یہ لڑائی وقعۃ الخرمہ کے نام سے تاریخ میں مذکور ہے۔ اس میں شریف غالب بری طرح شکست کھا کر بھاگا۔ یہ لڑائی اپنے بعض وجوہ کے لحاظ سے اہل نجد کے لئے مفید بھی ہوئی یعنی اس لڑائی کے نتیجہ کے طور پر فریقین کے مقبوضہ علاقہ جات کی حد بندی منظم طریقہ پر کی گئی اور حج کی اجازت بھی دے دی گئی۔

۱۲۱۳ھ میں ایک طویل ممانعت کے بعد اہل توحید کو حج کی اجازت ملتے ہی ایک کثیر تعداد موحدین کی حج کے لئے تیار ہو گئی اس قافلہ کے ساتھ حضرت شیخ الاسلام کے دو صاحبزادوں نے جن کے نام علی بن محمد۔ اور ابراہیم بن محمد ہیں شریک قافلہ ہوئے لیکن سلطان عبدالعزیز بن محمد ان کے فرزند سعود بن عبدالعزیز بعض عسکری مجبوریات کی وجہ حج و زیارت سے مشرف نہ ہو سکے۔ البتہ ۱۲۱۴ھ میں ولی عہد نجد سعود بن عبدالعزیز نے حج ادا فرمایا۔ ان کے ہمراہ اطراف نجد کے کئی بدوی قبائل تھے۔

۱۲۱۵ھ میں محمد سلطان عبدالعزیز محمد نے احرام حج باندھا اطراف نجد میں جوں ہی یہ خبر پھیلی تو گویا سارا نجد امڈ آیا سلطان مرحوم نے نہایت تزک و احتشام سے فریضہ حج ادا فرمایا کئی ہزار روپیہ صدقات و خیرات کے عنوان سے علماء و فقراء حرم کو عطا ہوئے۔ ان دو برسوں میں جو قافلے ایران و عراق سے حدود نجد سے ہو کر گذرتے تھے پورے امن و امان کے ساتھ گذرے خود سلطان عبدالعزیز نے بہ نفس نفیس فرائض نگرانی انجام دیتے اسی حسن انتظام سے متاثر ہو کر امیر عمان نے بھی سال آئندہ حج کیا تھا۔ اس تمام روئداد کی صراحت انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں درج ہے۔

حملہ کربلا

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ سلیمان پاشا والی بغداد جب اہل نجد پر حملہ آور ہوئے تو ان کے ساتھ قبیلہ خزاعل کے اہل تشیع بھی تھے اب کی بار پھر یہ اصل راق کے قبیلہ خزاعل نے حجاج کے قافلہ پر جب کہ وہ حج سے واپس ہو رہے تھے نجدی حکومت کی سرحد کے اندر آکر حملہ کیا تاکہ نجدی حکومت کی ذمہ داری بالالزام عائد ہو سکے اول تو ان بنی خزاعل کو اہل توحید سے بعض للّٰہی تھا ہی دوسری بات حسب گمان فلبی Philbi مندرجہ کتاب Arabia صفحہ ن قبائل کو حکومت بغداد اور حکومت مکہ کا اشارہ بھی تھا کہ وہ اس طرح عمل کریں۔ بہرحال شیعان بنی خزاعل نے قافلہ حجاج کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی اور ذمہ داری کومت نجد پر عائد کی گئی اس طرح اہل توحید نجد کے تعلقات دوبارہ حکومت عراق و اشراف مکہ سے خراب ہو گئے اب سلطان عبدالعزیز کو اس کے سوا بارہ نہ رہا کہ قبیلہ خزاعل کو اس کی شرارتوں کی پوری پوری سزا دی جائے تاکہ دوبارہ ان کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہو سکے اس پیش رفت پر سلطان عبدالعزیز ذیقعدہ ۱۲۱۶ھ میں مکمل تیاری کے ساتھ نکل کر ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۱۶ھ کو کربلا پہونچے اور بلا مزاحمت داخل شہر ہو گئے۔ یہاں حسین علیہ السلام کی قبر پر جو گنبد بنایا گیا ما اس کو منہدم کر دیا گیا جو کچھ سونا چاندی ہتھیار اور قیمتی کتب و مصاحف تھے وہ مال غنیمت میں حاصل کر لیا گیا اور قبیلہ خزاعل کو مکمل طور پر برباد کر کے کامیاب دئے باشندگان کربلا سے جن میں زیادہ تر قبیلہ خزاعل کے شیعہ تھے کم و بیش دو ہزار آدمی قتل کئے گئے اور یہ کام صرف تین چار گھنٹوں میں ختم ہو گیا یعنی فجر کی نماز کے بعد کربلا پر حملہ کیا گیا اور ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر فاتحین کربلا سے واپس ہو گئے۔ فلبی اپنی کتاب Arabia کے صفحہ ۸۱ پر اس موقعہ کی بت پر لوٹ لکھا ہے یہ حملہ کربلا نے اہل نجد کے جذبات انتقام کو تو بڑی حد تک تسکین دے دی لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام مسلمان اور خاص کر شیعان ایران ل سے بہت برہم ہوئے۔ اور شاہ ایران فتح علی شاہ قاچار نے امیر نجد کو دھمکی دی کہ وہ ایک لاکھ فوج لے کر اہل نجد پر حملہ کرے گا لیکن سلطان عبدالعزیز بن سعود کی ت اس وقت اس قدر مربوط ہو چکی تھی کہ اہل ایران کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ عربوں کے مقابلہ پر آئیں لہذا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ اور فتح علی شاہ قاچار

کو چاروناچار مصالحت کرنی ہی پڑی امیر سعود بن عبد العزیز کے زمانہ میں یعنی ۱۸۰۵ء میں حکومت نجد اور حکومت ایران میں دوستانہ تعلقات ہونے کی تصدیق فلبی نے اپنی کتاب کے صفحہ ۹۰ پر کی ہے۔

واقعۃ الحرمہ کے بعد جو مصالحت اور اجازت حج اہل توحید کو دی گئی تھی وہ موقعہ کربلا کے بعد ختم ہوگئی شریف غالب نے شکایت پیش کی کہ اہل نجد معاہدہ پر قائم نہیں رہے۔ اور اس نے عثمان مضائفی کو گفت و شنید کے لیے روانہ کیا لیکن عثمان مضائفی جب نجد پہونچا تو اہل نجد کی اسلامی زندگی اور سادگی دیکھ کر اہل توحید میں شامل ہوگیا اور امیر عبد العزیز کی طرف سے اس کی عسکری صلاحیتوں کے مدنظر مدافعانہ خدمات پر مامور کیا گیا اس دوران میں غالب اور عبد المعین میں جو شریف غالب کا بھائی اور غالب سے پہلے امارت مکہ پر فائز تھا ناچاقی ہوگئی اور عبد المعین سلطان عبد العزیز سے طالب امداد ہوا سلطان نے اسی عثمان مضائفی کو امیر لشکر بنا کر عبد المعین کی مدد کے لئے فوج روانہ کی۔ نجدی افواج کی آمد سن کر شریف غالب طائف میں قلعہ بند ہوگیا عثمان مضائفی نے طائف کا محاصرہ کر لیا اور تھوڑی سی مدافعت کے بعد ہی طائف فتح ہوگیا اور شریف غالب یہاں سے کسی نہ کسی طرح جان بچا کر بھاگ نکلا عثمان مضائفی کو طائف کا گورنر بنادیا گیا اس دوران میں شام سے قافلہ حجاج عبد اللہ پاشا گورنر شام کی قیادت میں آیا ہوا تھا اور یہاں لڑائی ہو رہی تھی اس لئے سلطان عبد العزیز نے قافلہ حجاج کو جو بالکلیہ غیر جانب دار تھا یہ اجازت دی کہ تین دن کے عرصہ میں مراسم حج ادا کر کے واپس ہو جائیں اس لئے یہ لوگ اس شرط کے مطابق تین دن میں واپس ہو گئے۔ اس موقعہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے شریف غالب نے عبد اللہ پاشا سے التجا کی کہ وہ ان دونوں کے درمیان صلح و صفائی کرادے لیکن پاشا کو صرف تین یوم کی مہلت ملی تھی اور اس دوران میں جملہ مناسک حج ادا کر کے واپس جانا تھا اس لئے وہ شریف غالب کی درخواست پر کوئی توجہ نہ کر سکا۔ زمانہ حج ختم ہوتے ہی شریف غالب جدہ فرار ہوگیا اور سپہ سالار افواج نجد شہزادہ سعود بن عبد العزیز ۸ محرم ۱۲۱۸ھ کو شہر مکہ معظمہ میں فاتحانہ داخل ہوا حاکم شہر تو پہلے ہی بھاگ گیا تھا باشندگان کی جانب سے بھی کوئی مدافعت نہیں کی گئی۔ مکہ میں داخل ہوتے ہی سلطان کے حکم سے سعود بن عبد العزیز نے عبد المعین کو مکہ کا گورنر مقرر کیا اور خود تطہیر شہر مکہ معظمہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ جس طرح آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے ساتھ ہی کعبۃ اللہ سے مشرکین کے نصب کردہ بت نکال پھینکے تھے اسی کی اتباع میں موحدین نجد نے بھی ان تمام اوثان باطلہ کو جو اسلام کے نام پر مسلم نما مشرک بنا رکھے تھے منہدم کرادیا۔ کہیں تو مولد النبی کے نام سے کوئی جگہ مختص کر لی گئی اور اس پر طرح طرح کی رسوم انجام دیے جانے لگے تو کہیں مسکن خدیجۃ الکبریٰ کے نام سے کسی مکان کو مقدس قرار دیا گیا اور وہاں اقسام کی من مانی بدعات کرنے لگے ان سب کو اہل توحید نجد نے توڑ تاڑ کر زمین کے برابر کر دیا۔ غرض اہل توحید نے جو کچھ کیا وہ کتاب و سنت کی سند پر کیا قرآن و حدیث پر پختہ دلائل رکھتے ہوئے کیا علماء مذاہب اربعہ کے فتوی کی بنا پر کیا اور جو کچھ بھی کیا وہ اصلی اسلام کے موافق کیا لیکن اس پر اہل بدعت نے وہ شور و پکار کیا اور وہ واویلا مچایا کہ شاید لات و منات کے توڑے جانے کے وقت مشرکین نے بھی نہ مچایا ہوگا۔ اہل توحید کو برا بھلا کہا گیا گالیاں دی گئیں افترا و بہتان طرازی کی گئی آج تک بھی ہر بدعتی اس موقعہ کو یاد کر کے اہل توحید کو برا کہتا ہے لیکن اسی کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ فرماتے ہوئے چلئے۔ دیکھئے فلبی **Philbi,** اپنی کتاب عرب **Arabia** کے صفحہ ۸۳ پر کیا لکھتا ہے۔

"فاتح مکہ سعود بن عبد العزیز نے عبد المعین کو شریف مکہ بنا کر خود حرم شریف کو مشرکانہ آلودگیوں سے پاک و صاف کرنا شروع کیا خانہ کعبہ کے جواہر اور قیمتی اشیاء فاتحین نے حاصل کر لئے غیر شرعی بنائی ہوئی گنبدیں وغیرہ مسمار کر دی گئیں اور ان کے بعض مجاور جنھوں نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی تھی قتل بھی کئے گئے۔

اور **Huges,** .... ڈکشنری آف اسلام میں یوں رقم طراز ہے۔

"حرم شریف کی حرمت کا لحاظ رکھتے ہوئے کل باشندگان مکہ کو امان دی گئی اور ان کو ذرہ بھر بھی جانی و مالی نقصان نہیں پہونچایا گیا اہل نجد کی حکومت کی برکت سے مسجدیں آباد ہوگئیں ذوق عبادت کی یہ مثال اور اسلامی زندگی کا یہ نمونہ عہد نبوی کے بعد پھر اسی نجدی حکومت کے دور میں نظر آیا" ان دو مخالفین اسلام انگریزوں کی شہادت کے بعد ہم کسی مزید ثبوت کی ضرورت نہیں سمجھتے اور یہی بہت کافی ہے اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اہل نجد نے فتح مکہ

کے موقعہ پر بھی فتح مکہ اولی کی پوری پوری پیروی کی۔

اس موقعہ پر حضرت شیخ عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب نے ایک رسالہ مشتمل بر اعمال و عقائد اہل توحید نجد لکھ کر باشندگان حرم میں تقسیم کرایا جس کا اہل علم پر بہت اچھا اثر ہوا۔

شہزادہ سعود بن عبدالعزیز چودہ دن مکہ معظمہ میں مقیم رہ کر شریف غالب کے تعاقب میں جو جدہ میں روپوش ہوگیا تھا روانہ ہوا لیکن فوج میں طاعون پھیل جانے کی وجہ حجاز کا خیال فی الحال ملتوی کر کے واپس نجد ہوا ان کے واپس جاتے ہی غالب پھر مکہ واپس آگیا اہل نجد نے جو (۲۰۰) سپاہی عبدالمعین کی مدد کے لئے مکہ میں چھوڑ گئے تھے ان کو غالب نے نہایت بے رحمی سے قتل کرادیا۔

امیر عبدالعزیز کی شہادت

کربلا پر حملہ کے دو سال بعد یعنی ۱۲۱۸ھ میں ایک عراقی یا ایرانی شیعہ نے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کے تین لڑکے معرکہ کربلا کے وقت قتل ہوگئے تھے سلطان عبدالعزیز بن محمد پر خنجر سے وار کر کے عین حالت نماز عصر شہید کردیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ. خوش نصیب سلطان کو زندگی بھر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق نصیب ہوتی تو موت میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی پیروی حاصل ہوئی کہ آپ کا قاتل بھی ایک عجمی غلام ہی تھا۔ بہر حال یہ مسلم ہے کہ قاتل شیعہ تھا اور گذشتہ دو سال سے درعیہ میں غربی اور مسکنت سے زندگی گذار رہا تھا اور امیر شہید کی خیرات اور صدقات پر ہی اس کی گذر ہورہی تھی غرض رجب ۱۲۱۸ھ میں سلطان عبدالعزیز بن محمد شہید ہوئے۔ سلطان شہید کی سیرت پر بہت کچھ لکھا گیا اور بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن مختصر یہ کہ حضرت شیخ الاسلام کی صحبت اور فیض تربیت نے ان کے کیریکٹر کو ٹھیٹھ اسلامی سانچے میں ڈھال دیا تھا تبلیغ دین و اعلاء کلمۃ الحق کا شوق ان کے دل و دماغ میں بیٹھا ہوا تھا۔ جو مقام فتح ہوتا وہاں سب سے پہلے مبلغین روانہ کئے جاتے جو لوگوں کے تطہیر عقائد اور اصلاح اعمال کے ذمہ دار ہوتے احکام شرع کی اجرا میں بڑے چھوٹے کا کوئی فرق نہیں ہوتا تھا عدل و انصاف رعایا پروری اور انسداد جرائم کی طرف سلطان کی خاص توجہ رہتی تھی سلطان کی عدل پروری اور انتظام مملکت کی نسبت عنوان المجد فی تاریخ النجد مصنفہ عثمان بن بشر سے ایک دو واقعات نقل کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ وہ ناقل ہے۔

" مملکت نجد میں ہر سمت کامل امن و امان ہے کوئی غریب سے غریب آدمی چاہے کسی موسم میں مال و اسباب لئے ہوئے نجد سے تہامہ یمن حجاز وغیرہ تک سفر کرے اس کو کسی چور ڈاکو وغیرہ کا مطلق خوف نہیں خطہ نجد کے تمام باشندہ فصل ربیع میں بلا کسی چرواہے کے اپنے اپنے جانور جنگل میں چھوڑ دیتے ہیں اور کوئی نگہبان نہیں ہوتا بعد انقضاء موسم مالک آکر معہ بچوں کے لے جاتا ہے صرف گھوڑوں کی نگہبانی کی جاتی ہے کیوں کہ اہل عرب گھوڑوں کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک عجمی وادی سبیع کے قریب قیام کیا وہاں اس کا ایک تھیلا جس میں دس قرش کی مالیت کا کوئی سامان تھا گم ہوگیا۔ اس نے وہاں کے حاکم کو مطلع کیا جب سلطان کو اس کی اطلاع ہوتی تو انھوں نے اطراف کے شیوخ قبائل کو طلب کر کے حکم دیا کہ چور کا پتہ لگائیں ان لوگوں نے زحمت سے بچنے کے لئے کہا کہ اس سامان کی قیمت سے دس گنا تاوان ہم سے لے لیا جائے اور اس تلاش کی زحمت سے ہم کو معاف فرمایا جائے لیکن سلطان راضی نہیں ہوئے بالآخر چور کا پتہ مل گیا اور مال مسروقہ بھی برآمد ہوگیا سلطان نے چور کو شرعی سزا دینے کے بعد مال کو حاکم زبیر کے پاس روانہ کردیا تاکہ وہ مالک کو پہونچا دیا جائے کیوں کہ اس دوران میں تاجر وطن واپس جاچکا تھا۔

اسی زمانہ کا یہ واقعہ بھی لائق ذکر ہے کہ ایک مرتبہ چند عرب جن کا پیشہ لوٹ و غارتگری تھا حکومت نجد کے کسی علاقہ سے گذر رہے تھے۔ ریگستان نجد میں ان کو چند بکریاں نظر آئیں جن کا کوئی چرواہا نہ تھا۔ یہ لوگ چونکہ بھوکے تھے آپس میں کہنے لگے کہ ان میں سے ایک بکری پکڑ کر ذبح کریں اور کھالیں لیکن پکڑنے کی ہمت کسی میں بھی نہیں ہورہی تھی اور ہر ایک دوسرے پر ٹال رہا تھا۔ بالآخر ان میں سے ایک نے جو سب میں زیادہ سمجھدار تھا کہنے لگا کہ یہاں ان کو مت چھیڑو کیوں کہ ان کا چرواہا نہ ہوا تو کیا ہوا اس کا چرواہا خود عبدالعزیز بن محمد ہے۔

عراق۔ عجم۔ کویت وغیرہ سے قافلے کاروان تاجر سیاح درعیہ میں اکثر آتے رہتے ہیں اور بڑے بڑے جنگلوں اور ریگستانوں میں سے ان کا گذر ہوتا ہے لیکن کوئی خطرہ پیش نہیں آتا اور نہ حکومت کی طرف سے کوئی محصول وغیرہ لیا جاتا ہے۔ ایک شخص بلا کسی ہتھیار کے صرف ہاتھ میں ایک ڈنڈا لے کر یمن سے شام تک بلا خوف و خطر جب چاہے سفر کرسکتا ہے۔ ایک بار شام سے زکوٰۃ جو چھ اونٹوں پر بار ہوکر درعیہ لائی جارہی تھی حلب سے صرف چند سپاہی اس کو لے کر آئے تھے راستہ میں جہاں رات ہوتی اس بار کو اتار کر زمین پر ڈال دیتے اونٹوں کو کھول دیتے اور خود کھاپی کر سو جاتے لیکن حلب سے درعیہ تک کسی نے بھی نہ پوچھا کہ تمہارے پاس کیا ہے۔

درعیہ میں آوارہ گرد جانوروں کی حفاظت کا ایک محکمہ ہے اس میں تمام جگہوں کے آوارہ گرد جانور لاکر رکھے جاتے ہیں اور اس محکمہ کا افسر عبید بن معیش جو چرواہوں کے ذریعہ ان کی نگہداشت کرتا ہے ان جانوروں کا مالک جب تلاش کرتے ہوئے آپہونچتا ہے تو اس کو بعد شناخت اس کا جانور حوالہ کردیا جاتا ہے اور اکثر بار ایک کی جگہ تین تین لیتا ہے کیوں کہ مادہ جو بچے دیتی ہے وہ بھی اس کو ساتھ دے دیئے جاتے ہیں اور ان کی حفاظت و نگہداشت کے اخراجات بھی حکومت نہیں لیتی۔

اس امن و امان کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اہل نجد کے دلوں میں تقویٰ و دیانت بھردی ہے اور امیر عبدالعزیز کا رعب ہر ہر حضری و بدوی کے دل میں ڈال دیا ہے جس کی وجہ تاریخ اسلام میں ایسا امن عہد فاروقی کے بعد بجز نجد کے اور کہیں نہیں پایا جاتا۔"

یہ سب نتیجہ ہے اسلام کی سختی سے پابندی اور حدود شرعی کے اجرا کا ہم بخوف طوالت اس حصہ کو ان ہی کے ہیں واقعات پر ختم کرتے ہیں ورنہ حکومت درعیہ کے امن و امان عدل و انصاف وغیرہ کے متعدد واقعات ہیں جن کو عنوان المجد کے علاوہ فلبی اور برک ہارٹ نے بھی بڑے پرشکوہ الفاظ میں بیان کیا ہے جن کو شوق ہو وہ فلبی کی کتاب **Arabia** یا برک ہارٹ کی کتاب **Travels in Arabia** ملاحظہ کرسکتے ہیں۔ چوں کہ ان ہر دو مصنفین کا ماخذ بھی عنوان المجد ہے اسی لئے ہم نے اصل ماخذ کی عبارت نقل کی ہے۔

امیر سعود بن عبدالعزیز

امیر عبدالعزیز بن محمد کی شہادت کے بعد ان کے فرزند امیر سعود بن عبدالعزیز ان کے جانشین ہوتے ان کی جانشینی کی بیعت حضرت شیخ الاسلام کی زندگی ہی میں ہوچکی تھی اور یہ بھی حضرت شیخ الاسلام کی صحبت اور تربیت سے مستفید تھے۔ زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی امیر سعود نے اپنے نامور باپ اور محترم دادا کی طرح تبلیغ و اشاعت کلمۃ الحق کے ساتھ ساتھ توسیع حکومت کا بھی لائحہ عمل تیار کرلیا اور جس طرح اپنے باپ سلطان عبدالعزیز شہید کے زمانہ حکومت میں یہ امیر عساکر تھے اسی طرح اپنے بیٹے عبداللہ بن سعود کو امارت عساکر حوالہ کی اور نوخیز امیر عبداللہ نے بحرین سے لے کر عمو تک اپنی فتوحات کا ڈنکا بجادی اس طرح نجد کا سارا علاقہ ساحل بحر تک اور کچھ حصہ حجاز کا بھی موحدین نجد کے زیر حکومت آگیا تھا۔ سلطنت عثمانیہ ترکی نے جو عرب کو اپنے زیر اقتدار رکھنا چاہتی تھی اہل نجد کی فتوحات کو تشویش کی نظروں سے دیکھا ادھر شریف غالب اور اس کے ساتھ دیگر علماء سوء حجاز نے جن کی معاش کا واحد ذریعہ مراسم شرک و بدعت کی ادائیگی کے نذرانے تھے حکومت ترکی سے بار بار التجائیں کیں کہ موحدین نجد کا بندوبست کریں ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ حرمین شریفین پر دوبارہ قابض ہوجائیں اہل توحید کا حرمین شریفین پر قابض ہوجانا گویا حکومت ترکی کے منصب خلافت پر ضرب تھی اور دوسری طرف

علماء سو اور مجاوران اوثان باطلہ کے وسائل معاش پر تیشہ زنی ان اسباب سے ترکی حکومت نے علی پاشا گورنر بغداد عبداللہ پاشا گورنر شام اور شریف پاشا حاکم جدہ کو حکم دیا کہ اہل نجد پر فوج کشی کی جائے اس پر عراق فوجی ہیڈ کوارٹر قرار دیا گیا اور کردوں اور عربوں کی ایک فوج تیار کی گئی لیکن جنگی تیاریاں مکمل نہ ہو سکیں ادھر امیر سعود بن عبدالعزیز کو جونہی یہ معلوم ہوا اس نے فوری بصرہ پر چڑھائی کر دی علی پاشا بصرہ سے حلہ پہونچ کر وہاں قلعہ بند ہو گیا اس لئے سلطان سعود بن عبدالعزیز نے حلہ و بصرہ سے ہٹ کر مقام زبیر پر حملہ کیا اور بعد فتح وہاں کے گنبدیں اور دیگر مشاہد غیر شرعی مسمار کر کے مع مال غنیمت کامیاب لوٹے ۔ اس حملے میں سلطان سعود تو کامیاب ہوئے لیکن بے چارہ علی پاشا کردستان کی بغاوت فرو کرنے میں کچھ ایسا الجھ گیا کہ اس کے انتظار میں شریف پاشا اور عبداللہ پاشا بھی کچھ نہ کر سکے غرض یہ حکم جوں کا توں بلا تعمیل ہی رہا۔ اس مہم سے فارغ اور آئندہ کے لئے مطمئن ہو کر سلطان سعود بن عبدالعزیز کو دوبارہ مکہ معظمہ کی فتح کا خیال ہوا۔ اس سے پہلے عمان اور خلیج فارس کے ساحلی علاقہ جات حکومت نجد کے زیر اقتدار تھے ہی اور خیبر تک علاقہ حجاز میں بھی ان کے زیر نگین تھا صرف حرمین شریفین اور راس کے آس پاس کے علاقہ جات باقی رہ گئے تھے جو باآسانی قبضہ میں آسکتے تھے ۔ اس لئے سلطان نے ذیقعدہ ۱۲۱۹ھ میں عثمان مضائفی کو مختصر سی فوج کے ساتھ روانہ کیا جس نے بلا مزاحمت طائف پر قبضہ کر لیا ۱۲۲۰ھ کے اوائل میں مدینہ منورہ پر بھی قبضہ ہو گیا اہل توحید نے مدینۃ الرسول کے تمام مشاہد بدعتی اور قبہ جات وغیرہ منہدم کر دیئے جو توحید کے معلم اول کے مقدس شہر میں باطل پرستوں نے اسلام کے نام پر تعمیر کر لئے تھے اس موقعہ کو مخالفین توحید نے بڑے رنگ آمیزیوں کے ساتھ پیش کیا اور اس قدر اچھالا کہ اس سے متاثر ہو کر بعض یورپین مصنفین نے اپنی اپنی تصانیف میں یہ غلط خبر درج کر وائی کہ موحدین نجد نے گنبد خضرا کو بھی شہید کر دیا تھا ملاحظہ ہو۔ New World of Islam by L. Stadered

Dictionary of Islam by Huges. لیکن یہ غلط ہے اور اس کی تردید پہلے بھی کی جا چکی ہے ۔

غرض مدینہ منورہ کے بعد مکہ معظمہ کی باری تھی لیکن زمانہ حج کے آغاز ہو جانے کی وجہ اطراف و اکناف کے قافلے حج کے لئے آنا شروع ہو گئے تھے شامی قافلہ مسدودی راہ کی وجہ رکا ہوا تھا اہل مکہ نے پریشان ہو کر شریف غالب کو مجبور کرنا شروع کیا کہ سلطان نجد سے مصالحت کر لے اس سے مجبور ہو کر شریف غالب نے ہتھیار ڈال دیئے اور ابو عبدالوہاب اور عثمان مضائفی کے پاس شرائط صلح روانہ کئے جس کو انھوں نے منظور کر کے اصل شرائط صلح اور تحائف جو شریف غالب نے بطور اظہار اطاعت پیش کئے تھے بغرض منظوری سلطان سعود بن عبدالعزیز کی خدمت میں پیش کئے جہاں سے بہت جلد منظوری بھی حاصل ہو گی خزانہ حرم سے جو کچھ بھی برآمد ہوا وہ وہیں کے مستحقین کو بانٹ دیا گیا۔ سال آئندہ ۱۲۲۱ میں خود سلطان سعود بن عبدالعزیز نے احرام حج باندھا اس سے قبل ..... وہ دوبار حج و زیارت سے مشرف ہو چکے تھے جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے اب دوبارہ فتح مکہ کے بعد بغرض تبلیغ اشاعت سنت تیسرا حج بھی کرنا چاہا اور اپنے ساتھ جملہ امراء و اکابر دربار کو لے کر نہایت تزک و احتشام کے ساتھ لیکن بغیر اسلامی سادگی کا دامن چھوڑے ہوئے راہی مکہ مکرمہ ہوئے اور بعد ادائی فریضہ حج تبلیغ و اشاعت سنت کی طرف متوجہ ہو گئے غرباء اور مساکین کو بے شمار صدقات و عطیات سے سرفراز ہوئے یہاں سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ پہونچ کر زیارت قبر اطہر کا شرف حاصل کیا یہاں بھی خوب خوب عطیات و خیرات تقسیم ہوئے ۔ شامی قافلہ کو بعلت خلاف ورزی معاہدہ دوران حج میں باجا نہ بجانے کی شرط تھی جس کی شامی قافلہ والوں نے پابندی نہیں کی ان کو بغیر حج واپس لوٹا دیا گیا ترکی افواج کو مکہ معظمہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا اور ان کو بجبر حجاز سے نکال دیا گیا اب شریف غالب کو بجز اطاعت کے کوئی چارہ نہ رہا۔ لہٰذا وہ سلطان سعود بن عبدالعزیز کے سامنے عاجزانہ حاضر ہو کر بیعت اطاعت کی الغرض سلطان سعود نے مکہ کی امارت پر اسی کو برقرار رکھا۔ یہ وہی غالب تھا جس نے بار بار سلطان سعود اور ان کے والد سلطان سعود اور ان کے والد سلطان عبدالعزیز کے خلاف تلوار اٹھائی۔ جب اس کی قوت جواب دے چکی تو بار بار گورنمنٹ عثمانیہ کے در پر اہل توحید نجد کے استیصال کے لئے جبہ سائی کی لیکن سلطان سعود کا حلم اور عفو اس کو گوارا نہ کیا کہ مغلوب دشمن غالب کو امارت مکہ سے برطرف کرے اور اس کی جگہ کسی اور کو مقرر کرے ۔

سلطان سعود نے فتح مکہ کے بعد جو کچھ اصلاح کی اسکے متعلق عثمان بن بشر مصنف عنوان المجد تحریر کرتا ہے ۔ میں بھی حج بیت اللہ کیا تھا اور میں نے سلطان سعود کو بحالت احرام ایک اونٹ پر سوار دیکھا اور اسی اونٹ پر سے اس نے خطبہ دیا تھا جس میں لوگوں کو توحید و سنت کی طرف توجہ دلائی۔

حج کے ارکان بتلائے اور کلمہ لاالہ الااللہ کی برکات اتحاد و امن اور غنایم کی فراوانی کے متعلق بیان کیا اور انھوں نے کہا کہ ایک کمزور کو قوی سے قوی تر کے مقابلہ میں اس کا حق دلا کر رہے گا اور اس کا پورا پورا انصاف کیا جائے گا۔ اور اس نے اسی سواری پر سے اعلان کیا کہ مکہ مکرمہ میں کوئی ہتھیار نہ اٹھائے اور کوئی عورت آراستہ و پیراستہ ہوکر بے پردہ باہر نہ نکلے۔ اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا کی دھمکی دی اور نماز باجماعت قائم کرنے کے لئے بطور خاص محتسب مقرر کئے گئے ہیں لہذا نماز باجماعت ادا ہو اور یہ بھی اعلان کیا کہ آئندہ بازاروں میں علی الاعلان کوئی تنباکو یا دیگر مسکرات کا استعمال کر سکے گا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مکہ مکرمہ میں منکرات بالکل مفقود ہو گئے۔

حرمین شریفین کی تطہیر ثانی کے بعد متعدد بیانات عرب اور انگریز مصنفین نے کئے ہیں جس میں کم و بیش مکہ مکرمہ و مدینہ طیبہ کی یہی حالت بتلائی گئی ہے جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ ہم نے بخوف طوالت صرف عنوان المجد جو انگریز مصنفین کا ماخذ ہے ایک حصہ نقل کر دیا ہے اور اس پر فلبی۔ برک ہارٹ وغیرہ نے کافی روشنی ڈالی ہے۔

حجاز کی فتح سے فارغ ہوکر سلطان سعود نے شام اور عراق کے بعض مقامات پر حملہ کئے اور کامیاب لوٹے۔ ۱۲۲۳ میں نجف پر حملہ کیا گیا اور ۱۲۲۵ میں شام فتح کیا گیا اس حملہ کی وجہ اہل شام سلطان سعود کے نام سے تھرانے لگے تھے۔ اسی زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے مقبوضات سلطانی میں سے راس الخیمہ پر چڑھ کر کے اس کو جلا دیا۔ چوں کہ یہ مقام سلطان کے دارالسلطنت سے فاصلہ پر ساحل بحر پر تھا اس لئے عساکر سلطانی کے پہونچتے پہونچتے انگریز بھاگ کھڑے ہوئے اس حملے کے اسباب پر پہلے روشنی ڈالی جا چکی ہے اس طرح اہل نجد کی فتوحات سلطنت عثمانیہ کے لئے باعث تشویش بن گئیں۔

اسی زمانہ میں محمد علی پاشا خدیو مصر بھی اپنی قوت بڑھا رہا تھا اور آہستہ آہستہ سلطنت عثمانیہ کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکنے کی فکر کر رہا تھا۔ اب حکومت ترکی کو ایک چال سوجھی کہ خدیو مصر کو اہل نجد سے بھڑا دیا جائے تاکہ اذا تعارضا تساقطا جب دو دشمن ٹکرائیں گے تو دونوں بھی گر یں گے ضمل ہو سکے اور کم از کم کسی ایک کے خطرہ سے حکومت کو نجات مل سکے۔ بہر حال قرعہ فال اس بار اہل نجد پر فوج کشی کرنے کے لئے محمد علی پاشا خدیو مصر کے نام پڑا اور محمد علی پاشا نے اپنے بڑے فرزند طوسون کو دس ہزار کا لشکر دے کر سلطان سعود بن عبدالعزیز کے مقابلہ پر روانہ کیا طوسون نے ۱۲۲۶ میں ینبوع کے ساحل پر قدم رکھا اور بندرگاہ ینبوع پر قابض ہو گیا یہاں سے مدینہ منورہ کی جانب پیش قدمی کی لیکن راستہ میں مقام جدیدہ پر مصری فوج کا مقابلہ اہل نجد سے ہو گیا جس میں شہزادہ عبداللہ بن سعود اور فیصل بن سعود تھے اس لڑائی میں اہل مصر کو بری طرح شکست دی اور آن کی آن میں بارہ سو مصری مارے گئے لیکن موحدین کا بہت ہی کم جانی نقصان ہوا اور طوسون بقیۃ السیف لشکر کے ساتھ بھاگ کر پھر ینبوع میں پناہ گزیں ہو گیا۔ چند دنوں کے بعد مصر سے جدید کمک آنے پر مدینہ منورہ روانہ ہوا دو ماہ کے محاصرہ کے بعد مدینہ منورہ فتح کر لیا گیا۔ یہاں سے فارغ ہوکر طوسون مکہ مکرمہ کی جانب روانہ ہوا۔ شہزادہ عبداللہ بن سعود جو نجد و حجاز کی متعدد افواج کا سپہ سالار بھی تھا اس خیال سے کہ اہل مصر بلدۃ الحرام کی کوئی بے حرمتی نہ کریں مکہ مکرمہ خالی کرنا مناسب سمجھا اور کیا عجب ہے کہ جس طرح حجاج بن یوسف نے حضرت عبداللہ بن زبیر کے خلاف فوج کشی کرتے ہوں خانہ کعبہ کی بے حرمتی کی تھی اور زمین کعبہ پر منجنیق سے پتھر برسائے تھے اس طرح مصری بھی بیجا حرکت نہ کریں۔ غرض کہ مکہ مکرمہ بلا مزاحمت اہل مصر کے حوالہ کر کے عبداللہ بن سعود چلے گئے اس کے بعد طایف بھی اہل مصر کے قبضہ میں آ گیا اس فتح کا جشن قاہرہ اور قسطنطنیہ میں بڑی دھوم دھام سے منایا گیا جشن سے فارغ ہوکر اہل مصر نجد کی جانب بڑھے لیکن طائف سے آگے منزل تربہ پر اہل نجد سے بڑی سخت لڑائی ہوئی جس میں اہل مصر کو بری طرح شکست ہوئی مصری بھاگ کر طائف میں قلعہ بند ہو گئے عثمان مضایفی جو اس لڑائی میں سپہ سالار افواج تھا اہل مصر کے تعاقب میں طائف کی جانب بڑھا۔ لیکن اس مرتبہ اہل مصر غالب آ گئے اور عثمان مضایفی جس کے نام سے اہل مصر تھراتے تھے اور جس کی گرفتاری پر پانچ ہزار ڈالر کا انعام حکومت مصر کی طرف سے مقرر تھا گرفتار ہو گیا اور اہل نجد کو شکست ہو گئی۔ برک ہارٹ کا خیال ہے کہ پانچ ہزار ڈالر کے انعام کے لالچ میں نجدی لشکریوں میں سے کسی نے غداری کر کے عثمان مضایفی کو گرفتار کرایا تھا۔ کوئی تعجب بھی نہیں میر صادق اور میر جعفر صفت ہر جگہ ہر حکومت اور ہر قوم میں رہتے ہی ہیں ممکن ہے کہ یہ صحیح بھی ہو بہر حال یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ الغرض عثمان مضایفی کو گرفتار کر کے مصر میں محمد علی پاشا کے پاس لایا

کیا گیا اور وہاں سے اس کو آستانہ خلافت پر روانہ کیا گیا جہاں بہت بے رحمی سے اس کو قتل کر دیا گیا ۔
الغرض لڑائی کی رفتار یہ تھی کہ کبھی اہل مصر کی فتح ہوتی تو کبھی اہل نجد کی اور لڑائی کی یہ رفتار کسی فریق کے لئے بھی اطمینان بخش نہ تھی اس لئے ۱۲۲۸ھ میں خدیو مصر محمد علی پاشا تازہ دم کمک کے ساتھ حجاز پہونچا اور آتے ہی شریف غالب کو گرفتار کر کے مصر میں قید کر دیا جہاں دو سال بعد وہ بے چارہ بحالت اسیری فوت ہو گیا اور اس کی جگہ یحییٰ بن سعود کو جو شریف غالب کا بھتیجا تھا برائے نام شریف مکہ بنایا گیا ۔ اور اس کے ساتھ ساتھ نجدیوں سے چھیڑ چھاڑ بھی جاری تھی حجاز اور دیگر ساحلی علاقے تو مصریوں کے قبضہ میں آ چکے تھے لیکن اندرونی حصہ عرب ابھی تک اہل نجد کے قبضہ میں تھا ۔ محمد علی پاشا نے مصطفیٰ بک کو فوج دیکر اہل نجد کے مقابلہ پر روانہ کیا لیکن پھر اسی مقام تربہ پر مصری اور نجدی افواج کی لڑائی ہوئی اس مرتبہ بھی مصریوں کو بڑی بھاری شکست ہوئی سب سے عجیب اور پر لطف بات یہ ہے کہ اب کی مرتبہ نجدی افواج کی کمان عثمان مضائفی شہید کی جگہ ایک بہادر عورت غالیہ کے ہاتھ میں تھی جس نے اس بے جگری سے بڑھ بڑھ کر حملے کئے کہ مصری افواج کو بھاگنا ہی پڑا فلبی اور برک ہارٹ نے اس بہادر عورت اور خاتون سپہ سالار کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے ہیں ملاحظہ ہو Arabia اور Travels in Arabia
غرض چند روز آرام لے کر مصر سے جدید کمک آنے پر مصری پھر آگے بڑھے اور مقام قنفذہ پر پھر ایک جھڑپ نجدی افواج سے ہوئی اور اس معرکہ میں بھی اہل مصر کی قسمت میں شکست تھی اور وہ پھر ناکام ہو کر بھاگ نکلی اور اہل نجد کو اس معرکہ میں بہت سا مال غنیمت ہتھیار وغیرہ ملا یہ جنگ محرم ۱۲۲۹ھ میں ہوئی اس کے بعد تین ماہ تک فریقین اسلحہ کی فراہمی اور دیگر فوجی ضروریات کی تکمیل میں مصروف تھے کہ اہل نجد کو ایک زبردست سانحہ سے دو چار ہونا پڑا ۔

سلطان سعود بن عبدالعزیز کی وفات

سلطان سعود بن عبدالعزیز مختصر سی علالت کے بعد ۱۱ رجادی الاول ۱۲۲۹ کو وفات پا گئے ان کی موت نے جنگ کا نقشہ ہی بدل دیا جس کا ذکر آگے آئے گا فی الحال ہم مرحوم سلطان نجد کی مختصر سیرۃ اور ان کے اخلاق پر کچھ گفتگو کر کے آگے بڑھیں گے ۔
سلطان سعود بن عبدالعزیز کی ولادت ۱۱۶۰ھ میں ہوئی جب ذرا بڑے ہوئے اور تعلیم کا زمانہ آیا تو یہ حضرت شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کے سپرد کر دیئے گئے شیخ نے ان کی تعلیم و تربیت میں خاص توجہ فرمائی اور نہ صرف ایک عالم دین بلکہ ایک اولوالعزم فرمانروا ثابت ہونے کی صلاحیت ان میں پیدا کر دی اسی لئے سلطان سعود بن عبدالعزیز میدان جنگ میں ایک بہادر سپاہی اور قابل فرمانروا تھا تو دربار میں ایک بے نظیر سیاست دان جبکہ مسجد کے منبر پر ایک فصیح و بلیغ خطیب تھا تو مسند درس و ارشاد پر ایک عالی دماغ فقیہ و عالم ۔ علوم فقہ حدیث میں سلطان کو خاصی دسترس تھی اور اس کے خطبات اور تحریرات ٹھوس اور عالمانہ ہوتے تھے ۔
زمانہ جنگ میں سلطان بلا ناغہ بعد نماز مغرب مجلس وعظ ترتیب دیتے تھے اور سپاہیوں کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے غزوات کے واقعات سنا کر ان کو بہادر اور ثابت قدم رہنے کی تاکید کرتے ۔ اپنے مواعظ کو موقع کی مناسبت سے قرآن مجید اور احادیث نبوی سے مزین کرتے ۔
لڑائی میں فوج کی ہدایت تھی کہ غزوات نبوی کی پوری پوری پیروی کی جائے کسی بھی حالت میں کسی عورت بوڑھے یا بچہ کو قتل نہ کیا جائے لڑائی ختم ہوتے ہی خمس نکال کر باقی مال غنیمت اسی وقت مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا اور صحیح اسلامی اصول کے تحت فارس اور رجل یعنی سوار اور پیادہ کا فرق تھا یعنی سوار کو پیدل کا دوگنا حصہ دیا جاتا ۔
زمانہ امن میں سلطان کا پروگرام مقرر تھا فجر کی نماز کے بعد اکابر شہر جمع ہوتے امیر سعود اور شاہی خاندان کے لوگ مدارس ۔ بیٹھتے ان کے بعد

حضرت شیخ الاسلام کے اہل خاندان کی نشست ہوتی اور تفسیر و حدیث کا درس دیتے تھے درس سے فارغ ہو کر وہ قصر حکومت میں جلوہ افروز ہوتے او حکومت کا کاروبار انجام دیا جاتا عام رعایا برایا کی شکایات سنی جاتیں دعاوی پیش ہوتے اور فیصل ہوتے اس سے فارغ ہونے کے بعد کچھ دیر آرام کرکے ظہر کی نماز پڑھتے بعد نماز قصر کے اندر مجلس درس آغاز ہوتی اس میں آل شیخ نہ ہوتے سلطان خود مسند درس پر تشریف فرما ہوتے اس کے بعد پھر عصر تک باہر حلقہ درس ہوتا اس میں بھی خود سلطان مسند درس پر متمکن ہوتے تفسیر ابن کثیر اور ریاض الصالحین کا درس سلطان کے ذمہ ہوتا اور سلطان خود شرح فرماتے اور یہ سلسلہ عصر تک جاری رہتا بعد نماز عصر پھر کاروبار سلطنت میں مغرب تک منہمک رہتے نماز مغرب کے بعد پھر حلقہ درس قائم ہوتا جس میں امرائے سلطنت معززین شہر وغیرہ وغیرہ کا اجتماع ہوتا اور شیخ سلیمان بن عبداللہ بن شیخ الاسلام صحیح بخاری کا درس ارشاد فرماتے نماز عشاء کے بعد دن کا یہ پروگرام ختم ہو جاتا یہ تھی حالت ان کی صورت

سیاسیات ملکی کی طرح سلطان جنگی امور پر بھی بہت حاوی تھے "برک ہارٹ" ان کی جنگی صلاحیتوں کا خاص طور پر مداح ہے وہ لکھتا ہے "کہ حملہ کے وقت سلطان اپنے عزائم کو بہت پوشیدہ رکھتا ہے شام پر حملہ کرنے کے لیے جب وہ روانہ ہوا ہے تو اس کو ایک ماہ پانچ یوم صرف پہونچنے میں لگے لیکن اہل شام کو اس حملہ کی خبر صرف دو دن پہلے پہونچی اور تدبر ملکی عدل و انصاف امن و امان اور سلطنت کے رعب و دبدبہ کی نسبت لکھتا ہے غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خلفاء کے بعد اب امن صرف عبدالعزیز بن محمد اور سعود بن عبدالعزیز کے دور حکومت میں نظر آتا ہے جس میں اہل عرب کو اپنے مال و متاع وغیرہ کی طرف سے بے فکر ہو کر آرام و چین سے سونے کا موقعہ ملا۔ ایک معمولی حبشی غلام بڑے سے بڑے سردار قبیلہ کو تن تنہا گرفتار کر کے حضور سلطانی میں پیش کرتا تھا یہ تھا سلطان کے رعب کا عالم سیرۃ سعود بن عبدالعزیز پر مختصر سی روشنی ڈالنے کے بعد اب ہم پھر سلسلہ داستان آغاز کرتے ہیں۔

امیر عبداللہ بن سعود بن عبدالعزیز

مرحوم سلطان سعود بن عبدالعزیز کی جگہ ان کے فرزند امیر عبداللہ بن سعود ان کے جانشین قرار دیئے گئے یہ شجاعت اور امور مہمات میں تو اپنے باپ کی طرح تھے لیکن میدان سیاست میں بہت پیچھے تھے وہ ایک ٹھیٹھ سپاہی تھے سیاسی جوڑ توڑ سے ان کو کوئی واسطہ نہ تھا۔ یہ تخت نشین ہوتے ہی اہل مصر سے صلح کی سلسلہ جنبانی آغاز کی لیکن اہل مصر نے صلح کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور لڑائی بدستور جاری رہی اُدھر محمد علی پاشا نے عابدین بک کو زہران کی جانب روانہ کیا جس نے راستہ میں قنفذہ پر قبضہ کر لیا لیکن ان کے آگے بڑھتے ہی پھر اہل نجد نے قنفذہ پر قبضہ کر لیا۔ زہران پر لڑائی ہوئی مگر اس میں بھی اہل مصر کو بری طرح شکست ہوئی۔

اس فتح کی خبر سے امیر فیصل بن سعود جو موجودہ امیر کے بھائی تھے اور طایف کے قریب طوسون کے لشکر کو روکے ہوتے تھے ان کی ہمت بڑھی اور طائف پر حملہ کرنے کی غرض سے آگے بڑھے۔ اس کی خبر پا کر خود محمد علی پاشا مکہ سے تازہ دم فوج لے کر خود آگیا اور مقام بسل پر جو طائف سے چند میل کے فاصلہ پر ہے اہل نجد اور اہل مصر کا مقابلہ ہوا اس لڑائی میں خلاف توقع اہل مصر کی فتح ہوئی اور امیر فیصل کو پیچھے ہٹ کر پناہ لینی پڑی۔ برانجس لکھتا ہے کہ اہل نجد کو اس شکست سے بہت نقصان اٹھانا پڑا کیوں کہ اس معرکہ میں پانچ ہزار سے زیادہ موحدین نے جام شہادت پیا اور اہل نجد کی قوت کمزور پڑ گئی۔ محمد علی پاشا نے دوران جنگ میں اعلان کیا تھا کہ جو کوئی ایک نجدی کا سر کاٹ کر لائے گا اس کو چھ ڈالر انعام ملے گا۔

امیر سعود بن عبدالعزیز مرحوم کی ہدایت تھی کہ اہل مصر سے کبھی کھلے میدان میں مقابلہ نہ کیا جائے لیکن افسوس کہ فیصل نے زعم شجاعت میں اس ہدایت کی تعمیل نہیں کی اور قوم کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہونچایا۔ الغرض محمد علی پاشا نے معرکہ بسل میں وہ مظالم ڈھائے کہ اس کی داستان رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے۔ برک ہارٹ جو ان واقعات کا عینی شاہد ہے نہایت صراحت سے اس کا ذکر کیا ہے غرض کہ محمد علی نے پچھلی ناکامیوں کا انتقام اسی معرکہ میں لینا چاہا پھر محمد علی نے تربہ کے قبائل کو مطیع کر کے عسیر تک پہونچ گیا اور قنفذہ سے ہو کر مکہ معظمہ اور وہاں سے مصر واپس ہو گیا۔

چونکہ طوسون اس وقت مدینہ طیبہ میں تھا اور نجد پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا اور وہ مدینہ منورہ میں بھی خاموش نہ بیٹھا بلکہ اطراف کے

مقامات پر قبضہ بھی کرتا رہا۔ ادھر معرکہ سبل کے بعد نجدی دستے ایک گوریلا وار کی شکل اختیار کر گئے تھے اس لئے اس کے ذرائع خبر رسانی منقطع ہو چکے اور دوران جنگ میں اس کو محمد علی پاشا کی کوئی خبر نہ مل سکی یہاں تک کہ وہ حجاز سے مصر روانہ ہو گیا۔ محمد علی کی روانگی کے ساتھ ہی سلطان عبدالعزیز بن سعود نے اہل مصر کا محاصرہ کر لیا اسی طرح اہل مصر نے دو ماہ تک محصور رہ کر صلح کا پیام روانہ کیا اور فریقین کی رضامندی سے صلح ہو گئی۔ شرائط صلح کی اہم شرطیں یہ تھیں کہ عبداللہ بن سعود نے ترکی خلیفۃ المسلمین کی ماتحتی تسلیم کر لی تھی اور کسی قریبی زمانہ میں بطور اظہار اطاعت آستانہ خلافت پر حاضر ہونے کا بھی اقرار کیا تھا اور اہل مصر نے نجد کے پورے علاقہ سے ترکی افواج ہٹالیں اور اہل نجد کو حج اور دیگر مقامات پر آنے جانے کی پوری پوری آزادی دیئے جانے کی طمانیت دی تھی۔

فلبی اپنی کتاب **Arabia** کے صفحہ ۹۷ پر لکھتا ہے کہ عبداللہ کی حالت اس وقت بہت اچھی تھی اور ان کو نجد کے ہر مقام سے کمک پہونچ رہی تھی انھوں نے اہل مصر کی نازک حالت کا اندازہ نہیں کیا اگر وہ موقعہ سے فائدہ اٹھاتے تو اہل مصر کا پوری طرح قلع قمع کر دینا بہت آسان تھا ان کے برخلاف اہل مصر نے اس صلح سے بہت کافی فائدہ اٹھایا اور نہایت امن و امان کے ساتھ مدینہ منورہ پہونچ گئے غرض یہاں تو صلح ہو گئی لیکن محمد علی پاشا نے اس صلح کو ناپسند کیا۔ اور صلح توڑنے کے بہانہ ڈھونڈھنا شروع کیا اور صلح نامہ کی ایک شرط کے مطابق امیر عبداللہ سے مطالبہ کیا کہ وہ جلد سے جلد آستانہ خلافت پر حاضر ہوں۔ چونکہ امیر نجد اس قدر جلد اپنے آپ کو حکومت مصر و ترکی کے حوالہ کرنا نہیں چاہتے تھے اس لئے وہ آس پاس کے قبائل کو منظم کرنے اور دوبارہ اہل مصر سے ٹکر لینے کی تیاریاں کرنے لگے۔ ادھر محمد علی پاشا نے اس صلحنامہ کو جو درحقیقت ایک فریب تھا۔ نامنظور کر کے طوسون کو جو ابھی تک مدینہ منورہ میں مقیم تھا واپس مصر طلب کر لیا اور اس کی جگہ اپنے دوسرے لڑکے ابراہیم کو مقرر کیا۔ اس ابراہیم کی نسبت فلبی نے اپنی کتاب **The Penetration of Arabia** کے صفحہ ۱۵۱ پر لکھا ہے کہ یہ ابراہیم محمد علی پاشا کا اصلی فرزند نہیں تھا بلکہ محمد علی نے اس کی ماں سے نکاح کر لیا تھا اور یہ اس کے ساتھ آیا تھا اور محمد علی نے اس کو اپنا متبنیٰ بنا لیا تھا۔ لیکن بہت دن ہوئے میں نے کسی اردو تاریخ میں دیکھا تھا کہ ابراہیم کی والدہ کوئی اٹالین رومن کیتھولک عورت تھی اور ابراہیم کی عمر جس وقت دس سال کی تھی وہ محمد علی پاشا کے حرم میں داخل ہوا۔ اس لئے یہ ابراہیم گو بظاہر مسلمان تھا لیکن اندرونی طور پر اپنی ماں کی تلقین سے وہ عیسائی اور مسلمانوں کا بدترین دشمن تھا اس کے حاشیہ نشین بھی سب کے سب کیتھولک عیسائی ہی تھے اور اس کے طبیب خاص کا نام **Scato** تھا جو اٹالین تھا ہوگا رتھے اس کے حاشیہ نشین اٹالین اور فرنچ عیسائیوں کے نام بھی گنوائے ہیں غرض ابراہیم نے جو مظالم اہل نجد اور عربوں پر کئے وہ سب ان ہی عیسائیوں کے ایماء و اشارہ سے کئے گئے تھے لیکن اس وقت مجھے یاد نہیں آرہا ہے کہ اس تاریخ کا نام کیا تھا اور اس کا مصنف کون تھا غرض کہ سطور بالا پچھلی یادداشت کی بنا پر لکھے گئے۔

غرض محمد علی خدیو مصر نے طوسون کی مرتبہ شرائط صلح کو کبھی یہ کہہ کر کہ عبداللہ بن سعود بلا کسی شرط کے آستانہ خلافت پر حاضر ہوں کبھی مویہ احسار کا مطالبہ کر کے صلح نامنظور کر دی اور ابراہیم کو جس کا ذکر اوپر ہوا ہے ۱۲۳۱ھ میں ایک جرار لشکر کے ساتھ روانہ کیا ابراہیم حناکیہ پہونچا اور یہاں کئی ماہ تک پڑا رہا۔ یہ مصری قوم کیسی تھی اور کس قماش کی تھی جو ابراہیم کی سرکردگی میں اہل توحید سے لڑنے آتی تھی اس کا ذرا سا خاکہ کتاب عجائب الآثار فی التراجم والاخبار جلد چہارم صفحہ ۲۰۰ مصنفہ عبدالرحمٰن بن حسن مطبوعہ مصر میں ملاحظہ ہو۔ مصنف نے بعض اکابر فوج کا بیان تحریر کیا ہے اور غالباً بعض اکابر سے شروع کرتا ہے "وہ کہتا ہے کہ ہماری فوج کا بڑا حصہ بالکل دین سے برگشتہ ہے اور وہ کسی شعار مذہبی کے پابند نہیں مسکرات کے بہت سارے بکس بھرے ہوتے ہمارے ساتھ ہیں اور وہ فوجیوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں ہمارے کیمپ میں اذان کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی اور نہ اہل فوج کے دلوں میں شعائر دینی کا کوئی خیال آتا ہے ہمارے برخلاف نجدی قوم وقت ہوتے ہی اذان دیتی ہے اور سارا لشکر امام کے پیچھے نہایت خضوع و خشوع سے نماز ادا کرتی ہے اگر دوران میں کہیں نماز کا وقت آجائے تو موذن کی اذان کے ساتھ ہی ساری فوج صلوٰۃ خوف پڑھتی ہے اور ہماری سپاہ حیرت سے ان کا منہ تکتے رہ جاتی ہے ان لوگوں کو ایسی نماز پڑھنا تو بڑی بات ہے دیکھنا اور سننا بھی شائد نصیب نہ ہوتا ہوگا۔

یہ تھی مصری فوج کی اخلاقی حالت دوسری طرف محمد علی پاشا اور اس کا بیٹا لڑکا طوسون اہل نجد کے مقابلہ پر آکر آزما چکے تھے کہ نجدی قوت کو زیر کرنا

آسان نہیں ہے اس لئے اب کے بار انھوں نے قوت کے ساتھ ساتھ دوسری چال بھی چلی یعنی بدوی قبائل کو رشوت دے کر اہل نجد سے منحرف کرنے کی بھی کوشش کی اس رشوت کا تذکرہ . برک ہارٹ ہوگارتھ برانجس نے صاف صاف الفاظ میں کیا ہے برانجس کا بیان ہے کہ "محمد علی پاشا نے سپاہیوں کی قوت سے زیادہ روپیہ کی قوت سے نجد پر اپنی دھاک بٹھائی" ان حقائق کی موجودگی میں جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ابراہیم حناکیہ میں کئی ماہ تک پڑا رہا تو اطراف کے قبائل آآکر اظہار اطاعت کرنے لگتے ہیں تو ہم کو صاف نظر آتا ہے کہ اس کی تہہ میں کیا کام ہو رہا ہے . جب امیر عبداللہ نے دیکھا کہ قبائل حرب مطیر و عتیبہ وغیرہ اہل نجد سے بچھڑ کر ابراہیم کے جھنڈے کے تلے جمع ہو رہے ہیں تو اس نے پیش قدمی کی اور ماویہ کے پاس لڑائی ہوئی اگرچہ اہل نجد نے جم کر مقابلہ کیا لیکن مصری توپوں کی شرباری نے جو فرنچ اور اٹالین انجینروں کی نگرانی میں ہو رہی تھی اہل نجد کو پسپا ہوجانا پڑا . امیر عبداللہ قصیم کی طرف پلٹا اور قلعہ بند ہوگیا ابراہیم نے تعاقب کیا اور اس کے مقام پر ٹھہرا اور محاصرہ کرلیا مسلسل کئی ماہ کے محاصرہ کے بعد اہل شہر نے امان طلب کی دوران محاصرہ میں صرف ۲ موحدین اور سات سو مصری شہید و قتل ہوئے اس فتح سے آئندہ کے لئے مصری فتوحات کا راستہ ہموار ہوگیا اور اہل مصر آہستہ آہستہ خبر و بریدہ وغیرہ پر قبضہ کرتے ہوئے شقراء پر پہونچے یہاں بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی لیکن مصری توپ خانہ اور اس کے فرنچ افسر کی وجہ یہاں بھی اہل نجد کو پسپائی ہوئی شقراء کے بعد ضرمی جو بڑا مستحکم قلعہ تھا یہاں بھی لڑائی ہوئی یہاں کے باشندے گھروں اور بازاروں میں قتل کر دیئے گئے اور اہل مصر نے یہاں پوری پوری درندگی کا ثبوت دیا ضرمی کا ہاتھ سے نکل جانا گویا درعیہ کے سقوط کا پیش خیمہ تھا اب درعیہ کا محاصرہ کرلیا گیا تھا درعیہ کا محاصرہ چھ ماہ سے کچھ اوپر قائم رہا روزانہ جنگ ہوتی اور مصری بڑی تعداد میں مارے جاتے رہے لیکن ان کو ہر وقت تازہ دم کمک آتی رہتی تھی ادھر محصورین کے پاس رسد اور اسلحہ کی روز بروز کمی ہونے لگی اس سے پریشان ہوکر اہل شہر نے امان طلب کی لیکن امیر اس سے متفق نہیں ہوتے اور اپنے خاندانی قلعہ میں جو طریف کہلاتا ہے پناہ گزیں ہوکر لڑائی جاری رکھی لیکن قلعہ کی دیواریں گولہ باری کی وجہ منہدم ہوگئیں اب مدافعت بیکار تھی اس لئے امیر عبداللہ مع اپنے افراد خاندان اور آل شیخ کے ساتھ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئے اور اس طرح بقول مسٹر فلبی First Wahabi Empire اولین وہابی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا .

اگرچہ کہ امیر عبداللہ نے بطور امان طلبی ہتھیار رکھ دیئے تھے لیکن ابراہیم نے ان کو بطور جنگی قیدی مصر روانہ کیا جہاں ان کے ساتھ وہ سب کچھ بدسلوکی کی گئی جس کی اہل مصر کو ان کی درندگی اجازت دے سکتی تھی غرض ان کو محرم ۱۲۳۴ھ میں قسطنطنیہ روانہ کیا گیا اور ۱۸ صفر ۱۲۳۴ھ میں ان کو مسجد ایا صوفیہ کے صحن میں پھانسی پر چڑھا کر شہید کر دیا گیا . اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ :

درعیہ میں جو چھ ماہ لڑائی ہوتی رہی اس میں خاندان شاہی کے اکیس افراد نے جام شہادت نوش کیا اور شیخ الاسلام کی اولاد میں سے تین مرتبہ شہادت پر فائز ہوتے اور ان کے علاوہ حضرت شیخ الاسلام کے ممتاز شاگردوں اور علماء و اکابر شہر کی ایک بڑی تعداد شہید کی گئی .

موحدین نجد کی اس شکست پر حکومت ہند ایسٹ انڈیا کمپنی نے کپتان جارج فاسٹر سیڈلز کو مبارک باد پیش کرنے کی غرض سے ابراہیم کی خدمت میں روانہ کیا اور دیگر عیسائی یوروپین اہل قلم نے بڑی مسرت سے اس ہزیمت کا ذکر کیا ہے نمونتاً دو حوالہ جات درج کئے جاتے ہیں فلبی اپنی کتاب Arabia کے صفحہ ۱۲ پر لکھتا ہے کہ .

"عرب میں سودی خاندان کے اقتدار کو ایک قصہ ماضی تصور کرنا چاہئے"

وزیمر نے اپنی کتاب گہوارہ اسلام صفحہ ۱۹۱ Arabia the cradle of Islam. "وہابی تحریک جو بڑی زور شور سے مردہ اسلام کو زندہ کرنے اٹھی تھی لیکن اس کا خاتمہ انتہائی ناکامی پر ہوا اور سیاسی اعتبار سے تو وہ ایک شاندار سوانگ سے کم نہ تھی" یہ تھی پادری وزیمر کی رائے لیکن آج دنیا نے دیکھ لیا کہ اہل توحید کو بزعم خود برباد کرنے والے مصری اور ان کی حکومت خدیو مصری چند ہی سال میں صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ گئی ترکی سلطنت عثمانیہ اور اس کی خلافت بھی آج دنیا سے ختم ہوچکی لیکن اہل توحید جنھوں نے اعلائے کلمۃ الحق کی راہ میں اپنی جانیں قربان کردیں پھر آج دنیا میں اسی آن بان کے ساتھ تطہیر حرمین شریفین کرنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے فرائض اشاعت سنت و توحید اور رد بدعت و شرک برابر انجام دیئے جا رہے ہیں . بقول اقبال

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری ؛ صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

سلام خیرالانام صلی اللہ علیہ وسلم

اے شہنشاہِ دو عالم، صاحبِ افسر سلام　　السلام　　شافع محشر سلام
ناظمِ بزمِ دو عالم، ساقیٔ کوثر سلام　　السلام　　شافع محشر سلام
پاک سیرت، پاک طینت عالی و والا گہر　　بسر　　بہتر از جن و بشر
مصطفٰے و مجتبٰے و سید برتر سلام　　السلام　　شافع محشر سلام
عالم و عامل مگر مشہور با امیؔ لقب　　للعجب　　مخزن علم و ادب
سالکانِ معرفت کے رہبر انور سلام　　السلام　　شافع محشر سلام
سب سے اعلیٰ سب سے افضل بعد رب العالمین　　دلنشیں　　سب حسینوں سے حسین
اے گروہِ انبیاء کے خاتم و سرور سلام　　السلام　　شافع محشر سلام
ماحیٔ کفر و ضلالت، حامیٔ صدق و صفا　　باوفا　　مظہر نورِ خدا
صاحبِ قرآں حبیب خالقِ اکبر سلام　　السلام　　شافع محشر سلام
کاشفِ سرِّ حقیقت، قاطع مکر و دغا　　باخدا　　منبع جود و سخا
ناصرِ بیچارگاں، مخلوق کے رہبر سلام　　السلام　　شافع محشر سلام
اے تمنائے دو عالم رحمت للعالمین　　بالیقیں　　بانیٔ حبل المتیں
جادۂ انسانیت کے قائدِ اطہر سلام　　السلام　　شافع محشر سلام
دیکھ کر اسلام سا محکم نظامِ زندگی　　یا نبی　　روحِ تہذیبِ نوی
کر رہی ہے آستاں پر آج بھی جھک کر سلام　　السلام　　شافع محشر سلام
امتِ مرحوم ہے دنیا میں باحالِ تباہ　　آہ آہ　　رحم کی بس اک نگاہ
سرورِ عالم پناہ، مختارِ بحر و بر سلام　　السلام　　شافع محشر سلام

سید مرغوب امین کاظمی امروہوی

الیساندرو بوزانی

شاعرِ مشرق

نامور اطالوی مفکر "الیساندرو بوزانی" نے اقبال کے "جاوید نامہ" کا منظوم ترجمہ اطالوی زبان میں کیا ہے اور اس کا ایک نہایت فاضلانہ مقدمہ بھی لکھا ہے ذیل میں اس مقدمہ کے اہم حصوں کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

اقبال جس کی ایک منظوم تصنیف جاوید نامہ کا ترجمہ ہم اطالوی قارئین کی خدمت میں پہلی بار پیش کر رہے ہیں۔ شدت سے اسلام کا معتقد ہونے کے باوجود مغرب کے فلسفہ اور معارف روحانیہ میں بھی گہرا عبور رکھتا تھا۔ یہ دو خصوصیتیں، جو شاذ و نادر ایک ہی شخصیت میں جمع ہوتی ہیں اقبال کا مابہ الامتیاز ہیں۔ وہ غالباً مشرق کے جدید ممالک اسلامیہ کا واحد مصنف ہے جس کے افکار کا مغرب کے بعض حلقوں میں نہ صرف پرچار سنائی دیتا ہے بلکہ ان سے اتفاق کیا جاتا ہے اور شاید قبول بھی۔ اس سے ہمیں یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ اس کا فن، جسے اس نے قصداً ایک نظریہ، ایک تصور اور افکار کی ترجمانی کے لئے وقف کر دیا ہے، اس کی شخصیت کا سب سے اہم یا بنیادی پہلو نہیں۔ اس پر جہاں بعض حلقوں میں شدید لے دے کی گئی ہے وہاں بعض نے اتنے ہی جوش و خروش سے اس کا خیر مقدم بھی کیا ہے۔ علاوہ بریں اس کے بعض ہم مذہبوں نے (جو روایتی مذہبی زندگی اور شعائر سے روز بروز زیادہ ہی دور ہوتے جا رہے ہیں اور اگر وہ مغرب کی دہریت کے قائل نہیں کم از کم مذہب اور زندگی کی اس مکمل علیحدگی کے قائل ضرور ہوتے جا رہے ہیں جو اسلام میں نصرانیت سے بھی زیادہ ناقابل تصور ہے۔) اس کے اسلام، خصوصاً پان اسلامیت میں شدید اعتقاد کو، جس میں مغربی تہذیب و تمدن کی مخالفت کو خاص دخل ہے، شدت سے ہدف تنقید بنایا ہے۔

اپنے فن کی طرح اقبال اپنے مذہبی فلسفہ میں بھی انقلاب پسند تھا۔ باغی نہ تھا چنانچہ اس نے ایک باغی فنکار کا روپ دھار کر اندھا دھند شعلے بکھیرنے کے بجائے بڑی سنجیدگی اور استقلال کے ساتھ فن کے اس کلاسیکی مشرب کو اپنایا جسے حقارت "گل و بلبل" کی شاعری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اگرچہ اس نے اس قدیم پیمانہ میں نئے تصورات اور تاثرات کی شراب بھر دی ہے۔ بعینہ اس طرح جس طرح اس نے اپنے مذہبی فلسفہ میں اسلام سے کبھی روگردانی نہیں کی۔ خواہ وہ اپنے بے باک خیالات کی جولانی میں کہیں دور شطحیات کی سرحد تک کیوں نہ پہونچ جائے "وہ ایک ایسا انقلابی تھا جو اپنے والہانہ جوش و خروش کو ایک خوش آیند ہیئت میں سمو سکتا ہے" یہ تعریف، اقبال کے فن اور فکر دونوں پر صادق آتی ہے۔ اس کا ذہن بتدریج ارتقا کرتا رہا پہلے عنفوان جوانی میں اس کا اعتقاد سرسری قسم کا مذہبی اعتقاد تھا، پھر وہ ایک [illegible] مبہم قسم کی وحدت الوجود کا قائل ہوا جو ترقی کرتے کرتے آخر کار قدیم ادعانات

کی بڑی اچھوتی، طبع زاد اور عمیق تشریح پر منتج ہوئی ہم اس ارتقاء کو صرف اسلامی نقطۂ نظر ہی سے سمجھ سکتے ہیں۔ وہ نقطۂ نظر جس کی نہایت واضح تعریف سورۂ بقرہ کی پہلی ہی آیت میں یوں کی گئی ہے کہ "متقی وہ ہیں جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، صلوٰۃ کو قائم رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دیا ہے اسی سے خرچ کرتے ہیں" یعنی ایک ہستی ماوراء پر پکا ایمان۔ (۲) ایمان کو نہایت سادہ مگر معین اور باقاعدہ شعائر کی شکل میں متشکل کرنا۔ (صلوٰۃ سے مراد نماز باجماعت ہے نہ کہ نجی عبادت) اور (۳) مال کی تنظیم اس طرح کہ ہر مومن کے مال و دولت کا حصہ جبری ٹیکس کے طور پر ایک شرکت عامہ یعنی بیت المال میں جمع کیا جائے۔ اسلام ایک ایسا مذہب نہیں کہ اپنے پیرووں کے لئے پیچیدہ عقائد کا گورکھ دھندا بن جائے۔ یہ صرف اتنا چاہتا ہے کہ وہ ایک خدا پر ایمان لائیں، یہ مانیں کہ وہ خود کو وقتاً فوقتاً برگزیدہ انسانوں کے ذریعہ جنھیں وہ خود ہی چنتا ہے اور جن کے سلسلہ کی آخری کڑی حضرت محمدؐ تھے، اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ اسلامی عبادت یعنی نماز میں تمثیلی شعائر مثلاً اصطباغ، عشائے ربانی وغیرہ کو کوئی دخل نہیں یہ محض سیدھی سادی عبادت ہے، جو رکوع و سجود پر مشتمل ہے اور دن میں پانچ بار ادا کی جاتی ہے۔ اسلامی ریاست ایک قسم کی مثالی حکومت الٰہیہ ہے جس میں ہر شخص خدا کی واحد اور مطلق حاکمیت کے سامنے برابر حیثیت رکھتا ہے۔ وہ خدا جو اناجیل کے باپ کی بہ نسبت توریت کے یہوا سے کہیں زیادہ قریب ہے۔ ان حدود میں فرد کی نظری و عملی آزادی کافی وسیع ہے۔ اسلام تکفیر میں اس قسم کی سہولت نہیں بخشتا ہے جو مثال کے طور پر کیتھولک فرقہ کے غایت درجہ فقیہانہ نظام میں دکھائی دیتی ہے۔

اقبال کے فکر میں ابتدائی تذبذب اور بعد میں کچھ تضادات ہیں، صرف اس وقت دکھائی دیتے ہیں۔ جب ہم اس بنیادی حقیقت کو فراموش کر دیں کہ وہ ایک بندۂ مومن تھا، چنانچہ جب ایک جدید روشن خیال شخص نے اس سے بڑے تعجب کے ساتھ پوچھا "آپ اس قدر متمدن ہوتے ہوئے خدا پر کیسے یقین رکھتے ہیں؟" تو اس نے جواب دیا "خدا میں تو اسے اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں، اسے مس کرتا ہوں، وہ تو میرے لئے ایک حقیقی احساس کی حیثیت رکھتا ہے" اقبال نے کبھی اس عقیدہ کو ترک نہیں کیا اس لئے اس کے تمام ارتقائی تصورات اس کا تذبذب ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ قرآن کی اصطلاح میں تمسک بحبل اللہ پر عمل

کرتے ہوئے خطرناک سے خطرناک گھاٹیوں پر بھی بے تکلف سیر کرسکتا تھا اور اس کے تمام اقوال۔ وہ نطشے سے ملتے جلتے مقولے اور تجویزیں جو اس کے قلم سے بکثرت صادر ہوتی ہیں ہمیشہ اس رب کے تحت ہوتے ہیں جو عالمین اور غیر عالمین کا رب ہے اور جو ہمیشہ اس کی روح کا حقیقی آقا و مولا رہا ہے۔

اقبال کا مذہبی فلسفہ خودی کے تصور پر مبنی ہے جس پر وہ خاص طور سے زور دیتا ہے اس کے استاد ڈاکٹر میکٹیگرٹ نے جو ہیگل کا پیرو تھا، اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ پڑھنے کے بعد ۱۹۲۰ء میں ایک خط لکھا تھا جس میں یہ دلچسپ سطور دکھائی دیتی ہیں۔

"روحانی اور جسمانی دونوں اعتبار سے انسان فی نفسہ ایک مکمل مرکز تو ہے لیکن ابھی فرد مکمل نہیں بن سکا۔ جتنا وہ خدا سے دور رہیگا، اتنی ہی اس کی ذات نامکمل ہوگی، اس لئے نہیں کہ وہ خدا میں قطعی طور پر جذب ہو جائے۔ بلکہ اس کے برعکس، وہ خدا کو اپنے اندر جذب کرے گا۔ حقیقی فرد نہ صرف اس مادی دنیا کو اپنے اندر جذب کر کے اس پر غالب آجاتا ہے، بلکہ وہ خدا کو بھی اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ زندگی جذب و تحلیل کا ایک ترقی پذیر سلسلہ ہے۔ یہ ان تمام رکاوٹوں کو دور کر کے اپنے اندر سمو لیتا ہے، جو اس کے اقدام میں سد راہ ہوتی ہیں۔ اس کی خاصیت تمناؤں اور آدرشوں کی مسلسل تخلیق ہے اپنے تحفظ و توسیع کے لئے زندگی نے اپنے ہی سینے سے بعض آلات بنائے۔ مثلاً حواس شعور وغیرہ جو ان موانعات کو جذب و ہضم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ زندگی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ مادہ یا قدرت ہے۔ پھر بھی قدرت کچھ ایسی بری چیز نہیں کیوں کہ اس سے زندگی کی باطنی قوتوں کی نشو و نما ممکن ہو جاتی ہے۔ وخودی، تمام رکاوٹوں کو دور کر کے اختیار حاصل کر لیتی ہے۔ یہ کچھ مختار ہے اور کچھ مجبور، اور جتنی یہ سب سے زیادہ مختار فرد یعنی خدا کے قریب پہونچتی جاتی ہے۔"

خدا کا یہ تصور کہ وہ "امکان کی آخری حد تک سب سے زیادہ مختار فرد ہے" بالکل قرآنی ہے اور ساتھ ہی اناجیلی بھی یعنی وہ خدا جو فعال مطلق ہے اور اس کے افعال تمام چون و چرا سے بالا ہیں۔ ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کا خدا" یہ ہرگز ہرگز وہ خدا نہیں جس کو مختلف صوفیانہ مشربوں میں حاکم مطلق، وجود یا ازلی قوت کہا جاتا ہے۔ اقبال مشرق و مغرب کے ان معدودے چند فلسفیوں میں سے ہے جنھوں نے عہد حاضر میں اللہ کے سامی تصور کو (جو کلاسیکی اور صوفیانہ تصور کے بالکل منافی ہے اور جس سے غلط تصورات خود بخود دور ہو جاتے ہیں) درست طور پر سمجھ اور دوبارہ بروئے کار لانے کی اہمیت کو سمجھا اور پھر اسے نہایت خوش اسلوبی سے اپنی مختلف تصانیف میں بیان کیا ہے۔ اقبال کے افکار کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس سے اس قسم کی مذہبیت کا نظریہ "عملیت" (PRAGMATISM) کے نقطہ نظر سے بھی جواز پیدا ہوتا ہے۔ اقبال نے اپنی تصانیف میں واضح کیا ہے کہ ابن عربی (جس نے لکھا تھا کہ حق کے سوا کچھ بھی نہیں، اس کے سوا اور کوئی چیز موجود نہیں جہاں نفس کل ایک ہے، وہاں نہ کوئی، یہاں ہے نہ وہاں) جیسے فلسفی کا خدا جسے یورپ کے کئی جدید مفکر اناجیل کے قدیم خدا سے بہتر خیال کرتے ہیں، فی الحقیقت کہیں زیادہ غیر ترقی پذیر، جابر اور غلام بنانے والا ہے۔ بمقابلہ

اس خدا کے جسے قرآن میں ایک کامل مطلق اور لاانتہا فرد تصور کیا گیا ہے، مکانی حیثیت سے نہیں، بلکہ اپنے لامحدود داد، بالکل آزادانہ تخلیقی عمل کے باعث۔ اقبال کے مطابق ایسا خدا جس کے ساتھ انسان عبادت کے ذریعہ رابطہ پیدا کر سکے، انسانی خودی کو زبردست تقویت پہنچانے والا خدا ہے، دنیا کے علماء نے ابھی تک یہ محسوس ہی نہیں کیا کہ وہ اس ہستی کے دل میں کس قدر قوت مضمر ہوتی ہے، جو یہ کہتا ہے کہ وہ اس ہستی اعلیٰ کے ساتھ وابستہ ہے یا اس کا عبد ہے۔ ایسا انسان زمان و مکان کی زنجیروں سے بالکل آزاد ہو جاتا ہے اور ایک غیر قانونی چیز بن جاتا ہے جو بالکل منفرد ہوتی ہے۔

انسانی فرد کی یہ مکرر کش مکش کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ماحول اور فطرت ناسازگار کے خلاف وہ فطرت جو وجود کی گہرائیوں میں بھی ممکن ہے۔ وہ کش مکش ہے جس کی بدولت وہ زیادہ سے زیادہ اختیار حاصل کر لیتا ہے، جو خدا کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ دوسری کش مکش اس تناؤ کو برقرار رکھتی ہے، جو بقائے دوام کا باعث ہوتی ہے۔ اس دوہری کش مکش سے دنیا میں ایک نیا انسان پیدا ہوگا، جو نطشے کی اصطلاح میں فوق البشر ہوگا، لیکن اقبال اسے مومن سے تعبیر کرتا ہے اور یہ فرق بڑا دلچسپ ہے۔ فرد کامل اس قسم کا خدا مست، کامل انسان ہے جو ابھی تک بروئے کار نہیں آیا اور جو قدرتی طور پر ہر شخصیت کو توانائی عطا کرتا ہے تمام نام نہاد "مومنین" نے خدا کی تشریح اس طرح کر دی ہے کہ وہ بالکل نوفلاطونی خدا بن کر رہ گیا ہے اور بڑے بڑے مذاہب ایک ایسی مذہبیت میں محو ہو کر رہ گئے، جسے مارکس کے پیرو بجا طور پر "افیون ام" قرار دیتے ہیں۔ موجودہ مسلمانوں بالخصوص اپنے ہم وطنوں کا زوال تو اقبال کی سب سے زیادہ کرخت تنقید کا موجب ہے، جس میں وہ وفور محبت سے اور بھی زیادہ تلخ نوائی سے کام لیتا ہے۔ چونکہ اقبال (جو بیک وقت ایک باعمل انسان اور سیاست داں بھی تھا) محسوس کرتا ہے کہ حقیقی اسلام کا یہ انقلاب (جو حقیقی عیسائیت اور مسیحیت کے احیائے ثانیہ کے ساتھ ہم آہنگ ہے) نوع انسان کی ترقی کے لئے لازمی ہے، اس لئے وہ اس کو ایک سیاسی نصب العین کے طور پر اختیار کرتا ہے یعنی وہ اپنے ہم مذہبوں کو بے خودی اور غلامی سے نجات دلا کر ایک پیغمبرانہ خودی کے طور پر جبر کی، کش مکش آمیز زندگی کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔

اس کش مکش میں اقبال علمی وجوہ کی بنا پر صریحاً مغرب کے خلاف ہے اور غالباً ضرورت سے زیادہ خلاف۔ میرے خیال میں اس فکر کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ بہت آسانی سے اس عمومی رائے کو قبول کر لیتا ہے کہ مشرق (کون سا مشرق؟) "دل" کا حامی ہے اور مغرب "دماغ" کا مشرق تجرد پسند، روحانیت اور تصوف کا قائل ہے اور مغرب خالص مادی عمل پرستی کا مشرق میں مذہب اور مغرب میں عقل، مشرق میں خواب اور مغرب میں اصلیت کا دور دورہ ہے۔ بلا شبہ یہ بڑی مخدوش سی بات ہے کہ ایک ایسے تہذیبی سلسلہ کو مادی قرار دیا جائے جس نے آگسٹائن اور سینٹ جان ہستیاں پیدا کیں اور اس سلسلہ کو روحانی جس میں تیمور لنگ اور چنگیز خاں پیدا ہوئے اور جب اقبال یہ کہتا ہے کہ ع

بہتر ہیں کلیساؤں سے بنکوں کی عمارات

تو میرے خیال میں وہ نہایت ارفع و اعلیٰ مقاصد جو اسے مغرب کی بے انتہا متنزل دنیا کے خلاف جد و جہد کی تحریک دلاتے ہیں، اسے ان مذہبی و روحانی تحریکات بھلا دیتے ہیں جو آج

کے بے حد مادی زمانہ میں بھی یورپ کے مذہبی انفعالات سے ظہور پذیر ہوتی ہیں یہاں تک کہ وہ مغرب کے انتہائی بعید حصّہ امریکہ میں بھی موجود ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال کو مشرقی تمدن سے گہرا لگاؤ ہے اور خواہ وہ اپنے مذہبی افکار میں نطشے، برگساں، میک ٹیگرٹ اور دیگر مغربی مفکرین سے کتنا ہی کچھ حاصل کیوں نہ کرے اس کا دل پھر بھی قرآن اور اس کے ان شارحین ہی کا گرویدہ ہے، جن میں ایک طرف امام ابن تیمیہ اور ہندوستان کے شیخ احمد سرہندی اور دوسری طرف ایران کے نامور عارف مولانا جلال الدین رومی شامل ہیں، جو یونانی و کلاسکی فکر کے علی الرغم خالص اسلامیت کے قائل تھے گئی ظاہر ہیں شاعر رومی کو محض ایک صوفی خیال کرتے ہیں، گویا وہ اس مبہم سریت کا پیر مغاں ہے جو تاتار کے بعد ایران کے تمام شعراء جنھیں اقبال تنزل قرار دیتا ہے، اور جن کا کلام یورپ کے ان باطن پرست حلقوں میں بھی سرایت کر گیا ہے، جو اپنے آپ کو "صوفی" قرار دیتے ہیں اقبال کا یہ کوئی کم کارنامہ نہیں ہے کہ اس نے حقیقی و خالص تصوف اور اپنے پیر و مرشد رومی کے پیچیدہ مذہبی فلسفہ کا فرق بڑی وضاحت سے محسوس کیا۔ نامور مستشرق نکلسن، جس نے رومی کا سب سے گہرا مطالعہ کیا ہے اور مثنوی معنوی کا ترجمہ کر کے اس پر تبصرہ بھی کیا ہے، ۱۹۲۳ء میں یوں اظہارِ خیال کیا تھا۔

"میں خوب جانتا ہوں کہ جہاں تک رومی کا تعلق ہے، یہ رائے کہ وہ ہمہ اوستی تھیں، ان لوگوں کو بہت تعجب انگیز معلوم ہوگا جنھوں نے دیوانِ شمس تبریز کے بعض ایسے اشعار پڑھے ہیں، جن میں فنا فی اللہ کا ذکر کچھ اس طرح کیا گیا ہے کہ وہ بادی النظر میں ہمہ اوستی معلوم ہوں اور جنھیں میں نے اس وقت ہمہ اوست ہی کا آئینہ دار سمجھا جب مجھے تصوف سے اتنی واقفیت نہ تھی جتنی اب ہے۔ رومی ایک مسلمان تھا اور اس کا خدا وہی خدا ہے جو قرآن کے الفاظ میں "کل یوم ھو فی شان" کے مصداق ہر روز تازہ بہ تازہ نو تخلیق میں مصروف ہے اور جو شخص اس کے راستے پر گامزن ہو اس کے لئے بے کار جد وجہد بھی بے عملی کی نیند سے بدرجہا بہتر ہے۔

اگرچہ یہ درست ہے کہ جو شخص قرآن اور رومی کو درست طور پر سمجھتا ہو وہ اقبال کے فلسفہ کو بخوبی سمجھ لیتا ہے، پھر بھی موخر الذکر اپنے افکار کی ترجمانی جدید پیرایوں میں اور جدید مابعدیات کے تحت کرتا ہے، اس لئے بعض لوگوں نے یہ شبہ ظاہر کیا ہے کہ اقبال کا اسلام واقعی حقیقی اور اصلی اسلام ہے یا نہیں۔ ساتھ ہی اقبال نہیں چاہتا اور صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ وہ بالکل ماضی ہی کی طرف لوٹ جانا پسند نہیں کرتا، بلکہ جدید داعیات اور اسپرٹ کی بنا پر اسلام کے افکار دینیہ کی تشکیل کا خواہاں ہے۔ گو اسلام، جیسا کہ شروع ہی میں بیان کیا جا چکا ہے فی نفسہ سیدھے سادھے عقائد اور شعائر پر مشتمل ہے، پھر بھی یہ روایات کے بار گراں کے نیچے دب کر رہ گیا ہے اور اس کے خد و خال مسخ ہو گئے ہیں۔ اقبال، جو تشکیل جدید میں فرسودہ اور غیر قرآنی عنصر کو مسترد کر دیتا ہے، اس ایک چیز یعنی قرآن کی روح کو برقرار رکھتا ہے جس کو حیات بروئے کار لانا اس کا اولی مسلک ہے۔ اس کی جد و جہد تمام تر اس رجحان کے خلاف ہے جو مذہب کو ایک زندہ قوت بنانے کے بجائے "محض علم الکلام" بنا دے۔ اس لئے وہ ابن رشد اور فلاسفۂ اسلام کے اندازِ فکر کے سخت خلاف ہے۔ وہ اشعری مدرسۂ فکر کے حسب اور ایک خاص اعتبار سے جدید نظریات و عقائد کی تعبیر نو کی طرف مائل ہے۔ ہمارا اشارہ اس پہلو کی طرف ہے جس نے ہمیشہ یونانی تمدن کی مخالفت کی اور قرآن کے شخصی تصورِ الٰہ کے ساتھ شدت سے وابستہ رہا، بخلاف مسیحی نظامِ شرع کے جس نے ارسطو کی تقلید کو اپنا شعار بنایا۔

اقبال کا فلسفہ بالکل قطعی اور ہر اعتبار سے مکمل نہیں ہے۔ اول تو یہ متفرق اشعار کی شکل میں بکھرا پڑا ہے، دوسرے یہ اپنے خالق کے ذہن میں آہستہ آہستہ نشو و نما پا رہا ہے اور منطقی نقطۂ نگاہ سے ہمیشہ پوری طرح مربوط نہیں، پھر بھی جو دائروں اور نقطوں کے گرد یہ گھومتا ہے، وہ بہت صاف اور واضح ہیں یعنی عقل، فکر سے بہتر ہے، عمل کے لئے تقویت کا باعث ہے اور انسان کو توانائی منتقل کرتا ہے۔

اقبال میں رومانویت کا جنون تو ہے، لیکن اس کے فنی مشرب اور اسلامی مذہبیت نے جس کے ساتھ وہ شدت کے ساتھ وابستہ ہے، اس میں امن و سکون کی وسیع و عریض پہنائیوں کا ضبط پیدا کر دیا ہے جو خوش قسمتی سے یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ ایک آشفتہ و سراسیمہ دنیا میں ہیجان انگیز سیاسی نعرے بلند کرے اور یہ پرتمکین انقلاب پسندی اور کلاسکی توازن جو بلند افکار و خیالات پر شدید سے شدید حملوں کی صورت میں بھی اپنا ضبط و سکون نہیں کھوتا، واقعی ایک بڑی مایۂ ناز اور نادر خصوصیت ہے۔ اقبال کی لمبی اور چھوٹی بحروں کا آہنگ اور قافیوں کی مترنم تنظیم و ترتیب اس کے الفاظ کو ایک ایسا متوازن بہاؤ عطا کر دیتی ہے، جو اس کو براہ راست منزلِ مقصود کی طرف لے جاتی ہے، بعینہ اس طرح جس طرح اس کے ہدایت آمیز فلسفیانہ افکار کی ہنگامہ آفرینی کو نماز پنجگانہ اور اسلام کے ارکان قابو میں رکھتے ہیں۔ اور مدارج ایک اور صرف ایک ہے۔ منزلِ ما کبریاست۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

خودی سے بے خودی تک

علامہ اقبال کے نظریۂ خودی کی مقبولیت کے دو بڑے غیر معمولی نتیجے نکلے ہیں۔ ایک یہ کہ عام طور سے ترکِ خود کے روحانی تصورات جو عرفا و اولیاء سے منسوب ہیں، خاصے الجھ کر رہ گئے ہیں۔ دوسرا یہ کہ خودی کے غلبۂ قبول نے خود اقبال کے تصورِ بے خودی کو جو خودی سے محکم طور سے وابستہ ہے، نظروں سے اوجھل سا کر دیا ہے، حالانکہ اقبال نے "رموزِ بے خودی" کا سرنامہ ہی رومی کے مندرجہ ذیل شعر کو بنایا ہے، جس میں خودی اور بے خودی کو لازم و ملزوم ٹھہرایا ہے ؎

جہد کن در بے خودی خود را بیاب
زود تر واللہ اعلم بالصواب

ان حالات میں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اقبال کی خودی و بے خودی کی حدود کیا ہیں اور ان کی بے خودی اور صوفیوں کی بے خودی کے مقاماتِ اشتراک اور مقاماتِ اختلاف کیا ہیں؟ اور بالآخر یہ کہ ان دونوں نظریات و تصورات کی غایت کیا ہے۔؟ یہ تو بالکل واضح ہے کہ اقبال کے باقی نظریات کی طرح ان کے تصورِ بے خودی میں بھی صوفیانہ فکر کے عناصر ملتے ہیں اور جا بجا طریق کار اور رجحانات کا رنگ بھی صوفیانہ ہی ہے، مثلاً خودی کے تصور میں عشق اور وجدان کا پہلو اور مافوق الانسان کا خدا کی ذات پر چھا جانے کا خیال۔ یہ صوفیوں اور عارفوں کے "عینِ عالم" نظریے کا عکس ہی معلوم ہوتا ہے، تاہم یہ بھی مسلّم ہے کہ اقبال نے ان سب تصوّرات کو اتنا منفرد بنا دیا کہ نتیجے کے لحاظ سے صوفی اور اقبال دو بالکل مختلف سمتوں میں معلوم ہوتے ہیں۔ اب آیئے، اس اختلاف کی حقیقت پر غور کر لیا جائے۔

یہ سمجھ لینا غلط ہوگا کہ صوفیوں کا کوئی نظریۂ خودی سرے ہی نہیں اور یہ کہ وہ تو صرف ترکِ خود اور نفیِ خود کے قائل ہیں۔ یہ خیال کسی طرح صحیح نہیں۔ صوفی "خود" کی ایک خاص شکل میں گہرا اعتقاد رکھتے ہیں، مگر ان کا یہ عقیدہ ان کے ایک اور ہمہ گیر عقیدۂ آفرینش سے وابستہ ہے، جس کی حیثیت محض اعتقاداتی یا زیادہ سے زیادہ مابعد الطبیعاتی ہے۔ صوفیوں کا نظریۂ آفرینش یہ ہے کہ

خدائے تعالےٰ کی طرف سے یہ الفاظ کہے گئے ہیں کہ میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا پھر میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں، پس میں نے کائنات کو پیدا کیا۔ اس سے یہ لازم آیا کہ کائنات کے وجود میں آنے سے پہلے صرف خدا کی ذات ہی محیطِ خود اور محیطِ کل تھی اور کوئی دوسری شے جو تشخص اور تعین کی گرفت میں آئی ہو، تھی ہی نہیں۔ پھر خدائے تعالےٰ نے اپنی مشیت سے کائنات کو پیدا کیا تو ظاہر ہے کہ یہ کائنات "غیرِ خدا" سے (کیوں کہ خدا کی ذات تو محیطِ کل تھی) الگ کوئی شے نہیں ہو سکتی، پس خدا تعالےٰ نے اپنے ہی ایک جزو کو اعتباری و اضافی شکل دے کر کائنات کو تخلیق کرتے ہوتے اس کی حیات کو بعض قوانین و قواعد سے وابستہ کر دیا، تو اس استدلال کی بنا پر صوفی یہ گہرا عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ خدا کی ذات سے علیحدہ کیا ہوا جزو بھی اصلاً اسی کل کا حصہ ہے، جس سے اس کو جدا کر دیا گیا تھا اور ہر چند کہ اب وہ ایک دوسری حیثیت میں متشکل ہو گیا ہے، مگر ہے تو وہی۔ میر تقی میر نے اسی خیال کو شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے ؎

وجہ بیگانگی نہیں معلوم
ہم وہاں کے ہیں تم جہاں کے ہو

اس بنیادی تخیل سے صوفیوں نے کئی بنیادی عقیدے قائم کئے۔ اوّل یہ کہ وجود صرف ایک ہے اور کائنات بھی اس کا جزو لاینفک ہے ؎

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اسکے ہیں ہمارا پوچھنا کیا (غالب)

دوّم یہ کہ کائنات ایک آئینہ ہے مگر اس آئینے کا اصل جوہر انسان ہے۔ گویا "کل" کی پوری تابندگی انسان ہی میں تجلی ریز ہے۔ تیسرا یہ کہ کل سے جدا کر دینے کے بعد یہ "جزو" یعنی کائنات کربِ جدائی میں ہے اور ہر لحظہ اپنی اصل سے ملنے کے لئے مضطرب ہے۔ یہ دردِ جدائی کائنات کے ذرّے ذرّے میں موجود ہے، جس کے سینے میں ہر وقت طلب و شوق کا شدید جذبہ موجزن رہتا ہے، جو اسے سرگرداں رکھتا ہے اور اس سے وہ سعیِ پیہم کراتا ہے جس کے نتیجے کے طور پر ہر شے "دوا دو" اور تگا پو میں ہے اور ہر لحظہ پُر اسرار قوانین کے ذریعے اپنی گم گشتہ منزل کی طرف سرگرمِ خرام اور تیز گام ہے۔ چوتھا یہ کہ انسان کی ہستی خدا کے "مزاج" پر بنائی گئی ہے اور خدا کا عارضی روپ اگر کسی شے میں منعکس ہے تو وہ انسان کا دل یا اس کا وجود ہے اور انسان ہی وہ آنکھ ہے جس کے ذریعے خدائے کائنات اپنی ہی ذات کی صفاتِ رنگا رنگ کا "تماشا" کرتا ہے۔

تخلیقِ کائنات کا یہ تصور بعض پہلوؤں سے انوکھا اور دلچسپ معلوم ہوتا ہے مگر آخر ابتدائے آفرینش کو تصور میں لانے کے لئے کسی نظامِ استدلال کی ضرورت پڑتی لازمی ہے افلاطون کائنات کو مثالی دنیا کا عکس کہے گا، سپنوزا اس کو مشیت کے تنوعات سے تعبیر کرے گا، ہیگل اس کو روحِ کلی کا انعکاس بتلائے گا۔ یہ سب نتیجے اس غور و فکر کے ہیں جو انسان آغازِ عالم کے متعلق آج تک کرتا رہا ہے۔ ان میں سے کسی کو سائنسی تجربات کی تصدیق و توثیق کا رتبہ حاصل نہیں۔ صوفیوں کے نظریۂ آفرینش کو بھی اسی طرح غیر عقلی سمجھ لیں

جائے تو کوئی خاص عیب کی بات نہیں، مگر ایک لحاظ سے صوفیوں کا تصور ہمارے ذہنوں کی حیرت و سرگشتگی کے لئے کچھ تشفی بخش ثابت ہو ہی جاتا ہے۔

تصوف کے نزدیک بھی ہر شئے کی "خودی" ہے یعنی وہی احساسِ جدائی جو اسے ہر وقت بے کل و مضطرب رکھتا ہے ؎

هر کسے کو دور ماند از اصل خویش
باز جوید روزگار وصل خویش

اور اسی اضطراب باطن کی وجہ سے (جو اسے اپنی اصل سے ملنے کے لئے ہے یعنی اس ذات سے ملنے کے لئے جو غایۃ الغایات کمال ہے) کائنات کی ہر شئے رواں اور دواں رہتی ہے۔ اب جب باور کر لیا گیا کہ احساسِ جدائی خودی ہی کا دوسرا نام ہے تو اس سے یہ لازم آیا کہ یہ "ہجراں زدہ" جدائی کی اس کسک کو مٹائے تاکہ وہ اپنی اصل سے مل سکے اور چونکہ خود وجود ہی وجہ جدائی ہے، اس لئے احساس جدائی کو مٹانے کے لئے احساس وجود ہی کو مٹایا جائے یہیں سے ترکِ خود، نفی خود یا صوفیانہ بے خودی کی حد شروع ہو جاتی ہے اور خودی و بے خودی کے تصور کا ایک ایسا پیچیدہ اور بڑی حد تک ناقابلِ فہم سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس کے بعض پہلو تو صد درجہ ناقابل فہم اور بعض اس درجہ ماورائے قیاس ہو گئے ہیں کہ اس کے رموز و اسرار کو شاید خود صوفی بھی نہ سمجھتے ہوں گے۔

ان سب باتوں سے یہ ثابت ہوا کہ صوفی بھی خود میں اعتقاد رکھتے ہیں، لیکن ان کی خودی کا تصور روحانی ہے۔ اُن کی انا مادی شوائب سے پاک ہے۔ ان کی روحانی اَنا اس درجہ محکم ہے کہ وہ مادی خود کو وجود مطلق کا جزو قرار دیتے ہیں۔ اور بڑے اثباتی انداز میں اس انانیت کا اظہار کرتے ہیں۔

کا مقولہ یا حدیث بھی اس اثباتِ خود یا خود شناسی کی تائید میں ہے۔ محمود شبستری نے "گلشنِ راز" میں ایک سوال کے جواب میں صوفیانہ اصطلاحوں میں مادی خودی کی نفی اور اس روحانی خود کا اثبات کیا ہے۔

اقبال کے تصور خود اور صوفیوں کے تصور میں یہ فرق ہے کہ اقبال خودی کے مادی لوازم و مقتضیات کو نظر انداز نہیں کرتے اور اس مادی خود کو بھی برحق، اگرچہ تغیر پذیر اور ترقی پذیر مانتے ہیں۔

اقبال کی خودی کیا شئے ہے؟ اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ سب کچھ ہے۔ انھوں نے مختلف موقعوں پر اس کے الگ الگ (گو ایک دوسرے کے قریب قریب) معنی بیان کئے ہیں۔ مثلاً خودی خود حیات کا دوسرا نام ہے۔ خودی عشق کے مرادف ہے، خودی ذوقِ تسخیر کا نام ہے (بالِ جبریل ص۱۴۲) خودی سے مراد خود آگاہی ہے (بالِ جبریل ص۸۲) خودی عبارت ہے ذوقِ استیلا سے (ضربِ کلیم ص۱۴۹) خودی ذوقِ طلب ہے (ضربِ کلیم ص۷) خودی ایمان کے مرادف ہے (ضربِ کلیم ص۹۷) خودی سرچشمہ جدت و ندرت ہے (ضربِ کلیم ص۱۲) خودی یقین کی گہرائی ہے، خودی سوزِ حیات کا سرچشمہ اور ذوقِ تخلیق کا ماخذ ہے۔ غرض اس قسم کے گوناگوں معانی و صفات خودی سے وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ سب اثباتِ خود کی صورتیں ہیں، جو ہر چیز کو ترقی کی اگلی منزلوں کی طرف محرک ثابت ہو رہی ہے۔

ایک زمانہ تھا جب اقبال صوفیوں کے تصورِ وحدت الوجود سے متاثر تھے اور انسانی روح کے فراق زدہ ہونے میں اعتقاد رکھتے تھے، مگر بعد میں رفتہ رفتہ ان کا یہ عقیدہ جاتا رہا اور خودی کی تنظیم میں مادیات کے مستقل وجود کی اہمیت کو تسلیم کرنے لگ گئے، تاہم ان کے اشعار میں صوفیوں کے "احساس جدائی" کا تصور پھر بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے "گلشن رازِ جدید" کے بعض اشعار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی اس جدائی کو اصل حیات سمجھتے ہیں:

جدائی خاک را بخشد نگاہے
وہد سرمایۂ کوہے بہ کاہے
جدائی عشق را آئینہ دار است
جدائی عاشقاں را سازگار است
اگر ما زندہ ایم از دردمندی است
وگر پایندہ ایم از دردمندی است

(گلشن رازِ جدید ص۲۲۰)

چہ سودا در سرِ ایں مشتِ خاک است
ازیں سودا درونش تابناک است
چہ خوش شود کہ نالد از فراقش!
ولیکن ہم بہ بالد از فراقش
فراق او را چناں صاحب نظر کرد
کہ شامِ خویش را بر خود سحر کرد
خودی را تنگ در آغوش کردن
فنا را با بقا ہم دوش کردن

(گلشن رازِ جدید ص۲۲۰)

اقبال کا تصورِ آفرینش کیا ہے۔؟ میں اس کے متعلق کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا، مگر اقبال زمان کے تسلسل کے ضرور قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ خودی جو حیات ہی کا دوسرا نام ہے، لحظہ بہ لحظہ تخلیق میں مصروف رہتی ہے اور تسلسل زمانی کو قائم رکھتی ہے، اگرچہ بعض جگہ احساس ہوتا ہے کہ وہ زمان کی نہایت کو مانتے ہیں۔ بہرحال خودی کا کام یہ ہے کہ زندگی کو جاری رکھے ؎

خودی را زندگی ایجادِ غیر است
فراقِ عارف و معروف خیر است
قدیم و محدث ما از شمار است
شمار ما طلسم روزگار است

(گلشن رازِ جدید ص۲۱۹)

اقبال نے ڈاکٹر نکلسن کو جو خط لکھا تھا اس میں لکھا تھا کہ دنیا ایسی چیز نہیں جس کی تکمیل ختم ہو گئی ہے، بلکہ یہ ابھی معرضِ تکمیل میں ہے، تخلیق کا سلسلہ جاری ہے اور انسان بھی اس تخلیق میں اپنا حصہ ادا کر رہا ہے۔ قرآن میں بھی خدا کے سوا دوسرے خالقین کے

موجود ہونے کا امکان ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر زندگی کیا ہے؟ یہ انفرادی اور اس کی اعلیٰ ترین صورت، جو اس وقت تک پیدا ہو سکی ہے، خودی ہے، جس میں فرد ایک فی نفسہٖ مکمل مخصوص مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ جسمانی اور روحانی طور پر انسان فی نفسہٖ مکمل ہے لیکن یہ مکمل فرد نہیں ہے۔ یہ خدا سے جس قدر دور ہوگا اسی قدر اس کی انفرادیت کم یا شخصیت بھی کم ہوگی۔ جو سب سے زیادہ خدا کے نزدیک آئے گا، مکمل ترین انسان ہوگا۔"

اس سے یہ ظاہر ہوا کہ اقبال کے نزدیک زندگی کی غایت انسان کا خدا کے قریب ہونا ہے تا آنکہ حیات یا خودی خدا کو اپنے اندر جذب کر لے گی۔

خودی کے متعلق اقبال کا نظامِ فکر بھی صوفیوں کے نظامِ فکر کی طرح اپنی آخری منزل میں خاصا ناقابلِ فہم، پیچیدہ اور پُراسرار ہو جاتا ہے، مگر یہ بحث کچھ دیر کے بعد آئے گی۔

یہاں پہنچ کر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان مسائل میں اقبال اور صوفیوں کے درمیان اختلاف کی صورت کہاں کہاں پیدا ہوتی ہے؟ جواب یہ ہے کہ اختلاف کی صورتیں مسئلہ بے خودی میں پیدا ہوتی ہیں، کیوں کہ جہاں تک خود یا خودی کا تعلق ہے صوفی بھی اس میں کچھ نہ کچھ اعتقاد رکھتے ہیں۔ کیوں کہ اگر خود کو تسلیم نہ کرتے ہوں تو خود کو مٹانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ صوفی وجود اور خود کو تسلیم کر لینے کے بعد فنائے خود میں اپنی نجات سمجھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ عارضی خود اس کو اس کی اصل سے جُدا کر رہا ہے، اس لئے اس کی پوری کوشش یہ ہے کہ اس خود کو بے خودی میں بدل دے، تاکہ اپنی اصل سے مل جائے یعنی پھر اس کمال تک پہنچ جاتے، جو اس کا ورثہ بھی ہے اور حق بھی۔ اسی چیز کو صوفیوں نے ترکِ خود یا نفیِ خود کے نام سے یاد کیا ہے، اقبال اس کے برعکس (چونکہ آفرینش کا کوئی نظریہ ان کے لئے مانع نہیں اس لئے) اس عارضی خود کی ناگزیر اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس لئے اس سے پیچھا چھڑانے کی بجائے بے خودی کی منزل تک پہنچنے کے لئے خود کو ذریعہ استعمال اور وسیلۂ ترقی بناتے ہیں۔ جہاں محمود شبستری کا ارشاد یہ ہے ؎

خراباتی شدن از خود رہائی است
خودی کفر است گر خود پارسائی است

وہاں اقبال یہ کہتے ہیں ؎

خودی تعویذِ حفظِ کائنات است
نخستیں پرتوِ ذاتش حیات است

غرض اس نقطۂ نظر میں اقبال اور صوفیوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا مشرق و مغرب میں ہے۔ اقبال بے خودی کے لئے خودی کو وسیلہ بناتے ہیں، صوفی خود کا اثبات اس میں دیکھتا ہے کہ خود کے احساس ہی کو مٹا ڈالا جاتے۔ ایک کی نظر اس پر ہے کہ ازل میں ہم میں خدا میں کوئی بُعد نہ تھا، بلکہ ہم شے واحد تھے۔ دوسرے کی نگاہ اس پر ہے کہ ازل کی بحث سے کیا فائدہ؟ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب خدا ہم میں جذب ہو کر رہ جائے گا اور اب بھی اس کی جستجو میں نہیں ہیں وہ ہماری جستجو میں ہے ؎

ما از خدائے گم شدہ ایم او بہ جستجو است
چوں ما نیاز مند و گرفتارِ آرزو است
در خاکدانِ ما گہرِ زندگی گم است
آں گوہرے کہ گم شدہ ماییم یا کہ اوست

صوفی غایت الغایاتِ کمال تک پہنچنے کے لئے جس بے خودی پر زور دیتے ہیں اس کی ساری کی ساری اہمیت روحانی اور ذہنی ہے۔ اقبال خودی کی جس تربیت سے بے خودی (کمالِ انسانیت) تک پہنچانا چاہتے ہیں، اس کا پہلا قدم مادے کی تسخیر ہے او[ر] اس کی شکست و ریخت کے بعد "نوریوں" کے درجے تک پہنچنا اور پھر اس سے بھی وراء الوراء کی منزلیں طے کرنا (جن کا سطورِ بالا میں ذکر ہوا) اس کے علاوہ اقبال کا تمام دائرۂ نظر اجتماعی ہے۔ صوفی فرد کی روحانی تربیت پر خاص زور دیتے ہیں۔ اقبال کے یہاں فرد کی تربیت اجتماع سے الگ کوئی شے نہیں۔

صوفیوں کے متعلق اس گفتگو سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ صوفیوں کا کمالِ روحانی تک پہنچنے کا لائحۂ عمل کوئی آسان چیز ہے۔ صوفیوں کے اس دستور العمل تربیت میں فرد کی حد تک پیکارِ حیات کے سب مظاہر اور ریاضت اور سعی کی سب شکلیں پائی جاتی ہیں۔ قلابذی نے اپنی کتاب التعرف المذہب اہل التصوف میں تربیت کے سب مدارج کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے، مگر مجاہدہ و ریاضت کے یہ سلسلے صرف اسلامی تصوف تک محدود نہیں۔ دنیا کے ہر نظامِ تصوف میں اس قسم کی ریاضت کے نصاب تجویز ہوتے ہیں۔ پروفیسر لیوبا نے تصوف پر جو کتاب لکھی ہے اس میں انھوں نے "سفرِ سعودی" کے کئی مدارج شمار کیے ہیں۔ ابتدا میں خدمتِ خلق اور اطاعتِ شیخ پر بڑا زور دیا جاتا ہے بعد میں شیخ رذائلِ نفسانی کی تطہیر کی کوشش کرتا ہے، پھر محبتِ کل اور مراقبے کے طریقے بتاتا ہے۔ اس کے بعد ذکر و فکر، اس کے بعد تعطلِ احساس کی منزل آتی ہے۔ اس حالت میں جذب و حال۔ مگر پھر اس میں حالِ حیرت، قبض اور بعض اوقات رجعت کی تکلیف پیش آجاتی ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے تا آں کہ عارف برای العین خدا کا دیدار کر لیتا ہے جو دراصل تمہید ہوتی ہے اس وصالِ روحانی کی جس کے لئے تصوف کا کل نظام قائم شدہ سمجھا جاتا ہے۔

یہ مجاہدہ و ریاضت کا ملاً انفرادی حیثیت کی چیز ہے۔ تصوف کے سارے نظا[م] میں محض افراد کے روحانی کمال پر زور دیا گیا ہے۔ عام لوگوں کے لئے شریعت کی پا[بندی] اور عقل کی پیروی ضروری سمجھی گئی ہے۔ گویا تصوف محض خاص افراد کی روحانی تربیت کا نظام ہے اور افراد کی وساطت سے اجتماع کی تربیت کا قائل معلوم ہوتا ہے۔ اقبا[ل] نے بھی تکمیلِ خودی اور کمالِ حیات کے لئے ایک نظامِ تربیت تجویز کیا ہے جس کی تفصیل "رموزِ بے خودی" میں دی ہے۔ اس کا پہلا سبق یہ بتایا ہے کہ فرد ملت سے وابستہ ہے، اس سے الگ ہیچ ہے ؎

فرد و قوم آئینہ یک دیگر اند
سلک و گوہر کہکشاں و اختر اند

فردمی گیرد ز ملت احترام!
ملت از افراد می یابد نظام!
فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

فرد کی خودی جب ملت کی بے خودی میں گم ہو جاتی ہے تو بڑی برکتوں کا باعث ہوتی ہے ؎

درجماعت خود شکن گردد خودی
تا ز گلبرگے چمن گردد خودی

اس کے بعد اقبال نے بھی فرد و ملت، دونوں کے لئے تطہیر و تکمیل کا ایک نصاب تجویز کیا ہے۔ مثلاً یاس و حزن و خوف کا ازالہ، سوال کی ممانعت، مساوات و اخوت بنی نوع آدم کا عقیدہ، آئین کی اطاعت، آرزو کی تربیت، ۔ اور سب سے آخر میں عشق اور ضبط نفس۔ تا آنکہ نیابت الٰہی تک پہنچ جاتا ہے ؎

بنتے ہیں مری کارگہ فکر میں انجم
لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

اقبال کے اس نظام فکر میں، جس کا تمام ماحول مادی ہے، عشق کا عقیدہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ یہ وہ عقیدہ ہے جس کا ایک رکن عقل کے کمال کا انکار اور جذبہ و وجدان کی برتری کا اثبات ہے۔ اس معاملے میں اقبال پھر صوفیوں اور عارفوں کی حکمت کے پیرو ہو گئے ہیں اور کمال کی منزلوں کو کسی ایسی روحانیت کی مدد سے طے کرنا چاہتے ہیں جس تک عقل انسانی کی رسائی نہیں۔

یہ ہے صوفیوں کی بے خودی اور اقبال کی خودی، جس کے کئی پہلو باہم مماثلت رکھتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک خودی کی اس تمام پیکار کا حاصل احاطۂ کائنات ہے صوفیوں کے نزدیک نفی خودی کی غایت خدا کی ذات سے مل جانا اور سرور سرمدی پالینا ہے۔ جس طرح صوفیوں کے استدلال میں بہت سی کمزوریاں نظر آتی ہیں، اسی طرح اقبال کے استدلال میں بھی بہت سے خلا نظر آتے ہیں۔ مثلاً یہی کہ خودی کی اس پیکار کا نقطۂ آغاز کیا ہے اور احاطۂ کائنات کر لینے کے بعد خودی کو سکون مل جائے گا یا پھر خودی کسی نئی طلب میں سرگرداں ہو جائے گی۔ یہی اشکال ہند فلسفیوں کو پیش آیا تھا۔ اسی کے سبب سے انھیں "مایا چکر" کے عقیدے کی طرف آنا پڑا، جس میں دائمی دور و تسلسل کو تسلیم کر لینا پڑا۔

حق یہ ہے کہ پیکار حیات کے مادی متعلقات کی حد تک اقبال کا نظام بڑا جاذب توجہ ثابت ہوتا ہے۔ مگر تسخیر کائنات کی منزل کے بعد اقبال بھی اس تیرہ اسرار ماورائیت کا سہارا ڈھونڈتے ہیں، جو حیرت سے پیدا ہوتی ہے۔ ارتقائے حیات کو تسلیم کر لینے کے بعد اگر زندگی کا انجام سکون (یعنی کسی ذات میں فنا یا کسی ذات کا سہارا یعنی اس میں جذب ہو جانا) ہے تو اس کے لئے نہایت زمانی کو تسلیم کرنا پڑے گا، جس کی تائید اقبال کے فلسفے سے نہیں ہوتی۔ صوفیوں کا نظام شروع سے ہی منطق کی گرفت سے باہر مگر ازل (بدایت) اور ابد (نہایت) کا ایک قابل فہم سا خیال انھوں نے ضرور پیش کیا ہے۔ زندگی کا معمایوں تو لاینحل ہی ہے، مگر اس کا کچھ تا پتا تصوف ہی کے راستے سے سوجھتا ہے، ورنہ اندھیرا ہی اندھیرا ہے، خواہ ہمارے ہاتھ میں عشق کی شمع ہو یا عقل کا چراغ۔

قصہ مختصر۔ اقبال نے خودی و بے خودی کے مسئلے میں صوفیوں کے نظام فکر سے استفادہ تو کیا ہے، مگر ان کا کارنامہ خاص یہ ہے کہ انھوں نے اس کو بھی اپنے خاص نظریہ اجتماعیت کے لئے استعمال کیا ہے اور صوفیوں کی فرد پسندی سے ذہن کو ہٹا کر اجتماعی عمل اور اجتماعی مصالح انسانیت کا راستہ دکھایا ہے۔ اور سائل پر نظر مرکوز کرنے کی بجائے ابدکی تسخیر کو منزل مقصود قرار دیا ہے، اور اس تسخیر کے لئے جو دستور العمل تجویز کیا ہے اس میں فرد و اجتماع دونوں کو لازم و ملزوم ٹھہرایا ہے۔ تصوف کا تمام نظام روحانی و فکری لحاظ سے کچھ معنی رکھتا بھی ہو، تب بھی عملی لحاظ سے اور اجتماع کے مقاصد کے لحاظ سے اس کا غیر مکمل اور ناقابل عمل ہونا ظاہر ہے۔ اقبال نے صوفیوں ہی کے فکر کے بعض پہلوؤں کا انتخاب کیا اور اس کو اپنے افکار سے ملا کر زندگی کی اجتماعی غایتوں کے لئے ایک ایسا دستور العمل تیار کیا جس کے عملی فوائد سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر محمد باقر

اقبال اور معاشرہ

انسانی معاشرے کے اتنے مختلف رخ اور اضلاع ہیں کہ جب تک کوئی آدمی ریفارمر کا منصب اختیار کر کے اس کو اپنا مقصود اور ہدف نہیں بنا لیتا، اس وقت تک اس کے لئے ان تمام اضلاع کا احاطہ کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ حکیم مشرق حضرت علامہ اقبالؒ نے اپنے لئے صرف "مفکر" کا منصب منتخب کیا اور اس انتخاب میں انھیں اس قدر کامیابی ہوئی کہ آج بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس صدی میں اسلامی دنیا کے مفکر اعظم تھے ظاہر ہے کہ ایک کامیاب اسلامی مفکر کی نظر صرف مسلمانوں کے معاشرے تک محدود نہ رہ سکتی تھی۔ ان کے سامنے ہندی مسلمان کے جلد حل طلب مسائل کے علاوہ اسلامیان عالم کے مسائل بھی موجود تھے اور انھوں نے اپنی بساط اور استعدادِ حیات کے مطابق ان مسائل پر غور کرنے اور ان کا حل تلاش اور تجویز کرنے کی مساعی کیں۔ یہ مساعی کس حد تک کامیاب ہوئیں، اس کا فیصلہ مستقبل کرے گا اور ان کے تجویز کردہ حل کس حد تک قابل قبول تھے یا ہیں، اس کا فیصلہ ملتِ اسلامیہ کے ہاتھ میں ہے۔

اقبالؒ نے جن مسائل پر غور کیا، ان میں سے ایک معاشرہ یا معاشرہ کے کچھ رخ تھے انھوں نے اس مسئلہ کے متعلق اپنی تنقید اور وضاحت کے بعد حل یا اصلاح کی تجاویز بھی پیش کر دیں۔ اس تنقید، وضاحت، حل اور اصلاح کی تجاویز سے آپ کو اتفاق ہو یا نہ ہو، لیکن اس مقالے میں صرف یہ کوشش کی گئی ہے کہ معاشرہ کے متعلق اقبالؒ کے نظریات آپ کی خدمت میں یکجا کر کے پیش کر دئے جائیں۔

اسلام سے راہنمائی

سب سے پہلے یہ وضاحت کرنا لازمی معلوم ہوتا ہے کہ اقبال معاشرہ کے مسائل کو حل کرنے اور اس کی اصلاح کی تجاویز پیش کرنے میں اپنے لئے اکثر اور بیشتر راہنمائی اسلام اور احکام اسلام میں تلاش کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے کچھ نئی اخلاقی اقدار اور سیاسی نظریات بھی وضع کئے، لیکن عمومی حیثیت سے ان کے الہامات کا منبع اور سرچشمہ اسلام ہے اور ان بزرگانِ دین اور مفکرین کے کردار اور ملفوظات ہیں جنھوں نے ان سے پہلے عالمِ اسلام میں اپنے لئے ممتاز مقام پیدا کیا۔ معاشرہ کا تار و پود وہ افراد ہیں جو ملت کی تعمیر کرتے ہیں اور ملت کی تہذیب و تربیت کے لئے انھوں نے صرف "رموزِ بیخودی" میں جو عنوان قائم کئے ہیں، ان میں سے چند ایک کے حصے ملاحظہ فرمائیے۔

"ملتِ محمدیہ موسس بر توحید و رسالت است" (ص ۴۵)

"آئین ملتِ محمدیہ قرآن است" (ص ۵۸)

پختگی سیرت ملت از اتباع آئین الہیہ است (ص ۶۵)

حسن سیرت ملت از تادب بآداب محمدیہ است (ص ۷۱)

وغیرہ وغیرہ۔ گویا عقیدے کے لحاظ سے اقبال کے ہاں معاشرہ کا بنیادی تصور اسلامی اسی لئے مشہور مستشرق نکلسن نے "اسرار خودی" کے ترجمہ کا دیباچہ لکھتے ہوئے کہ

"یہ فرض کرتے ہوئے کہ فرد کی مکمل نشو و نما کے لئے جماعت کی موجودگی لازم ہے، اقبال مثالی جماعت اس سوسائٹی میں پاتے ہیں، جس کو وہ حضرت محمد کے تصور اسلام میں مضمر پاتے ہیں۔"

اقبال کے یہاں اسی عقیدے پر جا بجا اصرار ملے گا مثلاً

برگ و سازِ ما کتاب و حکمت است
ایں دو قوت اعتبار ملت است (مسافر، ص ۴۴)

دارم اندر سینہ نور لا الٰہ
در شرابِ من سرور لا الٰہ (مسافر، ص ۴۴)

مرد مومن را عزیز اے نکتہ رس
چیست جز قرآن و شمشیر و فرس

(جاوید نامہ، ص ۲۴۰)

قبائلیت کی مذمت

معاشرے کی عام ہیئت میں "قبائلیت"، "گروہ بندی"، "افتخار نسب" اور "جغرافیائی حد بندی"، پر اقبال نے سب سے پہلے اور سب سے کڑی تنقید کی اس سلسلے میں ان کا روئے سخن بیشتر ہندی مسلمان سے رہا ہے، جو شاید جغرافیائی حد بندی کا اتنا قائل نہ تھا، لیکن قبائلیت، گروہ بندی اور افتخار نسب کا عملی العموم قائل تھا۔ اقبال نے معاشرہ کی اس ہیئتِ ترکیبی کی مذمت کی ہے۔

بر نسب نازاں شدن نادانی است
حکم او اندر تن و تن فانی است

جوہر ما با مقامی بستہ نیست
بادہ تندش بجامی بستہ نیست

ہندی و چینی سفالِ جامِ ماست
رومی و شامی گلِ اندامِ ماست
قلبِ ما از ہند و روم و شام نیست
مرز و بومِ او بجز اسلام نیست

خویشتن را ترک و افغاں خواندہ ای
وای بر تو آنچہ بودی ماندہ ای

قوم تو از رنگ و خوں بالاتر است
قیمتِ یک اسودش صد احمر است
نیست از روم و عرب پیوندِ ما
نیست پابندِ نسب پیوندِ ما

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

ہنوز از بندِ آب و گل نہ رستی
تو گوئی رومی و افغانیم من
من اوّل آدمِ بی رنگ و بویم
از اں پس ہندی و تورانیم من

اور پھر انگریزی میں فرمایا۔

"میری فارسی منظومات کا مقصد اسلام کی وکالت نہیں۔ درحقیقت میں ایک بہتر معاشری نظام کا متلاشی ہوں اور اس تلاش میں ایک ایسے نظام کو نظر انداز کرنا ناممکن ہے جو پہلے ہی سے موجود ہے اور جس کا مقصد نسل، ذات اور رنگ کے امتیازات کو ملیامیٹ کرنا ہے۔"

اس بیان سے جہاں ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ علامہ مرحوم کے دل میں اسلامی نظامِ حیات کے لئے بے حد احترام تھا، وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس مفکرِ اعظم کی فارسی شاعری کا مطمحِ نظر فقط یہ تھا کہ اس معاشرے کی ترویج کی جائے جس کی نسل، ذات اور رنگ کی تمیز نہ رہے۔

امومت

اقبال نے امت کو معاشرے کا سنگِ بنیاد ٹھہرایا ہے، اس لئے ہم بھی سب سے پہلے معاشرے کے اس اہم ستون کی وہ حدود آپ کے سامنے پیش کریں گے، جو علامہ مرحوم

نے مقرر کی ہیں۔ اقبال نے مغرب و مشرق کی سیاحت فرمائی تھی اور عورت کا بغور مطالعہ کیا، اس لئے اُن کے ذہن میں معاشرے کے اس اہم رکن کے واضح نقوش موجود نہ تھے اور اصولی طور پر وہ اس کے مدّاح تھے۔

نغمہ خیزد از زخمۂ زن سازِ مرد
از نیازِ او دو بالا نازِ مرد
پوششِ عریانیِ مرداں زن است
حسنِ دلجو عشق را پیراہن است
عشقِ حق پروردۂ آغوشِ او
این نوا از زخمۂ خاموشِ او

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

مسلمان نے معاشرے میں عورت کو جو رتبہ دیا تھا انھیں اس پر بھی اعتراض تھا

مسلمے کورا پرستارے شمرد
بہرۂ از حکمتِ قرآں نبرد

(رموز، ص ۱۰۴)

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود
میں بھی مظلومیِ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

کیوں کہ ان کا خیال تھا۔

از امومت گرم رفتارِ حیات
از امومت کشفِ اسرارِ حیات
از امومت پیچ و تابِ جوئے ما
موج و گرداب و حبابِ جوئے ما

لیکن "نازپیکر" اور "محشربدوش" عورت کی تعریف انھوں نے نہیں کی۔

واں تہی آغوشِ نازک پیکرے
خانہ پروردِ نگاہش محشرے
فکرِ او از تابِ مغرب روشن است
ظاہرش زن باطنِ او نازن است
بندہائے ملتِ بیضا گسیخت
تا نگاہش عشوہ ہا دل بردہ ریخت

شوخ چشم و فتنہ زا آزادیش!
از حیا نا آشنا آزادیش
علم او بار امومت بر نتافت
بر سر شامش یکی اختر نتافت
ایں گل از بستان ما نا رستہ بہ
داغش از دامان ملت شستہ بہ

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ بہت ممکن ہے کہ اقبال کی تنقید سے آپ کو اتفاق نہ ہو لیکن اگر آپ گرد و پیش پر نظر دوڑائیں تو اسلامیوں کے معاشرے میں وہ عورت کبھی کبھی اور کہیں کہیں چلتی پھرتی نظر آئے گی جس کی تصویر اقبال نے کھینچی ہے۔ اس لئے اقبال کے مشاہدہ کی آپ کو داد دینا پڑے گی۔ اسی طرح سے وہ عورت بھی نظر آئے گی جسے اقبال نے امومت کا معیار ٹھہرایا ہے ؎

آں رخ رستاق زادے جاہلے
پست بالائے، سطبرے، بد گلے
نا تراشے پرورش نا دادہ
کم نگاہے، کم زبانے، سادہ
دل ز آلام امومت کردہ خوں
گرد چشمش حلقہ ہائے نیلگوں
ملت از گیرد ز آغوشش بدست
یک مسلمان غیور و حق پرست
ہستیٔ ما محکم از آلام اوست
صبح ما عالم فروز از شام اوست

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا ـــــــــ در مکنوں

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کو عورت کی وہ بے راہ روی پسند نہ تھی، جو خالص فرنگی تہذیب یا معاشرے کے اثر کا نتیجہ تھی ؎

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امومت
ہے حضرت انساں کے لئے اس کا ثمر موت

قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

اور زہر اور قند کی تمیز رکھتے ہوئے اقبال واضح لفظوں میں عورت کی بے راہروی پر تنقید کرتے ہوئے ڈرتے بھی ہیں ؎

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں، معذور ہیں مردان خرد مند

اور فقط یہ نصیحت دے کر خاموش ہو جاتے ہیں ؎

اگر پندے ز درویشے پذیری
ہزار امت بمیرد تو نہ میری
بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

(ارمغان حجاز، ص ۱۳۳)

بہل اے دخترک ایں دلبری ہا
مسلماں را نہ زیبد کافری ہا
منہ دل بر جمال غازہ پرورد
بیاموز از نگہ غارتگری ہا

(ارمغان حجاز، ص ۱۳۴)

تعلیم و تعلّم اور تربیت

عصر حاضر کے معاشرے میں تعلیم و تعلّم اور تربیت کے سلسلوں کو بالعموم اقبال نے مورد تنقید ٹھہرایا ہے اور ہماری مسلمان کو بالخصوص متنبہ کیا ہے کہ ان کے دبستانوں میں تعلیم و تربیت کے وسائل کا فقدان روز افزوں ترقی پر ہے ؎

سرچشمۂ زندگی ہوا خشک
باقی ہے کہاں مئے شبانہ
خالی ان سے ہوا دبستاں
تھی جن کی نگاہ تازیانہ
دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار
کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

مدرسہ کی "خامکاری" اور "خوب و ناخوب" کی تمیز سے بے تعلقی کی وجہ سے معاشرے میں جو قباحتیں پیدا ہوتی ہیں، ان کا ذکر اقبال نے تفصیل سے کیا ہے! وہ علم کی ظاہری تحصیل سے وہ اس لئے مطمئن نظر نہیں آتے کہ اس عمل سے ملت کے لئے مفید انسانوں کی تعداد نہ صرف بڑھ نہیں رہی بلکہ کم ہوتی جا رہی ہے۔
اقبال کا طرز فکر یہ ہے کہ عصر حاضر کا معلم اور متعلم دونوں اپنی راہ سے ہٹ گئے ہیں۔

ردمکاتب میں علم کا صحیح مقام متعین کرنے کی راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔ اقبال نے شیخ مکتب
بہ عمارت گر روح انسان" کا خطاب دیا ہے اور اسے قومی دولت یعنی ملت کے
نہالوں کے متعلق پر امید رہنے کا مشورہ دیا ہے لیکن اس شرط پر کہ وہ بھی آتنی بصیرت
متا ہو کہ یہ دیکھ سکے کہ قوم کے بچوں کا بھی زندگی میں کوئی مقصد یا مقصود ہے یا نہیں۔

"نگاہ پاکباز" اور "دانش" کی تحصیل اقبال کے نظریہ تربیت میں ایک دوسرے
لوازم میں سے ہیں۔ اگر بیک وقت معاشرے میں ایسی تعلیم و تربیت کا انتظام
ں ہو رہا تو اقبال کے عقیدہ کے مطابق یہ ساری کوشش رائیگاں جا رہی ہے۔ یہ نظریہ
کرنے میں اقبال نے تعلیم و تربیت کے مسلمہ اصول کو بیان کیا ہے۔ اس لئے ان
اس نظریہ کو عالمگیر اور دوامی تائید حاصل ہے، لیکن یہ امر فراموش نہ کرنا چاہئے کہ
صدی میں اقبال پہلے مسلمان مفکر ہیں، جنھوں نے عصر حاضر کے اسلامی ممالک کے مکاتب
لیم و تربیت کے سرسری پن اور کھوکھلے پن کا مشاہدہ کر کے بڑی جرأت سے اس کے
ف علم بغاوت بلند کیا۔ اس سلسلے میں جب ہم یہ غور کرتے ہیں کہ اقبال خود بھی اسی
شرہ کے پروردہ تھے، جس کے مسائل تعلیم و تربیت میں وہ خامیاں موجود تھیں جن
ردہ بار بار کرتا ہے، تو اقبال کی تبلیغ اور بھی زیادہ پر لطف اور دلچسپ
ہونے لگتی ہے، لیکن ہمیں پھر اس بات کی داد دینا پڑتی ہے کہ اقبال کے مشاہدہ
مطالعہ نے اُن معائب کو جمع کیا، جو عام آدمیوں کی نظروں سے اوجھل رہے۔
اس تنقید کو پھر حسبِ معمول اقبال نے یہ حل سجھا کر ختم کیا ہے ؎

به پور خویش دین و دانش آموز
که تابد چون مه و انجم نگینش
بدستِ او اگر دادی هنر را
ید بیضا ست اندر آستینش

ملا اور قائدین

معاشرے میں سیاسی، مذہبی اور اخلاقی رہنماؤں کے اخلاق اور کردار سے جو بددلی
اور ہزیمت خوردگی پیدا ہوتی ہے، اس کے مختلف پہلوؤں پر اقبال نے بڑی چابک
سے بحث کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ اخلاقی اقدار کے انحطاط کی وجہ سے قائدین
کو منزل مقصود پر پہنچانے سے قاصر رہے ہیں۔ ہم یہاں رہنماؤں کی اُن مختلف اقسام
زہ لیں گے جن کو اقبال زیر بحث لایا ہے۔ سب سے پہلے سیاسی رہنماؤں کو لیجئے پھر
ست کی تعریف سنئے ؎

اس کھیل میں تعیینِ مراتب ہے ضروری
شاطر کی عنایت سے تو فرزیں، میں پیادہ
بیچارہ پیادہ تو ہے اک مہرۂ ناچیز
فرزیں سے بھی پوشیدہ ہے شاطر کا ارادہ

عصر حاضر کے سیاست مداروں کی شعبدہ بازی اور طلسم کاری کا افسانہ اقبال
س طرح بیان کیا ہے ؎

ما غمیم از رسوائی این کاروان
در امیر او ندیم نور جان
تن پرست و جاہ مست و کم نگہ
اندرونش بے نصیب از لا الٰہ
در حرم زاد و کلیسا را مرید
پردۂ ناموس ما را بر درید
دامن او را گرفتن ابلہی است
سینۂ او از دل روشن تہی است

سیاست مدار کی کلیسا پرستی اور اسلامی نظام حیات سے بعد کی وجہ سے اس کی لادینی
پر اقبال نے کڑی تنقید کی ہے۔

سیاسی قائدین کے علاوہ غلط قسم کے مذہبی رہنماؤں اور پیروں نے معاشرے
میں جو فساد برپا کیا ہوا ہے اس کا بھی اقبال نے گہرا مطالعہ کیا۔ مذہب کی اہمیت کو تسلیم
کرتے ہوئے اور اس کی ترویج و اشاعت پر مُصر ہوتے ہوئے بھی غلط کار مذہبی رہنما کا
ایک نمونہ اقبال نے تلاش کیا، جسے وہ "ملا" کے نام سے پکارتا ہے۔ معاشرے میں اس
رہنما کے کارناموں، اس کی فطرت اور اس کے اخلاق پر تبصرہ کرتے ہوئے کبھی مذاقاً
اور کبھی متانت سے بہت سی دلچسپ باتیں کہی ہیں ؎

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا
حق سے جب حضرتِ ملا کو ملا حکمِ بہشت
عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف
خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقوال
بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت
ہے بد آموزیِ اقوام و ملل کام اس کا
اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

مُلا کی متابعت سے انسان کا جو حشر ہوتا ہے، اس کی تفصیل سن لیجئے ؎

آسیا آں مرز و بوم آفتاب
غیر بیں، از خویشتن اندر حجاب

قلب او بے واردات نو بنو
حاملش راکش نگیرد یاد وجو
روزگارش اندریں دیرینہ دیر
ساکن و یخ بستہ و بے ذوقِ سیر
صیدِ ملایان و نخچیرِ ملوک
آہوئے اندیشۂ او لنگ و لوک

اسی لئے اقبال نے ملا کے فتووں کی قیمت گھٹاتے ہوئے کہا ؎

مُنکرِ حق نزدِ مُلّا کافر است
منکرِ خود نزدِ من کافر تراست

پیروں کی نخچیرگیری کا ذکر اقبال نے مزے لے لے کر کیا ہے اور بالخصوص پنجابی مسلمان کو اس کا ہدفِ ملامت بنایا ہے۔ خانقاہوں کے مجاوروں اور پیروں کی کم نگہی اور کھوکھلے پن کا قصہ "پنجاب کے پیرزادوں سے" کے عنوان سے ایک قطعہ میں بیان کیا ہے، جس میں حضرت علامہ کو شیخ مجدد رح کے مزار پرانوار سے ایک التجا کا یہ جواب... ملتا ہے ؎

آتی یہ صدا، سلسلۂ فقر ہوا بند
ہیں اہلِ نظر کشورِ پنجاب سے بیزار
عارف کا ٹھکانا نہیں وہ خطہ کہ جس میں
پیدا کلۂ فقر سے ہو طرۂ دستار
باقی کلۂ فقر سے تھا ولولۂ حق
طروں نے چڑھایا نشۂ خدمتِ سرکار

اسی لئے اقبال نے کہا ؎

تم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

اب فقط وہ لوگ رہ گئے، جنھوں نے ملت کو ان مسائل میں الجھا دیا کہ ؎

ابن مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟
ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات

سرمایہ داری کی مذمت

معاشرے کی اصلاح کے لئے اقبال نے جہاں اس کے اور کئی معیوب پہلوؤں پر روشنی ڈال کر بہتری کی تجاویز پیش کیں، وہاں انھوں نے سرمایہ داری کو معاشرے کے لے سمِ قاتل قرار دے کر اس کی بہت مذمت کی ؎

پوجا بھی ہے بے سود نمازیں بھی ہیں بے سود
قسمت ہے غریبوں کی وہی نالہ و فریاد
ہیں گرچہ بلندی میں عماراتِ فلک بوس
ہر شہر حقیقت میں ہے ویرانۂ آباد

"ویرانۂ آباد" کو بسانے والوں کی زندگی کی تفاصیل بیان کر کے جب اقبال پُرجوش انداز میں اس کی حمایت میں نعرہ زن ہوتے ہیں تو بسا اوقات یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آج کل کے معروف "ازموں" کے مقلد بن گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے سامنے صرف اسلامیوں کی دنیا ہے جس میں غیر مسلم اور مسلمان سرمایہ دار آن فلاکت زدہ مسلمانوں کو براہِ راست اور بالواسطہ لوٹ کر اپنے بنک اور محلات تعمیر کر رہا ہے۔ اقبال کا دل ان مظلوموں کے لئے آٹھ آٹھ آنسو روتا ہے اور وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے ؎

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

اور وہ مظلوم انسانوں کے سامنے "جوشِ کردار" کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے جرأتِ رندانہ کی تبلیغ کرتے ہیں ؎

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع
کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز
جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز

معاشرے کے یہ چند اہم مسائل تھے جن کو اقبال نے بالتفصیل موضوعِ سخن بنایا ہے لیکن آزادیِ افکار، سینما، مغربی تہذیب، کور ذوقی، فرنگی مدنیت اور مسلمان کی کاہلی اور بے عملی پر بھی اقبال کے کلام میں جا بجا اشارے ملتے ہیں۔

عجب نہیں خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

علامہ کے خادم علی بخش کی زبانی

علامہ اقبال کی کہانی

میں بارہ تیرہ سال کا تھا۔ بھاٹی دروازہ کے بازار حکیماں کے آغاز پر آمنے سامنے دو مکان تھے۔ ایک میں حضرت علامہ رہتے دوسرے میں حاکم علی ایڈووکیٹ، میں نے ہوشیار پور سے لاہور آکر انہی کے ہاں ملازمت کی۔ ایک روز مولوی حاکم صاحب نے مجھے ایک رقعہ دیا۔ اور فرمایا کہ وہ سامنے کی بیٹھک میں شیخ صاحب بیٹھے ہیں۔ یہ رقعہ انھیں پہنچا دو۔ میں رقعہ یا پرزہ کاغذ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ شیخ صاحب نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ پھر رقعہ پر نگاہ ڈالی۔ تو تنک کر فرمایا۔

لڑکے تم ہمارے ہاں رہو گے۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اتنا عرض کیا۔ اس کا اختیار میرے بڑے بھائی کو ہے۔ وہی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح دو چار دفعہ حضرت علامہ نے اصرار کیا۔ آخر میں نے اپنے بڑے بھائی کو لکھا وہ لاہور تشریف لائے اور میں حضرت علامہ سے ان کی ملاقات کے بعد شیخ صاحب کے ہاں نوکر ہو گیا۔

شیخ صاحب ان دنوں حضرت علامہ نہ تھے اور نہ لوگ ہی انھیں حکیم الامت کہتے تھے۔ بس ان کا عرف شیخ صاحب تھا۔ سب انھیں شیخ صاحب کہتے ان کا احترام کرتے۔ دن ڈھلے یعنی شام کی شفق اور شب کے جھٹپٹے میں بازار حکیماں کے تھڑے پر جہاں حکیم شہباز احمد مطب کرتے تھے۔ تمام دوست اکٹھے ہوتے۔ شیخ عبد القادر۔ مرزا جلال الدین۔ حاجی احمد بخش۔ سید تقی شاہ۔ شیخ گلاب دین۔ مولوی احمد دین اور رفقیر افتخار الدین وغیرہ۔ کوئی دو گھنٹے کی محفل جمتی۔

شعر و شاعری کا دور چلتا۔

لطیفہ بازی ہوتی۔

مختلف قسموں پر بحثیں ہونے لگتیں۔

گاہے گاہے ایک دوسرے پر پھبتیاں کسی جاتیں۔

استعارے اور تشبیہیں چلتیں۔

قہقہوں کے درمیان محفل شروع ہوتی اور قہقہوں کے درمیان ختم ہو جاتی مجھے بے تکلفی کے سوا کچھ یاد نہیں میں پڑھا لکھا نہیں کہ مجھے وہ باتیں یاد رہتیں، بس اتنا یاد ہے کہ بے تکلف دوست ایک دوسرے پر چھینٹے پھینکتے لیکن ان میں بازار کے لہجہ کا شائبہ تک نہ ہوتا.....
شیخ صاحب مزے مزے سے چٹکی لیتے لیکن ان کا احترام جوں کا توں رہتا سب انھیں شیخ صاحب کہہ کر پکارتے۔ وقت گزرتا گیا۔ محفلوں میں امتداد زمانہ سے کمی بیشی ہوتی رہی ان کے دوستوں میں کئی نئے چہروں کا اضافہ ہوتا رہا۔ کچھ بچھڑ گئے کچھ چھوڑ گئے۔

شیخ صاحب کچھ دنوں بعد علامہ کہلانے لگے۔ لوگ انھیں دیکھتے ہی احترام کی نظریں اور عقیدت کی جبینیں جھکا دیتے تھے۔

مجھے ان کے مرتبہ یا درجے کا علم نہ تھا زیادہ سے زیادہ مجھے یہ معلوم ہو سکا کہ وہ شاعر ہیں۔ جب حمایت اسلام کے جلسے میں پڑھتے ہیں تو ان کی آواز اشعار پر لوگ لوٹ پوٹ ہو جاتے اور جس دن ان کے نظم پڑھنے کا اعلان ہوتا تمام شہر ٹوٹ پڑتا۔

میں نے حقہ لگانا شروع کیا۔ علامہ نقل مکانی کر کے انارکلی میں آ گئے تھے۔ یہاں وہ اپنے مکان پر مختلف کالجوں کے طلبہ کو جو اسی کے قریب تھے۔ سر شام فلسفہ پر لیکچر دیتے ان کی پہلی ملاقات چودھری محمد حسین سے یہیں ہوئی۔ زمانے نے اس میں اتنی پختگی پیدا کی کہ ان کے بہت سے دوست جو آج کل ان کی عظمت کے پیش نظر ان سے اپنی ہمنشینی کا اعلان بڑے جاہ و جلال سے کرتے ہیں ایک ایک کر کے پیچھے رہ گئے __________

__________ لیکن چودھری صاحب سب سے پیچھے آئے اور سب سے آگے نکل گئے۔

چودھری صاحب سے رسم و راہ کا سبب نواب ذوالفقار علی خاں مرحوم تھے۔ جو اس زمانہ میں ان کے دونوں صاحبزادوں کے اتالیق تھے۔ یہ تعلق قائم کرنے میں اسلامیہ کالج کے انگریز پرنسپل کا ہاتھ تھا جنھیں چودھری صاحب کی طالب علمانہ قابلیت پر خاصا اعتماد تھا۔ علامہ اقبال سے تعلق خاطر قائم ہوتے ہی چودھری صاحب ان کی سفارش پر پریس برانچ میں ملازم ہو گئے۔

اس قرب نے جذب کی راہ پیدا کی یعنی کہ دل و دماغ کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہونے گئے۔ چودھری صاحب حضرت علامہ سے ملے بغیر نہ رہ سکتے وہ سیکرٹریٹ سے فارغ ہو کر سیدھے علامہ کے ہاں پہنچے۔ پھر دونوں گھنٹوں مختلف عنوانات پر باتیں کرتے۔ جن دنوں شعر کہتے ان دنوں چودھری صاحب سے ان کی طویل طویل صحبتیں رہتیں۔ دونوں غالباً شعروں کے الفاظ و مطالب کی یگانگت پر غور کرتے تھے۔

حضرت علامہ کھانے پینے کے چنداں شوقین نہ تھے لیکن جو کھاتے اس میں پاکیزگی کو ضرور ملحوظ رکھتے بالخصوص انھیں ذائقہ کا بہت خیال رہتا تھا وہ انگریزی دوائیوں کے استعمال سے بھی اسی لئے پرہیز کرتے تھے۔ کہ ان میں ذائقہ کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔

ایک زمانہ میں خوش خوراک بھی تھے بالخصوص پلاؤ انتہائی مرغوب تھا۔ اس کو مسلمانوں کی پرشکوہ غذا سمجھتے۔ پلاؤ کی اس دلفریبی ہی کا نتیجہ تھا کہ مسلم آؤٹ لک کا انگریز ایڈیٹر مسلمان ہو گیا۔ حضرت علامہ نے اس کو کھانے پر مدعو کیا وہ دسترخوان پر بیٹھا اور پلاؤ کا لقمہ اٹھایا تو لٹو ہو گیا۔ ایک روز کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔ غالباً اس کا نام وائر وا پشن تھا۔ وہ کہتا

کرتا تھا جس قوم کا کھانا اتنا عمدہ ہو اس کا عقیدہ کتنا ارفع ہوگا۔

آخر عمر میں ان کا کھانا پینا تقریباً چھوٹ گیا تھا۔ کئی سال سے صرف ایک وقت کھانا کھاتے وہ بھی بہت تھوڑا۔ لسی سال میں دو چار دفعہ پیتے۔ کشمیری ہونے کے باوجود چائے سے مجتنب ہی رہے۔ عموماً شلجم اور ساگ کھاتے۔ شوربہ پیتے۔ خشک چاول بھی پسند فرماتے تھے۔ پھلوں میں چوسنے والے آموں سے نہایت رغبت تھی۔ میاں نظام الدین مرحوم کے ہاں بارہ دکھانے میں آم کے موسم میں کئی کئی مجلسیں ہوتیں۔ اس کثرت سے آم چوستے کہ دوست چھیڑنے لگتے۔ فرماتے میں نے غالب کی تقلید آم کھانے میں کی ہے اور بس۔ خربوزہ شوق سے کھاتے لیکن زیادہ نہیں کیوں کہ انھیں خربوزے کی صحت پر چنداں اعتبار نہ تھا۔

جب خود کھانے کے قابل نہ رہے تو پھر دوستوں کو کھلا کر خوش ہوتے لیکن یہ رنگ میکلوڈ روڈ کی کوٹھی تک رہا جب وہاں سے چلے آئے تو پھر زیادہ سے زیادہ کم آمیز ہوتے گئے ان کی محفل میں بار پانا سہل نہ تھا۔ وہ مختلف تجربوں کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ دوستوں کے پھیلاؤ سے نقصان ہی ہوتا ہے البتہ چودھری صاحب سے ان کا تعلق خاطر پھیلتا گیا۔ عمر گھٹتی گئی تعلق بڑھتا گیا۔

انھیں خوب کھلاتے اور وہ بھی شوق سے کھاتے تھے۔ حقّہ کے بے حد رسیا تھے صبح شام حقہ پینے اس حقہ کے لئے مجھے ان کے قریب رہنا پڑتا۔ ان کے کمرہ سے ملحق میرا کمرہ تھا۔ کئی کئی دفعہ آواز دیتے۔ علی بخش حقہ بھرو۔ چلم میں آگ بھرو۔ وہ رات کا بڑا حصہ جاگ کر گزارتے تھے۔ مجھے بھی جاگنا پڑتا ہمیشہ یہ فکر رہتی جانے کب آواز دیں۔ پہلے تو میں ایک خدمت گزار اور وفادار کی حیثیت سے ان کے ساتھ رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ میں نے اپنا نظریہ بدل لیا۔ میں سمجھتا تھا۔

میں کسی آقا کی خدمت نہیں کر رہا بلکہ ایک بہت بڑے انسان کا خدمت گذار ہوں جس کے شب و روز انتہائی درد و اضطراب میں بسر ہوتے ہیں۔

میں ان کی "رفاقت" میں بچے سے بوڑھا ہو گیا اور اب سمجھو کہ گور کنارے ہوں زندگی کے چل چلاؤ کا زمانہ ہے۔ لیکن مجھے آج بھی وہ اپنے سامنے ہی نظر آتے ہیں۔ جاوید میاں کے لندن جانے پر بھی جاوید منزل۔ میری ہی تحویل میں رہی میں نے اسے سالہا سال تنہا پایا لیکن مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوا کہ جیسے حضرت علامہ مجھے پکار رہے ہیں۔

علی بخش کہاں ہو۔ حقہ تازہ کرو۔

آگ بھرو۔

کاغذ لاؤ۔

گرامی صاحب کے لئے کیا پکایا ہے چودھری صاحب آئے یا نہیں۔

اور میں نے بارہا ان کے کمرے کی دیواروں سے کان لگا کر ان کی آواز سننے کی کوشش کی ہے۔ میں نے ان کی آوازیں سنی ہیں۔

اتنا کہتے ہی علی بخش کی آواز بھرا گئی اس کا چہرہ اشک بار ہو گیا اور میں نے اس کے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے سوال کیا۔ بابا حضرت علامہ شعر کیوں کر کہتے تھے۔۔؟

شعر؟

جہاں شعر؟

ان پر ایک عجیب ہی کیفیت طاری ہوتی۔ ہفتوں فکر شعر میں مستغرق رہتے عموماً رات کو پچھلے پہر شعر کہتے۔ ایک عجیب سا کرب ان کے سارے جسم کو محیط ہوتا۔ ایک کپکپی سی طاری ہو جاتی۔ ان کا چہرہ تمتانے لگتا۔ آنکھیں سرخ ہو جاتیں۔ اور جب شعر یا نظم دماغ میں مکمل ہو جاتی تو پکارتے علی بخش! کاپی لاؤ، قلم لاؤ۔ دوات لاؤ۔ قرآن شریف۔ شعر کہنے یا لکھنے سے پہلے قرآن مجید کے اوراق کھولتے جاتے اس میں کچھ دیکھتے پھر شعر کہنے لگتے کبھی کبھار قرآن کھولتے ہی چپ ہو جاتے۔ کاپی واپس کر دیتے۔

میں چارپائی پر جا کر سوتا تو آواز آتی۔

علی بخش آؤ۔ غرضیکہ ان کے شعر کہنے کا انداز کسی طرح ایک کٹھن سفر سے مختلف نہ تھا میں نے بارہا انھیں روتے دیکھا۔ شعر کہتے جاتے اور روتے جاتے۔

حضور سرورِ کائنات سے انھیں انتہائی انس تھا۔ انس کیا وہ اس نام کے سنتے ہی بے خود ہو جاتے کوئی شخص حضور کا نام لیتا تو پوچھتے وضو کیا ہے۔ اگر بے وضو ہوتا تو کوٹھی کی مسجد میں وضو کرنے کے لئے کہتے۔ اذان سنتے تو مسحور ہو جاتے۔ قرآن مجید سن کر ان کا عالم ہی دوسرا ہوتا۔ وہ قرآن کی آیات تلاوت کرتے وقت کانپا کرتے اور حضور کا نام لیتے وقت انتہائی عجز میں ڈوب جاتے تھے۔ انھیں قلندروں اور فقیروں سے بے حد لگاؤ تھا لیکن فوراً ہی مجذوبوں اور قلندروں میں سے اصل نقل کو پہچان لیتے تھے۔

کوئی فقیر مانگنے کے لئے آتا تو اس کے چہرے سے اس کی اصلیت پہچاننے کی کوشش کرتے۔ اسے مایوس نہ کرتے کئی سائل چپکے سے عرض حال کرنے آجاتے کہتے علی بخش انھیں کہو پھر کبھی آنا۔ جب وہ باہر چلا جاتا تو مجھے کہتے دور جا کر۔ اسے یہ روپیہ دے آؤ۔ یہ خبر نہ ہونے دینا کہ میں نے بھجوائے ہیں۔

اب تیرہ چودہ سال کا علی بخش عمر رفتہ کا ایک ڈھیر ہے اس کا چہرہ شکنوں کے بوجھ سے اٹا پڑا ہے۔ لیکن اسے یقین ہے کہ میرا آقا مرا نہیں زندہ ہے۔

زندہ جاوید

اس کی شاخیں بار آور ہو چکیں۔

اس کے لالہ زار میں بہار آگئی ہے اور اس کے راز داں پیدا ہو چکے ہیں۔ اور وہ زندگی کو ایک فرض سمجھ کر بسر کر رہا ہے۔ کیوں کہ زندگی بہر حال ایک عبادت ہے۔
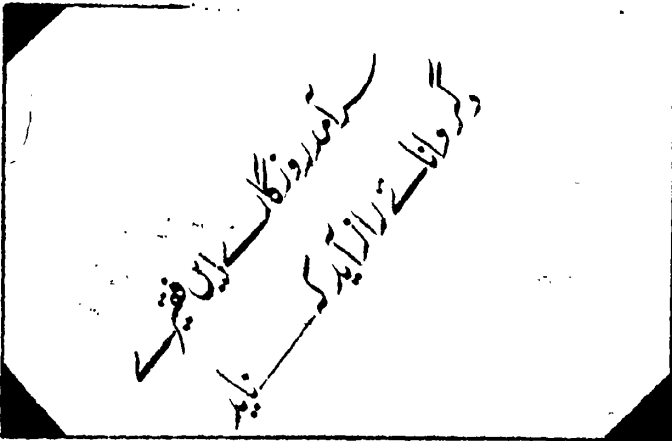
جگن ناتھ آزاد

اقبال تاریخ کے آئینے میں

اُردو کے مشہور شاعر جگن ناتھ آزاد نے حیاتِ اقبال کی اہم تاریخوں کا ایک چارٹ مرتب کیا ہے۔ یہ چارٹ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے نیچے درج کیا جارہا ہے۔

نمبر شمار	واقعہ	مقام	تاریخ
۱۔	ولادت	سیالکوٹ	۱۸۷۷ء
۲۔	مڈل	اسکاچ مشن ہائی سکول سیالکوٹ	۱۸۹۱ء
۳۔	میٹریکولیشن	〃 〃 〃	۱۸۹۳ء
	امتیازی حیثیت سے پاس کیا تمغہ اور وظیفہ پایا۔		
۴۔	انٹرمیڈیٹ	اسکاچ مشن ہائی سکول سیالکوٹ	۱۸۹۵ء
۵۔	بی۔ اے میں داخلہ	گورنمنٹ کالج لاہور	۱۸۹۵ء
۶۔	پہلی بار مشاعرے میں شرکت۔	لاہور	۱۸۹۶ء
۷۔	بی۔ اے	گورنمنٹ کالج لاہور	۱۸۹۷ء
	عربی میں امتیازی حیثیت حاصل کی، جمال الدین طلائی تمغہ حاصل کیا۔		
۸۔	ایم۔ اے (فلسفہ)	گورنمنٹ کالج لاہور	۱۸۹۹ء
۹۔	میکلوڈ عربک ریڈر	اورینٹل کالج لاہور	۱۸۹۹ء
۱۰۔	نالۂ یتیم، انجمن حمایت اسلام میں پڑھی۔	لاہور	۱۹۰۰ء
۱۱۔	یتیم کا خطاب ہلال عید سے، انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں پڑھی۔	لاہور	۱۹۰۱ء
	مولانا عبدالمجید سالک نے "ذکر اقبال" میں اس نظم کا ذکر کرتے ہوتے یہ شعر نقل کیا ہے ؎ پیام عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے ؎ ہلال عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے یہ شعر اقبالؒ کی ایک بہت بعد کی نظم کا ہے، مذکورہ جلسے میں اقبالؒ نے جو نظم پڑھی تھی اس کا پہلا شعر یہ ہے ؎ اے مہِ عید بے حجاب ہے تو ؎ حسن خورشید کا جواب ہے تو		
۱۲۔	ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کا امتحان	لاہور	۱۹۰۱ء
۱۳۔	قیام	بھاٹی دروازہ۔ لاہور	۱۹۰ء تا ۱۹۰۵ء
۱۴۔	اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج	لاہور	۱۹۰۳ء

نمبر شمار	واقعہ	مقام	تار
۱۵۔	علم الاقتصاد کی اشاعت	لاہور	۱۰۳
	علامہ اقبالؒ کی سب سے پہلی تصنیف۔ موضوع اقتصادیات		
۱۶۔	نظم "سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا" کی تخلیق		۱۰۴
۱۷۔	حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار پر حاضری۔	دہلی	۹۰۵
۱۸۔	انگلستان	روانگی	۱۰۵
۱۹۔	پی۔ ایچ ڈی	میونخ یونیورسٹی جرمنی	۱۰۷
۲۰۔	عربی کے پروفیسر	لندن یونیورسٹی	۱۹۰۷ء تا ۰۸
۲۱۔		لندن	۹۰۸
۲۲۔	بار ایٹ لاء	لندن	۹۰۸
۲۳۔	ہندوستان واپسی	لندن سے	۱۰۸
۲۴۔	بیرسٹری کی ابتداء	لاہور میں ۲۲ر اکتوبر	
۲۵۔	چیف کورٹ پریکٹس کرنے کی درخواست	لاہور ۲۲ر اکتوبر	
۲۶۔	"شکوہ" انجمن حمایت اسلام کے اجلاس میں	لاہور	۹۱۱
۲۷۔	فلسفہ کے پروفیسر گورنمنٹ کالج	لاہور	۹۱۱
۲۸۔	مدت قیام	انارکلی لاہور	اکتوبر ۱۹۰۸ تا ۱۲۱
۲۹۔	علامہ اقبال نے اپنے استاد سید میر حسن کے پوتے سید محمد عبداللہ کو ان کے ہزار اصرار پر اپنے شعر سنائے۔	انارکلی لاہور	۱۱۲
	علامہ اقبال اپنا کلام سنانے سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسوں کے علاوہ انھوں نے بہت کم اپنا کلام دوسرے جلسوں میں پڑھا یا کسی کو سنایا۔		
۳۰۔	تاریخ ہند (مڈل کے درجوں کے لئے)	لاہور	۱۱۳
	اس کا خلاصہ جوامر تسر کے ایک ناشر نے ۱۹۱۴ء میں شائع کیا جناب ممتاز حسین کی ذاتی لائبریری میں محفوظ ہے۔ اصل کتاب نایاب ہے۔		

۳۱۔ محترمہ بی بی کی وفات (والدہ علامہ اقبالؒ) سیالکوٹ ۹ نومبر ۱۹۱۴ء

مادر مخدومہ اقبال، رفت، سوئے جنت زیں جہاں بے ثبات

گفت اکبر با دل پُر درد و غم۔ رحلت مخدومہ تاریخ وفات ۱۳۳۳ھ

۳۲۔ "اسرار خودی" کی اشاعت لاہور ۱۹۱۵ء

۳۳۔ درد گردہ کا پہلا حملہ لاہور ۱۹۱۷ء

کانگریس کے مشہور لیڈر لالہ لاجپت رائے علامہ کی عیادت کو آئے تو انھیں مشورہ دیا کہ آپ نابینا صاحب دہلوی (حکیم عبدالوہاب انصاری) سے علاج کرائیں۔ چنانچہ علامہ بغرض علاج دہلی تشریف لے گئے۔

۳۴۔ "رموز بے خودی" کی اشاعت لاہور ۱۹۱۸ء

۳۵۔ اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کو ایک اہم خط۔ لاہور سے ۱۹۲۰ء

"میری تحقیق کے مطابق ہمارے خاندان کو سکونت لوچرہ یا لوجرہ میں نہیں موضع پچگو پرگنہ ادون میں تھی۔" (اقبال)

۳۶۔ کشمیر کا سفر سری نگر ۱۹۲۰ء

نشاط باغ میں اپنی مشہور نظم "ساقی نامہ" کہی

۳۷۔ اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ، از۔ آر۔ اے۔ لندن ۱۹۲۰ء

۳۸۔ مدت قیام میکلوڈ روڈ لاہور ۱۹۲۲ء تا ۱۹۳۵ء

۳۹۔ "سر" کا خطاب لاہور یکم جنوری ۱۹۲۳ء

۴۰۔ پیام مشرق کی اشاعت لاہور ۱۹۲۳ء

۴۱۔ اسکولوں کے چھٹے، ساتویں اور آٹھویں درجے کے طلبہ کے لئے تعلیمی نصاب (اردو کورس) کی ترتیب۔ لاہور ۱۹۲۴ء

ان کتابوں کی ترتیب میں حکیم احمد شجاع نے علامہ اقبال کا ہاتھ بٹایا۔

۴۲۔ "بانگ درا" کی اشاعت مارچ ۱۹۲۴ء

۴۳۔ والدۂ آفتاب اقبال مختار بیگم کا انتقال ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۴ء

۴۴۔ ولادت جاوید اقبال لاہور ۱۹۲۴ء

۴۵۔ لیکچر بعنوان "اسلام اور اجتہاد" اسلامیہ کالج لاہور ۱۹۲۵ء

اس لیکچر کے دوران میں علامہ اقبال نے بڑے جوش کے ساتھ ترکی شاعر ضیا کا کلام سنایا۔

۴۶۔ پنجاب کونسل کے الیکشن میں کامیابی لاہور دسمبر ۱۹۲۶ء

۴۷۔ کونسل کی مدت رکنیت لاہور ۱۹۲۶ء تا ۱۹۲۹ء

۴۸۔ "زبور عجم" کی اشاعت لاہور ۱۹۲۷ء

اگر ہے ذوق تو خلوت میں پڑھ زبور عجم۔ فغان نیم شبی بے نوائے راز نہیں

۴۹۔

کی اشاعت مدراس ۱۹۲۸ء

۵۰۔ سفر دکن اور مندرجہ بالا لیکچر مہاراجہ میسور کی ذاتی دعوت پر میسور ۱۰ جنوری ۱۹۲۹ء

۵۱۔ سفر دکن اور مندرجہ بالا لیکچر حیدرآباد ۱۴ جنوری ۱۹۲۹ء

۵۲۔ مولوی میر حسن کا انتقال سیالکوٹ ۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء

۵۳۔ ولادت منیرہ لاہور ۱۹۳۰ء

۵۴۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ جلسے کی صدارت الٰہ آباد ۱۹۳۰ء

۵۵۔ شیخ نور محمد کا انتقال (والد علامہ اقبال) سیالکوٹ ۱۷ اگست ۱۹۳۰ء

پدر و مرشد اقبال از یں عالم رفت ما همه راهروان منزل ملک ابد

ہاتف از حضرت خواست و تاریخ رحیل۔ آمد آواز "اثر رحمت" و "آغوش لحد" ۱۳۴۹ھ

۵۶۔ اقبالؒ نے پروفیسر سلیم چشتی کو "گلشن راز جدید" سبقاً سبقاً پڑھائی۔ لاہور ۱۹۳۱ء

۵۷۔

کی اشاعت لاہور ۱۹۳۱ء

۵۸۔ موتمر عالم اسلامی میں شرکت فلسطین ۱۹۳۱ء

۵۹۔ دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت لندن ۷ ستمبر تا یکم دسمبر ۱۹۳۱ء

۶۰۔ نپولین کے مزار پر پیرس ۱۹۳۲ء

۶۱۔ مشہور ریسرچ اسکالر سے ملاقات پیرس ۱۹۳۲ء

۶۲۔ اقبال نے برگساں کو حضورؐ کی یہ حدیث لا الدھر ان اللہ الدھر ھو اللہ

سنائی تو برگساں تصور زماں کے بارے میں یہ نظریہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔

۶۳۔ "جاوید نامہ" کی اشاعت لاہور ۱۹۳۲ء

۶۴۔ تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت لندن ۱۷ نومبر تا ۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء

۶۵۔ مسولینی سے ملاقات روم (اٹلی) ۱۹۳۳ء

۶۶۔ نظم "دعا" کی تخلیق قرطبہ (اسپین) ۱۹۳۳ء

۶۷۔ نظم "مسجد قرطبہ" کی تخلیق اسپین ۱۹۳۳ء

۶۸۔ علالت کا آغاز لاہور ۱۹۳۳ء

۶۹۔ حکومت افغانستان کی دعوت پر سفر افغانستان اکتوبر ۱۹۳۳ء

۷۰۔ ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۴ دسمبر ۱۹۳۳ء

۷۱۔ عید کی نماز کے بعد گرم سویاں دہی ملا کر کھائیں۔ شاید نزلے اور کھانسی میں مبتلا ہو گئے گلا بھی بیٹھ گیا لاہور جنوری ۱۹۳۴ء

۷۲۔ والدہ جاوید (سردار بیگم) کا انتقال لاہور ۱۹۳۵ء

۷۳۔ "بال جبریل" کی اشاعت لاہور ۱۹۳۵ء

۷۴۔ مولانا حالی کی برسی میں شرکت پانی پت اکتوبر ۱۹۳۵ء

۷۵۔ سر راس مسعود کے ہاں قیام (متعدد بار) بھوپال ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۸ء

۷۶۔ برقی علاج بھوپال ۱۹۳۵ء

۷۷۔ وصیت نامہ کی تحریر لاہور ۱۹۳۵ء

بہ طرزِ اقبال

(غزل سرا و نواہائے رفتہ باز آور)

ماہرالقادری

ہے دل میں جوشِ طبیعت ہے کس قدر موزوں
میں آج مطلعِ رنگیں جگر کے خوں سے لکھوں
نہ آرزو نہ کشاکش نہ جذب و سوزِ دروں
خدا کرے کہ میں اس حال میں کبھی نہ رہوں
جو خود بھی پی نہ سکیں اور کو پلا نہ سکیں
میں اُن کے ہاتھ سے جامِ حیات چھین نہ لوں

ہیں ٹھوکریں بھی تجھے تلخیٔ کرم آمیز
اگر نہیں ہیں ترے حوصلے زمانہ ستیز
چلے ہیں غم کے مٹانے کو سوئے میخانہ
یہ خودکشی کے ارادے، یہ زندگی سے گریز
کوئی کرے نہ مرے دل کی دھڑکنوں کا علاج
مرے لئے ہیں یہی نغمہ ہائے دل آویز

کانٹوں کی کھٹک دیکھ، نہ پھولوں کی مہک دیکھ
ہے تیز ہوا، شاخِ نشیمن کی لچک دیکھ
یہ قمری و طاؤس کے نظارے کہاں تک
رم خوردہ غزالوں کی بھی پلکوں کی جھپک دیکھ
تقدیر کے اسرار بتائے گا تجھے کون
آئینہ امروز میں فردا کی جھلک دیکھ
حُنین و بدر میں وہ غازیوں کی تکبیریں
نظر کے ساتھ بدلتی گئی ہیں تقدیریں!

خموشیوں سے نمایاں ہے جذبِ سوزِ دروں
یہ سلوٹیں ہیں جبیں پر کہ دل کی تحریریں
یہ کون پچھلے پہر رات کو ہے محوِ سجود
دعا کو ڈھونڈھ رہی ہیں ابھی سے تاثیریں
یہ سجدہ ہائے ریائی کے داغ، ارے توبہ
کہ مسجدوں میں بنادی گئی ہیں تصویریں
مجاہدوں سے کہو اس قدر نہ ہوں دلتنگ
کہیں کہیں سے ذرا مڑ گئی ہیں شمشیریں

معرفت ہے نہ محبّت نہ پیمبر نہ کتاب
علمِ حاضر کا یہ عالم کہ حضوری نہ غیاب
دستِ بے باک کی جرأت نہ ہو جب تک کہ شریک
صرف نظارے سے کھلتے ہیں کہاں بندِ نقاب
وہی انسان ہے اس دہر میں بیدار ضمیر
ہر نفس آج بھی ہے جس کے لئے روزِ حساب
ٹوٹ کر سطح کو بے چین تو کر جاتے ہیں
آبگینے یہ ہوا کے، یہی کمزور حباب
یہ فضا ہائے یہ دُنیا! یہ جہانِ تہذیب
عشق بے خواب ہے جس کا نہ محبّت بیتاب

وہ زندگی کہ نہیں جس میں جذب و مستی و سوز
وہ زندگی تو حقیقت میں خود ہے بیماری
خدا کے واسطے اس روزِ احتساب سے ڈر
کہ جب ہوں دیدہ و دل مجرمانِ اقراری
نہ تاج قیصر و سنجر نہ دولتِ پرویز
مرے لئے ہے بہت کچھ متاعِ خودداری
خود حسن کی نمود کو الفت کی ہے تلاش
یہ کس نے کہہ دیا کہ محبّت غلام ہے
نظریں بلند ہوں تو زمیں بھی ہے آسمان
سمعِ قبول ہو تو خموشی پیام ہے

بازارِ کوفہ کی دردناک تقریر

کربلا کا قتلِ عام ہو گیا۔ اور یزیدی فوج کے نمونی حضرت امام حسین علیہ السلام اور تمام شہیدوں کے سر نیزوں کی نوک پر چڑھا کر ابن زیاد کے پاس لے چلے تو حضرت امام حسین علیہ السلام کی عورتوں اور بچوں کے ہاتھوں میں رسیاں باندھ کر اونٹوں پر بٹھایا گیا۔

شہیدوں کے سر اور یہ قیدی جب کسی آبادی اور شہر سے گزرتے تھے۔ تو ہزاروں آدمی، عورت مرد ان کا تماشہ دیکھنے جمع ہو جاتے تھے۔

جس وقت یہ قافلہ کوفہ کے بازاروں سے گزرا تو راستوں گلیوں اور مکانوں کی چھتوں پر ہزاروں عورت و مرد اور بچے کھڑے زار و قطار رو رہے تھے۔ قیدیوں میں حضرت زینبؑ بنت علی بھی تھیں اور ان کے ہاتھوں میں رسی بندھی ہوئی تھیں۔ انھوں نے تماشائیوں کو مخاطب کر کے یہ دردناک تقریر کی۔

دیکھو دیکھو، ہمارا تماشہ دیکھو میں فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی ہوں علی میرے باپ تھے اور حسین میرا بھائی تھا جس کا کٹا ہوا سر سامنے نیزے پر چڑھا ہوا جا رہا ہے۔ وہ آگے حسین کا بیمار بیٹا عابد ہے جس کو رسیوں سے جکڑ کر باندھ دیا گیا ہے۔ اپنے گھر کے بیماروں کو آرام پہنچاتے ہو مگر اپنے رسول کے بیمار نواسہ کی بھی دیکھ لو کہ اونٹ کی ننگی پیٹھ پر بیٹھا ہے، نہ دوا ہے، نہ آرام ہے نہ راحت کا سایہ ہے نہ نرم بستر ہے۔

اس سکینہ کو بھی دیکھو اب یتیم ہے اور باپ کے خون میں بھرے سر کو تمام راستہ دیکھتی آتی ہے اور گھڑی گھڑی پوچھتی ہے اماں۔ گھر کب چلو گی۔؟ مگر ہم اسے کیا جواب دیں کہ ہمارا گھر تو اجڑ گیا آسمان کے نیچے، قبر کے سوا اب ہمارا کوئی بھی ٹھکانہ نہیں ہے۔

جب تک منزل ختم نہ ہو جائے ہم کسی جگہ اپنے اختیار سے ایک دم کو بھی نہیں ٹھہر سکتے۔ ہماری مجال نہیں ہے کہ دھوپ کی شکایت کریں یا پانی کا ایک گھونٹ پی لیں یا روٹی کا ایک ٹکڑا کھا لیں ہم اس رسول کے گھر والے ہیں جو بیماروں کا تیماردار رہتا جو بھوکوں کو روٹی، پیاسوں کو پانی اور قیدیوں کو رہائی دیتا تھا اور جو ستم رسیدہ لوگوں کی دلجوئی کرتا تھا مگر آج ہم خود بھوکے ہیں پیاسے ہیں قیدی ہیں، بیمار ہیں اگر ہم کہتے ہیں کہ ذرا دم بھر کر اونٹ روک لو تاکہ بیمار اور بچے پانی کا گھونٹ پی لیں تو ہمارے کوڑے مارے جاتے ہیں اور ہمیں گالیاں دی جاتی ہیں۔

دیکھو، اس سے بڑا تماشہ تم نے کبھی نہ دیکھا ہوگا اور نہ کبھی دیکھو گے اور خدا کرے کوئی بھی نہ دیکھے مگر میں تم سے کہہ دیتی ہوں، کہ اس دنیا کی عزت پر، دنیا کی حکومت پر گھمنڈ کرنا یہ سب فنا ہو جانے والی چیزیں ہیں اور میں تم سے یہ بھی کہتی ہوں کہ ہماری اس مصیبت پر رونے سے کچھ حاصل نہیں ہے۔ ہم نے حق و صداقت کے لئے اپنے سر کٹوائے گھر لٹائے اور سب کچھ برباد کیا۔ اگر تمہیں ہم سے محبت اور ہمدردی ہے تو تم بھی حق اور سچائی کو قائم رکھنے کے لئے ہماری طرح قربانیاں دو۔ میں حسین نے اسلام کی سچائی کے لئے اپنا اور اپنے بچوں کا سر دے دیا اور اسلام کی خدمت کے سامنے ہم عورتوں کی قید کا بھی اس کو خیال نہ آیا کیوں کہ وہ اسلام کا سب سے بڑا عاشق تھا۔

(حضرت خواجہ حسن نظامی)

ابن زیاد کے دربار میں جناب زینبؑ کی گفتگو

دوسرے روز ابن زیاد حاکم کوفہ نے دربار عام منعقد کیا، عمائدین شہر اور فوج کے بڑے بڑے افسر جمع ہو گئے تو عمر و سعد کو حکم دیا مقتولین کے سر اور قیدیوں کو حاضر کیا جائے۔

امام حسین علیہ السلام کا سر ایک طشت میں اور دوسرے شہداء کے سر دوسرے طشت میں پیش کئے گئے پھر حرم اہل بیت کو پہونچایا گیا۔ جناب زینبؑ ایک گوشہ میں کھڑی ہو گئیں ابن زیاد نے شہداء کے سروں اور اہل بیت پر ایک نظر ڈالی اور جناب زینب کو دیکھ کر دریافت کیا "یہ عورت کون ہے۔؟"

عمر و سعد نے کہا "یہ علی بن ابی طالب کی صاحبزادی اور حسین کی بہن زینب کبری ہیں، یہ ابن زیاد نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ اس نے تمہیں ذلیل و خوار کیا اور تمہارے نوجوانوں کو جھوٹا بنا دیا۔

جناب زینب نے جواب میں فرمایا، اس خدا کا شکر ہے جس نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہمیں عزت و شرف مرحمت فرمایا۔ آپ پر اور آپ کی اولاد پر خدا کی رحمت ہو۔"

ابن زیاد نے کہا تم نے دیکھا خدا نے تمہارے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا۔؟

جناب زینب نے فرمایا، میں نے تو ان میں خوبی ہی دیکھی ہے، یہ وہ لوگ تھے جن کے لئے خدا نے شہادت کا درجہ رکھا تھا اور وہ باہر نکل کر اپنے ٹھکانوں پر پہونچ گئے، اللہ تعالئے تجھے اور ان کو اکٹھا کرے گا وہ تیرے مظالم کی خدا سے فریاد کریں گے، ابن زیاد۔! تجھے بھی خدا کے حضور میں حاضر ہونا پڑے گا۔ تو جوابدہی کے لئے تیار ہو جا۔ اس وقت تو خود دیکھ لے گا کہ کون رسوا ہوتا ہے۔؟

جناب زینب کی اس گفتگو سے عبیداللہ ابن زیاد اس قدر غضبناک ہوا کہ ان کے قتل کا ارادہ کر لیا مگر عمرو بن حارث نے یہ کہہ کر اس کا غیظ و غضب ٹھنڈا کیا۔ "عورتوں کی باتوں پر کوئی سمجھدار انسان کان نہیں دھرتا۔"

ابن زیاد نے جناب زینب سے کہا خدا نے باغی و سرکش حسین (علیہ السلام) کے قتل سے میرے دل کو شفا بخشی ہے۔"

جناب زینب نے فرمایا "خدا کی قسم، تو نے میرے ادھیڑ لوگوں کو مار ڈالا میرے ہل کو بے پردہ کیا میری شاخوں کو قطع کیا اور میری جڑوں کو اکھاڑ ڈالا۔ اگر یہ باتیں تیرے لئے شفا ہیں تو بے شک تو نے شفا حاصل کر لی۔

ابن زیاد نے ان جملوں کو سن کر کہا "یہ عورت سجع اور قافیہ میں باتیں کرتی ہے یعنی نہایت فصیح و بلیغ ہے، پھر جناب زینب سے کہا تمہارے باپ بھی شاعر تھے اس لئے تمہیں شاعری اور خطابت میں جو ملکہ حاصل ہے مجھے اس پر تعجب نہیں ہے۔"

جناب زینب نے فرمایا، جو کچھ میں نے کہا ہے، یہ شاعری ہے نہ خطابت بلکہ صداقت ہے ابن زیاد! تجھے شرم نہیں آتی کہ فضول باتیں بنا رہا ہے۔" ابن زیاد خاموش ہو گیا، پھر کچھ وقت کے بعد اس نے عابد بیمار کی طرف اشارہ کر کے پوچھا، یہ لڑکا کون ہے۔؟

عمر و سعد نے کہا، حسین (علیہ السلام) کا لڑکا ہے اور اسے اس وجہ سے قتل نہیں کیا کہ یہ بیمار ہے۔"

ابن زیاد نے کہا "اسے میرے سامنے قتل کر دو تاکہ حسین (علیہ السلام) کا نام لیوا کوئی نہ رہے۔"

یہ سن کر جناب زینب عابد بیمار پر جھک گئیں اور فرمایا، ابن زیاد، کونسا ستم تو نے ہم پر نہ توڑا، یہ بچہ، ہاتھ لگا کر دیکھ، رسیوں میں جکڑا ہوا، اب بھی بخار میں جھلس رہا ہے، میں اس کو نہیں چھوڑوں گی، اگر تو اسے مارتا ہے تو مجھے بھی مار ڈال۔"

ابن زیاد پر جناب زینب کے ان الفاظ کا اثر ہوا اور اس نے عابد بیمار کے قتل کو اشارہ سے روک دیا۔

عبیداللہ ابن زیاد کے دربار کا یہ ایک واقعہ مورخین نے اور لکھا ہے۔

عبیداللہ ابن زیاد کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی جب امام حسین علیہ السلام کا سر طشت میں لا کر اس کے سامنے رکھا گیا تو اس نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے دانتوں کو اپنی چھڑی سے چھیڑنا شروع کیا، مشہور صحابی حضرت زید بن ارقم اس وقت وہاں موجود تھے انھوں نے ابن زیاد سے کہا "حسین (علیہ السلام) کے دانتوں سے چھڑی ہٹا لے قسم ہے خدائے واحد کی، میں نے ان ہونٹوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بوسے دیتے ہوئے دیکھا ہے۔"

(جناب رازق الخیری صاحب) بشکریہ حسینی آواز

> بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند
> فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر
>
> پیر رومؒ
>
> در دشت جنونِ من جبریل زبوں صیدے
> یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ
>
> مرشد اقبالؒ

بیگم صالحہ عابد حسین

گاہے گاہے باز خواں

قوموں کا ایک کیریکٹر ہوتا ہے، اشخاص کا کیریکٹر ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض شہروں اور بستیوں کا بھی ایک خاص کیریکٹر ہوتا ہے۔ قوموں اور انسانوں کی طرح وہ بھی موت و زیست سے دوچار ہوتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ان کا کیریکٹر صدیوں میں بنتا ہے اور ان کی عمر سینکڑوں اور بعض اوقات ہزاروں سال کی ہوتی ہے۔

میرا محبوب وطن

پانی پت میرا وطن! زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا۔ کہ میرے نطق نے بوسے مری زبان کے لئے ایک ایسی ہی بستی تھی۔ آپ نے بہت سے شہروں اور بستیوں کی کہانیاں دوسروں کی زبان سے سنی ہوں گی۔ آج پانی پت کی کہانی خود اس کی زبان سے سنیے! اس شہر کے ماضی پر فخر کیجیے پھر اس کے انجام پر آنسوؤں کی چند بوندیں مہیا کر کے خراج عقیدت کے موتی نذر کر دیجیے!

"آپ نے میرا نام ضرور سنا ہوگا۔ پانی پت میں کوئی بہت بڑی یا دولت مند بستی نہیں لیکن دیس کی تاریخ میں میری ایک خاص حیثیت رہی ہے۔ تاریخ کے صفحات اور ادب کی دنیا میں میرا نام آج بھی زندہ ہے۔ آپ دہلی سے شمال کی جانب انبالے کی طرف چلیں تو باون میل پر میں آپ کا استقبال کروں گا۔ یوں کہوں کہ کرتا ۔ کہ اب ہیں وہ . . . پانی پت کہاں ہوں جو فخر سے سر اونچا کر کے اپنے مہمانوں کا خیر مقدم کیا کرتا تھا۔ مگر ٹھہریے۔ ابھی تو میں اپنے "حال" میں کھویا ہوا ہوں اور اسی زبان میں بات کروں گا!

آج سے ہزاروں سال پہلے ہندوستان کی قدیم تاریخ کی سب سے بڑی سب سے اہم لڑائی کو میں نے ان آنکھوں سے دیکھا تھا۔ حق و باطل میں ہونے والی وہ پرانی جنگ جسے مہابھارت کے نام سے پکارا جاتا ہے جس میں حق پرست پانڈوؤں نے فتح پائی اور باطل نے منہ کی کھائی۔ پھر کئی اور تاریخی لڑائیاں میرے میدانوں میں لڑی گئیں۔ کہ ہندوستان کی راجدھانی دلی کی حفاظت کے لئے سورما ہمیشہ میرا دامن تھامتے اور یہیں سینہ سپر ہوتے تھے۔ بابر اور ابراہیم لودھی کی لڑائی پانی پت کی پہلی لڑائی کہلاتی ہے پھر ہندوستان کے عاشق اکبر اور ہیمو بقال کی جنگ۔ احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کی جنگ۔ مگر چھوڑیے ان قصے کو اس کا ذکر اور تفصیل تو آپ تاریخ میں پڑھتے اور سنتے ہی رہتے ہیں!

ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ میں کوئی بڑی، حسین یا دولت مند بستی نہیں تھا۔ میری آبادی چالیس پینتالیس ہزار سے زیادہ مگر میری ایک خصوصیت ایسی تھی جس پر مجھے بجا طور پر فخر ہے۔ آپ نے کپڑے کے ایسے تھان دیکھے ہوں گے جس میں تانا اور بانا مختلف رنگوں کا ہوتا ہے اور اسی رنگا رنگی سے کپڑے کی خوبصورتی بڑھ جاتی ہے۔ میرا حال ایسا ہی رہا ہے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے تانے بانے سے میری ذات نے اپنی قبائے صنعت تیار کی تھی۔ ہندو تو ہزاروں برس سے میرے ہاں رہتے آئے تھے۔ لیکن آٹھ نو سو برس پہلے مسلمانوں نے بھی آ کر میری گود میں پناہ لی مجھے اپنا وطن بنایا اور میرے ہو رہے۔ یا آج سے کوئی ہزار برس پہلے۔ چند مسلمان عالموں کا گروہ میرے ہاں آیا اور یہاں ڈیرے ڈال دیا مگر قریب کے ایک چھوٹے سے راجا نے ان کا رہنا پسند نہ کیا۔ مختصر سی لڑائی ہوئی۔ بہت سے بے گناہ مارے گئے۔ مگر ان عالموں کی اولاد یہاں سے گئی نہیں۔ یہیں رس بس گئی۔ ان میں اکثر بزرگوں کے مزار آج تک زیارت گاہیں ہیں!

اور پھر کوئی آٹھ سو برس ہوتے ہیں جب ہرات سے ایک عالم اور قابل آدمی ہندوستان آیا۔ خواجہ ملک علی۔ اس کی بادشاہ وقت نے بڑی عزت کی۔ میرے ہاں بسنے کی اجازت دی اور معافی پر زمین دی کہ وہ اور اس کا خاندان یہاں رہ کر پھلے پھولے میں نے دیکھا وہ بہت شریف بڑا بے ضرر آدمی ہے۔ میں نے اپنی گود اس کے لئے وا کر دی اور اس نے اور اس کی اولاد نے اس احسان کو اس قدر مانا کہ ہمیشہ میرا نام دیس میں اونچا کرتے رہے۔ آج بھی مجھے اس خاندان پر فخر ہے۔ اور میرے یہ بچے جہاں بھی ہوں۔ انھیں بھی مجھ سے محبت ہے، فخر ہے آپ جانتے ہیں محبت نے دیواروں اور بندھنوں سے کبھی ہار نہیں مانی!

میرے ہاں ہندوؤں اور مسلمانوں اور سبھی قوموں کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے۔ مدت سے میری آبادی میں تین چوتھائی مسلمان اور ایک چوتھائی ہندو تھے جو آپس میں سلوک اور محبت سے رہتے جو ایک دوسرے کو اپنا بھائی جانتے تھے ان میں جھڑپیں ضرور ہوتی تھیں، جھگڑے بھی چھوٹے موٹے ہو جاتے تھے مگر لڑائیاں، جنگیں نہیں۔ ان میں آپس میں مذہب یا معاشرت کی بنا پر نفرت نہیں تھی۔ ۱۸۵۷ء کے پر آشوب زمانے میں۔ یعنی پہلی جنگ آزادی کے وقت جب دلی بدیشی سامراجیوں کے ہاتھوں لٹی، اور تباہ ہوئی اس وقت دلی کے خانہ برباد لوگوں کے لئے میں نے اپنی گود وا کر دی۔ افسران اور مخبروں نے لاکھ کوشش کی کہ وہ میرے ان پناہ گزینوں کا پتہ چلائیں مگر میرے بہادر، رحم دل اور مہمان نواز سپوتوں کی وجہ سے وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ کیسے ہوا؟ اس طرح شہر والوں میں اس وقت باہمی اتحاد تھا اور وہ اپنے بھائی بہنوں کی مصیبت کو اپنی

ہی مصیبت سمجھتے تھے اس خطرناک زمانے میں بھی میں محفوظ سا رہا۔ افواہیں اڑائیں کہ پانی پت کو توپ سے اڑا دیا جائے گا۔ ایک ایک آدمی کو چن چن کر سولی پر چڑھا دیں گے۔ مگر یہ وقت بھی گزر گیا، خدا خدا کرکے دلی اور اس کے آس پاس کچھ امن ہوا۔ اور میرا ضمیر مطمئن تھا کہ میں نے قدیم ہندوستانی شرافت اور عرب کی مہمان نوازی کی روایتوں کو قائم رکھا۔ دلّی سے لٹے ان لوگوں میں سے کچھ تو میرے اتنے گرویدہ ہوئے کہ ہمیشہ کے لئے میرے ہو گئے۔

اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ پہلی جنگ آزادی (جس کو انگریز غدر کہتا تھا) اور آزادی کے درمیان کے نوّے سال میں ہندوستان اور اس کے سپوتوں پہ کیا کیا گزر گئی۔ کچھ عرصے پہلے ملک پر فالج کی سی کیفیت رہی۔ بدیسی سامراج نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی پر عمل کیا۔ بھائیوں میں نفاق ڈالا اور نفرت کے بیج بوئے۔ ہندوستان میں جگہ جگہ جھگڑے ہوتے۔ مندر اور مسجد پر محرّم اور دسہرے پر گائے اور پیپل پر باجے اور اذان پر۔ نام خدا اور مذہب کا اور کام شیطان کا۔ میرے ہاں بھی کوشش کی گئی۔ کبھی کبھی فسادیوں کو تھوڑی بہت کامیابی ہو جاتی لیکن میرے محبِ وطن اور خود میرے عاشق بچوں کی بدولت نفرت کا پودا پروان نہ چڑھ سکا۔ میری دونوں آنکھیں ہندو اور مسلمان میل ملاپ شانتی اور امن سے اپنی اس چھوٹی سی بستی میں اپنے چھوٹے مگر حقیقت میں کتنے بڑے بڑے کام کرتے رہے۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میرا دلی سے بڑا پرانا تعلق رہا ہے۔ دلی کا لباس، دلی کی خوراک، دلی کا رہن سہن، دلی کی زبان، دلی کی تہذیب کا میرے ہاں بہت اثر تھا۔ میرا دل دلی سے ملا ہوا تھا۔ میری آنکھ دلی سے لڑی تھی۔ کہنے والے کہتے پانی پت دلی کا ایک محلہ ہے مگر یہ بات نہ تھی۔ اسی اشتراک کے باوجود مجھ میں اور دلی میں بڑا فرق تھا۔ میری بولی کی زبان میں وہ لوچ اور نفاست نہ تھی جو اہلِ زبان کی خصوصیت سمجھی جاتی تھی۔ دلی کی بناوٹ، دلی کے تکلف، وہاں کی تہذیب کی چمک دمک، دلی کی شان و شوکت سے میں محروم تھا۔ میرے ہاں کے لوگ کہتے تھے۔ محفوظ تھا۔ اس کی جگہ میرے ہاں سادگی، خلوص، صاف گوئی اور صاف دلی تھی۔ ایک چھوٹے سے قصبے میں دلی کی چہل پہل، دلّی کا عیش و عشرت، دلّی کی آرائش و زیبائش، دلّی کی تفریحات کہاں۔؟ دلّی کی جامع مسجد، موتی مسجد، ہمایوں کا مقبرہ، پرانا قلعہ اور چاندنی چوک کہاں سے آتا۔؟ مگر میں پرانی تہذیب و تمدن کی دولت سے محروم نہ تھا۔ میرے ہاں بھی ایسے مقامات تھے جو ہندوستان بھر کے لئے زیارت گاہ تھے۔ پرانے زمانے کی خوبصورت جامع مسجد، قلندر صاحب کا مزار، کئی خوبصورت مندر، کچھ امام باڑے اور عبادت گاہیں جن میں خلوص اور عقیدت کا رنگ زیادہ جھلکتا تھا۔ بس ایسی ہی چند چیزیں تھیں۔ جو میرے بال بچوں کے ذہنی عقائد اور روایتوں کے احترام کی یادگاریں بھی تھیں اور باہر کے لوگوں کیلئے باعث کشش بھی تھیں۔ انگریزی تعلیم کا میرے ہاں زیادہ رجحان نہ تھا۔ ہاں مذہبی تعلیم عام تھی۔ میرے ہاں کے حافظ قرآن ساری دنیا میں شہرت پاتے تھے۔ فارسی اور عربی کے کئی بڑے بڑے عالم میرے ہاں ہوئے ہیں۔ جب انگریزی تعلیم کا چرچا ہوا افسوس میٹرک تک اسکول قائم ہو سکا۔ البتہ میرے بعض سپوتوں نے پانی پت سے باہر جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کی، نام پیدا کیا۔ مگر یہ تو میں بہت آگے نکل آیا۔ میں کہہ رہا تھا کہ مجھ میں کمزوریاں بھی تھیں اور خوبیاں بھی۔ میرے ہاں خاندانوں کے افراد تسبیح کے دانوں کی طرح الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک تھے۔ خاندان کا مفہوم چند رشتے داروں تک محدود نہ تھا۔ بلکہ دور دور کے عزیز اور برادری والے اس میں شامل تھے جو ایک دوسرے کے دکھ اور سکھ کے ساتھی تھے۔ ایک کی عزت سب کی عزت، ایک کا بھرم سب کا بھرم تھا۔ ایک طرف غریبوں کی غیرت قابل قدر تھی تو دوسری طرف حیثیت والوں کا خاموشی اور انکسار کے ساتھ ان کی مدد کرنے کا جذبہ۔ آج کے دور میں تو یہ خوبیاں مٹتی جا رہی ہیں۔ پیشوں کی تقسیم میرے ہاں بھی تھی۔ لوگ بغیر جانے بوجھے سوچے سمجھے پیشہ ور لوگوں کو کمین کہتے۔ نائی، دھوبی، سقے، مہتر۔ یہ لوگ لگان چند پیسوں اور اناج کے چند دانوں کے عوض سال بھر اپنے ججمانوں کی خدمت کرتے۔ ججمان سماجی حیثیت سے ان سے اپنے کو برتر مانتے ان سے خوب کام لیتے۔ اور برا بھلا کہتے ڈانٹتے پھٹکارنے کا حق بھی رکھتے تھے۔ بے شک یہ برائیاں تھیں مگر اس وقت یہ سماجی بھید بھاؤ سارے دیس میں تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان "کمینوں" اور "ججمانوں" میں ایک وحدت تھی، یک جہتی کا احساس تھا۔ اُنس تھا۔ تقریبوں اور خاص خاص موقعوں پر اپنے ان خدمت کرنے والوں کو حیثیت سے بڑھ کر دیا جاتا تھا، جس سے سال بھر کی کسر نکل جاتی۔ بیماری، پریشانی شادی اور غمی میں دونوں ایک دوسرے کے شریک ہوتے۔ خلوص اور محبت کے ساتھ۔ "کمین" ججمانوں کے برابر نہ بیٹھ سکتے مگر ان سے باتیں تقریباً برابری اور بے تکلفی سے ہوتیں۔ یہ میں نہیں کہتا کہ ان میں وہ برابری اور مساوات تھی جس کی تعلیم مثلاً گاندھی جی نے دی ہے یا جو اسلام کا طرۂ امتیاز تھی لیکن اس کے باوجود ان میں وہ خلوص اور اپنائیت تھی جو اب دیکھنے کو نہیں ملتی۔ ارے یہ تو میں اپنے عیب گنانے لگا۔ مگر خوبیوں اور کمزوریوں سے مل کر تو کیریکٹر کی تشکیل ہوتی ہے نا۔

میرے ہاں بھی ساس بہو، نند بھاوج، میاں بیوی میں لڑائیاں ہوتی تھیں۔ بہن بھائیوں اور ماں باپ اور اولاد کے خیالات میں اختلاف بھی پیدا ہوتے۔ اختلاف اور شرکت سے تو زندگی میں رنگ آتا ہے۔ لیکن ان کے اختلاف میں نہ نفرت کا زہر تھا نہ انتقام کا جذبہ۔ بزرگوں کی بات اور خیالات کا پاس تھا اور انھیں نوکروں کے جذبات کا خیال رہتا تھا، پھر دکھ، غم مصیبت، اور خوشی پر سب ایک ہو جاتے، جیسے کبھی جدا ہی نہ ہوئے تھے۔ ہاں ان کے خیالات میں وسعت نہ تھی مگر گہرائی تھی۔ ایک مشترک انسانیت کا احساس تھا، کمزور اور غریب کی امداد اور حفاظت کا جذبہ تھا جمعیت کا وہ جذبہ تھا جو فرد کی تنہائی اور بے بسی سے نکال کر (جس کا آج ہر جگہ رونا رویا جا رہا ہے) جماعت کی قوت اور اعتماد کا شریک بنا رہتا ہے۔

مجھے سب سے زیادہ فخر اس بات پر ہے کہ میرے ہاں پڑوسیوں کے تعلقات قابل رشک ہوتے تھے۔ دو ہم مذہب ہوں یا دو مذہبوں سے تعلق رکھتے ہوں، امیر ہوں یا غریب ہوں، پڑھے لکھے اور عزت و شہرت کے مالک ہوں، یا جاہل، غریب اور گمنام ہوں۔ ہر وقت کے میل جول آنے جانے لین دین نے ان تعلقات میں پائیداری اور گہرائی پیدا کر دی تھی۔ — حق ہمسایہ ماں کا جایا اور اپنے دور پڑوسی نیڑے — میرے ہاں کہاوت نہیں حقیقت تھی۔ جیسا میں نے کہا کبھی کبھی یہ لوگ جھگڑ بھی پڑتے ہندو مسلمان سنی شیعہ لوگوں میں فسادی عناصر کشیدگی اور بدگمانی پیدا کرا دیتے۔

مگر یہ کہاں نہیں ہوتا۔ لیکن مجموعی طور پر وہ سب ایک دوسرے کے دوست تھے۔ ایک دوسرے کے تہواروں میں شرکت کرتے تقریبوں میں حصہ لیتے غم میں ساتھ دیتے۔ دنیا کے کسی گوشے میں ملیں میرے بچے اپنے ہم وطن سے یوں لپٹ جاتے جیسے سگے بھائی ہوں اور کیوں نہ ہوتا؟ وہ میری اولاد تو تھے، ان کا رہن سہن ان کا کھانا پہننا، ان کی زبان اور لباس۔ ان کی بھلائیاں اور برائیاں بس ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھیں۔ وہ اپنے اپنے مذہب کے پکے ہوتے ہوئے بھی دوسروں سے محبت کرتے تھے۔ جو انسانیت کی نسل سے بڑی ہے۔!

میرے بچوں کو مجھ سے بے حد محبت تھی۔ وہ کسی جگہ ہوتے کہیں رہتے میرے پاس آنے کو بے چین رہتے تھے۔ بیٹیاں میکے آنے کا بہانہ ڈھونڈھتی تھیں۔ میرے بیٹے وطن دوڑ دوڑ کر آتے، دسہرے پر، محرم پر، عیدین میں، شادیوں پر، غمی میں۔ پانی پت آتے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہنستے بولتے، روتے دھوتے اور ایک نئی زندگی کی لہر رگوں میں دوڑتی محسوس کرتے۔ وہ مجھ پر فخر کرتے تھے۔ میں ان سے پیار کرتا تھا۔ مگر میرے کچھ ایسے سپوت بھی ہیں جن پر صرف میں ہی نہیں سارا ہندوستان فخر کر سکتا تھا۔ اور کرتا رہے گا۔ قدرشناسوں نے میرے ایسے ہی سپوتوں کے لئے کہا تھا پانی پت جواہر کا گلستہ۔ آیئے ان میں سے دو چار سے آپ کو بھی ملاؤں۔

آپ نے بو علی شاہ قلندر کا نام تو ضرور سنا ہے۔؟ وہ آج سے کوئی آٹھ سو برس پہلے گزرا ہے لوگ اسے مجذوب سمجھتے تھے مگر کیسی مجذوبیت جس پر ہزار عقل و دانش نثار نام کے مذہبی پیشواؤں نے ظاہر کو دیکھ کر قتل کا فتویٰ دے دیا لیکن عالم جذب میں اس کے کشف و کرامات دیکھا تو دم بخود رہ گیا اور اس کی ولایت کو تسلیم کرنا پڑا اور صدیوں سے اس بزرگ درویش قلندر منش کا مزار سارے ہندوستان کے لئے زیارت گاہ ہے۔ خوش عقیدہ لوگ یہاں آکر اپنی حاجتیں مانگتے ہیں اسی امید کے ساتھ کہ خدا والوں کے ذریعے خدا تک رسائی ہوگی آج بھی جب کہ سب کچھ ختم ہو چکا اس سچے درویش کے مزار پر عقیدت اور محبت سے لوگ سر جھکانے آتے ہیں اور اس کا عرس خاص دھوم سے منایا جاتا ہے۔ اور میرا ایک اور سپوت جس نے اپنی ادبی کرامت سے ایک سوتی ہوئی قوم کو جگایا اس کی نبض میں تازہ خون دوڑایا کون ہے جو الطاف حسین حالی کو نہ جانتا ہوگا۔ کون پڑھا لکھا ہے جو اس کی عظمت کے ساتھ ساتھ اس کی ادبی قابلیت اور علمی اور قومی خدمات کا معترف نہ ہوگا۔ اردو شاعری میں تجدد کا امام تنقید کا موجد، سیرت نگاری کا ماہر بیوہ کی مناجات کا خالق شہرہ آفاق ادیب اور مصنف اردو کا سب سے پہلا سب سے بڑا ترقی پسند شاعر۔ حالی جس نے میرا نام سارے دیس بلکہ ساری دنیا میں روشن کیا۔ وہ جدید تعلیم کا حامی بھی تھا اور عورتوں کے حقوق کا علم بردار اور ان کے احساس و جذبات کا مفسر بھی۔ اس کی سیرت بلند شخصیت پر وقار اور کیریکٹر بے داغ تھا۔ اس کے دل میں قوم اور ملک کی انسانیت کی سچی محبت تھی۔

پھر اسی حالی کے خاندان سے اور تربیت سے نوجوان ابھرے جنھوں نے اپنی اپنی لائن میں نام عزت اور شہرت پائی۔ تصدق حسین نے انصاف کی کرسی کو زینت دی غلام الحسنین مذہبی عالم سچے مدرس، اعلیٰ پایہ کے مصنف اور مترجم کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ ایسا مخلص درویش منش انسان جس کے طالب علم خواہ ہندو ہوں یا مسلمان اس سے گہری عقیدت رکھتے تھے ایسا روشن خیال عالم جس نے مذہب کی سچی روح کو سمجھا اور نئی تہذیب میں بھٹکنے والے ذہنوں کی رہنمائی کا فرض ادا کیا۔

اور حالی کا بیٹا۔ سجاد حسین آپ نے اس کا نام بھی شاید سنا ہو۔ علی گڑھ کالج کا پہلا گریجویٹ یونین کا پہلا صدر کرکٹ کا پہلا کپتان۔ اس میں مغربی اور مشرقی تہذیب کی خوبیاں بڑے حسن کے ساتھ جمع ہو گئی تھیں۔ اس نے ساٹھ سال تک ملک اور قوم کی بڑی خاموشی کے ساتھ خدمت کی۔ پنجاب اور صوبہ سرحد میں تعلیم پھیلانے کا مشکل کام بڑی خوبی سے انجام دیا اور آخری عمر کے تیس سال سے خود اپنے وطن میں رہ کر میرے بچوں میرے باشندوں کی تعلیمی اور اخلاقی حالت سنبھالنے میں تن من دھن سب لگا دیا۔ حالی مسلم ہائی اسکول اور حالی گرلز اسکول اس کی علمی جہاد کے کارنامے تھے وہ شہر کی بڑی محبوب بڑی محترم ہستی تھا۔ ہندو مسلمان امیر غریب، دوست دشمن سب پرانے سب اُسے چاہتے تھے وہ سب کو چاہتا تھا سب کے کام آتا تھا۔

میرا ایک ہونہار سپوت غلام الثقلین تھا۔ کتنی مختصر تھی اس کی زندگی مگر کتنی بامقصد بھرپور۔ چالیس سال کی عمر جب لوگ زندگی میں کچھ کرنے اور بننے کے قابل ہوتے ہیں اس نے وہ سب کر ڈالا جس پر آج بھی لوگ حیرت کرتے ہیں۔ اسکول اور کالج میں اس کی علمی قابلیت، ذہانت، اس کی بے مثال تقریری صلاحیت کی دھوم تھی تو تعلیم سے فراغت کے بعد اس کی سیاسی سوجھ بوجھ علمی اور ادبی کارناموں، قومی خدمت کا سکہ بیٹھ چکا تھا اور وہ اس نوجوانی ہی میں مرکزی حکومت کی لیجسلیٹو کانسل کا ممبر بنایا گیا جس کے لئے بڑے بڑے لوگ عمر بھر جد و جہد کرتے رہتے تھے کئی مفید قانون اسی نے پاس کرائے سب سے بڑا کارنامہ اس کا یہ ہوتا کہ وہ سود کی لعنت کو جو اس وقت قوم کو تباہ کر رہی تھی ختم کرانا چاہتا تھا مگر بے وقت کی موت نے اس کا یہ خواب پورا نہ ہونے دیا۔ قوم کی خدمت میں اس نے اپنے کو اس طرح کھپا دیا کہ صحت تج دی اور جوانی میں خدا کو پیارا ہو گیا۔

اور میرا وہ سپوت جس نے پانی پت کے نام کو چار چاند لگائے جو مجھ سے دور رہ کر بھی میرا رہا۔ جس پر میں کیا ہندوستان بھر فخر کرتا ہے۔ اسی غلام الثقلین کا بیٹا مشہور ماہر تعلیم غلام السیدین تھا جس نے باپ سے بھی زیادہ نام اور شہرت پائی۔ اس کی غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کی دھاک جو حالی مسلم اسکول سے شروع ہوئی تھی پھر پھیلتی گئی بڑھتی گئی اور لگ بھگ ساری دنیا میں پہنچ گئی۔ وہ اردو اور انگریزی کا صاحب طرز ادیب تعلیمی کتابوں کا مشہور اور مقبول مصنف دنیا کا مانا ہوا ماہر تعلیم تو تھا ہی ساتھ ہی بڑی حسین، بڑی دلکش، بڑی محبوب شخصیت کا مالک بھی تھا جو ایک نظر اسے دیکھتا ایک بار ملتا اس کا گرویدہ ہو جاتا مغربی اور مشرقی تعلیم اور اسلامی اور ہندوستانی تہذیب و سنسکرتی کا وہ ایک ایسا سندر سنگم تھا۔ جو پہلے بھی بہت کم یاب تھے۔ اب تو شاید نایاب ہی ہو گئے ہیں مجھے اس پر ناز ہے اور رہے گا۔

اور میرا ایک اور سپوت اشانتی سروپ بھٹناگر جس کی ننھیال میرے ہاں تھی۔ وہ مشہور سائنس داں جس نے اس میدان میں بڑی شہرت پائی اور دیش بندھو گپتا، قوم کا خادم، کامیاب سیاست داں اور مشہور صحافی۔ اور صوفی اقبال، مولوی ثناء اللہ اور حافظ فیاض جنھوں نے قومی تحریک کے دھارے کا ساتھ دیا، ملک کی آزادی کے لئے قربانیاں کیں جیلوں میں گئے۔ دکھاتا ہے یہ سب میرے سپوت ہیں جن پر مجھے کل بھی فخر تھا آج بھی فخر ہے۔!

مگر۔ ٹھہرئے آپ یہ نہ سمجھئے کہ مجھے صرف اپنے مشہور اور نام آور سپوتوں ہی پر فخر ہے۔ نہیں میرے ہاں ایسے غیر معروف اور گمنام لوگ بھی کم نہ تھے جنھوں نے شرافت محبت خدمت کا چراغ زندگی بھر اپنے لہو سے روشن رکھا اور نام نمود اور شہرت کی تمنا کے بغیر انسان کی، انسانوں کی بالواسطہ ملک اور قوم کی خدمت کا کام کرتے رہے قوموں کی تعمیر اور انسانیت کی تشکیل میں ان گمنام تعمیری کام کرنے والوں کا حصہ سب سے زیادہ اہم اور قابل قدر ہوتا ہے۔

ان میں میرے ہاں کی عورتیں، میری بیٹیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں بالکل ان پڑھ بھی تھیں اور معمولی پڑھی لکھی بھی تھیں (مغربی تعلیم سے بہرہ ور ہزاروں میں دو چار ہی ہوتی ہوں گی) آپ ان عورتوں کو جانتے تو شاید سمجھ سکتے کہ میرے ہاں ایسے ایسے سپوت کیسے پیدا ہوئے یہی مائیں تھیں جنھوں نے مجھے ایسے بیٹے دیئے۔ یہ اسکولوں اور کالجوں میں نہ پڑھی تھیں یہی چھوٹی سی بستی ان کی دنیا تھی مگر اس کے باوجود ان کی نظر میں وسعت، دل میں درد، اور گہرائی اخلاص اور خدمت کا جذبہ رچا بسا تھا وہ ہندوستان کی پرانی تہذیب اپنے اپنے مذہب کی امین تھیں۔ ان کے دل میں خدا کا خوف بھی تھا اور اس کے بندوں کے ساتھ محبت بھی۔ فرض شناس ماں، وفادار بیگم جانثار بہن اور سعادت مند بیٹی کے روپ میں عورت کا یہ جلوہ اور کہاں کہاں ہے میں نہیں جانتا مگر میری بیشتر بیٹیاں اس کا حسین نمونہ تھیں وہ کفایت شعار، صفائی پسند فیاض، درد مند، حساس تھیں۔ اخلاق کی اعلیٰ قدروں کو سینے سے لگائے وہ زندگی کا بڑے سے بڑا دکھ خندہ پیشانی سے سہار لیتیں اور اپنے غم دوسروں کے سکھوں میں ڈبو دیتی تھیں لیکن اپنے حقوق کی پروا نہ تھی فرض کو ادا کرنے کی دھن ضرور رہتی تھی۔ ہاں ان میں کمزوریاں بھی تھیں۔ انہیں سے بعض قدامت پرست تھیں رسم و رواج کی بندشوں میں جکڑی تھیں۔ رواجی چیزوں سے انھیں زیادہ پیار تھا۔ مگر یہ سطحی کمزوریاں تھیں۔ ان کی روح کا دل اور ذہن آزاد تھا۔ انھیں ماؤں نے اولاد کی سیرت کی تشکیل کی اقبال نے کہا ہے نا۔ سیرت فرزند ہا از امہات۔ جوہر صدق و صفا از امہات۔ ایسی مائیں اور بہنیں تھیں جن کی بدولت میرے ہاں ایسے ایسے سپوتوں نے جنم لیا۔

اب آیئے اپنے ہاں کی رنگا رنگ زندگی کے کچھ مناظر بھی دکھاؤں۔ کس قدر محبوب تھے مجھے یہ دلکش مناظر!

یہ میرے ہاں کا محرم ہے۔ جو سنی اور شیعہ ہی نہیں ہندو مسلمان مل کر مناتے تھے سنیوں کے ہاں سے بہت سے تعزیئے اٹھتے جن میں کم حیثیت عقیدت مند زیادہ تھے اور امیر کبیر کم۔ سب اہل پیشہ اور حرفے والوں کا الگ الگ تعزیہ ہوتا جو عشرے کے دن دھوم دھام سے اٹھایا جاتا۔ شربت اور ٹھنڈے پانی کی سبیلیں لگتیں اس طرح محرم کی سات کو مہندیاں اٹھاتی اور امام باڑوں میں چڑھائی جاتیں منتیں مانگی جاتیں۔ چھلے چوڑیاں اور کڑے امام کے نام پر سنی ہی نہیں بہت سے ہندو بھی اپنے بچوں کی صحت یا سلامتی کے لئے پہناتے تھے۔ آٹھویں کو کتنے ہی بچے امام حسین کے بھائی عباس بن علی کے نام سقے بنتے پانی اور شربت کی سبیلیں رکھی جاتیں جو ہندو بھی رکھتے تھے۔ پہلی محرم سے ۱۲ محرم تک میرے ہاں وہ چہل پہل وہ رونق وہ گہما گہمی رہتی جو سال بھر میں کبھی نہ ہوتی۔ محرم کی چاند سے شہر کے بڑے چھوٹے، زنانے مردانے امام باڑوں میں جن میں غریبوں اور معمولی حیثیت کے شیعہ گھرانوں کی تعداد زیادہ تھی مجلسیں برپا ہوتیں۔ علم نصب ہوتے عزاخانے سجائے جاتے۔ لیکن ایسے گھرانے بھی تھے جہاں نمود و نمائش کم ہوتی اور خلوص و عقیدت زیادہ۔ جہاں حسین کا سچا غم منایا جاتا آنے والوں کو وہ کسی عمر کسی طبقے کسی مذہب کے ہوں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا اور سینکڑوں بچوں عورتوں اور لوگوں کو تبرک تقسیم کر کے جب نڈھال ہو جاتے تو طمانیت کا احساس جاگ اٹھتا۔ یوں بھی میرے ہاں محرم میں نمائش اور ظاہر داری کم تھی اور اخلاقی قدروں کی تبلیغ اور روحانی تربیت کا جذبہ غالب تھا۔ بڑے شہر والوں کے لئے اس میں شاید کشش نہ ہو مگر میں جانتا ہوں میرے بچے۔ آج دنیا کے کسی گوشے میں ہوں اپنے پانی پت کے محرم کو نہیں بھولے ہوں گے۔ کیوں۔ دیکھئے۔ محرم کی دس تاریخ ہے صبح چار بجے سے شہر بھر کے لئے لوگ ایک بہت بڑے مگر پرانے اور شکستہ گھر کی طرف جاتے ہیں کبھی اس گھر کے مالکوں کا شمار شہر کے رئیسوں میں ہوتا تھا۔ آج وہ بہت غریب ہیں مگر خاندانی روایات اور وضع داری کا یہ کرشمہ ہے کہ صدیوں سے شیعوں کا ایک تعزیہ صرف اسی گھر سے اٹھتا ہے۔ آج بھی اٹھے گا بڑے سے بڑے آدمی کی مجال نہیں کہ وہ اس کے مقابلے میں اپنے گھر سے تعزیہ اٹھا سکے۔ ہزاروں ماتم دار اور اچھے سے اچھے پڑھنے والے موجود ہیں مگر تعزیہ کے ساتھ بوڑھا ماما خانہ اپنی پوپلی مگر پر درد آواز میں نوحہ پڑھ رہا ہے لاشہ کے ... یا تو کہتی ہوئی آئی۔ اے دانے حسینا! اور لوگوں کی آنکھوں سے گنگا جمنا بہہ رہی ہے۔ چھتیں اور گلیاں ہر طبقے اور مذہب کی عورتوں سے پٹے پڑے ہیں اور تعزیہ کے ساتھ بھی سبھی لوگ ہیں۔ کبھی کبھی مجمع ٹھہر جاتا ہے۔ اور میرا کوئی عالم فاضل کوئی مقرر، واعظ بیٹا فصاحت و بلاغت کے ساتھ حسینؑ اور ان کی قربانیوں کی داستان مختصر اور پر اثر لفظوں میں سناتا ہے۔ اور پھر ماتم کے ساتھ تعزیہ بڑھتا ہے یہاں تک کہ دس بجے کربلا میں لے جا کر اسے دفن کر دیتے ہیں۔

یہ ایک اور منظر دیکھئے۔ یہ گھر شہر کے میراثیوں کا ہے۔ میراثی جو اس وقت گانے بجانے کے پیشے کی وجہ سے تحقیر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ مگر سال بھر ان کی عورتیں چرخہ کات کر اتنا پیسہ جمع کر لیتی ہیں کہ سات محرم کو ان کے ہاں سے حضرت عباس کا علم اٹھ سکے۔ اور شہر بھر کے معززین جو آج کے دن ان کے ہاں آنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے نذر کا شربت پلا سکیں اور پھر یہ سب لوگ میراثیوں کے اس علم کو ان کی گلی سے بڑے امام باڑے تک ماتم کرتے، نوحے پڑھتے لے کر جائیں گے اور جدھر جدھر سے یہ جلوس گزرتے میرے ہزاروں بیٹے اور بیٹیاں اور بچے اس کی زیارت کے لئے رات گئے تک کھڑے

رہتے ہیں۔

یہ امام کے تیجے کے دن کی ایک مردانی مجلس ہے۔ اس کی دو خصوصیتیں ہیں۔ ٹھیک وقت پر صبح آٹھ بجے شروع ہو جاتی ہے شہر کے ہندو مسلمان آٹھ سات سو کے لگ بھگ اس میں شریک ہوتے ہیں اور میرے بہترین مقرر اور سپوت اسی میں تقریر کرتے ہیں اور دو گھنٹے تک لوگ مسحور ہو کر اس تقریر کو سنتے ہیں اور آخر میں شیرینی کی پیالیاں تقسیم ہوتی ہیں۔!

کہاں سے لاؤں اتنا وقت۔ اور وہ دل جو اپنے محرم کی خصوصیات آپ کو سناؤں

اور یہ ہے میرے ہاں کا دسہرہ۔!

دس دن تک میرے ہندو بیٹے بیٹیاں اس تہوار کا جشن مناتے ہیں۔ گھروں میں سفیدی ہوتی ہے۔ بچوں کے نئے کپڑے بنتے ہیں عورتوں کے لئے نئی ساڑھیاں آتی ہیں مٹھائیاں اور پکوان بازار سے کم آتے ہیں گھروں میں زیادہ بنتے ہیں۔ وہ دیکھو۔ بڑے بازار میں سے دسہرے کا جلوس گزر رہا ہے سجی ہوئی گاڑی پر رام لچھمن اور سیتا جی کی مورتیاں ہیں جیسے اب منھ سے بولیں کہ اب بولیں۔ ہزاروں عورتیں چھم چھم کرتی گاتی بجاتی، مرد ہنستے خوش ہوتے بچے اچھلتے کودتے جلوس کے ساتھ ساتھ ہیں دونوں طرف دوکانوں پر اور چھتوں پر دوسرے مذہب والے جلوس دیکھنے کے لئے جمع ہیں۔ ان میں وہ عورتیں نہیں جن کے ہاں پردے کی قید زیادہ ہے مگر غریب اور اہل پیشہ طبقے کی عورتوں کی کمی نہیں۔

اب ذرا پنکھے کے تہوار کی بھی ایک جھلک دیکھتے چلئے یہ سقوں کا تہوار ہے غریبوں کا۔ اہل پیشہ کا۔ ایک بڑے سے پنکھے کو بنی رنگین کاغذ، موتیوں اور لچکے وغیرہ سے آراستہ کر کے جلوس نکالا جاتا ہے۔ بستی سے تین میل دور بڑے امام صاحب کے مزار پر لے جا کر اسے چڑھایا جائے گا۔ جشن منانے کا کیا خوب طریقہ ہے اظہار عقیدت بھی اور تفریح بھی۔ مجمع کے بیچ میں نوجوان سقے لکڑی چلانے اور پٹہ بازی وغیرہ کے کرامت بھی دکھائے جا رہے ہیں۔ جلوس میں ہزاروں لوگ ہیں، تماشائی بھی کم نہیں۔ امیر غریب، ہندو مسلمان عورت مرد آخر انھیں چیزوں سے تو جماعت کی رکنیت کا احساس پکا ہوتا ہے نا۔!

یہ ایک نرالا جشن بھی دیکھتے چلئے۔ اب تو یہ جشن بڑے شہروں میں عام ہو گیا ہے۔ جو میری تاریخ میں ایک ہی بار منایا گیا سنتا ہوں۔ ۱۹۳۷ء کا زمانہ ہے۔ یہ حالی مسلم ہائی اسکول ہے حالی کی تعلیمی یادگار۔ آج اس کے چاروں طرف خیموں کا ایک جنگل اگ آیا ہے دس بارہ ہزار آدمیوں کا ایک شہر آباد ہے اور ہندوستان بھر سے راجہ، نواب شاعر ادیب عوام اور خواص یہاں جمع ہیں اسکول کے وسیع پنڈال میں جلسہ ہو رہا ہے۔ صدارت حمید اللہ خاں نواب بھوپال کر رہے ہیں۔ ان کے داہنی طرف ہندوستان کا مایہ ناز شاعر اقبال جلوہ گر ہے۔ سامنے کی صف میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور دلی کے اور بہت سے عالم فاضل ادیب شاعر اور قومی خادم بیٹھے ہیں۔ میرے کان میں حفیظ جالندھری کی آواز اپنا رس ٹپکاتی ہے

شان زندگی پاتا ہوں پانی پت کی راہوں میں

یہ منزلِ منزلِ مقصود ہے میری نگاہوں میں

یہاں نقش قدم موجود ہیں ان کار دانوں میں

زمین پر جن کے آگے سر جھکے تھے آسمانوں کے

اسی باعث ملا اس سرزمیں کو رتبہ عالی

کہ اس بستی کی خاک پاک سے پیدا ہوا حالی

وہ حالی ہاں وہی سرسید مرحوم کا بازو

وہ امت کی سپر وہ ملتِ مرحوم کا بازو

دلوں کو دردِ حب قوم سے آگاہ فرما کر

وہ حالی آج محو خواب ہے اسی خاک کے نیچے

پھر ڈاکٹر اقبال کی فارسی نظم پڑھی جاتی ہے تو ہزاروں لوگ جھوم اٹھتے ہیں وہ شعر آپ بھی سنئے

طواف مرقدِ حالی سزد ارباب معنیٰ را
نوائے او بجانہا افگند شورے کہ من دانم

بہانا فقر و شاہی در حضور او بہم سازم
تو بر خاکش گہر افشاں و من برگ گل افشانم

وہ سب باتیں اب خواب و خیال ہو چکیں۔ مگر ۱۹۴۷ء کے فسادات اور ملک کی تقسیم سے میرے سر پر سے قیامت گزر گئی میری تین چوتھائی مسلمان آبادی لٹ پٹ کر پاکستان جا بسی گنتی کے میرے چند جو اپنے وطن سے بے انتہا محبت رکھتے تھے۔ ہندوستان کے دوسرے شہروں میں جا بسے، میرے قدیم ہندو باشندے باہر سے آئے لاکھوں اجنبیوں میں غائب سے ہو گئے ان کا رہن سہن، تہذیب، ان کی زندگی اجنبیت میں کھو گئی۔ نئے آنے والوں نے میرا کیریکٹر بدل دیا، میرے پرانے محلّے نئی بستیوں میں دب سے گئے ہیں میری قصباتی تہذیب، صنعتی شہر میں دم توڑ چکی ہے، میں اب علم و تہذیب کا وہ مرکز نہیں جس نے "جواہر اگلے تھے"۔ اتحاد، اتفاق، یک جہتی، محبت اور خلوص جو میرے بچوں کی خصوصیات تھیں انھیں اب کہاں ڈھونڈوں۔؟ بے شک میری آبادی بڑھ گئی ہے میں دولت مند ہو گیا مگر میں وہ نہیں رہا جو تھا۔

آیئے۔ دیکھئے۔ یہ ہزار سالہ مسلمانوں کا وطن۔ بوعلی شاہ قلندر، مخدوم صاحب اور ملک علی کا وطن۔ یہ حالی و سجاد حسین کا وطن۔ یہ غلام الحسنین، غلام ثقلین کا وطن۔ یہ صوفی اقبال نعمان اللہ اور حافظ فیاض کا وطن۔ دیش بندھو گپتا، شانتی سروپ بھٹناگر کا وطن۔ یہ سیدین اور عباس کا وطن۔ آیئے اور حالی کی شکستہ قبر پر آنسو بہایئے سجاد حسین کے حالی مسلم اسکول کی مسخ شدہ صورت پر نالہ و شیون کیجئے۔ ٹوٹے پھوٹے امام باڑوں، ویران مسجدوں، شکستہ مزاروں، بنجر قبرستانوں کو دیکھئے اور عبرت حاصل کیجئے اب آپ کو وہ پانی پت کہیں نہ ملے گا جسے اپنی ہر چیز پر ناز تھا۔ اپنے دسہرے اور عرسوں پہ اپنے پنکھے کے تہوار اور ہولی پر، اپنے عیدوں اور اپنے محرم پر جیسے اپنے سپوتوں پر ناز تھا، اپنی خوددار، سلیقہ شعار، بلند سیرت عورتوں پر ناز تھا۔ اپنی امن پسندی اور شرافت پر، اور اپنی غریبی اور وضع داری، اور انسان دوستی پر ناز تھا۔ بتایئے اب میں کس چیز پر فخر کروں۔؟؟

(آل انڈیا ریڈیو سے ایک حصہ نشر ہوا)

بقیہ ۔ ایک روایت

۵۔ خشیتِ الٰہی اور تقویٰ و پرہیزگاری کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طور طریق کی پابندی کی جائے دینی معاملات میں نہ طریقۂ نبوی پر کوئی اضافہ کیا جائے نہ آپ کے طریقے سے انحراف کیا جائے ۔ طریقۂ نبوی پر اضافہ اور اس سے انحراف ایسا بدترین جرم ہے کہ اس جرم کے بعد مجرم ملت اسلامیہ سے خارج ہو جاتا ہے ۔ علاوہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کی اتباع چھوڑ کر کسی امتی کی تو در کنار کسی بڑے سے بڑے پیغمبر کی بھی اتباع کی جائے تو یہ اللہ و رسول کی سخت ناراضگی کا سبب ہے اور بدترین جرم ہے حضرت جابر کی یہ حدیث پڑھئے فرماتے ہیں " حضرت عمر ایک دن تورات کا کوئی ورق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے جس میں مندرج باتیں انھیں بڑی اچھی لگیں اور وہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پڑھنے لگے آپکا چہرہ ناگواری ناراضگی کی شدت سے بدلنے لگا حضرت ابوبکر آپ کی ناراضگی بھانپ گئے اور عمر کو اس طرف متوجہ کیا عمر نے آپ کو ناراض دیکھا تو گھبرا اٹھے اور بولے میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں اللہ اور اس کے رسول کی ناراضگی سے ہم اللہ کو رب مان کر اور اسلام کو اپنا دین تسلیم کر کے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول مان کر راضی ہیں (تورات پڑھنا ہماری کسی بے اطمینانی کا نتیجہ نہیں ہے) آپ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر صاحب تورات حضرت موسیٰ بھی نمودار ہو جائیں اور تم میری اتباع چھوڑ کر ان کی اتباع کرو تو تم سیدھے راستہ سے گمراہ قرار پاؤ گے ۔ میری نبوت کے بعد موسیٰ بھی زندہ ہو آئیں تو انھیں بھی میری ہی اتباع کرنی پڑے گی ۔ (سنن دارمی) گویا دینی معاملات میں تمام تر اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہونی چاہیئے نہ کسی اور پیر و پیمبر اور ولی و بزرگ کی ۔ نیز دینی کام وہی ہے جو کتاب و سنت سے ثابت ہو اور اسی قدر ہے جتنا ثابت ہو ۔ کوئی زائد کام جو صحیح طور پر کتاب و سنت سے ثابت نہ ہو وہ ہرگز دین کا کام نہیں اور اسے دینی کام سمجھنا اور اس پر عمل کرنے والا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیروکار نہیں ہے بلکہ اس کا پیروکار ہے جس نے اسے ایجاد کیا ہے ۔

٦۔ طریقۂ نبوی پر اکتفا نہ کرنا اور اس میں اضافہ کرنا خشیتِ الٰہی اور تقویٰ و پرہیزگاری نہیں ہے بلکہ یہ طریقۂ نبوی سے انحراف اور ملت اسلامیہ سے خروج ہے ۔

گویا وہ بہت سے کام جو دینی کام سمجھ کر کئے جاتے ہیں حالانکہ نہ اللہ و رسول نے اس کا حکم دیا ہے، نہ کتاب و سنت میں اس کا سراغ ملتا ہے وہ دین کے نہیں بلکہ سخت گناہ کے کام ہیں اور ان کاموں سے دور رہنا ضروری ہے نہ کہ ان کا کرنا ۔ امام مالک نے فرمایا ہے جس نے دین میں کسی نئی پیدا کی ہوئی بات کو دین کا اور نیکی کا کام سمجھا اس نے گویا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بدگمان کیا کہ آپ نے رسالت میں خیانت کیا ہے کہ یہ بعد دین کا ایک کام تھا اسے آپ نے چھپا لیا جس کا سراغ بعد میں لگا کیوں کہ دین تو آپ ہی پر مکمل ہوا ہے بعد کا یہ نکالا ہوا کام دین ہوگا تو اس کا وجود بھی آپ کے زمانہ میں ہونا چاہئے نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تو اس کا حکم دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (معاذ اللہ) اسے چھپا لیا ۔

اعتذار

ہمیں افسوس ہے کہ اوقاف میگزین کی موجودہ اشاعت بعض ناگزیر حالات کی بنا پر تاخیر سے شائع ہو رہی ہے ۔ جس کے لئے ہم اپنے قارئین کرام سے معذرت خواہ ہیں ۔

طباعت کے مراحل کی گرانی، اور کاغذ کی نایابی نے قریب قریب تمام اخبارات و رسائل کی حالت کو دگرگوں بنا دیا ہے ۔ اس کے باوجود بھی اخبار نویس، پریس والے تاجران کتب، ہاتھ پیر مار رہے ہیں کہ وہ اپنے اشاعتی سلسلوں کو قائم رکھیں ۔ انھوں نے اپنی قیمتیں بھی دوگنی کر دی ہیں ۔ لیکن اس پر بھی انھیں بے چینی ہے ۔ پریس والا اپنی سیاہی، اور دوسرے مصارف کا رونا روتا ہے ۔ کاتب حضرات مہنگائی کی دہائی پیٹ کر زیادہ اجرت مانگنے پر مجبور ہیں ۔ اور کاغذ کی نایابی نے ناک میں دم کر دیا ہے ۔ کاغذی منہ مانگے دام وصول کرتے ہیں اور ضرورت مند بلا چون و چرا کاغذ خرید رہے ہیں ۔

اوقاف میگزین چوں کہ کوئی تجارتی یا منافع بخش سودا نہیں ہے ۔ اس لئے اس امر کی کوشش کی جاتی ہے ۔ کہ کم لاگت پر قارئین کرام کو معیاری پرچہ پیش کیا جائے ۔ اور اس امر کے لئے ہم اپنے قارئین سے درخواست کریں گے ۔ کہ وہ اوقاف سہ ماہی کی امکانی مدد کریں ۔ اس کے لئے معیاری مضامین رپورٹ و اطلاعات بھیجیں، خریدار مہیا کریں، اور اشتہارات دیں ۔

ہمیں امید ہے کہ آپ کا بھرپور تعاون ہمیں حاصل رہے گا ۔

عبد الحمید رحمانی

تبصرہ

تاریخ میو چھتری

مصنفہ ۔ مولانا حکیم عبدالشکور مرحوم

صفحات ۔ ۶۵۰

کتابت طباعت اعلیٰ مجلد

قیمت ۲۲ روپے

شائع کردہ ۔ چودھری محمد یسین میو ہائی سکول نوح ۔ ضلع گوڑگانوہ

میو قوم ہندوستان کی ایک عظیم مسلم قوم ہے ۔ جو علاقہ میوات میں رہتی ہے میو کی مناسبت سے اس علاقہ کو میوات کہا جاتا ہے ۔ جو دہلی سے شروع ہو کر ہریانہ راجپوتانہ اور یوپی کے ضلع متھرا تک جاتا ہے ۔

میو قوم کی بہادری اور وطن پرستی ضرب المثل ہے ۔ ہندوستان کے دوسرے باشندے انھیں اوصاف کے ساتھ اس قوم کو جانتے ہیں ۔ زیر نظر کتاب دراصل میو قوم کی مکمل تاریخ ہے جس میں اس کے حسب و نسب پر بحث کرنیکے علاوہ عہد اسلامی سے لیکر ۱۹۴۷ء تک کے سیاسی، سماجی، حالات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے ۔ کتاب کے مصنف اس وقت دنیا میں موجود نہیں ہیں لیکن مرحوم کی محنت شاقہ یقیناً قابل داد ہے ۔

کتاب کی ترتیب پر طویل عرصہ صرف ہوا ہے ۔ جو اس کی محنت پر دلالت کرتا ہے ۔ شروع میں تاریخ قدیم کا موضوع بے حد دلچسپ ہے ۔ جس میں آرین نسلوں کے حالات کے علاوہ وحدت نسل پر زور دیا گیا ہے ۔ برہماجی اور حضرت ابراہیم کی شخصیت پر ایک تفصیلی بحث کتاب میں درج ہے ۔

میو قوم کی اصل و نسل کے سلسلے میں بہت سے کرسی نامے اور بنساولیاں کتاب میں شریک کی گئی ہیں ۔ جو اس زمانہ میں یقیناً نایاب ہیں ۔

میو قوم کی معرکہ آرائیاں، میوؤں کا قبول اسلام اس کتاب کے اہم موضوع ہیں ۔ جن میں بے شمار تاریخی حوالے مختلف تاریخی کتابوں سے نقل کئے گئے ہیں ۔

میو قوم کے بارہ پال اور باون گوتوں کا ذکر بھی تفصیل سے کیا گیا ہے ۔ بیرون میوات کے میوؤں کا تذکرہ بھی اچھے انداز میں آیا ہے ۔

کتاب کا ایک اہم موضوع ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی" میں میو قوم کی مردانہ وار شمولیت ہے اس مضمون کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے، کہ میو قوم کس قدر حریت پسند اور محب الوطن ہے ۔ اس مضمون میں غدر ۱۸۵۷ء کے زمانے کی بعض تحریرات و رپورٹیں بھی شامل کی گئی ہیں جن سے یہ مضمون بے حد جاندار بن گیا ہے ۔

۱۹۴۷ء کے روح فرسا حالات و تبادلہ آبادی کے واقعات بھی کتاب میں لکھے گئے ہیں، جن سے ان قومی مشکلات کا خوب اندازہ ہوتا ہے ۔ جو میو قوم کو اس دوران میں پیش آئی تھیں ۔ میو قوم کا تعلق تبلیغی جماعت سے بہت گہرا ہے ۔ اس مناسبت سے حضرت مولانا شاہ محمد الیاسؒ کا تذکرہ بھی کتاب میں کیا گیا ہے جس میں میوات میں سلسلہ تبلیغ کی شروعات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے ۔

الور و بھرت پور تحریکات کو ذکر بھی خوب ہے ۔

الحاصل یہ کتاب ہندوستان کی ایک ممتاز ترین قوم کی تاریخ ہے ۔ جو ہر اہل علم اور شائق تاریخ کو مطالعہ کرنی چاہئے ۔

کتاب کی کتابت طباعت عمدہ ہے ۔ تاہم سہو و کتابت کی غلطیاں بھی موجود ہیں جو آئندہ ایڈیشن میں دور کی جا سکتی ہیں ۔

سنٹرل وقف کونسل کیجانب سے طلبہ کیلئے وظائف

نئی دہلی سنٹرل وقف کونسل نے گذشتہ سالوں کی طرح امسال بھی میڈیکل کالج اور انجینئرنگ کے طلباء کو ساٹھ روپے ماہانہ کے حساب سے ایک سال کے لئے وظیفہ دینے کا فیصلہ کیا ہے درخواست دہندہ تفصیلی قواعد اور فارم کے لئے سکریٹری سنٹرل وقف کونسل سی ۔ ۱ ۔ نظام الدین (ویسٹ) نئی دہلی ۱۳ کو اپنا پورا پتہ لکھا اور ٹکٹ لگا کر لفافہ ارسال فرمائیں ۔ درخواست موصول ہونیکی آخری تاریخ ۳۱ اگست ۷۴ء ہے

ٹکٹ لگا ہوا لفافہ وصول نہ ہونیکی صورت میں فارم و قواعد نہیں بھیجے جائیں گے ۔

ہماری زبان سے

دارالمصنفین کو بچائیے

معارف (مئی ۱۹۷۴ء) کے اداریہ سے معلوم ہوا کہ دارالمصنفین کا پریس سخت مالی بحران کا شکار ہے ۔ کاغذ کی گرانی کی وجہ سے پریس میں کام بالکل نہیں ہے ۔ ادارے کے متعدد اہم کتابیں ختم ہو چکی ہیں ۔ کئی نئی کتابوں کے مسودے تیار ہیں ۔ لیکن کاغذ کی نایابی اور گرانی کی وجہ سے ادارہ یہ کتابیں شائع کرنے سے معذور ہے ۔

گویا وہ وقت آچکا ہے جب کسی بھی دن یہ انتہائی افسوسناک خبر ملے کہ "پریس بند ہو گیا" بظاہر کسی پریس کا بند ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں ۔ ہندوستان میں روز سیکڑوں پریس لگتے ہیں ۔ اور سیکڑوں بند ہوتے ہیں لیکن شبلی کا قائم کیا ہوا یہ پریس ان سیکڑوں پریسوں میں سے ایک نہیں ہے اس کی تاریخی حیثیت ہے ۔ دارالمصنفین اور اس کا پریس ہماری تہذیبی زندگی کا ایک انتہائی اہم سنگ میل ہے ۔ اس ادارے نے اسلام پر جتنا اہم کام کیا وہ اس موضوع پر کام کرنے والے دنیا میں کسی بھی ادارے سے کم نہیں ہے ۔ اور ہندوستان و پاکستان میں تو اس کا نام سرفہرست آتا ہے ۔

کیا پوری قوم میں ایک بھی ایسا انسان نہیں ہے جو اس اہم ادارے کو بحران سے نکال لے ۔ سال ڈیڑھ سال کی بات ہے کہ توحید کے ایک فرزند نے بمبئی کے ایک ہوٹل میں اپنی بچی کی سالگرہ کی ۔ تین دن تک تمام ہوٹل مہمانوں کے لئے ریزرو رہا ۔ پانی کی طرح شراب بہائی گئی ۔ اور ان تین دنوں کی مہمان نوازی کا خرچ سات لاکھ روپیہ تھا ۔ اس طرح کی نمود و نمائش کرنے والے حضرات کی ایک نگاہِ کرم اس عظیم ادارے کو موت کے منہ سے نکال سکتی ہے سوال کروڑ دو کروڑ کا نہیں صرف تین لاکھ روپے کا ہے یہ ادارہ اگرچہ اسلام پر کتابیں چھاپتا رہا ہے لیکن اس نے اسلام کا سائنٹفک مطالعہ کیا ہے فرقہ وارانہ نہیں اس لئے اس کی حیثیت تاج محل کی ہے ۔ جس کا بنانے والا ایک مسلمان تھا جس پر اسلامی فن تعمیر کی گہری چھاپ ہے لیکن جو ہر ہندوستانی کے لئے قابل فخر ہے ۔ اگر آج ہمیں یہ خبر ملے کہ خدانخواستہ تاج محل منہدم ہو رہا ہے تو کیا ہم اس خبر کو اسی بے حسی سے سنیں گے ۔؟ کیا اس خیال سے تڑپ نہیں جائیں گے کہ ہم ایک عظیم اور قابل فخر ورثے سے محروم ہو رہے ہیں ۔؟ اگر بہت جلد کوئی صاحبِ خیر اس ادارے کی مالی مدد کا بیڑا نہ اٹھائے تو پھر ہم اس مشورے کی تائید کریں گے جو ہفتہ وار "سب ساتھ" کے اداریہ میں دیا گیا ہے یعنی اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ اس طرف خصوصی توجہ دیں ۔ اس ادارے کی نہ صرف مالی مدد کریں بلکہ اردو میں چھپنے والے سرکاری لٹریچر کا کام بھی اس پریس کو دیں ۔ اسی طرح مرکزی حکومت بھی اس ادارے کی فوری مدد کرے ۔ اور وزارت تعلیم ادارے کی کتابوں کے لئے خاص کوٹہ مقرر کرے ۔

ہریانہ میں اُردو کے لئے مطالبہ

جناب اوم پرکاش ملک ایم اے ایل ایل بی، وحکیم اجمل خاں سیکرٹری انجمن ترقی اردو ہند ہریانہ نے سرکار سے مطالبہ کیا ہے۔ کہ ہریانہ سرکار سکولوں میں اردو کی تعلیم کا فی الفور انتظام کرے۔ خاص طور پر گوڑگانوہ وانبالہ کے اضلاع کے سکولوں میں اردو کی تعلیم کے لئے زبردست مانگ کی جارہی ہے۔ ان اضلاع میں ضلعی سطح پر اردو کے لئے علیحدہ افسران تعینات کئے جانے چاہئیں۔ انھوں نے یہ مطالبہ بھی کیا ہے۔ کہ ہریانہ میں سرکاری سطح پر ایک اردو بورڈ یا اردو اکیڈمی قائم کی جائے۔ تاکہ وہ اردو کی ترقی وترویج کے کاموں کا جائزہ لے ۔ اور اردو ادیب مصنفین، اور ہمدردان کی حوصلہ افزائی کرسکے۔ انھوں نے اس بات کی شکایت کی۔ کہ کمشنر برائے اقلیتی لسانیات نے ہریانہ میں اردو کے موقف کو نظرانداز کیا ہوا ہے۔ اور نمائندگان اردو تنظیم ہائے کو سننے کا موقعہ فراہم نہیں کیا۔

مقالہ نگار حضرات سے گذارش

"اوقاف" میگزین ایک اسلامی ملی میگزین ہے۔ جس کے لئے معیاری علمی مقالات درکار ہیں۔ مقالہ ومضامین نگار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ اپنی تخلیقات اوقاف کو بھیجیں اور حسب ذیل امور کا لحاظ رکھیں۔

۱۔ مضامین یا نظم علمی، تاریخی، اصلاحی، ادبی ہونے چاہئیں۔ اختلافی مضامین سے احتراز کیا جائے۔

۲۔ اوقاف کے انتظام اور ان کے استعمال سے متعلق مضامین، اطلاعات، پالیسی اور پروگرام خاص طور پر شریک اشاعت ہوں گی۔

۳۔ مضامین صاف اور کاغذ کے ایک طرف لکھے ہوئے ہوں۔

۴۔ جو مضامین اوقاف کے معیار کے مطابق نہیں ہوں گے، شریک اشاعت نہیں کئے جائیں گے۔

۵۔ مختلف وقف بورڈوں، سنٹرل وقف کونسل اور اسلامی تقریبات سے متعلق تصاویر بھی شائع کی جائیں گی۔ ان تصاویر کے ساتھ مختصر رپورٹ آنی ضروری ہے۔

(ادارہ)

پنجاب وقف بورڈ کی جانب سے

۱۹۷۳،۷۴ء میں تقسیم کئے گئے وظائف

درجات	تعداد	کل رقم
۱۔ اردو دینیات، حفظ، تجوید، مولویت	۲۳۵	۱۸۲۲۵ — ..
۲۔ پری یونیورسٹی	۱۴۶	۱۴۹۴۰ — ..
۳۔ بی، اے	۹۸	۱۳۲۳۰ — ..
بی اے (وقف)	۱۸۵	۲۴۹۸۵ — ..
۴۔ ایل ایل بی	۱۸	۴۰۵۰ — ..
۵۔ ایم اے	۳۶	۸۱۰۰ — ..
۶۔ جے بی ٹی	۷	۶۳۰ — ..
۷۔ ایم بی بی ایس	۷	۳۱۵۰ — ..
۸۔ یونانی	۱۴	۳۱۵۰ — ..
۹۔ انجینئرنگ	۲	۹۰۰ — ..
۱۰۔ پالی ٹیکنک	۲	۳۶۰ — ..
۱۱۔ آئی۔ٹی آئی	۷	۶۳۰ — ..
۱۲۔ چارٹرڈ اکاونٹنٹ	۲	۴۵۰ — ..
۱۳۔ متفرق وظائف	تقریباً ۲۵	۷۰۰۰ — ..

سکریٹری

قرآن کریم کا گورمکھی ترجمہ

پنجاب وقف بورڈ نے فیصلہ کیا ہے کہ قرآن کریم کا پنجابی ترجمہ گورمکھی رسم الخط میں شائع کیا جائے۔

چنانچہ بورڈ نے اس کے لئے ضروری اقدامات شروع کردیئے ہیں۔ خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس نیک کام کی تکمیل کرائے۔

دیوان "بقیہ نقیہ"

حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی سات سالہ یادگار ہندوستان میں قومی سطح پر منائی جارہی ہے جس کے لئے مختلف پروگرام سامنے آچکے ہیں۔ اس مبارک موقعہ پر پنجاب وقف بورڈ نے مشہور دیوان "بقیہ نقیہ" کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ انشاء اللہ شائقین و معتقدین اس سے فیض حاصل کریں گے۔

عربی طلبہ کے وظائف

درجہ عربی کے طلبہ کے وظائف کی منظوری ہوچکی ہے اور ان کی ترسیل شروع کردی گئی ہے۔ وظیفہ کی رقومات مدارس کے پتہ پر ناظمین و صدر مدرسین کی معرفت بذریعہ منی آرڈر بھیجی جائیں گی۔ امید ہے کہ وظائف رمضان کی تعطیلاً سے قبل پہونچ جائیں گی۔

عرس سراپا قدس

حضرت امام ناصرؒ کا عرس سراپا قدس درگاہ امام ناصر جالندھر میں مورخہ ۳،۲ ستمبر ۱۹۷۴ء کو منعقد ہو رہا ہے۔

معتقدین سے شرکت کی پرخلوص درخواست ہے۔

سکریٹری پنجاب وقف بورڈ انبالہ

مراسلات

رسالہ خاتونِ مشرق اردو بازار دہلی ۶

مکرمی جناب حکیم صاحب

السلام علیکم۔

تازہ جاری شدہ رسالہ اوقاف پہنچا شکر گذار ہوں کس قدر عمدہ پاکیزہ معیاری رسالہ آپ نے جاری کر کے ہم ایسے قدیم تجربہ کار۔ نام نہاد صحافیوں کو ایک طرف کر دیا ہے۔ کتنے اچھے اور اعلے مضامین آپ نے اس میں جمع کر دیئے ہیں کہ اُن کی خوبی کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ حسین کتابت۔ سفید بڑھیا کاغذ اس میں استعمال کر کے آپ نے صحافی حسن پرستی کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔

مولانا آزاد مرحوم کا فوٹو تو ایسا عجیب دلفریب آپ نے شائع کیا ہے دل چاہتا ہے کہ اس کو ہر وقت دیکھتے رہیں۔ میری ناقص رائے یہ ہے۔ کہ اس کو ماہنامہ شائع کیا جائے۔ اس قدر لاگت میں جو آپ نے صرف کی ہے۔ ماہوار جاری ہو سکتا ہے۔ میری خواہش اور آرزو یہ ہے کہ رسالہ اوقاف زندہ رہے اور جاری بھی۔

نیازمند

عبداللہ فاروقی

مکتبہ تجلّی دیوبند

محترمی سلام مسنون۔!

سہ ماہی اوقاف کا پہلا ایشوع ملا شکریہ۔ مجموعی اعتبار سے خوب ہے۔ امید ہے خوب سے خوب تر ہوتا جائے گا۔ ناچیز کی دعائیں اور نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔

آپکا مخلص

طاہر عثمانی

ماہنامہ زیور پٹنہ

محترمی سلام مسنون

آپ کا عنایت نامہ اور اوقاف کا پہلا شمارہ ملا۔ یاد آوری کا بہت بہت شکریہ۔

آپ نے اوقاف کا اجرا کر کے یقیناً ایک مستحسن قدم اٹھایا ہے۔ ہندوستان بھر میں مسلم اوقاف ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ یہ ملک کے طول و عرض میں بکھرے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کا اب تک باقاعدہ رسالہ شائع نہیں ہو سکا آپ نے یہ قدر مندانہ قدم اٹھایا ہے۔

خدا کرے آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں۔ پرچہ بے حد پسند آیا۔ زیور کے تبادلہ کے لئے پتہ درج کر لیا گیا ہے۔ رسالہ پابندی سے مرسل ہوتا رہے گا۔

امید ہے مزاج عالی بعافیت ہوگا۔

والسلام

احسان احمد

سجادہ نشین سید محمد امین الحیات رہائش گاہ چاندنی محل

مکرمی مدیر صاحب

اسلام علیکم

اوقاف سہ ماہی نظر سے گذرا۔ اللہ رب العزت آپ حضرات کو جزا خیر عطا فرمائے۔ پتہ اُردو میں میگزین روانہ فرمایئے گا۔

ننگ اسلاف

سید محمد امین الحیات

کتبہ عبدالقیوم خاں

Punjab Wakf Board's Publication

The AUKAF Quarterly

50. Sardar Patel Marg, AMBALA Cantt
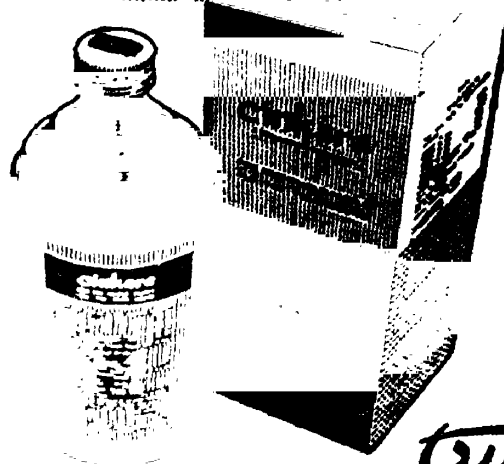
سہ ماہی

فضیلت مآب فخر الہند جناب فخر الدین علی احمد صدر جمہوریۂ ہند

یکے از مطبوعات پنجاب وقف بورڈ

سہ ماہی

مجلس ادارت

مدیر

حکیم احمد خان

جلد ــــ ۲	اکتوبر - دسمبر ــــ ۱۹۷۴ء	شمارہ ــــ ۴

اشتراکات

زر سالانہ ــــــــــــ ۱۰ روپے

فی کاپی ــــــــــــ ۲ روپیہ ۵۰ پیسے

سکریٹری پنجاب وقف بورڈ (میگزین) ۵۰- سردار پٹیل مارگ انبالہ کینٹ

محتویات

پرنٹر پبلشر ایڈیٹر حکیم اجمل خاں ۔ پروپرائٹر پنجاب وقف بورڈ ۔ مطبوعہ کوہ نور پریس دہلی مقام اشاعت ۵ سردار پٹیل مارگ سے انبالہ کینٹ سے شائع کیا

رفیق احمد سلفی

> اے لوگو جو ایمان لائے ہو نہ داخل ہو اپنے گھروں کے علاوہ دوسرے گھروں میں جب تک کہ گھر والوں کی اجازت نہ لے لو اور اُن پر سلام نہ بھیج لو یہ تمہارے لئے بہتر ہے توقع ہے کہ تم نصیحت حاصل کرو گے۔!!!
>
> (النور)

اس آیت سے قبل سورت کا جو حصّہ گذر چکا ہے اس میں زنا، اخلاقی اور تہمت کی زبردست مذمّت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ معاشرہ میں اس قسم کی برائیاں رونما ہو جائیں تو ان پر قابو پانے کے لئے تدابیر عمل میں لانی چاہئیں اس آیت اور اس کے مابعد آیتوں میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ ان عوامل و محرکات کو کس طرح ختم کیا جائے جو معاشرہ اس قسم کی گھناؤنی اخلاقی برائیوں کے نفوذ کا سبب بنتے ہیں۔

یہاں خطاب اسلامی معاشرہ کے افراد سے ہے اہل عرب کا یہ طریقہ تھا وہ ایک دوسرے کے گھروں میں بلا تکلف داخل ہو جایا کرتے تھے اور بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ گھر والوں اور ان کی عورتوں پر نادیدنی کی حالت میں ان کی نگاہیں پڑ جاتی تھیں یہ بات اسلامی اصول معاشرت کے بالکلیہ منافی تھی اس لئے مسلمانوں کو یہ معاشرتی اصول بتایا جا رہا ہے کہ تم اپنے گھروں کے علاوہ دوسروں کے گھروں میں بغیر گھر والوں کی رضامندی کے نہ داخل ہوا کرو۔

بیوتاً کا لفظ عام ہے خالی مکان ہو یا اس میں اہل خانہ کی رہائش کا انتظام ہو دونوں قسم کے مکان اس کے مفہوم میں داخل ہیں خالی مکان میں چوری وغیرہ کی بدگمانی کا اندیشہ ہے اور اگر گھر میں اہل خانہ موجود ہوں تو بہت سے فتنے رونما ہو سکتے ہیں گھر والوں پر اور ان کی عورتوں پر نادیدنی کی حالت میں نگاہیں پڑ سکتی ہیں اور ذہن میں غلط وسوسے قائم ہو سکتے ہیں۔

غیر بیوتکم کے مفہوم میں قریبی رشتہ داروں کے گھر بھی داخل ہیں یہاں تک کہ ماں اور بہنوں کی رہائش کی جگہیں بھی اس حکم میں شامل ہیں ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھا کہ کیا میں اپنی ماں کے پاس بھی جاتے وقت اجازت طلب کروں آپ نے فرمایا ہاں اس نے کہا میرے علاوہ ان کی خدمت کرنے والا کوئی نہیں ہے کیا ہر بار جب میں ان کے پاس جاؤں تو اجازت مانگوں آپ نے فرمایا کیا تو یہ پسند کرتا ہے کہ اپنی ماں کو ننگا دیکھے۔ آیت میں لفظ "تستانسوا" استعمال ہوا ہے استیناس اُنس سے ہے مطلب یہ ہے کہ تم اس وقت تک کسی کے گھر میں نہ داخل ہو جب تک تم ان سے انس نہ پیدا کر لو اور یہ معلوم نہ کر لو کہ تمہارا آنا گھر والوں کو ناگوار نہیں گذر رہا ہے۔

"استیناس" کی مختلف صورتیں ہیں باہر سے آواز دینا، دروازہ کھٹکھٹانا، سلام کہنا، حدیث میں ہے کہ تین مرتبہ سلام کہنا چاہئے اجازت لینے کا بھی اور بہتر طریقہ یہ ہے کہ وہ جب حضور کی خدمت میں حاضر ہونے کا عرض کرتے "السلام علیک یارسول اللہ ایدخل عمر" سلامتی ہو آپ پر اے اللہ کے رسول کیا عمر داخل ہو سکتا ہے

اجازت لیتے وقت دروازہ کے سامنے اس طرح نہیں کھڑا ہونا چاہئے کہ اندر نگاہ پڑے بلکہ دروازہ سے پرے ہٹ کر کھڑا ہونا چاہئے حضرت ہزیل بن شرحبیل کی روایت ہے کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عین دروازہ کے سامنے کھڑے ہو کر اجازت مانگنے لگا آپ نے فرمایا دروازہ سے الگ ہٹ کر کھڑے ہو کیوں کہ اجازت اسی لئے لی جاتی ہے کہ نگاہ نہ پڑے۔

✦ ✦ ✦

محتویات

پرنٹر پبلشر ایڈیٹر حکیم اجمل خاں نے پروپرائٹر پنجاب وقف بورڈ مطبوعہ کوہ نور پریس دہلی مقام اشاعت سے سوداگراں مارگ سے اپنا کریشٹ سے شائع کیا

رفیق احمد سلفی

> اے لوگو جو ایمان لائے ہو نہ داخل ہو اپنے گھروں کے علاوہ دوسرے گھروں میں جب تک کہ گھر والوں کی اجازت نہ لے لو اور اُن پر سلام نہ بھیج لو یہ تمہارے لئے بہتر ہے توقع ہے کہ تم نصیحت حاصل کرو گے۔!!
>
> (النور)

اس آیت سے قبل سورت کا جو حصّہ گذر چکا ہے اس میں زنا، بداخلاقی اور تہمت کی زبردست مذمت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اگر معاشرہ میں اس قسم کی برائیاں رونما ہو جائیں تو ان پر قابو پانے کے لئے کیا تدابیر عمل میں لانی چاہئیں اس آیت اور اس کے مابعد آیتوں میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ ان عوامل و محرکات کو کس طرح ختم کیا جائے جو معاشرہ اس قسم کی گھناؤنی اخلاقی برائیوں کے نفوذ کا سبب بنتے ہیں۔

یہاں خطاب اسلامی معاشرہ کے افراد سے ہے اہلِ عرب کا یہ طریقہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کے گھروں میں بلا تکلف داخل ہو جایا کرتے تھے اور بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ گھر والوں اور ان کی عورتوں پر نادیدنی کی حالت میں ان کی نگاہیں پڑ جاتی تھیں یہ بات اسلامی اصول معاشرت کے بالکلیہ منافی تھی اس لئے مسلمانوں کو یہ معاشرتی اصول بتایا جا رہا ہے کہ تم اپنے گھروں کے علاوہ دوسروں کے گھروں میں بغیر گھر والوں کی رضامندی کے نہ داخل ہوا کرو۔

بیوتا کا لفظ عام ہے خالی مکان ہو یا اس میں اہلِ خانہ کی رہائش کا انتظام ہو دونوں قسم کے مکان اس کے مفہوم میں داخل ہیں خالی مکان میں چوری وغیرہ کی بدگمانی کا اندیشہ ہے اور اگر گھر میں اہلِ خانہ موجود ہوں تو مزید فتنے رونما ہو سکتے ہیں گھر والوں پر اور ان کی عورتوں پر نادیدنی کی حالت میں نگاہیں پڑ سکتی ہیں اور ذہن میں غلط وسوسے قائم ہو سکتے ہیں۔

غیر بیوتکم کے مفہوم میں قریب رشتہ داروں کے گھر بھی داخل ہیں یہاں تک کہ ماں اور بہنوں کی رہائش کی جگہیں بھی اس حکم میں شامل ہیں ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھا کیا میں اپنی ماں کے پاس بھی جاتے وقت اجازت طلب کروں آپ نے فرمایا ہاں اس نے کہا میرے علاوہ ان کی خدمت کرنے والا کوئی نہیں ہے کیا ہر بار جب میں ان کے پاس جاؤں تو اجازت مانگوں آپ نے فرمایا کیا تو یہ پسند کرتا ہے کہ اپنی ماں کو ننگا دیکھے۔ آیت میں لفظ "تستانسوا" استعمال ہوا ہے استیناس اُنس سے ہے مطلب یہ ہے کہ تم اس وقت تک کسی کے گھر میں نہ داخل ہو جب تک تم ان سے اُنس نہ پیدا کر لو اور یہ معلوم نہ کر لو کہ تمہارا آنا گھر والوں کو ناگوار نہیں گذر رہا ہے۔

"استیناس" کی مختلف صورتیں ہیں باہر سے آواز دینا، دروازہ کھٹکھٹانا، سلام کہنا، حدیث میں ہے کہ تین مرتبہ سلام کہنا چاہئے اجازت لینے کا بھی اور بہتر طریقہ یہ ہے کہ وہ جب حضور کی خدمت میں حاضر ہوتے تو عرض کرتے "السلام علیک یارسول اللہ ایدخل عمر" سلامتی ہو آپ پر اے اللہ کے رسول کیا عمر داخل ہو سکتا ہے

اجازت لیتے وقت دروازہ کے سامنے اس طرح نہیں کھڑا ہونا چاہئے کہ اندر نگاہ پڑے بلکہ دروازہ سے پرے ہٹ کر کھڑا ہونا چاہئے حضرت ہزیل بن شرحبیل کی روایت ہے کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عین دروازہ کے سامنے کھڑے ہو کر اجازت مانگنے لگا آپ نے فرمایا دروازہ سے الگ ہٹ کر کھڑے ہو کیونکہ اجازت اسی لئے لی جاتی ہے کہ نگاہ نہ پڑے۔

✦ ✦ ✦

رفیق احمد سلفی

ایک روایت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس پر لازم ہے کہ اچھی بات کہے ورنہ خاموش رہے اور اپنے پڑوسی اور مہمان کی تکریم و تواضع کرے۔ (بخاری مسلم)

مندرجہ بالا روایت بڑی زبردست اہمیت کی حامل روایت ہے بعضوں نے اس روایت کے مضامین کو نصف اسلامی احکام پر مشتمل بتایا ہے کیونکہ احکام اسلامی کا تعلق یا تو حقوق اللہ سے ہوا کرتا ہے یا حقوق العباد سے اور اس روایت میں مکمل طور پر حقوق العباد کا ذکر کیا گیا ہے امام ابو محمد بن ابی زید نے جو اپنے عہد میں فقہ مالکی کے ایک جلیل القدر امام تھے جملہ اسلامی آداب کو چار حدیثوں سے متفرع بتایا ہے اور اس روایت کو بھی انھیں چار حدیثوں میں شمار کیا ہے جن سے جملہ اسلامی آداب ماخوذ ہیں یہ روایت چند اہم اسلامی آداب پر مشتمل ہے اور ان آداب کا ذکر ایمان کی علامت اور نشانی کے طور پر کیا گیا ہے۔

ہر مسلمان پر لازم ہے کہ جب وہ کسی بات کے کہنے کا ارادہ کرے تو پہلے اس کے سارے پہلوؤں پر اچھی طرح غور کر لے اگر اس بات کے کہنے میں کوئی بھلائی اور خیر محسوس کرتا ہے اور کسی فساد اور بگاڑ کا اندیشہ نہیں ہے تو کہے ورنہ بہتر ہے کہ خاموش رہے اسود بن اصرم المحاربی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول آپ مجھے کوئی نصیحت فرما دیجئے آپ نے ان سے دریافت کیا کہ کیا تم اپنی زبان کے مالک ہو۔ جواباً انھوں نے عرض کیا کہ اگر ہم اپنی زبان کے مالک نہ ہوں گے تو بھلا کس چیز کے مالک ہوں گے۔ پھر آپ نے پوچھا کیا تمہارے ہاتھ تمہارے اختیار میں ہیں۔؟ انھوں نے پھر وہی بات کہی کہ اگر ہمارے ہاتھ ہمارے اختیار میں نہ ہوں تو بھلا ہم کس چیز کے مختار ہوں گے۔ تب آپ نے فرمایا تم اپنی زبان سے صرف بھلی ہی بات کہو اور اپنے ہاتھ صرف بھلائی ہی کی طرف بڑھاؤ حضرت انس سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی بندے کا ایمان اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک اس کا دل نہ درست ہو اور دل اس وقت درست نہیں ہو سکتا جب تک اس کی زبان میں درستگی نہ آ جائے۔ حضرت عقبہ بن عامر فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول نجات کس چیز میں ہے آپ نے فرمایا اپنی زبان قابو میں رکھو خلاف شرع اور خلاف عقل باتیں کہنے سے احتراز کرو بلا ضرورت ادھر ادھر نہ پھرو اور اپنے گناہوں پر روتے رہو۔

پڑوسی کی عزت و تکریم اور اس کے ساتھ حسن سلوک کی اسلام میں زبردست تاکید آئی ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت جبرئیل مجھے برابر پڑوسی کے متعلق وصیت کرتے رہے یہاں تک مجھے ایسا محسوس ہوا کہیں ایسا نہ ہو پڑوسی کو وراثت میں حصہ دار قرار دے دیا جائے حضرت حسن بصری سے پوچھا گیا پڑوسی کی حد کیا ہے آپ نے فرمایا چالیس گھر آگے چالیس پیچھے چالیس دائیں چالیس بائیں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول میرے دو پڑوسی ہیں میں اپنا تحفہ اور ہدیہ کس کے یہاں بھیجوں آپ نے فرمایا اس پڑوسی کے یہاں جس کا دروازہ تمہارے دروازہ سے زیادہ قریب ہو۔

مہمانوں کی تکریم کو بھی اسلامی آداب میں زبردست اہمیت حاصل ہے تکریم سے مراد ان کی عزت و تواضع خاطر داری اور حسن ضیافت ہے صحیحین میں ابو شریح رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھا اور اپنے دونوں کانوں سے آپ کو یہ فرماتے سنا کہ جو شخص اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس پر مہمانوں کی تکریم و ضیافت اور اس کا جائزہ لازم ہے صحابہ کرام نے دریافت کیا کہ اللہ کے رسول مہمان کا جائزہ کیا ہے آپ نے فرمایا ایک دن اور ایک رات اور مہمان نوازی تین دن ہے اور اگر اس کے بعد بھی کوئی مہمان نوازی کرے تو وہ صدقہ ہے حضرت سلمان سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں مہمانوں کے لئے اس طرح کے تکلفات سے منع فرمایا ہے جو ہمارے اختیار میں نہ ہوں۔

جزئیات و تعبیرات میں اختلاف رائے اور سیاسی مصلحت پسندی، دینی فرقہ واریت کی بنیادی وجہ رہی ہے لیکن ایک اور بڑی وجہ جس کا احساس مسلم مفکرین اور دانشورانِ ملت کو ہمیشہ رہا ہے، وہ تھی منافقین و دشمنانِ اسلام کی ریشہ دوانیاں، اور اسلامی تعلیمات میں تحریف، تخفیف تشکک و ارتیاب کا سلسلہ۔

اِسلام کے خلاف یہ خطرناک سازش قرونِ اولیٰ ہی میں شروع ہو گئی تھی۔ اور اس وقت اس نے باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ جب مسلمانوں میں خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی تھی، اس وقت دینی و ملی شورائیت کا اسلامی تصور تو مجروح ہو گیا تھا۔ ائمہ عظام و محدثین کرام کی جماعت بے یار و مددگار تھی۔ پیشہ ور فقاہتوں اور تنخواہ دار مفتیوں کا زور تھا۔ یہ لوگ شریعت کے اصولوں، فرامین، اور فتاویٰ کی تعبیرات شاہانِ وقت کی مرضی کے مطابق کرنے لگے تھے۔ اور مخلص اور پابند شریعت بزرگ ائمہ کرام و محدثین کو ان کی حق گوئی اور اصول پرستی پر کڑی سزائیں دلواتے تھے۔

ایک طرف تو شریعت اسلامیہ کی تدوین میں بھاری مجرمانہ غفلت اور لاپرواہی کا ارتکاب خود شاہانِ اسلام کی طرف سے ہو رہا تھا۔ دوسری طرف یہودی و عیسائی علما جو اسلام اور مسلمانوں کی غیر معمولی ترقی و فتوحات کو دیکھ کر حسد کی آگ میں جل رہے تھے، غیر محسوس طریقے پر شریعت و ملت اسلامیہ کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔ اور برابر اسلامی اصولوں معتقدات و مسلمات کی بیخ کنی کر کے ان میں شکوک و شبہات کا بیج بو رہے تھے۔ ائمہ کرام و محدثین کو تدوین حدیث میں بھاری مشکلات درپیش تھیں۔ کیونکہ ضعیف و موضوع روایات کا ایک دفتر عظیم منافقین و دشمنانِ اسلام نے جمع کر دیا تھا۔

ہندوستان کے ممتاز مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب نے اپنی مشہور کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

> ایک طرف اسلام کے دینی افکار و اقدار کی تحقیر کا کام کیا۔ اور مسیحی مغرب کے افکار و اقدار کی عظمت ثابت کی اور اسلامی تعلیمات و اصول کی ایسی تشریح پیش کی۔ کہ اس سے اسلامی اقدار کی کمزوری ثابت ہو۔ اور ایک تعلیم یافتہ مسلمان کا رابطہ اسلام سے کمزور پڑ جاتے۔ اور وہ اسلام کے بارے میں متشکک ہو جاتے۔ کم از کم یہ سمجھنے پر مجبور ہو کہ اسلام موجودہ زندگی کے مزاج کے ساتھ ساز نہیں کرتا اور وہ اس زمانہ کی ضروریات و تقاضوں کو پورا کرنے سے عاجز ہے۔
>
> قرآن، سیرت نبوی، فقہ کلام، صحابہ کرام، تابعین، ائمہ مجتہدین، محدثین و فقہا، مشائخ و صوفیا، رواۃ حدیث، فن جرح و تعدیل، اسماء الرجال، حدیث کی حجیت، تدوین حدیث، فقہ اسلامی کے ماخذ، فقہ اسلامی کا ارتقا، ان میں سے ہر موضوع کے متعلق مستشرقین کی کتابوں اور تحقیقات میں اتنا تشکیکی مواد پایا جاتا ہے جو ایک ایسے ذہین و حساس آدمی کیلئے جو اس موضوع پر گہری نظر نہ رکھتا ہو۔ پورے اسلام سے منحرف کر دینے کے لئے کافی ہے۔ اس کا علمی جائزہ لینا ان کی تحریفات، فنی غلطیوں، اور ان کے دجل و تلبیس کو واضح کرنا اس وقت ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہے۔ یہ ایک اہم علمی موضوع اور عظیم الشان دینی خدمت ہے جس کے لئے عظیم و منظم ادارہ کی ضرورت ہے۔

مولانا موصوف ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

> اس استشراق کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ وہ واضح طریقے پر تیرہویں صدی مسیحی سے شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے محرکات دینی بھی تھے۔ سیاسی بھی، اقتصادی بھی، دینی محرک واضح ہے۔ اس کا بڑا مقصد مذہب عیسوی کی اشاعت و تبلیغ اور اسلام کی ایسی تصویر پیش کرنا ہے۔ کہ مسیحیت کی برتری اور ترجیح خود بخود ثابت ہو اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب و نئی نسل کے لئے مسیحیت میں کشش پیدا ہو۔ چنانچہ اکثر استشراق اور تبلیغ مسیحیت ساتھ ساتھ چلتے ہیں مستشرقین کی بڑی تعداد اصلاً پادری ہے۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد نسلاً و مذہباً یہودی ہے۔

اسی طرح گذشتہ سال جب کویت میں مسلم وزرائے اوقاف کی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ تو مشہور عربی میگزین المجتمع کے مدیر نے نائب وزیر اوقاف قطر سے انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو میں نائب وزیر اوقاف قطر نے فرمایا۔

مسلمانوں اور وقف وزارتوں کا یہ فرض ہے۔ کہ وہ ایسے ادارے قائم کریں۔ جو اسلامی کتب و تاریخ میں سے ایسی اسرائیلی روایات کی چھانٹی کریں۔ جو اسلامی اصول و اعتقادات کو مجروح کرتی ہیں۔ کیونکہ اسلامی کتب میں اسرائیلی روایات بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

مندرجہ حوالہ جات سے یہ اندازہ ہوا۔ کہ یہ ایک باقاعدہ سازش رہی ہے۔ جس کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ آپ ایک بات دیکھ رہے ہیں۔ کہ عرب ممالک، خصوصاً مصر و لبنان میں یہودی و عیسائی علماء نے بڑے بڑے علمی ادارے قائم کئے ہوئے ہیں جہاں سے اسلامی کتابیں طبع ہوتی ہیں۔ اور تحقیقات و ریسرچ کے نام پر تحریف و تخفیف اسلام کا کام جاری ہے۔ عربی زبان ادب، لغت، درس تاریخ، سیرت پر نایاب و نادر کتابیں انہیں اداروں سے نکل کر عالم اسلام میں جاتی ہیں۔ اور مسلم طلبا اساتذہ و شائقین علم و فن ان سے استفادہ کرتے ہیں۔۔۔ ایک طرف تو مغربیت ساری دنیا بالخصوص مشرق میں اس درجہ پھیل چکی ہے۔ کہ نئی نسلوں کے ذہن اس سے پوری طرح مرعوب ہیں۔ اگر ان مرعوب ذہن مسلم نژاد کو اسلام بھی مغربی مصنفین و مفکرین کی کتابوں کے ذریعہ پڑھایا اور سکھایا جائے گا۔ تو کیا ان میں حقیقی و اصلی اسلام کی روح باقی رہ سکے گی۔ یہ ایک اہم ترین سوال ہے۔ جسے آج دنیا کے مسلم مفکرین علماء کو محسوس کرنا چاہئے جہیں ایک طرف تو نئی نسلوں کی خبر لینی چاہئے۔ ان کے لئے ایک ایسا نظام تعلیم مرتب کرنا چاہئے۔ جو اسلام اور جدید دنیاوی تقاضوں سے بھرپور ہو۔ دوسری طرف ان نسلوں کو مغرب زدگی سے بچا کر ایسی کتابوں اور ایسے لٹریچر کے مطالعہ سے دور رکھا جائے۔ جو بظاہر تو اسلامی نظر آتا ہے۔ لیکن اندرون خانہ وہ اسلام کی تخفیف کا ذریعہ ہے۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہ العالی نے جہاں اس خطرے اور سازش کی نشاندہی فرمائی ہے۔ اور بتایا ہے۔ کہ عالم اسلام کو مغربیت کا زبردست خطرہ لاحق ہے۔ اور نئی نسلوں کو استشراق کے ذریعہ سے اسلام سے متنفر کیا جارہا ہے۔ وہاں آپ نے یہ بھی فرمایا ہے۔ کہ استشراق کا مقابلہ کرنے اور اس تحریک کا پتہ لگانے کا کام بہت اہم ہے۔ اس کام کے لئے ایک باقاعدہ ادارے کی ضرورت ہے۔

حضرت مولانا کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے۔ یہ کام معمولی نوعیت کا نہیں، کہ ایسے چلتے پھرتے کر دیا جائے۔ مسلم مفکرین پہلے اس مسئلہ کی اہمیت کو سمجھیں۔ اور اس کے لئے ایک ادارہ کے قیام کا منصوبہ تیار کریں۔ بہت سے مسلم ادارے، جماعتیں، افراد، حکومتیں، ظاہری رکھ رکھاؤ کے کاموں کو انجام دیتی ہیں۔ لیکن ایک بہت بڑا کام جسے ہمیشہ محض محسوس تو کیا جاتا رہا ہے مگر کسی نے چھوا تک نہیں، اب وقت آچکا ہے۔ بحمداللہ وسائل بھی موجود ہیں۔ اس اہم اور عظیم پروگرام کو مسلم علماء و مفکرین وقت کی اہم ضرورت سمجھ کر انجام دیں۔ اس سے اسلام کی ازلی و ابدی اقدار بھی محفوظ ہو جائیں گی۔ اور ملت کی نئی نسلیں بھی مسلمان رہ سکیں گی۔

ادارے کے کام کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ تعلیم و نصاب تعلیم

مسلمان بچوں کی تعلیم کا مسئلہ فی زمانہ بہت اہم ہے۔ جو غلط افکار علوم و فنون کی وجہ سے غتر بود ہو رہا ہے۔ اور نژاد نو افراط و تفریط کا شکار، دین پرست یا دنیا پرست لوگوں کا تختۂ مشق بنی ہوتی ہے۔ مسئلہ کا بنیادی حل ایک ایسا نصاب تعلیم ہے جس کو مسلمان بچے زمان و مکان کی مناسبت سے اپنا سکیں۔ نصاب تعلیم دینی و دنیاوی تقاضوں کو پورا کرسکے۔۔۔ جامعہ ازہر وغیرہ میں اس قسم کے تجربات کئے جاچکے ہیں جن سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ تلخیص و ترتیب

اسلامی معتقدات، مسلمات و اقدار کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہوگیا ہے۔ کہ اسلام کی نئی تعبیر پیش کرنے اور تحقیق و اصلاح مذہب کے پردے میں یہودیت و عیسائیت کی بالادستی قائم کئے جانے کے خطرناک منصوبوں کو کچل دیا جاوے۔

اسلامی کتب تفاسیر، احادیث، سیرت، تاریخ، لغات وغیرہ میں ان اسرائیلی روایات اور مستشرقین کی تحریفات کی چھانٹی کی جائے۔ جو اسلام کے بنیادی اصول، معتقدات و مسلمات سے ٹکراتی ہیں۔ دینی کتب کی تخلیص کی جائے۔ تاکہ شریعت اسلامیہ کو سمجھنے کے لئے ایک معیار متعین ہو سکے۔ اس تدبیر سے تشکک و ارتیاب کے جراثیم ختم ہوں گے۔ اور وحدت ملی کے لئے راستہ ہموار ہوگا۔

لعوز

حسن الدین احمد

فخرِ ہند

ایک لڑکا جس کی عمر لگ بھگ دس سال کی ہے الماری پر چڑھ کر چھت کو چھونے کی کوشش کرتا ہے الماری الٹ جاتی ہے اور وہ الماری سمیت نیچے گرتا ہے۔ اس کے سر میں سخت چوٹ آتی ہے لیکن وہ دھن کا پکا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ وہ چھت کی بلندیوں کی بجائے مدارج کی بلندیوں کو اپنا نصب العین بناتا ہے۔ الماری کی بجائے اصولوں اور کردار کا سہارا لیتا ہے اور ۲۴ راگست ۱۹۷۴ء کو مادی حیثیت سے وہ ایسی بلندی پر پہنچ جاتا ہے کہ دنیا بھر کے اربوں انسانوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ اگر مادی حیثیت کو نظر انداز بھی کیا جائے تو اس نے ان بلندیوں کو پہلے ہی چھو لیا ہے جنھیں انسانیت کی معراج قرار دیا جا سکتا ہے۔

خدا کے قانون کے تحت ہر انسان اپنے عزائم تک پہنچ سکتا ہے البتہ اس کے لئے یقین اور عمل کے علاوہ خلوص اور انکساری کی ضرورت ہے۔ جناب فخر الدین علی احمد نے بچپن ہی سے اپنا نصب العین اونچا رکھا اور مندرجہ بالا خصوصیات کو حیرت انگیز طریقہ پر اپنی طبیعت کا جزو بنا لیا۔

گذشتہ پونے دو سال سے مجھے جناب احمد صاحب کی شخصیت کا قریبی مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ میں نے سرکاری اور ادبی کاموں کے سلسلے میں ان سے بے شمار ملاقاتیں کیں۔ وہ مقناطیسی شخصیت کے مالک ہیں۔ اپنے نقطۂ نظر کو اثر سے نہیں تاثر سے منوانا چاہتے ہیں۔ خدا نے جو بیش بہا خوبیاں ان کو ودیعت کی ہیں ان میں وہ مسکراہٹ بھی ہے جو بے شمار مصروفیات میں بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ وہ دم گو ہیں لیکن نہایت درجہ معاملہ فہم ہیں۔ جذبات کی تہ کو پہنچ جاتے ہیں وہ اہم فیصلے نہایت آسانی سے کرتے ہیں۔ انھیں خود اعتمادی حاصل ہے وہ ایسی نرم و نازک طبیعت رکھتے ہیں کہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ "نہیں" کہنا نہیں جانتے لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے۔ وہ "نہیں" بھی ایسے اخلاق، خلوص اور رضیر جانب داری سے کہتے ہیں کہ مخاطب اس کو بطیب خاطر قبول کر لیتا ہے۔ عام طور پر کرسی نشین "نہیں" اس طور سے کہتے ہیں کہ اس میں ضروری طور پر ادر مخاصمت کا پہلو نکل آتا ہے اور اہل معاملہ "نہیں" کے ناگوار اثر کو تو برداشت کر سکتے ہیں "نہیں" کے انداز کو برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ ناراض ہونا نہیں جانتے یا یوں کہا جائے کہ ضبط کا وہ بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں کہ ناراضی کا اظہار نہیں ہونے پاتا۔ بڑے عالی ظرف ہیں۔ مخاصمت کرنے والے کو معاف کرنے اور عفو و درگذر کرنے والا دل رکھتے ہیں۔

احمد صاحب کے بزرگ اورنگ زیب کے زمانہ میں میر جملہ کے ساتھ آسام گئے اور وہاں آباد ہو گئے احمد صاحب کو صلاحیت ورثہ میں ملی۔ ان کے والد ذوالنور علی احمد پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے ۱۸۹۷ء میں انڈین میڈیکل سروس کا امتحان پاس کیا۔ اس زمانہ میں یہ بڑے اعزاز کی بات تھی زیڈ احمد صاحب کو اردو زبان نہیں آتی تھی وہ سنسکرت سے واقف تھے۔ ۱۸۷۲ء میں ان کو شیو ساگر میں ڈاکٹر ن کا سول سرجن مقرر کیا گیا۔ ان دنوں آسام میں انگریز پلانٹر کا راج تھا۔ گورنر کی ایک پارٹی میں امتیازی سلوک کرنے پر انھوں نے احتجاج کیا جس کے نتیجہ کے طور پر ان کا تبادلہ فوج میں کر کے انھیں صوبہ سرحد بھیج دیا گیا۔

کرزن دربار سے قبل وہ دہلی میں میڈیکل افسر تھے۔ یہیں انھوں نے رقیہ سلطان بیگم سے شادی کی جو نواب زین العابدین عارف کی پوتی تھیں (عارف مرزا غالب کی شریک حیات امراؤ بیگم کے حقیقی بھانجے تھے) ان کے پانچ لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہوئیں۔ وہ پہلے دریا گنج میں کرایہ کی کوٹھی لے کر رہتے تھے پھر گلی قاسم جان میں منتقل ہوتے۔ وہاں آبائی مکان ضیا منزل میں رہے اور پاس ہی ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لیا جس کو انھوں نے اپنا مطب بنایا ہندوستانی ہونے کی وجہ سے انھیں محکمہ صحت کا ڈائریکٹر جنرل نہیں بنایا گیا اور کوئی بات ان کے خلاف نہ تھی انھوں نے انگلستان تک بھی اپنی کارروائی میں نالش کی لیکن نتیجہ برآمد نہ ہوا جس کی وجہ سے دل برداشتہ ہو کر تین برس قبل ہی انھوں نے استعفیٰ دے دیا اور دہلی میں نجی پریکٹس کرنے لگے۔

احمد صاحب نے بچپن ہی سے اپنے والد کے ساتھ گورنر کی پارٹی میں امتیازی سلوک، والد کی جانب سے احتجاج اور اس کی سزا کی تفصیلات سنی تھیں پھر ہندوستانی کے باعث انھیں جائز ترقی سے محروم رکھا گیا تھا۔ ان باتوں کا ان کی حساس طبیعت پر بڑا اثر ہوا آزادی کی تحریک میں احمد صاحب کی شمولیت میں اس اثر کا بھی قابل لحاظ حصہ رہا ہوگا۔

جناب فخر الدین علی احمد ۱۳ رمئی ۱۹۰۵ء کو دہلی میں پیدا ہوئے وہ اپنے والد کے ہمراہ چار سال گونڈہ شہر میں رہے جہاں درجہ پنجم سے درجہ ششم تک تعلیم حاصل کی ان کا شمار شوقین اور ہونہار طالب علموں میں ہوتا تھا سنجیدہ اور خاموش طبیعت تھے کھیل کود سے دلچسپی تھی۔ ان کے والد کا تبادلہ دہلی ہو گیا جہاں انھوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک کامیاب کیا۔ پھر سینٹ اسٹیفن کالج دہلی سے ایف اے کامیاب کیا۔ ان دنوں حکیم اجمل خاں صاحب کے خیالات اور جذبہ حب الوطنی سے احمد صاحب متاثر ہوئے۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے۔ ۱۹۲۷ء میں جامعہ کیمبرج سے مضمون تاریخ میں ٹرائی پاس کیا پھر قانون کا امتحان پاس کر کے ۱۹۲۸ء میں انرٹیمپل سے بیرسٹر ہو گئے۔ پنڈت نہرو سے پہلی ملاقات ۱۹۲۶ء میں کیمبرج کے قیام کے دوران میں ہوئی جب کہ پنڈت نہرو اپنی شریک حیات کملا نہرو کے ساتھ ان کے علاج کے لئے انگلستان آئے تھے اس ملاقات سے ان کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل مرتب کرنے میں مدد ملی۔ محمد علی جناح سے بھی ان کی پہلی ملاقات اسی دوران ہوئی۔ محمد علی جناح کے جذبہ قوم پرستی سے بھی وہ متاثر ہوئے۔

انگلستان کے قیام کے دوران ہی ان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ آئی سی ایس کے مقابلہ میں

تھیں لیکن احمد صاحب کا رجحان آئی سی ایس میں نہ تھا ان کے سر میں کچھ اور ہی دھن تھی وہ تحریک آزادی سے متاثر تھے وہ سر محمد شفیع کے ساتھ پنجاب میں قانونی پریکٹس کرنا چاہتے تھے۔ لیکن چونکہ ان کے والد کی جائداد آسام میں تھی اور جائداد کے تعلق سے کچھ مقدمات زیر دوران تھے اس لئے انھیں آسام جانا پڑا۔ جہاں انھوں نے اپنی جائداد کے مقدمات کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ کلکتہ اور گوہاٹی ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع کر دی۔ ایک زمانہ میں انکی ماہانہ پریکٹس ۱۰،۸ ہزار روپیہ تک پہنچ گئی تھی۔

احمد صاحب ۱۹۲۸ء میں یعنی انگلستان سے واپسی کے بعد ہی انڈین نیشنل کانگریس کے رکن بنے۔ لیکن سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کے نفاذ کے بعد ہوا۔ اسی سال انھوں نے سر محمد سعداللہ کے نمائندہ کے مقابلہ میں اسمبلی کا الیکشن جیتا جو اس وقت ریاست میں برسر اقتدار تھے ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۵ء تک کانگریس کے ٹکٹ پر آسام کی مجلس مقننہ کے رکن رہے۔ انھوں نے آزادی سے قبل آسام میں مسلم لیگ کی سختی سے مخالفت کی۔ انھوں نے ہمیشہ فرقہ پرستی کے خلاف جنگ کی۔ مسلم لیگ کی فرقہ وارانہ سیاست اپنے دور شباب میں بھی ان کو متاثر نہ کر سکی۔ اور وہ عزم و استقلال کے ساتھ اس کی رجعت پسند پالیسیوں کی مخالفت پر ہر وقت کمربستہ رہے۔ انھوں نے اس وقت کانگریس اور اس کے اصولوں کا علم بلند رکھا جب کسی مسلمان کیلئے کانگریس کا نام لینا اور اس کے لئے کام کرنا اپنے لئے خطرات مول لینا تھا اور اپنی شہرت و عزت کی بازی لگانا تھا۔ لیکن انھوں نے اپنے اصولوں کی خاطر کسی بات کی مطلق پرواہ نہ کی۔ اس حیثیت سے اپنی ریاست میں ان کی واحد اور منفرد شخصیت تھی۔ ع

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ آتے ہی گئے اور کارواں بنتا گیا

۱۹۳۸-۳۹ء میں مسٹر گوپی ناتھ باردولی نے آسام میں وزارت تشکیل دی تو احمد صاحب کو وزیر مالیات بنایا گیا۔ ۱۹۴۰ء میں انھوں نے گوپی ناتھ باردولی کے ساتھ استعفی دیدیا اور انفرادی ستیہ گرہ میں حصہ لیا۔ ان کو ایک برس کی سزائے قید ہوئی۔ جیل سے چھوٹے ہی تھے کہ گاندھی جی نے "کرو یا مرو" تحریک شروع کی تو انھوں نے اس تحریک میں حصہ لیا۔ پورے آسام میں وہ پہلے شخص تھے جنھیں اس تحریک کے تحت گرفتار کیا گیا۔ گرفتاری کے وقت وہ سخت بخار میں مبتلا تھے اس مرتبہ ساڑھے تین سال جیل میں رہے اور اپریل ۱۹۴۵ء میں ان کی رہائی ہوئی رہائی کے بعد انھیں دوبارہ آسام کا وزیر مالیات بنا دیا گیا ۱۹۴۵ء کے الیکشن میں دوسری مرتبہ ان کو مسلم لیگ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ خود محمد علی جناح نے ان کے خلاف الیکشن کی مہم میں حصہ لیا کیوں کہ اس وقت تک قومی تحریک سے اپنا ناطہ توڑ چکے تھے اور مسلم لیگ کے قائد بن چکے تھے۔ اس مرتبہ وہ مسلم لیگ کے امیدوار کے مقابلہ میں ناکام رہے۔

جب ۱۹۴۶ء میں ہندوستان کے لئے عارضی حکومت کی تشکیل دی جا رہی تھی تو وزارت کے لئے جن مسلمانوں کے نام لئے جا رہے تھے ان میں آپ کا نام بھی تھا (اخبار اسٹیٹسمین مورخہ ۳ اگست ۱۹۴۶ء)۔ ۱۹۴۶-۴۷ء کے دوران ان کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کا رکن بنایا گیا۔ ۱۹۴۶ء میں ان کو آسام کا ایڈوکیٹ جنرل بنایا گیا۔

۱۹۵۲-۵۳ء میں وہ راجیہ سبھا کے رکن نامزد ہوئے ۱۹۵۷ء تک بھی وہ راجیہ سبھا کے رکن رہے ۱۹۵۵ء میں ان کو ہندوستانی وکلا کے وفد کے صدر کی حیثیت سے روس بھیجا گیا ۱۹۵۷ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ہندوستانی مندوب کی حیثیت سے شرکت کی۔ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۲ء تک کانگریس کے ٹکٹ پر دوبارہ انتخاب آسام کی مجلس مقننہ کے لئے ہوا۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۶ء تک ریاست آسام کے وزیر مالیات رہے اس دوران یعنی ۱۹۶۴ء میں انھیں کانگریس ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا پارلیمنٹری بورڈ کا رکن بنایا گیا۔ اور اس وقت سے برابر وہ دونوں کے رکن رہے۔

۲۹ جنوری ۱۹۶۶ء کو وزیر آبپاشی و برقی حکومت ہند مقرر ہوئے ۱۹۶۶ء میں تعلیمات کا قلمدان وزارت انھیں تفویض ہوا۔ ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات میں بورپٹہ (آسام) کے حلقہ انتخاب سے رکن پارلیمنٹ (لوک سبھا) چنے گئے۔

۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۰ء کے دوران وزیر صنعتی ترقیات حکومت ہند رہے۔ اس وقت اوقاف کا کام بھی آپ سے متعلق ہوا۔

۱۹۶۹-۷۰ء کے دوران تجارت کا اور ۲۷ جون ۱۹۷۰ء سے وزارت زراعت و اغذیہ کا قلمدان وزارت سنبھالا۔

جب کانگریس میں اندرونی اختلاف رونما ہوا تو احمد صاحب مرکزی قائدین کے اس اولین گروہ میں شامل تھے جس نے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کا ساتھ دیا۔

احمد صاحب کی شادی ۱۹۴۵ء میں قید فرنگ سے رہائی کے بعد ہوئی۔ آپ کی شریک حیات اردو کے نامور افسانہ نگار سلطان حیدر جوش کی صاحبزادی ہیں۔ جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی گریجویٹ ہیں انھیں آرٹ فنون لطیفہ کے کم و بیش تمام شعبوں اور شعر و ادب سے گہری دلچسپی ہے۔ پینٹنگ ان کا محبوب مشغلہ ہے غالب صدی کے دوران انھوں نے بہت سے اشعار کا عکس کٹ ورک میں پیش کیا تھا جو تمام تر ان کے تخیل کی پرواز تھی۔ عابدہ احمد کی سماجی اور تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز آسام رہا۔ وہ آسام فلڈ ریلیف کمیٹی کی چیئرمین رہ چکی ہیں۔ احمد صاحب کے ایک لڑکی اور دو لڑکے ہیں۔ بڑا لڑکا ڈاکٹر ہے۔

احمد صاحب جتنے نرم گفتار، شیریں مقال اور بامروت ہیں۔ اصول اور عزائم کے بارے میں اتنے ہی سخت واقع ہوتے ہیں۔ ان کی ذات جدید و قدیم کا حسین امتزاج ہے۔

بلاشبہ احمد صاحب کا مقام ان لوگوں میں ہے جو ملک کی آزادی سے قبل بھی رہنماؤں کی صف اول میں رہے

حضرت ابوبکر نے ایک صحابی کو غلط فہمی میں کچھ برا بھلا کہہ دیا۔ بعد کو بڑے نادم ہوتے تو فرمانے لگے۔ یعنی تم بھی مجھے اسی طرح کے برے کلمات کہہ لو تاکہ دنیا میں بدلہ پورا ہو جائے۔ انھوں نے کہا میں ایسی حرکت نہیں کر سکتا حضرت ابوبکر نے نبی کریم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا میں فلاں معاملہ میں بدلہ دینا چاہتا ہوں۔ وہ صاحب بدلہ لینے پر راضی نہیں حضور نے ان کو بلایا اور بدلہ لینے کے لئے ارشاد فرمایا صحابی نے آنحضرت سے عرض کیا کہ میں بدلہ لینا نہیں چاہتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر معاف کر دو انھوں نے معاف کر دیا۔ حضرت ابوبکر بغایت ندامت اور خوف آخرت سے روتے ہوئے دربار نبوی سے واپس ہو گئے۔

ترجمہ۔ جناب عبدالحمید رحمانی فاضل مدینہ یونیورسٹی رکن مجلس ادارت «اوقاف»

شیخ عبداللہ انصاری نائب وزیر اوقاف قطر سے ایک ملاقات

۱۹۷۳ء کے اوائل میں کویت کے ہلٹن ہوٹل میں عرب وزرائے اوقاف کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں شیخ عبداللہ انصاری نائب وزیر اوقاف قطر نے اپنے وفد کی رہنمائی کی تھی۔ اس موقع پر کویت کے مشہور اسلامی مجلہ المجتمع کے مدیر تشاری محمد براہیم نے وزیر موصوف سے ملاقات کی۔ نائب وزیر اوقاف قطر نے بعض مفید خیالات کا اظہار فرمایا۔ جن کے اہم اقتباس اوقاف میگزین کے قارئین کرام کی دلچسپی کے لئے درج کئے جا رہے ہیں۔

مدیر۔ اس حیثیت سے کہ آپ عرب وزرائے اوقاف کی کانفرنس میں ریاست قطر کے وفد کے سربراہ ہیں۔ ہم یہ جاننا پسند کریں گے۔ کہ آپ ان اہم مقاصد کی نشاندہی کریں۔ جو اوقاف کی وزارتوں کے فرائض میں شامل ہیں

نائب وزیر۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ وزارت اوقاف کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے۔ کہ وہ ہر جگہ دینی احکام و شعائر اسلام کو مستحکم کرے۔ اپنے طویل مطالعہ کی بنا پر میرا نقطۂ نظر ہے۔ کہ اوقاف کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اوقاف مطلقہ (عامہ) دوسرے اوقاف مقیدہ۔

اوقاف مطلقہ سے میری مراد ہے۔ کہ وہ اسلام کے ہر قسم کے اہم مفادات و مصالح پر خرچ کئے جائیں۔ تاکہ ان سے اللہ کے دین کا استحکام ہو۔ اور دعوت دین و تحفظ شریعت کی مساعی کو تقویت ملے۔ اوقاف مقیدہ سے مراد وہ اوقاف ہیں۔ جن کے مقاصد وقف کے منشا اور اغراض تک محدود ہیں۔

مدیر۔ اوقاف کے انتظام کے ضروری مصارف کے بعد جو فنڈ بچ جاتے ہیں۔ بچت کی رقم ایسے تجارتی کاموں میں جن میں سود کا شبہ نہ ہو، لگائی جا سکتی ہے، تاکہ وقف کی آمدنی میں اضافہ ہو سکے؟

نائب وزیر۔ سلف صالحین نے اس بارے میں کافی وضاحت کی ہے اوقاف کے ذمہ دار اور وزارت اوقاف کا فرض ہے۔ کہ وہ اوقاف کے مال میں اضافہ کی پوری کوشش کریں۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ یہ مال قلیل ہو لیکن ذمہ دار کی محنت مشقت اور تجارت میں لگانے سے اس میں کافی اضافہ ہوتا ہے۔ لہذا متولی خواہ وزارت اوقاف ہو، یا کوئی دوسرا اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ کہ وہ جائز اور حلال طریقوں سے ان کو بڑھانے اور ترقی دینے کی کوشش کرے۔ اسلاف میں سے بعض کا نقطۂ نظر یہ بھی ہے۔ کہ اوقاف کے مال کو بڑھانے کی کوشش کرنا واجب نہیں مستحب ہے۔

میری رائے یہ ہے۔ کہ متولیان اوقاف کی یہ ذمہ داری بلکہ شرعی فرض ہے۔ کہ وہ اوقاف کی جائداد کو ترقی دیں۔ اس لئے کہ اگر ترقی کا راستہ نہ اپنایا جائے تو یہ کم ہوتے ہوتے ختم ہو جائیں گے۔ میرا خیال بھی ہے۔ کہ وقف کی وزارتوں کا یہ فرض ہے۔ کہ وہ اوقاف کے مال میں افزائش کا انتظام کریں جہاں تک مجھے علم ہے۔ سعودی عرب، و کویت کی وقف وزارتیں اس ذمہ داری کو بخوبی انجام دے رہی ہیں یہ بات البتہ بہت ضروری ہے۔ کہ وقف وزارتوں کو غیر شرعی یا ربوی طریقے استعمال کرنے سے باز رکھا جائے

مدیر۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں مسجدوں کا بہت اہم کردار (رول) ہوتا تھا۔ جسے وہ مختلف انداز سے انجام دیتی تھیں۔ کیا آپ جدید دور میں بھی مساجد کے اس کردار، افادیت، اور حرکیت کو پسند کریں گے۔

نائب وزیر۔ آپ کا یہ سوال انتہائی اہم اور قابل غور ہے۔ اور اس سے قبل مجھ سے یہ سوال نہیں کیا گیا۔ اس سلسلے میں میں نے اپنا نظریہ واضح کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم مساجد کے اس کردار (رول) کے شدت سے ضرورت مند ہیں جو وہ دینی و تبلیغی تحریکات کے سلسلے میں ادا کرتی رہی ہیں۔ مساجد کی حرکت و نشاط علوم و فنون کے میدان سے لے کر اجتماعات تک وسیع تھی لیکن آج زمانہ بدل چکا ہے۔ اور امت کے دل میں مساجد کے احترام کے جو جذبات تھے وہ مدھم پڑ چکے ہیں۔ فی زمانہ اگر اس طریقہ کو رائج کر دینے کی اجازت دی جائے۔ تو یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ یہ طریقہ جائز اور مفید ہو سکے گا۔ میں نے خود بعض حضرات کو مسجد میں خرید و فروخت کی گفتگو کرتے دیکھا ہے تعزیت کی مجالس بھی ہوتے دیکھی ہیں۔ بیڑی سگریٹ پیتے دیکھا ہے۔ امت اگر اسی طرح مساجد کا احترام کرتی ہوتی جیسے اسلاف کرتے تھے۔ تو یقیناً اجتماعات وغیرہ مفید ہو سکتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ ایسے اجتماعات، علمی مجالس مساجد میں منعقد ہوتے۔ تو آدمی کے دل پر ان کا زیادہ گہرا اثر ہوتا۔

مدیر۔ اجنبی استعمار نے عصری ذرائع اور جدید سائنسی صلاحیتوں سے مسلم نوجوانوں کی بڑی تعداد کو ان کے دین سے منحرف کر دیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کمیونزم الحاد، اور غلط افکار و نظریات ان میں تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ ایسے نازک حالات میں اوقاف کی وزارتیں ان غلط رجحانات کے ازالے کے لئے کیا کر سکتی ہیں اور ان پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟

نائب وزیر۔ استعمار کی یہ تہذیبی جنگ بلاشک و شبہ ہمارے اوپر ہر طرف سے مسلط ہو چکی ہے۔ اور مسلمانوں کا یہ فرض ہے۔ کہ وہ اس کا معقول علاج تلاش کریں۔ اور اس کے مقابل جم جائیں۔ یہ ذمہ داری صرف وقف وزارتوں کی نہیں۔ پوری اسلامی ملت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے۔ کہ وہ ضروری اور مناسب ذرائع کے ساتھ اس طوفان کو روکنے اور اس خطرے کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کرے۔ میرے نزدیک اس کا علاج اس وقت یہ ہے کہ ملت اسلامیہ تعلیم

کی اہمیت کو محسوس کرے اور اس طرف بھرپور توجہ دے ۔ نصاب میں دینی علوم کو پوری اہمیت دی جائے ۔ اسلامی لٹریچر کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو ۔ خاص طور پر چھوٹے بچوں کی کتابوں پر نمایاں توجہ دی جائے ۔ کیونکہ بچوں میں مختلف افکار کو قبول کرنے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے انھیں بچپن ہی میں ایسا نصاب پڑھایا جائے ۔ جس سے ذہنوں پر دین کی گہری چھاپ لگ سکے اور ایسے علوم حاصل کر سکیں ۔ جن سے کہ رد عقائد و خیالات اور کنفیوژن سے وہ بچ سکیں ۔

کلفت بہ قبل أن اعرف الھوی
فصادف قلباً خالیاً فتمکنا

مجھے اس سے محبت کے نام کی واقفیت سے قبل ہی دلچسپی تھی اور اس محبت نے بالکل صاف اور خالی دل پایا اور اس میں مضبوطی سے جم گئی ۔

لہٰذا سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہم بالغوں سے پہلے بچوں کے نصاب اور مطالعہ کی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کریں ۔ یہاں یہ بات بھی یاد دلانی مناسب سمجھتا ہوں کہ غلط افکار سے بچانے کے جو ذرائع ہیں ۔ ان میں ایک اہم ذریعہ یہ بھی ہے کہ ہم ان زہرناکیوں سے مکمل طور پر بچیں جو ہمارے جدید ناتجربہ کار مصنفین کی کتابوں میں دشمنان اسلام کے لٹریچر کے مطالعہ کے نتیجہ میں گھس آئی ہیں ۔ میں تمام اسلامی ملکوں کی نشر و اشاعت کی وزارتوں سے اپیل کروں گا ۔ کہ وہ نئی تصنیفات اور مجلات و صحف پر زبردست نظر رکھیں تاکہ مشنریوں یا دشمن اسلام اداروں کی کتابوں اور لٹریچر کا زہر ہمارے اندر سرایت نہ کر سکے ۔

مدیر ۔ جب نشر و اشاعت کی وزارتوں کو یہ اہمیت حاصل ہے ۔ تو ایسی صورت میں وزارت اوقاف اور وزارت نشر و اشاعت کے درمیان باہمی تعاون و ہم آہنگی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟

اگر ان میں باہم تعاون نہ ہو تو خطرہ ہے کہ انکی کوششیں ایک دوسرے سے متصادم ہو کر مفادات کو مجروح کر کے رکھ دیں گی ۔

نائب وزیر ۔ صرف وزارت نشر و اشاعت و وزارت اوقاف ہی نہیں بلکہ ساری وزارتوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں ۔ اور ہر ایک کا راستہ صحیح اور مقصد تک لے جانے والا ہو ۔ اور وزارت دوسرے کے لئے آئینہ ثابت ہو ۔ اور جہاں کسی وزارت کے کام میں خلا محسوس ہو ۔ تو دوسری وزارت اس کمی کو دور کرنے کے لئے وزارت کو بروقت بیدار کر دے ۔

. . . . یہاں میں نشر و اشاعت کے مختلف وزراء سے اپیل کروں گا کہ قوم کے مفادات کے لئے جو پروگرام نشر کئے جاتے ہیں —— ان کی راہ میں جان توڑ کوششوں کو اپنا فرض بنالیں ۔ اور کوئی ایسا پروگرام ہرگز نشر نہ ہونے پائے ۔ جو قوم کے لئے ضرر رساں ہو ۔ بنابریں یہ ضروری ہوگا ۔ کہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو وغیرہ میں جو پروگرام لائے جائیں ۔ ان کی کڑی نگرانی کی جائے ۔ اس طرح سے ہم جوانوں کے قلب و دماغ میں اچھی قدریں پیوست کر سکتے ہیں ۔ اگر ایسا نہ ہوا تو نوجوانوں میں غلط اقدار سرایت کر جائیں گی ۔ میں سمجھتا ہوں کہ دونوں وزارتوں میں جس تعاون کی خواہش آپ نے اپنے سوال میں کی ہے ۔ اس کی تکمیل اسی طرح ممکن ہے ۔

مدیر ۔ اسلاف نے مختلف علوم و فنون میں اپنی تصنیفات و تالیفات کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے ۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان مصنفات میں صحیح باتوں کے علاوہ بعض غلط اور کمزور چیزیں بھی ملتی ہیں ۔ خاص طور پر قرآن کریم کی تفاسیر اسرائیلی روایات سے بھری ہوئی ہیں ۔ اسی طرح تاریخی کتب میں غلط اور عجیب و غریب کہانیاں ملتی ہیں ۔ اس سلسلے میں کیا آپ میرا یہ مشورہ قبول کریں گے کہ وزارت اوقاف اس بات کی ذمہ داری قبول کرے ۔ کہ وہ اس ورثہ کی تنقیح کا کام کرے ۔ اور قدیم لٹریچر کو عصر حاضر کے نوجوانوں کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید انداز میں پیش کرے ۔

نائب وزیر ۔ بات اصل میں یہ ہے کہ یہ مسئلہ وزارت اوقاف کے ساتھ خاص نہیں ۔ بلکہ یہ ذمہ داری سارے علمی اداروں کی ہے کہ وہ ان باتوں کو نقد و نظر کا نشانہ بنائیں ، جو عالم اسلام کو نقصان پہنچا رہی ہیں ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایسی سوسائٹی یا چند سوسائٹیاں تشکیل دی جائیں ۔ جن میں جامعہ ازہر و جامعہ عالم اسلامی اور عرب ممالک کی دوسری علمی انجمنوں کے ذمہ دار ہوں ۔ یہ ادارے اس قدیم لٹریچر کی تنقیح کی ذمہ داری سنبھالیں اور پوری دقت نظر سے اس بات کا مطالعہ کریں کہ اس میں کونسی چیزیں نئی نسل کے لئے قابل مطالعہ ہیں اور کونسی چیزیں ساقط ہیں ۔ میں سمجھوں گا کہ یہ ذمہ داری بھی اوقاف کی وزارت کے بجائے وزارت نشر و اشاعت ہی پر عائد ہوتی ہے ۔ اس لئے کہ کتابیں بھی یا کوئی دوسرا لٹریچر مطابع اسلامیہ میں اس وقت تک نہیں آسکتا جب تک وزارت نشر و اشاعت کو اس کی اطلاع نہ دی جائے ۔ اپنا جواب ختم کرنے سے پہلے میں یہ بھی بتانا چاہتا ہوں ۔ کہ سلف کی وہ کتابیں جو اسرائیلی روایات پر مشتمل ہیں ۔ اور جن کا شمار بڑی کتابوں میں ہوتا ہے ۔ بڑی آسانی سے غلط روایات سے پاک کی جاسکتی ہیں ۔

مدیر ۔ عالم اسلام میں مسلمانوں نے اپنی عملی زندگی میں اسلام کے شرعی احکام پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے ۔ اور حکومتوں نے قانون اور معاملات میں اسلامی قانون کو معطل کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عملی میدان میں اسلامی تعلیمات سے دور ہونے کی بنا پر مسلمان ________ مسلسل شکست و ریخت اور ذلت و نکبت کا شکار ہو رہے ہیں ۔ ایسی صورت میں اسلامی قانون کے نفاذ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟

وزیر ۔ یہ سوال بہت اہم ہے ۔ اور اس کا جواب دیتے ہوئے میرے قلب و جگر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں ۔ ملت اسلامیہ تسلسل کے ساتھ ذلت و گراوٹ کی طرف جا رہی ہے ۔ اور یہ ذلت و عار اس وجہ سے لاحق ہوتی ہے ۔ کہ اس نے اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کرنا چھوڑ دیا ۔ اگر مسلمان صحیح راستہ پر جم جاتے اور ہدایت قرآنی پر عمل کرتے ۔ تو عزت و وقار ان کا حلیف ہوتا ۔ لیکن انتہائی افسوس کی بات ہے ۔ کہ مسلمانوں پر قرآن کریم کی یہ آیت "واذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم اذا فریق منھم معرضون ۔ وان یکن لھم الحق یاتوا الیہ مذعنین ۔"

(ترجمہ ۔ جب یہ اللہ اور رسول کی جانب بلائے جاتے ہیں تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کیا جائے ۔ تو ان میں سے ایک گروہ اعراض کرتا ہے اور اگر انہیں کچھ ملتا ہوتا تو یہ سر کے بل آتے ۔)

منطبق ہوتی ہے ۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو سخت ڈانٹ دی ہے جن کا یہ حال ہے چنانچہ ارشاد ہوا ۔ افی قلوبھم مرض ام ارتابوا ام یخافون ان یحیف اللہ علیھم ورسولہ

۔ کیا ان کے دلوں میں بیماری ہے یا وہ شک میں پڑ گئے یا وہ ڈرتے ہیں کہ اللہ اور اس کا رسول ان پر ظلم کریں گے ۔

ہمیں امید ہے کہ ملت اسلامیہ اپنے خالق کی اتاری ہوئی کتاب اور شریعت کی طرف لوٹے گی ۔ اور اس آسمانی دستور کے مطابق فیصلہ کرے گی ۔ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا گیا ، اور جس میں اللہ نے فرمایا ۔ فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما ۔

بقیہ

جناب حسن الدین احمد

ایک انٹرویو

محراب ٹو اتجمسٹ کے جناب ایس ایس اشرف نے جناب حسن الدین احمد آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی برائے اوقاف حکومت ہند کا انٹرویو لیا ہے۔ جس میں اوقاف کے انتظام اور ان کے استعمال سے متعلق اہم اور مفید باتیں آئی ہیں۔ ناظرین کی دلچسپی کے لئے ہم اس انٹرویو کے اہم اقتباسات پیش کر رہے ہیں۔

(ادارہ)

"مسلم اوقاف مسلمانوں کی تکلیفوں اور پریشانیوں کو کسی حد تک دور کر سکتا ہے"، ایک بڑے سوالیہ نشان کی طرح برسوں سے میرے ذہن میں انتشار پیدا کر رہا تھا مسلم اوقاف کے پاس کتنی جائداد ہے۔ ہم اسے کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔؟ اس میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں کو کس طرح دور کیا جا سکتا ہے؟ ایسے بیشتر سوالات کا جواب لینے کے لئے میں نے مرکزی وزارت اوقاف کے ایک سرکاری افسر جناب حسن الدین احمد آئی اے ایس سے انٹرویو لینے کی درخواست کی۔۔۔۔

حسن الدین احمد صاحب وزارت قانون میں آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی ہیں اور محکمہ اوقاف کی اصلاح کے لئے مرکزی حکومت نے ان کی خدمات آندھرا پردیش سے مستعار لی ہیں۔

حسن الدین احمد صاحب سے یہ انٹرویو میں نے ان کے دفتر میں نہیں بلکہ ان کی رہائش گاہ پر ہی لیا تھا۔ اتوار کے دن صبح دس بجے سے یہ انٹرویو شروع ہو کر شام کو ۴ بجے ختم ہوا۔ اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہندوستان کے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اوقاف کے محکمہ کی تمام کارگزاریوں پر گہری نظر رکھے تاکہ اس میں پھیلی ہوئی بدعنوانیاں دور ہوں۔ اور سالانہ کی وقف شدہ امانت کا صحیح استعمال کیا جا سکے۔

"وقف سے کیا مراد ہے اور اس کی ابتدا کب سے ہوتی؟"، حسن الدین احمد صاحب سے یہ میرا پہلا سوال تھا۔

غور و فکر تلاش و تحقیق کی لہریں ان کی پیشانی پر بکھر گئیں اور ان کا چہرہ کسی عظیم خلا سفر کی طرح ہو گیا۔ جواب دیتے ہوئے انھوں نے فرمایا۔

"وقف کے لغوی معنی "ٹھہرا دینا ہیں۔ عام حالات میں جائداد ایک فرد یا جماعت کی ملکیت سے دوسرے فرد یا جماعت کی ملکیت میں منتقل ہو سکتی ہے۔ لیکن وقف کی ہوئی جائداد خدا کی ملکیت قرار دی جا کر منتقل نہیں کی جا سکتی۔ اسے اسی عالم میں ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ عام طور پر وقف کی گئی جائداد فروخت نہیں کی جا سکتی لیکن اغراض وقف کی خاطر ایسا کیا جا سکتا ہے۔

اگرچہ کلام پاک میں وقف کا کوئی تذکرہ نہیں ہے لیکن رسول صلعم کے زمانے سے ہی وقف کا سلسلہ جاری ہے اور اس وقت تمام دنیا خصوصاً اسلامی ممالک میں اوقاف کے محکمات ایسے اہم ترین معاشی اور معاشرتی اداروں کی حیثیت سے روبکار ہیں جن کی بنیادیں دین پر قائم ہیں"۔

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے موصوف نے بتایا کہ جن ممالک میں مسلمان بستے ہیں ان میں اوقاف کے تعلق سے ہندوستان ایک اہم مقام کا حامل ہے اور یہاں اوقاف کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

حسن الدین احمد صاحب کے سلسلہ کلام کو منقطع کرتے ہوئے میں نے ان سے دریافت کیا "ہندوستان میں وقف کی گئی جائدادوں کی موجودہ مالیت کیا ہوگی۔؟"

جواب دیتے ہوئے کہنے لگے۔

"ہندوستان میں تقریباً نو سو یا ہزار سال سے مسلمان آباد ہیں۔ اس طویل دور میں انھوں نے بے شمار جائدادیں عامۃ المسلمین کے لئے وقف کیں۔ ان وقف شدہ جائدادوں کی تعداد اور ان کی مالیت کا اندازہ سردست مشکل ہے لیکن ابھی تک تحقیقیوں کی مساعی کا جو نتیجہ سامنے آیا ہے اس کی رو سے یہ معلوم ہوا ہے کہ ان کی تعداد لاکھ سے زیادہ اور مالیت ایک ارب روپے سے اوپر ہے۔ ہمارے ہندوستان میں ایسی جائدادوں کی نشان دہی کے لئے کوششیں جاری ہیں جن کا نتیجہ اگلے پانچ دس سالوں میں ظاہر ہو جائے گا۔ مرکزی وقف کے ساتھ ساتھ صوبائی اوقاف کے محکمات کی تحقیق و تفتیش جاری ہے"۔

اسی ضمن میں جناب احمد صاحب نے بتایا کہ وقف شدہ جائدادوں کی دو اقسام ہیں۔ پہلی قسم کی جائدادیں وہ ہیں جو اغراض وقف کو بالراست پورا کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر مسجد جو نماز اور دیگر مذہبی امور کے لئے وقف کی جاتی ہیں۔ قبرستان درگاہیں اور خانقاہیں بھی اس زمرے میں آتی ہیں۔ دوسرے قسم کی وہ جائدادیں ہیں جن سے آمدنی ہوتی ہے اور اس آمدنی کے ایک حصہ کو مساجد وغیرہ کی نگہداشت پر صرف کیا جاتا ہے۔ پہلے قسم کی جائدادوں سے کوئی آمدنی نہیں ہوتی نہ

انھیں ترمیم وتنسیخ کی گنجائش ہے۔ دوسری قسم کی جائدادوں میں بذاتِ خود تقدس نہیں پایا جاتا لیکن وہ مقدس جائدادوں کی کفالت کا ذریعہ بنی ہوتی ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں نے مقدس اوقاف والی جائدادیں لاکھوں کی تعداد میں قائم کیں لیکن اُن کی نگہداشت کے لئے دوسری قسم کی جائدادیں اسی تناسب سے وقف نہیں کیں اور یہی وجہ ہے کہ آمدنی والی وقف شدہ جائدادوں کا بیشتر حصہ ان مقدس جائدادوں پر صرف ہو جاتا ہے۔ آمدنی والی جائدادوں کی وجہ سے بہت سی مساجد اور بہت سے قبرستان کس مپرسی کے عالم میں پائے جاتے ہیں کیونکہ جن جائدادوں سے آمدنی وصول کی جاتی ہے ان میں ایسے مکانات اور ایسی دکانیں ہیں جو برسہا برس پہلے کے کرایوں پر چڑھی ہوئی ہیں اور اُن میں بسے ہوئے کرایہ دار موجودہ دور کی شرحوں کے مطابق کرایہ میں اضافہ منظور کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ایسے کرایہ داروں میں مسلمان بھی ہیں اور غیر مسلم بھی۔ نیتوں کا فساد عالمگیر ہے جس میں ہر مذہب کے افراد کے ساتھ خود مسلمان بھی شریک ہیں۔ معمولی کرایہ حاصل ہونے کی وجہ سے یہ عمارتیں خراب وخستہ حال ہیں ان کے علاوہ ان گنت جائدادیں ملک کی تقسیم کے بعد ناجائز قبضوں کا شکار ہو چکی ہیں۔ دلی، پنجاب، ہماچل پردیش وغیرہ میں ایسی بہت سی جائدادیں تھیں جن پر قبضہ ناجائز کر لیا گیا تھا۔ لیکن اب ان کی واگذاشت کی کارروائیاں کی جارہی ہیں۔ حکومت وقت کے تعاون سے واگذاشت کی کارروائیوں میں آسانیاں اور سہولتیں پیدا ہوتی جارہی ہیں۔"

حسن الدین احمد صاحب کے اس بیان سے اب میرے ذہن میں ایک سوال ابھرا اور وہ اُن مساجد وغیرہ سے متعلق تھا جن پر مرکزی حکومت کے محکمہ آثار قدیمہ کی نگرانی ہے لہٰذا میں نے اُن سے دریافت کیا۔

"جو مساجد، خانقاہیں، مقبرے وغیرہ محکمہ آثار قدیمہ کی نگرانی میں ہیں، اُن کے اخراجات وغیرہ کی کفالت کون کرتا ہے اور سہ درحقیقت کیسے کرنا چاہیئے۔؟"

"محکمہ آثار قدیمہ ایسی تمام جائدادوں کو اپنی نگرانی میں لے لیتا ہے جو تاریخی اہمیت رکھتی ہوں اور جن کی قدامت کو برقرار رکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے لیکن ایسی جائدادوں کی نگرانی کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے یہ محکمہ اُس کی ملکیت یا اوقافی حیثیت کو تبدیل نہیں کرتا۔ اگر ایسی عمارتوں میں مساجد وغیرہ ہیں تو وہاں نماز وغیرہ کا انتظام وقف بورڈ کی جانب سے اور شکست وریخت کی مرمت کا اہتمام محکمہ آثار قدیمہ کی جانب سے ہوتا ہے۔"

"کلیتاً مسلمانوں کے اس ادارے میں مرکزی حکومت کا کیا رول ہے؟"

میرے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے او۔ ایس۔ ڈی وقف نے کہا کہ۔

"مرکزی سرکار اوقاف کے داخلی انتظام میں قطعاً مداخلت نہیں کرتی۔ البتہ ایسے بنیادی مسائل میں دلچسپی لیتی ہے جن کا براہ راست تعلق اوقاف کی صیانت اور اس کے انتظام سے ہے۔ جائدادوں کو ناجائز قبضوں سے واگذاشت کرانے کے سلسلے میں میعاد گذر جانے کی وجہ سے عدالتی کارروائی میں قانونی دشواریاں حائل ہو رہی تھیں۔ اس لئے ایک قانون کے ذریعے اس سقم کو رفع کیا گیا۔ اکثر ریاستوں میں ۱۹۷۵ء تک اس مدت میں توسیع کی جا چکی ہے۔ اور چند ریاستوں میں توسیع دینے کی کارروائی کی جارہی ہے۔

مقدمات دائر کرنے کی صورت میں کورٹ فیس کا صرفہ اوقاف کے لیے غیر ضروری بار تصور کرتے ہوئے ریاستی حکومتوں کو ایک سفارش کے ذریعے دس یا پندرہ روپے علاحدہ فیس مقرر کرانے کا سہرا بھی مرکزی حکومت کے سر ہے۔ اس طرح بازیافت کے مقدمات دائر کرنے میں اخراجات میں بڑی حد تک کفایت کا امکان ہے۔

اسی طرح ریاستوں میں قانون کرایہ نافذ ہیں جو مالک مکانوں کے مقابلے میں مخصوص کرایہ داروں کے حقوق کا تحفظ کرتے ہیں۔ ان قوانین کے تحت کرایوں میں نہ صرف یہ کہ اضافہ ہی نہیں کیا جا سکتا بلکہ تخلیہ کے لئے بھی موانعات موجود ہیں۔ چونکہ اوقاف کی جانب سے مکان کرایہ پر دیئے جاتے ہیں اس لئے مرکزی سرکار نے اوقافی جائدادوں کو ان قوانین سے مستثنیٰ قرار دینے کی تحریک کی ہے۔

"اس کے علاوہ" انھوں نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا "کسی خاص مسئلہ کو ایک ریاست کا وقف بورڈ بہتر طور پر حل کرتا ہے۔ دوسری ریاستوں کے وقف بورڈ کو اس سے واقف کروایا جائے تو وہ بھی اس طریقہ پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔ مرکزی سرکار کی دلچسپی اور مداخلت بہرحال مددگار ثابت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر وقف بورڈ کے عملہ کے تقررات کا مسئلہ ہے۔ عام طور پر پنشن یافتہ اشخاص کو بھرتی کیا جاتا تھا لیکن وہ عمر کی زیادتی کی وجہ سے کارآمد ثابت نہیں ہوتے۔ ایسی تقرریوں سے کارکردگی کو کم اور پرورش کو زیادہ پیش نظر رکھا جانے لگا۔ دوسری طرف نوجوان تنخواہ کی کمی کی وجہ سے پیشہ کے لئے وقف کی ملازمت کے لئے وقف ہو جانا پسند نہیں کرتے اور جب بھی انھیں سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت ملے تو وہ وقف کی سروس کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ اس مسئلہ کا حل آندھرا پردیش میں سید ہاشم علی صاحب آئی اے ایس نے پیش کیا کہ اوقاف میں ایسے افراد کو بھرتی کیا جائے جن کی عمر سرکاری ملازمت میں داخلے کی عمر سے تجاوز ہو چکی ہو۔ تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صورت حال کا یہی بہترین حل ہے جب آندھرا پردیش کے اس تصفیہ کو مرکزی سرکار کی جانب سے دوسری ریاستوں کے وقف بورڈ کے سامنے رکھا گیا تو ان کو غور کرنے کا موقع ملا۔ علی الخصوص تامل ناڈو (مدراس) کے وقف بورڈ نے اُسے فوراً ہی قبول کر لیا۔"

حسن الدین احمد صاحب کی گفتگو سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس اسلامی ادارے کے تعلق سے مرکزی سرکار کی خدمات کو اوقاف کے حق میں مفید اور مناسب سمجھتے ہیں۔ اور جہاں تک احمد صاحب کے کردار اور حسن کردار کا سوال ہے انھیں مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا تو کجا جانبدار بھی نہیں کہا جا سکتا۔

مسٹر حسن الدین احمد عربی النسل ہیں۔ اُن کا خاندان قبیلہ قریش سے تعلق رکھتا ہے اور حضرت جعفر طیار کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کا خاندان جس کے تجارتی تعلقات پہلے ہی سے ہندوستان سے قائم تھے تیرہویں صدی عیسوی میں جنوبی ہند میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گیا۔ موصوف کے دادا شمس العلماء نواب عزیز جنگ بہادر ولاؔ نے چالیس سے زیادہ تصانیف سے اردو اور فارسی ادب کے دامن کو سنوارا۔ اُن کے والد نواب دین یار جنگ ریاست حیدرآباد میں صدر ناظم کوتوالی ہی نہ تھے بلکہ سرکار نظام کے خصوصی معتمدین میں سے تھے۔ حیدرآباد کی ساکھ "عزیز باغ" کو مرکز دین ودانش تصور کیا جاتا ہے۔ وہ فروری ۱۹۲۳ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۶ء میں انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے کیا۔

اسی سال محکمہ اوقاف میں مددگار ناظم امور مذہبی کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں حکومت کی جانب سے انھیں غیر ممالک کے دورے پر روانہ کیا گیا۔ ۱۹۵۴ء میں انھوں نے جاپان میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی مذہبی کانفرنس اور بین الاقوامی امن کانفرنس میں ہندوستانی مذہب کی حیثیت سے شرکت کی۔ انھوں نے "اسلام اور امن عالم" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا جس کا ترجمہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ہوا۔ جاپان کے علاوہ وہ امریکہ، انگلستان، ترکی، مصر

سوئٹزرلینڈ وغیرہ بھی جاچکے ہیں اور بیشتر ممالک کے اخبارات نے اُن سے انٹرویو لئے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگرام دیئے۔ انھیں اردو زبان سے غیر معمولی لگاؤ ہے۔ وہ ادیب بھی ہیں اور مصنف بھی۔

اُنھوں نے کہا کہ

"منتظمین اوقاف کے سامنے یہ مسئلہ رہتا ہے اور رہنا بھی چاہئے کہ وقف کے تقاضوں کی تکمیل اس طرح کی جائے کہ اغراض وقف کی پابندی بھی ہوتی رہے اور ساتھ ساتھ وقف کے بنیادی کردار کی خلاف ورزی بھی نہ ہو۔ ترکی میں اس مسئلہ کو طے کیا گیا ہے اس کی ایک مثال دیتا ہوں جو ہمارے لئے قابل تقلید ہے۔ ہوا یہ کہ استنبول میں قدیم طرز کی بنی ہوئی ایک سرائے محکمہ وقف کے زیر نگرانی تھی۔ یہ عمارت انتہائی بوسیدہ اور فرسودہ ہو چکی تھی۔ اس کی مرمت بھی وہاں کے محکمہ اوقاف کے لئے ایک مستقل مسئلہ بن چکی تھی لیکن سرائے مذکور کا محل وقوع بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے بڑی اہمیت حاصل کر چکا تھا۔ سرائے سے کچھ آمدنی نہیں ہوتی تھی اور اتنے اہم محل وقوع سے خاطر خواہ استفادہ نہ کرنا بھی غیر مناسب تھا اور سرائے کے اغراض وقف کی تکمیل بھی ضروری تھی سرائے مذکور میں بوقت واحد بیس مسافروں کی قیام کی گنجائش تھی۔ چنانچہ ترکی کے محکمہ اوقاف نے اس عمارت کو منہدم کر کے اس جگہ سترہ منزلہ جدید طرز کا عالی شان ہوٹل تعمیر کرایا۔ اس ہوٹل میں بیس کمرے اغراض وقف کی تکمیل کی خاطر غریب مسافروں کے قیام کے لئے مختص کر دیئے گئے ایسے مسافروں کو جو ہوٹل کا کرایہ ادا کرنے کے قابل نہیں ہوتے ہیں۔ ان کمروں میں بلا معاوضہ ٹھہرا دیا جاتا ہے باقی آمدنی سے اخراجات اور قرض کی ادائیگی کے بعد ایسے ادارے چلائے جاتے ہیں جو مسلم نوجوانوں کو جدید ٹیکنیکل تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتے ہیں۔

ہندوستان میں بھی اس جانب قدم اٹھایا جا رہا ہے۔ سنٹرل وقف کونسل اور ریاستی وقف بورڈ سے بہت سے طلبا کو فنی تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظائف دیئے جاتے ہیں لیکن وقف کی آمدنی سے مسلمانوں کے تمام مسائل اس لئے حل نہیں کئے جا سکتے کہ سر دست یہ آمدنی محدود ہے۔ مسلمانوں میں پھیلی ہوئی بے روزگاری اور مسلمانوں کے دیگر مسائل حل کرنے میں اوقاف سے بہت کچھ مدد حاصل کی جا سکتی ہے لیکن اوقاف ہی کی آمدنی پر تکیہ کرنا کافی نہیں ہے۔ جہاں تک انجینئرنگ، میڈیکل، ٹیکنیکل اداروں کے قیام کا سوال ہے میں اس خیال سے متفق ہوں چوں کہ یہ دور حاضر اور موجودہ وقت کا سب سے اہم تقاضا ہے بعض اوقاف کے بورڈ بہت محدود حد تک اس جانب متوجہ ہیں۔ تامل ناڈو (مدراس) کے وقف بورڈ کے صدر ڈاکٹر امیر الدین اس جانب پوری توجہ دے رہے ہیں"۔

"لیکن" کچھ لمحے توقف کے بعد انھوں نے فرمایا "بنیادی طور پر متولی اغراض وقف کی تکمیل کا پابند ہوتا ہے۔ صرف وہی ہوتا ہے جو واقف نے متعین کیا ہے۔ اس کی آمدنی سے دوسرے کام بھی کئے جا سکتے ہیں بشرطیکہ اغراض وقف میں واقف نے ان کی جانب اشارہ کیا ہو۔ اس کے علاوہ غریب اور نادار مسلمانوں کی کفالت کے بعض مسائل بھی اتنے ہی اہم ہوتے ہیں جتنے تعلیمی کام یتیموں اور بیواؤں کے وظائف کو بعض صورتوں میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور یہ وہ صورتیں ہیں جہاں ان کو وقتی یا ہنگامی امداد دینے میں کوئی بھی کمی کی جاتے تو اُن کا وجود اور زندگی ہی خطرے میں آجاتی ہے۔ لاوارث لاشوں کو دفنانے اور کفنانے کے فرائض سے کس طرح چشم پوشی اختیار کی جا سکتی ہے سسکتے ہوئے اور دم توڑتے ہوئے مریضوں کو بر وقت طبی امداد فراہم نہ کرنے سے ہم پر ایک معصوم اور لاچار کے قتل تک کا الزام عائد ہو سکتا ہے۔

چھوٹے دھندوں میں ضرور ایسی رقمیں لگانی چاہئیں جو ہنگامی اور فوری ضروریات کے مصارف کے بعد بچتی ہوں لیکن اس باب میں دو تین رکاوٹیں ہیں۔ مالی دشواریاں تنظیمی صلاحیت کی کمی مناسب اور موزوں افراد کی عدم میسری۔ اس کے علاوہ کاروباری اسکیموں میں نگرانی کے تعلق سے ہمیشہ چوکنے رہنے کی ضرورت پڑتی ہے جب کہ وقف بورڈ کی نگرانی کے ذرائع محدود ہوتے ہیں اور وہ اپنے مسائل کو حل کرنے میں خود اتنے مصروف رہتے ہیں کہ کاروباری اسکیمیں چلانا اُن کے بس سے باہر ہے اور پھر ہر تجارت میں نقصان کا اندیشہ لاحق رہتا ہے اس لئے وقف کے دیانت دار عمّال اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے کتراتے ہیں"

"ان اندیشوں کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ ایسے صنعتی دھندوں کو تولیت میں بھی تو دے سکتے ہیں۔؟" میں نے اُن سے دریافت کیا۔ احمد صاحب نے فرمایا۔

"اس طریقہ کار سے شکایتیں پیدا ہونے کا امکان ہے"

"کیسی شکایتیں" میں نے دریافت کیا۔

"ظاہر ہے کہ ایسی فیکٹری یا کارخانے کی تولیت حاصل کرنے کی طلب ایک سے زیادہ افراد کو ہو سکتی ہے اور جتنے طلب گار بھی اس عہدے سے محروم کر دیئے جائیں گے وہ لازمی طور پر اس پر جا اور بیجا نکتہ چینیاں کریں گے"

"یہ بات تو طریقہ انتخاب کی خامی یا اس میں کی گئی جانب داری کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ اگر آپ چیدہ اور لائق افراد میں سے کسی ایک کو قرعہ اندازی سے منتخب کر لیں تو یہ شکایت رفع ہو سکتی ہے خود مغلوں کے سنہری دور میں یہ سسٹم رائج تھا۔؟"

احمد صاحب نے کہا کہ اصل دقت تو یہی ہے کہ موزوں اشخاص سامنے نہیں آتے۔ اور جو سامنے آتے ہیں موزوں نہیں ہوتے۔ میں نے اسی ضمن میں اور ایک سوال کیا۔ انھوں نے اس کے بعد کہا کہ اس بات سے تو اُن لوگوں کی شکایت صحیح ثابت ہوتی ہے جو متولیوں کو عام طور پر دیانت دار اور امین مکمل نہیں سمجھتے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو ایسے تمام متولیوں کو اُن کے عہدوں سے سبک دوش کر دینا چاہئے"

حسن الدین احمد صاحب نے اس اہم سوال کا جواب دیتے ہوئے انکشاف کیا کہ متولی، واقف کی منشا کے مطابق مقرر کئے جاتے ہیں اور جب تک وہ اغراض وقف کی صریحی خلاف ورزی نہ کریں تو انھیں سبکدوش کرنا خلاف قانون ہے اور سبکدوش کرنے کے سلسلہ میں مراحل ضابطے کی پابندی بھی ضروری ہے۔

پھر احمد صاحب نے اُن جائدادوں کا جو افراد کی تولیت میں ہیں تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ متولی ایسی وقف شدہ جائدادوں کی آمدنی اور خرچ کا سالانہ حساب بھی پیش کرتے ہیں۔ ان حسابات کی تنقیح بھی ہوتی ہے اور بجٹ میں بھی ترمیم و تنقیح کی جاتی ہے۔ ہر متولی وقف شدہ جائداد کی آمدنی کا چھ فی صدی متعلقہ وقف بورڈ کو ادا کرتا ہے جس میں سے ایک فی صدی مرکزی وقف کونسل کو ملتا ہے۔ پھر اصل سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ تمام متولیوں کو مشکوک نظروں سے نہیں دیکھا جا سکتا کیوں کہ ان میں سے بہت سے کردار کی اعلیٰ قدروں کے حامل ہیں۔ اصل سوال موثر نگرانی کا ہے۔ اگر نگرانی موثر ہوگی تو متولیوں کی جانب سے پیدا ہونے والی غلطیوں میں معتد بہ کمی ہوگی۔

اس جواب کے سلسلے میں بات کو آگے بڑھاتے ہوئے موصوف سے ریاستی اور مرکزی وقف بورڈوں کے طریقۂ کار پر روشنی ڈالنے کے لئے کہا۔

احمد صاحب نے کہا کہ۔

ہر ریاست میں ایک وقف بورڈ قائم ہے جس کے اراکین کی تعداد گیارہ ہوتی ہے۔ ممبران کی نامزدگی ریاستی حکومت کرتی ہے۔ بعض علاقے جیسے انڈمان نکوبار وغیرہ جن کا انتظام براہ راست مرکز کے ماتحت ہے وہاں کا بورڈ پانچ ممبران پر مشتمل ہوتا ہے۔ دلی اس فارمولے سے مستثنیٰ ہے چوں کہ یہاں جائداد کافی ہے اس لئے یہاں کے وقف بورڈ میں گیارہ اراکین ہی نامزد کئے جاتے ہیں لفٹیننٹ گورنر ممبران کی نامزدگی مرکزی حکومت کے مشورے سے کرتے ہیں جب کہ دوسری ریاستوں میں نامزدگی کا حق ریاستی حکومتوں کو ہوتا ہے۔ ممبران کی نامزدگی کرتے وقت حکومت ایسے مسلمانوں کو لیتی ہے جو اسمبلی کے اراکین ہوں یا پھر کسی مسلم عوامی ادارے کے رکن ہوں۔ قانون اور فقہ اور نظم و نسق کی معلومات رکھنے والے مسلمانوں کو بھی اس بورڈ کی رکنیت کے لئے نامزد کیا جاتا ہے۔

مرکزی وقف کونسل بیس اراکین پر مشتمل ہوتی ہے ان اراکین کو پانچ سال کے لئے نامزد کیا جاتا ہے۔ مرکزی وقف کونسل اوقافی مسائل پر مرکزی حکومت کو مشورے دیتی ہے۔

"حکومت ممبران کی نامزدگی کی بجائے اُن کا چناؤ کیوں نہیں کراتی"

جواب دیتے ہوئے موصوف نے کہا ریاستی اور مرکزی حکومت اوقاف کے بہتر انتظام کی ذمہ دار ہے اور عموماً ایسے ہی مسلمان نامزد کئے جاتے ہیں جو عوام میں مقبول ہوتے ہیں اور جن کی عام شہرت رہی ہو۔۔

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وقف بورڈ کی جملہ خرابیوں کی ذمہ دار بھی حکومت ہی ہے" میں نے کہا۔

جواب دیتے ہوتے احمد صاحب نے کہا سردست حکومت کی یہ ذمہ داری کئی زاویوں سے مناسب نظر آتی ہے۔ ابھی نہ جانے کتنی جائدادوں کو واگذاشت کرانا ہے۔ عدالتی کارروائیوں سے نپٹنا ہے اور اس طرح وقف کے بجٹ پر بھی دیگر انتظامی امور کے مصارف کا بوجھ کم ہوجاتا ہے اصل مسئلہ مسلمانوں میں اوقاف کے تعلق سے شعور بیدار ہونے کا ہے تاکہ وقف بورڈ کی تشکیل کے وقت موزوں افراد کو نامزد کرسکیں۔ اگر ایسا شعور موجود نہ ہو تو انتخابات کا طریقہ کار بھی ایسی ہی خرابیوں کو پیدا کرسکتا ہے جو نامزدگی کے طریقۂ کار میں آپ کو نظر آتی ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ خرابیاں پیدا۔۔۔ ہوسکتی ہیں۔

اب میں نے اُن سے اگلا سوال کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"کیا آپ اوقاف کے موجودہ قانون سے مطمئن ہیں۔"

"ہندوستان میں مسلمانوں کے ابتدائی دور سے اوقاف کا انتظام قاضیوں کے ماتحت تھا اور ان کی نگرانی کا یہ سلسلہ متواتر و مسلسل انگریزوں کے ابتدائی دور تک رہا جسے بعد میں انھوں نے منقطع کردیا۔ بلاشبہ برطانوی حکومت نے اوقاف کے ساتھ صریحی ناانصافی برتی اور اپنا عمل انتہائی معاندانہ رکھا۔ اگر انگریزوں کے دور حکومت کے اوقاف سے متعلق قوانین پر غیر جانبدارانہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد اوقاف کا تحفظ یا صیانت ہرگز نہیں تھا۔

آزادی کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے مسلم زعماء کی خاص دلچسپی کی وجہ سے "یکساں بل" کے نام سے موجودہ قانون کی ابتدائی صورت گری ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آزادی کے بعد قومی حکومت نے ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار تمام ہندوستان کے اوقاف کے لئے ایک نوعیت کا جامع قانون مدون کیا ۱۹۵۴ء کا قانون بلاشبہ قوانین کی قطار میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جس سے اوقاف کے انتظام میں پہلی مرتبہ مرکزیت پیدا ہوتی۔ میں یہ نہیں کہوں گا میں یا ہماری وزارت اس قانون سے پوری طرح مطمئن ہے کیوں کہ کوئی بھی قانون ہمیشہ کے لئے کارآمد قرار نہیں دیا جاسکتا۔ قانون ایک طرح سے ایسا پہننے والا لباس ہے جو ہمیشہ تبدیلی چاہتا ہے۔ تجربات کی بنا پر چند مسائل سامنے آرہے ہیں جن سے موجودہ قانون میں ترمیم کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔

میرے سوال کا جواب دینے کے بعد انھوں نے ازخود پھر اس مسئلہ پر روشنی ڈالی جو میرے دماغ میں عرصہ دراز سے اضطراب اور بے چینی پیدا کر رہا تھا اور وہ مسئلہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ اوقاف عامۃ المسلمین کی معاشی زبوں حالی کو کس حد تک دور کرسکتے ہیں۔ اور کیا مرکزی وقف کونسل کے سامنے ایسا کوئی لائحہ عمل ہے جو اوقاف کی آمدنی سے مسلمانوں کی اقتصادی حالت میں سدھار پیدا کرسکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے فرمایا۔

"عامۃ المسلمین کے معاشی اور اقتصادی حالات سدھارنے کے لئے اوقاف اسی وقت مؤثر ثابت ہوسکتے ہیں جب خود انفرادی اوقاف کا انتظام بہتر ہو کر ان کی آمدنی میں معتدبہ اضافہ ہو۔ میرے پیش نظر یہ لائحہ عمل ہے اور جس کو میں ہر ہر صوبہ کے وقف بورڈ کے سامنے رکھ چکا ہوں کہ اوقافی جائدادوں کا سدھار کیا جائے اُن میں ضروریات حاضرہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اضافے کئے جائیں۔ بوسیدہ اور فرسودہ عمارتوں کو اس طرح از سر نو تعمیر کیا جائے اُن کی آمدنی سے ملت اسلامی کے ضروری مسائل کو حل کرنے کی جانب قدم اٹھایا جاسکے۔ دور حاضر میں مالی وسائل کی سہولتیں وافر تعداد میں موجود ہیں اُن سے اس طرح استفادہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ قرضوں کی ادائگی کے ساتھ ساتھ سابقہ آمدنی سے زیادہ رقومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

اسی لئے میں نے وقف ڈیولپمینٹ کارپوریشن کا تصور پیش کیا ہے جس پر بعض ریاستی وقف بورڈ غور کر رہے ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ جلد ہی اس کی صورت گری ہوگی"

بیان جاری رکھتے ہوتے حسن الدین احمد صاحب نے پر وثوق لہجہ میں فرمایا کہ۔

"ہندوستان میں مسلم اوقاف کی شکل میں متعدد شہروں میں کافی قیمتی اور موقع کی جائدادیں ہیں جن سے ہم بھرپور اور مقدور بھر استفادہ کریں گے اور اس طرح آمدنی میں چوگنا اور کہیں کہیں دس گنا اضافہ ہوسکے گا۔ اسی لئے اب یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ اصل سوال شہری اوقافی جائدادوں کو ڈیولپ کرنے کا ہے اور ہندوستان کے اوقاف کا مستقبل اسی ڈیولپمینٹ سے وابستہ ہے۔ اگر ایک بار یہ جائدادیں عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق ڈیولپ ہوجائیں تو پھر عام مسلمانوں کے معاشی، اقتصادی، دینی، تعلیمی اور سماجی مسائل آسانی کے ساتھ حل کئے جاسکیں گے۔ جنوبی ہندوستان میں اوقاف کی امداد کے سہارے کالج، مدارس ٹیکنیکل ادارے کام کر رہے ہیں۔

جواب دیتے ہوئے انھوں نے افسردہ لہجہ میں کہا۔

"دست برد زمانہ سے جو اوقافی جائدادیں یا تو ناجائز قبضوں میں جاچکی ہیں یا خود متولی اُن کو خانگی جائداد کے طور پر استعمال کر رہے ہیں اُن کا پتہ چلانے کے لئے باضابطہ سروے ایک فوری ضرورت تھی چنانچہ جن ریاستوں میں مرکزی اوقاف کا قانون ۱۹۵۴ء نافذ ہوچکا ہے اُن کی حد تک سروے کمشنر کا انتخاب کر کے سروے کا کام شروع کردیا گیا ہے۔ آسام۔ گجرات (علاقہ کچھ) ہریانہ کرناٹک۔ تامل ناڈو، آندھرا پردیش (علاقہ آندھرا) کیرالہ (علاقہ ملابار) پنجاب، راجستھان،

بقیہ صفحہ ۔۔ پر

اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش اسباب اور علاج

کمال اتاترک کی قیادت (۱۹۳۸-۱۹۲۴) میں عالم اسلام میں تجدد و مغرب زدگی کے نظریات
ا قدر پھیل گئے۔ کہ آزاد اسلامی ممالک یا نئی قائم ہونے والی مسلم سلطنتوں کے بانی اور
حاکم و بیش اس کے فکر سے متاثر تھے۔ ہر ملک کے ذہین، اعلیٰ تعلیم یافتہ، اور صاحب اختیار طبقہ
رخ کمالی طرز کی اصلاحات و ترقیات اور تجدد و مغربیت کی طرف ہے۔ ہم کو اس امر پر غور کرنا
ہئے کہ کیا یہ محض اتفاق ہے۔ یا یہ کمال اتاترک کی طاقت ور شخصیت کا نتیجہ ہے یا اس کی وہیں
ں سے زیادہ ٹھوس، موثر اور عالمگیر اسباب پائے جاتے ہیں۔ کہ عالم اسلام میں ملک اور سوسائٹی
نئی تعمیر و تشکیل کے لئے جو اٹھتا ہے وہ کمال اتاترک ہی کے نقش قدم پر چلتا ہے۔ اور ملک کی
قی و استحکام کا راز تجدد و مغربیت ہی میں سمجھتا ہے۔

ہمارے نزدیک اس کے کچھ گہرے ٹھوس اور عمومی اسباب ہیں۔ ہم یہاں مختصر طریقے پر علیحدہ
علیحدہ ان اسباب و عوامل کا جائزہ لیں گے۔

مغربی نظام تعلیم

اہل نظر جانتے ہیں کہ انسانی وجود کی طرح نظام تعلیم بھی اپنی ایک روح اور تعمیر رکھتا ہے۔
روح اور ضمیر در اصل اس کے واضعین و مرتبین کے عقائد و نفسیات، زندگی کے متعلق ان کے نقطہ نظر،
عالم و کائنات و علم اسماء، کی اساس و مقصد اور ان کے اخلاق کا عکس اور پرتو ہوتا ہے۔ جو اس
نظام کو ایک مستقل شخصیت، ایک مستقل روح اور ضمیر عطا کرتا ہے۔ یہ روح اس کے پورے ڈھانچہ
ادب و فلسفہ تاریخ، فنون لطیفہ، علوم عمرانیہ، حتیٰ کہ معاشیات و سیاسیات میں اس طرح سرایت
کر جاتی ہے کہ اس کو اس کے جوہر کرنا بڑا کٹھن کام ہے۔ یہ بہت بڑے صاحب اجتہاد اور اعلےٰ
تنقیدی صلاحیت رکھنے والے کا کام ہے۔ کہ اس کے مفید اجزا کو مضر اجزا سے الگ کر کے "خذ
ما صفا ودع ما کدر" پر عمل کرے۔ اور اصل و زوائد میں فرق کر کے اس کا جوہر اور اس کی روح
لے لے۔ طبعی و تجربی علوم میں یہ کام بہت مشکل نہیں لیکن ادب و فلسفہ اور علوم عمرانیہ میں یہ کام بڑا
نازک اور مشکل ہے۔ خاص طور پر جب کوئی ایسی قوم جو متعین و محکم عقائد، مستقل فلسفہ حیات اور
مسلک زندگی، اپنی ایک مستقل تاریخ جو محض ماضی کا ایک ملبہ نہیں بلکہ آئندہ نسلوں کے لئے نشان
راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور جس کے لئے پیغمبر کی شخصیت اور اس کا زمانہ آئیڈیل کی حیثیت
رکھتا ہے۔ جب کبھی ایسی قوم یا ادارہ کا نظام تعلیم قبول کرتی ہے جو اساس و بنیاد اور مثال و معیار میں
اس سے مختلف بلکہ اس کی ضد واقع ہوئی ہے۔ تو قدم قدم پر تصادم ہوتا ہے۔ اور ایک کی تعمیر

دوسرے کی تخریب، اور ایک کی تصدیق دوسرے کی نفی و تردید، ایک کا احترام دوسرے کی تحقیر
کے بغیر ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں پہلے ذہنی کشمکش، پھر عقائد میں "تزلزل" پھر اپنے دین سے انحراف
اور قدیم افکار و اقدار بجائے جدید افکار و اقدار کا آنا ضروری ہے۔ یہ سب ایک قدرتی امر ہے
اور بالکل قدرتی امور کی طرح اس کا پیش آنا ضروری ہے۔ کسی قسم کی خوش نیتی، ضمیر کی خلش مربیوں
کی خواہش، خارجی و جزئی انتظامات، اس امر کے وقوع میں خارج نہیں ہو سکتے۔ اس کی رفتار کو
سست اور اس کے وقوع کو موخر کر سکتے ہیں۔ ملتوی نہیں کر سکتے۔ درخت اپنے طبعی نظام سے
نشو و نما پائے تو وہ اپنے برگ و بار ضرور پیدا کرے گا۔ اور وقت پر پھل لائے گا۔ انسان کو اس کا
اختیار ہے کہ درخت نہ لگائیں یا اس کو پانی نہ دیں۔ یا جب تیار ہو تو اس کی ہستی کو ختم کر دیں۔
مگر اس کا اختیار نہیں۔ کہ ایک توانا و تندرست، سرسبز و شاداب درخت کو اپنے نومی وجود
و شخصیت کے اظہار اور وقت پر پھل پھول لانے سے روک سکیں۔

یہی معاملہ مغربی نظام تعلیم کا ہے۔ وہ اپنی ایک روح اور اپنا ایک منفرد نظریہ رکھتا ہے
جو اپنے مصنفین و مرتبین کے عقیدہ و ذہنیت کا عکس، ہزاروں سال کے طبعی ارتقاء کا نتیجہ، اہل مغرب
کے مسلمہ افکار و اقدار کا مجموعہ اور ان کی تعبیر ہے۔ یہ نظام تعلیم جب کسی اسلامی ملک یا مسلمان معاشرہ
میں نافذ کیا جائے گا۔ تو اس سے ابتداءً ذہنی کشمکش، پھر اعتقادی تزلزل یا پھر ذہنی اور بعد میں دینی
ارتداد و قدرتی امر ہے۔ ایک سلیم الطبع مغربی مفکر نے جس کو مغرب کے نظام تعلیم اور مشرق میں اس کے نتائج
کا وسیع تجربہ ہے صحیح لکھا ہے۔

> ہم نے گذشتہ صفحات میں اس بات کی تائید میں چند اسباب و دلائل پیش کئے ہیں۔
> کہ اسلام اور مغربی تمدن جو زندگی کے دو متضاد نظریوں پر قائم ہیں۔ ایک دوسرے
> کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے۔ جب واقعہ یہ ہے۔ تو ہم کیسے اس بات کی توقع
> کر سکتے ہیں۔ کہ مسلمانوں کی نئی نسل کی مغربی بنیادوں پر ایسی تعلیم و تربیت، جو
> عمومی طور پر یورپ کے علمی و ثقافتی تجربوں اور ان کے تقاضوں پر مبنی ہے، مخالف
> اسلام اثرات سے پاک ہو سکتی ہے۔
>
> ہماری اس توقع کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں۔ اگر ہم بعض ایسے غیر معمولی حالات
> کا استثنا کر دیں۔ جن میں کسی انتہا درجہ کے روشن اور فائق دماغ کے لئے ایسا
> ممکن ہوا کہ وہ اپنے درسی مضامین سے متاثر نہیں ہو سکا۔ تو عام اصول یہی رہے
> گا۔ کہ مسلمانوں کی نئی نسلوں کی مغربی تعلیم و تربیت ان کو اس قابل نہیں رکھے گی۔

کہ وہ اپنے کو اس مخصوص ربانی تمدن کا نمائندہ سمجھیں۔ جس کو اسلام نے کر دیا ہیں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں۔ کہ ان روشن خیالوں کے اندر دینی عقائد برابر مضمحل ہوتے جا رہے ہیں۔ جنھوں نے مغربی بنیادوں پر نشو و نما حاصل کیا ہے۔

پھر وہ نصاب تعلیم کے مختلف اجزا کے متعلق علیحدہ علیحدہ گفتگو کرتے ہوتے لکھتے ہیں۔

مغربی ادبیات کی تعلیم کا انجام اس شکل میں جو اس وقت اکثر اسلامی اداروں میں رائج ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کہ اسلام مسلمان نوجوانوں کی نگاہ میں ایک اجنبی چیز بن جاتے۔ یہی بات بلکہ اس سے بہت زیادہ یورپ کے فلسفہ تاریخ پر صادق آتی ہے۔ اس لئے کہ یورپ کا قدیم نظریہ تاریخ یہ ہے کہ دنیا میں دو ہی گروہ ہیں۔ رومی اور وحشی تاریخ کو اس طرح پیش کرنے کا ایک پوشیدہ مقصد ہے وہ یہ کہ ثابت کیا جائے کہ مغربی اقوام اور ان کا تمدن ہر اس چیز سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ جس کا اس وقت تک وجود ہوا یا آئندہ کبھی دنیا میں وجود ہو سکتا ہے۔ اس سے اہل مغرب کے حصول اقتدار کی کوشش اور مادی طاقت کا اخلاقی جواز پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ حق بجانب ثابت ہوتی ہے۔

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں۔

تاریخ کی اس طرح کی تعلیم نوجوانوں کے دماغوں میں اس کے علاوہ کوئی اور اثر نہیں چھوڑ سکتی۔ کہ وہ احساس کمتری میں مبتلا ہوں۔ اور اپنی پوری ثقافت (کلچر) اور اپنے مخصوص تاریخی عہد کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگیں۔ اور مستقبل میں ان کے لیے ترقی و خدمت کے جو وسیع اور روشن امکانات ہیں۔ ان کا انکار کرنے لگیں۔ اس طرح وہ ایک ایسی منظم تربیت حاصل کرتے ہیں۔ جن میں اپنے ماضی اور اپنے مستقبل کی کامیابی صرف اس میں ہے۔ کہ وہ مغربی معیار کے مطابق اور مغرب کے افکار و اقدار سے ہم آہنگ ہوں۔

آگے چل کر وہ بڑی جرات کے ساتھ کہتے ہیں۔

اگر مسلمانوں نے زمانہ ماضی میں علمی تحقیق و تفکر کے کام کو نظر انداز کر کے غلطی کی تو اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ اس غلطی کی اصلاح کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ مغرب کا نظام تعلیم جوں کا توں قبول کر لیں۔ ہماری پوری تعلیمی پسماندگی اور علمی بے بضاعتی اس ہلاک اثر کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ جو مغرب کے نظام تعلیم کی اندھی تقلید، اسلام کی مخفی دینی طاقتوں پر ڈالے گی۔ اگر ہم اسلام کے جوہر کو یہ سمجھ کر محفوظ رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ ایک مستقل علمی و تہذیبی عنصر ہے۔ تو ہمارے لئے ضروری ہوگا۔ کہ ہم مغربی تمدن کے ذہنی ماحول اور فضا سے دور دور رہیں۔ وہ فضا ہمارے معاشرے اور ہمارے میلانات پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے تیار ہے۔ مغرب کے طور و طریق اور اس کے لباس و مظاہر زندگی کو قبول کر لینے سے آہستہ آہستہ مغرب کے نقطۂ نظر کو قبول ہونے پر مجبور ہو جائیں گے۔ خارجی مظاہر کی تقلید اس ذہنی رجحان تک پہنچا دیتی ہے۔

اس نتیجہ کی پیشین گوئی ان بعض مغربی مفکرین نے بھی کی ہے۔ جو ایشیائی اور مشرقی ممالک میں اس نظام تعلیم کو رواج دینے والے تھے۔ مشہور انگریز ماہر تعلیم لارڈ میکالے نے بھی جو ۱۸۳۵ء میں اس تعلیمی کمیٹی کے صدر تھے، جو یہ طے کرنے کے لئے بیٹھی تھی۔ کہ ہندوستانیوں کو مشرقی زبانوں کی جگہ انگریزی زبان میں تعلیم دی جائے۔ اپنی رپورٹ میں لکھا تھا۔

ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہئے۔ جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان ترجمان ہو یہ ایسی جماعت ہونی چاہئے۔ جو خون و رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہے۔ مگر مذاق اور رائے الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔

یہ مغربی نظام تعلیم در حقیقت مشرق و اسلامی ملکوں میں ایک گہرے قسم کی خاموش نسل کشی کے مرادف تھا۔ عقلائے مغرب نے ایک پوری نسل کو جسمانی طور پر ہلاک کرنے کے فرسودہ اور بدنام طریقہ کو چھوڑ کر اس کو اپنے سانچے میں ڈھال لینے کا فیصلہ کیا۔ اور اس کام کے لئے جا بجا مراکز قائم کئے جن کو تعلیم گاہوں اور کالجوں کے نام سے موسوم کیا۔ اکبر مرحوم نے اس سنجیدہ تاریخی حقیقت کو اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔ ان کا مشہور شعر ہے۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ایک دوسرے شعر میں انھوں نے مشرقی اور مغربی حکمرانوں کا فرق اس طرح بیان کیا ہے۔

مشرقی تو سر دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

اس سے کئی برس بعد اقبال نے جنھوں نے نظام تعلیم کا خود زخم کھایا تھا۔ اس حقیقت کو زیادہ سنجیدہ انداز میں اس طرح پیش کیا ہے۔

معاش ایمن از آں علمے کہ خوانی
کہ از وے روح قومے می تواں کشت

تعلیم جو قلب ماہیت کرتی ہے۔ اور جس طرح ایک سانچہ توڑ کر دوسرا سانچہ بناتی ہے۔ اس کو بیان کرتے ہوتے کہتے ہیں۔

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

وہ مغرب کے اس نظام تعلیم کو دین و اخلاق کے خلاف ایک سازش قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

اقبال دوسرے ان چند افراد میں سے ہیں۔ جو مغربی نظام تعلیم کے سمندر میں غوطہ لگا کر ابھر آئے۔ اور نہ صرف یہ کہ بچ سلامت ساحل پر پہنچے۔ بلکہ اپنے ساتھ بہت سے موتی تہ سے نکال کر لائے۔ اور ان کی خود اعتمادی، اسلام کی ابدیت، اور اس کے معجزات پر ان کا یقین اور زیادہ مستحکم ہو گیا۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے۔ کہ انھوں نے مغربی تعلیم اور مغربی فلسفہ کا مطلق اثر قبول نہیں کیا۔ اور ان کا دینی فہم کتاب و سنت اور سلف امت کے بالکل مطابق ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس آتش نمرود نے ان کے ہزاروں معاصرین کی طرح ان کی خودی اور شخصیت کو جلا کر خاکستر نہیں کیا۔ اور بڑی حد تک ان کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ

طلسم علم حاضر را شکستم
ربودم دانہ و دامش گسستم

خداوندا کہ مانند براہیم
بنار او چہ بے پروا نشستم

اس جدید تعلیم اور اس کے اثرات کے متعلق مولانا محمد علی مرحوم کی شہادت بھی بڑی وقعت رکھتی ہے جنھوں نے ایک راسخ العقیدہ دینی ماحول میں تربیت پائی تھی۔ پھر مغربی تعلیم کے بہترین ہندوستانی مرکزوں میں اپنی تعلیم کا آغاز کیا۔ وہ اپنی خود نوشت سوانح میں لکھتے ہیں۔

حکومت برطانیہ مکمل مذہبی غیر جانبداری کی قائل اور علمبردار تھی۔ اور مذہبی حتیٰ کہ اخلاقی تعلیمات کو بالکلیہ بے دخل کر کے اس نے اس پالیسی کو عملی جامہ بھی پہنایا صرف وہ معلومات جن کو لڑکے از خود انگریزی اور مشرقی زبانوں کی درسی کتابوں میں پائے جانے والے لٹریچر سے اخذ کرلیں رہ گئیں۔

دوسری طرف وہ تعلیمی نظریہ جو حکومت نے ہندوستانی نوجوانوں کے لئے بہم پہونچایا تھا "جدید" تھا لیکن اپنی تمام تخریبی صلاحیت کے ساتھ اس کا سارا زور اسی طرف تھا کہ طالب علم کے اندر ایک بے جا ہمہ دانی کا احساس پرورش پاتے اور صدیوں پرانے توہمات کے ساتھ ساتھ روایت و حجت و سند کی ساری عظمت کو ختم کردے۔ اس میں شبہ نہیں کہ رفتار زمانہ کے ساتھ یہ تعلیم حقیقت کی تلاش و جستجو کے ایک مخلصانہ جذبہ کو بیدار کرنے کا سبب بنی۔ لیکن اپنی پہلی یورش میں یہ خاص طور پر تخریبی ہی رہی ہے۔ اور ختم کئے ہوئے توہمات کے بدلے میں جو تھوڑا بہت اس نے دیا۔ وہ بذات خود بے بنیاد عقائد اور توہمات پر مبنی تھا ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ تھوڑا بہت "جدید" تھا۔

" اسلام ان ماڈرن ہسٹری" کا مصنف (ڈبلیو۔ سی سمتھ) جو اسلامی ممالک میں کام کرنے والے مختلف رجحانات اور وہاں کے مختلف طبقوں سے متعلق تازہ معلومات رکھتا ہے اسلامی ممالک میں جدید مغربی تعلیم اور اس کے مرکزوں کے گہرے ذہنی اثر کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ ممالک اسلامیہ کی حریت پسند تحریک لبرل ازم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

ممالک اسلامیہ میں آزاد خیالی او حریت پسندی کی جو تحریک چل رہی ہے۔ اس کا ایک اہم سبب اور عامل (فیکٹر) مغرب کا نفوذ بھی ہے۔ یورپ میں حریت پسندی کی تحریک انیسویں صدی کے اواخر سے لے کر پہلی جنگ عظیم تک اپنے نقطۂ عروج پر رہی ہے۔ یہی معاملہ یورپ کے تفوق اور ترقی کا ہے۔ بہت سے مسلمان نوجوانوں نے مغرب کا سفر کیا۔ اور یورپ کی اسپرٹ اور اس کی اقدار سے انھوں نے واقفیت حاصل کی۔ اور ایک حد تک وہ ان کے گرویدہ ہوتے یہ بات ان طلباء پر خصوصیت کے ساتھ صادق آتی ہے۔ جو روز افزوں تعداد کے ساتھ یورپ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہے ہیں۔ مغرب کی بہت سی چیزیں دنیائے اسلام میں آگئیں۔ اس کام میں پیش پیش وہ تعلیمی ادارے تھے جنھوں نے ایک پوری نسل کی تربیت کی۔ اور اس کو مغرب کے جدید طرز کے حوالے کر دیا مغرب سے آنے والی چیزوں میں متعدد نئے

خیالات اور کم از کم اتنے ہی زیادہ اہم، نازک اور باریک خام ذہنی اندازے اور نئے میلانات تھے۔ جن کو یہ مختلف تعلیمی شائل پھیلانے کے ذمہ دار ہیں۔ مزید براں مغرب کے دوسرے قانونی، سیاسی، اجتماعی، اور دوسری قسم کے جدید اداروں کا بڑھتا ہوا اثر و نفوذ، ان میں سے بعض تو زبردستی مسلط کئے جاتے ہیں۔ اور بعض کے لئے کوشش کی جاتی ہے۔ بعض مسلمانوں نے اس کا مقابلہ کیا۔ بعض نے اس کا خیر مقدم کیا۔ بعض کو ایسی تربیت دی گئی۔ یا انھوں نے خود تدریجی طور پر ان کو خوش آمدید کہا۔ انجام کار بہت سے مسلمان ان نظریات اور اداروں کو مسلمہ حقائق سمجھنے لگے۔ اس طرح سے مغربیت کی کارروائی تیزی اور طاقت کے ساتھ جاری رہی۔

لیکن ان چند مستثنیٰ شخصیتوں (اقبالؒ و محمد علیؒ وغیرہ) کو چھوڑ کر جن کی فطرت ابراہیمی یا خارجی موثرات و واقعات نے ان کے نور ایمانی اور فہم اسلام کی حفاظت کی۔ یا ان کے اندر مغرب کی تہذیب و فکر کے خلاف کوئی شدید رد عمل پیدا ہوا۔ عام طور پر عرب اور عجمی ممالک کے ذہین مسلم نوجوانوں کو (جو اپنی قوم کا جوہر اور سرمایہ تھے) اس نظام تعلیم کے تیزاب نے اتنا بدل دیا۔ کہ نہ اسلام اپنی صحیح شکل و صورت میں ان کے جدید ذہن میں فٹ ہو سکتا ہے۔ اور نہ وہ عام اسلامی معاشرہ میں فٹ ہوتے ہیں۔ اور بقول اقبال

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی

مذہب کے ایک پرائیویٹ معاملہ ہونے پر اصرار جس کو سیاست و ریاست میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ دین اسلام کے ساتھ مسیحی کلیسا کا معاملہ، مذہب و سیاست کی تفریق کا نظریہ۔ مذہب کو ترقی انکشاف و تحقیق کی راہ میں خارج و مخل سمجھنے کا خیال، علمائے اسلام کو مسیحی کلیسا کے ان نمائندوں کی صف میں کھڑا کرنا جو قرون وسطیٰ میں مطلق العنان اقتدار کے مالک تھے۔ عورت کو بالکل مرد کے مساوی سمجھ کر اس کو زندگی کے تمام میدانوں میں دوڑنے اور حصہ لینے کا اہل اور مستحق سمجھنا پردہ کو مشرق کے قدیم حرم کے نظام کی یادگار، اور مردوں کے صنفی استبداد کا نشان سمجھنا اور اسکے ختم کرنے کو اصلاح و ترقی کا پہلا قدم تصور کرنا، اسلام کے قانون میراث اور ضابطہ نکاح و طلاق کو قرون وسطیٰ کے مسلمان فقیہوں کا اجتہاد اور اس کے محدود اور ابتدائی معاشرہ کا طبعی نتیجہ سمجھنا جو ساتویں آٹھویں صدی مسیحی میں قائم تھا۔ اور اس کی تبدیلی و ترمیم اور مغربی اصولوں اور معیاروں کے مطابق بنانے کے کام کو وقت کا ایک ضروری فریضہ قرار دینا۔ سود، شراب، قمار، جنسی تعلقات میں آزادی و بے قیدی کو زیادہ معیوب نہ سمجھ کر نظر انداز کرنا۔ قوم پرستی، قدیم تہذیبوں اور زبانوں کے احیاء کا جذبہ اور لاطینی رسم الخط کی افادیت و اہمیت پر یقین، یہ اور اس طرح کے بہت سے رجحانات (جو اس جدید تعلیم یافتہ نسل کے نزدیک) حقائق و مسلمات کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور روشن خیالی و ترقی پسندی کی علامت ہیں۔ مغربی نظام تعلیم اور (محمد اسد صاحب کے الفاظ میں) اس کے ذہنی و فکری ماحول و فضا اور اس کے تاریخی ورثہ کا نتیجہ ہیں۔

آپ کو ترکی سے لے کر انڈونیشیا تک مسلمان ممالک کے جتنے سربراہ اور رہنما نظر آتے ہیں گے وہ سب اسی مغربی نظام تعلیم کی پیداوار ہیں۔ ان میں سے جن کو براہ راست کسی مغربی ملک یا یورپ کے کسی مشہور تعلیمی مرکز میں پڑھنے اور پروان چڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ انھوں نے اپنے ملک میں رہ کر اس نظام تعلیم سے (اس کے مخلص نمائندوں کی نگرانی و سرپرستی میں) پیدا شدہ

اطلبا ۔ ان میں سے متعدد اشخاص نے مغربی کالجوں میں تعلیم پائی ۔ جہاں مغربی طرز کی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام ہوتا ہے ۔

اس بنا پر آج عالم اسلام میں دو ذہنوں فلسفوں دو معیاروں اور دو رخوں کے درمیان جو کشمکش برپا ہے ۔ اور جو عام طور پر منتج ہوتی ہے ۔ زیادہ طاقت و اسلحہ صاحب اختیار و اقتدار گروہ کی کامیابی پر وہ بالکل قدرتی ہے ۔ وہ اگر ہے تو خواہ کتنے تاسف کی بات ہو ، تعجب کی بات نہیں ۔ تعجب اس وقت ہوتا ۔ جب یہ کشمکش اور تجدد و مغربیت کا یہ رجحان پایا نہ جاتا ۔

زہر کا تریاق

اس کا علاج ۔ خواہ وہ کتنا ہی مشکل اور کتنا ہی دیر طلب ہو اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظام تعلیم کو از سر نو ڈھالا جائے ۔ اس کو مسلمان اقوام کے عقائد مسلمات اور مقاصد اور ضروریات کے مطابق بنایا جائے ۔ اس کے تمام علوم و مضامین مادہ پرستی و خدا بیزاری اخلاقی و روحانی اقدار سے بغاوت اور جسم پرستی کی روح نکال کر ۔ اس میں خدا پرستی ، خدا طلبی آخرت کشی ، تقویٰ شعاری ، اور انسانیت کی روح پیدا کی جائے ۔ زبان و ادب سے لے کر فلسفہ حیات تک اور علوم عمرانیات سے لے کر معاشیات و سیاسیات تک سب کو ایک نئے سانچے میں ڈھالا جائے مغرب کے ذہنی تسلط کو دور کیا جائے ۔ اس کی معصومیت و امامت کا انکار کیا جائے ۔ اس کے علوم و نظریات کو آزادانہ تنقید اور جرأت مندانہ (پوسٹ مارٹم) کا موضوع قرار دیا جائے ۔ مغرب کی سیادت و بالاتری سے عالم انسانی کو جو عظیم الشان نقصانات پہنچے ان کی نشاندہی کی جائے غرض مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے علوم و فنون کو پڑھایا جائے ۔ اور اس کے علوم و تجارت کو مواد خام فرض کر کے اپنی ضرورت اور اپنی قد و قامت اور اپنے عقیدے و معاشرت کے مطابق سامان تیار کیا جائے ۔

اس عظیم کام میں خواہ کتنی ہی مشکلات ہوں ۔ اور اس میں خواہ کتنی دیر لگے ۔ عالم اسلام میں تجدد و مغربیت کی اس عالم گیر رو کا اس کے سوا کوئی علاج نہیں ۔ جو اسلام کے وجود ملی اور اس کے اجتماعی ڈھانچے کو چیلنج کر رہی ہے ۔ اور اس کے لئے شدید خطرہ بلکہ موت و حیات کا مسئلہ بن گئی ہے ۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہے ۔ کہ مسلمان عوام کا خلوص ان کی قربانیاں ان کا جذبہ اور ان کی قوت عمل جس کے سر ان ملکوں کی آزادی اور سلطنتوں کے قیام کا سہرا ہے ۔ اس روشن خیالی و تجدد کی آگ کا ایندھن بن کر رہ گئی ۔ یہ سادہ دل بے زبان گرم جوش اور مخلص عوام ان قائدین و حکمرانوں کے ہاتھ میں بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ بن کر رہ گئے ہیں ۔ جن کو جس منزل کی طرف چاہا جاتا ہے ۔ خاموشی کے ساتھ ہنکایا جاتا ہے ۔

ہندوستان میں انگریزی حکومت کی کامیابی اور استحکام کا راز سول سروس کے طبقہ اور حکام کی مغربی تربیت سلیقہ مندی اور اطاعت شعاری میں تھا ۔ ان ہی نے اس ملک کا ڈھانچہ بنایا ۔ اور ۱۵۰ برس تک کامیابی کے ساتھ اس ملک کو اس کے غیر ملکی حکمرانوں کے منشا اور مزاج کے مطابق چلاتے رہے ۔ اب بھی اسلامی ممالک کے رنگ کی تبدیلی اور اسلامی فکر اور اسلامی زندگی کی طرف ان کو لے چلنے کی امید یہی ہے ۔ کہ اس طبقہ کی اسلامی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جائے جس کے ہاتھ میں ملک کی رہنمائی اور اس کی زیادہ کام آنے والی ہے ۔ اور اس نظام تعلیم کو درست کیا جائے ۔ جو اس طبقہ کو تیار کرتا ہے ۔

نظام تعلیم کی یہ بنیادی تبدیلی اور اس کی اسلامی تشکیل اگرچہ نہایت ضروری ہے ۔ مگر دیر طلب اور طویل کام ہے ۔ اور اس کے وسیع و عظیم صلاحیتوں اور وسائل کی ضرورت ہے ۔ جدید اسلامی نسل کا معاملہ ایک دن کی تاخیر اور التوا کا روادار نہیں ۔ مندرجہ بالا کام کی تکمیل تک (اور حقیقتاً اس کی موجودگی میں بھی) یہ کام ان اسلامی اقامت خانوں سے لیا جا سکتا ہے جن میں یونیورسٹیوں اور کالجوں کے مسلم طلبا مقیم ہوں ۔ قیام کریں ۔ اور وہاں اسلامی تربیت اسلامی زندگی اور ماحول کے قیام اور صالح ذہنی روحانی غذا مہیا کرنے کا خاص اہتمام کیا جائے ۔ اقامت خانوں کا طلبا کی سیرت و زندگی اور ان کے اخلاق و رجحانات کی تشکیل میں جو گہرا حصہ ہے ۔ اس سے وہ حضرات بے خبر نہیں جو اس نسل کا کچھ تجربہ رکھتے ہیں ۔ اسلامی اسکول اور کالج (جن پر ملت کے سرمایہ اور توجہ کا قیمتی حصہ صرف ہو چکا ہے ۔) بہت جلد حالات کی تبدیلی سے اپنی افادیت کھو چکے ہیں ۔ پھر اکثر وہ "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کا مصداق ثابت ہوتے ہیں ۔ ان کے برعکس اقامت خانوں کی تاسیس و انتظام کی مشکلات کم اور فوائد زیادہ ہیں ۔ اور جہاں نظام تعلیم کا سر رشتہ صحیح الخیال و دردمند مسلمان زعماء و قائدین کے ہاتھ سے نکلا ہوا ہے ۔ اور اس کے بازیاب کی جلد امید نہیں وہاں یہ اقامت خانے ہی زیر تعلیم مسلم نوجوانوں کی اخلاقی حفاظت اور ذہنی و دینی تربیت کا سامان کرتے ہیں ۔ اور بہت سی سعید روحوں کو فاسد و مفسد ماحول اور مسخ کرنے والے نظام تعلیم اور اکثر تعلیم کی سمیت سے محفوظ رکھ سکتے ہیں ۔

ان اسلامی اقامت خانوں کی مسلم ممالک کے علاوہ مغربی ممالک میں بھی ضرورت ہے ۔ جہاں وہ مسلمان نوجوان بڑی تعداد میں تعلیم پاتے ہیں ۔ جو ذہانت اور قوت عمل میں ملت کا سرمایہ اور جوہر ہیں ۔ اور جن کے لئے بالعموم (اپنی ذہنی صلاحیتوں اور مغربی علوم و السنہ و سیاست سے واقفیت کی بنا پر) گویا مسلم ممالک کی قیادت اور کم سے کم ان کی کلیدی جگہ مقدر ہو چکی ہیں ۔ اگر ان مرکزوں میں ان کے رجحانات کی اصلاح اور اسلامی ذہن کی تعمیر کا سامان کیا جا سکے ۔ اور اسلام اور اس کے مستقبل پر ان کا اعتماد و بحال کیا جا سکے ۔ تو اس خاموش کام کے ذریعہ ان مسلم ممالک میں خاموشی کے ساتھ وہ اسلامی انقلاب لایا جا سکتا ہے ۔ جن کی قیادت دیر یا سویر یہ نوجوان سنبھالنے والے ہیں ۔ اور یہ طریقہ ان تمام طریقوں سے زیادہ آسان اور محفوظ معلوم ہوتا ہے جن کا عرصے براہ راست ان ممالک میں تجربہ کیا جا رہا ہے ۔

مغربی مستشرقین اور انکی تحقیقات و افکار کا اثر

موجودہ عالم اسلام کے رہنما و حکمران طبقہ کے (جس نے اعلیٰ مغربی تعلیم گاہوں میں تعلیم پائی ہے یا مغربی زبانوں میں اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے) ذہنوں میں اسلام کے ماضی کی طرف سے بدگمانی ، اس کے حال کی طرف سے بیزاری ، اس کے مستقبل کی طرف سے مایوسی ، اسلام و پیغمبر اسلام اور اسلامی ماخذ کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے اور اصلاح مذہب "اصلاح قانون اسلامی" کے اس طرف پر آمادہ کرنے میں جس کا نمونہ اوپر گذر چکا ہے ۔ بہت بڑا حصہ ان علمائے مغرب کا ہے ۔ جنھوں نے اسلامیات کے مطالعہ کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں ۔ اور ان کو عام طور پر مستشرقین کہا جاتا ہے ۔ اور جو اپنے علمی تبحر تحقیقی انہماک اور مشرقیات سے گہری واقفیت کی بنا پر مغرب و مشرق کے علمی و سیاسی حلقوں میں بڑی عظمت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں ۔ اور ان کی مشرقی اسلامی مباحث و مسائل میں ان کی تحقیق و نظریات کو صرف آخر و تقلیل [illegible]

ہے۔

اس استشراق کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اور واضح طریقہ پر تیرھویں صدی عیسوی سے شروع ہوا ہے۔ اس کے محرکات متعدد بھی تھے۔ سیاسی بھی، اقتصادی بھی، دینی محرک واضح ہے۔ ان کا بڑا مقصد مسیحیت کی اشاعت و تبلیغ اور اسلام کی ایسی تصویر پیش کرنا ہے۔ کہ مسیحیت کی برتری خود بخود ثابت ہو۔ اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب و نسل کے لئے مسیحیت میں کشش پیدا ہو تا چنانکہ استشراق اور تبلیغ مسیحیت ساتھ ساتھ چلتے ہیں مستشرقین کی بڑی تعداد اصلاً پادری ہے۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد نسلاً و مذہباً یہودی ہے۔

سیاسی محرک یہ ہے۔ کہ یہ مستشرقین عام طور پر مشرق میں مغربی حکومتوں اور اقتدار کا ہراول دستہ رہے ہیں مغربی حکومتوں کو علمی کمک اور رسد پہنچانا ان کا کام ہے۔ وہ ان مشرقی اقوام و ممالک کے رسم و رواج طبیعت و مزاج، طریق ماند و بود، اور زبان و ادب، بلکہ جذبات و نفسیات کے متعلق صحیح اور تفصیلی معلومات بہم پہونچاتے ہیں۔ تاکہ ان پر اہل مغرب کو حکومت کرنا آسان ہو۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان حالات و تحریکات، عقائد و خیالات کا تو ڑ کرتے رہتے ہیں۔ جو ان حکومتوں کیلئے پریشانی و دردسر کا باعث ہیں۔ اور ایسی ذہنی و علمی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جن میں ان حکومتوں کی مخالفت کا خیال ہی پیدا نہ ہونے پائے۔ اس کے بالمقابل ان کی تہذیب کی عظمت اور ان کی خدمات کی وقعت پیدا ہو۔ اور اپنے ملک کی اصلاح و ترقی اور ان کی مغرب کے نقش قدم پر لے چلنے کا ایسا جذبہ پیدا ہو۔ کہ ان مغربی حکومتوں کے ہٹ جانے پر بھی ان کا ذہنی اور تہذیبی اقتدار قائم رہے۔

اسی بنا پر مغربی حکومتوں نے مستشرقین کی اہمیت و افادیت کو پوری طرح محسوس کیا۔ اور ان کے سربراہوں نے ان کی پوری سرپرستی کی، اور اس مقصد کے ماتحت مختلف ممالک کے مستشرقین عالم اسلام سے متعلق مختلف رسائل اور مجلات شائع کرتے ہیں جن عالم اسلام کے مسائل و رجحانات پر سہ ماہی انہ تبصرہ و ماہرانہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس وقت بھی رسالہ "مشرق وسطیٰ" اور مجلہ "عالم اسلامی"، امریکہ سے اور پیرس سے نکل رہے ہیں۔

ان اہم مذہبی اور سیاسی محرکات کے علاوہ قدرتی طور پر استشراق کا ایک محرک اقتصادی بھی ہے بہت سے فضلا اس کو ایک کامیاب پیشہ کے طور پر اختیار کرتے ہیں۔ بہت سے ناشرین اس بنا پر کہ ان کتابوں کی جو مشرقیات اور اسلامیات پر لکھی جاتی ہیں۔ یورپ و ایشیا میں بڑی منڈی ہے اس کام کی ہمت افزائی اور سرپرستی کرتے ہیں۔ اور بڑی سرعت کے ساتھ یورپ و امریکہ میں ان موضوعات پر کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ جو بہت بڑی مالی منفعت اور کاروبار کی ترقی کا ذریعہ ہیں۔ ان مقاصد کے علاوہ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ بعض فضلا مشرقیات و اسلامیات کو اپنے علمی ذوق و شغف کے ماتحت بھی اختیار کرتے ہیں۔ اور اس کے لئے اس دیدہ ریزی، دماغ سوزی، اور جفاکشی سے کام لیتے ہیں۔ جس کی داد نہ دینا ایک اخلاقی کوتاہی اور علمی ناانصافی ہے۔ ان کی مساعی سے بہت سے مشرقی و اسلامی علمی جواہرات لعل و گہر وہ خزانے نکل کر منظر عام پر آئے۔ اور جاہل وارثوں اور ظالم کیڑوں کی دست برد سے محفوظ ہو گئے عالم اسلامی مآخذ اور تاریخی وثائق ہیں۔ جو ان کی محنت و ہمت سے پہلی مرتبہ شائع ہوئے۔ اور مشرق کے اہل علم نے اپنی آنکھوں کو ان سے روشن کیا۔

اس علمی اعتراف کے باوجود اس کے کہنے میں باک نہیں، کہ مستشرقین عمومی طور پر اہل علم کا وہ بدقسمت اور بے توفیق گروہ ہے۔ جس نے قرآن و حدیث، سیرت نبوی، فقہ اسلامی، اخلاق و تصوف کے سمندر میں بار بار غوطے لگائے۔ اور بالکل خشک دامن اور تہی دست واپس آیا۔ بلکہ اس سے اس کا عناد اسلام

سے دوری اور حق کے انکار کا جذبہ اور بڑھ گیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ نتائج ہمیشہ مقاصد کے تابع ہوتے ہیں۔ عام طور پر ان مستشرقین کا مقصد کمزوریوں کا تلاش کرنا اور دینی یا سیاسی مقاصد کے ماتحت ان کو نمایاں کرنا اور دکھانا ہوتا ہے۔ چنانچہ صفائی کے انسپکٹر کی طرح ان کو ایک گلزار و چمن نشاں میں صرف غیر صحت مند مقامات ہی نظر آتے ہیں۔

مستشرقین کی محرومی صرف ان کی ذات تک محدود نہیں۔ اگر تنہا یہ پہلو ہوتا۔ تو وہ ہماری توجہ کا مرکز اور ہماری اس بحث کا موضوع نہ ہوتا ہے۔ مسئلہ کا زیادہ سنگین اور دور رس پہلو یہ ہے۔ کہ وہ اپنا تمام صلاحیتوں کو معقول و غیر معقول طریقہ پر ان کی کمزوریوں کی نشاندہی اور ان کو نہایت مہیب شکل میں پیش کرتے ہیں۔ وہ خوردبین سے دیکھتے ہیں۔ اور اپنے قارئین کو دوربین سے دکھلاتے ہیں۔ رائی کا پربت بنانا ان کا ادنیٰ کام ہے وہ اپنے اس کام میں (یعنی اسلام کی تاریک تصویر پیش کرنے میں) اس سبک دستی، ہنرمندی، اور صبر و سکون سے کام لیتے ہیں۔ جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ وہ پہلے ایک مقصد تجویز کرتے ہیں۔ اور ایک بات طے کر لیتے ہیں۔ کہ اس کو ثابت کرنا ہے۔ پھر اس مقصد کے لئے ہر طرح کے رطب و یابس، مذہب و تاریخ، ادب، افسانہ، شاعری، مستند و غیر مستند ذخیرہ سے مواد فراہم کرتے ہیں۔ اور جس سے ذرا بھی ان کی مطلب براری ہوتی ہو اس کو بڑے آب و تاب سے پیش کرتے ہیں۔ اور اس متفرق مواد سے ایک نظریہ کا ڈھانچہ تیار کر لیتے ہیں۔ جن کا اجتماعی وجود صرف ان کے ذہن میں ہوتا ہے۔ وہ اکثر ایک برائی بیان کرتے ہیں۔ اور اس کو دماغوں میں بٹھانے کے لئے بڑی فیاضی کے ساتھ اپنے ممدوح کی دس خوبیاں بیان کرتے ہیں۔ تاکہ پڑھنے والے کا ذہن اور ان کے انصاف اور وسعت قلب اور بے تعصبی سے مرعوب ہو کر اس ایک برائی کو قبول کر لے۔ وہ کسی شخصیت یا دعوت کے ماحول تاریخی پس منظر، قدرتی و طبعی عوامل و محرکات کا نقشہ ایسی خوبصورتی اور عالمانہ انداز سے کھینچتے ہیں کہ ذہن اس کو قبول کرتا چلا جاتا ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں وہ اس شخصیت و دعوت کو اس ماحول کا قدرتی رد عمل یا اس کا فطری نتیجہ سمجھنے لگتا ہے۔ اور اس کی عظمت و تقدیس اور کسی غیر انسانی سرچشمہ سے اس کے اتصال و تعلق منکر ہو جاتا ہے۔ اکثر مستشرقین اپنی تحریروں میں زہر کی ایک مناسب مقدار رکھتے ہیں اور اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ کہ وہ تناسب سے نہ بڑھنے پائے۔ اور پڑھنے والے کو متنفر و بدگمان نہ کر دے۔ ان کی تحریریں زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہیں۔ اور ایک متوسط آدمی کا ان کی زد سے بچ کر نکل جانا مشکل ہے۔ قرآن، سیرت نبوی، فقہ و کلام، صحابہ کرام، تابعین، ائمہ مجتہدین، محدثین و فقہا، مشائخ و صوفیا، حدیث، فن جرح و تعدیل، اسماء الرجال، حدیث کی حجیت، تدوین حدیث، فقہ اسلامی کے ماخذ فقہ اسلامی کا ارتقاء ان میں سے ہر موضوع کے متعلق مستشرقین کی کتابوں اور تحقیقات میں اتنا تشکیکی مواد پایا جاتا ہے۔ جو ایک ایسے ذہین و حساس آدمی کو، جو اس موضوع پر وسیع اور گہری نظر نہ رکھتا ہو۔ پورے اسلام سے منحرف کر دینے کے لئے کافی ہے۔ اس کا علمی جائزہ لینا، ان کی تحریفات، فنی غلطیوں اور ان کے دجل و تلبیس کو واضح کرنا اس وقت ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہے۔ یہ ایک اہم علمی موضوع اور عظیم الشان دینی خدمت ہے۔ جس کے لئے ایک عظیم و منظم ادارہ کی ضرورت ہے۔

یہاں ہم نہایت اختصار کے ساتھ ان کی اس دعوت و تلقین کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جو وہ اپنے پڑھے لکھے جدت پسند اور ترقی پسند نوجوان قارئین کے سامنے بار بار اور مختلف عنوانوں سے پیش کرتے رہتے ہیں۔ اور جس کو ان نوجوانوں کا ذہن ایک معقول اور بدیہی حقیقت کی طرح قبول کرتا چلا جاتا ہے۔ اس دعوت و تلقین کا اسلامی ممالک کی اصلاح و ترقی کی تحریکات سے قریبی تعلق ہے اور ان کی نوعیت کا

امدادنہ اس کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اس موقع پر ہم اس خلاصہ کو بطور اقتباس پیش کرتے ہیں جو ایک مصری فاضل نے اپنی فاضلانہ کتاب الفکر الاسلامی الحدیث میں پیش کیا ہے۔ اور جو اکثر و بیشتر مستشرقین کی کتابوں کا قدر مشترک اور ان کے خیالات کا عکس ہے۔

"اسلامی معاشرہ کی وابستگی اسلام کے ساتھ صرف ایک مختصر وقفہ میں مستحکم رہی۔ یہ وہ تاریخی وقفہ ہے۔ جب کہ اسلامی معاشرہ ابتدائی حالت اور دورِ طفولیت نے اس کا موقع دیا۔ کہ زندگی اور اسلامی تعلیمات میں مناسبت اور ہم آہنگی پیدا ہوسکے لیکن اس مختصر ابتدائی وقفہ کے ختم ہوتے اسلامی معاشرہ اور اسلام کے درمیان خلیج پڑ گئی۔ اور اسلام زندگی کی رہنمائی کا سرچشمہ نہیں رہا۔ کلچرل، سیاسی، اقتصادی اور دوسرے خارجی محرکات و عوامل کے نتیجہ میں اسلامی معاشرہ کے اندر زندگی جتنی تبدیل ہوتی رہی۔ اور ترقی کرتی رہی۔ اتنا ہی اسلام اس بدلتی ہوئی اور ترقی کرتی ہوئی زندگی کا ساتھ دینے سے قاصر ہوتا چلا گیا۔ یہ خلیج برابر وسیع ہوتی رہی۔ یہاں تک خلافت اسلامی کے آخری مرکز نے اس کا اعلان کر دیا کہ اسلام اب عام زندگی میں دخل نہ دے سکے گا۔ اور اب اس کی جگہ فرد کے ضمیر میں ہوگی۔ اور یہ فرد بغیر کسی اعلان اور جوش کے اپنی ذات کے لئے اس کا اظہار کرسکے گا۔

اسلامی تعلیمات کا نافذ نہ کرسکنا، اجتماعی ضرورت کا عین تقاضا ہے۔ اور یہ نتیجہ ہے روز بروز بدلتی ہوئی زندگی کے ان حالات کا جن کو اسلام اپنی تعلیمات کی روشنی میں اپنے مطابق نہیں بنا سکا۔ اور ان کے اور اپنی تعلیمات کے درمیان ہم آہنگی نہیں پیدا کرسکا اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے پر زور دینے کے معنیٰ اس زمانے میں اس کے سوا کچھ اور نہیں ہیں۔ کہ زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرلی جائے۔ تمدن جدید کے وسائل سے فائدہ اٹھانے میں مسلمان دنیا سے پیچھے رہ جائیں۔ مسلمان ممالک میں غربت، بیماریاں اور جہالت کو بخوشی گوارا کیا جائے جیسا کہ اس وقت سعودی حکومت میں حال ہے۔ یہ وہ تنہا اسلامی ملک ہے۔ جس نے سرکاری طور پر اسلام پر عمل کیا ہے۔ اس لئے وہ اس بات کا نمونہ ہے۔ کہ اسلام پر عمل کرنے سے کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

تغیر و ترقی جو زندگی کا ایک ایسا عام قانون ہے جس سے مفر نہیں۔ مسلمانوں کو اپنے اسلام کے بارے میں بھی اس سے کام لینا چاہئے۔ تاکہ وہ جلد یا بدیر مغربی دنیا کے قدم بقدم چل سکیں۔ اور کمزوری و بدنظمی کے اسباب سے نجات پاسکیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود اسلام پر بھی بحیثیت ایک مذہب کے اس قانون کو نافذ کریں اور اس کو زمانہ کے ساتھ بدلنے اور ترقی دینے کی کوشش کریں۔ ملت اسلامی کو تغیر و ترقی کے اس فطری اور ابدی قانون کی پیروی سے مغربی معیار کے مطابق چلنا اور اپنے مشرقی ماحول میں اس سے متاثر ضروری ہے۔ اس لئے کہ شکوہ زندگی کے میدان میں اہل مغرب کے رجحانات طویل انسانی تجربوں کا نتیجہ ہیں ـــــــــــ

ـــــــــــ اہل مغرب نے ان رجحانات کی تشکیل میں علمی اور سائنٹیفک طریقہ استعمال کیا۔ یہ طریقہ اوہام و خرافات اور عقائد سے متاثر نہیں ہوتا۔ اس کے پیش نظر صرف انسانیت کی فلاح ہوتی ہے "

تقریباً پورے دو صدی کے طویل و مسلسل تجربہ کے بعد مستشرقین نے محسوس کیا کہ ان کے طریق کار میں بنیادی غلطی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کی جدوجہد کا پورا نتیجہ نہیں نکل رہا تھا۔ اور بعض اوقات اس کے خلاف اسلامی حلقوں میں شدید ردعمل اور اشتعال پیدا ہوجاتا تھا۔ جو تبلیغی و دعوتی نقطہ نظر سے خطرناک تھا۔ وہ برابر اپنی مساعی اور ان کے اثرات و نتائج کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے رہے۔ اب ان نتائج کی روشنی میں انھوں نے طے کیا۔ کہ ان کو اپنے رویہ اور طریق کار میں بنیادی تبدیلی پیدا کرنی چاہئے۔ اور بجائے مسلمانوں کو بدلنے کی کوشش کے اسلام کی جدید تعبیر پیش کرنے اور اصلاح مذہب کی تحریک چلانی چاہئے۔ اور جہاں جہاں تجدد و اصلاح مذہب کی تحریک چل رہی ہے۔ اس کی حوصلہ افزائی اور تائید کرنی چاہئے۔ اس ذہنی تبدیلی اور ایک نئے طریق کار کی حسب ذیل اقتباس سے بخوبی نشاندہی ہوتی ہے۔ ہری گے لارڈ ڈورمن اپنی کتاب ٹوورڈز انڈر سٹینڈنگ اسلام میں لکھتا ہے۔

"اصلاحی تحریکیں، دینی تعلیمات کی موجودہ تجربوں کی روشنی میں از سر نو تشریح کرنے کی مخلصانہ کوشش ہوتی ہیں۔ یا ان کے ذریعہ نئے تجربوں کو دینی تعلیمات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہیں۔ اور اس لئے وہ (مسیحیت کے) ایک مبلغ کے لئے اولین اہمیت رکھتی ہیں۔ اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں۔ کہ ہر نئی تحریک جس کو کہ چند خبطی شروع کر دیں۔ وہ اس کا استحقاق رکھتی ہے۔ کہ اس کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔ ہماری مراد ان تحریکوں سے ہے۔ جن کی حیثیت موجودہ زندگی کے پیچھے دینی اظہار کی ہے اور جو روزمرہ کے تجربہ کی روحانی تشریح کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اور پھیلتی جاتی ہیں۔ اور جس میں روحانی قوتیں نبرد آزما ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ان میں سے ایک اصلاحی تحریک مسلمانوں کے حضرت عیسیٰ کو سمجھنے کے سلسلہ میں بالآخر بڑی اہم ثابت ہو۔ حتیٰ کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آئندہ چند سالوں میں اسلامی ممالک میں (مسیحی) مبلغ کا اصل کارنامہ مسلمان افراد کی اصلاح و احیا سے زیادہ خود اسلام کی تجدید و احیاء ہو بہرحال یہ کام کا ایک میدان ہے۔ جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اور جس سے غفلت نہیں برتی جاسکتی۔ یہ میدان کھلا ہوا ہے۔ یہ ان معذرت پسندوں کی مثال سے ظاہر ہے۔ جو عیسائیوں اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا خیر مقدم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس نصف صدی کے اندر عالم اسلام میں اصلاح و ترقی (درحقیقت تجدید و مغربیت) کے جتنے علمبردار پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے خیالات اعلانات اور ان کے طریق کار میں مستشرقین کی اس دعوت و تلقین کا عکس صاف نظر آئے گا۔ یہاں تک کہ مستشرقین کے ان خیالات کو ان مصلحین و زعمائے فکر و عمل کی اساس قرار دیا جاسکتا ہے اور اس کو ان کا مشترک منشور کہا جاسکتا ہے۔

ان مستشرقین نے ایک طرف اسلام کے دینی افکار و اقدار کی تحقیر کا کام کیا۔ اور مسیحی مغرب کے افکار و اقدار کی عظمت ثابت کی۔ اور اسلامی تعلیمات و اصول کی ایسی تشریح پیش کی۔ کہ اس سے اسلامی اقدار کی کمزوری ثابت ہو۔ اور ایک تعلیم یافتہ مسلمان کا رابطہ اسلام سے کمزور پڑ جائے۔ اور وہ اسلام کے بارے میں متشکک ہوجائے۔ کم از کم یہ سمجھنے پر مجبور ہو۔ کہ اسلام موجودہ زندگی کے مزاج کے ساتھ ساز نہیں کرتا۔ اور وہ اس زمانہ کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے سے عاجز ہے۔ ایک طرف انھوں نے بدلتی ہوئی زندگی اور تغیر پذیر اور ترقی یافتہ زمانہ کا نام لے کر خدا کے آخری اور ابدی دین اور قانون پر عمل کرنے کو روایت پرستی، رجعت پسندی، اور قدامت و دقیانوسیت کا مرادف قرار دیا۔ دوسری طرف اس کے بالکل برعکس انھوں نے ان قدیم ترین تہذیبوں اور زبانوں کے احیاء کی دعوت

دی۔ جو اپنی زندگی صلاحیت اور ہر طرح کی افادیت کھو کر ماضی کے ملبہ کے نیچے سینکڑوں ہزاروں برس سے مدفون ہیں۔ اور جن کے احیاء کا مقصد مسلم معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کرنے، اسلامی تہذیب اور عربی زبان کو نقصان پہونچانے اور جاہلیت قدیمہ کو زندہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ انہیں کی تحریروں کے اثر اور انہی کے شاگردان رشید کے ذریعہ مصر میں فرعونی عراق میں آشوری شمالی افریقہ میں بربری فلسطین و لبنان کے ساحل پر فینیقی تہذیب و زبان کے احیاء کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ اور ان کے مستقل داعی پیدا ہو گئے۔ انہی مستشرقین اور ان کے شاگردوں نے شد و مد کے ساتھ یہ کہنا شروع کیا۔ کہ قرآنی عربی زبان فصحیٰ اس زمانہ کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی۔ اس کے بجائے عامی اور مقامی زبانوں کو رواج دینا چاہئے۔ اور انہی کو اخبارات اور کتابوں کی زبان بنانا چاہئے۔ یہ بات انھوں نے اتنی خوبصورتی سے اور اتنی بار کہی۔ کہ مصر میں اچھے پڑھے لکھے اور صاحب قلم لوگوں نے اس تحریک کی حمایت شروع کر دی۔ جس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ کہ ہر ملک و ہر صوبہ کی الگ الگ زبان ہو جائے۔ قرآن مجید اور اسلامی ادب سے عرب قوموں کا رشتہ کٹ جائے اور وہ ان کے لئے ایک اجنبی زبان اپنی بین الاقوامی حیثیت ختم کر دے اور عرب اس پورے دینی سرمایہ اور روح سے محروم ہو کر الحاد و ارتداد اور اختلاف و انتشار کی نذر ہو جائیں۔

اس طرح انھوں نے عربی رسم الخط کے بجائے لاطینی رسم الخط کے اختیار کرنے کی دعوت دی۔ اور ان کے تلامذہ نے وقتاً فوقتاً اس کی ضرورت ثابت کی۔ اور اس کے فوائد و فضائل بڑی بلند آہنگی سے بیان کئے۔ اس کا نتیجہ بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ کہ پوری قوم عرب صحیح طور پر قرآن مجید پڑھنے سے محروم و ناآشنا ہو جائے۔ اور وہ پورا علمی ذخیرہ بے معنیٰ اور بے کار ہو کر رہ جائے۔

ان تجاویز اور مشوروں سے مستشرقین کے حقیقی مقاصد و خیالات ان کی دور بینی اور ان کی اسلام دشمنی کا پورا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ان میں سے اکثر کی تصنیفات اسلام کی بنیادوں پر تیشہ چلاتی ہیں۔ اسلامیات کے سرچشموں کو مشکوک قرار دیتی ہیں۔ مسلم معاشرہ میں سخت ذہنی انتشار و تشکیک و اضطراب پیدا کرتی ہیں۔ اسلام کے حاملین و شارحین کی علمیت و ذہانت کی طرف سے متشکک بناتی ہیں فاحش علمی غلطیوں، مضحکہ خیز غلط فہمیوں، زبان و قواعد سے ناواقفیت اور بعض اوقات کھلی تحریفات کی ان میں بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن ان کی اکثر و بیشتر تصنیفات مغربی و مشرقی دنیا میں مقبول ہیں۔ نیا تعلیم یافتہ طبقہ اس کی حسن ترتیب طرز استدلال نتائج کے استنباط اور پیش کرنے کے علمی طریقہ سے مرعوب و مسحور ہے۔ اور اس کی تشفی خالص علمائے مشرق کی تصنیفات سے نہیں ہوتی۔ مغربی علماء مستشرقیات جس وقعت و اعتماد کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور انھوں نے مشرق جو مقام حاصل کر لیا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے۔ کہ مشرق وسطیٰ کی تینوں موقر مجالس علمیہ المجمع اللغوی مصر، المجمع العلمی العربی شام المجمع اللغوی العراقی بغداد میں مستشرقین کی ایک خاص تعداد رکن ہے۔ اور ان کے مطالعہ و آرا سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ عالم اسلام اور عالم عربی کی بے مائیگی و کم ہمتی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خالص اسلامی و عربی موضوعات پر بھی عرصہ دراز سے مستشرقین کی کتابوں پر دارو مدار ہے۔ اور وہ اپنے موضوع پر ایک طرح سے کتاب مقدس کی حیثیت رکھتی ہیں۔ تاریخ ادبیات عرب پر نکلسن کی کتاب "اے لٹریری ہسٹری" تاریخ عرب و اسلام پر ڈاکٹر ہٹی کی کتاب "ہسٹری آف عربس" تاریخ ادبیات اسلامیہ پر بروکلمان کی کتاب جرمن میں اور اس کا انگریزی ترجمہ "اے ہسٹری آف عرب لٹریچر" اسلامی قانون پر شاخت کی کتاب "دی اوریجن آف محمڈنس جورس پروڈنس" اپنے اپنے موضوع پر سند سمجھی جاتی ہے۔ اور بیشتر مشرقی جامعات میں شعبہ عربی و اسلامیات میں ان کی حیثیت ایک علمی مرجع اور سند کی ہے۔ مستشرقین کا مرتب کیا ہوا "دائرۃ المعارف الاسلامیہ" جس کے متعدد ایڈیشن یورپ و امریکہ سے نکل چکے ہیں۔ اور جن میں برائے نام مسلمان مقالہ نگاروں کی ایک تعداد بھی شامل ہے۔ اسلامی معلومات و حقائق کا سب سے بڑا اور مستند ذخیرہ سمجھا جاتا ہے۔ ادھر پاکستان میں اسی کو بنیاد بنا کر عربی اور اردو میں منتقل کیا جا رہا ہے۔

اس صورت حال کی اصلاح و مستشرقین کے تخریبی و تشکیکی اثرات کو روکنے کی صرف یہی صورت ہے۔ کہ ان علمی موضوعات پر مسلمان محققین اور اہل نظر قلم اٹھائیں۔ اور مستشرقین کی ان تمام قابل تعریف خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بلکہ ان کو ترقی دیتے ہوئے جو ان کا حصہ سمجھی جاتی ہیں۔ مستند و صحت مند اسلامی معلومات اور نقطہ نظر پیش کریں۔ یہ ایسی تصنیفات ہوں۔ جو اپنی تحقیقات کی اصلیت مطالعہ کی وسعت، نظر کی گہرائی" اور عمق" ماخذ کے استناد و صحت اور اپنے محکم استدلال میں مستشرقین کی کتابوں سے کہیں فائق و ممتاز ہوں۔ ان میں ان کی تمام خوبیاں ہوں۔ اور ان کی کمزوریوں و عیوب سے پاک ہوں۔ دوسری طرف ان مستشرقین کی کتابوں کا علمی محاسبہ کیا جائے۔ اور ان کی تلبیسات کو بے نقاب کیا جائے۔ متن کے سمجھنے میں ان کی غلط فہمیوں اور ترجمہ و اخذ مطالب میں ان کی غلطیوں کو واضح کیا جائے۔ ان کے ماخذ کی کمزوری اور ان کے اخذ کئے ہوئے نتائج کی غلطی کو روشن کیا جائے۔ اور ان کی دعوت و تلقین میں ان کی جو بدنیتی، مذہبی اغراض، اور سیاسی مقاصد شامل ہیں۔ ان کو طشت از بام کیا جائے۔ اور بتایا جائے۔ کہ یہ اسلام اور ملت اسلامیہ کے خلاف کیسی گہری اور خطرناک سازش ہے۔

اس مثبت و ایجابی کام اور اس دوسرے سلبی و جوابی جز کے بغیر دنیائے اسلام کا ذہین و حوصلہ مند طبقہ جو یورپ و امریکہ کی بلند پایہ یونیورسٹیوں یا اپنے ملک کی اعلیٰ تعلیم گاہوں میں تعلیم پاتا ہے۔ اور مغربی زبانوں ہی میں اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے مستشرقین کے زہر آلود خیالات کے اثر سے آزاد نہیں ہوسکتا

اور جب تک اس اثر سے آزاد نہ ہو۔ اسلامی ممالک برابر فکری انتشار اور ذہنی ارتداد کے خطرہ سے دوچار رہیں گے۔ اور ان ممالک میں تجدد و مغربیت کے علمبردار برابر ان خیالات کا اظہار کرتے رہیں گے۔ اور جب اقتدار ان کے ہاتھ میں آئے گا۔ تو ان کو بروئے کار لانے کی کوشش کریں گے۔ جو اسلام کی روح کے منافی ہیں۔ اور ایک معاشرہ کی تشکیل کرتے ہیں۔ جو صرف نسل و قومیت میں قدیم اسلامی معاشرہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ اور جس کا رخ مغرب اور خالص مادیت کی طرف ہوگا۔ اور جس کو دیکھ کر کم سے کم عالم اسلام کے ان فضلا اور رہنماؤں سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو میروی بترکستان است

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی

ہندوستان میں دینی تعلیمی تحریک

مسلمان جب عرب کے سادہ ماحول سے باہر نکلے اور رومی و ایرانی تہذیب اور یونانی علوم وفنون سے سابقہ ہوا تو نئے افکار وخیالات اور نئے انداز و اطوار سامنے آئے اور آہستہ آہستہ زندگی ان سے متاثر ہونے لگی لیکن جب عباسی عہد میں حکماء یونان کی کتابوں کے ترجمے عربی میں شائع ہوئے تو فلسفہ وحکمت کے مسائل نے ذہن و دماغ میں ہلچل پیدا کر دی اور مذہبی عقائد و اعمال کے بارے میں بحثیں ہونے لگیں ان عقلی موشگافیوں نے طرح طرح کے شبہات پیدا کر دیئے ۔ پرانے بزرگ اس صورت حال سے کڑھتے تھے لیکن خاطر خواہ اس کا تدارک نہیں کر پاتے تھے ۔ فلسفہ کی راہ سے جو اعتراضات ہو رہے تھے ان کا جواب وہ لوگ کس طرح دے سکتے تھے جنھوں نے کبھی اس کوچہ میں قدم نہیں رکھا تھا بالآخر یہ بات سمجھ میں آئی کہ دینی علوم سے تعلق رکھنے والے فلسفہ وحکمت کے مسائل سے بھی واقفیت حاصل کریں تاکہ ان کو پیش نظر رکھ کر دینی مسائل کی ایسی تشریح کر سکیں جو نوجوانوں کی خلش مٹا سکے اور فلسفہ کے اعتراضات کا جواب فلسفہ کی زبان میں دیا جا سکے ۔

اس منصوبہ کے مطابق نصاب و نظام تعلیم میں ترمیم کی گئی اور قرآن وحدیث اور فقہ وتفسیر کے پہلو بہ پہلو فلسفہ وحکمت کی کتابیں بھی درس میں داخل کی گئیں نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ان جدید تعلیم یافتہ حضرات نے یونانی فلسفہ کا طلسم توڑ دیا اور اشعری وماتریدی اور رازی وغزالی کے ہاتھوں اس کی فلک بوس عمارت زمین دوز ہو گئی ان بزرگوں نے فلاسفہ کے دلائل کی کمزوری واضح کر دی جس سے ذہنی مرعوبیت دور ہوئی اور دلوں میں اسلامی عقائد و اعمال کی برتری نقش ہو گئی۔

کچھ ایسا ہی حال اس وقت ہوا جب یورپی تہذیب کو فروغ ہوا یونانی فلسفہ کے رواج کے زمانہ میں تو صرف علمی طور پر مسلمان اس سے متاثر تھے سیاسی میدان میں ان کی بالادستی قائم تھی ۔ ادھر چین سے مراکش تک عباسیوں کا پرچم لہرا رہا تھا اور اسپین سے فرانس اور اٹلی کے حدود تک خلفاء اندلس کا جھنڈا اڑ رہا تھا اس بنا پر وہ احساس کمتری سے محفوظ تھے اس لئے علماء اسلام کو صرف فلسفہ یونان کی کمزوری واضح کرنی تھی لیکن انیسویں صدی عیسوی کی حالت ہی کچھ اور تھی اس زمانہ میں سیاسی میدان میں بھی یورپ کا بول بالا تھا ۔ مسلم ممالک یا تو زیر ہو چکے تھے یا زیر کئے جا رہے تھے اور سیاست ومعیشت، تہذیب وتمدن اور علم وفن کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو یورپی اثرات سے محفوظ ہو ۔ ایک طرف یورپین فوجیں مسلمان ملکوں کو فتح کرتی جا رہی تھیں دوسری طرف مغربی مفکرین کے خیالات عقائد و اعمال کی دنیا میں تہلکہ برپا کئے ہوئے تھے تیسری طرف مسیحی مشنری انجیل ہاتھ میں لئے شہروں اور گاؤں میں پھر رہے تھے اور پریشان حال مسلمان کو آسمانی بادشاہت کی بشارت سنا رہے تھے اور دنیا میں مصائب و آلام سے نجات دلا کر عزت و آرام سے زندگی بسر کرنے کا یقین دلا رہے تھے ان کی طرف سے غریبوں کی امداد کے لئے محتاج خانے، بیماروں کے علاج کے لئے شفاخانے اور بچوں کی تعلیم وتربیت کے لئے اسکول وکالج کھلے ہوئے تھے جن پر بے دریغ دولت صرف کی جا رہی تھی ۔

یوں تو ساری دنیائے اسلام ان حالات سے متاثر تھی لیکن جہاں ٹوٹی پھوٹی مسلم حکومتیں موجود تھیں وہاں مغربی سیلاب کا اثر زیادہ محسوس نہیں ہوتا تھا مگر ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت چونکہ بالکل ہی ختم ہو چکی تھی اور سارا ملک براہ راست انگریزوں کے ماتحت آ گیا تھا اس لئے مغربی اثرات پوری قوت سے پڑ رہے تھے اور خطرہ تھا کہیں اسلامی حکومت کے ساتھ اسلام کا بھی خاتمہ نہ ہو جائے ان حالات نے دردمندان ملت کو بے چین کر دیا اور الحاد وارتداد کے سیلاب کو روکنے کے لئے بند باندھنے کی فکر کی جانے لگیں حکومت کے نشہ نے پادریوں کو بدمست کر دیا تھا اور ان کی تحریریں اور تقریریں مسلمانوں کے دلوں کو چھلنی کئے دے رہی تھیں مگر گورہ شاہی کا خوف ایسا چھایا ہوا تھا کہ کسی کو یارائے سخن نہ تھا مگر جب حالات حد سے گذر گئے تو اللہ نے اپنے چند مخلص بندوں کو ہمت دی ۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے پادری فنڈر کو شکست فاش دی، مولانا محمد علی مونگیری اور ان کے ہمنواؤں نے پادری احمد شاہ کے چھکے چھڑا دیئے اور اس کی دل آزار کتاب اور مضامین کے پرخچے اڑا دیئے ۔ سر ولیم میور صوبجات متحدہ آگرہ واودھ کے لفٹنٹ گورنر تھے انھوں نے بھی پادریوں کی ہم نوائی کی اور لائف آف محمد لکھ کر تاریخ کے رنگ سے پیغمبر اسلام علیہ السلام کی سیرت پاک داغدار ثابت کرنے کی کوشش کی جس زمانہ میں ایک انگریز سنتری سے لوگوں کی روح کانپتی ہو اس وقت صوبہ کے لاٹ صاحب کے رعب و داب کا کیا عالم ہوگا لیکن ناموس رسالت کی حفاظت کے جذبہ نے سر سید احمد خاں کو بے تاب کر دیا وہ جان پر کھیل کر سامنے آئے اور خطبات احمدیہ لکھ کر سر ولیم میور کی افترا پردازیوں کا پردہ چاک کیا ۔ سید امیر علی نے اسپرٹ آف اسلام تاریخ اسلام اور اسلامی مباحث پر پر زور مضامین کے ذریعہ مغربی مفکرین اور معترضین کی علمی کھل اور علامہ شبلی کی محققانہ کتابوں اور گراں قدر مضامین نے مستشرقین کی غلط بیانیوں کو بے نقاب کیا۔

ان کوششوں نے عیسائی مشنریوں کی یلغار اور ان کے ہم نواؤں کے حملے بڑی حد تک روک دیئے لیکن مغربی افکار وخیالات سے جو نقصان پہنچ رہا تھا اس کا سد باب نہ ہو سکا اس پہلو سے ہوا کہ انگریزوں کے غلبہ اور انگریزی حکومت کے استحکام کے ساتھ تعلیم کا نظام بھی تبدیل ہوا اور عربی فارسی کے پرانے مدارس

کی جگہ نئے انگریزی کالجوں اور اسکولوں کا سارے ملک میں جال بچھ گیا ان جدید تعلیم گاہوں کے ذریعہ تہذیب و معاشرت میں تغیر ہونے لگا اور علم و فن کی راہ سے آزاد خیالی کے نام پر ایسے خیالات دماغوں میں پرورش پانے لگے جن سے مذہبی عقائد کی جڑیں ہل گئیں اور مسلمانوں کے بچے اسلام سے برگشتہ نظر آنے لگے۔
ان حالات نے مسلمانوں کو نئی تعلیم سے بدظن کر دیا اور انھوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ اس تعلیم سے احتراز کریں لیکن اس طرز عمل نے دوسری مشکلیں پیدا کر دیں۔ ایک طرف اس اجتناب نے مسلمانوں کے خلاف حکمرانوں کے جذبات بھڑکا دیئے اور دوسری طرف وہ ترقی کی شاہراہ سے ہٹنے اور زمانہ کی دوڑ میں بچھڑنے لگے تھوڑے ہی عرصہ میں اس منفی طرز عمل کی غلطی نمایاں ہوگئی اور صاف محسوس ہونے لگا کہ اس طرح عزت و سر بلندی کے دروازے ان پر بند ہو جائیں گے اور وہ زندگی کے میدان میں اہل وطن سے بہت پیچھے ہو جائیں گے اس مرحلہ پہ یہ خیال ہوا کہ مسلمان خود اپنے اسکول اور کالج قائم کریں جہاں سرکاری نصاب کے ساتھ اسلامیات کی بھی تعلیم دی جائے۔ اس خیال کے ماتحت اسلامی اسکول اور کالج کھل گئے جنمیں دینیات کی تعلیم کیلئے ایسے مستند علماء مقرر کئے گئے جنکی دینداری شک و شبہ سے بالاتر تھی لیکن تجربہ نے بتایا کہ قدیم طرز کے علماء جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ذہنی تشفی نہیں کر سکتے ہیں اعتراض و جواب کا انداز بالکل مختلف ہوتا تھا ایک زمین کی کہتا تھا اور دوسرا آسمان کی، نتیجہ یہ ہوا کہ دینیات کی کلاسیں تمسخر و استہزا کا مرکز بن گئیں بجہاں اسلام سے حسن ظن کے بجائے بدظنی پیدا ہوتی تھی علاوہ ازیں یہ بات بھی کھل کر سامنے آئی کہ دین کی معمولی واقفیت پختہ کار حریفوں کے مقابلہ کی سکت نہیں رکھتی ہے۔

حالات روز بروز نازک سے نازک تر ہوتے جا رہے تھے اور مسلمانوں کی نئی نسل الحاد سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ اس صورت حال پر غور کرنے کے لئے ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۳ء) میں مولانا محمد علی مونگیری نے علماء اسلام اور اکابر ملت کا کان پور میں ایک اجتماع کیا ان کو عیسائی مبلغوں اور مصنفوں سے بہت سابقہ رہ چکا تھا اور مدتوں سے زبان و قلم سے ان کے مقابلہ میں اسلام کی مدافعت کر رہے تھے ان کا رسالہ تحفۂ محمدیہ اس جد و جہد کے لئے وقف تھا اس لئے ان کو طوفان کی شدت کا پورا اندازہ تھا اور وہ خوب سمجھتے تھے کہ اس سے حفاظت کی موثر تدبیر کیا ہے۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ پہلے مسلمان اپنے اختلافات ختم کریں اور فرقہ آرائی کے بجائے تلطف و مدارا کا طریقہ اختیار کریں، اس میں آسائش گیتی کا راز پنہاں ہے، بقول حافظ ؎

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

حریف سے مورچہ لینا ہے تو پہلے اپنی صفوں کا انتشار دور کرنا ضروری ہے اپنی جماعت منظم ہو جائے تو میدان میں قدم بڑھانے کی جرأت کی جا سکتی ہے اس وقت اسلامی کتب خانے بھی برباد ہو رہے تھے اور نایاب کتابیں یورپ کی لائبریریوں کی زینت بن رہی تھیں۔ مولانا نے کہا کہ ان بکھری ہوئی کتابوں کو اکٹھا کیا جائے اور اسلاف کے علمی خزانہ کو ایک عظیم الشان کتب خانہ کی شکل میں محفوظ کر دیا جائے تاکہ ان کے ذریعہ ہمارے علم میں گہرائی نظر میں وسعت پیدا ہو اور ہم زیادہ اعتماد اور قوت کے ساتھ اسلام کا پیغام دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب علم دنیا سے اٹھ جائے گا اور سیادت جاہلوں کے ہاتھ میں آ جائے گی وہ خود گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے کچھ یہی حالات اس زمانہ میں بھی تھے جسے ذرا سی شدبد ہو جاتی تھی وہ اپنے کو فتویٰ کا اہل سمجھنے لگتا تھا اور جبہ و دستار پہن کر خلق کو اپنے دام تزویر میں گرفتار کرنے لگتا تھا یہ در اصل دین کے نام پر ایک کاروبار تھا۔ یہ لوگ اپنے مفاد کی خاطر دوسروں کی تفسیق و تکفیر کرتے نتیجہ یہ تھا کہ ملت کی زبوں حالی بڑھتی جاتی تھی اور خانہ جنگی جنگ جھگڑا کا باعث تھی مولانا نے فرمایا کہ اس کا علاج یہ ہے کہ ایک ایسا دار الافتاء قائم کیا جائے جہاں ایسے مفتی فتویٰ کی خدمت انجام دیں جو قرآن و حدیث پر گہری نظر رکھتے ہوں، فقہاء اسلام کے اصول استنباط سے واقف اور وقت کے تقاضوں سے باخبر ہوں ان کا ہاتھ زمانہ کی نبض پر ہو اور وہ کتاب و سنت کے نصوص کو حالات پر منطبق کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں تاکہ وہ مسائل کو سمجھ کر پیش کر سکیں اور نئے زمانے کو اسلامی احکام کی قدر و قیمت سے آگاہ کر سکیں ان امور پر توجہ دلانے کے ساتھ مولانا نے فرمایا جو نصاب تعلیم ہماری دینی درسگاہوں میں رائج ہے وہ از کار رفتہ ہو چکا ہے جن حالات اور مصالح کے ماتحت یہ نصاب تیار کیا گیا تھا وہ اب بالکل بدل گئے ہیں اب یونانی فلسفہ و ہیئت کی جگہ یورپی فلسفہ و سائنس کا دور دورہ ہے۔ حریفوں کے اعتراضات کی نوعیت بدل گئی ہے۔ اب ہمیں پرانے زنگ خوردہ آلات کو ترک کر کے نئے ساز و سامان سے اپنے کو لیس کرنا ہے، ہمارے نصاب کو دین و دنیا کی جامعیت اور قدیم و جدید کا خوبیوں کا حامل ہونا چاہئے۔

مولانا محمد علی مونگیری کی ذات میں متعدد صفات جمع تھیں۔ ایک طرف وہ مسلم شیخ طریقت تھے دوسری طرف علماء ظاہر کی صف میں بھی ممتاز تھے پھر جدید تعلیم یافتہ اصحاب بھی ان سے خوش تھے امراء و ارباب ثروت بھی ان کے ساتھ عقیدت رکھتے تھے اور اکابر قوم ان کے اخلاص اور صلاحیت کار سے مطمئن تھے اس لئے سب نے ان کی باتوں کو توجہ سے سنا اور ان کی تجویز منظور کی اور ندوۃ العلماء کے نام سے ایک انجمن قائم ہو گئی جس میں علماء و مشائخ، جدید تعلیم یافتہ اصحاب اور عمائد قوم کے دوش بدوش دین کی خدمت اور ملت کے اندر زندگی کی نئی روح پھونکنے کے لئے شریک ہو گئے۔

اس انجمن کو ہر حلقہ خیال نے پسند کیا۔ مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، استاذ الاساتذہ مولانا لطف اللہ، مولانا انور اللہ، مولانا شبلی نعمانیؒ، سر سید احمد خاں، نواب محسن الملک، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا عبد الحق حقانی، مولانا محمد فاروق چریا کوٹیؒ، مولانا محمد ابراہیم آرویؒ، جسٹس عبد الرحیم، مرحیم بخش، جسٹس شرف الدین، منشی اطہر علی مشیر قانونی تعلقداران اودھ، مولانا حبیب الرحمٰن شروانی، مولانا احمد حسن کانپوری، شاہ سلیمان پھلواروی، شاہ محمد حسین الہ آبادیؒ وغیرہ اکابر علماء و مشائخ، تعلیم یافتگان اور ارباب وجاہت اور اصحاب ثروت سبھی نے اس کا خیر مقدم کیا۔ سال بسال اس کے جلسے مختلف شہروں میں بڑے دھوم دھام سے منعقد ہوتے اور لوگ جوش و خروش اور امید و حوصلہ کے ساتھ ان میں شریک ہوتے۔ انتظامی امور کی انجام دہی کے لئے علماء اور جدید تعلیم یافتہ اصحاب پر مشتمل ایک انتظامی کمیٹی بنائی گئی نظامت کا بار خود مولانا محمد علی مونگیری کے کاندھوں پر ڈالا گیا اور ان کی مدد کے لئے حکیم سید عبد الحی صاحب کو نائب ناظم بنایا گیا پھر جب مولانا محمد علی کی عمر زیادہ ہوئی اور ضعف کے غلبہ کی وجہ سے ندوہ کے کاموں کی انجام دہی میں دشواری محسوس ہوئی تو نظامت کا بار گراں حکیم صاحب کے کاندھوں پر آ گیا جسے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ وہ تا دم مرگ اٹھائے رہے۔ اس کے بعد بھی مولانا محمد علی کا تعلق ندوہ کے ساتھ قائم رہا اور زندگی کے آخری لمحوں تک وہ اس کے سرپرست رہے۔ مولانا شبلی اس قسم کے کاموں کے لئے سربراہ رہتے تھے۔ ندوہ کی تحریک ان کے خوابوں کی تعبیر تھی اس وقت وہ علی گڑھ میں سر سید اور ان کے رفقاء کے ساتھ کام کر رہے تھے ندوہ کی دعوت پر انھوں نے لبیک کہا اور اگلے جلسہ میں ندوہ کے مقاصد پر ایک مضمون پڑھا ان کی یہ دلچسپی برابر بڑھتی رہی، کچھ عرصہ تک علی گڑھ اور حیدرآباد سے وابستگی کی وجہ سے وہ پورا وقت یہاں نہ لگا سکے لیکن اس سے فراغت کے بعد اپنی ساری زندگی ندوہ کی خدمت میں لگا دی ان کو ندوۃ العلماء اور اس کے دار العلوم کے ساتھ والہانہ تعلق تھا وہ اسے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا ذریعہ سمجھتے تھے ان کے معتمدی کے زمانہ میں نصاب و نظام تعلیم کی بڑی

اصلاح ہوتی اور ان کی توجہ سے بہت سے ایسے طالب علم تیار ہوئے جو ندوہ کے تخیل کا عملی پیکر تھے اور جن کے علم و عمل سے ندوہ کا نام روشن ہوا۔ مولانا سید سلیمان، مولانا ابوالکلام، مولانا عبدالسلام، مولانا عبدالباری، خواجہ عبدالواجد، مولانا مسعود علی، ضیاء الحسن علوی، سید ابوظفر وغیرہ انھیں کے دور کی یادگار اور انھیں کے فیض تربیت کی مثال ہیں۔

ندوہ کے کام کا یہ طریقہ تھا کہ عہدہ دار مجلس انتظامی کے مشورہ سے کام کرتے رہتے تھے سال بھر کے بعد عام جلسہ کسی مشہور مقام پر ہوتا تھا اس کے لئے کوئی نامور صاحب علم صدر منتخب ہوتا وہ ایک پر اثر خطبہ پڑھتا جس میں ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد بیان کئے جاتے ناظم سالانہ کارگزاری کی رپورٹ سناتا پھر مشہور مقرروں کی تقریریں ہوتیں جن میں عربی مدارس کے منتظمین کو آمادہ کیا جاتا کہ نئے حالات اور جدید ضروریات کے پیش نظر وہ نصاب تعلیم اور طریقہ درس میں تبدیلی کریں لیکن صوبوں کے رائج شدہ نصاب کو بدلنا آسان نہیں تھا طبیعتیں اس سے مانوس تھیں اور ان کتابوں سے ایک خاص قسم کی محبت اور عقیدت پیدا ہو گئی تھی اس لئے جلسوں کا اثر دیرپا نہ ہوتا لوگ مصلحین کے خیالات کی زبان سے تائید کرتے مگر عمل کی راہ میں قدم نہ رکھتے وہی غالب کے شعروں کا معاملہ تھا کہ ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اس جمود پسندی کی توجیہہ ندوہ کے ایک پرانے سرگرم رکن شاہ سلیمان پھلواروی نے ایک جملہ میں اس طرح کی کہ "لوگوں کے ہاتھ میں چند برس جو لاٹھی رہ جاتی ہے اس کو چھوڑنا بھی مشکل ہوتا ہے تو جس نصاب کو صدیوں سے سینہ سے لگائے چلے آرہے ہیں اس کو چھوڑنا کتنا مشکل ہوگا۔"

بالآخر کئی سال کے تجربے کے بعد سب کی صلاح ہوئی کہ جب تک اصلاح شدہ نصاب کے مطابق خود اپنی درسگاہ قائم نہ کی جائے گی اصلاح نصاب کی تحریک کامیاب نہ ہوگی اس خیال کے مطابق ایک نمونہ کی درسگاہ قائم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا اور ۱۳۱۶ھ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کا سنگ بنیاد لکھنؤ میں رکھ دیا گیا اور نیا نصاب تعلیم رائج کیا گیا۔ اس نصاب کے مجوزین کے پیش نظر یہ تھا کہ جس طرح عہد عباسی میں یونانی علوم و فنون کے فروغ کے بعد ضرورت محسوس ہوئی تھی کہ مذہبی علوم کے ساتھ فلسفہ و حکمت اور ریاضی و ہیئت کو نصاب درس میں شامل کیا جائے اسی طرح اب ضرورت ہے کہ یورپی علوم و فنون اور یورپی زبانوں کو بھی درس میں داخل کیا جائے تاکہ علماء کو زمانہ کے حالات کا اندازہ ہو اور جو زہر نئی راہوں سے پھیل رہا ہے اس کا تریاق تیار ہو سکے۔ نئے ابن رشد و ابن حزم اور نئے غزالی و رازی ہوں جو حریفوں کو انھیں کے ہتھیاروں سے شکست دیں وہ نئے حالات کو سمجھیں، وقت کے تقاضوں سے باخبر ہوں، نئی تہذیب و معاشرت کا اندازہ کریں اور زندگی کے میدان میں نئے ساز و سامان سے آراستہ ہو کر قدم رکھیں وہ کتاب و سنت پر گہری نظر رکھتے ہوں، فقہاء اسلام کی کاوشوں سے واقف ہوں متکلمین کے کارنامے پر ان کی نظر ہو اور جدید علوم و آداب سے باخبر ہوں تاکہ قدیم و جدید کے امتزاج سے وہ اکسیر تیار ہو جو ملت کے امراض کہنہ کو دور کر دے اور اس کے تن ناتواں کے اندر نئی روح پھونک دے جس سے اس کے اعضاء و جوارح میں ایسی قوت و توانائی پیدا ہو جو اس کے لئے کامیابی کے دروازے کھول دے۔

ان مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے نصاب تعلیم میں اسلامیات کے اعلیٰ مضامین کے ساتھ جدید علوم و فنون بھی شامل کئے گئے۔ یورپی زبانوں کے سلسلہ میں یہ پیش نظر تھا کہ طلبہ کو ان کی ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ اس لائق ہو جائیں کہ ان زبانوں میں بے تکلف تقریر کر سکیں، کتابیں لکھ سکیں اور یورپ و امریکہ جا کر اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی خدمت انجام دے سکیں۔ قرآن مجید میں قدم قدم پر بنی

اسرائیل کا تذکرہ ہے اور ان کے عقائد و اعمال، رسم و رواج اور ان کی تاریخ کے اہم واقعات بیان کئے گئے ہیں ان باتوں کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے عبرانی و سریانی زبانوں کا جاننا ضروری ہے اس کے بغیر بہت سے عقدے حل نہیں ہو پاتے اور بیسیوں گتھیاں سلجھنے سے رہ جاتی ہیں۔ ہندوستانی مذاہب سے واقفیت اور اسلام سے ان کے موازنہ کے لئے سنسکرت کا جاننا ضروری ہے اور بدھ مذہب کو سمجھنے کے لئے پالی سے واقف ہونا ناگزیر ہے اس کے بغیر ان مذاہب کے اصل ماخذ تک رسائی نہیں ہو سکتی اور ثانوی ذرائع سے حاصل شدہ معلومات اس لائق نہیں ہوتی ہیں کہ بحث و گفتگو کے وقت ان پر اعتماد کیا جا سکے۔

علوم اسلامی میں کتاب و سنت کے ساتھ خاص اعتنا کیا گیا قرآن و حدیث دین کا اصل ماخذ ہیں اس لئے بہت غور و خوض کے ساتھ ان کے مطالعہ کی ضرورت ہے ان کا ایک ایک لفظ حقائق کا خزینہ ہے لیکن تاریخ کے دبیز پردے درمیان میں حائل ہیں۔ ڈیڑھ ہزار برس میں دنیا بہت بدل گئی ہے لیکن کلام الٰہی اور ارشادات نبوی کی تازگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آج بھی ان کے اندر ہدایت و رہنمائی کی وہی صلاحیت ہے جس نے کبھی عرب کے بدوؤں کو زمین سے آسمان پر پہونچا دیا تھا ان کی زبانیں جبرئیل امین کے راز فاش کرنے لگی تھیں اور ان کے جوش عمل نے بحر و بر کو فرمان ایزدی کے سامنے جھکا دیا تھا۔ کتاب و سنت کی معجز نمائی کا اب بھی وہی حال ہے بشرطیکہ ہم اللہ و رسول کے ارشاد کو انسانی کتاب سے الگ کر کے دیکھ سکیں انسان خواہ کیسا ہی عقیل و فہیم اور کتنا ہی صاحب علم و بصیرت ہو مگر اپنے ماحول کے اثرات اور اپنے زمانہ کے خیالات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا زمان و مکان سے ماوراء صرف اللہ کا کلام اور اس کے رسول کا بیان ہے انھیں دونوں ماخذوں سے فیضان حاصل کر کے ہم اس لائق ہو سکتے ہیں کہ اسلام کا ابدی پیغام ہر زمانہ میں پہونچا سکیں اور ابنائے عصر کی الجھنوں کو سلجھا سکیں مفسرین خواہ کتنے ہی صاحب نظر ہوں ان کی نظر بہر حال محدود ہوتی ہے اور زمان و مکان کے پردوں کو چاک کر کے مستقبل کے امکانات کو پورے طور پر دیکھ نہیں سکتی ہے نہ ان کے لئے قابل فہم بن جاتی ہے، ذہن رسا نارسا ہو جاتا ہے، ماضی کی گرہ کشائیاں مستقبل میں مزید پیچیدگیوں کا باعث ہو جاتی ہیں اور عقل بے عقلی کا خطاب پاتی ہے اور عقلاء روزگار مضحکۂ روزگار بن جاتے ہیں۔ اس حقیقت کو ندوہ کے ناظم اول محمد علی مونگیری نے اپنے ایک ہدایت نامہ میں کس خوبی سے واضح کیا ہے۔

> قرآن مجید کے درس میں اس کا خاص خیال رہے کہ قرآن مجید کے الفاظ کیا ہیں اور مفسرین کے خیالات کیا ہیں بعض معترضین کے اعتراض اکثر مفسرین کی تفسیر پر ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ قرآن کے الفاظ کے اگر کئی معانی ہو سکتے ہیں تو اس معانی کو اختیار کرنا چاہئے جس پر اعتراض نہ پڑتا ہو۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ان کا خط بنام نائب ناظم حکیم سید عبدالحئی مرحوم)

اب کہاں ہیں وہ عقلیں نو آسمان، کدھر ہیں وہ فلک جن کا خرق و التیام محال تھا، کہاں گئے وہ کج رفتار، کدھر ہیں ستاروں کے نگینے۔ آج کون کہہ سکتا ہے کہ زمین ساکن اور سورج اس کا طواف کر رہا ہے، اب چار بسیط عناصر کا کون قائل ہے آج تحقیق کے یہ شاہکار اوہام و خرافات کا مجموعہ سمجھے جاتے ہیں اور حکماء و محققین کی عقلی جولانیوں پر ایک طفل مکتب بھی خندہ زن ہے لیکن قرآن مجید کے الفاظ آج بھی حقیقت کی ترجمانی کر رہے ہیں اور لاریب فیہ کا اعلان صدیوں کے تجربہ کے بعد بھی ثابت ہو رہا ہے اسی لئے ندوہ نے اپنے نصاب میں متن قرآن کو اصل درس کا موضوع بنایا اور براہ راست اس کا درس ضروری قرار دیا تفسیروں کو صرف امدادی حیثیت دی جنھیں الفاظ کی تحقیق اور لغت سے واقفیت

فصاحت و بلاغت کے قاعدوں کی آگاہی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور صحابہ کرام اور ان کے شاگردوں کے اقوال کے علم اور علماء سلف کے خیالات سے باخبر ہونے کے لئے پڑھنا چاہئے۔ تفسیریں ایک طرح سے فہم قرآن کی تاریخ ہیں ان کی روشنی میں ہر دور کا نقطہ نظر ہمارے سامنے آجاتا ہے قرآن مجید کے اصل شارح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں وہ اس کی تعلیم و تبیین پر مامور تھے آپ نے کلام الٰہی کو عمل کے قالب میں ڈھالا اور ربانی ہدایات کو اس آب و گل میں اس خوبی کے ساتھ نافذ کیا کہ نہ الفاظ کی وسعتوں میں فرق آیا نہ ان پر جامۂ عمل تنگ ہوا اور الفاظ و معنی کے تعلق نے ہمیشہ ہدایات کو لازوال بنائے رکھا۔ اسلام کی تعلیم کبھی نگاہوں سے اوجھل ہوتی نہ اس کو عمل میں لانے کے لئے کبھی تنگئ داماں کی شکایت ہوتی اس لئے دین کو صحیح طور پر سمجھنے اور احکام الٰہی کو عملی زندگی پر منطبق کرنے کے لئے احادیث نبوی سے بے میل واقفیت ناگزیر ہے نیز کتاب و سنت سے مسائل کے استنباط، اجماع سے استفادہ، قیاس کی مشق اور اجتہاد کے طریقہ کو سمجھنے کے لئے اکابر فقہاء کے طرز استدلال اور اصول استنباط کو اچھی طرح سمجھنا بے حد ضروری ہے اس لئے قرآن کے ساتھ فقہ و حدیث میں اعلیٰ درجہ کی استعداد پیدا کرنے پر بھی زور دیا گیا۔

اس دارالعلوم کو قائم ہوتے اسی برس سے زائد ہو چکے ہیں اگر قوم نے اس کی صدائے اصلاح پر کان دھرا ہوتا، اس کے اصلاحی پروگرام کو بروئے کار لانے کی جدوجہد کی ہوتی، نصاب و نظام تعلیم میں خاطر خواہ ترمیم ہو گئی ہوتی، اس پر عمل کے مواقع میسر آجاتے اور اس کے بلند مقاصد کے شایان شان اسباب اور ساز و سامان مل جاتا تو آج قوم کی پستی و پست روی کا یہ حال نہ ہوتا جو ہمارے سامنے ہے نہ دین اس کس مپرسی میں مبتلا ہوتا جس کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں بلکہ مذہب ایک زندہ حقیقت ہوتا اور مسلمان اسلام کی روشنی لے کر آگے بڑھتے اور زندگی کی شب تاریک سحر کر دیتے اور ان کے فیض سے دنیا کے خزاں رسیدہ چمنوں میں پھر بہار آجاتی، مرجھائے ہوئے پھول لہلہا اٹھتے گل و لالہ پر نکھار آجاتا سبزۂ پامال ہوا کی موجوں سے اٹکھیلیاں کرنے لگتا اور یہ عالم پیر پھر نئے سرے سے جوان ہو جاتا۔ تہذیب و تمدن کو نئی آب و تاب نصیب ہوتی، سیاست نئی کروٹ لیتی۔ معیشت کے پیچ و خم دور ہوتے، معاشرت ایک نیا رنگ اختیار کرتی اور انسانیت کا درماندہ راہ قافلہ اسلام کی روشنی میں خیر و فلاح کی منزل کی طرف بڑھتا۔

لیکن قوم کی بے توجہی، وسائل کی کمی اور ساز و سامان کی نایابی کے باوجود اتنا کام ہو گیا کہ بندوہ کے بانیوں کی روشن ضمیری محتاج ثبوت نہیں رہی اگرچہ قدیم و جدید کی آمیزش اور عقل و نقل کا امتزاج اس اعلیٰ معیار کے مطابق نہ ہو سکا جو ندوہ کے کارکنوں کے پیش نظر تھا مگر محدود تجربہ نے بھی مقصد کی صداقت عیاں کر دی اور اس کے فرزندوں کی عملی مثال نے دوسرے نو رہروں کے لئے راہ عمل نمایاں کر دی۔ فکر و نظر کے گوشے ہوں یا تحریر و تقریر کے میدان، تصنیف و تالیف کے ادارے ہوں یا درس و تدریس کی مسندیں، جلوت کے ہنگامے ہوں یا خلوت کے حلقے اخبارات و رسائل کے مقالے ہوں یا ذکر و شغل کے مشغلے سیاست کی پرخار وادیاں ہوں یا معیشت کی پرپیچ راہیں، ادب کے گیسوؤں کی آرائش ہو یا علم و حکمت کی غواصی کون سا کام ہے جو متوسلین ندوہ کے نام سے خالی ہے۔ کس میدان میں اس کے فیض یافتوں کے قدم نہیں پہنچے کون سی وادی ان رہ نوردان شوق سے ناآشنا ہے اور ان کے نقش پا کی شوخی کس منزل پر پکار پکار کر یہ اعلان نہیں کر رہی ہے کہ ؎

"ابھی گزرا ہے کوئی اس طرف سے"

ضرورت ہے کہ اس محدود تجربہ کو مزید وسعت دی جائے، دین و دنیا کی ہم آمیزی کا معیار اور بلند کیا جائے اور قدیم وجدید کا ایسا عظیم سنگم بنایا جائے جہاں سے فکر و خیال کی نئی نہریں رواں ہوں جن کا آب حیات ہماری مردہ رگوں میں زندگی کا خون دوڑا دے، ہماری کشت ویراں سرسبز و شاداب ہو جائے مرجھائے ہوئے پودے پھر لہلہا اٹھیں اور ہمارے باغ و چمن میں نئی بہار آجائے، ملت کی تمنائیں بار آور ہوں، بزرگوں کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو، رویا واقعہ کا قالب اختیار کرے اور مستقبل ایک جہانِ نو کی بشارت سنائے۔

بقیہ نفسیات

بسا اوقات سکون کی تلاش میں وہ غیر فطری طریقے بھی اپناتا ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا جرم قتل ہے۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ انسان قتل کا ارتکاب بھی سکون حاصل کرنے کے لئے کرتا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کو سکون کیلئے زک پہنچاتا ہے اور تو اور وہ مذاق بھی سکون کے لئے کرتا ہے۔ گالی بھی سکون کے لئے دیتا ہے جیتی سکون کے لئے بنتا ہے۔ آپ سوچئے سکون کتنی بڑی نعمت ہے۔ دراصل نعمت ہی سکون ہے۔ اور سکون ہی میں نعمت ہے۔

سکون کہاں ہے

سکون مشکل سے ملتا ہے۔ سکون بہت آسان ہے۔ دونوں باتیں صحیح ہیں غیر شعوری طور زندگی میں سکون کے حصول کے لئے انسان توازن اپنایا چاہتا ہے۔ مگر اس سے سکون بھاگ جاتا ہے۔ اور اگر توازن کا راستہ اپنایا جائے تو سکون خود بخود آجاتا ہے۔

سکون حاصل کرنے کے لئے بنیادی چیز ہے کہ پریشانیوں سے آپ دور ہو جائیں۔ صرف پیش آمدہ مسائل پر غور کریں اور پھر عمل کریں۔ یہ سب چیزیں لازم ملزوم ہیں۔ محض افکار انسان کو بے عمل بناتے ہیں فکر کیجئے اور عمل کیجئے۔ سکون ملے گا۔ سکون صرف عمل سے مل سکتا ہے وہ کبھی بھی کسی گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر نہیں مل سکتا۔ جو لوگ گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر سکون حاصل کرتے ہیں۔ انھیں بھی سکون مل جاتا ہے مگر وہ ایک مقصدی عمل کے بعد چاہے وہ عمل چلہ کشی کا ہو، عبادت کا ہو، خدا کی تلاش کا ہو۔ خالی بیٹھے مکھیاں مارنا جرم ہے اس سے سکون بھاگ جاتا ہے۔ بے راہ روی آتی ہے آپ عدم توازن کا شکار ہوتے ہیں سکون صرف عمل سے ملتا ہے۔ عمل، عمل، عمل صرف عمل میں سکون ہے۔

جو لوگ سکون کی تلاش کے لئے غیر فطری طریقے پر اپناتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو برباد کرتے ہیں۔ تمباکو کچھ وقفہ کے لئے شراب افیون، کوکین، وغیرہ اس سے کچھ زیادہ وقفہ کے لئے سکون کی نیند سلاتے ہیں۔ مگر وہ سکون نہیں ہے۔ وہ سکون انسان کے لئے بے کار ہے۔ تباہی کا راستہ ہے۔ غیر فطری ہے جو عملی فکری صلاحیتوں کو ختم کر دیتا ہے۔ آپ سکون صرف عمل میں تلاش کیجئے۔ یقیناً ملے گا آپ کامیاب و کامران ہوں گے۔

حضرت ابراہیمؑ اور برہما جی

دنیا آج جس رخ پر چل رہی ہے اس کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نوع انسانی کا بیڑا غرق ہونے کا وقت قریب آگیا ہے دنیا کی ہر نوع آپس میں پریم اور محبت رکھتی ہے کوئی چھوٹی سے چھوٹی نوع بھی آپ کو ایسی نہیں ملے گی جو اپنی نوع کی نقصان اور تباہی کے در پے ہو مگر نوع انسانی کے متعلق یہ سمجھ لینا بالکل قریب الفہم ہے کہ نوع انسانی کے تمام جنسیں اور صنفیں آپس میں ٹکرا رہی ہیں نوع انسانی کا کوئی گروہ و قوم ایسی دنیا میں نہیں پائی جاتی جو ایک دوسرے کو تباہ و برباد کر کے عروج حاصل کرنا نہ چاہتی ہو بے شک دنیا کارگاہ عمل ہے اس میں جو کچھ ملتا ہے وہ سعی و عمل سے ملتا ہے مگر سعی و عمل کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کو تباہ و برباد کر کے اپنے ارتقاء کا زینہ بنالے۔

جہاں تک سوچا اور سمجھا جاتا ہے ہر مفکر ذرا سے سوچ اور فکر و وچار کے بعد یہ سمجھ سکتا ہے کہ دنیا میں مذہب ہی وہ شے ہے جس نے انسانیت کو فروغ دیا اور انسانی تمدن بے شمار منزلیں طے کرتا ہوا آج کی اس منزل میں پہنچا کہ آج سارا کرہ ارضی ایک گاؤں اور بستی کے مانند بن گیا ہے جس طرح سے گاؤں کے سارے آدمی اپنی ہر قسم کی ضرورتیں اپنی بستی ہی سے حاصل کر لیتے ہیں اس لئے دنیا کی اس ساری بستی کو بھی اس بڑی انسانی بستی سے مستفید ہونے کا حق حاصل ہے ہم دیکھتے ہیں کہ اگر بستی میں کئی ایک فریق بن جاتے ہیں اور ہر فریق ایک دوسرے کی تباہی پر تل جاتا ہے تو وہ بستی کچھ عرصے کے بعد آپس میں لڑ بھڑ کر اجڑ جاتی ہے دین و مذہب کا مقصد یہ ہے کہ نوع انسانی میں اتفاق و محبت پیدا ہو اور ملک و ملت کو ترقی ہو مگر بڑے فکر کی بات ہے آج وہی مذہب نااتفاقیوں مصیبتوں اور ہر قسم کی جنگوں کا پیش خیمہ بن رہا ہے ہر قوم اقتدار اور معاشرے کی کشمکش میں پھنس کر اپنی دوسری پڑوسی قوم کو تباہ و برباد کرنی چاہتی ہے حالانکہ مذہب تو خدا کے بنائے ہوئے اور سکھائے ہوئے طریق زندگی کا نام ہے جس پر عمل کر کے انسان اتفاق اور اتحاد کے ساتھ پر امن زندگی گذارتا ہے اور جملہ اہل مذاہب قوم و گروہ کو نہیں بلکہ جملہ نوع انسانی کو مذہب کی دعوت دے کر خدا کی رضا حاصل کر لیتا ہے لیکن آج تک کی انسانی تاریخ جو کچھ بتاتی ہے وہ یہی ہے کہ نوع انسانی نے فطرت کے تقاضوں کو تو بھلایا ہی تھا مگر مذہب سے بھی اس نے بہت کم فائدہ اٹھایا اور دنیا کے ملحد اور بے دین یہ کہنے لگے ہیں کہ مذہب نسل انسانی میں اتفاق و اتحاد پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے ملاحدہ کے اس غلط بیانی نے مذہبی انسانوں کو اس طرف متوجہ کر لیا ہے کہ وہ یہ غور و فکر کر کے سمجھنے کی کوشش کریں کہ کیا واقعی آج جو دنیا میں قومی لڑائیاں ہو رہی ہیں ان کا ذمہ دار مذہب ہے یا اور کچھ۔ کچھ آج کل یہ بھی کہنے لگے ہیں کہ صاحب اصل جنگ معاشرے کی ہے روٹی کپڑے کی ہے اقتدار کی ہے اور کچھ لوگ اس کے علاوہ اور بھی کچھ کہتے ہیں بہرحال اس وقت دنیا جو تباہی کے سمندر کے ساحل پر کھڑی ہے اس کا سبب خواہ انسانی معاشرہ ہو یا نسلی و قومی اقتدار یا مذہبی اختلافات نفسیاتی طور پر جب غور کیا جاتا ہے تو بات سمجھ میں یہ آتی ہے کہ نہ تو فطرت کا تقاضہ یہ ہے کہ نوع انسانی تباہ ہو کر رہ جائے اور نہ دین و مذہب کا یہ تقاضہ ہے کہ انسانیت کا بیڑا غرق کر دے بلکہ حقیقت جو کچھ سمجھ میں آتی ہے وہ یہی ہے کہ ساری نوع انسانی اپنے معاشرے اور اقتدار کی ہوس میں اپنے خالق و مالک کو بھول گئی آج جو دنیا میں بڑے بڑے مذاہب ہیں ان سب اہل مذاہب کا جائزہ لے کر چھان پھٹک دیکھ لیجئے کہ ان میں سے آج ایک فیصدی بھی مذہب پر قائم نہیں رہے خود مذہبی روح بھرنے والے میں بڑی تیزی کے ساتھ لامذہبیت گھسی چلی آ رہی ہے نہ عیسائیوں میں عیسائیت ہے اور نہ ہندوؤں میں ہندو مت کا وجود باقی ہے اور مسلمان تو ایسے گئے گذرے ہوئے ہیں کہ ان کا وجود کرہ ارضی پر ایک بوجھ بن کر رہ گیا دنیا کا کوئی مذہب بھی ایسا نہیں ہے جو انسانی بغض و عداوت کا حامی ہو بلکہ سب ہی اتفاق اور محبت کی تعلیم دیتے ہیں رحم کی اپیل کرتے ہیں ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کرتے ہیں بالخصوص ہندو مذہب کی تلقینات اور اسلام کی تعلیمات کے متعلق تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چھوت چھات اور اونچ نیچ سے اگر صرف نظر کر لیا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ انسان تو انسان حیوان پر رحم کرنے کی اپیل کرتا ہے قدیم ہندو مذہب کی تعلیم میں موذی جانور کو مارنا بھی پاپ بتایا گیا ہے اور انسانی جیو کو ستانا اور ایذا دینا تو مہا پاپ ہے اور اسلام کی تعلیم نے تو انسانی وحدت پر بہت بھاری زور صرف کیا ہے قرآن نے ساری نوع انسانی کو کان الناس امۃ واحدۃ قرار دیا ہے اور سارے انسانوں کو ایک باپ کی اولاد قرار دے کر ادیان و مذاہب کے اختلاف کو اس طرح سے ختم کر دیا ہے کہ ارشاد باری ہوتا ہے لانفرق بین احدھم من الرسل ہم ان لوگوں میں تفریق کو روا نہیں رکھتے جو خدا کی طرف سے شریعتوں اور دینوں کو لے کر آئے اور پیغمبر اسلام نے تو اختلاف و تفریق اور اونچ نیچ کا قضیہ یہ کہہ کر ہمیشہ کے لئے چکا دیا ہے الخلق عیال اللہ فاقرب الی اللہ انفعہم لعیالہ ساری مخلوق (جملہ انسان و حیوانات) اللہ کا کنبہ ہے اللہ سے زیادہ نزدیک وہ بندہ ہے جو اللہ کی مخلوق کو نفع پہنچائے اسلام مساوات اور رواداری کا بہت بڑا حامی ہے قرآن مجید میں بیس پچیس نبیوں اور رسولوں کا ذکر کر کے جملہ ادیان عالم کی تصدیق کر دی ہے اسلام نے انسانیت کے سارے بڑے آدمیوں اور نبیوں رسولوں رشیوں منیوں اوتاروں اور مہا پرشوں کا احترام سکھایا ہے۔

ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک میں مذہبی رجحانات کا رخ اس قدر متعصبانہ اور تنگ نظرانہ نہیں ہے وہاں مذہبی عقائد کی بنا پر لڑائیاں بہت کم ہوتی ہیں مگر ہمارے ملک کا تو وہ برا حال ہے کہ دنیا ہمارا مذاق اڑاتی ہے ہم نہیں جانتے کہ جب خدا ایک ہے تو اس کے مذاہب کیوں ایک نہیں

یہ بات تو اس کی شان کے خلاف ہے کہ وہ ایک ملک کے نبی کو تو ایک راستہ بتائے اور دوسرے کو دوسرا راستہ اور تیسرے کو تیسرا ہم تو یہ جانتے ہیں اور یہی حق بھی ہے کہ جس طرح رب ایک ہے جیسا کہ آج تقریباً سارے انسان اس کی وحدت تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں اور قوانین فطرت بھی سب کے لئے یکساں ہیں مذہبی تصور ہر قوم کا جداگانہ نہیں ہو سکتا یہ ایک ایسا عقلی استدلال ہے جس پر غور کرنے سے ہر صاحب علم و فہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ حق تعالےٰ شانہ کا منشا اہل مذاہب کو آپس میں لڑانا اور ایک دوسرے کا خون پلانا اور یوں کیسوں سے بھسم کرا دینا نہیں ہے بلکہ ساری نوع انسانی کو فطری نظام پر ثابت قدم رکھتے ہوئے اتحاد و امن پر قائم رکھنا ہے برعظیم ہند و پاکستان میں یوں تو بہت سے چاہے مذاہب ہیں مگر وہ سارے کے سارے ہندو مت اور اسلام میں متحد ہو سکتے ہیں آج اگر ان دونوں مذاہب کے پیرو دینی حقائق اور قوانین مذہبیہ کو سمجھنے کی کوشش کریں تو یقیناً ان میں اتحاد و ائتلاف کی راہیں پیدا ہو سکتی ہیں مقالہ ہذا میں جن افکار و قلائع کو مضمون کا جامہ پہنایا جا رہا ہے اگر اس پر پاکستان و ہندوستان کے ہندو و مسلمان غور و فکر کرنے کی تکلیف گوارہ فرمائیں گے تو وہ یقیناً دونوں ملکوں میں اتحاد و ائتلاف کی راہیں کھول سکیں گے نسلی اور مذہبی انسانوں میں کرۂ ارضی پر دو انسانی شخصیتیں ایسی ہیں جن کو نسلاً و مذہباً دنیا کی بڑی بڑی آبادیوں اور قوموں نے بڑا انسان تسلیم کیا ہے اور دنیا میں جس قدر ان کے پیرو نظر آتے ہیں کسی اور کے نہیں ہیں ہند و پاکستان کے جملہ ہندو اقوام چین و جاپان ۔ نیپال ۔ بھوٹان ۔ لنکا ۔ آسام ۔ برما وغیرہ کے بدھ مت رکھنے والے برہما جی کو ابو البشر مانتے ہیں اور ان کو ویدوں کا مصنف اور ربانی قرار دیتے ہیں اسی طرح سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا بھر کے مسلمان عیسائی یہودی قومیں امام الانبیاء اور عظیم ترین پیشوا تسلیم کرتے ہیں چونکہ یہ شخصیتیں نہایت قدیم زمانہ میں ہو گذری ہیں اس وجہ سے ان بزرگوں کے عام حالات تاریکی میں کھوئے جا چکے ہیں آج حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ان صحائف کا کہیں پتہ نہیں جن کے نازل ہونے کی تصدیق قرآن مجید میں موجود ہے اسی طرح برہما جی پر جو وید نازل ہوتے تھے ان کا بھی کہیں اتا پتا نہیں چلتا اگرچہ قدیم ہندو فلسفہ مذہب کی تاریخ یہی بتا رہی ہے کہ برہما جی پر چاروں وید پرگھٹ ہوئے تھے مگر بہت سے شارحین وید اور تاریخ نگاروں نے اس کی تصدیق نہیں کی اور مشہور آریہ سماج سوسائٹی کے لیڈر سوامی دیانند نے اس نظریئے کی صاف طور پر تغلیط کی ہے مگر جن لوگوں نے مذہبی تاریخ کا ریسرچ کیا ہے اور ان کا صحیح جائزہ لیا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور برہما جی کے حالات کی جانچ کی ہے تو انہی یہ رائے قائم کی ہے ۔

> ہندو قوم کا مشہور اور آریہ نسل کا عظیم ترین مقتدا برہما جی مسلمانوں اور عیسائیوں و یہودیوں کا اولوالعزم پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام دونوں حسباً و نسباً و مذہباً و عقیدتاً ایک ہیں ۔

اہل تحقیق کے اس دعوے کو محض دعویٰ سمجھ کر آگے نہ بڑھ جایئے بلکہ ہم ان حضرات کو خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان یا عیسائی جو تحقیق تاریخ قدیم کے مدعی اور مذاہب عالم میں تطبیق دینے کی کوشش کیا کرتے ہیں دعوت دیتے ہیں کہ اس موقع پر جو دلائل و شواہد اس ہیچمدان نے پیش کئے ہیں ان پر غور و فکر کی نظر ڈالیں میں سمجھتا ہوں کہ ہند و پاکستان میں ایسے ایسے تاریخ داں موجود ہیں جو میرے تاریخی شواہد اور جائزوں کی بنا پر اگر وہ اپنے ذہن و فکر کے گھوڑے دوڑائیں گے تو شاید ہمارا یہ دعویٰ دعویٰ نہیں بلکہ حقیقت بن کے سامنے آجائے گا آج تاریخی انکشافات کا زمانہ ہے قدیم تاریخ کے بہت سے پردے چاک کر دیئے گئے قدیم کتبات اور علم الآثار نے نوع انسانی کے بہت سے راز کھول کر ظاہر کر دیئے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور برہما جی کی شخصیتیں ایسی ہیں جن کا تقدس جن کی بزرگی جن کا ابو الاقوام ہونا تقریباً ساری انسانی آبادی کو مسلم ہے اہل ہند جب برہما جی کی نسل کا پھیلاؤ پھیلاتے ہیں تو ان کا یہ پھیلاؤ ایشیا کے بہت سے ملکوں پر حاوی ہو جاتا ہے یہی حال برہما جی کی ویدک مت کا ہے اس وقت ہند ایشیائی مذاہب میں جو انسانی آبادی پلٹی ہوئی ہے اس کی آبادی ایک ارب ستر یا اسی کروڑ کے قریب ہے اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ابو الاقوام ہونا اور امام الانبیاء تسلیم کیا جانا تقریباً دنیا کی ڈیڑھ ارب آبادی کا مسلمہ بنا ہوا ہے یورپ اور ایشیا کی مسلمان یہودی عیسائی قومیں ان کو بہت بڑا اولوالعزم نبی اور رسول اور پیشوا و امام تسلیم کرتی ہیں

(الف) ام لم ینبأ بما فی صحف موسیٰ ۞ و ابراھیم الذی وفیٰ (سورۃ النجم)

(ب) ان ھٰذا لفی الصحف الاولیٰ ۞ صحف ابراھیم و موسیٰ ۞ (سورۃ الاعلیٰ)

(ج) واتبع ملۃ ابراھیم حنیفا۔

(د) لقد کان اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم۔

ان آیات سے صریحاً معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو ایک بہت بڑے تشریعی نبی تھے ان پر کچھ صحائف بھی ضرور نازل ہوئے تھے اور نبی اکرم صلی اللہ کو بھی یہ حکم دیا گیا کہ وہ ان کی ملت کی اتباع کریں ابراہیم علیہ السلام کی ذات آپ اور آپ کی امت کے لئے اسوۂ حسنہ ہے ۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ بعثت محمدی کے وقت اہل عرب ابراہیمی دین اور شریعت کے پابند کہلاتے تھے اور انھیں اس پر بڑا بھاری ناز تھا ۔ خود نبی اکرم نے بعض قدیم عرب مسائل کو سنت ابراہیمی قرار دے کر انھیں باقی رکھا ۔ فریضہ حج و قربانی شریعت ابراہیمی کے دو مشہور مسئلے ہیں اسلام نے انھیں جوں کا توں باقی رکھا ہے مگر غور کرنے کی بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے جو کچھ کہا ہے اس سے تو انکار کی گنجائش ہی نہیں ۔ یقیناً حضرت ابراہیم نبی تھے اور ان پر کوئی کتاب بھی نازل ہوئی مگر آپ آج ساری دنیا کی خاک چھان ڈالئے تمام تاریخیں پڑھئے بائیبل عہد عتیق اور عہد جدید کا ریسرچ کر لیجئے ۔ آپ کو حضرت ابراہیم کا نام اور ان کی تشریعی حیثیت تو ہر جگہ معلوم ہو جائے گی مگر ان کی کتاب (صحف) کا کہیں پتہ نہیں لگے گا ۔ ابراہیمی عرب جب نبی اکرم صلعم سے ٹکرائے ۔ تو انھوں نے یہ تو ضرور کہا کہ ہم اپنے جد اعلیٰ ابراہیم کی ملت پر ہیں اور اسی پر رہیں گے مگر وہ حضرت ابراہیم کے صحیفے اور کتاب کا ایک ورق بھی پیش نہ کر سکے ۔ آج دنیا میں کوئی کتاب ایسی نہیں ملتی جس کو حضرت ابراہیم کے نام سے منسوب کیا جاتا ہو ۔ نہ کوئی یہودی اس کا دعویدار ہے ۔ نہ کوئی عیسائی و مسلمان کیا ساری اولاد آدم نے اتفاق کر کے ان صحائف کو تلف کر دیا ۔ ؟

آج کل جو کتاب صحیفہ ابراہیمی کے نام سے ملتی ہے ۔ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کی مصنفہ ہے اس کے متعلق مشہور اسلام دشمن یورپین مصنف نے یہ خیال ظاہر کیا ہے ۔

> یہ کتاب غالباً مصر میں طبع ہوئی ہے ۔ اور دوسری یا تیسری صدی عیسوی میں ایک یہودی کا مصنف نے جو بعد میں عیسائی ہو گیا تھا لکھی ہے اس کتاب کا ترجمہ عربی زبان میں موجود ہے
>
> (بحوالہ ٹسڈل کی ماخذ القرآن ص [illegible])

پیدائش انسان ہی سے حق تعالےٰ کی یہ سنت جاری رہی ہے کہ اس نے ہر قوم و ملک میں انبیاء و رسل بھیجے بعض انبیاء و رسل کے مذاہب نے بہت بڑا فروغ حاصل کیا ۔ ان میں ایک حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ہیں جنھیں ایک بہت بڑے خطے کا نبی بنا کر بھیجا گیا ۔ اور ان پر کتاب بھی نازل ہوئی مگر یہ آج پرانی بات ہے ۔ جب کرۂ ارضی پر انسانی آبادی کا اس قدر پھیلاؤ نہیں تھا ۔ جتنا آج ہے ۔ قرآن و بائبل اور تاریخ ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ ذریت ابراہیم سے دنیا بھر گئی اور دنیا کی مشہور شورہ پشت قومیں کال—

پارسیوں کو تم نی اسرائیل اور ... ہو ابی، اسماعیلی عرب وغیرہ اپنا سلسلۂ حسب و نسب حضرت ابراہیم سے ملاتی ہیں پھر یہ کیوں کر ہو سکتا تھا کہ اس قدر اقوام اپنے مورث اعظم اور پیغمبر کی الہامی کتاب و صحائف کو اس قدر جلد بھلا دیتیں۔ کہ ان کو کتاب یا صحیفہ کا نام تک یاد نہیں رہا۔ فالعجب ثم العجب۔

تاریخ قدیم کی گہرائی میں جانے اور قدیم مذاہب عالم کی تحقیق تطبیق و مشابہت کے سمجھنے میں جن لوگوں نے عقل و فہم کے گھوڑے دوڑائے ہیں۔ ان کی رائے اور خیال ہے کہ ہو نہ ہو ابراہیمی صحیفہ ایشیا کوچک سے کسی دوسرے ملک میں چلا گیا۔ اور کچھ عرصہ تک ذریت ابراہیم اس کی تلاش میں سرگرداں اور پریشان رہی۔ اس مقام پر یہ نہ سمجھ لینا چاہئے۔ کہ اولاد آدم نے صرف صحیفہ ابراہیمی ہی کو ضائع کیا ہے ہم نہیں بتا سکتے کہ کس قدر نبیوں اور رسولوں کی کتابیں مختلف طریقوں سے ضائع ہوئیں اور ضائع کی گئیں۔
پھر جب تاریخ اسلامی کے اس نظریہ پر غور کیا جاتا ہے۔ کہ انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار تھی جن میں تین سو تیرہ تشریعی رسول تھے۔ اور ایک سو چار کتابیں ان رسولوں کو دی گئی تھیں۔ تو یہ خیال قطعی طور پر ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ کہ جس طرح سے دوسرے رسولوں اور نبیوں کی کتابیں ضائع ہو گئیں۔ اسی طرح حضرت ابراہیم کا صحیفہ بھی ذریت ابراہیم کے ہاتھ سے جاتا رہا اور اب اس کا وجود بھی دنیا میں نہ ہو یا کوئی انسانوں کا غول کسی قریب کے بر اعظم یا ملک میں اسے لے گیا ہو۔
جیسا کہ آریہ اقوام کا اصل مخرج عراق عرب یا شام کا وہ حصہ ہے جہاں ابراہیم علیہ السلام اور ان کی ذریت کے آثار موجود ہیں ہندوستان اور یورپ کے مورخ یہ ثابت کرتے ہیں کہ ممالک یورپ میں جو قومیں آباد ہیں اور ہندوستان و ایران وغیرہ کی آرین قومیں باعتبار حسب و نسب، تہذیب مذہب سب اسی سرزمین سے ہجرت کر کے گئی ہیں۔ وہ آج سے تین چار ہزار سال پہلے جب یہاں سے نقل مقام کر کے گئی تھیں۔ تو شامی تہذیب اور شامی مذہب کو ساتھ لے گئیں پس اس میں کون سے شبہ کی بات ہے کہ ہم یہ تسلیم کر لیں۔ کہ آرین قومیں جو شام سے چل کر گئی ہیں۔ اپنی تہذیب و مذہب کے ساتھ ساتھ ابراہیمی صحائف کو بھی لے گئیں ہوں۔
یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ملک شام اور اس کے نواحی خطے انسانیت کا قدیم گہوارہ ہیں۔ جس قدر انبیاء و رسل اس سرزمین میں پیدا ہوئے ان کی شہادت میں تاریخ شاہد ہے اس سرزمین کو آج بھی ارض مقدسہ کہا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت سلیمان علیہ السلام اور بہت سے انبیاء کرام کے مزارات یہاں موجود ہیں۔ اس مقام پر ہم علم الآثار علم الالسنہ اور مطابقت مذاہب پر روشنی ڈالنا چاہیں گے۔ کہ حضرت ابراہیم اور برہما جی میں کس قدر مناسبت پائی جاتی ہے۔ تاریخ ہند قدیم میں برہما، وید، آریہ تینوں الفاظ بے حد قدیم ہیں۔ اور ان تینوں کی تحقیق پر علمائے محققین برابر اپنا سر کھپاتے چلے آئے ہیں۔ ہم نے قدیم ہندی کتب اور انگریزی کی جدید تالیفات سے ان الفاظ کی حقیقت جاننے کی سعی کی ہے۔

برہما کے تلفظ کے متعلق یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ کب بنایا گیا اس کی اصلیت صرف یہی ملتی ہے۔ کہ برہما ایک قدیم دیوتا کا نام ہے۔ اور یہی وہ دیوتا ہے جس پر "وید" نازل ہوئے۔ پرانوں میں جہاں آریہ قوم کا شجرہ نسب ہے۔ وہاں آخر میں برہما جی کا نام ملتا ہے جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ برہما جی آریہ اقوام کے جد امجد ہیں۔ اقوام ہند میں برہمن قوم اس بات کی مدعی ہے کہ [illegible] تعلق برہما جی سے ہے۔ ہندوستانی اقوام میں یہ قوم گیان علم و فہم کے اعتبار سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ ہمارا قدیم میں تہذیب و شائستگی و دھرم کا پرچار بھی اسی قوم کا حصہ رہا ہے۔
برہم کا لفظ جس سے برہما و ابراہیم کے الفاظ مشتق ہیں۔ اس کا وجود ساری ایشیائی زبانوں میں ملتا ہے۔ یہاں تک کہ بابلی اشوری، کنعانی عبرانی میں بھی یہ موجود ہے۔ مولانا عبرانی میں اس کے وہی معنی ہیں جو سنسکرت میں ہیں سنسکرت میں اس لفظ کے معنی روشنی و علم کے بتائے گئے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ برہما و ابراہیم میں مشابہت کی وجوہات موجود ہیں۔ جیسا کہ برہمن کا لفظ برہما سے وضع کیا گیا ہے۔ ان لوگوں نے شروع میں اپنے کو برہمی یعنی برہما والے کہنا شروع کیا ہے۔ بعد میں یہی لفظ برہمن میں تبدیل ہو گیا۔ برہم کا لفظ آریوں میں بہت محبوب تھا وہ اس لفظ کو اعلیٰ و مقدس مذہبی پرچارکوں کے لئے استعمال کرتے تھے انھیں وہ برہمن یا برہمی کہنے لگے۔ ہندوستان میں برہمی بوٹی کے نام سے ایک گھاس ملتی ہے۔ جو دماغی طاقت اور حافظہ کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ اس بوٹی کا یہ نام بھی برہم کی مناسبت معنوی کی وجہ سے رکھا گیا ہے۔ ایک اور دوا برہم ڈنڈی ہے اس کے فوائد بھی اسی قسم کے بیان کئے جاتے ہیں۔ یہ دونوں دوائیں آیورویدک کی مشہور دوا ہیں۔ مشرقی ہند میں ہمالہ پربت سے ایک دریا نکلتا ہے جس کا نام برہم پتر رکھا گیا ہے۔
قدیم برہمنوں نے بہت سی کتابیں برہمنوں برہمن کے ناموں سے موسوم کی ہیں۔ یہاں تک کہ چاند سورج والی زمین کو بھی انھوں نے برہما کے نام سے پکارا ہے۔
ابراہیم۔ اب ذرا لفظ ابراہیم کی طرف آیئے۔ یہ لفظ بائیبل و قرآن میں وارد ہوا ہے۔ بائیبل کے جو قدیم نسخے قدیم زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں یہ لفظ برہام براہام اہرام اور ابراہام کے تلفظ کے ساتھ ملتا ہے۔ سر سید احمد خاں مرحوم نے اپنی کتاب تبیین الکلام میں اس لفظ پر حسب ذیل بحث کی ہے۔

> ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام در قرآن اسم عجمی است و در آں لغات است ابراہام و ابراہوم و ابراہم مثلہ الباد ابراہم تقبل الباء الالف بسید و ابیرہ و براہیم مصغر آنست و ابلاہ و ابارہ و ابارہ و براہم و براہوم و براہمہ و براہ۔ (بحوالہ منتہی الارب ... جلد اول)

یہ بات قابل غور ہے۔ کہ برہما و ابراہیم کے تلفظ میں تو پوری مشابہت موجود ہے مگر قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ برہما جی ہندی تاریخ کی رو سے ہندی الاصل تھے۔ اور ابراہیم شامی الاصل تھے۔ جیسا کہ بائیبل اور قرآن کی شہادت سے اب تک سمجھا جاتا ہے اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تاریخ اقوام عالم اور علم الالسنہ کی تحقیقات کے مطابق کرۂ ارضی کی ساری زبانیں اس طرح سے مل جل گئی ہیں جیسے نسل انسانی مخلوط ہو چکی ہے۔ قدیم سے قدیم عربی فارسی سنسکرت الفاظ میں بہت میل پایا جاتا ہے عربی کے بہت سے الفاظ ہندوستانی زبانوں میں موجود ہیں۔ اسی طرح سنسکرت کے الفاظ قدیم شامی و عربی زبانوں میں ملتے ہیں اس لئے ہمارا خیال ہے کہ ابراہیم و برہما کے تلفظ کو قدیم انسانی تہذیب کی تاریخ میں تلاش کرنا ضروری ہے۔
آریہ۔ یہ بات قطعی طور پر صاف ہے کہ برہما جی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سامی قوم سے تعلق رکھتے ہیں حضرت ابراہیم کا کرسی نامہ بائیبل میں موجود ہے۔ جو چند نسلوں کے بعد سام بن نوح سے مل جاتا ہے یہ نسلیں شامی الاصل ہیں جن کا اصل وطن ایشیائے کوچک یعنی شام ہے۔ آریہ قومیں بھی جہاں کہیں بھی آباد ہیں واقعہ یہ ہے کہ وہ اسی سرزمین سے نکل کر گئی ہیں۔
مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم ترجمان القرآن جلد دوم ... میں رقمطراز ہیں۔

> ان قبائل کا ابتدائی گروہ جسے آرین کے نام سے پکارا گیا۔ اس کا ایک حصہ وسط ایشیا سے [illegible] کی طرف بڑھ گیا۔ ایک حصہ آ کر خراسان میں آباد ہو گیا۔ ایک مغرب کی طرف بڑھا اور یونان اور اٹلی یا اطالیہ میں پھیل گیا۔ اسے ... کے نام سے ...

کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ہندوستان و یورپ دونوں کے آریہ اقوام کے مورث اعلیٰ تھے ان کا جو حصہ شمالی ہند میں بس گیا اس نے اپنا نسلی خطاب برابر ہی رکھا۔ اور اپنے دیش کو آریہ ورت کہتا رہا۔ جو فارس اور میڈیا میں بسا۔ اس نے اپنے ابتدائی قیام گاہ کو ایریانہ کے نام سے موسوم کیا۔ اور یہی ایریانہ ایران ہو گیا جو قبائل اناطولیہ تک پہنچ گئے تھے۔ وہ غالباً ہتی کے نام سے پکارے گئے جنہیں تورات کی کتاب پیدائش میں قوام کہا گیا ہے۔ اور دھرم کے قدیم نوشتوں میں ہتی پایا جاتا ہے۔ آریہ کے سلسلے میں دوسرے محققین کے مزید خیالات آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔

وید۔ ویدک[1] دھرم میں وید شاستر، پران، مہابھارت و راماین وغیرہ قدیم سمجھے جاتے ہیں۔ مہابھارت راماین تاریخی کتب ہیں جن میں قدیم آریوں کی لڑائی کا ذکر ہے۔ پرانوں میں بھی تاریخ کا بہت حصہ آگیا ہے شاستر ویدوں کی شروحات کی حیثیت رکھتے ہیں یہ وید چار ہیں۔ رگ وید، شام وید، یجر وید، اتھروید وید اپنی اصلی شکل و صورت میں اس وقت دنیا میں موجود ہیں یا نہیں، اس بحث میں ہم اس وقت نہیں پڑیں گے۔ اتنا یقین ہے کہ آریہ قوم کے پاس وید نامی کتاب ضرور موجود تھی۔ اور جو آج بھی کسی نہ کسی شکل میں ہندوستانی آرین نسل کے پاس موجود ہے۔

اب ہم آپ کی توجہ ان دلائل کی طرف مبذول کرانا چاہیں گے جنہیں ہم اپنے دعوے کے سلسلے میں بطور استدلال پیش کر رہے ہیں۔ یہ استدلال فی زمانہ حسب ذیل چیزوں سے کیا جا سکتا ہے۔

(۱) زبان (۲) مذہب (۳) رسومات و عادات (۴) قدیم نوشتے و علم الآثار (۵) الہامی نوشتے علم الآثار۔

زبان

ابتدا میں آرین نسل کی ایک ہی زبان تھی جو نقل مکانی کے بعد بدل گئی۔ اور جہاں جہاں یہ نسلیں جاکر آباد ہوئیں۔ وہاں نئی زبانوں نے جنم لیا۔ مثلاً یورپ میں ان کی زبانیں لاطینی جرمن فرانسیسی، اطالی وغیرہ بن گئیں۔ ایران میں آئے تو فارسی ہو گئی اور ہندوستان میں سنسکرت، یہ واقعہ ہے کہ سمیٹک اور آریہ اقوام کی تمام زبانوں میں بھاری مشابہت پائی جاتی ہے سنسکرت فارسی اطالوی انگریزی زبانوں میں اس زبان کے الفاظ پائے جاتے ہیں جو آج سے ہزاروں سال قبل آریا اقوام کے اصلی وطن وسط ایشیا شام وغیرہ میں بولی جاتی تھی۔ شامی و آرین زبانوں کا جائزہ لینے والا ایک یورپین محقق رقمطراز ہے

فبعضهم رجح ان جميع اللغاة السامية واللغاة الأرية كانت فى عصر من العصور لغة واحدة..

ان میں سے بعض کا یہ رجحان ہوا کہ تمام سامی و آریہ زبانیں کسی زمانے میں ایک ہی زبان تھیں۔

تاریخ اللغات السامیہ مطبوعہ مصر ص ۱

ہندوستانی مورخ کے خیالات ملاحظہ فرمایئے۔

شائستہ زندگی کے سب سے پہلے مراکز ایشیا میں ہی خیال کئے جاتے ہیں۔ مگر ہم اس قدر اور اخذ کرتے ہیں۔ کہ تمام آرین زبانوں کی نہایت ہی قدیم صورت اس زبان سے ملتی جلتی ہے جس کو آریہ نسلوں کے بزرگ عموماً بولتے تھے۔

بحوالہ قدیم ہندوستان کی تہذیب رومیش چندر دت بنگالی عالم

غازی محمود دھرم پال اس طرح سے مخاطب ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج سے پانچ ہزار سال قبل ہندوستان میں عربی زبان مہاراج یدھشٹر کے دربار میں کیسے رائج ہو گئی اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے۔ کہ آج سے پانچ ہزار سال پیشتر اس ملک میں دین حنیف کا دور دورہ تھا۔ اور یہ کہ یدھشٹر وغیرہ جس قدر راجہ اور مہاراجہ تھے وہ بہت بت پرست نہیں تھے۔ بلکہ دین حنیف کے ماننے والے تھے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب کہ ابراہیم خلیل اللہ نے عراق عرب اور ملک شام اور حجاز کے اندر دین حنیف کا علم بلند رکھا تھا۔ ...... ہندوستان اور عرب کے درمیان اس زمانے میں تجارتی مجلسی اور مذہبی تعلقات موجود تھے۔ اس لئے ہندوستان کے راجوں مہاراجوں میں عرب کی زبان کا رواج تھا۔ قیاس چاہتا ہے کہ انہوں نے حضرت ابراہیم سے جن کو عبرانی زبان میں ابرہم کہا جاتا ہے۔ خدائے وحدہ لاشریک کی تعلیم پرستش حاصل کر کے اس کو اپنے ملک میں برہم ودیا کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور برہم ودیا میں سوائے وحدہ لاشریک کے کسی دوسرے کی پرستش کی تعلیم نہیں ہے۔

ایک مقام پر دھرم پال جی نے اپنے مضمون کو زیادہ مدلل بنانے کے لئے سوامی دیانند جی کے حوالے سے لکھا ہے۔

سوامی دیانند نے اپنی کتاب ستھیارتھ پرکاش مطبوعہ بنارس ۱۸۷۵ء میں جابجا اس امر پر زور دیا ہے۔ کہ زمانہ قدیم میں اس ملک میں بت پرستی نہ تھی۔ بلکہ بت پرستی زمانہ مابعد کی ایجاد ہے یہ وہی زمانہ ہے جو کہ ہمارے ہاں جاہلیت کا زمانہ کہلاتا ہے۔ کچھ بھی ہو سوامی دیانند کی تحقیقات کے مطابق جس کا ذکر کر چکا۔ آج سے پانچ ہزار برس قبل عرب و ہند کے تعلقات بہت گہرے تھے۔

(کفر توڑ مصنفہ دھرم پال بی اے)

اب آپ مشہور لیڈر لالہ لاجپت رائے کے خیالات ملاحظہ فرمائیں۔

ہندو آریہ لوگوں کے بارے میں بعض یورپین مورخوں نے لکھا ہے کہ وہ خانہ بدوش اقوام میں سے تھے مگر یہ بات بالکل غلط ہے اس بات کا بہت کافی ثبوت موجود ہے کہ آریہ ہندوستان میں آنے سے قبل اور ہندوستان میں آنے کے بعد بھی میسوپوٹامیہ یعنی عراق عرب فارس افغانستان کے علاقوں کے حکمران تھے۔ اور فنون کاشتکاری و آلات حرب سازی سے بخوبی واقف تھے۔

(تاریخ ہند لالہ لاجپت رائے جلد اول ۹۶)

لالہ جی کے اس نوٹ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل ہند و اہل عرب میں تعلقات بے حد گہرے تھے جس سے یہ بھی قرین قیاس ہے کہ وہ ضرور عربی زبان جانتے ہوں گے۔ جناب مولانا عبداللہ العمادی اپنی تاریخ "عرب قدیم" میں لکھتے ہیں۔

ہندوستان سے اکثر عرب کے تعلقات رہے ہیں۔ یہ ملک اہل عرب کو اتنا پیارا

---

[1] ویدک دھرم آج کل ہندو دھرم کے نام سے مشہور ہے۔ حالانکہ ہندو دھرم کا نام نہیں ہے۔ ہندو تو ہند میں رہنے والے کو کہا جا سکتا ہے۔ ہندو دھرم کا اصل نام ویدک دھرم ہے۔

تھا۔ کہ اس کے ہندنام کو انھوں نے دمشق کا موضوع قرار دے رکھا تھا وہ ہندوستان کی کسی خاص حصے کی آبادی کو عربی النسل کہا کرتے تھے۔ ہم یہ یقین تو نہیں کر سکتے مگر ہاں یہ جانتے ہیں کہ غیر تاریخی زمانے میں چند گجرات میں عربی حکومتیں موجود تھیں مسٹر الیسٹ کی انگریزی تاریخ سندھ میں اہل عرب کی سلطنت سندھ کا تذکرہ موجود ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے قدیمی اور علمی زبان میں جو ٹھیٹ آرین زبان تھی عربی کے آثار موجود ہیں۔

(تاریخ عرب قدیم ص)

رسالہ زمانہ کانپور میں ایک مقالہ نگار فرماتے ہیں۔

وادی انڈس کی تہذیب کے عہد کا تعین عراق کی تہذیب سے اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ دونوں کے شواہد میں مشابہت موجود ہے۔ انڈس کی وادی سے جو نوادر دستیاب ہوئے ہیں وہ عراق کے دریافت شدہ آثار سے ملتے جلتے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تقریباً چار ہزار سال قبل مسیح دونوں ممالک میں ارتباط کا سلسلہ قائم تھا۔

۲۔ مذہب

قومی مماثلت و مشابہت کے لئے مذہب بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اگر چار ہزار سال پیچھے ہٹ کر ہم عراق عرب عجم اور شام کے مذاہب کی طرف نظر دوڑائیں۔ تو ہندوستان کے قدیم آریہ ویدک مذہب سے پوری مطابقت پائی جائے گی۔ جس کی تصدیق عراق و شام کے کھنڈرات سے ہوتی ہے۔ جن کی کھدائی ابھی ماضی قریب میں ہو چکی ہے جس کا ذکر ہمارے متعدد حوالہ جات میں گذر چکا ہے۔ خود قرآن مجید نے بھی اس کی نشاندہی کی ہے کہ حضرت ابراہیم کے عہد میں ان علاقوں میں بڑی بھاری بت پرستی رائج تھی۔ خود حضرت ابراہیم ایک بت تراش خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ قرآن میں حضرت ابراہیم کے بتوں کو توڑنے کا ذکر کرتے ہوئے علم نجوم کی طرف اشارہ کیا ہے۔

فنظر نظرۃ فی النجوم ہم دیکھتے ہیں کہ بت گری و بت پرستی کے معاملے میں ہند و عرب میں پوری مشابہت پائی جاتی ہے۔

۳۔ رسومات و عادات

قوموں کے عادات و رسومات بھی ایسی چیزیں ہیں۔ جن سے قومی تشابہہ کا راستہ نکلتا ہے چونکہ چار یا پانچ ہزار سال کا عرصہ اس قدر طویل ہے کہ اتنے عرصے میں کوئی قوم بھی اپنے مخرج سے نکل کر اپنی عادات و رسوم کو قائم نہیں رکھ سکتی۔ جو وہ قوم اپنی پیدائش کے زمانے میں رکھتی ہو گی۔ اس لئے مختصراً اتنا عرض کیا جا سکتا ہے کہ قدیم اہل عرب میں نسلی غرور جیسا تھا ہم سمجھتے ہیں یہ نسلی غرور ہندوستانی آرین نسل میں بھی پایا جاتا ہے۔ مہابھارت کا بلیدہ، چھتریوں کی لڑائیاں راجپوتوں کے قصے اس بات کی بھاری نشاندہی کرتے ہیں۔

۴۔ قدیم نوشتے

قدیم نوشتے یا کتابیں چاہے وہ الہامی یا غیر الہامی بالعموم ہر قوم کے پاس ملتی ہیں۔ مگر ہمارے پاس وید کے علاوہ کوئی ایسی چیز نہیں جو اس عہد کے حالات ہمیں بتا سکے۔ آریوں کے ابتدائی عہد کے وہ بلی یا قربانی کا عام رواج تھا اور جو آج بھی ہندوستان کی قوموں میں پائی جاتی ہے یہ سنت ابراہیمی ہم عرب قومیں یا نسلیں بھی اس سنت پر چلتی رہی ہیں۔

۵۔ الہامی نوشتے

الہامی نوشتے جو وقتاً فوقتاً خدا کے نبی و رسولوں پر نازل ہوتے۔ اور جو آج بھی نوع انسا[ن] کے پاس موجود ہے۔ ان میں وہ نوشتے بائیبل و قرآن قابل قدر ہیں۔ ان میں بہت سی قوموں [کے] حالات ملتے ہیں مگر ان میں ترتیب نہیں پائی جاتی۔ کیوں کہ انھیں مختلف مقامات پر عیسے عہد[وں] کے نقطہ نظر سے لکھا گیا ہے۔

تاہم اس بات کی طرف یقیناً روشنی پڑتی ہے کہ سارے انسان ایک ہی آدم کی اولاد ہیں او[ر] ایک مذہب خدا نے نبیوں و رسولوں پر نازل فرمایا تھا۔ مگر بعد میں انکی شکلیں بدل دی گئیں اور نو[ع] انسانی میں مذہبی تفریقات واقع ہو گئیں۔

۶۔ علم الآثار

اس سلسلے میں ہندوستان کے عظیم مورخ جناب اکبر شاہ خاں کی کتاب تاریخ ہند قدیم کا اقت[باس] ملاحظہ فرمایئے۔

۱۔ آریہ اقوام کے ہندوستان میں آنے کا زمانہ ہی ہے جب کہ بابل میں نمرود بن کنعان بن کنش حکمران تھا اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ آگ میں ڈالے گئے تھے۔

۲۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے آگ میں ڈالے جانے سے پہلے بابل کے کچھ لوگ ممدوح کی دعو[ت] پر ایمان لے آئے تھے اور اس حادثہ کے بعد حضرت خلیل اللہ جب مصر کی طرف تشریف لے گئے تو بابل کے مومنین نمرودیوں کی مخالفت کے خوف سے جلاوطن ہو کر ہندوستان کی طر[ف] چلے آئے۔

۳۔ نمرود کی حکومت نہ صرف میسوپوٹامیہ بلکہ ایران کے تمام صوبوں میں پھیلی ہوئی تھی اور بڑی اور متشددانہ حکومت تھی لہذا ممکن ہے کہ آریہ قوم بابل سے نہیں بلکہ ایران کے کسی صوبے جلاوطن ہو کر ہندوستان کی طرف آنے پر مجبور ہوئی ہو اور اس زمانے میں بابل کے یوم حضرت ابراہیم خلیل اللہ پر ایمان لے آئے اور بابل سے روانہ ہو کر ایرانی یا ایرین لو[گوں] سے آملے ہوں اور ان ایرین لوگوں کو جو دارالسلطنت کے باشندے ہونے کی وجہ سے زیادہ شائستہ اور مہذب ہوں گے عزت و عظمت کے مقام پر جگہ دی ہو اور ان کو اپنا اور روحانی پیشوا تسلیم کیا ہو۔

۴۔ برہما جی کی پیدائش ہندو روایات کے مطابق اس طرح بیان کی گئی ہے کہ اگنی دیوتا نے کنو[ل] پھول کھلایا اور اسی کنول کے پھول میں سے برہما جی پیدا ہوئے تھے اگنی دیوتا سے ا[س] کی طرف اشارہ ہے جو نمرود نے مہیا کی تھی اور جو خدا کے حکم سے گل و گلزار ہو گئی تھی۔

ہولی کے متعلق قدیم ہندو روایات بالکل خاموش ہیں اور کسی اصلیت کا پتہ نہیں چلتا لیکن رسم کی قدامت سے انکار نہیں ہو سکتا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں حضرت خلیل ال[لہ] اس واقعہ کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے ہولی کی رسم کو جاری کیا گیا ہے۔

۵۔ بابل کا حکمران خاندان ستارہ پرست اور اسور دیوتا کی پرستش کے سبب اسوریہ خاندان تھا آریہ برہمنوں نے ہندوستان آکر اپنے دشمنوں یعنی ہندوستان کے قدیم باشندوں کو بھی پہلے والے دشمنوں کے نام سے موسوم کر کے اسور خطاب دیا جیسا کہ وید اور سنسکرت زبان کی تصانیف سے ثابت ہے۔

۶۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ توحید الہیٰ کے علمبردار تھے ان کی سکھائی توحید کو ان بابلی موحدین نے ہندوستان کی آریہ قوم میں شائع کیا اور ان سب کو موحد بنا کر ابراہیم کے دین میں شامل کیا اس دینی علم کا نام برہم ودیا تھا اور مبلغین کی یہ جماعت برہمی یا برہمچاری کے نام سے موسوم ہوئی اس بات کے قوی قرائن موجود ہیں کہ ویدک تعلیم اپنے ابتدائی اور اصلی حالت میں خالص توحید الہیٰ پر مبنی تھی اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی تعلیم تھی بعد میں جب اسرائیلی اقوام شرک میں مبتلا ہوئیں۔ برہمنوں کے مذہب میں توحید باقی نہ رہی۔

۷۔ ہندوستان کے برہمنوں کا ایک خطاب مصری بھی ہے۔ جو غالباً ملک مصر سے ان کے تعلق کو ظاہر کرتا ہے اور یہ بھی حضرت ابراہیم کے مصر جانے اور مصری شاہزادی سے شادی کرنے اور مصر سے تعلق پیدا کرنے کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

۸۔ بابل میں سب سے پہلے ہیئت کی تدوین ہوئی اور دنیا کے تمام ملکوں پر بابل والوں کو ستاروں اور سیاروں کے طلوع و غروب کے متعلق معلومات بہم پہنچانے میں اولیت کا شرف حاصل ہے اور ان بابلی مسلمانوں نے ہی (جو برہمنوں کے نام سے مشہور ہوتے) ہندوستان میں آن کر علم جیوتش کی بنیاد رکھی اس سے پہلے یہ علم ہندوستان میں نہ تھا۔

۹۔ نمرود کی بابت اکثر مورخین کا خیال ہے کہ اسی کا نام ضحاک ہے جس نے جمشید کو شکست دیکر ایران پر قبضہ کیا تھا جمشید کی نسبت جامع التواریخ موسوم بہ مراۃ العالم میں لکھا ہے کہ جمشید آریوں کا بادشاہ تھا۔ شاہنامہ میں رقوم ہے کہ جمشید ایران سے کابل کی طرف روانہ ہوا اور یہیں گرفتار کیا گیا۔ یہ بھی دلیل اس بات کی ہے کہ آریہ لوگ ایران سے کابل کی طرف آئے اور وہاں سے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ نمرود جمشید و حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک ہی زمانہ تھا جو لوگ ہندوستان میں داخل ہوئے۔ وہ نمرود یعنی ضحاک کے مظالم کی بنا پر آئے نمرود یا ضحاک کے شرکیہ عقائد و اعمال کے خلاف حضرت ابراہیم نے آواز بلند کی تھی اس لئے ہندوستان میں داخل ہونے والوں کا حضرت ابراہیم کے عقائد و مذہب کو تسلیم کر لینا اور ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھنا بالکل قرین قیاس ہے۔

۱۰۔ آگ کی مہماں اور ستائش جو رگوید میں موجود ہے۔ وہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آگ کے گلزار اور موجب سلامتی بن جانے کی طرف اشارہ کر رہی ہے مثلاً رگ وید میں ہے کہ عظیم الشان اگنی اگرچہ تیری فطرۃ ایک ہی ہے تیری صورتیں تین ہیں آگ بن کر تو یہاں دمکتا ہے بجلی بن کر تو فضا میں چمکتا ہے سنہری سورج بن کر تو آسمان پر شعلہ زن ہے تو وہ رشتہ ہے جس کا پھیلاؤ آسمان تک ہے تو وہ پل ہے جو وسیع غار پر محیط ہے جو کہ زمین و آسمان کے درمیان واقع ہے وہ پل ہے جس پر ہو تے ہوتے نیک لوگ بالآخر بہشت میں داخل ہوتے ہیں۔ (انتھی خلاصہ تاریخ ہند قدیم ص۳۳)

ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے مندرجہ بالا بیان سے یقیناً آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ابراہیمی تہذیب و ہندوستانی تہذیب میں بھاری مطابقت موجود ہے۔ سامی نبیوں کا مذہب قدیم سے قدیم نسل انسانی کا مذہب رہا ہے۔ اور آرین قومیں جو ہندوستان میں باہر سے آئی تھیں۔ وہ لازمی طور پر اپنی پرانی تہذیب کے ساتھ ہی داخل ہوئی تھیں۔ ابراہیم کا نام بھی ان کے ساتھ تھا جو بعد میں زبان و مکان کی تبدیلی سے برہما ہو گیا۔ اسی طرح سے ان کے صحیفے وید بن گئے۔

قرآن کریم نے اس بات کی پوری نشاندہی کی ہے کہ خدا نے نبی اور رسول ہر قوم میں بھیجے تھے بہت سے محققین نے آریہ قوم کے رشیوں منیوں کو نبی و رسول تسلیم کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ حضرت سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں۔

> تعلیم محمدی کے احوال کے مطابق یہ تعین کرنا ضروری ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی قوموں اور ملکوں جیسے چین ایران ہندوستان وغیرہ میں بھی نبی صلعم سے قبل خدا کے انبیاء مبعوث ہو چکے ہیں اور اس کے لئے یہ تمام قومیں اپنے جن بزرگوں کی عظمت و عزت کرتی ہیں اور دین مذہب کو ان کی طرف منسوب کرتی ہیں۔ ان کی صداقت اور امتیازی کا کوئی مسلمان انکار نہیں کر سکتا اس بنا پر بعض علماء نے ہندوستان کے کرشن اور رام چندر کو بلکہ ایران کے زردشت کو اور بعض اصحاب نے تو بدھ کو بھی پیغمبر کہا ہے بہر حال امکان نہیں تو شبہ بھی نہیں۔
>
> (سیرت نبوی مطبوعہ پریس اعظم گڈھ)

بقیہ : ایک انٹرویو

پانڈیچری، جزائر لکادیپ ہماچل پردیش کا وہ علاقہ جو سابقہ ریاست پنجاب کا جزو تھا۔ اس کے علاوہ مہاراشٹر کے مرہٹواڑہ علاقہ میں یہ کام مکمل ہو چکا ہے۔ امید ہے کہ اس کام کے نتیجہ میں بہت سی مسروقہ جائدادوں کا انکشاف ہوگا اور اوقاف میں بعض قیمتی جائدادوں کا اضافہ ہو جائے گا۔ ناجائز قبضوں کو دور کرنے کی اس مہم کو سر کرنے کے لئے ہمہ اقسام کی کوششیں جاری ہیں۔ قانونی طور پر مقدمے دائر کئے جا رہے ہیں جن کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہونے کی توقع ہے۔

اپنا آخری سوال کرتے ہوتے میں نے مرکزی وقف کے اوایس ڈی سے دریافت کیا کہ ”زندگی میں آپ کی سب سے عظیم خواہش کونسی ہے؟

میرے اس سوال پر مسکراتے ہوتے انھوں نے غالب کا ایک شعر پڑھا۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

پھر کہنے لگے کہ ”میں اسے خواہش تو نہیں کہوں گا یہ میرا ایک خواب ہے اور میں جانتا ہوں کہ وہ ایک دن ضرور شرمندۂ تعبیر ہوگا۔ اور اس خواب کی تعبیر یہ نکلے گی کہ اوقافی جائدادوں کی خوب ترقی ہوگی۔ ہر شہر میں کئی منزلہ عالی شان اوقافی عمارتیں ہوں گی۔ اوقاف کے زیر اہتمام ہمارے نوجوانوں کے لئے تعلیمی، صنعتی، انجینیرنگ اور میڈیکل ادارے شب و روز کام کریں گے۔ چھوٹے کاروبار اور پیشہ ورانہ معلومات کے ادارے ہوں گے۔ مساجد وغیرہ کا مناسب انتظام ہوگا غسل، وضو اور صفائی کے لئے عصری طریقوں پر اہتمام ہوگا اور مساجد کے پیش اماموں کو اعلیٰ مشاہرے دیئے جائیں گے تاکہ نماز کے اوقات کے بعد تنظیمی کام انجام دیں اور اپنے اپنے محلوں کے مذہبی، تہذیبی اور اخلاقی امور میں مناسب اور اہم مشورے دے کر مسلم سوسائٹی کے قلب کو دینی اور روحانی روشنیوں سے منور کر سکیں گے۔

بشکریہ محراب ٹائمس دہلی

غلطیہائے مضامین

جناب عبدالخالق صاحب نقوی کی ممتاز علمی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ۔ آپ عربی زبان کے زبردست فاضل تو ہیں ہی ۔ مگر اردو میں ادب پر بھی پوری دسترس حاصل ہے ۔ زیر نظر مضمون آپ کی علمی بصیرت کا شاندار شاہکار ہے ۔

ابھی چند سال پیشتر جب غالب کی صدی منائی گئی تو ایک بروشور شائع کیا گیا ۔ اس میں بعض حضرات کے پیغامات شائع کئے گئے تھے ان پیغام دینے والوں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو غالب کی زبان میں پیغام نہیں دے سکتے تھے ۔ اس لئے مجبوراً انھوں نے انگریزی کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا ۔

یہ بزرگ عالی مقام غالب کو انگریزی کے توسط سے خراج تحسین و عقیدت پیش کرنا چاہتے ہیں اور غالب کے الفاظ ہی مدد بھی لے رہے ہیں اور بات یہاں آکر ٹھہرتی ہے کہ وہ غالب کے کلام کو جنت نگاہ اور فردوس گوش فرما دیتے ہیں ۔ یقیناً یہ دونوں تعبیریں بڑی خوبصورت اور دلنشین ہیں ۔ مگر کسی شاعر کے لئے ان کا استعمال خاکسار کی نظر میں درست نہیں ۔ البتہ غالب کے یا کسی بھی شاعر کے شعر کو اس وقت جنت نگاہ کہا جا سکتا ہے جب عبدالرحمن چغتائی یا ایم ایف حسین (اگرچہ ایم ایف حسین کا آرٹ میرے شعور سے بالاتر ہے) اسے نقش و نگار کے قالب میں ڈھال دیں اور فردوس گوش اس وقت ہوگا جب بیگم اختر یا لتا منگیشکر اسے اپنے حسن صوت و فن سے نغموں کا روپ بخش دیں ورنہ اپنی تجریدی حالت میں غالب یا کسی اور شاعر کے شعر کو جنت نگاہ یا فردوس گوش کہنا صحیح نہ ہوگا ۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے منطقی قضیوں میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ کیونکہ اس قسم کا بیان بداہتہً باطل ہے ۔

اس موقع پر عرض کروں گا کہ اپنی مادری زبان کو چھوڑ کر بلاضرورت کسی اجنبی زبان سے استعانت کرنا نہ صرف یہ کہ مناسب نہیں ہے بلکہ نہایت درجہ غیر مناسب ہے ۔ البتہ بعض اوقات اجنبی زبان کی ضرورت ناگزیر ہو جاتی ہے ۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے متعلق ایک صاحب نے ایک ایرانی ادیب کی اچھی طرح خبر لی ۔ اس ایرانی نے علمائے ہند کی فارسی خدمات کا مذاق اڑایا تھا حتیٰ کہ اس نے برصغیر کے فارسی لغت نویسوں پر زبان طنز و تشنیع دراز کی تھی حالانکہ اہل فارس آج تک اپنے ملک میں ان ڈکشنریوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں ۔ میں نے ان حضرت کو مشورہ دیا کہ بلاشبہ آپ کا مقالہ بہت بلند ہے ۔ مگر اردو میں ہونے کی وجہ سے اس کی افادیت محدود ہو کر رہ گئی ہے لطف تو جب تھا کہ اہل ایران علی العموم اور وہ ایرانی نکتہ چین بالخصوص آپ کے مقالے کو پڑھتے تب ان کو اپنی ناانصافی پر شرمندگی ہوتی ۔ صاحب مقالہ کا ارشاد تھا کہ آپ کی تجویز بالکل درست ہے مگر میں ایسی فارسی لکھنے پر قدرت نہیں رکھتا جو ایرانیوں کے لئے قابل قبول ہو اور زبان و بیان کے اغلاط سے پاک ہو ۔ مجھے چونکہ یہ مقالہ پسند تھا اس لئے میں نے اپنے دوست پروفیسر سیتانند جاوا صاحب سے درخواست کی کہ آپ اس مقالہ کا فارسی میں ترجمہ فرما دیں چنانچہ موصوف نے میری درخواست کو قبول کر لیا اور اس مضمون کا ترجمہ آج کل کی رواں دواں فارسی میں کر دیا اور وہ مضمون فارسی کے ایک میگزین میں بڑی آب و تاب کے ساتھ چھپ گیا ۔ اردو میں یہ مقالہ رشید حسن خاں صاحب نے لکھا تھا ۔

اہل یورپ نے اس گر کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ جب بھی وہ کسی غیر زبان کے بارے میں کوئی علمی یا ادبی تحقیق پیش کرتے ہیں تو اپنی زبان ہی میں پیش کرتے ہیں ۔ مثلاً عربی کی ایک نادر و نایاب کتاب کو ایڈٹ کریں گے تو عربی زبان میں اپنی تحقیق کو قلمبند کرنے سے گریز کریں گے اور اپنی مادری زبان ہی کو اس غرض کے لئے استعمال کریں گے ، تمام محققین یورپ کا تقریباً یہی اجماعی وتیرہ ہے (لفظ وطیرہ کو املا کے لحاظ سے "ط" سے لکھنے پر فارسی کے ایک بہت بڑے عالم کا اصرار ہے ، اسی طرح وہ ازدحام کو جو رائج ہے اور جو درحقیقت غلط ہے ۔ "ژ" اور "ہائے ہوز" سے لکھنے پر اصرار فرماتے ہیں) مگر ہمارے ہاں فیشن یہ ہے کہ اگر فارسی یا عربی کی کوئی کتاب ایڈٹ فرمائیں گے تو اپنی تحقیق یا انگریزی میں یا پھر فارسی عربی ہی میں لکھیں گے ۔ میں نے اپنی یہی رائے اپنے ایک دوست کو پیش کی جنھوں نے عربی کی ایک کتاب کو ایڈٹ کیا ہے ۔ بلکہ موصوف نے مجھ سے خود فرمائش کی اور کہا کہ کتاب تو چھپ گئی ہے مگر ناشر نے میرے تحقیقاتی ملاحظات بھی اپنے ملاحظات بھی ثبت فرمائے ہیں اب میں نے پھر تفصیلی نوٹس تیار کئے ہیں اور جناب ناشر کی کوتاہ فہمیوں کو خوب واشگاف کیا ہے ۔ آپ ان پر نظر ڈال لیجئے ۔ ان کے اصرار سے یہ خدمت میں نے اپنے ذمہ لے لی ۔ جناب محقق کی مطبوعہ اور تازہ تحقیقات پر نظر ڈالنے کا مجھے موقع ملا ۔ نیز اس کتاب کے ناشر عبدالمعید خاں مرحوم کے ملاحظات بھی نظر سے گزرے ۔ الستشار مومن کی اسپرٹ کے پیش نظر مجھ جو بات کھٹکی وہ ایمانداری کے ساتھ نوٹ کر لی ۔ میں نے جن اوراق پر اپنے نوٹس کو منضبط کیا تھا وہ قریب قریب ۲۰ صفحات

سرزد ہوں گے اور جب یہ نوٹس جناب محقق کو لکھ کر دیتے تو محسوس کیا کہ ان کو انشراح کے بجائے کافی نقباض ہوتا ہے ۔ میں نے بے تکلفی سے جگہ جگہ کچھ ایسے جملے بھی لکھ دیئے تھے جو خلش پیدا کرسکتے تھے یہ بھی عرض کیا تھا کہ آپ نے اتنی بہت سی کتابوں سے استفادہ کیا ہے پھر بھی بکثرت اغلاط باقی ہیں ۔ اگر میرے پاس حوالے کی اتنی یا تھوڑی بھی کتابوں کا ذخیرہ ہوتا تو یہ کتاب "المنمق" آئینہ ہوجاتی ۔ اقبال کا ایک شعر بھی لکھ دیا تھا جو شاید مناسب نہ تھا اور وہ یہ تھا ۔

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

اور اس شعر کے لکھنے کا سبب یہ تھا کہ اس عاجز کی نظر میں محقق علام سے بعض ایسی نمایاں اغلاط ظہور پذیر ہوئی تھیں جو عربی کے ایک پروفیسر سے سرزد نہ ہونی چاہیئے تھیں ۔

بات پرانی ہو چکی ہے مگر جو حقیقت ہے وہ اپنی جگہ تازہ ہے میں نے جناب محقق سے کئی بار استدعا کی کہ چونکہ آپ کو میرے نوٹس نہ صرف یہ کہ پسند نہیں آتے بلکہ ان سے آپ کو گرانی ہوتی لہٰذا از کرم مجھے واپس فرما دیجئے ۔ مگر جناب محقق نے لکھا کہ وہ کاغذات کہیں خلط ملط ہو چکے ہیں اس لئے معذوری ہے اگر مل جائیں گے تو میں واپس کردوں گا ۔

بہت روز سے مجھے خیال آرہا ہے کہ بعض تحقیقی کاموں کے بارے میں اپنا عندیہ عرض کروں ایک طرف تو عالم ہے کہ کاہتا اور لے دوڑی، اور یہاں یہ حالت ہے کہ بے شمار خیالات مجتمع ہوئے اور بکھر گئے ۔ اب سوچا کہ اپنے جگر لخت لخت کو پھر سے جمع کیا جائے اور اگر وہ پیش بھی کئے جاسکیں تو یہ خدمت بھی انجام دی جائے ۔

کتاب المنمق کے محقق علام جناب خورشید فارق سے مجھے یہیں سے اختلاف ہوا کہ انھوں نے عربی کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ کیوں بنایا جب کہ اردو میں بے تکلفی سے اپنا مدعا ظاہر کرسکتے تھے ۔ عربی زبان پر یا تو ایسی قدرت ہو کہ لغزشِ قلم کا کہیں خطرہ نہ ہو ورنہ اپنا مفہوم کسی اچھوتے ادبی انداز میں نہ سہی سیدھے سادے صاف اور صحیح طریقے سے بیان ہوجاتے ۔ مگر وہ اصحاب جو کسی غیر زبان کو پڑھتے یا بولتے تو رہتے ہیں مگر اس میں لکھنے کا موقع کبھی کبھار آتا ہے جب بھی قلم اٹھاتے ہیں اور لکھنے بیٹھتے ہیں چھپ چھپ کر اور غیر شعوری طور پر غلطیاں راہ پاجاتی ہیں خورشید فارق صاحب نے کتاب المنمق کا مقدمہ یا دیباچہ جو بھی کہئے عربی میں تصنیف فرمایا ۔ اب مجھے تفصیل تو یاد نہیں ہے ۔ مگر ذیل کے نمونے کی غلطیاں بیک نظر سامنے آجاتی ہیں ۔

۱ کسی رسالے یا اخبار کے ایڈیٹر کے لیے موصوف نے مدیر کا لفظ استعمال فرمایا ہے ۔ اردو والے مدیر بمعنی ایڈیٹر استعمال کرتے ہیں مگر عربی میں لفظ مدیر بہ ایڈیٹر کے معنی میں ہرگز مستعمل نہیں ۔

۲ ۔ ایک جگہ محقق علام نے فرمایا ہے : "وجدنی ورثتہ ابیہ" عربی میں میراث، تراث ارث اور ورث وغیرہ مستعمل ہیں لفظ ورثہ اس معنی میں خالص اردو کا استعمال ہے ۔

۳ ۔ ایک جگہ ارشاد ہوا ہے : "فی حقل الحدیث" لفظ حقل عربی میں آج کل FIELD کے معنی میں ضرور مستعمل ہے مگر حدیث کے ساتھ اس لفظ کا استعمال نہایت بے جوڑ ہے ۔ اس کے بجائے موضوع یا مضمار کے لفظ زیادہ موزوں تھے ۔

۴ ۔ حضرت محقق کے بعد والے نوٹس جو مجھے دیکھنے کے لئے دیتے تھے ان میں ایک جگہ "بیت الحکم" ارشاد ہوا ہے ۔ میں نے عرض کیا تھا کہ حضرت والا آج تک "لحم" پر کسی نے الف لام داخل نہیں کیا، آپ نے کیوں اس کی صورت بدل دی ہے ۔

۵ ۔ محقق موصوف نے ایک اور کتاب ایڈٹ فرمائی ہے ، اس کا دیباچہ بھی عربی میں تحریر کیا ہے اور اس کتاب کی اشاعت جناب حکیم عبدالحمید صاحب کے قائم کردہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی طرف سے عمل میں آئی ہے ۔ اس کے عربی دیباچہ میں بھی زبان و بیان کے اغلاط موجود ہیں ۔ اس وقت تفصیل تو یاد نہیں مگر آیۃ وجستہ کتاب جیسی غلطی جس حقیقت کی غمازی کر رہی ہے وہ کسی عربی کے مبتدی سے بھی چھپی ہوتی نہیں ہے ۔ میں نے حضرت علامہ کو توجہ دلائی تو موصوف نے تسلیم کیا کہ جی ہاں یہ غلطی رونما ہوگئی ۔ خواہ میری طرف سے ہوئی خواہ کمپوزیٹر کی طرف سے ۔ شکریہ آپ نے نشان دہی کردی اگلے ایڈیشن میں دور کردی جائے گی ۔ جناب محقق نے میرے معروضے کو شرف قبول بخشا میں ان کا ممنون کرم ہوں ۔

عربی کے ایک دیوبندی ادیب نے القراۃ الواضحۃ کے نام سے عربی کی ایک کتاب دو تین حصوں میں شائع کی ہے مجھے ان کی کوشش اس لئے پسند آئی کہ ہندوستان میں عربی زبان کی تدریس کے لئے ایسی کتابوں کا قحط ہے جو ہمارے ہندوستانی طلباء کی مشکلات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہوں مذکورہ بالا کتاب مجھے اسی قسم کی ایک کوشش معلوم ہوئی ، لیکن جب غور سے ایک ایک لفظ پڑھا تو پتہ چلا کہ یہ کتاب بے شمار اغلاط کا مجموعہ ہے ۔ چنانچہ راقم الحروف نے مصنف کی خدمت میں ایک خط لکھا اور بعض بہت ہی فاش قسم کی اغلاط کی نشان دہی کی مگر مولف نے میرے خط کا جواب دینے کی زحمت نہیں فرمائی البتہ ان اغلاط کو درست کرلیا جن کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا پھر بھی بقیہ اغلاط اپنی جگہ موجود ہیں ۔ حیرت تو یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا استاد اور عربی کا ادیب ایسے اغلاط کا مرتکب ہوتا ہے جن کا اس کی ذات سے سرزد ہونا مستبعد ہے ، ہماری یونیورسٹیوں میں عربی کا معیار بہت گر چکا ہے ۔ وہاں کے طلبا سے کوئی توقع نہیں کی جاسکتی ۔ کیونکہ اکثر اساتذہ یا تو خود کم سواد ہیں یا جو ذی استعداد ہیں، وہ محنت نہیں کرتے ۔ مگر عربی مدارس خاص طور پر دیوبند جیسے مرکز سے عام طور پر یہ امید کی جاتی ہے کہ وہاں کے فارغ التحصیل اس درجہ کے ضرور ہوں گے کہ معمولی قسم کی صرفی یا نحوی اغلاط سے بچ سکیں گے ۔ لیکن مولف القراۃ الواضحۃ سے سخت مایوسی ہوئی ۔ وہ اجوف واوی باب سمع یسمع سے امر حاضر کا صیغہ واحد مونث بجائے "نامی" کے "نمی" تحریر فرماتے ہیں اور ناقص واوی باب نصر ینصر سے فعل مضارع کا صیغہ واحد مونث بجائے "تدعین" کے "تدعوین" ارشاد فرماتے ہیں ۔ میں اس کتاب کے اغلاط پر ایک جداگانہ مضمون انشاء اللہ مستقبل قریب میں لکھوں گا ۔

مولف "القراۃ الواضحۃ" کی کوتاہی یا بھول بہت معمولی سی معلوم ہوتی ہے کیونکہ انھوں نے پھر بھی ہندوستان میں رہ کر ہی تعلیم پائی ہے ۔ ایسے حضرات سے بھی واسطہ پڑا ہے جو جامع ازہر میں پانچ پانچ سال پڑھ کر آتے ہیں یا جنہوں نے قاہرہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ لیا ہے اور حال یہ ہے کہ نہ عربی کی عبارت صحیح پڑھ سکتے ہیں اور نہ ان کو یہ معلوم کہ قال یقول سے صیغہ امر حاضر مونث کے لئے کیا ہوتا ہے وہ "قولی" کی جگہ "قلی" استعمال کرتے ہیں ۔ یہ تو وہی "چو کفر از کعبہ برخیزد" والی بات ہوگئی ۔

اپنے مُدعا کو ثابت کرنے کے لئے مجھے ایک بہت اہم شہادت پیش کرنی ہے ۔ بالفعل اسی ذیل میں یہ بھی عرض کردوں کہ جنوبی ہند (مدراس) کے ایک عربی کے استاد نے عربی کی تعلیم کے لئے ایک کتاب انگریزی میں ARABIC FOR BEGINNERS کے نام سے تصنیف فرمائی ہے ۔ افسوس ہے کہ یہ بھی ایک ناکام کوشش کی حدود سے آگے نہیں بڑھ سکی ۔ انتہا ہوگئی کہ فاضل مصنف جناب سید علی صاحب نے باب الافعال سے صیغہ امر حاضر "افعل" بکسر الف تحریر فرمایا ہے

یہ ایسی غلطی ہے جس کو ہمالیہ کے برابر کہا جا سکتا ہے۔ غلطیاں تے مضامین کی نوعیت [illegible] ہیں ان کا تنوع اِملا اور انشاء کے اغلاط تک پھیل جاتا ہے۔

مثلاً ہمارے بعض ارباب قلم "حرکات وسکنات" کو لفظِ اعراب سے تعبیر کرتے ہیں چنانچہ راقم السطور نے ایک بار قاضی عبدالودود صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ جناب والا ہمارے فلاں دوست جنھوں نے اردو ادب میں قاموس الاغلاط کے اغلاط کی نشاندہی فرمائی ہے حرکات وسکنات کے لئے لفظ اعراب کا استعمال کرتے ہیں۔ کیا لفظ کتاب میں کاف کا کسرہ یا لفظِ اعراب میں الف کا کسرہ اور عین کا سکون اعراب ہے؟ قاضی صاحب میری گذارش فوراً سمجھ گئے اور فرمایا کہ جب اسداللہ خاں غالب اس مرض میں گرفتار تھا تو یہ بے چارے قابل معافی ہیں البتہ اگر ادّعا کا پہلو اختیار کریں تو تنبیہ کی ضرورت ہے۔ غالب کا معاملہ تو یہ تھا کہ وہ مدعی بھی تھا۔

اعراب کی بحث چھیڑ کر میں نے بعض قارئین کرام کو شاید الجھن میں ڈال دیا ہو تو بہتر ہے کہ لفظ اعراب کے بارے میں چند کلمات عرض کر دوں۔ لفظ "اعراب" عربی قواعد صرف ونحو کی ایک علم اصطلاح ہے، جس کے معنی ہیں عربی زبان میں الفاظ کے آخر کی وہ حرکاتی سکناتی یا حرفی تبدیلیاں جن سے کسی لفظ کی حیثیت کسی خاص جملے میں متعین ہوتی ہے لہٰذا کتاب کے کاف کا کسرہ یا اعراب کے الف کا کسرہ اور عین کا سکون اعراب کی تعریف سے خارج ہو گئے۔ چنانچہ وہ بندگانِ عالی مقام جو عام حرکات وسکنات کو اعراب کہتے ہیں۔ اس عاجز کی رائے میں غلطی کرتے ہیں۔

بعض غلطیاں محض لغزش قلم سے ہو جاتی ہیں وہ سب ہماری بحث سے خارج ہیں۔ مگر کچھ غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جن کو آپ لغزشِ قلم سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک سامنے کا لفظ ہے ہر شخص اس کو سمجھتا اور استعمال کرتا ہے لہٰذا عوام جس کے میں پیرو دوسری راہ نہیں" کہہ کر ایک شاعر اپنے لئے ایک نیا لفظ تلاش کر کے لاتا ہے مثلاً "تذکیر وتانیث" کی جگہ "تذکیر وتثنیہ" کہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ لفظ "تثنیہ" "تانیث" کے مقابلے میں ذرا بھاری بھرکم ہے۔ لہٰذا کیوں نہ اسے استعمال کیا جائے۔ یہ غلطی اور اسی قبیل کی دوسری غلطیاں مرحوم سیماب نے کی ہیں۔ ان کے اس دور میں ہندی کا چرچا شروع ہو چکا تھا۔ ایک لفظ "سمسیّہ" PROBLEM بھی تھا جو ہندی والے اس وقت بھی استعمال کرتے تھے۔ لہٰذا سیماب صاحب مرحوم نے یہ لفظ اپنی تحریر میں جگہ جگہ استعمال کیا ہے جو اس وقت بھی غیر مانوس تھا اور اب بھی ہے اور لطف یہ ہے کہ انھوں نے اسے مضمونِ شعر کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ میں یہ تو یقین کے ساتھ نہیں کہتا کہ لفظ "سمسیّہ" کے معنی مضمونِ شعر کے نہیں ہیں۔ البتہ اتنا ضرور عرض کر دوں گا کہ یہ لفظ ہنوز غیر مانوس ہے۔

راقم السطور اپنی اس کمزوری کا معترف ہے کہ اس کی نگاہ عیوب پر اکثر جاتی ہے۔ میرے ایک بزرگ محترم جن کا انتقال ہو چکا ہے عادت تھی کہ جب بھی وہ کچھ تحریر فرماتے تو مجھ سے فرمائش کرتے کہ تم اس پر نظر ثانی کر لو۔ ایک بار ایک مضمون مرحوم نے عربی میں سپرد قلم فرمایا اور میں نے اُن کے حکم کی تعمیل میں اس پر نظر ڈال لی، ایک پرچہ رہ گیا فرمایا کہ اس میں صرف قرآنی آیات میں نے نقل کی ہیں۔ تو ان کو بھی دیکھ لو اور اللہ کے کلام میں بھی کوئی مین میخ نکال دو۔ میں نے عرض کیا کہ نقل کرنے میں غلطی کا امکان ہے کیونکہ قرآنِ کریم کا رسم الخط جگہ جگہ متداول رسم الخط سے مختلف ہے اور اہلِ علم ہمیشہ اس بات کا اہتمام فرماتے رہے ہیں کہ قرآنی آیت کو اسی رسم الخط میں نقل کریں جس طرح وہ قرآن میں لکھی جاتی ہے۔ مولوی صاحب مرحوم نے قرآن کی ایک آیت اس طرح نقل فرمائی تھی اور ہر عربی داں اسی طرح لکھنا چاہے گا۔ وباؤا بغضب من اللہ (۱۱۲ آل عمرانؔ) اور ایک آیت کی کتابت اس طرح فرمائی تھی۔ قد افلح المومنون الذین ہم فی صلوٰتہم خاشعون (۲۳ المومنون ۱۔۲) میں نے عرض کیا کہ قبلہ مولوی صاحب باؤ و میں قرآن کا رسم الخط الف جمع کے بغیر ہے اور فی صلاتہم خاشعون میں آپ نے واؤ پر الف لکھا ہے۔ یہ درست نہیں ہے بلکہ اس جگہ قرآنی رسم الخط الف کے ساتھ ہے "صلاتہم" نہ کہ "صلواتہم" مولوی صاحب بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے ایسے باریک نکتوں کی طرف نظر جانا مشکل ہے۔ ؎ ہزار نکتہ دریں کار و بار دلداریست۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اغلاط کی انواع واقسام ہیں اور انھیں انواع واقسام کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ غلطی کا مرتکب کس درجے میں آتا ہے۔ بعض غلطیاں تو زبانِ حال سے صاف صاف اعلان کرتی ہیں ہمارا ارتکاب نہ کاتب کی دینِ قلم ہے اور نہ سنگ ساز اور کمپوزیٹر کا منت کش، ہمارا صدور تو اسی قلمِ حقیقت رقم سے ہوا ہے جس کی دھاک اقلیمِ علم وادب میں بیٹھی ہوئی ہے۔

غلطی کی ایک شدید قسم یہ بھی ہے کہ مصنفِ علام دیدہ ودانستہ اس کا ارتکاب فرماتے ہیں اور یہ خیال کر لیتے ہیں کہ ایک خلافِ واقعہ کو اپنی طرف یا اپنے والدِ بزرگوار کی طرف منسوب کر کے وہ اپنی یا اپنے والد کی شان میں شاید چار چاند لگا رہے ہیں، اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اب نہ سہی تو آئندہ کبھی نہ کبھی لوگ اس حقیقت کو پا ہی جائیں گے پھر اس وقت ہمارے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے علم وفضل کا مجھے بہت اعتراف رہا ہے اور ان کی ذہانت وذکاوت کا آج تک معترف ہوں مگر یہ کہہ کر کہ میری پیدائش مکہ میں ہوئی یا یہ شہرت دے کر کہ میں نے جامع ازہر میں تعلیم پائی نہ تو کسی کے تقدس میں اضافہ ممکن ہے اور نہ علم وفضل کا پایہ اونچا کیا جا سکتا ہے، کہ جیسے مقدس شہر میں کیا غیر مقدس لوگ پیدا نہیں ہوتے، اور کیا جامع ازہر سے فارغ ہو کر جاہل کے جاہل نہیں رہتے یا حسلاً مولانا ابوالکلام آزاد نے INDIA WINS FREEDOM میں ارشاد فرمایا، ہمایوں کبیر کو لکھوایا کہ میرے والدِ بزرگوار عربی کے زبردست عالم تھے اور ان کی ایک کتاب عربی زبان میں جب دس جلدوں میں شائع ہوئی تو عرب دنیا میں دھوم مچ گئی مگر مولانا نے اس کتاب کا نام نہیں بتلایا کسی اور عقیدت مند کو اگر اس جلیل القدر کتاب کا نام معلوم ہو تو وہ اس عاجز کو بتانے کی زحمت فرمائے ہندوستان کے عربی داں علماء کے عربی میں جو کتابیں کئی کئی جلدوں میں لکھی ہیں وہ معدودے چند ہیں اور ان کے نام سے کیا ہندوستان اور کیا ہندوستان سے باہر کے لوگ سب ہی اہلِ علم واقف ہیں۔ مثال کے طور پر نواب سید صدیق حسن صاحب کی تفسیر فتح البیان فی مقاصد القرآن دس جلدوں میں چھپی تھی۔ اگرچہ اس تفسیر قرآن کے بارے میں روسی عالم موسیٰ جاراللہ صاحب نے راقم الحروف کو یہ بتلایا کہ درحقیقت یہ تفسیر نواب صاحب کی روش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ قاضی شوکانی کی اس عربی تفسیر کا مخطوطہ ہاتھ آ گیا اس وقت تک وہ چھپا نہیں تھا۔ لہٰذا نواب صاحب نے تھوڑی سی ترمیم کے بعد اس کو اپنے نام سے چھپوا دیا مگر مجھے آج تک فتح البیان فی مقاصد القرآن اور فتح القدیر کے موازنہ کا موقع نہیں ملا۔ موسیٰ جاراللہ کے بارے میں میرا خیال ہے کہ ان کا یہ بیان ٹھیک ہوگا۔ نواب صاحب سے پہلے مولوی غلام علی آزاد بلگرامی کے عربی کے دیوانوں کی تعداد کوئی سات بتلاتا ہے اور کوئی دس لیکن یہ صحیح ہے کہ ہیں متعدد دیوان، اسی طرح یہ بات بالکل معتبر ہے اور اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ قاموس کی شرح "تاج العروس" سید مرتضیٰ زبیدی الواسطی البلگرامی نے دس جلدوں میں لکھی ہے۔ ان حضرات کے علاوہ شاید اور دو ایک بزرگ ہوں گے جن کی عربی کی کسی کتاب کا شمار کئی جلدوں میں ہوتا ہے۔ مثلاً حکیم سید عبدالحسن صاحب گل رعنا کی عربی تصنیف نزہۃ الخواطر کئی جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ مگر مولانا آزاد کے والدِ بزرگوار کی کون سی عربی

تصنیف دس جلدوں میں چھپی ہے آج تک ایک نعمت ہے۔

مولانا آزاد نے اپنی کتابوں اور رسائل کے نام بھی اکثر دوسروں سے اخذ کئے ہیں۔ جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان میں ORIGINALITY کی کمی تھی۔ ورنہ وہ اپنے رسالہ کا نام الہلال نہ رکھتے۔ کیوں کہ الہلال تو سب سے پہلے جرجی زیدان نے اپنے رسالہ کا نام رکھا تھا۔ جو اس نے ۱۸۹۲ء میں قاہرہ سے جاری کیا تھا اسی طرح البلاغ ایک عربی روزنامہ تھا۔ مولانا آزاد کی ایک اور مہتم بالشان تصنیف کا نام ترجمان القرآن ہے۔ یہ نام ہندوستان میں سب سے پہلے نواب صدیق حسن خاں نے اپنی اردو تفسیر کا رکھا تھا جو ۱۹ یا ۲۰ جلدوں میں شائع ہوئی تھی اور یہ نام اس قدر مقبول ہوا کہ آزاد نے اپنے ترجمہ قرآن کو اس نام سے موسوم کیا۔ مولوی ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے ماہنامہ کا نام ترجمان القرآن رکھا اور پھر مرزا بشیر الدین محمود نے اپنی تفسیر قرآن کو ترجمان القرآن کے نام سے موسوم کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے بلند پایہ انشا پرداز اور عظیم المرتبت خطیب ہونے میں کوئی کلام نہیں مگر اس تمام علم و فضل کے باوجود ان کی شخصیت ایک Complex کی شکار تھی جو ان کو مجبور کرتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو مادر زاد عبقری کا GENIUS اور رجال یوگیشور ثابت کریں۔

ایک بزرگ حضرت نیاز فتح پوری بھی تھے جنھوں نے وہ ساحرانہ فنکاری دکھلائی تھی جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ راقم الحروف نے اُن کی حیات میں ایک کافی طویل مقالہ لکھا تھا جس پر ان کو اور اُن کے نیازمندوں کو بہت تکلیف ہوئی تھی اور شاید نیاز صاحب کو زندگی میں پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو اُن کے دعوی ہمہ دانی میں شک کر سکتے ہیں۔ نیاز صاحب کا بھی معاملہ یہ رہا کہ انھوں نے مختلف جگہ سے تراجم کئے اور اس طرح اپنے علم و فضل کا لوہا ہمارے اردو والوں سے منوایا۔ یہاں ان کے بارے میں زیادہ تفصیل سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہے صرف دو ایک مثالیں پیش کرنا کافی ہوگا۔ حضرت نیاز کا وتیرہ خاص تھا کہ وہ تراجم کا سہارا لیتے تھے۔ اُن کے شہاب کی سرگذشت" "تاریخ الدولتین اور مطالعات نیاز حتی کہ نگار کا خدا نمبر سب انھیں ترکستازیوں کے نتائج ہیں بلکہ ان کی دیگر تصنیفات کو بھی میرا عقیدہ ہے کہ اگر ذرا سا کھرچ کر دیکھا جائے تو اس کی تہ میں کوئی نہ کوئی چیز اسی قبیل کی ضرور دریافت ہوگی تاریخ الدولتین جرجی زیدان کی مشہور کتاب سے ماخوذ ہے۔ شہاب کی سرگذشت کا مجھے علم نہیں لیکن وہ بھی ضرور اسی قسم کی کاوش ہوگی۔ مطالعات نیاز مصر کی ایک مشہور ادیبہ آنسہ مَیّ کے مجموعۂ مضامین کا ترجمہ ہے جو عربی میں ظلمات واشعۃ کے نام سے شائع ہوا تھا۔

ہندوستان میں کئی سال پہلے ٹیگور کا جشن صد سالہ منایا گیا۔ آل انڈیا ریڈیو نے اردو والوں سے کہا کہ آپ لوگ بھی کچھ لکھئے۔ ڈاکٹر قمر رئیس سے فرمائش کی کہ آپ اس موضوع پر قلم اٹھائیے کہ ٹیگور کے انداز تحریر نے اردو کو کہاں تک متاثر کیا ہے چنانچہ ہمارے اس ادیب لبیب نے لبیک کہا اور ایک صد چاک "یا مقالہ جو بھی کہئے سپرد قلم کر ڈالا۔ قمر رئیس صاحب کو سب سے زیادہ نیاز فتحپوری کی نثر میں ٹیگور کے اسلوب (میں اسلوب بفتح الف نہیں بلکہ بضم الف لکھتا ہوں میں نے سنا ہے کہ علی گڑھ میں ایک استاد محترم ہیں ان کا نام اسلوب احمد ہے مگر وہ بفتح الف پر اصرار کرتے ہیں۔ اعلام کے بارے میں کسی بحث و تکرار کی گنجائش نہیں جیسا نام ماں باپ نے رکھ دیا یا جس طرح پکارنے لگے وہی صحیح ہے) کا عکس نظر آیا چنانچہ اپنے دعوے کے اثبات میں نیاز فتحپوری کی تحریر کا ایک نمونہ بھی پیش کیا ہے۔ اس تحریر کا عنوان ہے "نہر صفا کا نغمہ" نیاز صاحب کی نثر کا یہ ٹکڑا مطالعات نیاز سے ماخوذ ہے اور یہ پوری کتاب "ظلمات واشعۃ" کا ترجمہ ہے صرف چند مضامین کو چھوڑ کر جو مترجم کے فہم سے بالاتر تھے کہاں سے کہاں بات پہنچ گئی۔ یہ مضامین عربی میں لکھے گئے۔ حضرت نیاز کے شیفتوں نے ان کو مطالعات نیاز کا نام دیدیا۔ اور جناب قمر رئیس کو ان میں ٹیگور کا اسلوب و انداز نظر آنے لگا اس طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک حقیقت پر کتنے پردے پڑتے چلے جاتے ہیں۔

جب نگار کا خدا نمبر میری نظر سے گذرا تو مطالعات نیاز کو پڑھ کر جس طرح خیال آیا تھا کہ یہ مضامین تو ایسا لگتا ہے کہ میں نے پڑھے ہیں مگر کہاں پڑھے ہیں تا آنکہ ظلمات "واشعۃ" کی طرف خیال گیا اور وہ درست نکلا۔ خدا نمبر کے بارے میں بھی مجھے محسوس ہوتا تھا کہ یہ کتاب یا یہ مضامین میرے لاشعور میں سے ابھر ابھر کر سطح پر آ رہے ہیں اتفاق سے اس کتاب کا بھی نام یاد آ گیا۔ میں نے بھوپال سے حضرت نیاز کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا کہ کیا خدا نمبر کو ترتیب دیتے وقت عباس محمود العقاد کی کتاب "اللہ" آپ کے پیش نظر رہی ہے تو جواب ملا جی نہیں میں نے نقاد کی کتاب پڑھی ہے اس کا موضوع دوسرا ہے۔ میں نے عقاد کی کتاب کا حوالہ دیا تھا مگر حضرت نیاز نے عقاد کو نقاد کہہ دیا اور یہ بھی فرمادیا کہ میں نے اس کی کتاب پڑھی ہے۔ مجھے اُن کی اس بات سے بہت دکھ ہوا۔ میں نے بعض نقادوں کو کہتے سنا کہ حضرت! موجودہ عہد کے سب سے بزرگ افسانہ نویس فلاں صاحب ہیں مگر کتنے ہی اور ایسے ادیب ہیں جنھوں نے اس میدان میں بہت بعد میں قدم رکھا لیکن اپنے پیشرو سے سبقت لے گئے اور اس وقت سرخیل ادیبان فن فسانہ گوئی ہیں اور اُن کی چند کاوشوں کا نام بھی لینا شروع کیا۔ جب ایک گدھے کی آواز بازگشت سامعہ نواز ہوئی تھی اس عاجز کے کان کھڑے ہوئے اور فوراً گمان گذرا کہ ہو نہ ہو یہ تو وہی مطالعات نیاز والا معاملہ معلوم ہوتا ہے میں نے عرض کیا کہ میں تو افسانے پڑھتا نہیں لیکن عربی کے ایک اخبار میں جو سعودی عرب کا تھا ایک افسانہ قسط وار چھپتا رہا تھا اور اس کا عنوان ہوتا تھا "مذکرات حمار" ایک "گدھے کی ڈائری" کاش کہ مجھے اس کا نام و نشان یاد رہتا تو اس وقت بھی بدگمانی کو دور کرنے یا اس کو یقین بلکہ عین الیقین بنانے میں مدد ملتی اتنا ضرور یاد رہ گیا کہ وہ کسی فرانسیسی ادیب کا نتیجۂ فکر تھا اور فرانسیسی زبان سے ترجمہ کیا جاتا تھا۔

راقم السطور ایک روز شام کو بمبئی میں شرف الدین الکتبی کی دوکان پر بیٹھا چند عربی کی درسی کتابوں کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ یکایک ایک عنوان سامنے آیا۔ عنزۂ فلاں عنزہ[1] کے بعد کیا نام ہے۔ اس وقت یاد نہیں آ رہا مگر School of Foreign Languages کی لائبریری میں یہ کتاب موجود ہے چھ سات حصوں میں ہے اور اس میں یہ کہانی موجود ہے جس کا جی چاہے جا کر دیکھ لے اور مترجم نے آخر میں اس کہانی کا ماخذ بھی ظاہر کر دیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ یہ کہانی فلاں فرانسیسی ادیب کی ہے اور وہیں سے عربی میں ترجمہ ہوا ہے۔ بس جناب پھر نہ پوچھئے یا تو یہی میں دوکان پر بیٹھا ہوا عربی کی کتاب پڑھ رہا تھا یا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے آبو خاں کی بکری اکڑی ہوئی ہے اور میں میں کر کے چلا رہی ہے کہ میں کسی خاں صاحب کی ملکیت نہیں ہوں میں نے تو یورپ کے ملک فرانس میں ایک شخص کے یہاں جنم لیا تھا ہندوستان میں آبو خاں پکڑ لائے اور وہ مجھے اپنی بکری بتلاتے ہیں ۔

داوری خواہم مگر یا رب کرا داور کنم

مولانا ابوالکلام آزاد کے غبار خاطر کے اس نسخے کے بارے میں کچھ معروضات ہیں جو حضرت مالک رام نے مرتب فرمایا ہے۔ اس نسخے کا بدترین اور سب سے زیادہ بدنما پہلو جناب مرتب کا وہ اقدام ہے جو انھوں نے اجمل خاں صاحب کے گرانقدر مقدمے کو ساقط فرما کر کیا ہے یہ کتاب چند بار مولانا آزاد کی حیات ہی میں چھپی ہے اور اس کتاب کے بعض خطوط کے مضمون سے پتہ چلا

[1] عنزہ کے معنی ہیں بکری

ہے کہ اجمل خاں صاحب مرحوم غبار خاطر کی تدوین و اشاعت کے بہت اہم محرک تھے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے بہ پاس خاطر اجمل خاں مرحوم اس کتاب کے چھپوانے کا ارادہ کیا۔ اجمل خاں صاحب مرحوم کا مقدمہ اس کتاب کا جزو لاینفک اور اٹوٹ انگ تھا اور اس کو وہی وثائقی DOCU-MENTARY اہمیت حاصل تھی جو مولانا کے کسی خط کو حاصل ہے حضرت مرتب کا یہ گمان محض ایک گمان باطل تھا کہ اجمل خاں کے مقدمہ کو ساقط کر کے وہ کوئی علمی خدمات انجام دیں گے اور اس مقدمہ کی جگہ مرتب کی تحقیق انیق لے سکے گی۔ مرتب کو اگر اپنے تحقیقاتی مقدمہ کا اضافہ کرنا ہی تھا تو اجمل خاں کے قیمتی اور ادبی قسم کے مقدمہ کو خارج کرنے کی کیا وجہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ فاضل مرتب کو اس لئے غصہ آیا کہ یہ مقدمہ اجمل خاں کے رشحات قلم کا نتیجہ کب تھا۔ یہ تو خود مولانا آزاد نے اجمل خاں کے نام سے لکھ کر شامل کر دیا تھا اگر واقعہ یہی ہے حالانکہ نہیں ہے پھر تو اس مقدمے کی اہمیت اور بھی بڑھ جائے گی اور اگر وہ اجمل خاں کے قلم سے نکلا ہے تو جناب مرتب کو یہ حق کس نے دیا کہ وہ کتاب کے اس حصے کو در یا برد کر ڈالیں جس کو خود مولانا آزاد عزیز رکھتے تھے بہر حال کسی بھی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے یہ مالک رام صاحب کی وہ کوتاہی ہے جس کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں تلاش کی جا سکتی ہے اور افسوس ہے کہ انھوں نے اس علمی اور ادبی فرض ناشناسی کے لئے اس عاجز کا جہاں تک علم ہے کسی قسم کا اعتذار پیش نہیں کیا میں غالب کا وہی مصرع دہراتا ہوں بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا۔

غالب کے فارسی خطوط کا ایک مجموعہ "نامہ ہائے فارسی غالب" کے عنوان کے ساتھ جناب سید اکبر علی ترمذی صاحب کی تحقیق و تدقیق کے ساتھ، غالب اکیڈمی دہلی نو کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے، حال میں نہیں بلکہ اب تو ماضی بعید کہنا مناسب ہوگا۔ اس مجموعہ کی تدوین و جمع کے سلسلے میں جناب مدوّن نے دیباچہ اور تعارف انگریزی میں تحریر فرمایا ہے اور ان پر پیش لفظ قاضی عبدالودود صاحب نے لکھا ہے۔ قارئین کرام سے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مجھے اس طرح انگریزی یا عربی زدگی سے اختلاف ہے اور اس بارے میں مجھے محققین یورپ کا طریقہ معقول نظر آتا ہے کہ وہ علی العموم اپنی زبان ہی کو خواہ وہ انگریزی ہو یا فرانسیسی، جرمن ہو یا روسی، استعمال کرتے ہیں اور نہ صرف یہ کہ لازمی اور ضروری نہیں سمجھتے بلکہ قطعاً غیر ضروری اور نامناسب خیال کرتے ہیں کہ ایک غیر زبان کو اپنے مدعا کے اظہار کا ذریعہ بنائیں کیوں کہ اس طرح وہ بڑا خطرہ مول لے سکتے ہیں۔ اس کے بارے میں مختصراً میں نے اپنے عندیات اس مقالے کے آغاز ہی میں عرض کر دیئے ہیں۔

جب نامہ ہائے فارسی غالب کا پیش لفظ نوشتہ قاضی عبدالودود اور دیباچہ و تعارف نوشتہ سید اکبر علی صاحب ترمذی نظر سے گذرا تو اصل خطوط تک پہونچنے کے بجائے میری نگاہ اسی انگریزی پیش لفظ اور مقدمہ و تعارف میں الجھ کر رہ گئی مجھے حیرت ہے اور شدید حیرت ہے کہ بعض افسوسناک اغلاط زبان اس انگریزی نویسی کی بدولت راہ پا گئی ہیں تو مثلاً انگریزی کا لفظ سوجرن SOJOURN جو بمعنی اقامت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے سفر JOURNEY کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

بعض اغلاط بھول چوک کا نتیجہ ہوتی ہیں لیکن بھول چوک ایک بار ہوگی دو بار ہوگی مگر لو دفعہ کیسے ہو سکتی ہے۔ پھر یہ کس قبیل کی غلطی ہے؟ میں عرض کر چکا ہوں کہ بعض اوقات انسان کا جی چاہتا ہے کہ روش عام کو چھوڑ کر اپنے لئے خاص روش بنائے اسی جذبے نے سید اکبر علی ترمذی کے ذہن میں الجھاؤ پیدا کیا اور انھوں نے سوچا کہ JOURNEY پیش پا افتادہ لفظ ہے اس کے مقابلہ میں SOJOURN زیادہ بھاری بھرکم لگتا ہے لہٰذا کیوں نہ استعمال کیا جائے جس طرح ایک بزرگوار نے تانیث کی جگہ تثنیہ کا لفظ استعمال فرمایا۔ مگر حضرت اکبر علی ترمذی کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی ایک لفظ کا غلط استعمال اس امر کی دلیل کیسے ہو سکتی ہے کہ ان سے اور بھی اغلاط ہوئی ہوں گی میں اس بات کو کافی وزنی مانتا ہوں۔ یقیناً اس قسم کی ایک غلطی سے مذکورہ بالا نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں مجھے ایک بات یاد آئی کہ ایک بار بحث یہ تھی کہ منشی امیر احمد امیر مینائی زبان کی تہذیب و اصلاح کے اُن اصولوں پر سختی سے کاربند تھے جن کی خلاف ورزی سے زبان کی صحت محل نظر ہو سکتی تھی۔ فارسی اور عربی الفاظ کا عطف یا اضافت خالص ہندی الفاظ کے ساتھ ناجائز سمجھی جاتی تھی۔ یہ جداگانہ بحث ہے کہ یہ اصول کہاں تک صحیح تھا اور آیا آج بھی اس کی صحت معتبر ہے یا نہیں مگر جہاں تک منشی امیر احمد امیر مینائی کا تعلق ہے تو وہ زبان و بیان کے مسلمہ اصولوں کے پابند تھے مگر ایک صاحب نے اُن کی ایک غزل میں غلط اضافت کی ایک مثال ڈھونڈ نکالی، امیر کی ایک غزل ہے، "دشمن تو نہیں ہم روشن تو نہیں ہم"، اسی غزل کا ایک شعر ہے ؎

بخیہ کا دیا حکم تو بولے دہن زخم
سلواتے ہو کیوں قابل سیون تو نہیں ہم

یہ قابل سیون کیا ترکیب ہوئی کہاں امیر مینائی اور کہاں یہ نمایاں اور فاحش غلطی۔ اور معلوم ہوا کہ ان کے زمانہ سے لے کر زمانۂ مابعد تک کے تمام مطبوعہ دیوانوں میں یہ غلطی پائی جاتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر امیر اس قسم کی غلطی کا ارتکاب کر سکتے تھے تو کہیں اور بھی ان کے یہاں اسی قبیل کی غلطی پائی جانی چاہئے۔ مگر باوجود جستجو نہیں ملتی۔ ہوا یہ کہ حضرت کاتب نے سلوانے کا جو ذکر دیکھا تو شیون کو جو بہ شین مثلثہ ہے سیون بہ سین مہملہ سے پڑھ لیا اور اسی طرح لکھ مارا اور بعد والے کاتبوں نے جو نقل کیا تو برابر نقل ہوتا چلا گیا۔ اس طرح یہ غلطی راہ پا گئی مگر اس جیسی غلطی کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔

جناب اکبر علی ترمذی کے یہاں معاملہ اس سے مختلف ہے انھوں نے نہ صرف یہ کہ SOJOURN بمعنی JOURNEY لکھا ہے بلکہ اسی درجہ کی اغلاط اور بھی موجود ہیں، جناب ترمذی نے دو تین جگہ LAST BEAT NOT THE LEAST راقم الحروف کو LEAST کے ساتھ آرٹیکل THE کے استعمال کی صحت میں کلام ہے۔ اس عاجز نے آج تک کسی معتبر انگریزی ادیب کے قلم سے یہ استعمال نہیں دیکھا ہے اور اگر صحیح ہے تو بار ثبوت اُس پر ہے جو صحت کا دعویٰ کرتا ہے۔ اسی طرح جناب ترمذی نے قرب مکانی یا زمانی کے معنی میں APPROXIMITY کا استعمال فرمایا ہے مگر انگریزی زبان میں آج تک یہ لفظ مستعمل نہیں ہوا۔ اور کہیں ہوا ہے تو از راہ کرم کوئی حوالہ نقل فرمایا جائے یا کسی معتبر DIC-TIONARY کا حوالہ دیا جائے جہاں تک اس عاجز کو معلوم ہے وہ یہ ہے کہ صحیح لفظ..... PROXIMITY ہے یہاں بھی وہی SOJOURN والی غلطی بھیس بدلے ہوئے موجود ہے۔ انگریزی میں CORRECTATED میں ڈبل R ہے مگر ترمذی صاحب نے سنگل R لکھا ہے۔

انگریزی کے مبتدی تو CORRELATED میں سنگل R لکھ سکتے ہیں لیکن ایک مولف کتاب کو زیب نہیں دیتا کہ وہ بھی CORELATED لکھے۔ اسی طرح ایک جگہ انگریزی کا ایک محاورہ RESULTED IN SMOKE استعمال کیا ہے۔ یہ استعمال بھی محل نظر ہے۔ جہاں تک اس عاجز کی معلومات کا تعلق ہے وہ محاورہ انگریزی ادب میں آج تک نظر سے نہیں گزرا۔ اس کے بجائے ENDED IN SMOKE البتہ مستعمل ہے۔

یہ تو رہا انگریزی زبان سے متعلق اغلاط کا ذکر اب آئیں اصل متن کتاب کی طرف۔ اس سلسلہ میں یہ عرض کروں گا کہ غالب کے خطوط کو صرف تاریخی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنے کے بجائے ضرورت اس امر کی بھی شدید تھی کہ غالب کی فارسی دانی اور اس کے معیار کے بارے میں بھی کچھ کہا جاتا مگر جناب ترمذی نے اس پہلو کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔ غالب کے یہاں بے شمار ایسے الفاظ خاص طور پر اس کی فارسی نثر میں ملتے ہیں جن کے بارے میں یہ جاننا ازبس ناگزیر تھا کہ ان کے لئے سند جواز کہیں ایرانی یا افغانی فارسی میں بھی موجود ہے۔ میں تو افغانی فارسی کو بھی فارسی ہی مانتا ہوں مگر افغانی اسے دری کہتے ہیں۔ ان کی طرف سے اس زبان کے دری ہونے کا دعویٰ کوئی بری بات نہیں لیکن اہل ایران دری زبان کی تنقیص کرتے ہیں یا اُسے ایرانی فارسی سے کم درجہ کی چیز سمجھتے ہیں تو یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میں نے بھی بعض ایرانیوں سے سنا ہے کہ وہ دری کو بنظر حقارت دیکھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر دری بری چیز ہے تو ہوا کرے مگر حافظ شیرازی دری جاننے کو قابل فخر بات سمجھتے ہیں یہ بھی تو انھوں نے فرمایا ہے ؎

زشعرِ دلکش حافظ کسی شود آگاہ
کہ لطفِ طبع و سخن گفتن دری داند

لہٰذا ترمذی صاحب کو اس سلسلہ میں بھی کاوش کرنا چاہیے تھی۔ غالب نے ایک جگہ مشارٌ الیہ کی طرح سے معظم الیہ لکھا ہے اور اس تحریر کا عکس بھی غالب کے قلم کا کتاب میں موجود ہے سوال یہ ہے کہ معظم الیہ کیا بلا ہے۔ غالب نے یہ استعمال کہاں سے سیکھ لیا۔ یہ تو صراحتہً غلط اور جہل پر مبنی ہے۔

بعض جگہ متن فارسی میں الفاظ کی تقدیم و تاخیر نظر آتی ہے مثلاً غالب کی مثنوی جو پوری کی پوری نقل کی گئی ہے۔ اس میں ایک شعر اس طرح نقل ہوا ہے۔

نژاد بال نقشِ طاؤس است
انتخابِ صراح و قاموس است

راقم السطور کی نظر میں پہلا مصرع یوں ہونا چاہیے تھا۔ نژادِ نقش بال طاؤس است، بال نقش طاؤس کہنا تو بے معنی ہے۔ اسی مثنوی کا ایک مصرع ہے۔

"رحم بر بادیِ گناہیِ ما"، یہاں لفظ رحم بمعنی رحمت مستعمل ہوا ہے مگر اس تصرف کے لئے غالب کے پاس وجہ جواز موجود ہے۔ کیوں کہ اہلِ ایران نے رحمت کی 'ت' اڑا کر اس لفظ کو رحم بنا لیا تھا۔ حافظ کا مصرع ہے "رحم کن بر جانِ خود پرہیز کن از تیر ما"، یہ اسی غزل کا ایک مصرع ہے جس کا مشہور مطلع ہے ؎

دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیر ما
چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما

ہندوستان میں بھی یہ لفظ عام تھا اور آج بھی ہے۔ رحمت کرنا کوئی نہیں بولتا تھا اور نہ رحم کرنا ہی ہے حتیٰ کہ ناموں میں بھی رحمت کی طرح رحم مستعمل ہوتا ہے لوگ رحمت علی کے بجائے رحم علی بھی نام رکھ دیتے ہیں۔ اکثر نام رکھنے میں الفاظ کی صحت کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور ساری دنیا میں نام رکھنے کے بارے میں انسانوں کی آزادروی ایک قدر مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے۔ قاضی عبد الودود صاحب نے بتایا کہ بنگال میں عورت علی مرد کا نام، تاج الملوک اور رکھبورالنساء جیسے نام بھی . . . . پائے گئے۔

. . . .

. . . .

اسی مذکورہ بالا مثنوی کا آخری شعر ہے ؎

آشتی نامۂ وداد پیام
ختم شد والسلام والاکرام

آشتی نامۂ وداد پیام ختم شد۔ مگر اس کے آگے والسلام والاکرام کونسا عربی اسلوب ہے؟

صفحہ ۴۴ پر ایک عبارت میں یوں ہے "یہ مقطع غزل حکیم ہمام تبریزی آں می دہد" اور ترمذی صاحب نے انڈیکس میں ہمام بفتح ہائے ہوز ثبت فرمایا ہے حالانکہ یہ لفظ بضم ہا ہے۔

صفحہ ۱۰۱ پر غالب کا یہ شعر اس طرح تحریر ہوا ہے اور غلط نامہ میں اس غلطی کی طرف کوئی اشارہ نہیں فرمایا گیا۔ "گلویم تشنہ و جان و دلم افسردہ اے ساقی" یہاں "اے" حرف ندا نہیں ہے بلکہ "ہے" ہے جو فارسی میں بھی است کے معنی میں مستعمل ہے لہٰذا ہونا یوں چاہیے تھا۔

گلویم تشنہ و جان و دلم افسردہ ہے ساقی

صفحہ ۹۵ پر سطر ۱ میں اس طرح لکھا گیا ہے۔

للّٰلہِ دُرُّ قائل

پہلی بات تو یہ ہے کہ للہ کا املا اس طرح ہے کہ لفظ اللہ سے الف ہٹا دیا جائے تو للہ باقی رہ جاتا ہے۔ اس میں ایک لام اور بڑھانا سخت غلطی ہے۔ اقبال کی ایک نظم "الارض للہ" میں بھی الف لکھا گیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ دُرّ بضم دال یہاں نہیں ہے بلکہ بفتح دال ہے اور تیسری بات یہ ہے کہ غالب نے یہ لکھ کر خود اپنی ہی ایک رباعی نقل کی ہے للہ در قائل جس کے معنی ہیں کسی کہنے والے نے خوب کہا ہے" اس کے بعد خود کاتب کا اپنا قول نقل کرنا بالکل ناجائز ہے۔ یہ امر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ غالب کی عربی استعداد بہت کمزور اور ناقص تھی۔ قاضی عبد الودود صاحب کا کہنا ہے کہ غالب نے والدہ ماجدہ مدظلہٗ لکھا ہے جو عربیت سے نابلد ہونے کی غمازی کر رہا ہے۔

صفحہ ۵۶ پر سطر ۱۱، ایک عبارت اس طرح ہے "دربہ عزم دورہ بال نہضت . . " یہاں نہضت کے آگے ان نقطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک لفظ رہ گیا جو پڑھا نہیں جا سکا۔ اس ضمن میں چند تنقیحات قائم کی جاسکتی ہیں۔ اول یہ کہ لفظ "دورہ" جو آج کل بھی TOUR کے معنی میں مستعمل ہے غالب کے زمانہ میں بھی اس معنی میں استعمال ہوتا تھا مگر سوال یہ ہے کہ فارسی معاصر میں بھی یہ استعمال تھا کہ نہیں۔ ؟ بال نہضت کا استعارہ بالکل یہ بالکل واضح ہے۔ نہضت کا لفظ انیس کے زمانہ تک تو سفر کے معنی میں مستعمل ہوتا تھا وہ کہتا ہے ؎

اس فصل میں وہ نہضت فرزند پیمبر
جن روزوں پکھیرو بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر

عربی زبان میں اس زمانہ میں یہ لفظ ترقی اور اٹھان کے معنی میں استعمال ہوتا ہے بلکہ زیادہ تر اس کا استعمال نشاۃ ثانیہ اور یورپ کے عہد ترقی کے معنی میں ہوتا ہے جس کا انگریزی مترادف RENAISSANCE ہے اور بعض اس کا املا RENASCENCE بھی لکھتے ہیں جو لفظ پڑھا نہیں جا سکا اس کے بارے میں سیاق عبارت لفظ "گشاد" کا متقضی ہے۔ لہٰذا یہ عبارت یوں ہوگی۔

"دربہ عزم دورہ بال نہضت گشاد"

تمرنی صاحب کے اصول کے مطابق فرض کیجئے کسی شخص کا نام حجرت حق ہے اور حقی نہیں ہے
تو کیا وہ اس کو HAJJI میں TRANSLITERATION بنا دیں گے اگر
اُن کا ایسا خیال ہے تو یہ حق کے خلاف ہے دو چار مثالیں اس سلسلہ میں اور پیش کر دوں عربی میں دکان
بتشدید کاف ہے مگر اردو میں کاف کی تخفیف ہی کے ساتھ درست ہے اور دکّان لکھنا یا بولنا غلط
ہے اس سے غیر صحیح ہے اسی طرح عربی میں جنّاء ہندی کے ہیں بہ تشدید نون ہے مگر اردو میں بلکہ فارسی
میں بھی اس کے نون کو مخفف کر دیا گیا ہے ۔

یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ دوسرے اسماء و اعلام کے بارے میں تو جناب مدون نے سخت بے
اعتنائی برتی اور اس علمی کوشش میں ان کا TRASLITERATION اس قدر گیا
جو اُن کے مرتبہ سے فروتر تھا مگر قادری اور رافضی کی دال اور فا کو لاطینی رسم الخط میں سکون کے ساتھ
منضبط کیا جب کہ قادری اور رافضی لکھنا ضروری تھا ۔ مدنی بفتح دال اور علوی بفتح لام کو سکون کے
ساتھ مدنی اور علوی لکھنا غلط ہے تو قادری رافضی اور عابدی لکھنا بھی درست نہیں ہے ۔ اور
سوجرن SOJOURN کو JOURNEY کے معنی میں بطور تکیہ کلام استعمال کرنے
میں تو کمال ہی کر دیا صرف ایک صفحہ ۷ پر بجائے اپنے محبوب لفظ SOJOURN کے
JOURNEY استعمال کیا ہے جو غالباً "از غلط بر ہدف زند تیرے" کا مصداق ہوگا ۔ مجھے
ٹرانسلٹریشن اور مناسب صوتی علامات DIACRITICAL MARKS نہ ہونے
کی وجہ سے بعض اسماء و اعلام کا تلفظ حسب ذیل طریقے سے بھی کیا جا سکتا ہے ۔

اَبدُل قَدِر یا قادِر آزامی صفحہ VIIC
PREFACE بجائے عبدالقدیر اعظم
فائز الدین ہلنے در صفحہ X بجائے فیض الدین حیدر
ماسِر غالب صفحہ XI بجائے مآثرِ غالب
سدرِ امین یا امین صفحہ XII بجائے صدر امین
امین کسرہ کے ساتھ لکھنا بالکل غلط ہے ۔
نَسر اللہ صفحہ XII بجائے نصر اللہ
مَشاترہ صفحہ XXX بجائے مشاعرہ اور
ابدالکادِم صفحہ XXX بجائے عبدالکریم

یہ ایک چھوٹا سا اور مختصر جائزہ ہے انہیں خطوط پر میرا ارادہ ہے کہ چند اور کتابوں کے بارے میں
بھی لکھوں بشرطیکہ قارئین کی طرف سے میری حوصلہ افزائی ہو ۔ اگر میں نے حق گوئی اور راست بازی کے مسلک
سے انحراف کیا ہے تو مجھے متنبہ فرما دیا جائے ۔ میں ممنون ہوں گا ۔ خود جہاں تک میرا خیال ہے اس کا جواب
اس شعر سے ہوتی ہے ؎

خاشش می گویم و از گفتۂ خود دل شادم
بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم

دانش ور کہلاتے ہیں اب فکر و نظر سے عاری لوگ
اپنے دَور کی اس پستی پر چپ ہیں کیوں معیاری لوگ
ساغر ساغر پیاس کے شعلے، مرہم مرہم زخم کی آنچ ۔!
ہم جیسے معصوموں سے بھی کر گئے دنیا داری لوگ
ان کے وقار و وزن کے آگے خود میزان پشیماں ہے
ظرف کے کتنے ہلکے نکلے پتھر جیسے بھاری لوگ
اپنے ہی پہلو میں آخر نشتر بن کر تیر گئے
کب تک بیٹھے کرتے زخمی خوابوں کی دلداری لوگ
اس کے بدن کا ہنستا سورج درد ہمارا جانے ہے
ہم چمکیلی دھوپ کے گاہک، سائے کے بیوپاری لوگ
گونگے بہرے، کنکر پتھر، ہیروں کے مسجود ہیں اب
دفن کر آتے کس مٹی میں، جیون کی خودداری لوگ
دیکھیں درد کی شبنم بن کر مژہ مژہ یہ کب بکھرے
پی تو گئے ہیں پھول سمجھ کر، شعلے کی چنگاری لوگ
کب ملبوس کا چم خم اس کی عریانی کو ڈھانپ سکا
کر نہ سکے اب تک زخمِ تہذیب کی پردہ داری لوگ
پتھر پتھر ڈھونڈھ رہے ہیں اپنے گم شدہ چہروں کو
آ گئے تیشے کی منزل تک خال و خط کے پجاری لوگ
غالب و بیدل کے افسوں میں غرق ہیں سر سے پاؤں تلک
کیا سمجھیں گے سادہ سادہ لفظوں کی پرکاری لوگ
فکر و فن کا ورثہ بھی ہے مستقل اک آزار فضا
سونپ گئے ہیں مجھ کو عذابِ آگہی و ہشیاری لوگ

رفعت ابن فیضی

راج بہادر گوڑ

جدیدیت

ڈاکٹر محمد حسن کا خیال ہے کہ "جدیدیت" معاصرانہ حقیقتوں میں نئی بصیرت اور معنویت کی تلاش ہے یہ معاصرانہ حقیقتیں کیا ہیں۔؟ اور ان میں نئی بصیرت اور معنویت کی تلاش کا عمل کیا ہے؟ یہ تلاش تلاش گمشدہ نہیں ہے بلکہ یہ روح عصر تک پہنچنے کی تگ و دو ہے اور میرے نزدیک روح عصر اصل میں ابھرتی ہوئی حقیقتوں کی وہ کشمکش ہے جو رجعتی رکاوٹوں کے خلاف جاری ہے۔ عصری حقیقتیں یقیناً متعدد ہیں مختلف اور متصادم ہیں، متحارب ہیں۔

اگر ان متحارب حقیقتوں کے درمیان اچھی اور بری کو پہچاننا اور اچھی کو فروغ دینا جدیدیت کا منشا ہے تو پھر اس میں اور حقیقت پسندی اور ترقی پسندی میں کیا فرق ہوا۔؟

مگر یہ نہیں، جن معنی میں ہم "جدیدیت" کی اصطلاح کا مطلب نکالتے ہیں۔ وہ بالکل مختلف ہے۔ ڈاکٹر محمد یاسین صدیقی "جدیدیت" اور "جدید پرستی" میں فرق کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک جدیدیت تخلیقی ادب پر عصری، سیاسی، سماجی، معاشرتی، فکری اور سائنسی اثرات کے محاسبے کا نام ہے اور "جدید پرستی" جدت برائے جدت کی جنونی کیفیت ہے۔

"ایک بار مذکر ہنسے" کی زبان ادبی زبان نہیں ہوتی۔ آج کل کم سے کم اردو ادب کے محاذ پر "جدیدیت" اور "حقیقت پسندی اور ترقی پسندی" برسرپیکار ہیں اور دو متصادم ادبی دبستانوں کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ اس لئے جدیدیت کو لغوی نہیں بلکہ عصری اصطلاحی معنوں میں جانچا جانا چاہئے۔ ماسکو سے کی شائع کی ہوئی انگریزی کتابیں مل جائیں گی۔ انھوں نے فن و ادب پر بہت اچھے مقالے چھاپے ہیں، ایک کتاب عصری جمالیات کے مسائل "اس کتاب میں پر مضامین ہیں اور حقیقت پسندی اور جدیدیت کی کو موضوع پر اچھا تبصرہ ہے۔ جدیدیت کی فلسفیانہ اساس اور انسانی سماجیات میں اس کے مقام پر اچھی بحث کی گئی ہے۔ میں نے اس کتاب کے علاوہ بہت زیادہ ملی گڑھ یونیورسٹی کے ایک سیمینار کے مقالوں سے استفادہ کیا ہے جو جدیدیت اور ادب کے عنوان پر منعقد ہوا تھا یہ سب مقالے "جدیدیت اور ادب" کے نام سے ایک کتاب کی شکل میں شائع کر دیئے گئے ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور کا خیال ہے کہ "جدیدیت کا نمایاں عنصر آج آئیڈیالوجی سے بیزاری فرد پر توجہ، اس کی نفسیاتی تحلیل، ذات کا عرفان، اس کی تنہائی اور اس کے موت کے تصور سے خاص دلچسپی ہے۔"

ڈاکٹر محمد یاسین صدیقی کا خیال ہے کہ "سیاسی بے یقینی، ذہنی پراگندگی، روحانی انتشار اور تہذیبی بے قدری نے لکھنے والوں کو متاثر کیا۔"

ڈاکٹر وحید اختر سمجھتے ہیں کہ "آج اقدار کا کوئی واضح تصور نہیں، اس لئے اقدار خود شکست و ریخت عمل سے دوچار ہیں" اور پھر یہ بھی کہ جدید شاعر جس تنہائی کا نوحہ خواں ہے وہ اس کی اپنی خلاقی تنہائی ہی نہیں بلکہ اس ریاکار اور بے ضمیر معاشرے میں ہر حساس فرد کی تنہائی اور محرومی ہے۔"

ان سب باتوں کا مجموعی تاثر کیا ہے۔؟ یہی کہ عصری سرمایہ دارانہ تہذیب کی شکست و ریخت موجودہ منزل پر ایک زوال پذیر سماج کے نزاع کے عالم میں پیشتر عروج کے زمانے کی قدریں ٹوٹ رہی ہیں فن کار ایک بے یقینی، پراگندگی، انتشار اور سراسیمگی کے عالم میں احساس تنہائی کا شکار ہے۔ وہ اپنی تنہائی کو تنہائی کے درد و کرب کو، ٹوٹی ہوئی آرزوؤں کے انبار کو خواہشوں کی جلتی ہوئی چتاؤں کو اپنی ناکامیوں اور محرومیوں سے پیدا ہونے والی اذیت کو محسوس کرتا ہے۔

مگر یہی تو کل حقیقت نہیں ہے۔ ایک تہذیب مر رہی ہے تو ایک تہذیب ابھر رہی ہے کچھ قدریں ٹوٹ رہی ہیں، لیکن کچھ نئی قدریں بھی تعمیر ہو رہی ہیں۔ آرزو کی موت ہی کا ماتم کیوں۔؟ تکمیل آرزو کے امکانات بھی تو پیدا ہیں۔ خواہشات پوری ہونے کے لئے نئی راہیں بھی تو آشکار ہو رہی ہیں۔

اگر ہمارے ذہن پر ماضی ہی مسلط رہے اور حال پر اس کے مہیب سائے پڑتے رہیں تو مستقبل نظروں سے اوجھل رہے گا۔ ناآسودگی چھائی رہے گی۔ اور ممکن الحصول کی جدوجہد بے سود ہی معلوم ہوگی۔ یہیں سے بیزاری، یاس اور ناامیدی کا غلبہ ہوتا ہے اور وہ مریضانہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو فن کار کو فن کی امید انگیز منزلوں سے دور کر دیتی ہے اور وہ رنج و الم میں گھرا ہوا تنہائی اور موت سے کربناک دلچسپی لینے لگتا ہے۔ اسی لئے اس قبیل کا جدید فن کار آئیڈیالوجی کا منکر ہے۔ کیوں کہ آئیڈیالوجی خیالات کا وہ سسٹم ہے جو حرکت پیدا کرتا ہے۔ پروفیسر سرور نے سچ کہا ہے کہ آئیڈیالوجی ایک پرچم ہے جو فرد اور جماعت کو عمل پر آمادہ کرے۔ آئیڈیالوجی سے فرار اصل میں عمل سے فرار ہے۔

یہاں "جدیدیت" کے اصل خدوخال واضح ہوتے ہیں اور یہ صاف ہو جاتا ہے کہ فلسفہ وجودیت ہی اس مکتب جدیدیت کا سرچشمہ ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے ختم پر جب سرمایہ دار سماج کی شکست و ریخت شروع ہو چکی تھی۔ اقدار پسندی کا بھرم کھل گیا تھا اور سرمایہ دار سماج کے رشتے ایک ایک کر کے ٹوٹ کر گرنے لگے تو فلسفہ وجودیت نے مرتی ہوئی قدروں کو سہارا دیا۔ یہ کوئی عجوبہ بھی نہیں کہ سرزمین جرمنی پر ہی یہ فلسفہ نمودار ہوا اور بعد میں مغربی یورپ اور امریکہ کے دانشوروں کے ایک طبقہ پر اثر انداز ہوا۔ [illegible] بھی اس کے نام ہیں۔ اور فلسفہ وجودیت ساری سرمایہ دارانہ دنیا میں دانشوروں کے ایک بڑے طبقہ پر آج بھی چھایا ہوا ہے۔ اس لئے اس کی اہمیت کو گھٹایا نہیں جا سکتا اور اس فلسفہ وجودیت کے انقلابی

اور فنی اور ادبی تخلیقوں پر جو معاندانہ اثرات مترتب ہوتے ہیں ان کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے۔ تاکہ ان مضر اثرات کا مقابلہ بھی کیا جا سکے۔

فلسفۂ وجودیت کے مطابق انسان کو اپنے "وجود" سے واقف ہونے کے لئے "روحانی زندگی کی سرحدوں" پر پہنچنا چاہئے۔ وہاں سے وہ اپنے وجود کو پہچان سکتا ہے۔ خوف، معصیت، گناہ، بے اطمینانی اور موت وغیرہ سرحدیں ہیں روحانی زندگی کی۔ اس کے آگے عدم وجود ہے۔

وجودیت کے ماننے والوں کے پاس آزادی کا بھی ایک بہت دلچسپ تصور ہے۔ ان کے پاس آزادی کا مطلب ہے کئی امکانات میں سے کسی ایک کے انتخاب کی آزادی، ذرا غور کیجئے امکانات کو حالات موجودہ سے الگ کر دیا اور فرد کو سماج کے باہر کھڑا کر دیا موضوعی ضرورتوں۔۔۔۔ یعنی قانونِ ارتقاء سے فرد کو علیحدہ کر دیا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ان لوگوں کے نزدیک آزادی انتہائی قسم کی انفرادیت ہے، ایسی انفرادیت جو فرد کو سماج سے کاٹ دیتی ہے۔

ظاہر ہے اس وچار دھارا کا اثر فن و ادب پر پڑے گا تو کسی قسم کا فن و ادب تخلیق ہوگا۔ سماج سے کٹے ہوئے فرد کی حیثیت آخر تو پانی کے اس پول ہی کی طرح ہوگی جو دریا کے عام بہاؤ سے الگ ہو کر ایک گڑھے میں جمع ہو گیا ہو۔ یہاں گندگی ہی تو پرورش پائے گی سڑاند ہوگی، عفونت ہوگی، مرض پھیلانے والے جراثیم پیدا ہوں گے۔

ہپی (HIPPY) تحریک سے تو سب ہی واقف ہیں۔ ہندوستان میں خاص طور پر دہلی کی سڑکوں پر نوجوان لڑکوں، لڑکیوں کو دیکھا تو ہوگا۔ ان کی بھی عصری، سماجی قدروں کے خلاف بغاوت ہے۔ لیکن کیسی بغاوت۔؟ اس کا نتیجہ کیا۔ بے ہنگم لباس، چرس اور گانجہ جیسی بے راہ روی اور تعفن میں تلذذ بس یہی سب کچھ کیفیت اس ہیجانی ادب کی بھی ہے جو فلسفۂ وجودیت یا "ماورائے حقیقت" کے نام سے پیدا ہو رہا ہے۔

"ماورائے حقیقت" کا مکتبِ خیال سگمنڈ فرائیڈ کی تعلیمات سے فیض یاب ہے۔ اور یہاں سارے فن کا مواد "جنسی محرکات" سے حاصل ہے۔ جنسیات کے اطراف ہی طواف اس مکتبِ خیال کا سب کچھ ہے۔ یہاں سے حقیقت خود زندگی سے بیزاری کا آغاز ہوتا ہے۔ اور ادب میں زور ہوتا ہے الم و یاس پر، قنوطیت پر، خطرات پر اور خطرات اور اندیشوں کی وجہ سے پیدا ہونے والے اعصابی تشنج کی کیفیت پر۔!

سرل کانولی نے اعلان کیا کہ "آج سے ایک فن کار صرف اپنی تنہائی کی گونج اور اپنی مایوسی کی گہرائی سے پہچانا جائے گا"۔

اگر یہ تنہائی ایک ریاکار اور بے رحم معاشرے کی پیداوار ہے تو اس کے بطن سے بغاوت پیدا ہونی چاہئے۔ وہ بغاوت جو اس معاشرے کو توڑ دے۔ اس تنہائی سے وہ عزم پیدا ہونا چاہئے جو اس معاشرے کے کھنڈروں پر نئے اور منصفانہ معاشرے کی تعمیر کر سکے۔

بغاوت کو صرف موجودہ ڈھانچہ کو توڑ دینے ہی تک محدود نہیں رہنا چاہئے۔ نئے ڈھانچہ کی تعمیر کا منصوبہ بھی بغاوت ہی کا ایک جزو لاینفک ہے۔ ورنہ بغاوت اپنے مقصد میں ناکام ہو جائے گی اور شکست کھا جائے گی۔

جب شکست و ریخت اور تعمیرِ نو دونوں ہی زندگی کے مقصد قرار پائے تو یہی فن و ادب کے مقصد ہوتے اور یہی فن کاروں کی منزل ہوتی۔

سرمایہ داری سماج میں صرف سرمایہ کو آزادی اور انفرادیت حاصل ہے۔ جب کہ زندہ انسان محض تابعدار ہے اور اس کی کوئی انفرادیت نہیں یہاں سائنسداں، فن کار، ادیب، مزدور سب کے سب سرمایہ کے حکم کی تعمیل کریں۔ سرمایہ کے تنخواہ یاب خادم ہیں۔ یقیناً اس زمین موت پر وارد کو ڈھانا اور اس کی جگہ ایک نئی دنیا اور ایک نئے آدم کی تعمیر زندگی کا مقدس مقصد ہوگا۔ بورژوا سماج میں تصادم ہے۔ سوشلسٹ سماج میں فرد اور سماج میں مکمل ہم آہنگی ہوگی۔ فرد کو سماج سے دور کیوں لے جائیں، یہ سماجی فطرت کے خلاف ہے۔ انسان کی منزل سے کبھی کا گذر چکا ہے اب اس کی سماجی حیثیت ہے۔ اسے توڑنا نہیں بلکہ اسے اور مضبوط کرنا اور فرد اور سماج میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرنا اور اس کی کوشش کے رستے میں حائل سرمایہ دارانہ پیداواری رشتوں کو ختم کر کے سوشلسٹ سماجی رشتوں کو فروغ دینا ہی ادب کا منشا ہونا چاہئے۔

ایک بات اور "جدیدیت" کے علمبردار تکنیک پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ تکنیک ہی تحقیق اور تحقیق ہی تخلیق کا جواز ہیں۔ تکنیک اگر نا آسودگی کا مظہر ہے اور آسودگی کی کشمکش کو مہمیز کرنے کا ذریعہ تو اس میں ہمیں شکایت کا کوئی موقع نہیں۔ ڈاکٹر وحید اختر کا کہنا ہے کہ تکنیک دراصل رومانیت کٹ ملائیت کے خلاف بغاوت ہے اور اس لحاظ سے مستند ہیں معاصر کی حاضرہ اور اس کی قدروں کے تعلق سے تکنیک تو سمجھ میں آسکتی ہے لیکن فساد وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں سے اس معاشرہ کے خلاف اجتماعی جدوجہد پر سے ایمان اٹھ جاتا ہے، مستقبل بھی تکنیک کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور ابھرتی ہوئی قدروں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ یہاں تکنیک وہ ہیجانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے جو شخصیت، بے اطمینانی اور انتشار کے راستے فن کار کو موت اور مایوسی سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ اسے کچھ لوگ "جدیدیت" سمجھتے ہیں میں اسے فن کی موت قرار دوں گا۔

"جدیدیت" کے طرفداروں میں ایک اور قدر مشترک یہ ہے کہ وہ سب مارکسزم سے انحراف سے لے کر مخالفت تک کی مختلف منزلوں میں ہیں۔ مارکسزم پر فردِ جرم عائد کر دیا ہے۔ انھوں نے اور الزام دہی سب ہی جس کا مسکت جواب کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز نے فروری ۱۸۴۸ء ہی میں کمیونسٹ مینی فیسٹو میں دے دیا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ اسٹالین کے دور کی غلطیوں نے اور خاص طور پر ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی بائیں بازو کی تنگ نظری نے یہ ثابت کر دیا کہ آسودگی نہ سرمایہ داری میں ہے اور نہ سوشلزم میں۔!

یہاں اس بات کو بھلا دیا جاتا ہے کہ سرمایہ داری نے "آزادی مساوات اور اخوت" کا نعرہ بلند کیا اور پھر ان ہی اقدار کی قبر پر اپنا نظام کھڑا کر دیا۔ انسانیت کو جنگلوں کی آگ میں جھونکا، تباہی و بربادی وسیلہ بن گئی سرمایہ دارانہ نظام کے قائم رکھنے کا۔ سوشلزم نے سرمایہ داری کے ویرانے پر آزادی اور خوشحالی کی ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ سے آزاد سماجی نظام کی تعمیر کی۔ سوشلزم کا چیلنج ایک زندہ اور حقیقی چیلنج ہے۔ انسانیت کی قسمت سوشلزم ہے اور جدیدیت سے انحراف کرتی ہے۔

اس لحاظ سے "جدیدیت" اپنے نئے لباس میں سرمایہ داری سے بیزاری کے نام پر سوشلزم سے بدگمانی کا اظہار بن جاتی ہے اور اس گروہ کے انتہا پسند، مخالف سوشلسٹ اور مخالف کمیونسٹ عناصر سے جا ملتے ہیں اور اس طرح سوشلزم کے لئے خطرہ بن جاتے ہیں۔

یہاں یہ بات بتانی ضروری ہے کہ کمیونسٹ پارٹیوں نے غلطی کی ہے، لیکن ان غلطیوں کے ازالے کی سبیل بھی کمیونسٹ تحریک کے اندر ہی سے نکل آئی ہے۔ کہیں اور اس کی مثال نہیں ملتی۔ مارکسزم ایک ایسی زندہ اور متحرک سائنس اور ایک ایسا نظامِ فکر ہے، جو انقلاب اور تعمیرِ نو کے اصول ہی معین نہیں کرتا بلکہ ان اصولوں سے عملی انحراف سے بچنے اور ان کی تصحیح کے ہتھیار بھی مہیا کرتا ہے۔

منیب الرحمٰن کی نظم "آئینہ" میں شاعر نے عصری انسانوں کی شق شدہ شخصیت کو پیش کیا ہے۔ اس ایک شخصیت کی کئی بٹی ہوئی شخصیتیں ہیں۔ ایک پیٹ پالنے کے لئے محنت کرنے والی شخصیت ہے، دوسری مبتلائے کرب روحانی شخصیت ہے۔ شاعر ان شخصیتوں کے درمیان ربط اور آہنگ کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

میں کبھی عکس ہوں، کبھی سایہ — اصل میں جستجو میں سرگرداں
خود کو پہچاننے میں عمر کٹی — اور اپنے لئے میں غیر رہا
سب نے دیکھا مجھ مگر میں ہی — اپنی صورت کبھی نہ دیکھ سکا

یہ سرمایہ دار کا سماج کا مسلط کیا ہوا المیہ ہے کہ انسان بٹ گیا ہے اور فرد اور سماج، ماحول اور مزاج ہم آہنگ نہیں۔ لیکن کیا ہم اس حقیقت کے اظہار ہی پر اکتفا کریں اور "خود اپنے لئے غیر بنے" کی الم انگیز کیفیت ہی میں ڈوبے رہیں یا اس حقیقت کو بدلنے کی کوشش کریں۔ انفرادی تجربہ اجتماعی تجربے سے ہم آہنگ ہے۔ غم جاناں، غم دوراں کا جز ہی تو ہے۔ جب یہ انفرادی حقیقت، اجتماعی حقیقت کا حصہ ہے تو پھر اس منزل پر رکنا کیسا کہ میں۔!

اپنی صورت کبھی نہ دیکھ سکا۔

اصل سوال فرد اور سماج کے رشتے کا ہے۔ سوشلزم اور سماج کا ماحاصل بھی یہی ہے۔ ترقی پسندوں کے نزدیک فرد کی آسودگی کو اولیت حاصل ہے۔ مارکسیٹوں کے پاس فرد کی آسودگی، سماجی آسودگی کے ساتھ وابستہ اور اس کا ایک حصہ ہے۔ ایسا فرد آسودگی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ پوری سماج سے آفت سے چھٹکارا پانے کی تب ہی فرد بھی آسودہ حال ہوگا۔

مقالہ نگار حضرات سے گذارش

"اوقاف" میگزین ایک اسلامی ملی میگزین ہے۔ جس کے لئے معیاری علمی مقالات درکار ہیں۔ مقالہ و مضامین نگار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ اپنی تخلیقات اوقاف کو بھیجیں اور حسب ذیل امور کا لحاظ رکھیں۔

۱۔ مضامین یا نظم علمی، تاریخی، اصلاحی، ادبی ہونے چاہئیں۔ اختلافی مضامین سے احتراز کیا جائے +

۲۔ اوقاف کے انتظام اور ان کے استعمال سے متعلق مضامین، اطلاعات، پالیسی اور پروگرام خاص طور پر شریکِ اشاعت ہوں گی +

۳۔ مضامین صاف اور کاغذ کے ایک طرف لکھے ہوئے ہوں +

۴۔ جو مضامین اوقاف کے معیار کے مطابق نہیں ہوں گے، شریک اشاعت نہیں کئے جائیں گے +

۵۔ مختلف وقف بورڈوں، سنٹرل وقف کونسل اور اسلامی تقریبات سے متعلق تصاویر بھی شائع کی جائیں گی۔ ان تصاویر کے ساتھ مختصر رپورٹ آنی ضروری ہے +

(ادارہ)

سات سو سال کے بعد

اسپین کے ارباب حل وعقد نے اسلامی سکریٹیریٹ کی مساعی کے زیر اثر مسجد قرطبہ کو واگذار کر دیا اور سات سو سال کے بعد وہاں اذان دی گئی اور نماز جمعہ ادا ہوئی۔

اب سے تقریباً ۴۰ سال پہلے علامہ اقبال نے اس مسجد میں حاضری دی تھی اور نماز ادا کی تھی اور کہا جاتا ہے کہ وفور گریہ سے وہ حالت نماز ہی میں بے ہوش ہو گئے اور پھر اپنی وہ مشہور نظم لکھی جو مسجد قرطبہ کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

اسپین میں مسلمانوں نے ۷۱۱ء میں ایک بربری النسل جنرل طارق بن زیاد کی سرکردگی میں پہلی بار قدم رکھے اور ۱۴۹۲ء تک وہاں حکومت کی اس وقت تک ان کی فتوحات کا سلسلہ جنوبی فرانس تک وسیع ہو چکا تھا اور پورا یورپ اپنے تمدن وثقافت میں اسلامی اثرات کی برتری کو تسلیم کرنے لگا تھا لیکن باہمی خانہ جنگیوں نے انھیں بالآخر کمزور کر دیا اور وہاں ہلال کو صلیب کی خاطر جگہ چھوڑ دینا پڑی۔

اسپین بدقسمت تھا کہ اسے مسلمانوں کے بعد ان جیسی کوئی عادل اور رفاہی حکومت نہیں مل سکی اور یورپ شاید بہت پیچھے رہ جاتا اگر اسپین میں اس گروہ کے قدم نہ اکھڑتے مسجد قرطبہ اسی دور عروج کی یادگار ہے اور اس کی بازیابی اس امر کی زندہ علامت ہے کہ مستقل عزم کے آگے صدیوں کے فاصلے دم زدن میں طے کئے جا سکتے ہیں۔

آج اگر اقبال زندہ ہوتے تو مرثیہ زوال امت کے وہ نشاۃ ثانیہ کی علامتیں پیش کرتے۔ ہم سمنانی صاحب کے شکر گذار ہیں کہ انھوں نے اقبال کے آہنگ میں مسجد قرطبہ کی واپسی کو عنوان بنایا ہے اور انھوں نے واقعی اس کا حق ادا کر دیا ہے۔

سید غلام سمنانی

مسجد قرطبہ کی واپسی

(۱)

ہے نگہ اشتیاق، محو تماشائے ذات
ڑ دیئے عشق نے عقل کے لات ومنات
عشق ہے فتح مبیں، عشق ہے نور یقیں
عشق غیور ومتیں، عشق ہے صبر وثبات
شق کا سوز نفس، گرمی بازار شوق
شق کا اشک رواں، دجلہ ونیل وفرات
کوہ کن وقیس ہیں بندۂ بے دام عشق
عشق رئیس الکرام، عشق امیر التفات

عشق ہے مہر منیر عشق سے روشن ہوئی
تیرہ وتاریک تھی، انجمن کائنات
جنبش، ابروئے عشق جنبش بال فضا
فتنہ یوم نشور عشق کی ادنیٰ سی بات
مٹ گئی اک آن میں کشمکش جسم وجاں
اٹھ گیا اک آن میں پردۂ ذات وصفات
وسعت دست طلب، عشق کو فردوس جاں
نیش غم جاوداں عشق کو شاخ نبات

مرحلۂ عشق میں خارِ الم گل مددشش
میکدۂ عشق میں زہر ہے آبِ حیات

عشق کی تقدیر ہے آتش وخوں، دار وگیر
عشق کو پیش آتے ہیں ایسے بہت سانحات

عزم وعمل کے لئے کچھ نہیں ارض و سما
عزم وعمل کے لئے کچھ نہیں یہ شش جہات

زیرِ قدم آگیا خیمۂ عرشِ بریں
ہوگئی ہے ریزہ ریزہ، شیشہ گہِ ممکنات

میرے جنوں کا صلہ، مملکت تحت وفوق
عقل زیاں کوش ہے، میرے جنوں کی زکات

مجھ پہ ہوئے منکشف، لوح وقلم کے رموز
پوچھ لے مجھ سے کوئی، رازِ حیات وممات

شاطرِ تقدیر نے چال کچھ ایسی چلی
دیکھتے ہی دیکھتے کھا گئی تدبیر مات

کتنے دنوں پر ملا عشق کو اذنِ سجود
پھر وہی جوشِ اذاں، پھر وہی لطفِ صلوٰت

چشمِ تمنا میں ہے حسن سراپائے دوست
سامعہ افروز ہے لذتِ اداتے دوست

(۲)

قافلۂ وقت ہے گرم رو وتیز گام
کس کے لئے قعود، کس کے لئے ہے قیام

کمترک از برگِ خشک، کمترک از ریگِ دشت
وقت کے صحرا میں یہ شام وسحر کا خیام

وقت کے دریا کی موج جوششِ طوفاں بدوش
وقت کا ساحل نہیں، اس کا نہیں ہے مقام

وقت کے تیشہ سے آب، زہرۂ فولاد وسنگ
کوشک وایوان وکاخ، قصر ودر وسقف وبام

وقت کی تیغ اصل، وقت کی شمشیر تیز
بے جگر وبے خطر، بے خبر وبے نیام

وقت کے محکوم ہیں، قیصر وخاقان ومیر
خواجہ وشاہ وسپاہ، وقت کا ادنیٰ غلام

وقت سکوں ناآشنا وقت ہے شورش اساس
وقت کا رہوار ہے تندرو وبے زمام

مرغ بلند آشیاں، اس کا اسیر فریب
وقت کا صیاد ہے، تیز نگہ، تنگ دام

وقت کے معبد میں سب، محو رکوع وسجود
وقت کے سب مقتدی، وقت ہے سب کا امام

کس کو ملی ہے یہاں، رخصتِ اظہار شوق
کس کو ملی ہے یہاں، فرصتِ عیش دوام

خواب پریشاں سے کم آرزوئے دل نہیں
خواہش عیش دوام، ایک تمنائے خام

وقت کی اک آن ہیں ماضی وفردا وحال
وقت کی اک شان ہے انجمن صبح وشام

وقت عظیم وجلیل، وقت محیط وبسیط
وقت کو کچھ مت کہو، یہ ہے کسی کا پیام

وقت ہے درمانِ درد، وقت دم گرم و سرد
وقت ہی خود زخم ہے، وقت ہی خود التیام

وقت نہیں ہے حدود، وقت نہیں ہے ثغور
اس کی بھی ہے انتہا، اس کا بھی ہے اختتام

وقت ہے سیلِ رواں، عشق ہے کوہِ گراں
وقت کے اس سیل کو عشق ہی لیتا ہے تھام

عشق ازل آشنا، عشق ابد اختیار
عشق ہے دارالبقا، عشق ہے دارالقرار

(۳)

اب نگہ شوق میں غیب ہے عین شہود
راز کہاں رہ گیا، عالم بود و نبود

شاہد تقدیر نے رخ سے الٹ دی نقاب
پھر وہی ذکر جمیل، پھر وہی گفت و شنود

عشق پہ تیری بنا، عشق سے تیرا خمیر
ہے یہی رازِ دوام، ہے یہی رازِ خلود

نقش ترا لازوال، نقش ترا بے مثال
کام تو کچھ کر گیا، عشق کا ذوق نمود

جس کے تھے قلب و نظر جلوہ شناسِ ازل
تھا وہ یقیناً ترا نقش طراز وجود

جس کے ہنر نے کئے جمع بحسن و کمال
کسوت تہذیب کے بکھرے ہوئے تار و پود

جس کو بہا لے گیا ساحل مقصود تک
لطمۂ بحر عطا، موجۂ دریائے جود

جس کی امیری سے تھا حسن فقیری عیاں
جس کی نگاہوں میں ہیچ حرف زیاں شوق سود

راز کے بند قبا کھل گئے اک آن میں
عقدۂ مشکل کی تھی جس سے کشاد و کشود

اُن کی نگہ دل کشا، اس کی ادا حق نما
کتنے ہی فتنے اٹھے زیر سپہر کبود

بزم گہہ ناز میں جلوہ فزائے کرم
رزم گہ کار میں ہوش ربائے جنود

زورق و طوفاں شکن، مرد زن و جاں شکن
قیصر و خاقاں شکن، اس کا قدم در ورود

جس کا خیال و عمل، باعث تجدید شوق
جس سے کہ توڑا گیا، مغربیوں کا جمود

خلوت و جلوت میں تھا نقش گر صدق
اس کا قیام و قعود اس کا رکوع و سجود

اس کا امین عطا، شاہد تہذیب و فن
اس کی رہین کرم کارگہ دہر و زود

کتنے دنوں تک رہا ساز نوا بے خروش
کتنے دنوں تک رہی محفل جاں بے سرود

اک نئے عنوان سے جشن بہاراں ہوا
جشن بہاراں ہوا رقص نگاراں ہوا

(۴)

تیرے ہر اک سنگ میں، نورِ دل جبرئیل
تو ہے عدیم النظیر، تو ہے عدیم المثیل

تیری ہر اک خشت میں، خونِ رگ دلبری
تیرا ہر اک پیچ وخم، رقص گہہ سلسبیل

مرحلۂ حق میں تھا، صبر و رضا کا نقیب
جس سے ہوا آشکار سرِّ ذبیح و خلیل

منبر و محراب و در، یہ تیرے نقش و نگار
مصدرِ خیر کثیر، مرکز اجر جزیل

اس کا عمل، اس کا عزم اس کا ختم اس کا حزم
چشم جہاں کے لئے، ایک کتاب الدلیل

تیری بلندی سے پست، رفعت چرخ بریں
تجھ سے ہوا فرش خاک کتنا عظیم و جلیل

جس کی زرہ لا الٰہ، جس کی بنہ لا اِلٰہ
جس کے لئے کچھ نہیں تیغ و سناں، اسپ و فیل

جن کی بہاروں سے فاش، رازِ بہار ارم
تیرے وہ گل زار و باغ، تیری وہ کشتِ نخیل

عرصۂ پیکار میں، قلزم ذخّار میں
کچھ نہ رہا کیف وکم، کچھ نہ رہا قال و قیل

حکمتِ تعمیر کو تجھ سے ملی آب و تاب
حکمتِ تعمیر کا تیری نہیں ہے عدیل

بن گیا مضراب جاں بن گیا مہمیز شوق
اسکے قلم کا صریر، اس کے فرس کا صہیل

وسمۂ ابروئے زیست ہے ترا دودِ چراغ
تیری کفِ خاک سے دیدۂ مغرب کحیل

بندۂ مومن کی روح تجھ سے ہے پرتوفشاں
وہ بھی نہیں مستحیل، تو نہیں مستحیل

شمع رہِ دیں بنی ظلمتِ مغرب میں تو
علم و ہنر کے لئے تیری بنا سنگِ میل

پھر ہے وہی رستخیز، پھر وہی شورِ ستیز
تازہ نہ ہوجائے پھر قصۂ فرعون و نیل

مجھ کو معلوم تھا کون وہ آذر ترا
آہ وہ فردِ فرید، آہ وہ مردِ نبیل

ضربِ کلیمی بھی ہے اور یدِ بیضا بھی ہے
ساحرِ عصرِ جدید! تو نے یہ دیکھا بھی ہے

عرب لیگ ایک تعارف

اگر عرب لیگ کی عمارت قوت گویائی رکھتی تو بہت سی حیرت انگیز باتیں سامنے آتیں اس لئے کہ اس نے بہت سے گرم و سرد حالات دیکھے اور بے شمار عروج و زوال کے مناظر سے گذری اس کی کہانی ۲۹ سال سے زیادہ طویل ہے۔

عرب لیگ عمر میں انجمن اقوام متحدہ (یو۔ این۔ او) سے تین ماہ بڑی ہے۔ عرب لیگ کا قیام ۲۲ مارچ ۱۹۴۵ء کو عمل میں آیا اور اقوام متحدہ ۲۶ جون ۱۹۴۵ء میں قائم ہوئی۔ انجمن اقوام متحدہ کی بائیس ذیلی کمیٹیاں ہیں اور عرب لیگ کی چھتیس کمیٹیاں۔

عرب لیگ کی بلند و بالا طویل و عریض، خوبصورت و دلآویز عمارت میں ان تمام کمیٹیوں اور متعلقہ شعبوں کے دفاتر ہیں اور ان کے مستقل ناظم و نگراں اور عملہ ہے۔

ہم نے اقتصادی شعبہ، ثقافتی شعبہ، شعبۂ نشر و اشاعت، شعبۂ فلسطین کا اور ان کی کارکردگی کا تفصیلی جائزہ لیا۔ شعبہ نشر و اشاعت کے عربی سیکشن کے سکریٹری نے ہمیں بتایا کہ عرب لیگ نے ۱۹۵۴ء میں پہلی بار نیویارک میں نشر و اشاعت کا دفتر کھول کر جب پروپیگنڈہ کے میدان میں قدم رکھا تو وہاں ہم نے کیا پایا۔؟؟

۱۔ عربوں کے متعلق زبردست تاریخی اور ثقافتی غلط فہمیاں۔

۲۔ امریکی سوسائٹی میں عربوں کے بارے میں یہودیوں پر ظلم کا زبردست احساس۔

۳۔ صیہونیت کے ذریعہ امریکی یہودیوں کا سیاسی اغراض کے زبردست استعمال۔

۴۔ امریکہ میں کلیدی عہدوں، نشریاتی اور تجارتی اداروں پر یہودیوں کا تسلط

ان حالات میں عرب لیگ کو اپنے مقاصد اور پروگرام کی اشاعت کرنا تھا۔ یہ ایک چیلنج تھا جسے قبول کرنے کی پوزیشن میں ہم نہیں تھے کیونکہ

۱۔ عرب کاز کو قومی سطح پر انجام دینے اور کامیاب بنانے کے لئے ٹھوس بنیادوں کا فقدان۔

۲۔ عرب جماعتیں اور افراد کا امریکی سوسائٹی میں پگھل جانا۔

۳۔ وہ امریکی شخصیتیں جو عربوں کی حامی تھیں اور یہودیوں کے ڈر سے اس کے اظہار اور اعلان کی جرأت کی کمی۔

ان تمام مشکلات کی وجہ سے ماہر اور تربیت یافتہ افراد کے باوجود عربی نشریات بے بس تھیں ان رکاوٹوں کے باوجود عرب لیگ جنیوا، کینیڈا، برازیل، ارجنٹائن، اٹلی، جرمنی، فرانس، جاپان اور افریقی ممالک میں اپنے دفاتر قائم کرنے میں کامیاب رہی۔ عربی نشریات کا کام فلموں، لیکچروں اور نشریوں کی صورت میں ہوتا رہا یہاں تک کہ ۱۹۶۷ء کی جنگ ہوئی اور اسرائیل کے کروٹ لینے کی وجہ سے عالمی صورت حال میں تبدیلی آنے لگی۔ پہلے تو اسرائیل نے اپنے بارے میں یہ باور کرایا تھا کہ وہ ایک اقلیتی قوم کا ایک چھوٹا سا ملک ہے جو زندہ رہنا چاہتی ہے جسے لاکھوں عرب چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور اسے سمندر میں دھکیل دینا چاہتے ہیں۔ لیکن عرب اسرائیل جنگ ۶۷ء کے بعد صورت حال بدل گئی، اسرائیل اپنی حربی قوت کے ساتھ عرب علاقے ہتھیاتا، اقوام متحدہ کے اصول اور تجاویز کو ٹھکراتا اور اپنی فوجی طاقت کا مظاہرہ کرتا ہوا دنیا کے سامنے نمودار ہوا۔

دوسری طرف عرب پروپیگنڈہ میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی اس نے بلاواسطہ خبروں پر بالواسطہ خبروں کو ترجیح دی، برطانوی ممبران پارلیمنٹ صحافیوں اور مشہور اہل قلم حضرات کی ۱۶ ممبران پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل دی۔ ان لوگوں نے ٹیلی ویژن، پارلیمنٹ، اخبارات اور لٹریچر میں عربوں کے نظریات و خیالات اور ان کے کاز کی موثر حمایت اور مدافعت کی۔

ابراہیم شکراللہ سکریٹری شعبہ نشر و اشاعت نے مزید کہا۔ ۶ اکتوبر ۱۹۷۳ء کی جنگ نے پانسہ پلٹ دیا اور اب ہم مندرجہ ذیل چیزوں کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔

۱۔ متحدہ عرب محاذ کا ترجمان اور عربوں کے موقف کا نمائندہ اخبار۔ پہلے عربوں میں پھوٹ تھی مگر اب الحمدللہ حالات بدل گئے ہیں۔

۲۔ پٹرول کے ہتھیار کا موثر استعمال۔

۳۔ عربوں میں شہری زندگی، تعیش اور آرام طلبی کی بجائے جفاکشی اولوالعزمی اور جنگی اسپرٹ کا فروغ۔

یہ تمام باتیں جدید ضروریات بدلتے ہوئے سیاسی حالات اور عربی پروپیگنڈہ کی آمدنی اور ملازمین کی تعداد میں اضافہ کی متقاضی ہیں۔

ہر عرب کی ذمہ داری۔

نشریات کے عرب لیگ سکریٹری نے آخر میں کہا کہ عرب پروپیگنڈہ کی ذمہ داری ایک مشترکہ ذمہ داری ہے اور یہ ہر عرب حکومت، عرب مفکر اور عرب نمائندے پر عائد ہوتی ہے۔ یہ تنہا عرب لیگ کی ذمہ داری نہیں۔!!!

عرب لیگ مشن کے دفاتر اور ان کی سرگرمیاں صرف ۱۵ عالمی راجدھانیوں تک محدود ہے جب کہ عرب ممالک کے ڈپلومیٹ مشن دنیا کی تقریباً ہر راجدھانی میں ہے اس میں شک نہیں کہ یہ ممالک بھی عرب نشریات کے سلسلہ میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

غیر ملکی سفر کرنے والے ہر عرب کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے وطن اور اپنے موقف کا دفاع کرے اور اپنی عزت پر حرف نہ آنے دے۔

عرب لیگ کے انتظامی امور کے متعلق گیارہ ادارے ہیں جن میں سے بعض اپنا کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ اجتماعی امور کے نگران ڈاکٹر ابراہیم العشاوی نے اپنے ادارے کی سرگرمیوں کے متعلق بتلایا کہ ہماری اب تک کی کارکردگی یہ ہے کہ ہم نے عرب لیگ کے ممبران کو باہمی تعاون پر آمادہ کیا ہے۔ اسی ذریعہ سے عربوں کی صنعتی، زراعتی اور اقتصادی ترقی ہو سکتی ہے۔ ہم نے باہمی تعاون سے متعلق ایک لائحہ عمل بھی تیار کیا ہے، جسے اقوام متحدہ اور دیگر ممالک نے بھی پسند کیا ہے۔

اگر عرب ممالک باہمی تعاون اور اقتصادی امداد پر دس فیصد بھی توجہ دیں تو ان کے منصوبے کامیاب ہو سکتے ہیں۔

اس ادارے نے عراق اور عمان میں اجتماعی مرکز کھولے، ابھی حال ہی میں عدن اور خرطوم (سوڈان) میں اس کے مراکز قائم ہوئے ہیں جن پر تقریباً ۴۰ ہزار ڈالر کی لاگت آئی ہے۔ ملازمین کی تربیت پر ۱۲ ہزار ڈالر صرف ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر عشاوی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "عرب لیگ نے قاہرہ، عمان اور طرابلس میں ورزشی مراکز کھولے ہیں، اب ہم نے یمن میں اسٹیڈیم بنانے کے لئے ایک لاکھ ڈالر کا بجٹ بنایا ہے اس طرح کئی عرب ممالک میں طبی کیمپ قائم کر چکے ہیں جن پر ڈیڑھ لاکھ ڈالر لاگت آئی ہے۔

عرب یونسکو۔

عرب لیگ کی ذیلی تنظیموں میں کارکردگی کے اعتبار سے سب سے بہتر "مرکز تعلیم و ثقافت" ہے یہ گویا عرب "یونسکو" ہے۔

ہم اس کے سکریٹری ڈاکٹر عبد العزیز سے ملے جنھوں نے بتایا کہ ۱۹۶۴ء میں یہ سنٹر کھلتے ہی عرب ممالک نے اس میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ابوظبی، قطر اور بحرین عرب لیگ میں شامل ہونے سے پہلے اس میں شریک ہوتے۔ فی الحال اس کے ممبر ممالک کی تعداد ۱۶ ہے۔ اس مرکز کا آئندہ اقدام غیر عربی ممالک میں عربی زبان و ادب کی تعلیم کا بندوبست کرنا ہے۔ اس سنٹر سے متعلق شعبہ مخطوطات، شعبہ تعلیم بالغان شعبہ انسداد ناخواندگی اور دیگر ریسرچ سنٹر ہیں۔

سید نوفل سے ملاقات۔

اپنے دورے کے اختتام پر عرب لیگ کے جنرل سکریٹری سے ہم نے ملاقات کی۔ انھوں نے صاف صاف کہا کہ۔

"ہمیں اپنی مشکلات اور اپنی خامیوں کا بخوبی احساس ہے اور اس کی اصلاح کے لیے ہم کوشاں ہیں ہماری ہر حریت پسند سے درخواست ہے کہ وہ عرب لیگ کی مدد کرے، اس کی حمایت کرے اور تقویت پہونچائے۔

عرب لیگ ہم سب کا آئینہ ہے۔

ڈاکٹر سید نوفل نے کہا کہ عرب لیگ کسی استثنا کے بغیر ہم سب کا آئینہ دار ہے۔ اگر ہم قوی ہوں گے تو عرب لیگ قوی ہوگی۔ اگر ہم کمزور ہوں گے تو عرب لیگ کمزور ہوگی۔ اگر ہم منتشر ہوں گے تو وہ بھی بکھر جائے گی۔ اگر ہم جذباتی ہوں گے تو یہ ضروری نہیں کہ ہر وہ شخص جو عرب لیگ کے لئے کام کر رہا ہو بھی جذباتی ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم کل کے مقابلہ میں آج بہتر حال میں ہیں۔"

بقیہ۔ آپ کیا کھائیں۔

تو دنیا تمدن باقی نہ رہتا۔ اس تمدن کی خصوصیت یہ ہے۔ کہ غذاؤں کا تنوع بہت بڑھ گیا ہے اور اگر آٹے اور شکر کے ذریعہ ہمیں شکری خزانہ مل جاتی، تو جدید تمدن کی بنیاد کھوکھلی ہو جاتی۔ لیکن ہمیں اس امر کا رکھنا چاہئے کہ کیک اور مٹھائیوں کی لذت، اور عام دستیابی کی بنا ان کا زیادہ استعمال شروع نہ کر دیا اس لئے کہ ان کی زیادہ صحت کے لئے نقصان دہ ہوگی۔ اور ہم ان سے اپنا پیٹ بھر لیں۔ تو دوسرے عناصر اور غذاؤں سے محروم ہو جائیں گے۔

آپ کی بنیادی غذا

ذیل میں آپ کی روزانہ غذا کے لئے ایک فہرست دی جاتی ہے۔ جو آپ کو ایک بنیادی صحت بخش غذا کا کام دے سکتی ہے ان کے استعمال سے آپ کو تمام غذائی اجزا مل سکیں گے۔

دودھ، انڈا، کچھ گوشت، دو سبزیاں، آلو، کچھ پھل اور کچی سبزیاں گیہوں کے آٹے کی روٹی دال تبدیلی کے ساتھ، موسم سرما میں دھوپ، اور روغن ماہی کا گاہے گاہے استعمال۔ بس آتنی چیزیں باقاعدگی کی تبدیلی کے ساتھ روزمرہ کی غذا میں شامل کر لی جائیں۔ تو غذا کا ایک معقول اور مفید نظام قائم ہو سکتا ہے۔

بقیہ۔ نائب وزیر اوقاف قطر

ترجمہ: "تیرے رب کی قسم یہ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے اختلافی امور میں تجھے حکم نہ مان لیں اور اپنے نفس میں تیرے فیصلہ سے کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور بات پوری طرح مان لیں۔

جس وقت امت اپنی کتاب اور دستور آسمانی کی طرف رجوع کرے گی۔ اس وقت ہمارے اوپر اللہ کا قول انما کان قول الذین اٰمنوا اذا دعوا الی اللہ ورسولہ ان یقولوا سمعنا واطعنا ۝

"ایمان والوں کو جب اللہ اور اس کے رسول کی طرف پکارا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں۔ ہم نے سنا اور اطاعت کی" منطبق ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے ہماری دعا ہے۔ کہ وہ ملت کے قائدین اور ان کے علماء کو خیر کی ہدایت دے اور سیدھے راستے پر چلائے۔

عالمِ اسلام کا ایک تعارف

اردن

اردن محل وقوع: اردن کے شمال میں شام۔ شمال مشرق میں عراق جنوب اور مشرق میں سعودی عرب، مغرب میں فلسطین۔

رقبہ: ۳۸، ۳۷، (۱۹۶۷ کی جنگ میں اردن کے مغربی کنارے کا علاقہ اسرائیل کے قبضہ میں چلا گیا تھا اس لئے رقبہ کم ہو گیا ہے)۔

آبادی۔ ۲۲ لاکھ۔ زبان عربی مسلمان اکثریت

آب و ہوا۔ مختلف علاقوں میں درجہ حرارت مختلف ہوتا ہے۔

پیداوار: زیتون، سیب، ناشپاتی، آلو، خوبانی، بادام، انجیر، کیلا، انار، انگور، مکئی، پیاز، گندم جو اور مختلف نوعیت کی سبزیاں۔

معدنیات۔ پوٹاس، فاسفیٹ اور سیمنٹ۔

مختصر تاریخ۔ جنگ عظیم اول (۱۹۱۴، ۱۹۱۸) میں ترکی کی اسلامی ریاست مسلمانوں کی غداری کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی انگریزوں نے مکہ کی ایک معروف شخصیت شریف حسین کو ترکوں کے ساتھ غداری کے صلہ میں مشرقی اردن اور عراق دو ریاستیں دیں عراق میں شریف حسین کا لڑکا فیصل اور مشرق اردن میں عبداللہ (موجودہ بادشاہ کے دادا) حکمراں بنے۔

اردن جنگ عظیم کے دل کے بعد برطانیہ کے زیر انتساب دیدیا گیا تھا لیکن عوامی مطالبے سے تنگ آکر امیر عبداللہ نے ۲ رمئی ۱۹۲۳ء کو مشرق اردن کی آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ لیکن مشرق اردن شاید اس لحاظ سے دنیا کا پہلا بدقسمت ملک تھا کہ آزاد ہونے کے بعد بھی غلام رہا امیر عبداللہ اگر اندرون معاملات میں خود مختار تھا لیکن دفاع مالیات اور خارجہ تعلقات وغیرہ پر برطانیہ کا مکمل کنٹرول تھا نیم غلامی کی یہ حالت ۱۹۴۶ء تک رہی۔

اپریل ۱۹۲۸ میں عبداللہ حکومت کے خلاف عوام نے مظاہرے شروع کر دیئے اس کی وجہ یہ تھی کہ اہل اردن مملکت کا مذہب اسلام دیکھنا چاہتے تھے امیر عبداللہ نے بہت جلدی اعلان کیا کہ مشرق اردن کا مذہب اسلام ہوگا ۱۹۲۹ میں مشرق اردن میں انتظامی کونسل ۲ نشستوں کے علاوہ ۸ افراد پر بنائے جانے رکھے گئے۔ ۱۹۳۰ء میں انتظامی کونسل اور امیر عبداللہ کے درمیان چپقلش جب زیادہ سنجیدہ ہو گئی تو امیر نے کونسل توڑ دی جون ۱۹۳۰ء میں کونسل کے دوبارہ انتخابات منعقد ہوئے انتخابات کے بعد ابھی پہلا اجلاس منعقد ہوا ہی تھا کہ ایک دفعہ پھر امیر عبداللہ اور کونسل کے درمیان اختلافات شدت اختیار کر گئے امیر عبداللہ نے پھر کونسل توڑ دی۔

یاد رہے کہ یہ اختلافات اردن میں برطانوی مداخلت پر ہوتے تھے۔

۲ رجون ۱۹۳۴ء کو امیر عبداللہ اور برطانیہ کے درمیان ایک معاہدہ قرار پایا جس کی رو سے امیر عبداللہ کے اختیارات میں اضافہ کر دیا گیا جس کے تحت امیر عبداللہ بیرونی ممالک میں اپنے سفیر مقرر کر سکتا تھا اگست ۱۹۳۹ء میں حکومت برطانیہ نے امیر عبداللہ کو کونسل کی جگہ وزارت بنانے کی اجازت دی جو کہ امیر کے سامنے جواب دہ ہو گی۔

۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۷ء تک مسلسل ۱۹ برس اہل اردن حقیقی آزادی کے لئے کوشش کرتے رہے۔

مارچ ۱۹۴۵ء میں عرب لیگ کا قیام عمل میں آیا برطانوی حکومت نے امیر عبداللہ پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ اردن عرب لیگ کا ممبر بن گیا۔

۲۲ رمارچ ۱۹۴۶ء کو برطانیہ نے مشرق اردن کو آزادی دی گئی اور یہ اعلان کیا گیا کہ مشرق اردن ایک آزاد اور خود مختار مملکت ہو گی جس کا سربراہ امیر عبداللہ ہوگا۔

معاہدہ کے تحت ۲۵ رمئی ۱۹۴۶ء کو امیر عبداللہ اردن کا پہلا بادشاہ بنا اسی سال اردن میں پہلا دستور تیار ہوا جسے ۱۹۴۷ء میں نافذ کر دیا گیا۔

دستور کے چیدہ چیدہ نکات درج ذیل تھے۔

تمام انتظامی اختیارات مالک عبداللہ ہو گا اس کی وفات کے بعد اس کی اولاد تخت کا وارث ہو گی۔

بادشاہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوگا۔

بادشاہ کسی بیرونی ملک کے ساتھ اعلان جنگ و صلح اور دیگر معاہدات کر سکتا ہے۔

پارلیمنٹ کے انتخابات کرانا، اجلاس بلانا، ملتوی کرنا، پارلیمنٹ کو ختم کرنا بادشاہ کے دائرہ اختیار میں ہوگا۔

بادشاہ انتظامی امور کی انجام دہی کے لئے ایک وزیر اعظم مقرر کرے گا وزیر اعظم اور اس کی کابینہ انفرادی اور اجتماعی طور پر جواب دہ ہو گی۔

پارلیمنٹ کے دو ایوان ہوں گے ایوان بالا (کونسل آف نوٹ ایبل) ایوان زیریں (نمائندگان کی کونسل)

۱۹۴۷ء میں فلسطین سے برطانوی انقلاب ختم ہو گیا برطانیہ نے اسرائیل کی ریاست قائم کرنے میں یہودیوں کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ ۱۹۴۸ء میں جنگ فلسطین شروع ہوئی اور فلسطینی مہاجرین گروہ در گروہ اردن میں داخل ہونا شروع ہو گئے اور یہیں سے اردن کے سیاسی حالات ایک نیا رخ اختیار کر گئے اردن کی سیاست میں ہنگامہ آرائی داخل ہو گئی اس ہنگامہ آرائی میں کمیونسٹ پیش پیش رہے یہی وجہ ہے

کہ آج تک اردن میں سکون نہیں ہو سکا۔

۱۹۵۱ء میں امیر عبداللہ کو قتل کر دیا گیا اس کی جگہ طلال اس کے بیٹے نے لی۔ اس سال اردن میں عام انتخابات ہوئے۔ ۱۱ مئی ۱۹۵۲ء کو شاہ طلال کو خرابی صحت کی بنا پر تخت سے الگ ہونا پڑا اس کی جگہ حسین کو اردن کا بادشاہ بنایا گیا۔ ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۳ء میں ملک میں وسیع پیمانہ پر کمیونسٹوں کی گرفتاریاں ہوئیں ۱۹۵۴ء میں ملک بھر میں پھر انتخابات ہوئے انتخابات کے بعد عوامی مطالبہ کے پیش نظر عرب لیجن کے کمانڈر گلب پاشا کو ملک سے نکال دیا گیا یاد رہے کہ انگریزوں نے اردن پر اپنا سیاسی اقتدار قائم کرنے کے لئے ایک ہزار افراد پر مشتمل فوجی دستہ عرب لیجن کے نام سے ۱۹۲۱ء میں بنایا تھا۔ اس کا پہلا کمانڈر ایف جی پیک تھا جو ۱۹۳۹ء تک عرب لیجن کا کمانڈر رہا ۱۹۳۹ء میں گلب پاشا کمانڈر بنا۔

۱۴ دسمبر ۱۹۵۵ء کو اردن اقوام متحدہ کا رکن بنا۔

۱۳ اپریل ۱۹۵۶ء میں کمیونسٹوں نے زرقہ کے ایک فوجی کیمپ میں بغاوت کرا دی شاہ حسین نفس نفیس وہاں پہونچا اور بغاوت کو ذاتی اثر و رسوخ سے دبا دیا کمانڈر انچیف ابونوار کو برطرف کر دیا گیا۔

۱۹۵۷ء میں ناصر کے کہنے پر شاہ پر پہلا قاتلانہ حملہ ہوا یاد رہے کہ شاہ پر اس طرح کے ایک درجن سے زائد حملے ہو چکے ہیں۔

۱۹۵۸ء میں عراق میں فیصل کا تختہ الٹ دیا گیا وہ دن تھے جب عرب میں ناصر کا طوطی بولتا تھا ناصر کی خواہش تھی کہ وہ عالم عرب کا لیڈر بنے اور عراق کی طرح اردن کی حکومت کا بھی خاتمہ ہو چنانچہ ۱۹۵۹ء میں قاہرہ ریڈیو سے پہلی دفعہ حسین کے خلاف پروپیگنڈہ شروع ہو گیا۔

۱۹۶۰ء میں ناصر نے ریڈیو پر تقریر میں شاہ پر الزام لگایا کہ وہ امریکہ اور برطانیہ کا ایجنٹ ہے اور یہ کہا کہ حسین دنیائے عرب کے چند غداروں میں سے ہے حسین نے اس کا فوراً نوٹس لیا اور کہا کہ ناصر بدترین قسم کا ڈکٹیٹر ہے اور اسے انتباہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کی بدبختی کا دور شروع ہونے والا ہے ایسی بدبختی جو ہر ڈکٹیٹر کے نصیب میں ہوتی ہے۔

۲۹ اگست ۱۹۶۰ء کو اردن کے وزیر اعظم الہزاع کو کمیونسٹوں نے ہینڈ گرینیڈ سے اڑا دیا شاہ نے قتل کی ذمہ داری ناصر پر ڈالی۔

۱۹۶۵ء میں تنظیم آزادی فلسطین کے گوریلوں نے جب اسرائیل کی نواحی بستیوں پر حملے کئے تو شاہ نے عرب سربراہوں کو متوجہ کیا کہ اسرائیل ان حملوں کو بہانہ بنا کر بڑا حملہ کر دے گا اس لئے گوریلوں کی کارروائیوں کا نوٹس لیا جائے۔

۱۹۶۶ء میں شاہ اور تنظیم آزادی فلسطین کے درمیان تعلقات انتہائی کشیدہ ہو گئے وصفی التل وزیر اعظم نے تنظیم کے دفاتر سربمہر کر دیئے اور تنظیم کو اپنی سرگرمیاں بند کرنے کو کہا۔

۲۵ نومبر ۱۹۶۶ء تنظیم آزادی فلسطین اور کئی غیر قانونی تنظیموں کے کارکنوں نے ملک میں ہنگامہ آرائی شروع کر دی آخر کار کچھ عرصہ بعد ان میں صلح ہو گئی۔

جون ۱۹۶۷ء میں عربوں اور اسرائیل کے درمیان تیسری مقدس جنگ شروع ہو گئی اس سے اردن بھی متاثر ہوا یہودیوں نے دریائے اردن کے مغربی کنارے پر قبضہ کر لیا بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ بھی یہودیوں کے قبضہ میں چلے گئے۔

۱۹۶۹ء میں رباط میں اسلامی سربراہوں کی کانفرنس منعقد ہوئی اس میں اردن بھی شامل ہوا۔

۱۹۷۰ء میں یاسر عرفات اور حسین کے درمیان مذاکرات کا آغاز ہوا مذاکرات کامیاب ہوئے لیکن جلد ہی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔

جون ۱۹۷۰ء میں الفتح کے دو مسلح دستوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اردن اس عرصہ میں میدان جنگ بنا رہا آخر کار شاہ اور تنظیم آزادی فلسطین کے درمیان صلح ہو گئی۔

ستمبر ۱۹۷۰ء میں تیسری بار اردن میں خانہ جنگی شروع ہوئی ۲۳ لاکھ کی آبادی میں تین ہزار زخمی ہوئے اور ۲ ہزار مارے گئے ۲۳ ستمبر ۱۹۷۰ء کو عرب لیگ کے امن مشن کے سربراہ جنرل نمیری نے دونوں پارٹیوں کو فائر بندی پر آمادہ کیا فائر بندی کے بعد قاہرہ کانفرنس میں تنظیم آزادی فلسطین اور حسین کے درمیان ایک معاہدہ فارمولا پر دستخط ہو گئے۔

۲۸ نومبر ۱۹۷۱ء کو اردن کے نمائندے وصفی التل کو جب کہ وہ شیرٹن ہوٹل قاہرہ میں داخل ہو رہا تھا گوریلوں نے قتل کر دیا تین ماہ کی مکمل خاموشی کے بعد ۲ مارچ ۱۹۷۲ء میں فدائین اور حکومت کے درمیان تعلقات پھر کشیدہ ہو گئے فوج نے شاہ کے خلاف بغاوت میں حصہ لیا لیکن شاہ کی وفادار فوج نے بغاوت پر قابو پالیا۔

مارچ ۱۹۷۲ء میں شاہ نے دریائے اردن کے دونوں کناروں کے آس پاس یونائیٹڈ عرب کنگڈم بنانے کا اعلان کیا تمام دنیائے عرب میں اس کا سخت ردعمل ہوا۔

۱۹۷۳ء میں شاہ نے اپنی دوسری بیوی کو طلاق دے کر ایک فلسطینی لڑکی سے شادی رچائی تاکہ فلسطینیوں کو خوش کیا جا سکے۔

اردن میں گوریلا تنظیموں اور حکومت کے درمیان تعلقات ابھی تک کشیدہ ہیں سرد جنگ جاری ہے دیا رہے کہ چند ماہ ہوئے شاہ حسین کے ہیلی کوپٹر پر ایک طیارے نے راکٹ برسائے تھے جس سے شاہ کی رانوں پر زخم آئے شاہ کی وفادار فوجوں نے طیارے کو گرا لیا شاہ بال بال بچ گئے۔

افغانستان

پاکستان کے جنوب میں ۲½ لاکھ مربع میل رقبہ میں پھیلی ہوئی تقریباً ۱ کروڑ نفوس پر مشتمل افغانستان کی آزاد و خودمختار ریاست واقع ہے شمال میں اس کی سرحدیں روسی علاقہ تا پاکستان مشرق میں چین اور مغرب میں ایران تک پھیلی ہوئی ہیں کوئلہ، نمک، چاندی، تانبہ، سیسہ افغانستان کی مشہور معدنیات ہیں روس کی امداد کے ساتھ ساتھ تیل کی تلاش کا کام بھی جاری ہے اگرچہ گندم، چاول، پھل اور کپاس کافی مقدار میں پیدا ہوتی ہیں لیکن اس کی معیشت کا دار و مدار زیادہ تر امریکہ اور روس پر ہے۔

مختصر تاریخ : افغانستان کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وسط ایشیا کے اس علاقے کا نام پہلے پہل آریانہ تھا ۳۳۲ ق م میں سکندر اعظم یونانی نے افغانستان پر حملہ کیا سکندر اعظم کا ارادہ اس ملک کو اپنے دائرہ اختیار میں لانا تھا کہ اس کی اچانک موت نے اس کے تمام منصوبے خاک میں ملا دیئے سکندر اعظم کی وفات کے بعد اس کے ایک جرنیل گرگیہ نے افغانستان فتح کیا اور وہاں باقاعدہ سلطنت کی بنیاد رکھی یونانی دو سال تک تقریباً افغانستان پر قابض رہے یونانیوں کے بعد سات سو برس تک بدھ مت کے پیرو افغانستان پر حکومت کرتے رہے عرصہ کے زمانہ میں اسلام کی روشنی یہاں پہونچی اور آہستہ آہستہ بدھ مت کے اثرات افغانستان سے غائب ہونا شروع ہو گئے۔ بدھوں کے بعد ساسانیوں نے افغانستان پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۴۷ء میں اسے آزادی دے دی گئی یہ وہ دور تھا جب افغانستان کے ایک ہمسایہ ملک ہندوستان میں انگریز اپنے قدم جمانے کی کوشش کر رہے تھے میسور کی چوتھی جنگ (۱۷۹۹) کے بعد انگریز تقریباً ہندوستان پر قابض ہو گئے تھے اب ان کی حریصانہ نگاہیں افغانستان پر پڑ رہی تھیں چنانچہ انیسویں صدی کے اوائل میں انگریزوں نے سندھ اور پنجاب کے حکمرانوں کی مرضی کے خلاف ان کے علاقوں سے گزر کر افغانستان پر حملہ کیا افغانستان کے ساتھ انگریزوں کی باقاعدہ جنگ ۱۸۳۹ء میں ہوئی یہ جنگ ۱۸۴۲ء تک رہی اور تاریخ میں افغانستان

کی پہلی جنگ کے نام سے مشہور ہے ۔

برطانیہ نے لارڈ آک لینڈ کو وسط ایشیا کی جسم سر کرنے کے لئے بھیجا تھا ۔ افغانستان پر ان دنوں امیر دوست محمد حکومت کرتا تھا اگرچہ دوست محمد انگریزوں کے ڈر سے کابل چھوڑ کر بھاگ گیا تھا لیکن اس کے بیٹے اکبر خاں نے انگریزوں کا مقابلہ کیا اور ان کو عبرت ناک شکست دی ۔

۱۸۷۸ء میں انگریزوں نے افغانستان پر بھرپور حملہ کیا ۔ اس دفعہ پھر شکست کھائی آخر کار ۱۸۷۹ء میں گندمک کے مقام پر افغانوں اور انگریزوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا معاہدہ کے تحت .... ۶ پونڈ سالانہ کے علاوہ پشتین کے علاقے انگریزوں کو دینے کی کوشش کی گئی لیکن لوگوں نے انگریز سفیر کو قتل کر دیا اور یعقوب خاں پر زور ڈالا کہ معاہدہ منسوخ کر دے انگریزوں نے یعقوب خاں کو گرفتار کر کے حملہ کر دیا یعقوب خاں کے بھائی ایوب خاں نے انگریزوں کو میوندے کے مقام پر زبردست شکست دی شکست کھانے کے بعد انگریزوں نے افغانستان کے سابق حکمران امیر شیر علی کے بھتیجے عبدالرحمٰن کے ساتھ سازباز کی اور اسے زبردستی کابل کا امیر بنا دیا ۔ عبدالرحمٰن نے ایوب خاں کو شکست دی اور خود افغانستان کا حکمران بن گیا عبدالرحمٰن ۱۸۸۰ سے ۱۹۰۱ء تک حکمران رہا ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۹ء تک امیر حبیب اللہ افغانستان کا حکمران بنا رہا ۔

۲۵ فروری ۱۹۱۹ء کو حبیب اللہ قتل کر دیا گیا سات دن تک حبیب اللہ کا بھائی نصر اللہ خاں حکمران رہا لیکن اسے امان اللہ خاں نے شکست دی اور حکمران بنا مجموعی طور پر ان دونوں کے زمانہ تک اثر و رسوخ دونوں کے برابر تھا اگرچہ عبدالرحمٰن انگریزوں کا پروردہ تھا ۔ ۱۸۷۴ء سے ۱۹۱۹ء تک افغانستان میں افراتفری برپا رہی اور حقیقی معنوں میں اسے آزاد اور خود مختار ریاست نہیں کہا جا سکتا اسے حقیقی آزادی ۸ اگست ۱۹۱۹ء میں معاہدہ راولپنڈی کے تحت ملی ۔ یہ معاہدہ افغانستان اور برطانیہ کے درمیان ہوا تھا ۔

امان اللہ خاں نے ۱۹۲۳ء میں عوام کو مغربی تہذیب سے روشناس کرانے کے لئے پہلا قانون پاس کیا ۱۹۲۷ء میں امان اللہ خاں نے اٹلی، جرمنی، فرانس، برطانیہ، ماسکو، ایران، ترکی اور ہندوستان کا دورہ کیا امان اللہ خاں کا یہ دورہ اس لحاظ سے خاصی اہمیت رکھتا تھا کہ شاہ نے ان ممالک کا دورہ کرنے کے بعد افغانستان میں معاشرتی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی چنانچہ ترکی کی طرح امان اللہ خاں نے ایک سے زائد شادی پر پابندی لگا دی ۔ برقعہ کے خاتمہ کا اعلان کر دیا پہلی دفعہ شاہی خاندان کی عورتیں اسکرٹ پہن کر نکلیں ۔

افغانستان میں اس طرح کی غیر اسلامی اصلاحات نافذ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا عوام نے فوراً ہی ان اصلاحات کے خلاف ہنگامے شروع کر دیئے ۔ ۱۷ جنوری ۱۹۲۹ء کو امان اللہ خاں کو اقتدار سے الگ ہونے پر مجبور کر دیا ۔ امان اللہ خاں یورپ چلا گیا ۔ امان اللہ خاں کے خلاف افراتفری سے ایک قبائلی بچہ سقہ نے فائدہ اٹھایا اور اقتدار پر قبضہ کر لیا بچہ سقہ نے امان اللہ خاں کی اصلاحات کو فوری طور پر ختم کر کے عوام کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش بھی کی اکتوبر ۱۹۲۹ء تک بچہ سقہ افغانستان کا حکمران رہا اس دوران مکمل طور پر افغانستان میں افراتفری پھیلی رہی تھی کہ فرانس میں افغانستان کے سفیر نادر شاہ نے بچہ سقہ کو شکست دی اور افغانستان کا بادشاہ بنا اور ۱۹۳۲ء میں ملک کو دستور دیا ۔

اگرچہ دستور نافذ کر دیا گیا تھا لیکن نادر خاں اور ان کے بھائیوں نے ایک دن بھی دستور پر عمل نہیں کیا اس کا بھائی ہاشم خاں ۱۹۴۶ء تک وزیر اعظم رہا محمود شاہ خاں کمانڈر انچیف اور دوسرے بھائی شاہ ولی خاں اور عزیز خاں بھی وزارتوں پر متمکن رہے خود نادر خاں کے پاس وزارت انصاف تعلیم اور خارجہ کے محکمے تھے ۔ نومبر ۱۹۳۳ء میں نادر شاہ کو اس کے ایک دیرینہ دشمن نے قتل کر دیا اس کی جگہ اس کا بیٹا ظاہر شاہ افغانستان کا بادشاہ بنا ۔ ۱۹۳۷ء میں افغانستان، عراق، ایران اور ترکی کے درمیان "سعد آباد پیکٹ" پر دستخط ہوئے دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۵ء) میں افغانستان غیر جانبدار رہا ۱۹۴۷ء میں جب انگریز ہندوستان سے رخصت ہوتے اور ہندوستان دو ملکتوں (بھارت اور پاکستان) میں تقسیم ہو گیا تو افغانستان نے پاکستان کے اقوام متحدہ میں داخلہ کے خلاف ووٹ دیا ۔

۱۹۴۸ء میں امریکہ اور افغانستان کے درمیان سفارتی تعلقات قائم ہوتے ۱۹۴۹ء میں امریکہ نے افغانستان کو ۲ کروڑ ۱۰ لاکھ ڈالر کی امداد دینے کا اعلان کر دیا اس سال افغانستان اور روس کے درمیان سرحدوں کا تعین ہوا جو دونوں ملکوں کے درمیان وجہ فساد بنا ہوا تھا ۔

۱۹۵۳ء میں محمد شاہ وزیر اعظم نے استعفیٰ دے دیا اس کی جگہ محمد داؤد خاں (موجودہ وزیر اعظم) ظاہر شاہ کا بھتیجا اور داماد وزیر اعظم بنا ۔

داؤد خاں نے وزارت سنبھالنے کے بعد پہلی دفعہ پاکستان کے سرحدی علاقوں پر مشتمل ایک آزاد ریاست پختونستان کے قیام کا مطالبہ کیا ۱۹۵۵ء میں پاکستان میں ون یونٹ کے قیام کے بعد سردار داؤد خاں کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا کابل میں پاکستانی سفارتخانہ پر مشتعل ہجوم نے حملہ کیا پاکستانی جھنڈے کی بے عزتی کی پاکستانی عوام نے بھی سفارت خانے کے آگے پشاور میں مظاہرہ کیا دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات ختم ہو گئے کچھ عرصہ بعد سعودی عرب اور ترکی کی حکومتوں نے دونوں ملکوں کے درمیان صلح کرا دی ۔

۱۵ دسمبر ۱۹۵۵ء کو روسی کمیونسٹ پارٹی کے دو لیڈروں بلگانن اور خروشچیف نے افغانستان کا دورہ کیا لیکن افغانستان اور روس کے درمیان صحیح معنوں میں تعلقات ۱۹۶۰ء میں شروع ہوئے ۔

اکتوبر ۱۹۵۶ء میں سردار داؤد نے روس کا دورہ کیا اور فوراً بعد داؤد خاں نے پراگ اور پیکنگ کا دورہ کیا ۔

۱۹۵۸ء میں روسی پریذیڈیم کے صدر نے افغانستان کا دورہ کیا اس کے مقابلہ میں ۱۹۵۹ء میں آئزن ہاور نے پہلی مرتبہ افغانستان کا دورہ کیا ۔

مئی ۱۹۶۰ء امریکی جاسوسی طیارہ یو ۔ ٹو پاکستان سے اڑ کر افغانستان سے ہوتا ہوا روس جاسوسی کی غرض سے گیا لیکن وہاں گرا لیا گیا افغانستان اور روس نے امریکہ اور پاکستان سے اس سلسلہ میں احتجاج کیا ستمبر ۱۹۶۱ء میں پختونستان کی خاطر پاکستان اور افغانستان میں ایک دفعہ پھر سفارتی تعلقات منقطع ہو گئے ۱۹۶۳ء میں سردار داؤد نے وزارت اعظم سے استعفیٰ دے دیا استعفیٰ کی وجہ نیا دستور بنی جس کے مطابق شاہی خاندان کا کوئی فرد آئندہ حکومت میں شامل نہیں کیا جائے گا یہ دستور ۱۹۶۴ء میں نافذ کیا گیا فوراً داؤد زیر زمین چلا گیا اور دس سال تک افغانستان کی سیاست سے غائب رہنے کے بعد اچانک ۱۷ جولائی ۱۹۷۳ء کو جب ظاہر شاہ یورپ کے دورہ پر گیا ہوا تھا ظاہر شاہ کی حکومت کا تختہ الٹ کر خود وزیر اعظم بنا سردار داؤد کا یہ کارنامہ روسی حکومت کا مرہون منت ہے ۔

سردار داؤد کو اقتدار پر آئے ہوئے ایک سال ہو چکا ہے اس دوران انقلابی حکومت کا تختہ الٹنے کی دو مرتبہ کوشش ہو چکی ہے بائیں بازو کی جماعتیں پرچم اور خالق اگرچہ سردار کی حمایت میں پیش پیش ہیں لیکن ان جماعتوں کے نوجوان انقلابی حکومت سے کافی بدظن ہیں اور برملا اس کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں اس کے علاوہ افغانستان کی ایک خفیہ جماعت "ستیام ملی" کے ارکان بھی سردار داؤد کے خلاف سرگرم کار ہیں اس طرح چین نواز کمیونسٹ پارٹی "شعلہ جاوید" بھی سردار داؤد کی حکومت کے خلاف ہے افغانستان کے گذشتہ ایک سال کے واقعات تو یہی بتاتے ہیں کہ اگر روسی حکومت سردار داؤد کی پشت پناہی نہ کرے

تو شاید سردار داؤد زیادہ دیر تک نہ چل سکے ۔

البانیہ

سرکاری نام ۔ جمہوریہ البانیہ صدر مملکت ہیکسی لیشی

محل وقوع ۔ البانیہ یورپ کا نہایت ہی خوبصورت ملک ہے اس کی جنوب مشرقی سرحدیں یوگو سلاویا اور شمال مشرقی سرحدیں یونان سے ملتی ہیں جنوب مغربی حصہ سمندر سے ملحق ہے اس کا دو تہائی حصہ پہاڑی علاقہ اور جنگلات پر مشتمل ہے ۔

رقبہ ۔ ااا مربع میل

آبادی ۔ ۲۲ لاکھ

دارالحکومت ۔ ترانہ

زبانیں ۔ البانوی ملک کی سرکاری زبان ہے اس کے علاوہ کئی دیگر زبانیں بھی بولی جاتی ہیں ۔

مذہب ۔ تقریباً ۷۰ فیصد لوگ مسلمان ہیں ۔ سکہ ۔ لیک

اہم پہاڑی سلسلے ۔ البانوی ایلپس کوہ کورابی، البانیہ کا بلند ترین پہاڑ ہے اس کی بلندی ۲۸ ۔ ۹ فٹ ہے ۔

اہم دریا ۔ یمانی دریپ، دجو سلاور حتی کہ آب و ہوا ۔ ساحلی علاقوں کی آب و ہوا گرم مرطوب ہے جب کہ اندرونی علاقوں کا موسم خشک اور گرم ہوتا ہے یہاں سردی بہت کم پڑتی ہے ۔

زرعی پیداوار ۔ گندم، مکئی، زیتون ۔ تمباکو، لکڑی، پٹیر ماون، کھالیں ۔

معدنی پیداوار ۔ تیل البانیہ کی سب سے بڑی دولت ہے اس کے علاوہ خام کردم اور خام لوہا بھی نکالا جاتا ہے ۔

صنعتیں ۔ یہاں تیل صاف کرنے چینی تیار کرنے اور کپڑا بننے کی صنعتیں ہیں ۔

قومی پرچم ۔ البانیہ کا جھنڈا سرخ رنگ کا ہے اس کے وسط میں دوہرے سر کا عقاب اور اس کے اوپر سنہری رنگ میں پانچ کونی ستارہ دکھایا گیا ہے ۔

معاہدوں اور تنظیموں سے وابستگی ۔ یہ اقوام متحدہ اور اسلامی سکریٹریٹ کا رکن ہے ۔

مختصر تاریخ ۔ البانیہ پر دو ہزار سال تک حملے ہوتے رہے ۔ ۱۹۱۲ء میں ترکوں نے ایک معاہدہ کے تحت اسے آزاد کر دیا ۔ ۱۹۱۴ء میں شہزادہ ولیم آف وِیڈ تخت نشین ہوا ۔ وہ چند ماہ کے بعد بھاگ گیا کیوں کہ پہلی جنگ عظیم میں مختلف قوتوں نے یکے بعد دیگرے اس پر چڑھائی کر کے قبضہ کر لیا تھا ۔ ۱۹۲۰ء میں اسے جمہوریہ قرار دیا گیا ۔ احمد زوگو نے زبردستی اقتدار پر قبضہ کر لیا ۱۹۲۸ء میں اس نے زوگ اول کے لقب سے البانیہ کا بادشاہ ہونے کا اعلان کیا ۱۹۳۹ء میں جب اٹلی نے البانیہ پر قبضہ کیا تو زوگ اول بھاگ گیا ۱۹۴۳ء میں جب اٹلی نے اتحادی فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تو ۱۹۴۴ء میں انور ہوکسا کی قیادت میں البانیہ کی نئی حکومت کا قیام عمل میں آیا انور ہوکسا نے البانیہ کے سابق بادشاہ زوگ اول کے البانیہ میں داخلے پر پابندی لگا دی ۱۹۴۶ء میں البانیہ کا نیا آئین نافذ ہوا اس کے تحت ملک کو جمہوریہ قرار دیا گیا اس سال برطانیہ اور امریکہ نے البانیہ کی اقوام متحدہ میں شمولیت کے خلاف ووٹ دیا بالآخر ۱۹۵۵ء میں برطانیہ کی حمایت اور امریکہ کی اقوام متحدہ میں ووٹنگ میں حصہ نہ لینے کی بنا پر اسے اقوام متحدہ کا رکن بنا لیا گیا ۔ اسی سال البانیہ معاہدہ وارسا کا رکن بنا دسمبر ۱۹۶۱ء میں روس نے البانیہ کے ساتھ سفارتی تعلقات منقطع کر لئے اور ۱۹۶۲ء میں وارسا معاہدہ کے اجلاسوں میں اسے حصہ لینے سے منع کر دیا چنانچہ اس پر البانیہ ۱۹۶۸ء میں معاہدہ وارسا سے علیحدہ ہو گیا ۔

۱۹۷۰ء میں چین اور البانیہ کے مابین تجارت کو فروغ دینے کا ایک معاہدہ طے پایا ۱۹۷۱ء میں البانیہ یوگوسلاویہ اور یونان کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کئے ۔

الجزائر

الجزائر شمالی افریقہ کی سوشلسٹ جمہوریہ اور اس وسیع و عریض خطے کا جزو ہے جسے تاریخ میں مغرب کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور جو لیبیا سے لے کر مراکش تک پھیلا ہوا ہے بحر روم کے جنوب میں شمالی افریقہ میں جو ملک واقع ہیں ان میں الجزائر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اس کے مشرق میں لیبیا اور تیونس اور مغرب میں مراکش واقع ہیں اور شمال میں بحر روم ہے جنوب میں اس کی حدیں مالی اور نائیجریا سے ملتی ہیں اس کا رقبہ ۱۳۸۴ مربع میل اور آبادی ایک کروڑ باون لاکھ ستر ہزار ہے ۔

الجزائر کے قدیم باشندے بربر قوم سے تعلق رکھتے تھے آج بھی یہاں کے آداب و رسوم اور لوک گیتوں میں بربر تمدن کی جھلک نظر آتی ہے ساتویں صدی عیسوی میں جب بنو امیہ کے عہد میں عرب فاتح شمالی افریقہ پر چھا گئے تو مختصر سی مقاومت کے بعد یہاں کے باشندوں نے عربی ثقافت اور عرب فاتحین کا دین (اسلام) قبول کر لیا اور وہ ہر لحاظ سے عرب قوم کا جزو بن گئے ۔

۱۴۹۲ء میں اسپین نے غرناطہ فتح کرنے کے بعد الجزائر کے چند اہم شہر فتح کر لئے بعد میں یہاں ترک فاتح کی حیثیت سے آئے جولائی ۱۸۳۰ء میں اس پر فرانس کا قبضہ ہو گیا اس کے بعد فرانسیسی بڑی تعداد میں یہاں آباد ہو گئے اور زمینوں کے مالک بنا دیئے گئے اس صورت حال کے ردعمل کے طور پر آزادی کا جذبہ پیدا ہوا جسے کچلنے کے لئے فرانس نے اپنا پورا ہلاکت بار سامان الجزائر میں جھونک دیا اور اس کی پانچ لاکھ فوج سالہا سال تک اپنی پوری قوت سے بے سروسامان مجاہدوں کے خلاف استعمال کرتی رہی الجزائر کی آزادی میں دراصل وہ پندرہ لاکھ فرانسیسی حائل تھے جو تقریباً سوا سو سال کے عرصے میں وہاں آ کر مالک بن بیٹھے تھے بہر صورت الجزائر کے عوام نے آزادی کے حصول کے لئے جو قربانیاں دیں تاریخ عالم میں اس کی نظیر آسانی سے نہیں مل سکتی ۔ ۱۹۴۵ء میں صرف قسطنطین کے علاقے میں فرانسیسی فوج نے ۴۵ ہزار افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا فرانس کے خلاف اگرچہ انقلاب (باقاعدہ اور منظم اور چھاپہ مار جنگ) کا آغاز یکم نومبر ۱۹۵۴ء کو ہوا لیکن جہاد آزادی دراصل ۱۴ جون ۱۸۳۰ء ہی کو شروع ہو گیا تھا جب فرانس نے الجزائر میں تسلط کے ارادے سے قدم رکھا تھا چھاپہ مار قیادت کی جنگ محاذ آزادی کے رہنما تھے چار برس بعد ۱۹۵۸ء میں الجزائر کی پہلی جلاوطن حکومت قاہرہ میں قائم ہوئی بے انتہا قربانیوں کے بالآخر کامیابی نے مجاہدین کے قدم چومے اور فرانس کے صدر ڈیگال الجزائر کو ۳ جولائی ۶۲ کو آزاد کرنے پر مجبور ہو گئے آزادی کے بعد یہاں پہلی عبوری حکومت مرتب ہوئی اس کے وزیراعظم یوسف بن خدہ اگست ۶۲ء میں احمد بن بیلا نے فوج کی مدد سے اقتدار سنبھال لیا ۔ ۸ ستمبر ۶۳ء کو نیا آئین منظور ہوا اور وزیراعظم بن بیلا ۱۵ ستمبر کو پانچ سال کے لئے صدر منتخب ہو گئے ۱۹ جون ۶۵ء کو فوج کے کمانڈر انچیف کرنل حوری بومدین صدر بن بیلا کو معزول کر کے کسی خون خرابہ کے بغیر مسند اقتدار پر فائز ہو گئے اس وقت وہ ملک کے وزیر دفاع اور نائب صدر بھی تھے ۔ ۱۱ جولائی ۶۵ء کو انھوں نے صدارت سنبھالا روزی کابینہ کا بینہ کا اعلان کیا ۔

الجزائری فوج کی تنظیم میں جتنا حصہ بومدین کا ہے کوئی دوسرا رہنما اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا انہی نے ۶۲ء کے موسم گرما میں الجزائر کے اس وقت کے وزیراعظم یوسف بن خدہ کا تختہ الٹا تھا اور

ستمبر ۱۹۶۲ء میں جب باغی فوجوں نے الجزائر پر قبضہ کر لیا تو یہ بومدین ہی تھے جنھوں نے صدر بن بیلا کے اقتدار کی حفاظت کی اور باغی عناصر کو ختم کر دیا تھا۔ ۱۹۵۴ء میں غواس کے پہاڑی علاقہ میں حریت پسندوں نے جب فرانسیسیوں کے خلاف جدوجہد شروع کی تو حوری بومدین چھاپہ مار دستوں کے کمانڈر کی حیثیت سے اس میں پیش پیش تھے۔

صدر بومدین نے ستمبر ۱۹۷۳ء میں الجزائر میں غیر جانبدار ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس کی صدارت کی تھی غیر جانب دار ممالک کے ترجمان اور غیر جانبدار ملکوں کے سربراہوں کی چوتھی کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے انھوں نے مشرق وسطیٰ کے مسئلے پر تیسری دنیا اور افریقی رائے عامہ کی تنظیم میں بڑا اہم کردار انجام دیا آپ اکتوبر ۱۹۷۲ء میں عرب سربراہوں کی چھٹی کانفرنس کے صدر بھی منتخب ہوئے تھے یہ کانفرنس بھی الجزائر میں ہوئی تھی الجزائر عرب لیگ، اقوام متحدہ اور اسلامی سکریٹریٹ کا رکن ہے۔

اہم شخصیات: تحریک آزادی کے جدید دور کی شخصیات میں صدر بومدین کے علاوہ احمد بن بیلا یوسف بن خدہ کریم بالقاسم فرحت عباس اور حریت پسند خاتون جمیلہ کی شخصیات خاص نمایاں ہیں تحریک آزادی کے قدیم دور کے رہنماؤں میں امیر عبدالقادر بکسرانی، بوعمامہ اور ایک مجاہدہ فاطمہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

دارالحکومت الجزیرہ سب سے بڑا شہر ہے دوسرا بڑا شہر اوران ہے قسطنطین میں ہوائی اڈہ ہے جہاں جیٹ طیارے اترتے ہیں عنابا بندرگاہ ہے جہاں فولاد کا کارخانہ اور جیٹ طیاروں کے لئے ہوائی اڈہ ہے عرزیو میں گیس کو رقیق بنانے کا بڑا کارخانہ ہے۔

الجزائر معدنیات کی دولت سے مالا مال ہے جن میں قدرتی گیس اور تیل سب سے اہم ہیں دنیا بھر کے گیس کے ذخائر کا دس فیصد حصہ الجزائر میں ہے۔ ان ذخائر سے صنعتی ترقی میں بڑی مدد مل رہی ہے اور معدنیات، لوہا فاسفیٹ، جست، سیسہ، پارہ، تانبہ، سرمہ ہیں ۱۹۶۹ء میں تیل کی پیداوار ساڑھے چار کروڑ ٹن تھی تیل کی پیداوار میں الجزائر دنیا کا دسواں بڑا ملک ہے گیس رقیق بنانے اور تیل صاف کرنے کے علاوہ یہاں کھاد کپڑے، شراب اور ٹریکٹر سازی کے بھی کارخانے ہیں۔ زرعی پیداوار میں گندم، جو، مکئی، آلو تمباکو کھجور: انار اور انجیر شامل ہیں تجارت زیادہ تر فرانس کے ساتھ ہے۔ ۶۸-۱۹۶۷ء میں تیل کی تقسیم کی غیر ملکی کمپنیاں قومی ملکیت میں لے لی گئی تھیں ۷۱-۱۹۷۰ء میں تیل کی پیداوار سے متعلق متعدد غیر ملکی کمپنیاں بھی قومی تحویل میں لے لی گئیں۔

تعلیم اور مذہب

آزادی سے قبل الجزائر میں تقریباً دس لاکھ یورپی باشندے تھے جو زیادہ تر الجزائر ہی میں پیدا ہوئے تھے آزادی کے بعد ان کی تعداد گھٹ کر اسی ہزار رہ گئی ہے اس وقت عرب اور بربر آبادی کی اکثریت ہے اور یہ سب مسلمان ہیں اور ملک میں تین یونیورسٹیاں اور ۱۲ فنی ادارے قائم ہیں۔

دفاع: ۷۳-۱۹۷۲ء میں بری فوج کی تعداد ۵۳ ہزار تھی ہوائی فوج کی تعداد چار ہزار اور بحری فوج کی ۳۰۰۰۔ روس کی امداد سے مسلح افواج کی توسیع اور جدید خطوط پر ان کی تنظیم کا سلسلہ جاری ہے

انڈونیشیا

براعظم ایشیا کے جنوب مشرق اور آسٹریلیا کے شمال میں تین ہزار چھوٹے بڑے جزائر پر مشتمل عالم اسلام کا سب سے بڑا (آبادی تقریباً ۱۲ کروڑ نفوس) ملک انڈونیشیا واقع ہے۔

ان تین ہزار جزائر میں سب سے بڑا جزیرہ جاوا ہے جس کی آبادی ۵ کروڑ کے لگ بھگ ہے انڈونیشیا میں موسم قدرے گرم رہتا ہے کیونکہ خط استوا بیشتر جزائر سے گذرتا ہے بعض جزائر ایسے بھی ہیں جہاں وقفوں کے بعد مسلسل بارش ہوتی رہتی ہے مجموعی طور پر بہار اور خزاں کا موسم پورے ملک میں نہیں آتا۔ گرم مسالے، چاول جوار، مونگ پھلی، تمباکو، چائے، کوکو، ناریل، کپاس، نیشکر وغیرہ وافر مقدار میں پیدا ہوتی ہیں اس کے علاوہ انڈونیشیا قلعی کوبایہ، پٹرول، قدرتی گیس، سونا اور تانبہ وغیرہ جیسی دھاتوں سے بھی مالا مال ہے۔

مختصر تاریخ: ۱۵۰۴ء میں پرتگالیوں نے جزائر انڈونیشیا (جزائر شرق الہند) پر قبضہ کیا۔ پرتگالیوں کے بعد ولندیزی ایک طویل مدت تک (دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں چند برس جاپانی انڈونیشیا پر قابض رہے)

اور آخر: ۳۰۰ سال کی غلامی کے بعد ۱۹۴۹ء میں بین الاقوامی ادارے (یو این او) کی مداخلت پر انڈونیشی عوام آزادی سے ہم کنار ہوتے اور ۲۷ دسمبر ۱۹۴۹ء کو وفاقی جمہوریہ انڈونیشیا کے قیام کا اعلان کیا گیا یہ وفاق ۱۶ ریاستوں اور خود مختار علاقوں پر مشتمل تھا۔ انڈونیشیا کی تحریک آزادی میں حاجی احمد سعید ڈاکٹر سوکیمان ڈاکٹر سوئیکارنو شہریر۔ ڈاکٹر ناصر اور ڈاکٹر حتی وغیرہ نے سب سے اہم رول ادا کیا آزادی کے فوراً بعد ۱۹۵۰ء میں ملک کو دستور کیا گیا دستور میں پارلیمنٹ کے دو ایوان (سینٹ ۳۲ ارکان) اور ایوان نمائندگان (۱۵۰ ارکان) بنانے کا فیصلہ کیا گیا دستور کے تحت سوئیکارنو صدر اور ڈاکٹر ناصر کو وزیر اعظم بنایا گیا۔

وزارت میں ڈاکٹر سوکیمان کی ماشومی پارٹی اور سوئیکارنو کی نیشنلسٹ پارٹی کو موثر نمائندگی دی گئی۔

۱۹۵۵ء میں انڈونیشیا کی کابینہ میں ایک اہم تبدیلی لائی گئی ڈاکٹر علی ساسترو بجو جو کی جگہ ماشومی پارٹی کے لیڈر برہان الدین ہراہاپ کو وزیر اعظم بنایا گیا ڈاکٹر علی ساسترو کمیونسٹوں کا ہم خیال تھا اور اس کا وزیر دفاع فوج میں ایک پروگرام کے تحت کمیونسٹوں کو بھرتی کر رہا تھا یہ بات عوامی حلقوں میں باعث تشویش تھی۔ نئے وزیر اعظم عبدالحارث نوسوتیان کو فوج کا کمانڈر انچیف مقرر کیا۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۵۵ء کو ایوان نمائندگان کے انتخابات منعقد ہوئے انڈونیشیا کی چار بڑی جماعتوں ماشومی کمیونسٹ پارٹی نیشنلسٹ پارٹی اور نہضۃ العلماء کو زیادہ ووٹ ملے انتخابات کے نتائج کے طور پر برہان الدین ہراہاپ مستعفی ہو گئے ان کی جگہ ڈاکٹر علی ساسترو بجو جو نے مخلوط وزارت تشکیل دی۔ اسی سال افریقی ایشیائی ممالک کی کانفرنس بانڈونگ میں منعقد ہوئی اس لحاظ سے یہ بڑی اہم کانفرنس تھی کہ چین نے اس کانفرنس کے بعد جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک میں اہم رول ادا کرنا شروع کر دیا۔ ۱۹۵۶ء میں سماٹرا میں مرکزی حکومت کے خلاف بغاوت ہو گئی بنتیجہ مخلوط وزارت ٹوٹ گئی۔ ۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۵۷ء تک انڈونیشیا میں سات وزارتیں تشکیل دی گئیں لیکن کوئی حکومت بھی مستحکم ثابت نہیں ہوتی۔ یہ دور انڈونیشیا کی تاریخ میں برل پریڈ کہلاتا ہے سوئیکارنو نے انتخابات کی جگہ مارشل لاء لگا دیا مسلسل دو سال تک سوئیکارنو اسی کوشش میں رہا کہ کسی طرح وہ انڈونیشیا کا مرد آہن بن جائے اور آخرکار اپریل ۱۹۵۹ء میں سوئیکارنو نے ۱۹۴۵ء کا دستور زمانہ دستور نافذ کرنے کا پروگرام بنایا اور مجلس دستور ساز سے سوئیکارنو کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تو سوئیکارنو نے ایک صدارتی فرمان کی رو سے ۱۹۵۰ء کا دستور منسوخ کر دیا اور اسی کی جگہ زبردستی ۱۹۴۵ء کا دستور ٹھونس دیا یاد رہے کہ اس دستور کی بنیاد سوئیکارنو کے پنج شیل پروگرام پر تھی یعنی (۱) خدائے واحد پر ایمان (۲) قومیت کی ترقی (۳) بین الاقوامیت (۴) نمائندہ حکومت (۵) معاشرتی عدل۔ اس کے علاوہ یہ اعلان بھی کیا گیا کہ مشاورتی مجلس عوام اور عارضی مشاورتی مجلس جلد از جلد قائم

کی جائیں گی۔ ۱۹۶۰ء میں سوئیکارنو نے ایوان نمائندگان کو ختم کر دیا ۱۹۶۳ء میں مشاورتی اسمبلی نے سوئیکارنو کو تاحیات صدر بنانے کا اعلان کر دیا اس سال نیوگنی جمہوریہ انڈونیشیا میں شامل ہوا ۱۹۶۳ء کا سارا عرصہ ملک میں بے یقینی کی حالت رہی اور ایسا دکھائی دیتا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ ہونے والا ہے ۱۹۶۵ء میں انڈونیشیا خانہ جنگی کا شکار ہو گیا۔ انڈونیشی بری فوج کے ایک جرنل آئیڈرٹ (آئیڈرٹ بائیں بازو کا انتہا پسند کمیونسٹ تھا۔ اس کے چین کے ساتھ خفیہ تعلقات تھے انقلاب سے چند روز پہلے آئیڈٹ چین کا دورہ کر کے آیا تھا) نے بغاوت کر دی۔ اسلامی ذہن رکھنے والے تمام جرنیلوں کو انتہائی بے دردی سے شہید کر دیا صرف جنرل عبدالحارث ناسوتیان کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا اس نے اپنے حمایتی فوجیوں کی مدد سے باغیوں کی سرکوبی کی۔ یہ انقلاب ایک مدت تک جاری رہا ایک محتاط اندازے کے مطابق ان خونی انقلابوں میں ۱۲ لاکھ کے قریب افراد مارے گئے۔ تحقیقات سے پتہ چلا کہ سوئیکارنو اور اس کا وزیر خارجہ سوباندریو بھی اس سازش میں شریک تھے اور مقصد یہ تھا کہ کسی طرح افواج کو اسلام پسند عناصر سے پاک کیا جائے عوام کے مطالبہ پر سوئیکارنو اور اس کے وزیر خارجہ کو نظر بند کر دیا گیا ملک کا نیا صدر جنرل سوہارتو بنا امید یہ تھی کہ حالات کے سنورتے ہی ملک میں سیاسی سرگرمیاں شروع کر دی جائیں گی نئی حکومت بھی مسلسل ایسے اعلان کرتی رہی ہے لیکن ۱۹۶۵ء سے اب تک ملک میں فرد واحد کی آمریت قائم ہے جمہوری ادارے نہ ہونے کے برابر ہیں اگرچہ عرصہ ہوا بغاوت ختم ہو گئی تھی لیکن بغاوت کے اثرات ابھی تک باقی ہیں ملک کی بری طرح تباہ ہو چکی ہے سیاسی استحکام برائے نام ہے لوگ ۹ سال کی مسلسل گھٹن سے الگ پریشان ہیں۔

سیاسی جماعتیں (مختصر تعارف)

انڈونیشیا کے تین سو سالہ دور غلامی میں متعدد جماعتوں نے آزادی کے علم کو بلند کیا مثلاً ماشومی پارٹی شرکت اسلام، نہضۃ العلماء، بے پندار پارلیان، جمعیۃ محمدیہ، قومی پارٹی اور کمیونسٹ پارٹی وغیرہ لیکن ذیل میں تین اہم جماعتوں ماشومی پارٹی، کمیونسٹ پارٹی اور قومی پارٹی کا مختصر تعارف کرایا جا رہا ہے۔

مجلس شوریٰ مسلمی انڈونیشیا (ماشومی پارٹی)

۵ نومبر ۱۹۴۵ء میں ڈاکٹر سوکیمان نے مجلس شوریٰ مسلمی انڈونیشیا تشکیل دی پارٹی کی قیادت کے لئے ایک مرکزی کونسل اور سیاسی امور سے نمٹنے کے لئے پارلیمنٹری کونسل قائم کی گئی۔ اس کا صدر ڈاکٹر ناصر کو بنایا گیا ماشومی کا مقصد لوگوں کی زندگیوں کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا اور ولندیزیوں سے ملک کو آزاد کر کے ایک جمہوری اسلامی مملکت کے قیام کے لئے کوشش کرنا ماشومی پارٹی کیونکہ انڈونیشیا میں اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے لئے کوشش کر رہی ہے۔ اس لئے بہت جلدی انڈونیشیا کے سیاسی میدان پر چھا گئی اور عوام کی ہر دلعزیز جماعت ہو گئی۔ جماعت کی ہر دلعزیزی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ولندیزیوں اور جاپانیوں کے ساتھ سیاسی مذاکرات اتنی دیر منعقد نہیں ہوتے تھے جتنی دیر ماشومی کے لیڈروں کو اعتماد میں نہیں لیا جاتا تھا۔ اس کی کامیابی کا اس بات سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بہت جلد ہی ملک کی دوسری اسلام پسند جماعتیں مثلاً شرکت اسلام بے پاندار پارلیان شرکت اسلام کبھرو، جمعیۃ محمدیہ اور نہضۃ العلماء وغیرہ ماشومی میں شامل ہو گئیں۔ ماشومی، ۱۹۵۰ء تک متعدد وزارتوں میں شریک رہی۔

۱۹۶۵ء کی بغاوت کو ناکام بنانے میں ماشومی پارٹی کے کارکنوں اور لیڈروں کی خدمات کا اعتراف خود انقلابی حکومت کر چکی ہے۔ یہ جماعت، آج کل بھی انڈونیشی عوام پر گہرے اثرات رکھتی ہے۔ جماعت کے کارکن اپنے آپ کو اسلام کی دعوت اور تبلیغ کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ تیرہویں صدی میں جزائر شرق الہند کے باشندوں نے اسلام قبول کیا

کمیونسٹ پارٹی: انڈونیشیا میں کمیونسٹوں نے جنگ عظیم اول کے دنوں میں کام کی ابتدا کی۔ ریندرک اسینولٹ اشتراکی عوامی پارٹی بنا کر خود اس کا صدر بنا یہ وہ زمانہ تھا جب انڈونیشیا کے سیاسی میدان پر حاجی عمر سعید بانی شرکت اسلام پارٹی (۱۹۱۳ء) آخوس سالم ربانی بے پندار پارلیان ۱۹۲۸ء احمد دحلان بانی جمعیۃ المحمدیہ ۱۹۱۲ء) اور شیخ عبدالوہاب بانی (نہضۃ العلماء) ۱۹۲۶ء جیسی شخصیتیں انڈونیشی عوام پر گہرے اثرات رکھتی تھیں۔ خاص طور پر شرکت اسلام کے کارکن اس وقت انڈونیشیا کے سیاسی میدان پر چھائے ہوئے تھے اور کمیونسٹوں کی بات سننے کے لئے کوئی تیار نہ تھا پارٹی کے لیڈر ریندرک اسینولٹ نے جب یہ دیکھا کہ کامیابی ممکن نہیں ہے تو فوراً ہی پارٹی کا اجلاس بلا کر فیصلہ کیا کہ کامیاب اشتراکی انقلاب کے لئے ضروری ہے کہ کچھ لوگ شرکت اسلام پارٹی میں اپنے لئے جگہ پیدا کریں۔ چنانچہ دوران جنگ کمیونسٹوں کی ایک کثیر تعداد شرکت اسلام میں داخل ہوئی۔

۱۹۱۹ء میں اسینولٹ ہالینڈ واپس چلا گیا۔ اور کمیونسٹ پارٹی کی قیادت سیماعون کے پاس گئی۔ اس جماعت کے دوسرے مشہور لیڈر وارسونو۔ ڈیکیہ۔ تان ملاکا اور محمد یوسف وغیرہ تھے ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۲۸ء تک کمیونسٹوں نے آزادی جنگ کی بجائے متعدد دفعہ اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اس کے لیڈروں نے انقلاب لانے کے لئے کئی دفعہ روس کا دورہ بھی کیا لیکن انہیں کامیابی نہ ہوئی اس کی وجہ عوام کی مذہب سے وابستگی تھی ۱۹۴۵ء میں اس کا نام انڈونیشی کمیونسٹ پارٹی رکھا گیا ۱۹۴۸ء میں کمیونسٹ پارٹی نے مسلح بغاوت کر دی لیکن ناکام ہوئے۔ پارٹی کے متعدد لیڈروں کو فوج نے گولی مار کر ہلاک کر دیا ان میں تان ملاکا بھی شامل تھا۔ آزادی کے بعد کمیونسٹوں نے چینی طرز پر پارٹی کو منظم کرنا شروع کیا۔ ۱۹۵۲ء کے انتخابات میں سوئیکارنو کی قومی پارٹی اور کمیونسٹ پارٹی نے آپس میں اتحاد کر لیا۔ ۱۹۵۴ء میں پارٹی نے سوئیکارنو کے پنچ شیلا پروگرام کی حمایت میں مظاہرے کئے۔ ۱۹۵۵ء کے انتخابات میں کمیونسٹ چوتھے نمبر پر آئے، یہ ان کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ ۱۹۵۵ء کے بعد ان کا رسوخ افواج تک پہنچنا شروع ہو گیا تھا۔ اور کمیونسٹ لیڈروں نے چین کے دورے کرنا شروع کر دیئے ۱۹۶۲ء تک کمیونسٹ اس قابل ہو چکے تھے کہ کسی بھی وقت ملک میں بغاوت کر سکتے تھے۔ ۱۹۶۴ء میں پارٹی کی تعداد ۳۵ لاکھ تک پہنچ گئی اور یہ غیر کمیونسٹ دنیا کی سب سے بڑی کمیونسٹ پارٹی تھی لیکن ان کی اندرونی حالت بھیڑوں کے اسی ریوڑ کی سی تھی جس پر قابو پانے کے لئے گڈریئے کو بار بار مختلف سمتوں میں جانا پڑتا تھا یہی وجہ تھی کہ کمیونسٹ مسلح بغاوت سے گھبراتے تھے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں جنرل آئیڈٹ کی سرکوبی میں کمیونسٹوں نے انقلاب بپا کر دیا انقلاب کے بعد سے آج تک کمیونسٹ پارٹی اور کمیونسٹوں کی سرگرمیوں پر پابندی لگی ہوئی ہے۔

انڈونیشی قومی پارٹی: احمد سوئیکارنو نے ۱۹۲۷ء میں قومی پارٹی کی تشکیل دی۔ پارٹی کا مقصد ولندیزی سامراج سے نجات حاصل کرنا تھا۔ لیکن جب پارٹی غیر معمولی طور پر کامیاب ہونا شروع ہوئی پارٹی کا پروگرام اور بنیاد پنچ شیلا کو ٹھہرایا گیا ۱۹۲۸ء میں قومی پارٹی کا پہلا سالانہ اجلاس منعقد ہوا اجلاس میں پارٹی کا جھنڈا لہرایا گیا۔ یہی جھنڈا بعد میں انڈونیشیا جمہوریہ کا جھنڈا بنا دو سرخ اور سفید ۱۹۲۹ء میں سوئیکارنو اور اس کی پارٹی کے کئی لیڈر خلاف حکومت سرگرمیوں کے الزام میں گرفتار کر لئے گئے ۱۹۳۳ء میں پارٹی کے بعد سوئیکارنو مسلسل آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد میں لگا رہا اور متعدد بار جیل بھی گیا۔ تحریک آزادی میں سوئیکارنو کا کمال یہ تھا کہ اس نے اپنی پارٹی کا الگ تشخص برقرار رکھا

جماعتوں کی طرح قومی پارٹی کو ضم نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ ولندیزیوں کے ساتھ مذاکرات میں قومی پارٹی کے لیڈروں کو برابر اعتماد میں لیا جاتا رہا۔ سوئیکارنو کے جیل خانے کے بعد پارٹی کی سرگرمیاں ایک عرصہ تک معطل رہی۔ ۱۹۴۵ء میں سوئیکارنو نے دوبارہ اسی جماعت کی تجدید کی۔ اس کے لیڈروں میں ڈاکٹر غنی، ڈاکٹر جی سارا تو وغیرہ۔ ۱۹۵۳ء میں پارٹی کی چھٹی سالانہ کانفرنس منعقد ہوئی۔

۱۹۵۵ء کے انتخابات میں قومی پارٹی کے لیڈر علی سارترد جو جو نے وزارت بنائی۔

۱۹۵۶ء میں جب قومی پارٹی کے خلاف بغاوت ہوگئی تو، ۱۹۵۷ء میں سوئیکارنو نے ملک میں مارشل لا لگا دیا اور یہ کوشش کرنا شروع کی کہ کسی طرح ملک پر صرف ایک پارٹی کی حکومت قائم ہو جائے۔ چنانچہ مختلف حیلوں بہانوں سے سوئیکارنو اپنا مقصد حاصل کرتا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ انڈونیشیا ۱۹۶۵ء میں ایک بہت بڑی تباہی سے دوچار ہوا ہے۔ اس تباہی کی ذمہ داری قومی پارٹی اور سوئیکارنو پر ڈالی جا سکتی ہے۔ آج کل قومی پارٹی کی سرگرمیاں بالکل مفقود ہیں۔

ایران ۔

محل وقوع ۔ سلطنت ایران جنوبی مغربی ایشیا میں جزیرہ نمائے عرب کے شمال مشرق میں واقع ہے اس کے شمال میں روس اور بحیرۂ کیسپین مشرق میں افغانستان و پاکستان جنوب میں خلیج فارس و امان اور مغرب میں عراق اور ترکی واقع ہیں۔

رقبہ ۔ اس کا کل رقبہ ۶۳۶۲۹۶ مربع میل ہے یعنی پاکستان کے کل رقبہ کا تقریباً دوگنا۔

آبادی ایران کی آبادی تین کروڑ ۲۰ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔

دارالحکومت ۔ تہران

زبان ۔ فارسی ۔ کروش

مذہب ۔ یہاں کی اکثریت شیعہ مسلمانوں کی ہے مذاہب میں عیسائیوں کا تناسب ۰٫۶ فیصد اور یہودیوں کا تناسب ۰٫۳۵ فیصد ہے۔

اہم پہاڑی سلسلے ۔ کوہ البرز، کوہ زاگوس۔ کوہ البرز کی سب سے اونچی چوٹی ریما وند ہے جو سطح سمندر سے ۱۸۹۳۴ فٹ بلند ہے۔

آب و ہوا ۔ ایران کا شمالی علاقہ بشمول تہران بہ نسبت جنوبی سرد ہے۔ دسمبر اور جنوری میں بارش کثرت سے ہوتی ہے اور کہیں کہیں برف بھی پڑتی ہے۔ جنوبی علاقہ میں مئی تا دسمبر سخت گرمی پڑتی ہے اور نمی کے ساتھ ساتھ گرد بھی اڑتی ہے۔ اکتوبر تا مئی سیاحوں کے لئے موزوں مہینے ہیں۔

اہم زرعی پیداوار ۔ گندم، تمباکو، جو، مکئی، کپاس، گنا، چاول، افیون، جوار، باجرا۔ پھلوں میں خوبانی آڑو، انجیر، آلوچہ، سیب، ناشپاتی، انار، خربوزہ، سنگترہ، انگور، کھجور، بادام اور پستہ۔ خام تانبہ، سیسہ جست مینگانیز، کومائیٹ، گندھک زہر، فیرس اکسائیڈ اور خام میکا بھی نکالا جاتا ہے۔

صنعتیں ۔ چینی چائے، سوتی کپڑا، سیمنٹ سگریٹ اور قالین سازی۔

مختصر تاریخ ۔ ۲۰۰۰ ق م میں آرین ۔ میدس اور پارسی نسل کے لوگ یہاں آکر آباد ہوتے، ۵۵۰ ق م میں کوروش دوم نے بیلوتیا، شام اور ایشیائے کوچک کو ملا کر سلطنت ایران کی بنیاد رکھی۔ ازاں بعد اس میں مصر، تھریس اور مقدونیہ کے علاقے بھی شامل کر لئے گئے ۳۳۴ تا ۳۲۸ ق م کے مابین سکندر اعظم نے اسے فتح کر کے سیلوکس اور اس کے حواریوں کے سپرد کر دیا تیسری صدی قبل مسیح میں پارتھیا حکمرانوں نے اس پر قبضہ کر لیا ۲۲۶ء میں ساسانی حکومت کے بانی اردشیر نے اس پر قبضہ کیا۔ ۱۰۳۷ تا ۱۰۵۵ء سلجوق ترک ایران پر حکومت کرتے رہے، ۱۲ ویں صدی عیسوی میں منگول ایران کے تخت پر جلوہ افروز ہوتے ۱۳۳۴ء میں ایران کی تقسیم ہوئی۔ ۱۳۸۰ء میں تیمور لنگ یہاں کا حکمران بنا۔ ۱۴۹۹ء تا ۱۷۳۶ء میں صفوی خاندان برسر اقتدار آیا پھر اسے بہادر جنگی جرنیل نادر شاہ نے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ ۱۷۹۴ء تا ۱۹۲۵ء قاچار بادشاہ یہاں حکومت کرتے رہے۔ اس دوران جنگ عظیم اول شروع ہوگئی۔ روس اور برطانیہ نے ایران کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب میں روسی حکومت نے شمالی ایران پر اپنی عملداری ختم کرنے اعلان کیا انگریزوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تہران پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا ۱۹۲۱ء میں کاسک ڈویژن کے کمانڈر رضا خان نے تین ہزار فوجیوں کی معیت میں تہران پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا اور اس کے کچھ عرصہ بعد یعنی ۱۹۲۵ء میں رضا شاہ پہلوی کو ایران کا حکمران تسلیم کر لیا گیا رضا شاہ پہلوی کے عہد میں ایران نے بڑی ترقی کی۔ انھوں نے عورتوں کو مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کے لئے پردے کا رواج ختم کیا، ۵ ستمبر ۱۹۴۱ء کو رضا شاہ پہلوی اپنے بیٹے محمد رضا شاہ پہلوی کے حق میں دست بردار ہو گئے۔ محمد رضا شاہ پہلوی کے عہد میں ایران ایک ترقی یافتہ ملک بن گیا۔ ان ہی کے عہد میں روس سے آذربائیجان حاصل کیا گیا اور ان ہی کے عہد میں ایران کی تیل کی صنعت کو قومی ملکیت میں لیا گیا۔ سفید انقلاب بھی شاہ ایران کے اہم کارناموں میں سے ایک ہے۔ ایران سینٹو، کولمبو پلان اسلامی سیکریٹریٹ کا رکن ہے۔

برونئی

ملک کا نام ۔ برونئی

دارالحکومت ۔ برونئی (شہر و بندرگاہ)

سربراہ مملکت ۔ حسن خیرالدین (سلطان)

سرکاری زبان ۔ انگریزی

رقبہ ۔ ۲۲۶-۳ مربع میل

یوم آزادی ۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۵۹ء

آبادی ۔ ۱۸۰۰۰۰ نفوس

سکے ۔ ۱ سین ایک ملائی ڈالر

مسلم ۵٫۰ فیصد ۔ ۹۳٫۵ مسلمان

خاص برآمدات ۔ ربڑ، تیل، لکڑی

جنوب مشرقی ایشیا میں اب صرف ایک بادشاہ رہ گیا ہے اور وہ ہے سلطان برونئی۔ جو اپنے خاندان کے انتیسویں سلطان ہیں۔ ملائشیا کے درمیان جزیرہ بورنیو کے ساحل پر ایک چھوٹی سی بادشاہت ہے۔

برونئی کی معلوم تاریخ کا آغاز ابتدائی سولہویں صدی میں ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں یہ مملکت تمام جزیرہ بورنیو اور مجمع الجزائر سالے پر مشتمل تھی۔ انیسویں صدی عیسوی میں ولندیزی اور انگریزی سامراجی طاقتوں نے اس کے وسیع علاقہ پر قبضہ کر لیا تو یہ سلطنت سمٹ کر بہت چھوٹی رہ گئی پھر بھی صبر نہ آیا اور ۱۸۸۰ء میں اس پر اپنی سیادت مسلط کر دی ۲۸ ستمبر ۱۹۵۹ء کو اس سلطنت کو اندرونی طور پر آزادی نصیب ہوئی۔

برونئی اسلامی سلطنت کے موجودہ سلطان جناب حسن خیرالدین کی عمر ۲۷ سال ہے، ان کے والد سلطان عمر علی سیف الدین اکتوبر ۱۹۶۷ء میں تخت سے دست بردار ہو گئے تھے لیکن دست برداری کے باوجود برونئی کی محترم و مقتدر ترین شخصیت ہیں۔ موجودہ سلطان پنج وقتہ نمازی ہیں اس مملکت کے قانون کے مطابق نماز جمعہ کے لئے جامع مسجد میں نہ آنا جرم ہے سلطان برونئی اس پر بھی آمادہ ہیں کہ کسی وقت یہاں جمہوری

حکومت تشکیل دی جاتی ہے۔ برونئی کی معیشت کی بنیاد تیل کی پیداوار ہے جس کی پہلی کھدائی ۱۹۲۹ء میں ہوئی اس کے علاوہ ربڑ، زراعت، ماہی گیری اور جنگلی پیداوار پر بھی معیشت کا دارومدار ہے برونئی میں ۷۰۹ میل لمبی سڑکیں اور ایک مختصر ریلوے لائن ہے مئی ۱۹۵۷ء سے برونئی براڈکاسٹنگ سروس سے نشریات بھی شروع ہو گئی ہیں سرکاری اسپتال اور دواخانے عوام کی صحت کی دیکھ بھال مفت کرتے ہیں یہاں تنخواہیں ایشیا کے ہر ملک سے زیادہ ہیں اور کوئی ٹیکس نہیں ہے۔ شراب پر پابندی ہے یہاں جنوب مشرقی ایشیا کا سب سے بڑا ہوائی رن وے زیر تعمیر ہے۔

پاکستان

بنگلہ دیش کی ایک الگ ریاست وجود میں آنے کے بعد پاکستان کا رقبہ ۳۱۰۴۰۳ مربع میل رہ گیا ہے اور آبادی چھ کروڑ کے قریب ہے۔

برآمدات۔ روئی، کھالیں، نمک، تیل نکالنے کے لئے بیج، اون، ریشم

معدنیات۔ پٹرولیم، کرومائیٹ، نمک، لوہا، چونے کا پتھر، کوئلہ، جپسم اور سوئی گیس وغیرہ۔

تقسیم ہند کے بعد محمد علی جناح پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو اسٹیٹ آف پاکستان کا افتتاح کیا اور ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو محمد علی جناح نے کراچی میں وفات پائی۔ محمد علی جناح کی وفات کے بعد خواجہ ناظم الدین نے دوسرے گورنر جنرل کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا یکم اکتوبر ۱۹۴۸ء کو پاکستان نے اپنے نوٹ جاری کئے ۱۹۴۹ء میں پاکستان نے "طارق اور ٹیپو سلطان"، دو تباہ کن جہاز انگلستان سے خریدے ۱۹۴۸ء میں رسال پور فضائیہ کی پہلی تربیت گاہ قائم کی گئی ۲۵ نومبر ۱۹۴۹ء کو مشرقی پاکستان میں بھی فضائیہ کا ہیڈ کوارٹر قائم کیا گیا۔ ۱۹۵۰ء میں صوبہ سرحد میں پشاور یونیورسٹی قائم کی گئی اسی سال کراچی میں نیشنل میوزیم قائم کیا گیا ۱۹۵۱ء میں تمام بالغ مردوں اور عورتوں کو رائے دہی کا حق دے دیا گیا۔

دستوری نشو و نما: تقسیم ہند کے فوراً بعد صوبائی مجالس قانون ساز نے دستور ساز اسمبلی کا انتخاب کیا قائداعظم محمد علی جناح مجلس دستور ساز کے پہلے صدر منتخب ہوئے اور یہ اعلان کیا کہ جتنی دیر ملک کے لئے نیا دستور تیار نہیں ہوتا اتنی دیر ۱۹۳۵ء کے دستور سے کام چلایا جائے گا۔ یہ اور درمیانی مدت میں دستور ساز اسمبلی مرکزی مجلس قانون ساز کا کام بھی سرانجام دے گی گورنر جنرل محمد علی جناح کی زندگی ہی میں ملک میں سیاسی اور مذہبی جماعتوں نے اسلامی دستور کی مہم شروع کر دی۔ وزیراعظم لیاقت علی خاں کے زمانہ میں یہ مہم شدت شدت اختیار کر گئی ملک بھر کے علماء کو گرفتار کر لیا لیکن اس کے باوجود بھی یہ مہم کامیابی سے جاری رہی اور آخرکار مجلس دستور ساز نے مارچ ۱۹۴۹ء میں قرارداد مقاصد منظور کی یہ قرارداد پاکستان بھر کے علماء کے اسی نکات کو سامنے رکھ کر تیار کی گئی اسی رو سے یہ اعلان کیا گیا کہ۔

"چونکہ اللہ تعالٰی ہی کل کائنات کا بلا شرکت غیرے حاکم مطلق ہے اور اس نے جمہور کی وساطت سے مملکت پاکستان کو اختیار حکمرانی اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لئے نیابت عطا فرمائے اور چونکہ یہ اختیار حکمرانی ایک مقدس امانت ہے لہٰذا جمہور پاکستان کی نمائندہ مجلس دستور ساز فیصلہ کرتی ہے کہ آزاد و مختار مملکت پاکستان کے لئے ایک دستور مرتب کیا جائے جس کی رو سے مملکت کے جملہ حقوق اختیارات حکمرانی جمہور کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعہ استعمال کرے۔

جس میں اصول جمہوریت، حریت، مساوات رواداری اور عدل عمرانی کو جس طرح سے اسلام نے ان کی تشریح کی ہے پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے جس کی رو سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق جو قرآن مجید اور سنت رسولؐ میں متعین ہیں ترتیب دے سکیں۔

قرارداد مقاصد پاس ہونے کے بعد بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے ۲۸ ستمبر ۵۰ء کو اپنی رپورٹ خواجہ ناظم الدین کو پیش کر دی۔ دستور سازی میں رکاوٹ ڈالنے کے لئے ۱۹۵۲ء میں پنجاب میں نئی قادیانی ہنگامے شروع ہو گئے ان ہنگاموں کو بہانہ بنا کر پنجاب میں مارشل لاء لگا دیا گیا مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا عبدالستار خاں نیازی کو سزائے موت سنائی گئی لیکن اس پر عمل نہ ہو سکا خواجہ ناظم الدین ان ہنگاموں کے نتیجہ کے طور پر مستعفی ہو گئے اکتوبر ۵۳ء میں آخری رپورٹ و بوگرا رپورٹ پیش کی گئی اکتوبر ۵۴ء میں گورنر جنرل غلام محمد نے ______ دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا دستور سازی میں رخنہ ڈالنے کے لئے یہ ایک بہت بڑی سازش تھی، مولوی تمیز الدین خاں نے غلام محمد ______ کا فوراً نوٹس لیا اور اس کے احکامات کو عدالت میں چیلنج کیا اور کامیابی حاصل کی۔ غلام محمد نے فیڈرل کورٹ میں اس فیصلہ کے خلاف اپیل دائر کی جسٹس محمد منیر نے فیصلہ غلام محمد کے حق میں دیا یہ دن پاکستان کی دستوری تاریخ کا سیاہ ترین دن تھا۔ ۱۹۵۵ء میں چودھری محمد علی کی وزارت میں ون یونٹ کے قیام کا اعلان کیا گیا مغربی پاکستان کے اتحاد کے بعد پھر دستور سازی کا کام شروع ہو گیا ۱۹ فروری ۵۶ء کو دستور کا ابتدائی مسودہ منظور ہوا سہروردی کی عوامی لیگ کی مخالفت کے باوجود ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو دستور منظور ہوا یہ پاکستان کا پہلا اسلامی جمہوری دستور تھا فروری ۵۹ء میں ملک میں عام انتخابات منعقد کرانے کا اعلان کیا گیا لیکن انتخابات سے پہلے ہی کمانڈر انچیف ایوب خاں نے مارشل لاء لگا دیا وزیراعظم ملک فیروز خاں نون اور صدر سکندر مرزا کو ان کے عہدوں سے برطرف کر دیا گیا۔

اکتوبر ۵۸ء سے ۱۹۶۲ء تک پاکستان میں مارشل لاء کا سیاہ قانون نافذ رہا عوام کے مطالبے پر ۱۹۶۲ء میں فیلڈ مارشل نے سیاسی جماعتیں بنانے کی اجازت دی اور خود مسلم لیگ (کنونشن) کا صدر بنا اسی سال صدر نے ملک پر ایک نیا دستور نافذ کیا یہ دستور ساز کمیشن کے ارکان کی سفارشات کو بالکل نظر انداز کر کے نافذ کیا گیا اس کے تحت ۱۹۶۴ء میں انتخابات کا اعلان کیا گیا۔ حزب اختلاف نے ایوب خاں کے مقابلہ میں محترمہ فاطمہ جناح کو انتخاب لڑانے کا فیصلہ کیا انتخاب میں ایوب حکومت نے دھونس اور دھاندلی سے کام لے کر متحدہ حزب اختلاف کی واحد امیدوار کو شکست دی۔

ہند پاک جھگڑوں کو سلجھانے کے لئے روسی حکومت نے اپنی خدمات پیش کیں چنانچہ جنوری ۶۶ء میں انہیں کوششوں کے صلہ میں اعلان تاشقند پر دستخط ہوئے۔

۱۹۶۵ء میں ایوب حکومت کے خلاف ہنگامے شروع ہو گئے صدر ایوب نے اسی دوران اپوزیشن لیڈروں سے بات چیت جاری رکھی لیکن اچانک ایک دن ایوب خاں نے اقتدار فوج کے کمانڈر انچیف کے حوالے کر کے خود صدارت سے الگ ہو گئے ملک میں پھر مارشل لاء نافذ ہو گیا یحییٰ خاں نے ۱۹۷۰ء میں عام انتخابات کرائے عوامی لیگ نے سب سے زیادہ ووٹ حاصل کئے لیکن یحییٰ خاں نے اقتدار منتقل کرنے میں پس و پیش کرتا رہا ادھر پاکستان پیپلز پارٹی یحییٰ خاں پر دباؤ ڈالتی رہی کہ اقتدار منتقل نہ کیا جائے اسی کے نتیجہ میں ______ پاکستان کے دونوں بازو الگ ہو گئے اور بنگلہ دیش بنا۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد یحییٰ خاں کو اقتدار سے الگ کر دیا گیا اس کی جگہ ذوالفقار علی بھٹو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر بنے ۱۹۷۱ء سے لے کر ۱۹۷۳ء تک بھارت اور پاکستان میں جنگی قیدیوں کی واپسی اور ہندوستان کے ساتھ حالات معمول پر لانے کے لئے مذاکرات ہوتے رہے آخرکار قیدیوں کی واپسی شروع

ہوگئی اور اپریل ۱۹۷۴ء تک تمام جنگی قیدی ہندوستان سے واپس آگئے بھٹو صاحب نے پہلے مارشل لا ختم کیا پھر ملک میں ایک جمہوری دستور نافذ کیا دستور کے تحت بھٹو صاحب وزیر اعظم منتخب ہوئے اور پھر ۱۹۷۳ء میں ایک نیا دستور نافذ کیا گیا۔

فروری ۱۹۷۴ء میں لاہور میں اسلامی سربراہ کانفرنس منعقد ہوئی اور اس کانفرنس کے موقع پر پاکستان نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا جون ۱۹۷۴ء میں ملک میں بڑے پیمانے پر اینٹی قادیانی ہنگامے شروع ہوئے اپوزیشن نے ۱۹۵۳ء کی طرح حکومت سے مطالبہ کیا کہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دیا جائے ان ہنگاموں کی وجہ یہ تھی کہ قادیانیوں نے مسلمان طلبا (کی ایک) پارٹی پر جب کہ وہ ربوہ سے گاڑی میں گزر رہی تھی مسلح حملہ کیا جس سے کافی طلبا شدید زخمی ہوئے۔ چنانچہ پاکستان نے ان کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا ہے۔

ترکی،

ملک کا نام — ترکی جمہوریہ

سرکاری زبان — ترکی

سربراہ مملکت — فائری کردترک (صدر)

خاص برآمدات۔ تمباکو، کپاس، اون، لوہا۔

رقبہ۔ ۲۸۲ د ا ۔ ۳ مربع میل

یوم جمہوریہ۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۳ء

آبادی۔ ...ر۔ ر۴۸ م نفوس

رکن اقوام متحدہ۔ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۵ء

مسلم ۹۸ فیصد... ر۲ د ا۴ ۳ مسلمان سکے۔ ..ا قرش۔ ایک لیرا

دارالحکومت۔ انقرہ آبادی ۹ لاکھ ترکی عوام پاکستانی باشندوں سے بڑی گرم جوشی اور محبت سے پیش آتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تحریک خلافت سے لے کر قبرص کے مسئلہ تک ان کو اپنے ساتھ محسوس کرتے ہیں علاوہ ازیں ترک کے معنی بہادر کے ہیں۔

ترکی میں سلطنت عثمانیہ کی بنیاد عثمانی ترکوں نے ۱۲۹۹ء میں رکھی جب اس سلطنت کو عروج حاصل ہوا تو ایشیا افریقہ اور یورپ تینوں براعظموں میں ڈنکا بجنے لگا اور ملت اسلامیہ کی خلافت کا اعزاز بھی اسے حاصل ہوا اور یہ حکومت مسلمانوں کی عظمت و وقار کی علمبردار بن گئی لیکن چھ سو سال سے زائد عرصہ تک ایک مضبوط حکومت اور ایک وسیع سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں رکھنے کے بعد عثمانی بادشاہوں کا زوال شروع ہوگیا پہلی جنگ عظیم میں ساری دنیا انھیں مٹانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی بہت سے ممالک ان کے قبضے سے نکل گئے آخر کار ترک مجاہدوں کا خون جوش میں آیا اور انھوں نے مصطفےٰ کمال اتاترک کی زیر قیادت بیمار ترکی میں نئی روح پھونک دی ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۳ء کو ترکی کو جمہوریہ کا درجہ دینے کا اعلان کیا گیا اور اس کے پہلے صدر اتاترک بنائے گئے جو ۱۹۳۸ء تک تاحیات اس کے صدر رہے۔

۳ر مارچ ۱۹۲۴ء کو خلافت کے خاتمہ کا اعلان کیا گیا۔

ترکی کی خارجہ حکمت عملی اتاترک کے ان الفاظ کی بنیاد پر قائم ہے "داخلی امن دنیا میں امن" ترکی اقوام متحدہ کا بانی رکن ہے۔ یورپی اقتصادی کمیونٹی کا ایسوسی ممبر ہے کونسل آف یورپ کا رکن ہے نیٹو، سنٹو اور میثاق استنبول کا بھی رکن ہے۔

ترکی کی آب و ہوا گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں سخت سرد ہے یہاں کے پہاڑی سلسلے آتش فشاں کے سبب ظہور میں آئے اور یہی وجہ ہے کہ یہاں زلزلے کثرت سے آتے ہیں ان پہاڑوں میں معدنی دولت کے وسیع ذخائر ہیں یہاں کوئلہ لوہا۔ تانبہ، سیسہ۔ ابرق جست، پارہ اور پٹرولیم بافراط ملتا ہے۔

خاص شہر استنبول۔ آبادی ۲۰ لاکھ

سوڈان،

رقبہ.... ۹۶۷۵۰۰ مربع میل

آبادی۔ ایک کروڑ چھتیس لاکھ (تقریباً ۸۲ر مسلمان)

زبان۔ شمالی سوڈان میں آبادی اکثریت عربی بولنے والے مسلمانوں کی ہے جب کہ جنوبی سوڈان میں حبشی النسل لوگ مختلف قبائلی زبانیں بولتے ہیں۔

دارالحکومت۔ خرطوم (۱۸۳۱ء میں وجود میں آیا) نیل ازرق اور نیل ابیض سنگم پر واقع ہے۔

زرعی پیداوار۔ کپاس، گندم، مکئی، جوار، مونگ پھلی وغیرہ۔

آب وہوا۔ آب و ہوا گرم ہے گرمیوں کا موسم خوب گرم اور سردیوں میں موسم نیم گرم ہوتا ہے۔ اوسط بارش سالانہ ۲۵ انچ ہے عموماً بارش موسم گرما کے آخر میں ہوتی ہے بارش کے بعد گرمی ہوتی ہے باقی سارا سال موسم خشک رہتا ہے۔

صدر جعفری النمیری (۱۹۶۹ء میں کمیونسٹوں کی مدد سے اسمٰعیل الازہری کا تختہ الٹ کر صدر بنا

مختصر تاریخ۔ ۱۸۳۰-۳۱ء میں عثمانی حکمران مہمت کے بیٹے حسین نے سوڈان فتح کیا۔ ۶۴ برس کے مختصر عرصہ میں ۱۲ خاندانوں نے سوڈان پر حکومت کی حتیٰ کہ ۱۸۸۵ء میں مکمل طور پر مہدی سوڈانی نے غیر ملکیوں کو سوڈان سے نکال باہر کیا انگریز قونصل جنرل گورڈن اور اس کے ساتھیوں کو تہہ تیغ کر دیا۔ مہدی سوڈانی کی وفات تک انگریزوں اور عثمانیوں کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ سوڈان کا رخ کریں۔ مہدی سوڈانی کی وفات کے بعد ۱۸۹۸ء میں انگریزوں اور مصریوں نے سوڈان پر اپنا قبضہ مکمل کر لیا ۱۸۹۸ء سے ۱۹۵۲ء تک مصری اور انگریز سوڈانیوں کی قسمت کے مالک بنے رہے۔ ۱۹۵۲ء میں سوڈان کو دستور دے کر انتخابات کرائے گئے اور آزادی کا وعدہ کیا گیا چنانچہ حسب پروگرام یکم جنوری ۵۶ء کو سوڈان کو آزادی ملی جمال عبدالناصر نے سب سے پہلے اسمٰعیل الازہری کو مبارک باد دی۔ جولائی ۵۶ء میں مخلوط وزارت ترتیب دی گئی اس کا سربراہ عبداللہ الخلیل تھا ۱۹۵۷ء میں جنوبی سوڈان کے کمیونسٹوں نے مرکزی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی (یہ بغاوت جنرل عبود کے انقلاب ۱۹۵۸ء تک جاری رہی) ۸ر فروری ۵۸ء کو مصری فوجیں سوڈان کے علاقہ میں دس ہزار مربع میل تک اندر گھس آئیں سوڈانی حکومت کے الٹی میٹم پر مصری فوجیں وطن واپس ہوئیں۔ ۲ر مئی ۵۸ء کو پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی اور امہ پارٹی نے مخلوط وزارت بنائی ڈاکٹر امین السعید کو سینٹ کا صدر اور عبداللہ الخلیل کو وزیر اعظم بنایا گیا چند ماہ بعد وزیر اعظم نے اقتدار جنرل عبود کے حوالے کر دیا اور خود پنشن لینا شروع کر دیا گویا کہ ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا انقلاب کے فوراً بعد ہی سیاسی لیڈروں نے انقلابی حکومت کے خلاف نفرت کا اظہار کرنا شروع کر دیا ۱۹۶۴ء کے فوراً بعد تو ملک میں ہنگامہ آرائی دن بدن تیز ہوتی گئی یہاں تک کہ عبود کو حکومت چھوڑنی پڑی۔

عبود کے بعد خاتم الخلیفہ کی سرکردگی میں عبوری حکومت تشکیل دی گئی اپریل، مئی ۱۹۶۵ء میں عام انتخابات منعقد ہوئے انتخابات کے نتائج کے طور پر اسمٰعیل الازہری (نیشنل یونینسٹ پارٹی ۵۳ نشستیں) کو سپریم کونسل کا صدر اور محمد احمد المحجوب (امہ پارٹی ۷۴ نشستیں) کو وزیر اعظم بنایا گیا لیکن یہ وزارت

جلد ہی حکومت گئی جولائی ۱۹۶۵ء میں صادق المہدی اور الازہری نے مخلوط وزارت تشکیل دی۔ المہدی الازہری حکومت نے کمیونسٹوں کی سرگرمیوں کا سختی کے ساتھ نوٹس لیا اور جب کمیونسٹوں نے حکومت کو پریشان کرنا نہ چھوڑا تو کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگا دی دستور ساز اسمبلی سے ان کے ۱۱ ارکان اسمبلی کی نشستیں ختم کر دی گئیں دسمبر ۱۹۶۶ء میں کمیونسٹوں نے ہائی کورٹ میں دستور ساز اسمبلی کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر دی جسٹس ابوبکر عوض اللہ نے اپیل منظور کرلی اور ارکان کی اسمبلی سے بے دخلی کو غیر قانونی قرار دیدیا حکومت نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی اور فیصلہ حکومت کے حق میں ہوا ۱۹۶۷ء میں ۳۰ کمیونسٹوں کو حکومت کے خلاف بغاوت کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا یاد رہے کہ فاروق عثمان اور جعفر النمیری نے ملٹری اکیڈمی کے ۳۰ نوجوانوں کو بغاوت پر اکسایا تھا ۱۹۶۷ء میں صادق المہدی مستعفی ہوگیا اور محمد احمد المحجوب پھر الازہری کے ساتھ مل کر حکومت کرنے لگا اسی سال کمیونسٹوں نے سوشلسٹ پارٹی ترتیب دی ادھر دستور ساز اسمبلی انتشار کا شکار ہوگئی صادق المہدی اور الہادی المہدی دو الگ الگ گروپ وجود میں آگئے ۱۸۰ ارکین اسمبلی نے استعفیٰ دے دیا اسمبلی توڑ دی گئی دوبارہ انتخابات ہوئے حکومت اپنی مرضی کے افراد دستور ساز اسمبلی میں لانے میں کامیاب ہوگئی نئے دستور کے متعلق دستور ساز اسمبلی ابھی آخری مرحلے میں تھی کہ مئی ۱۹۶۹ء میں انقلاب آگیا انقلاب کی قیادت جعفر النمیری، فاروق عثمان وغیرہ کے ہاتھ میں تھی سوڈان پر اگرچہ انقلاب کمیونسٹ لائے تھے لیکن النمیری بہت جلد ان سے پریشان رہنے لگا آخر کار ایک دن فاروق عثمان وغیرہ نے النمیری کے خلاف جوابی انقلاب لانے کی کوشش کی اور ناکام ہوئے سوڈان میں لوگ اسلام سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں اس لئے کمیونسٹ یا لادینی نظریات کامیاب نہیں ہوسکتے یہی وجہ ہے کہ النمیری ابھی تک سوڈان میں مستحکم حکومت قائم نہیں کر سکا۔

سیاسی جماعتیں۔ امۃ پارٹی ۱۹۴۵ء میں عبداللہ الخلیل نے امۃ پارٹی تشکیل دی اور پہلا جنرل سکریٹری بنا۔ عبدالخلیل ۱۹۱۰ء میں فوج میں بھرتی ہوا ۱۹۴۴ء تک پہلا مصری تھا جو بریگیڈیر کے عہدہ پر پہونچا ۱۹۴۸ء میں سوڈانی پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہوا اور اسی سال مجلس عاملہ کا رکن بنا اور آخر کار وزیر زراعت بنا ۱۹۵۳ء میں لیڈر آف دی اپوزیشن بنا ۱۹۵۶ء کی مخلوط وزارت میں وزیر اعظم بنا ۱۹۵۸ء میں اس نے اقتدار جنرل عبود کے سپرد کر کے پنشن لینا قبول کیا یہ پارٹی ناصر ازم اور سوشلزم کے خلاف رہی ہے ۱۹۶۹ء کے انقلاب کے وقت اس جماعت کی قیادت صادق المہدی اور الہادی کے ہاتھ آتی۔

تیونس:

سرکاری نام۔ تیونس (اسلامی عرب جمہوریہ)

محل وقوع۔ یہ الجزائر اور لیبیا کے مابین شمالی افریقہ کے ساحل پر واقع ہے اس کے مغرب میں مراکش مشرق میں لیبیا شمال میں بحیرہ روم اور جنوب میں الجزائر اور صحرائے اعظم واقع ہیں۔

رقبہ۔ ۶۳۳۷۹ مربع میل

آبادی۔ تقریباً ۵۰ لاکھ

دارالحکومت۔ تیونس

دیگر اہم شہر۔ صفاقس، سوس، بزرتہ

زبان۔ عربی سرکاری زبان ہے البتہ فرانسیسی بھی بولی جاتی ہے۔

مذہب۔ ریاست کا سرکاری مذہب اسلام ہے تقریباً ۹۰ فیصد آبادی مسلمانوں کی ہے دیگر مذاہب کے لوگوں میں عیسائی اور یہودی شامل ہیں۔

سکہ۔ دینار

اہم پہاڑی سلسلے جبل تیمی (بلندی ۵۰۶۶ فٹ)

آب و ہوا۔ ساحلی علاقوں کا درجہ حرارت معتدل ہوتا ہے ملک کے اندرونی حصوں میں موسم خشک اور گرم ہوتا ہے۔

زرعی پیداوار۔ گندم، جو، انگور، زیتون، کھجور، مچھلی، سنگترہ لیموں اور پست نشیبی علاقوں میں ایک خاص قسم کی گھاس پیدا ہوتی ہے جس سے کاغذ بنتا ہے۔

معدنی پیداوار۔ لوہا، خام سیسہ، جست، فاسفیٹ، پارہ، تیل وغیرہ وغیرہ معدنی پیداوار میں فاسفیٹ بڑا اہم ہے اس کی کانیں جفصہ کے علاقہ میں ہیں۔

صنعتیں۔ بناسپتی گھی، آٹا پیسے، شیشہ سازی دھات کی مصنوعات، رنگ روغن، کپڑا وغیرہ گھریلو صنعتوں میں اونی دھاگہ، اونی کپڑا، برتن، دریا اور جوتے کی صنعت قابل ذکر ہیں۔ زیتون کا تیل نکالنے کی صنعت بڑی ترقی یافتہ ہے۔

نوٹ: ۱۳ جنوری ۱۹۷۴ء کو لیبیا اور تیونس کو ضم کر کے اسلامی عرب جمہوریہ قائم کرنے کا فیصلے کا اعلان کیا گیا۔ اس پر دونوں ممالک کے سربراہوں نے انضمام کے معاہدے پر دستخط کر دیئے لیکن بعد میں بورقیبہ نے انضمام سے انکار کر دیا۔

مختصر تاریخ۔ تیونس کی تاریخ بڑی قدیم ہے یہاں نومثال تک برابر حکومت کرتے رہے ۹۰۹ء سے ۱۱۷۱ء تک فاطمی خلفاء یہاں کے حکمراں رہے ۱۵۷۰ء میں ترک یہاں قابض ہوگئے ۱۸۸۱ء میں فرانس سے آزادی حاصل کرنے کے لئے جدوجہد جاری رہی فرانس نے اس تحریک کو دبانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر اسے کامیابی حاصل نہ ہوسکی کچھ عرصہ بعد حبیب بورقیبہ نے دستور پارٹی کی بنیاد رکھی جلد ہی دیگر جماعتیں بھی اس پارٹی کے ساتھ شامل ہوگئیں اور انہوں نے فرانس کی حکومت کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیونس کے عوام میں حق خود اختیاری اور داخلی امور میں خود مختاری کا مطالبہ زور پکڑ گیا بالآخر تیونس کے عوام کے سامنے فرانس کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور اس نے ۲۰ مارچ ۵۵ء کو تیونس کو آزاد دیا حبیب بورقیبہ نئی حکومت کے سربراہ بنے ۲۵ جولائی ۱۹۵۷ء کو تیونس کو جمہوریہ قرار دیدیا گیا اور حبیب بورقیبہ ملک کے صدر مقرر ہوتے ۸ نومبر ۵۹ء کو قومی اسمبلی کا انتخاب عمل میں آیا اور اس سلسلہ میں دستور پارٹی نے ۹۰ نشستیں جیت لیں یکم جون ۱۹۵۹ء کو تیونس کا آئین نافذ ہوا تھا ۱۹۶۹ء میں آئین میں نئی ترمیم کی گئی نئی ترمیم کے تحت وزیر اعظم کو اختیار دیا گیا ہے کہ اگر اچانک صدر کا عہدہ خالی ہوجاتا ہے تو وہ اس کی جگہ صدارتی اختیارات سنبھال سکتا ہے۔

قومی پرچم اس کا جھنڈا سرخ رنگ کا ہے اس کے وسط میں سفید رنگ کی طشتری ہے اور اس طشتری پر سرخ ہلال اور پانچ کونی ستارہ دکھایا گیا ہے۔

معاہدوں اور تنظیموں سے وابستگی۔ تیونس افریقی اتحاد کے ادارہ، عرب لیگ، اقوام متحدہ اور اسلامی سکریٹریٹ کا رکن ہے۔

اہم شخصیات قدیم کار کا علاقہ تیونس پر مشتمل تھا اس کا ممتاز ترین رہنما جنرل ہی بال (۲۴۷-۱۸۳ ق م) تھا اس نے کئی بار رومیوں کو شکست دی مگر بالآخر وہ بھی زاما کے مقام پر ۲۰۲ ق م میں شکست کھا گیا۔

موجودہ تیونس کی اہم شخصیات میں سے حبیب بورقیبہ (پ ۱۹۰۲) ہیں جنہوں نے تیونس کو آزاد کرانے میں اہم کردار ادا کیا وہ آج تک تیونس کے صدر چلے آرہے ہیں دیگر شخصیات میں سے مونگی سلیم

۱۹۰۸ء، ۱۹۶۹ء) ہیں جو ۱۹۶۱ء، ۱۹۶۲ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ۱۶ویں اجلاس کے صدر تھے۔
تیونس میں بہترین ادیبوں نے بھی جنم لیا ہے ان میں البرٹ میمی (پ ۱۹۱۵ء) اور محمود سعودی...
(پ ۱۹۱۱ء) شامل ہیں اول الذکر فرانسیسی میں اور مؤخر الذکر عربی میں لکھتے ہیں۔

العربیۃ السعودیہ

سرکاری نام المملکۃ العربیۃ السعودیہ، محل وقوع۔ مملکت سعودیہ عرب کی سرحد مشرق میں خلیج عرب سے شروع ہوتی ہے اور مغرب میں بحیرۂ عرب پر ختم ہوتی ہے اس کے شمال میں عراق اور شام جنوب میں یمن حضرموت اور عمان واقع ہیں اس کے وسط میں نجد سب سے بڑی اقلیم ہے۔

اس کا کل رقبہ ۱۰ لاکھ مربع میل ہے آبادی۔ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق اس کی آبادی ایک کروڑ نفوس سے تجاوز کر چکی ہے۔

دارالحکومت۔ الریاض (آبادی ۲۲۵۰۰۰) دیگر مشہور شہر۔ مکۃ المکرمہ، مدینہ منورہ، جدہ، دمام اور ظہران۔

بندرگاہیں۔ جدہ، دمام، راس شورہ اور جیران۔

زبان۔ عربی ملک کی سرکاری زبان ہے۔

مذہب۔ یہاں کی سو فیصدی آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ سرکاری مذہب اسلام ہے۔

سکہ۔ ریال

اہم پہاڑی سلسلے۔ تہامۃ الشام وغیرہ آب و ہوا سعودی عرب کے میدانی علاقوں میں سخت گرمی اور رطوبت ہوتی ہے پہاڑی علاقوں میں ہوا معتدل ہے البتہ تھوڑی سی سردی بھی پڑتی ہے گرمی کے موسم میں معمولی بارش بھی ہوتی ہے اندرونی علاقوں میں درمیانے درجے کی گرمی ہوتی ہے بارش کم ہوتی ہے۔

پیداوار۔ کھجوریں، گندم، باجرہ، پھل کھالیں وغیرہ وغیرہ تیل کی یہاں کی سب سے بڑی معدنی پیداوار ہے اس کے علاوہ سونا لوہا بھی نکالا جاتا ہے۔

صنعتیں۔ سیمنٹ، صابن، چرم سازی، گولہ بارود، قالین سازی، فرنیچر سازی اور کھجوروں کو ڈبوں میں بند کرنے کی صنعتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مختصر تاریخ۔ ۱۸ویں صدی عیسوی میں سعودی عرب کا علاقہ نجد و حجاز کہلاتا تھا اس وقت یہاں عثمانی ترکوں کی حکومت تھی ۱۹۱۳ء میں سعودی سلطنت کے بانی شاہ ابن سعود نے ترک حکمرانوں کا تختہ الٹ دیا اور ترکی کے صوبہ احسار پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۲۵ء میں حجاز اور ۱۹۲۶ء میں عسیر کا علاقہ بھی شاہ ابن سعود کے قبضہ میں آگیا۔ ۸ جنوری ۲۶ء کو شاہ ابن سعود نے حجاز کا بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا ۱۸ ستمبر ۱۹۳۲ء کو ملک کا نام تبدیل کر کے سعودی عرب رکھ دیا گیا۔ ۹ فروری ۵۳ء کو شاہ سعود بن عبدالعزیز سعودی عرب کے بادشاہ بنے ۲ نومبر ۱۹۶۴ء کو علماء کے ایک فتوے کی رو سے شرعی طور پر فیصل کو سعودی عرب کا بادشاہ مقرر کیا گیا چنانچہ شاہ سعود بن عبدالعزیز شاہ فیصل کے حق میں دستبردار ہو گئے۔

موجودہ حکمران شاہ فیصل کی زیر قیادت ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہے ہر شعبہ میں خاطر خواہ اصلاحات کی گئی ہیں ملک کی تعلیمی حالت کو بہتر بنانے کے لئے یونیورسٹیاں اور کالج قائم کئے گئے ہیں ذخیرۂ آب کی توسیع و حفاظت کے لئے خاطر خواہ انتظامات کئے گئے ہیں غذائی پیداوار کو بڑھانے کے لئے جیران بند، ابھا بند، مکہ بند، بطحان بند اور صیا بند تعمیر کئے گئے ہیں زراعت کو سائنسی اصولوں پر ترقی دینے کے لئے ہائیڈرولوجیکل انسٹی ٹیوٹ قائم کئے گئے ہیں صنعتی میدان میں بھی اس ملک نے نمایاں ترقی کی ہے۔

معاہدوں اور تنظیموں سے وابستگی۔ سعودی عرب، عرب لیگ۔ اسلامی سکریٹریٹ اور اقوام متحدہ کا رکن ہے۔

مشہور شخصیات۔ سعودی عرب کے باہر جن شخصیت کو شہرت حاصل ہوئی وہ عبدالعزیز ابن عبدالرحمٰن الفیصل السعود (جنھیں ابن سعود کے نام سے یاد کیا ہے) تھے فیصل عبدالعزیز السعود (پیدائش ۱۹۰۶ء) موجودہ فرمانروا بھی شہرت رکھتے ہیں۔

قومی پرچم۔ سعودی عرب کا جھنڈا سبز رنگ کا ہے۔ اس کے درمیان میں کلمہ طیبہ رقم ہے اور اس کے نیچے تلوار دکھائی گئی ہے۔

شام

محل وقوع۔ شام جنوبی ایشیا میں بحیرۂ روم کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ اس کے شمال میں ترکی جنوب میں فلسطین اور اردن مشرق میں عراق اور مغرب میں لبنان اور بحیرہ روم واقع ہیں۔

رقبہ۔ ۷۱۴۹۸ مربع میل (اس میں وہ رقبہ بھی شامل ہے جس پر جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے قبضہ کر لیا تھا)۔

آبادی۔ اس کی آبادی تقریباً ۰ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔

دارالحکومت۔ دمشق۔

زبانیں۔ عربی اور کروش۔ عربی بولنے والوں کا تناسب ۹۰ فیصد ہے۔

مذہب۔ شام کی ۸۵ فیصد آبادی سنی مسلمانوں پر مشتمل ہے اس کے علاوہ عیسائی اور یہودی بھی موجود ہیں۔

اہم پہاڑی سلسلے۔ جبل الروا۔ سلسلہ انصاریہ

اہم دریا۔ فرات اور آسی

آب و ہوا۔ مختلف علاقوں میں اس کی آب و ہوا مختلف ہے۔ گرمیوں میں سخت گرمی سردیوں میں کم سردی اور ساحلی علاقوں میں بارش کثرت سے ہوتی ہے۔ اندرونی علاقوں میں گرمیوں میں زیادہ خشکی ہوتی ہے۔ جنوری میں بارشیں کثرت سے ہوتی ہیں۔

اہم پیداوار۔ روئی، جو، بھیڑیں بکریاں اور دنبے، روغنی بیج، گندم

معدنی پیداوار۔ تیل

صنعتیں۔ کپڑا۔ اون اور اس کی مصنوعات تیل صاف کرنے، سیمنٹ، سگریٹ، شیشہ اور چینی کے کارخانے۔

مختصر تاریخ۔ سرزمین شام دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں کا گہوارہ ہے۔ شام کو دراصل بہت سی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں تقسیم کیا گیا۔ یہ چھوٹی چھوٹی حکومتیں یہودیوں کے خلاف برسرپیکار رہیں۔ اس پر علی الترتیب اہل بابل، اہل فارس اور اہل مقدونیہ حکومت کرتے رہے مگر ۳۰۱ ق م میں اس نے سلیوکس کے عہد حکومت میں شہرت حاصل کی۔ رومی اور بازنطینی سلطنت کا حصہ بننے کے بعد ساسانیوں نے ۶۳۶ء میں اسے فتح کر لیا۔ ۱۵۱۶ء تا ۱۹۱۸ء یہ علاقہ جو اب شام کہلاتا ہے ترکی کے قبضہ میں رہا۔ ۱۹۱۸ء، ۱۹۱۹ء میں برطانوی اور فرانسیسی دستوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۰ مئی ۱۹۲۰ء کو ایک معاہدے کے ذریعے اسے علیحدہ ملک کی حیثیت ملی۔ اور یکم ستمبر ۱۹۲۰ء کو اسے شام اور عظیم تر لبنان میں تقسیم کر دیا گیا۔ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۴۱ء دونوں

فرانس کے انتداب میں رہے۔ ۱۹۴۶ء میں شام کو مکمل طور پر آزادی دے دی گئی فروری ۱۹۵۸ء میں شام متحدہ عرب جمہوریہ میں شامل ہو گیا لیکن ۲۸ ستمبر ۱۹۶۱ء کو شام نے متحدہ عرب جمہوریہ سے علیحدگی اختیار کر لی مارچ ۱۹۶۳ء میں سوشلسٹ بعث پارٹی نے فوج کے ساتھ مل کر حکومت کا تختہ الٹ دیا۔

مارچ ۱۹۶۹ء میں جنرل حافظ الاسد شام کے صدر بنے۔ ۳ جولائی ۱۹۶۹ء کو شام نے عرب حکومتوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے معاہدے کر لئے۔

معاہدوں اور تنظیموں سے وابستگی۔

شام اقوام متحدہ، عرب لیگ اور اسلامی سکریٹریٹ کا رکن ہے۔

صومالیہ

ملک کا نام ۔ صومالیہ جمہوریہ

دارالحکومت ۔ مغادیشو (آبادی پونے ۲ لاکھ)

سربراہ مملکت ۔ میجر جنرل محمد سعید بارے صدر

سرکاری زبان ۔ عربی

رقبہ ۔ ۲،۴۶،۲۰۱ مربع میل

خاص برآمدات ۔ روئی، کھالیں، کیلا، مچھلی

آبادی ۔ ۲۸،۷۰،۰۰۰ نفوس

یوم آزادی ۔ یکم جولائی ۱۹۶۰ء

مسلم ۱۰۰ فیصد ۔ ۲۸،۷۰،۰۰۰ مسلمان

رکن اقوام متحدہ ۔ ۲۰ ستمبر ۶۰ء

سکے ۔ ۱۰۰ سینٹ ۔ ایک شلنگ صومالیہ

صومالی قوم کے اسلاف عرب کے قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے ہیں ان لوگوں نے ساتویں صدی عیسوی میں عرب سے ہجرت کی تھی ان میں عقیل بن ابی طالب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی قابل ذکر ہیں چنانچہ جلد ہی مغادیشو میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی اور دوسری اسلامی حکومت دملہ میں قائم ہوئی جس کا پایہ تخت "ہرار" قرار پایا جو آج ایتھوپیا کا جز ہے یہ حکومت تیرہویں صدی میں خلیج عدن تک وسیع ہو گئی۔ سولہویں صدی عیسوی میں اس سلطنت کے حاکم امام احمد بن ابراہیم الغازی ہوئے جنھوں نے ایتھوپیا کی حکومت کو شکست فاش دے کر بہت سا علاقہ فتح کر لیا ۱۶۴۳ء میں ان کے انتقال کے بعد سلطنت کا شیرازہ ... بکھر گیا۔

مغادیشو کی اسلامی سلطنت بھی ۱۴ ویں صدی عیسوی میں اپنے عروج پر تھی لیکن سترہویں صدی عیسوی میں انحطاط پذیر ہو کر سلطان مسقط کی باج گذار بن گئی سلطان مسقط کی وفات کے بعد ایک لڑکے کے حصے میں مسقط عمان اور دوسرے مغادیشو اور زنجبار آئے۔

۱۸۴۰ء میں انگریزوں نے زملہ کی مسلمان حکومت پر قبضہ کر لیا ۱۸۸۶ء تک مزید علاقوں پر قابض ہو کر اس کا نام برٹش صومالی لینڈ رکھ دیا۔ ۱۸۸۰ء میں اٹلی نے سلطان زنجبار سے اٹلی کی تجارت مراعات کے لئے ایک معاہدہ کیا اور رفتہ رفتہ مغادیشو اور اس کے اطراف کے سارے علاقہ پر قابض ہو گئے اس طرح اطالوی صومالی لینڈ کی بنیاد پڑی۔

آزادی کی لہر نے حوصلہ سامراجیوں کو مجبور کیا کہ وہ صومالیہ کو آزاد کر دیں یکم جولائی ۶۰ء کو صومالیہ جمہوریہ کی آزاد مملکت کا نقشہ دنیا کے نقشہ پر ظہور ہوا جس کے پہلے صدر عبداللہ عثمان منتخب ہوئے آج کل میجر جنرل محمد سعید بارے صدر ہیں۔

صومالیہ کی خاص پیداوار اناج تیل کے بیج، کیلا، گنا اور کپاس ہے۔

کویت

ملک کا نام ۔ دولت کویت

سرکاری زبان ۔ عربی

سربراہ مملکت ۔ شیخ عبدالسلام الصباح

خاص برآمدات ۔ پٹرول

رقبہ ۔ ۶،۲۰ مربع میل

یوم آزادی ۔ ۱۹ جون ۱۹۶۱ء

آبادی ۔ ۵،۷۰،۰۰۰ نفوس

رکن اقوام متحدہ ۔ ۱۴ مئی ۱۹۶۳ء

مسلم آبادی ۱۰۰ فیصد ۔ ۵،۷۰،۰۰۰ مسلمان

رکن عرب لیگ ۔ ۲۰ جون ۱۹۶۱ء

دارالحکومت ۔ کویت (آبادی سوا دو لاکھ)

سکے ۔ ۱۰۰۰ فلوس ۔ ایک دینار

کویت کی چھوٹی سی عرب ریاست خلیج عرب کے مغربی کنارے پر واقع ہے ۱۷۵۶ء میں یہاں عرب قبیلہ صباح نے اپنی عملداری قائم کی۔ کویت کے موجودہ حکمراں کا تعلق اسی قبیلے سے ہے اور وہ اپنے خاندان کے گیارہویں حکمراں ہیں جو ۲۷ نومبر ۱۹۶۵ء کو برسر اقتدار آئے۔

۱۸۹۹ء میں برطانیہ نے خلیج فارس پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لئے یہاں کے امیر شیخ مبارک سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے برطانیہ کا یہ زیر حفاظت علاقہ قرار پایا جس سے ۱۹ جون ۱۹۶۱ء کو نجات ملی اور کویت آزاد ہو گیا۔

کویت میں تعلیم لازمی ہے عوام کے علاج کے لئے ۱۵ سرکاری اسپتال اور ۸۳ کلینک ہیں کویت میں پٹرول کی پیداوار تین ارب ۸ کروڑ ٹن سالانہ ہے جو مشرق وسطی میں سب سے زیادہ ہے یہاں پٹرول کی کل پیداوار مالکانہ حقوق "کویت آئل کمپنی لیمیٹڈ" کو حاصل ہیں۔

کیمرون

ملک کا نام ۔ کیمرون متحدہ جمہوریہ

سرکاری زبان ۔ فرانسیسی

سربراہ مملکت ۔ الحاج احمد واہجو (صدر)

خاص برآمدات ۔ کوکو، کافی، لکڑی، ربڑ

رقبہ ۔ ۱،۸۳،۵۶۹ مربع میل

یوم آزادی ۔ یکم جنوری ۱۹۶۰ء

مسلم ۵۵ فیصد ۔ ۳۶،۳۵،۰۰۰ مسلمان

سکے ۔ ۱۰۰ انیٹ ۔ افرانک

دارالحکومت ۔ یاونڈے (آبادی ۶۰ ہزار)

کیمرون میں اسلام بربر مبلغین کے ذریعہ پھیلا موحدین کی تحریک کے نتیجہ میں کیمرون میں باقاعدہ مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں کیمرون کی مسلم حکومت کا ذکر کیا ہے آج بھی اس ملک میں دو مقامی ریاستیں مسلمان حکمرانوں کے تحت ہیں جن میں سلطان عوہ اور لیلر آف ری بوا شامل ہیں۔

۱۸۸۴ء میں کیمرون پر جرمنی نے قبضہ کیا ۱۹۱۶ء میں برطانوی اور فرانسیسی فوجوں نے جرمنی سے چھین لیا ۱۹۲۲ء میں "جمعیتہ اقوام" کے "انتداب" کے تحت اسے برطانوی اور فرانسیسی حکومتوں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا یکم جنوری ۶۰ء کو فرانس نے کیمرون کو آزادی دے دی اور یکم اکتوبر ۱۹۶۱ء کو برطانوی کیمرون بھی آ کر اس میں شامل ہو گیا اور وفاقی صدارتی حکومت قائم ہوئی احمد واہجو وفاق کے پہلے صدر منتخب ہوئے کیمرون کی خاص صنعت المونیم کے کارخانے ہیں۔

گنی۔

ملک کا نام ۔ گنی جمہوریہ

دارالحکومت ۔ کوناکری (آبادی سوا لاکھ)

سربراہ مملکت ۔ ایم شیخ طور (صدر)

سرکاری زبان ۔ فرانسیسی

رقبہ ۔ ۹۴،۹۲۶ مربع میل

خاص برآمدات ۔ باکسائیٹ ۔ ناریل ۔ مونگ پھلی

آبادی ۔ ۳۹،۳۵،۰۰۰ نفوس

یوم آزادی ۔ ۲۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء

مسلم ۸۵ فیصد ۔ ۳۳،۴۴،۷۵۰ مسلمان

رکن اقوام متحدہ ۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۵۸ء

سکے ۔ ۱۰۰ اسینٹ ۔ ایک فرانک

گنی میں اسلام پہلی صدی ہجری میں پہونچ گیا تھا بربر مبلغین نے اسے باقاعدہ اسلامی مملکت کا جزء بنالیا تیرہویں صدی عیسوی میں یہ گھانا کی عظیم اسلامی مملکت کا حصہ بن گیا جس کا دارالحکومت ٹمبکٹو تھا جو ایک دور میں افریقہ کا "بغداد" تھا۔

انیسویں صدی کے اوائل میں ہی یورپی غاصب گنی پہونچنے لگے مگر امام سموری طور کی زیر قیادت گنی کے مسلمان ۱۸۹۸ء تک فرانسیسیوں کے خلاف جہاد کرتے رہے اگرچہ امام کو شکست ہو گئی لیکن آزادی کی روح ملک میں برقرار رہی اور امام کے پوتے شیخ طور نے ۲ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو فرانسیسی استعمار سے اپنے ملک کو آزاد کرا لیا شیخ طور افریقی "سوشلسٹ بلاک" کے سب سے زیادہ قابل اعتماد حلیف ہیں۔

گنی میں سونے ہیرے اور پٹرول کے وسیع ذخائر کے قوی امکانات ہیں یہاں زرعی پیداوار میں جو، چاول، ناریل، اناس، کافی اور مونگ پھلی قابل ذکر ہیں۔

گیمبیا۔

ملک کا نام ۔ گیمبیا جمہوریہ

دارالحکومت ۔ باتھرسٹ

سربراہ مملکت ۔ حاجی فرما نگے (صدر)

سرکاری زبان ۔ انگریزی

رقبہ ۔ ۴،۳۶۱ مربع میل

خاص برآمدات ۔ مونگ پھلی ۔ مچھلی ۔ مچھلی کا تیل

آبادی ۔ ۳،۶۰،۰۰۰ نفوس

یوم آزادی ۔ ۱۸ فروری ۱۹۶۵ء

مسلم ۹۰ فیصد ۔ ۳،۲۴،۰۰۰ مسلمان

سکے ۔ ۱۲ پنس ۔ ایک شلنگ اور ۲۰ شلنگ ۱ پونڈ

گیمبیا مغربی افریقہ میں دریائے گیمبیا کے آس پاس دس میل چوڑی پٹی کا ایک چھوٹا سا ملک ہے جس میں ایک جزیرہ سینٹ میری بھی شامل ہے جو دریائے گیمبیا کے طرابلطا کے سامنے بحر اوقیانوس میں واقع ہے۔ اس ملک کا دارالحکومت باتھرسٹ بھی اسی جزیرے میں آباد ہے۔

گیمبیا پر انگریزوں کی عملداری کافی عرصہ تک قائم رہی ہے۔ ان کی غلامی سے ۱۸ فروری ۱۹۶۵ء کو نجات ملی۔ یہ ایک زرعی ملک ہے یہاں مونگ پھلی بہت پیدا ہوتی ہے۔ مچھلی اور مچھلی کا تیل بہت برآمد ہوتا ہے۔ تاڑ کے درختوں کے کافی جنگلات ہیں۔

لیبیا۔

ملک کا نام ۔ لیبیا عربیہ جمہوریہ

سرکاری زبان ۔ عربی

سربراہ مملکت ۔ کرنل معمر القذافی (صدر)

خاص برآمدات ۔ پٹرول ۔ کھجوریں

رقبہ ۔ ۶،۷۹،۳۶۲ مربع میل

رکن عرب لیگ ۔ ۲۸ مارچ ۱۹۵۳ء

آبادی ۔ ۱۹،۰۰،۰۰۰ نفوس

رکن اقوام متحدہ ۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۵۵ء

مسلم ۹۶ فیصد ۔ ۱۸،۴۶،۰۰۰ مسلمان

یوم انقلاب ۔ یکم ستمبر ۱۹۶۹ء

دارالحکومت ۔ طرابلس (آبادی ۲۲ لاکھ)، بن غازی (آبادی ایک لاکھ)

سکے ۔ ۱۰۰۰ ملیمات ۔ ایک دینار

حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے عہد میں عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے یہاں کے حاکم جرجیر کو شکست دے کر اس ملک کو اسلامی سلطنت کے ایک صوبے کی حیثیت دی امویوں کے بعد عباسی دور میں اغالبہ نے یہاں اپنی حکومت قائم کی۔ سلطان سلیمان اعظم کے زمانہ میں یہاں عثمانی ترکوں کی حکومت قائم ہوئی ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے اس پر فوج کشی کر کے قبضہ کر لیا۔ عرب قبائل نے استعمار کے خلاف جنگ جاری رکھی ۲۴ دسمبر ۱۹۵۱ء کو شاہ ادریس بادشاہ بنے یکم ستمبر ۱۹۶۹ء کو فوجی انقلاب کے ذریعے کرنل قذافی

بادشاہ کی حکومت کا تختہ الٹ کر برسر اقتدار آگئے۔

لیبیا میں پٹرول کی پیداوار پندرہ لاکھ بیرل روزانہ ہے تیل کے انکشاف کے حقوق اوسس آئیل کمپنی آف لیبیا، اور سینٹ لیٹر آئیل کمپنی، کو حاصل ہیں۔

ماریطانیہ۔

ملک کا نام ۔ اسلامی جمہوریہ ماریطانیہ
سرکاری زبان ۔ عربی فرانسیسی
سربراہ مملکت ۔ مختار الدادہ (صدر)
خاص برآمدات ۔ خام لوہا، تانبہ، مچھلی، کھالیں
رقبہ ۔ ۳،۹۷،۹۵۰ مربع میل
یوم آزادی ۔ ۲۸ نومبر ۱۹۶۰ء
آبادی ۔ ۱۰،۵۰،۰۰۰ مسلمان
مسلم ۱۰۰ فیصد ۔ ۱۰،۵۰،۰۰۰ مسلمان
دار الحکومت ۔ نواک شت
سکے ۔ ۱۰۰ اسنیٹ ۔ ایک فرانک

ماریطانیہ میں مراکش کے حکمران مرابطین کے عہد میں مسلمانوں کے قدم پہنچے اور ان کے توسط سے یہاں کے بربر افریقی قبائل مسلمان ہوتے ۔ یہ علاقہ مراکش اور مالی کی مسلم حکومتوں کا ایک جز بنا رہا ۔ پندرہویں صدی عیسوی میں یہاں مقامی سرداروں کی حکومتیں قائم ہوئیں جن میں خاندانِ تراب کی سلطنت بہت مشہور ہے ۔

۱۴۴۲ء میں سب سے پہلے پرتگیزیوں کے قدم ماریطانیہ کے ساحل پر آئے اس کے بعد ان کے سامراجی بھائی فرانس اور برطانیہ بھی یہاں آدھمکے ۔ چنانچہ ۱۸۸۰ء میں فرانس نے جنوبی حصہ پر قبضہ کر لیا اور ۸ جنوری ۱۹۰۹ء کو سارے ماریطانیہ پر قابض ہوگیا ۔ ۴ دسمبر ۱۹۲۰ء کو اسے اپنی نوآبادی بنا لیا جس سے ۲۸ نومبر ۱۹۶۰ء کو نجات ملی ۔ ماریطانیہ کے پہلے صدر مختار الدادہ منتخب ہوئے اور وہی آج تک صدر کے عہدہ پر فائز ہیں ماریطانیہ کی زرعی پیداوار کھجور، تیل کے بیج، گندم، جو، تمباکو گوند اور پھل ہیں ۔ معدنیات میں خام لوہا اور تانبہ کافی مقدار میں پایا جاتا ہے ۔ رومن شمال مغربی افریقہ کو ماریطانیہ کہا کرتے تھے اور لفظ "مور" اسی لفظ سے مشتق ہے جس سے مراد عرب نژاد بربر ہے ۔

مال دیپ۔

ملک کا نام ۔ مال دیپ جزائر
دار الحکومت ۔ مالے
سربراہ مملکت ۔ الامیر محمد فرید دیدی (سلطان)
سرکاری زبان ۔ انگریزی
رقبہ ۔ ۱۱۵ مربع میل
خاص برآمدات ۔ ناریل، پھل، مچھلی
آبادی ۔ ۱،۰۹،۰۰۰ نفوس
یوم آزادی ۔ ۲۶ جولائی ۱۹۶۵ء
مسلم ۱۰۰ فیصد ۔ ۱،۰۹،۰۰۰ مسلمان
رکن اقوام متحدہ ۔ ۲۱ ستمبر ۱۹۶۵ء
سکے ۔ ۱۰۰ لاری ۔ ایک روپیہ

مال دیپ کی اسلامی سلطنت سری لنکا سے ۴۲۰ میل جنوب مغرب کی جانب بحیرہ عرب میں واقع ہے ۔ دو ہزار جزیروں پر مشتمل ہے ۔

پہلی صدی ہجری میں یہاں عرب تجار نے اپنی نوآبادی قائم کر لی تھی ۔ ابن بطوطہ یہاں کا قاضی رہا ہے ۔ اس نے یہاں کی عورتوں کے حسن کی بہت تعریف کی ہے ۔ برطانیہ نے برصغیر کے قبضہ کے ساتھ ۱۸۸۷ء میں ان جزائر پر بھی اپنا تسلط جما لیا ۔ یکم جنوری ۱۹۵۳ء کو مالدیپ جمہوریہ قرار پایا ۔ ۲۲ فروری ۱۹۵۴ء کو اسمبلی نے اس کو ایک سلطنت قرار دیا اور الامیر محمد فرید دیدی کو سلطان منتخب کیا یہی آج کل مال دیپ کے سربراہ ہیں ۔

۱۴ فروری ۱۹۶۰ء کو برطانیہ نے تیس سالہ معاہدہ کی رو سے یہاں اپنا ایک ہوائی اڈہ قائم کیا ہے ۲۶ جولائی ۱۹۶۵ء کو برطانوی تسلط سے مکمل آزادی ملی ۔

مالی۔

ملک کا نام ۔ مالی جمہوریہ
سابقہ نام ۔ فرانسیسی سوڈان
سربراہ مملکت ۔ مودیبا کیتا ۔ (صدر)
سرکاری زبان ۔ فرانسیسی
رقبہ ۔ ۴،۷۸،۶۵۵ مربع میل
خاص برآمدات ۔ مونگ پھلی، چاول، گوند، مویشی
آبادی ۔ ۴۹،۲۰،۰۰۰ نفوس
یوم آزادی ۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۶۰ء
مسلم ۹۰ فیصد ۔ ۴۴،۱۸،۰۰۰ مسلمان
رکن اقوام متحدہ ۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۶۰ء
دار الحکومت ۔ بماکو (آبادی ڈیڑھ لاکھ)
سکے ۔ ۱۰۰ اسنیٹ ۔ ایک فرانک

۱۰۴۲ء میں بربر مصلح عبداللہ بن یٰسین نے اس علاقہ میں تبلیغ اسلام شروع کی اور مینڈنگ (مالی) کے بادشاہ نے ان کی کوششوں سے اسلام قبول کر لیا ۔ یہ ملک اس زمانہ میں گھانا (غانہ) کی عظیم سلطنت کا ایک جزو تھا ۱۰۷۶ء میں یوسف بن تاشفین کے عم زاد بھائی ابوبکر بن عمر نے گھانا کے دار الحکومت کو فتح کیا اور اس علاقہ کے بیشتر حکمرانوں نے اسلام قبول کر لیا ۔ انیسوی صدی عیسوی کے اوائل میں فولانی مصلح عثمان وان فودیو کی تبلیغ و اصلاح کا اس علاقہ پر گہرا اثر پڑا اور ان کے پیروؤں نے اس علاقہ پر عرصہ تک فرانسیسیوں کا مقابلہ کیا ۔ بیسویں صدی کے اوائل میں سینگال بالائی وولٹا اور گنی کو ملا کر بڑی اسلامی حکومت کے قیام کی آخری کوشش کی گئی لیکن جدید ہتھیاروں سے مسلح فرانسیسی افواج نے ان کوششوں کو ناکام بنا دیا ۔

۱۹۰۴ء میں یہاں فرانسیسی نوآبادی قائم ہوئی ۱۹۵۹ء میں مالی اور سینی گال کا وفاق بنا۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۶۰ء کو مکمل آزادی نصیب ہوئی اگست ۱۹۶۰ء بعد سینی گال کے ساتھ اتحاد ختم ہوگیا کیونکہ سینی گال کی پالیسی بہت زیادہ انقلابی تھی۔

متحدہ امارت۔

ملک کا نام ۔ متحدہ عرب امارت
مسلم ۱۰۰ فیصد ۔ ...... ۵ مسلمان
سربراہ وفاق ۔ شیخ زید بن سلطان النہان (صدر)
دارالحکومت ۔ (عارضی) ابوظہبی
رقبہ ۔ .... ۳۲۰۰ مربع میل
سرکاری زبان ۔ عربی
آبادی ۔ .... نفوس
خاص برآمدات ۔ پٹرول مچھلیاں
یوم وفاق ۔ ۱۸ جولائی ۷۱ ۱۹ء

خلیج عرب کی نو ریاستوں کا وفاق ۱۸ جولائی ۱۹۷۱ء کو قائم ہوا ہے جس کے پہلے صدر ابوظہبی کے امیر شیخ زید اور نائب صدر دوبئی کے امیر شیخ راشد بن سعید المکتوم ہیں اس وفاق میں نو ریاستیں ہیں ۱۔ بحرین ۲۔ قطر ۳۔ ابوظہبی ۴۔ دوبئی ۵۔ شارجہ ۶۔ عجمان ۷۔ ام القوین ۸۔ راس الخیمہ ۹۔ فجیرہ ان ریاستوں کے حکمرانوں کے درمیان دوبئی کی بندرگاہ میں ملاقات ہوئی اور حسب ذیل امور پر اتفاق ہوا۔

اول تمام ریاستیں اندرونی طور پر خود مختار رہیں گی لیکن مجموعی طور پر ایک وفاق کی صورت میں اکٹھی ہوجائیں گی۔

دوم۔ وفاقی حکومت ایک کونسل چلائے گی جس میں نو ریاستوں کے حکمران برابر کی حیثیت رکھیں گے۔

سوم۔ وہ اپنے ارکان میں سے ایک کو وفاقی حکومت کا سربراہ چن لیں گے لیکن شرط یہ ہوگی کہ ہر رکن باری باری سے سربراہ بنے گا۔

چہارم ۔ تمام ریاستیں ایک مشترکہ دفاعی نظام بنائیں گے جو عرب لیگ اور اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق ہوگا۔

پنجم ۔ کونسل ایک مستقل اور مکمل دستور بنائے گی اور سیاسی، دفاعی، معاشی اور ثقافتی مسائل بین الاقوامی امور کے بارے میں اعلیٰ پالیسی طے کرے گا۔

مراکش۔

ملک کا نام ۔ مملکت مغربیہ
دارالحکومت ۔ رباط (آبادی ڈھائی لاکھ)
سربراہ مملکت ۔ شاہ حسین
سرکاری زبان ۔ عربی
رقبہ ۔ ۱۷۱،۸۳۵ مربع میل
خاص برآمدات ۔ فاسفیٹ، مینگنز۔ سکہ۔ تمباکو۔
آبادی ۔ ...... ۱۵۰۳۰ نفوس
یوم آزادی ۔ ۲ مارچ ۱۹۵۶ء
مسلم ۹۵ فیصدی ۔ .... ۱۴۶۳۵ مسلمان
رکن اقوام متحدہ ۔ ۱۲ نومبر ۱۹۵۶ء
سکے ۔ ۱۰۰ فرانک ۔ ایک دینار

۶۶۰ء میں عقبہ بن نافع کے زیر کمان مسلمانوں نے مراکش پر فوج کشی کی اور بربر قوم کی مدد سے بہت جلد پورے علاقہ میں وحدانیت کا سکہ جما دیا بنو امیہ کے عہد سے عباسی حکمران ہارون الرشید کے زمانہ تک مراکش وسیع اسلامی سلطنت کا ایک صوبہ چلا آتا رہا جس کو اس وقت مغربی اقصیٰ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی میں یہاں ادارسہ کی حکومت قائم ہوئی ۱۰۶۱ء میں مرابطین نے اس پر قبضہ کر لیا اور ان کے وزیر یوسف بن تاشفین نے مراکش کا شہر آباد کیا ۱۱۴۹ء میں موحدین کی حکومت قائم ہوئی اس کے بعد بنی مرین نے تین سو سال تک حکومت کی پھر دولت وسلطیہ اور اس کے بعد دولت سعدیہ کی حکومتیں برسر اقتدار آئیں۔

۱۹۰۹ء میں علی الحسنی نے اپنی حکومت قائم کی آج تک اسی خاندان کے ہاتھ میں مراکش کی حکومت ہے اور موجودہ شاہ حسن اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں ۱۹۱۲ء تک مراکش ایک آزاد مسلم ملک تھا کہ فرانس اور اسپین نے اسے اپنی ہوس ملک گیری کا نشانہ بنایا ۱۹۲۱ء میں ایک حریت پسند مجاہد غازی امیر عبدالکریم نے سامراجی طاقتوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا ۱۹۲۷ء میں ان کو قید کر لیا گیا ۱۹۴۴ء میں استقلال پارٹی قائم ہوئی اس نے آزادی کی جدوجہد شروع کی جس کے نتیجے میں ۲ مارچ ۱۹۵۶ء کو فرانس اور اسپین کی غلامی سے مراکش کو نجات ملی مراکش کی زرعی پیداوار گندم، جو، روئی، پھل اور زیتون ہے معدنیات میں فاسفیٹ، لوہا، سیسہ، جست اور جپسم وغیرہ شامل ہے۔

مسقط و عمان۔

ملک کا نام ۔ دولت عمان
دارالحکومت ۔ مسقط (آبادی ساڑھے چھ ہزار)
سربراہ مملکت ۔ سلطان قابوس بن سعید (بادشاہ)
سرکاری زبان ۔ عربی
رقبہ ۔ .... ۲ مربع میل
خاص برآمدات ۔ کھجور، مچھلیاں، موتی، پھل
آبادی ۔ .... ۷۰۰ ۵۵ مسلمان
سکے ۔ ۱۰۰ بقشہ ۔ ایک روپیہ

سلطنت عمان کے موجودہ حکمران قابوس کے ایک بزرگ احمد بن سعید نے ۱۷۴۹ء میں اس سلطنت کی بنیاد رکھی تھی یہ خاندان آل ابوسعید کے نام سے مشہور ہے اٹھارہویں صدی عیسوی میں یہ سلطنت صومالیہ اور زنجبار تک وسیع ہوچکی تھی یورپین سامراجیوں نے جب صومالیہ پر قبضہ کر لیا تو امام کے ایک لڑکے کی حکومت مسقط و عمان میں اور دوسرے کی صرف جزائر زنجبار میں محدود ہو کر رہ گئی زنجبار پر ان دنوں تنزانیہ قابض ہے سلطنت عمان پر برطانیہ کی سیادت ۱۸۹۱ء کے معاہدہ کی رو سے

قائم ہوئی جس سے ۱۹۶۷ء میں نجات ملی ۔

مصر متحدہ عرب جمہوریہ ۔

براعظم افریقہ کے نقشہ پر اگر ہم نگاہ ڈالیں تو اس کے شمال مشرق میں ۳۸۶۰۰۰ ۹ مربع میل پر واقع ایک مسلم ریاست (مصر) واقع ہے اس کے شمال مشرق میں بحیرہ روم جنوب میں سوڈان مشرق میں بحیرہ قلزم مغرب میں صحرائے لیبیا اور صحرائے اعظم واقع ہے زمانہ قدیم میں اسے "کیمٹ" یعنی سیاہی مائل زمین کے نام سے پکارا جاتا ہے مشہور تاریخ والا اور سیاح ہیروڈوٹس اسے "عطیہ نیل" کے نام سے پکارتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دریائے نیل کے دونوں اطراف کا ساحل کا علاقہ پورے براعظم کا زرخیز ترین حصہ ہے مصر کا کل زرعی رقبہ ۱۳۵۰۰ مربع میل یعنی کل رقبہ کا ۳۵ فیصد ہے زرعی زمین کے علاوہ صحرائی زمین بھی کثرت سے ہے کپاس، گندم اور چاول اس علاقہ کی اہم فصلیں ہیں اس کے علاوہ تیل اور بے شمار دھاتیں بھی مصر سے نکلتی ہیں ۱۹۶۲ء کے اعداد و شمار کے مطابق مصر کی کل آبادی ۲۶ ملین (۶۳ر۳ دیہاتوں میں اور ۳۷ شہروں میں ہے) ان میں سے ایک ملین عیسائی یہودی اور دوسری غیر مسلم اقوام ہیں قاہرہ مصر کا صدر مقام اور براعظم افریقہ کا سب سے بڑا شہر ہے قاہرہ میں جامعہ ازہر کے قریب الاہرام مصر نامی مینار ہے جو دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک ہے مصر کے شمال مشرق میں نہر سویز (۱۸۶۹ء) واقع ہے یہ نہر براعظم افریقہ اور ایشیا کے سنگم پر کھودی گئی ہے ۔

تاریخی پس منظر تاریخی لحاظ سے یہ ثابت کرنا انتہائی مشکل ہے کہ قدیم مصر کب اور کیسے وجود میں آیا۔ البتہ تاریخی واقعات، شواہد اور آثارات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مصر کی تاریخ ۵۰۰۰ ق م سے شروع ہوتی ہے حضرت نوح علیہ السلام کے ایک پوتے "مصر" کے نام پر اس ملک کا نام رکھا گیا عبرانی لوگ اسے "مصرائم" کا نام دیتے ہیں ابتدا سے لے کر سکندر اعظم یونانی کے حملہ (۳۳۲ ق م) تک مصر پر کل ۳۱ خاندانوں نے حکومت کی ۶۰۵ ق م میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے مصر کو فتح کیا سکندر اعظم کی ناگہانی موت نے جلد ہی یونانیوں کا اقتدار بھی ختم کر دیا اور پھر مصر پر بطالیہ خاندان کے لوگ (بطلیموس) حکومت کرنے لگے اس خاندان کے ۱۲ویں بادشاہ کو رومیوں نے مار بھگایا اور پھر چار سو سال تک رومی مصریوں کی قسمت کے مالک بنے رہے اور آخر کار عمر فاروقؓ کے زمانہ میں حضرت عمرو بن عاصؓ نے مصریوں کو رومیوں کے ظلم و تشدد سے نجات دلائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لوگ اسلام سے متعارف ہو گئے ۔

۶۴۰ء سے لے کر ۹۶۹ء (دور عباسی) تک مصر اسلامی سلطنت کا ماتحت صوبہ رہا عباسیوں کے دور حکومت میں یہاں دو خاندانوں الطولون اور اخشیدی ۸۶۸-۹۰۵ اور ۹۲۵-۹۶۹ء نے حکومت کی عباسیوں کی گرفت حسب اقتدار ڈھیلی پڑ گئی تو فاطمی خاندان کے ایک فرد جوہر صقلی نے مصر پر قبضہ کر لیا۔ فاطمیوں کے بعد اقتدار کی باگ نور الدین کے ہاتھ چلی گئی نور الدین کی وفات کے بعد صلاح الدین ایوبی کے بعد تین سو سال تک اس کے غلاموں کا خاندان (مملوک ۱۲۵۲-۱۵۱۷) حکومت کرتا رہا حتیٰ کہ ۱۵۱۷ء میں سلیم نے مصر پر حملہ کر کے اسے عثمانی قلمرو میں داخل کیا سلیم اول نے غوری خاندان کے ایک فرد خیر بک کو مصر میں منتظم اعلیٰ بنایا، ۱۵۱۷ء سے ۱۸۸۲ء تک تقریباً ۶۳ حکمرانوں نے مصر پر حکومت کی ۱۸۸۲ء کا ذکر ہے کہ مصری فوج کے ایک زندہ دل افسر کرنل احمد اعرابی پاشا نے انگریزوں کی بڑھتی ہوئی جارحیت کو روکنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے اسی دن سے مصری انگریزوں کے غلام بن گئے برطانوی حکومت نے لارڈ کرومر کو مصر میں اپنا پہلا قونصل جنرل بنایا۔

۱۸۸۲ء سے ۱۹۵۲ء تک کا یہ عرصہ (۷۰ سال) مصری انگریزوں کے ظلم و ستم اور ملک میں مداخلت کے خلاف لڑتے رہے اس عرصہ میں مصری لیڈر مصطفیٰ کمال پاشا جمال الدین افغانی محمد عبدہ سعد زاغلول پاشا شیخ حسن البنا شہید مصر کی آزادی کے لیے کوشش کرتے رہے ۔

۱۹ راپریل ۱۹۲۳ء کو مصر میں دستور نافذ کیا گیا جولائی میں مارشل لا ختم کر کے ملک میں انتخابات کا اعلان کیا گیا انتخابات ۱۹۲۴ء میں وفد پارٹی کو کامیابی ہوئی وفد کے لیڈر سعد زاغلول پاشا نے وزارت تشکیل دی ۲۴ دسمبر ۱۹۲۴ء کو شاہ مصر نے وفد کی اکثریت توڑ کر دوبارہ انتخابات کا اعلان کیا ۱۹۲۵ء کے انتخابات میں سعد زاغلول پاشا ایوان زیریں کے صدر منتخب ہوتے اس سال ایلن بی کی جگہ لارڈ لائیڈ کو برطانوی ہائی کمشنر برائے مصر مقرر کیا گیا لارڈ ساتھ نے آتے ہی ملکی معاملات میں مداخلت شروع کر دی اور شاہ پر زور دیا کہ ۱۹۲۵ء کے انتخابات کو کالعدم قرار دیا جائے ۔

۱۹۲۷ء میں دوبارہ انتخابات منعقد ہوئے وفد پارٹی اقتدار پر آئی لیکن جلد ہی اس کے لیڈر سعد زاغلول پاشا کا انتقال ہو گیا فواد نے فوراً ہی ۱۹۲۳ء کا دستور منسوخ کر دیا اور نحاس پاشا کو وزارت بنانے کی دعوت دی ۱۹۲۸ء میں اسمٰعیلیہ کے ایک معزز خاندان کے ایک فرد حسن البنا نے اخوان المسلمین (سیاسی جماعت) تشکیل دی ۱۹۲۹ء میں رائے دہی کے حق کو محدود کرنے کی کوشش کی گئی لیکن عوام میں اس کا سخت ردعمل ہوا اور حکومت کو یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔ ۱۹۳۱ء میں انتخابات منعقد ہوتے وفد ایک دفعہ پھر کامیاب ہوا اس کے لیڈر مصطفیٰ نحاس پاشا نے وزارت تشکیل دی ۱۹۳۶ء میں نحاس پاشا کے زمانہ اقتدار میں برطانیہ کے ساتھ رسوائے زمانہ دوستی اور رفاقت کا معاہدہ ہوا اسی سال فواد کا انتقال ہو گیا اور فاروق کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا گیا اور ۱۹۴۱ء تک ریجنسی کونسل قائم کر دی ۔

۲۶ مئی ۱۹۳۷ء میں مصر عرب لیگ کا رکن بنا اسی سال دسمبر میں نحاس پاشا کو وزارت سے باہر کیا گیا ۱۹۳۸ء کے انتخابات میں پہلی دفعہ قومی جماعت وفد کو شکست ہوئی اس سال اخوان نے سیاست میں حصہ لینے کا اعلان کیا ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو ملک میں انگریزوں کے خلاف مظاہرے شروع ہو گئے حکومت کی ہمدردیاں انگریزوں کے ساتھ تھیں جب کہ لوگ جرمنوں کے حق میں تھے ۱۹۴۲ء میں انتخابات منعقد ہوئے وفد نے اخوان المسلمون کے تعاون سے انتخابات میں نمایاں کامیابی حاصل کی لیکن وزارت بنانے کے بعد اخوان المسلمون سے کئے گئے وعدے پورے نہ کیے گئے ۱۹۴۴ء میں احمد ماہر پاشا نے وزارت تشکیل دی لیکن اسے بہت جلد ہی گولی سے اڑا دیا گیا ۱۹۴۷ء میں برطانیہ نے امریکہ اور روس نے جب ایک سازش کے تحت فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی عملی کوششیں شروع کیں تو ملک میں ان طاقتوں خاص طور پر برطانیہ کے خلاف ہنگامے شروع ہو گئے ۱۹۴۸ء میں جنگ فلسطین شروع ہو گئی جنگ میں اخوان کے مسلح رضاکاروں نے مصر کی گوریلا فوجوں سے زیادہ بہادری دکھائی۔

۱۹۴۹ء میں حسن البنا مرشد عام اخوان المسلمون کو شارع عام پر گولی مار کر شہید کر دیا گیا اور اخوان المسلمون پر پابندی لگا دی گئی ۔ یہ ایک بہت بڑا قومی سانحہ تھا۔ ۱۹۵۰ء میں انتخابات منعقد ہوئے وفد نے ۳۱۹ میں سے ۲۳۵ نشستوں پر قبضہ کر لیا ۱۹۵۱ء میں وزیر اعظم نحاس پاشا نے پارلیمنٹ میں ایک بل پیش کیا جس کے تحت "دوستی اور رفاقت" کے ۱۹۳۶ء کے معاہدے کو کالعدم قرار دے دیا گیا ۱۹۵۲ء میں "آزادی پسند افسروں" نے جنرل نجیب کی سرکردگی میں فاروق کا تختہ الٹ دیا دسمبر ۵۲ء میں دستور ختم کر دیا گیا اور انقلابی حکومت نے قوم کو یہ مژدہ سنایا کہ ملک پر فوجی ۱۹۵۵ء تک حکومت کریں گے چنانچہ ۱۳ افراد پر مشتمل ایک کانگریس جنرل نجیب کے تحت کام کرنے لگی ۔ ۱۸ جون ۱۹۵۳ء کو نجیب ملک کا پہلا صدر اور وزیر اعظم بنا۔ یاد رہے کہ اس سے پہلے ۲۹ مارچ ۱۹۵۳ء کو تمام سیاسی جماعتیں (اخوان) کے سوا ختم کر دی گئی تھیں۔

۱۹۵۴ء میں نجیب کا نائب جمال عبدالناصر ....

صدر بنا...

...... ۱۹۵۵ء میں ناصر نے اسوان ڈیم میں توسیع کا پروگرام بنایا اس سلسلہ میں امریکہ سے امداد درخواست کی اسی سال ناصر انڈونیشیا (بنڈونگ) میں منعقد ہونے والی افریقی ایشیائی ممالک کی کانفرنس میں شریک ہوا یہاں جواہر لال نہرو نے اس کی چو این لائی سے خصوصی ملاقات کرائی چنانچہ ۱۹۵۶ء میں ناصر نے کمیونسٹ چین کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا ادھر امریکہ نے اسوان ڈیم کے لئے مدد دینے سے انکار کر دیا۔ فوراً ہی روس نے مصر کے لئے مالی اور فوجی امداد کا اعلان کیا ۲۳ جون ۵۶ء کو ناصر بلا مقابلہ مصر کا صدر منتخب ہوا ۵۶ء جولائی ۵۶ء کو ناصر نے اپنی کابینہ کی زبردست مخالفت کے باوجود نہر سویز کو قومی تحویل میں لے لیا ناصر کے اس اقدام کے خلاف فرانس برطانیہ اور اسرائیل کی مشترکہ فوجوں نے مصر پر حملہ کر دیا۔ سویز کی جنگ میں اگرچہ مصر کو شکست ہوئی لیکن نہر سویز کو قومی تحویل میں لینے سے ناصر دنیائے عرب کا ہیرو بن گیا۔ اسی سال سوڈان مصر سے الگ ہو گیا ، ۱۹۵۷ء میں ناصر نے پارلیمنٹ کے انتخابات کرائے تقریباً ۹۰ فیصد امیدوار بلا مقابلہ منتخب ہوتے (غیر کمیونسٹ ملک کا پہلا انتخاب جو کمیونسٹوں کے طریقہ پر منعقد ہوا وہ یہ کہ تمام امیدوار سرکاری تھے مقابلہ کسی سے نہیں تھا) اس سال مصر کی واحد سیاسی جماعت نیشنل یونین کے قیام کا اعلان کیا گیا۔

فروری ۱۹۵۸ء میں شام اور مصر کے وفاق کا اعلان کیا گیا نئی مملکت کا نام (U. A. R.) رکھا گیا۔ ۱۹۶۰ء میں ناصر نے دو بڑے بینکوں کو قومی تحویل میں لے لیا۔

۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۱ء تک سوشلزم کے اثرات جلد ہی عرب دنیا پر ظاہر ہونے لگے عراق میں نوری اور فیصل کا تختہ الٹ دیا گیا اس کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی حکومتیں ناصر کے اشارے پر بننے اور بگڑنے لگیں ۱۹۶۱ء میں شام مصر سے ناراض ہو کر وفاق سے الگ ہو گیا ۱۹۶۳ء میں شام اردن اور مراکش سے ناصر سرد جنگ میں الجھ گیا ۲۵ مارچ ۱۹۶۴ء مصر کے لئے نئے دستور کا اعلان کیا گیا دستور میں حاکمیت کے اختیارات اللہ تعالیٰ کی بجائے عوام کو سپرد کرنے کا اعلان کیا گیا۔

جون ۶۷ء میں اسرائیل نے مصر شام اور اردن پر بیک وقت حملہ کر دیا۔ ۲ گھنٹوں کے اندر مصر کی فضائی اور بحری قوت کا خاتمہ کر لیا گیا اسرائیل نہر سویز کے مشرقی کنارے پر قابض ہو گیا ________

ناصر نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا ________ لیکن جلد ہی استعفیٰ واپس لے لیا ________

____

________ اس سال یمن سے مصری فوجیں واپس بلائی گئیں جنگ کے بعد حالات کا جائزہ لینے کے بعد عرب سربراہوں کی متعدد کانفرنسیں منعقد ہوئیں ایک سربراہ کانفرنس میں مصر کو ۳۰ ملین ڈالر سالانہ امداد دینے کا اعلان کیا گیا ۱۹۷۱ء میں ناصر پر دل کا دورہ پڑا اور اس کا انتقال ہوا۔ ناصر کے بعد اس کا دوست راست انور السادات کا مصر کا نیا صدر منتخب ہوا علی صابری کے علاوہ متعدد سیاسی رہنماؤں کو نئی حکومت نے نظر بند کر دیا اگست ۱۹۷۲ء میں مصر اور لیبیا کی فوجوں کا کمانڈر انچیف بنایا گیا ستمبر میں روسی ماہرین کو مصر سے باہر نکال دیا گیا اور یوں نظر آتا تھا کہ سادات روس کے ساتھ اپنے تعلقات پر نظر ثانی کر رہا ہے اکتوبر ۷۳ء میں اچانک ایک دن مصری فوجوں نے نہر سویز عبور کی اور اپنا مقبوضہ علاقہ اسرائیل سے آزاد کرا لیا مصر کے اس اقدام سے ایک دفعہ پھر عرب اسرائیل جنگ شروع ہو گئی اسرائیل نے سویز شہر پر قبضہ کر لیا یہ جنگ فتح اور شکست کا فیصلہ ہوتے بغیر ختم ہو گئی جنگ کے بعد مصر نے لیبیا کے ساتھ انضمام کرنے سے انکار کر دیا اس سے لیبیا اور مصر کے تعلقات خراب ہونے شروع ہو گئے لیبیا نے مصر کی ۳۰ ملین کی امداد بند کر دی جنگ بندی کے بعد امریکہ کی کوششوں سے سویز شہر مصر کو واپس مل گیا مئی ۷۴ء میں امریکہ اور مصر کے درمیان ایک طویل عرصہ کے بعد سفارتی تعلقات قائم ہو گئے اور ۱۹ سال کے بعد نکسن پہلا امریکی صدر ہے جس نے جون ۱۹۷۴ء میں مصر کا دورہ کیا تھا۔

ملائشیا

ملک کا نام	ملائشیا
مقامی زبان	ملائی چینی
سربراہ مملکت	تنکو عبدالحکیم معظم شاہ (آئینی شہنشاہ)
سرکاری زبان	انگریزی
رقبہ۔	۱۲۸۰۴۳ مربع میل
خاص برآمدات	ربڑ، ٹین، لوہا، آکسائیڈ
آبادی...	۹۰ النفوس
رکن اقوام متحدہ	۱۷ ستمبر ۱۹۶۳ء (ملایا)
مسلم، ٪فیصد....	۵۵۰۵۹ مسلمان
یوم وفاق ملائشیا۔	۱۶ ستمبر ۶۳ء
دارالحکومت۔	کوالالمپور (آبادی ۵ لاکھ)
سکے۔	.. اسین ۔ ایک ملائی ڈالر

وفاق ملائشیا کا علاقہ ہلالی شکل میں آبنائے ملاکا سے بحر سولو تک پھیلا ہوا ہے اس میں ملایا کی ۱۱ ریاستیں قدیم ۔ پنیانگ ۔ پیرک سلانگور ۔ ملاکا نیگری سیمبلن کلنتن ۔ ترغانو ۔ فہانگ ۔ جوہر کے علاوہ سراواک اور سابہ کے علاقے بھی شامل ہیں جو جزیرہ بورنیو میں واقع ہیں۔

ملایا اپنی ٹین اور ربڑ کی دولت کے لئے تمام دنیا میں مشہور ہے یہاں کی کانوں سے ہر سال تقریباً پندرہ لاکھ ٹن ٹین جو دنیا کی کل پیداوار کا ایک تہائی ہے حاصل کیا جاتا ہے اس کے علاوہ لوہا اور باکسائیٹ بھی کافی مقدار میں پایا جاتا ہے۔

ملائشیا کو زمانہ قدیم ہی سے مختلف تہذیبوں اور قوموں کا سنگم بننے کا موقع ملا ہے بحر عرب اور بحر چین کے درمیان جتنی بھی تجارت ہوتی رہی ہے وہ سب آبنائے ملاکا کے ہی راستے ہو رہی ہے اور ملاکا کا شہر ایک ایسا دروازہ بن گیا جس کے ذریعہ عرب فارس ہند سماترا ملایا اور چین کے تہذیبی اور ثقافتی اثرات اندرون ملک پھیلتے گئے اسی بندرگاہ سے ہو کر ۹۲ء میں پہلے یورپی سیاح مارکو پولو کی بادبانی کشتی گذری اسی شہر میں ۱۱ء پرتگالی فتنہ باز البوقرق ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں بائیبل لے کر اترا تھا یہی وہ شہر ہے جہاں ۱۶۴۱ء میں ولندیزیوں نے پرتگالیوں کو ہٹا کر اپنے ڈیرے جمائے تھے اور یہی شہر ہے جہاں سے انگریزوں نے اپنے تسلط کا آغاز کیا جو تقریباً سو سال کے بعد "مردیکا ملایا" کے انقلاب آفریں نعروں میں ختم ہوا۔

ملائشیا ۱۳ ریاستوں پر مشتمل ایک ایسا آئینی وفاق ہے جس کا سربراہ آئینی شہنشاہ کہلاتا ہے اس وفاق میں شامل تیرہ ریاستوں میں سے ۹ تو چھوٹی چھوٹی سلطنتیں ہیں جن کا ایک الگ سلطان ہوتا ہے اور باقی چار ریاستیں پنانگ ، ملاکا ، سابہ اور سراوک ہیں جن کا حاکم گورنر کہلاتا ہے فیڈریشن کے

آئینی شہنشاہ کا انتخاب و چھوٹی سلطنتوں کے سلطانوں میں سے پانچ سال کے عرصہ کے لئے کیا جاتا ہے ملائشی آئین کی رو سے و سلطانوں کی کانفرنس میں ریاست قیدح کے سلطان تنکو عبدالحلیم معظم شاہ کو ۲۸ر فروری ۱۹۷۱ء سے پانچ سال کے لئے آئینی شہنشاہ منتخب کیا گیا ہے۔

نائیجیریا۔

ملک کا نام نائیجریا جمہوریہ
سرکاری زبان فرانسیسی
سربراہ مملکت۔ الحاج عبدالرحمن جوری صدر
خاص برآمدات مونگ پھلی، گوند، لوہا، کھالیں
رقبہ۔ ۴۰۸۹،۲۰ مربع میل
یوم آزادی۔ ۳ر اگست ۱۹۶۰ء
آبادی۔ . . . ۳۹،۰۶ نفوس
رکن اقوام متحدہ۔ ۲۰ر ستمبر ۱۹۶۰ء
مسلم ۸۵ فیصد . . . ۳۳،۶۶ مسلمان
دارالحکومت نیامی (آبادی ایک لاکھ)
سکے۔ اسنیٹ۔ ایک فرانک

ایسے تاریخی شواہد بھی ملے ہیں جو نائیجریا پر رومنوں کے حملہ کا پتہ دیتے ہیں تاہم اس علاقہ کی قسمت اس وقت جاگی جب شمالی افریقہ اسلام کی روشنی سے منور ہو گیا اور مسلمان تاجروں کے قافلے جھیل چاڈ کے علاقے تک پہونچنے کے لئے اس علاقے کو استعمال کرنے لگے ان میں سے اکثر چاڈ اور نائیجریا میں آباد ہو گئے ۱۵۰۱ء میں سونگائی کے مسلمان مسقیہ محمد اول نے ہاؤسا قبائل پر لشکر کشی کر کے اگادیس کے شہر پر قبضہ کر لیا اور یوں تمام علاقوں پر مسلمانوں کی حکمرانی قائم ہو گئی وقت گذرنے کے بعد سلطنت مختلف مسلمان حکمرانوں کے تسلط میں جاتی رہی دوسری طرف ہاؤسا قبائل بھی سر اٹھانے لگے انھوں نے ۱۸۰۵ء میں مسلمان حکمران سے جو فولانی خاندان سے تھا حکومت چھین لی ۱۸۱۰ء میں فولانی رہنما عثمان نے لشکر کشی کر کے ہاؤسا ریاستوں کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا چنانچہ ان طویل روابط نے اور اسلام کی حقانیت نے مقامی مسلمانوں کے دلوں میں گھر کر لیا چنانچہ وہ اسلام قبول کرنے لگے کاشتکاری ہاؤسا اور سنگائی قبائل کے قبضہ میں ہے جو اب سو فیصد مسلمان ہیں ۱۹۲۲ء میں فرانسیسیوں نے اسے اپنی نو آبادی بنا لیا فرانسیسی استعمار سے نائیجریا کو ۳ر اگست ۱۹۶۰ء کو نجات ملی اس ملک کی پیداوار جوار، باجرہ، مونگ پھلی، گوند، روئی ہے معدنیات ٹین، لوہا اور نمک شامل ہیں۔

جنوبی یمن۔

ملک کا نام۔ یمن عوامی جمہوریہ
دارالحکومت۔ مدینۃ الشعب و عدن
سربراہ مملکت۔ سالم علی ربیعی (صدر)
سرکاری زبان۔ عربی
رقبہ۔ ۱۱۰،۷۵ امربع میل

خاص برآمدات۔ کپاس، مچھلی، کافی، چمڑا، تمباکو
آبادی۔ . . . . ۱۲۰۳۰۰ نفوس
یوم آزادی۔ ۳۰ر نومبر ۱۹۶۷ء
مسلم ۹۹ فیصد۔ ۱۲۰۱،۷۰۰ مسلمان
سکے۔ . . . افلوس۔ ایک دینار

عدن جو بحر احمر کا "جبل الطارق" کہلاتا ہے بڑی اہمیت کا حامل ہے انگریزوں نے اس کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے ۱۸۳۹ء میں اس پر قبضہ کیا عدن اس زمانے میں سلطان لاہج کی حکومت میں شامل تھا۔

۱۱ر فروری ۱۹۵۹ء کو جنوبی عرب کے چھ حکمرانوں نے ایک وفاق کی بنیاد رکھی ۴ر اپریل ۱۹۶۲ء کو آٹھ مشرقی ریاستیں بھی اس وفاق میں شامل ہو گئیں محاذ آزادی کے رہنما قحطان الشعبی کی بے مثال قربانیوں سے یہ ملک آزادی سے ہمکنار ہیں اور جنوبی یمن جمہوریہ کے نام سے ایک نئی اسلامی مملکت ۳۰ر نومبر ۱۹۶۷ء کو معرض وجود میں آئی جس میں عدن، مغربی عدن کا زیر حفاظت علاقہ اور مشرقی عدن کا انتدابی علاقہ بھی شامل ہے۔

شمالی یمن۔

ملک کا نام یمن عرب جمہوریہ
دارالحکومت۔ صنعا (آبادی ایک لاکھ)
سربراہ مملکت (صدر) جون ۷۴ء کے انقلاب کے بعد کرنل ابراہیم محمد الحمیدی سربراہ مملکت بنے)
سرکاری زبان عربی
رقبہ ۷۵،۳۰۰ مربع میل
یوم جمہوریہ ۲۸ر ستمبر ۱۹۶۲ء
مسلم۔ ۹۹ فیصد۔ . . . . ۴۹،۵۰۰ مسلمان
سکے۔ ایک ریال

آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں یمن کے ایرانی گورنر باذان نے اسلام قبول کیا اس طرح یمن میں اسلام کو فروغ حاصل ہوا حضرت ابوبکر صدیق کے عہد میں اسود عنسی نے یمن میں فتنہ ارتداد بلند کیا تو عکرمہ بن ابوجہل، مہاجر بن ابی امیہ مخزومی اور جبل بن حسن نے اس کا انسداد کیا اموئیوں کے بعد عباسی دور میں یہاں زیادتیں وزرا یعفورین، نجاحین، صلیحین، ہمدانیین، مہدیین طمودر تین ایوبی، رسولی، طاہری یعروبی اور زیدی ائمہ کی عملداری قائم رہی ۱۵۳۸ تا ۱۶۳۰ء اور ۱۸۴۹ء تا ۱۹۱۸ء میں ترکوں کی عثمانی سلطنت میں شامل رہا جنگ عظیم کے بعد یمن کی حکومت پھر زیدیوں کے ہاتھ آگئی۔

۲۶ر ستمبر ۱۹۶۲ء کو یمن میں کرنل عبداللہ سلال نے بادشاہت کا خاتمہ کر دیا ۵ر نومبر ۱۹۶۷ء میں ایک دوسرے فوجی انقلاب کے ذریعہ جنرل حسن العامری نے اقتدار سنبھالا یمن کے موجودہ سربراہ مملکت کرنل ابراہیم محمد الحمیدی ہیں۔ حدیدہ یمن کی اہم بندرگاہ بحیرہ احمر کے کنارے واقع ہے جس کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔

یوگنڈا۔

ملک کا نام۔ یوگنڈا جمہوریہ
دارالحکومت۔ کمپالا
سربراہ مملکت جنرل عیدی امین
سرکاری زبان۔ انگریزی
رقبہ۔ ۹۱۶۷ مربع میل
خاص برآمدات کپاس، ہاتھی دانت تمباکو، کافی
آبادی۔ ۸۴۴۳۰۰۰ نفوس
یوم آزادی۔ ۹/اکتوبر ۱۹۶۲ء
مسلم ۲۵ فیصد۔ ۲۱۷۰۰۵۰ مسلمان
سکے۔ ۱۰۰ سینٹ۔ ایک شلنگ

پندرھویں صدی عیسوی میں سوڈان اور مصر کی طرف سے مسلمان قبائل ہیما اور سیما یوگنڈا میں داخل ہوئے اور انھوں نے مقامی منتو قبائل پر اپنی برتری قائم کر لی۔ ۱۸۵۰ء کے لگ بھگ ایک عرب تجارتی قافلہ اس طرف سے گذرا اور یہاں کے بادشاہ "سونا" کے دربار میں پہونچا جہاں کے عقائد اسلامی سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گیا اور اس کے درباری بھی مسلمان ہو گئے اس سے پچاس سال قبل سے ہی کباکا (بادشاہ) یوگنڈا اور زنجبار کے سلطان سید عبدالماجد کے درمیان تحائف کا تبادلہ جاری تھا کباکا کے مسلمان ہونے کے بعد یہاں اسلام کا فروغ ہوا۔

۱۹/جون ۱۸۹۴ء کو برطانیہ نے اس پر قبضہ کر لیا جس کے ذریعہ عیسائی پادریوں نے حالات سازگار بنا رکھے تھے برطانوی استعمار کے خلاف آزادی پسند تحریکوں نے ۱۹۴۳ء میں یہاں عدم تشدد کی تحریک شروع کی جس کے نتیجہ میں ۹/اکتوبر ۱۹۶۲ء کو اس سے نجات ملی اور ابوتے کباکا کو یوگنڈا کا صدر منتخب کیا گیا ۲۵/جنوری ۱۹۷۱ء کو ایک فوجی انقلاب کے ذریعہ جنرل عیدی امین برسر اقتدار آگئے۔

عراق۔

دریائے فرات اور دجلہ کے درمیانی علاقہ میں ۱۷۱۰۵۵۴ مربع میل پر مشتمل عراق کی آزاد اور خود مختار ریاست واقع ہے عراق کا شمار مشرق اوسط کے تیل پیدا کرنے والے ممالک میں ہوتا ہے سالانہ تقریباً ۵۳ ہزار بیرل تیل پیدا ہوتا ہے اس کی سرحدیں ترکی، ایران اور اردن سے ملتی ہیں ملک کی آبادی میں تقریباً ایک لاکھ کردباشندے ۵۵ سال سے آزادی کا علم بلند کئے ہوئے ہیں مشرق اوسط کے اس خطہ میں بارشیں بہت ہی کم (تقریباً ۵ انچ سالانہ) ہوتی ہیں پہاڑی علاقوں میں ۲۰ (انچ) ہوتی ہیں)

۱۲۸۵ء میں منگولوں نے بغداد پر حملہ کر کے عباسیہ خاندان کی حکومت کا خاتمہ کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا ۱۵۱۲ء میں ترکوں اور ایرانیوں میں اقتدار کی خاطر متعدد جنگیں ہوئیں اور آخر کار ۱۶۳۸ء میں عراق پر ترکوں نے قبضہ کر لیا جنگ عظیم اول میں مکہ کی ایک معروف شخصیت شریف حسین نے ہنری میکموہن (برطانوی ہائی کمشنر متعینہ مصر) کے ساتھ خفیہ مذاکرات کر کے عراق میں ترکوں کو شکست دلوائی برطانیہ نے ۱۹۱۷ء میں پہلے بغداد پر اور پھر ۱۹۱۸ء میں موصل پر قبضہ کر کے عراق کی فتح کو مکمل کر لیا مارچ ۱۹۲۱ء میں سکریٹری فار کالونیز ونسٹن چرچل نے قاہرہ میں اپنے فوجی اور سیاسی ماہرین سے مشرق اوسط خاص طور پر عراق کی صورت حال پر مشورہ کیا اور یہ طے کیا کہ فیصل ابن شریف حسین (لارنس آف عربیا کا دست راست) کا عراق کا تخت دیدیا جائے پروگرام کے مطابق فیصل ۲۳ جون ۱۹۲۱ء کو عراق آیا۔ ۱۱/جولائی کو کونسل کے سامنے برطانوی نمائندہ نے فیصل کا مسئلہ پیش کیا کونسل نے اس شرط پر کہ اگر ملک میں دستوری اور نمائندہ جمہوری حکومت قائم کی جائے تو فیصل کو بادشاہ بنانے کے لئے تیار ہے ۲۲/اگست ۱۹۲۱ء کو فیصل کو بادشاہ بنایا گیا ۲۱/مارچ ۱۹۲۵ء کو فیصل نے ملک میں پہلا دستور نافذ کیا یہ دستور برطانوی طرز کا تھا اس میں اگرچہ اسلام کو سرکاری مذہب قرار دیا گیا تھا لیکن اقتدار اعلیٰ کے مالک عوام ہی تھے ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۲ء تک مسلسل ترکی اور ایران کی سرحدوں پر کرد آبادی بغاوت پر رہی ان کا مطالبہ تھا کہ کردستان کا الگ صوبہ قائم کیا جائے ۱۹۳۲ء میں عراق لیگ آف نیشنز کا ممبر بنا اور اگلے سال برطانوی انتداب ختم کر دیا گیا ۱۹۳۳ء میں فیصل اول کا انتقال ہو گیا اس کی جگہ غازی احمد اس کا بیٹا بادشاہ بنا ۱۹۳۴ء میں عراق میں کمیونسٹ پارٹی ترتیب دی گئی ۱۹۳۶ء میں دوسری جنگ عظیم کے دوران غازی احمد کار کے حادثہ میں جاں بحق ہوا اس کی جگہ چار سالہ فیصل دوم نے لی ۱۹۵۳ء تک اختیارات ریجنسی کونسل کے سپرد رہے ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو اس خوفناک جنگ کے شعلے عراق تک بھی پہونچ گئے جنگ کے ابتدائی سالوں میں عراق نے غیر جانبدار رہنے کی کوشش کی لیکن ۱۹۴۳ء میں برطانیہ کے دباؤ پر عراقی حکومت نے جرمنی اور اٹلی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا حالانکہ لوگوں کی ہمدردیاں اٹلی اور جرمنی کے ساتھ تھیں جنگ کے بعد عراق عرب لیگ اور یو این او کا ممبر بنا۔ ۱۹۳۵ء میں ریجنسی کونسل ختم کر کے اختیارات فیصل دوم کے سپرد کئے گئے ۱۹۵۴ء میں ملک میں عام انتخابات ہوتے وزیر اعظم عمر نے استعفیٰ دے دیا اس کی جگہ نوری السعید نے اس نے اس شرط پر وزارت قبول کی کہ انتخابات کو کالعدم قرار دیدیا جائے دوبارہ انتخابات میں نوری واضح اکثریت سے کامیاب ہوا نوری نے وزیر اعظم بنتے ہی اپوزیشن کو پریشان کرنا شروع کر دیا تحریر و تقریر پر بے شمار پابندیاں لگا دیں کمیونسٹوں اور اسلام پسندوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سیاسی جماعتیں تقریباً ختم ہو گئیں کمیونسٹ زیر زمین چلے گئے۔

۲۴/فروری ۱۹۵۵ء کو عراق بغداد پیکٹ میں شامل ہوا عرب لیگ کے ممالک نے ردعمل کے طور پر عراق کا بائیکاٹ کر دیا ۱۹۵۶ء میں جنگ سوئز شروع ہوئی عراق نے اپنی فوجیں اردن کی مدد کے لئے بھیجیں نومبر ۱۹۵۶ء میں عراق نے فرانس سے تعلقات ختم کر دیئے اور بغداد پیکٹ کے اجلاس میں شرکت سے انکار کر دیا ۱۹۵۷ء میں فیصل نے امریکہ کا دورہ کیا فروری ۱۹۵۸ء میں عراق اور اردن وفاق میں شامل ہو گئے جولائی ۵۸ء میں بریگیڈیئر جنرل کریم قاسم نے انقلاب برپا کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا اپنی دنوں نوری فیصل اور فواد کو قتل کیا گیا انقلاب کے دو ہفتے بعد قاسم نے ملک میں عارضی دستور نافذ کیا ستمبر میں زرعی زمین کی حد ۲۰۰۰ ایکڑ سے ۵۰۰ ایکڑ تک مقرر کی گئی ۳۰/ستمبر ۱۹۵۸ء کو قاسم نے اپنے دست راست عبدالسلام عارف کو وزیر داخلہ اور ڈپٹی وزیر اعظم کے عہدوں سے فارغ کر کے جرمنی میں سفیر مقرر کر دیا ۴/نومبر ۱۹۵۸ء کو عبدالسلام عارف کو ملک بلا کر بغاوت کے الزام میں نظر بند کر دیا گیا ۸/مارچ ۵۹ء کو موصل میں کرنل عبدالوہاب شواف نے بغاوت کر دی قاسم نے کمیونسٹوں سے مدد سے بغاوت پر قابو پا لیا اس بغاوت میں دو ہزار افراد مارے گئے ۵ ہزار گرفتار ہوئے اس کے علاوہ قاسم نے نوری کے زمانہ کے ملک بدر کمیونسٹوں کو ملک میں آنے کی اجازت دے دی۔

جولائی ۱۹۵۹ء میں قاسم نے ۲۵ ہزار کمیونسٹ سولین ملیشیا کو فوج کے حوالے کر دیا تاکہ بوقت ضرورت ان سے کام لیا جاسکے انہی دنوں کردوں نے بغاوت کر دی اس بغاوت میں کمیونسٹ بھی شریک تھے چنانچہ قاسم نے براہ راست اس کی ذمہ داری کمیونسٹوں پر ڈالی ۱۹۶۰ء میں قاسم نے کردیش ڈیموکریٹک پارٹی جس پر ۱۹۵۴ء سے پابندی لگی ہوئی تھی کام کرنے کی اجازت دیدی ۱۹۶۰ء میں ملک میں جمہوریت کا سورج طلوع ہونے لگا ۱۹۶۴ء میں عبدالکریم قاسم کا تختہ الٹ دیا گیا اور اس کی جگہ عبدالسلام عارف نے لی ۱۹۶۵ء میں عبدالسلام عارف ہوائی حادثہ کا شکار ہوا اور ملک کا نیا صدر عبدالرحمٰن عارف کو بنایا گیا ۱۹۶۷ء میں عرب اسرائیل جنگ شروع ہوئی عراق نے اپنی فوجیں اردن اور شام کی مدد کے لئے بھیجیں جنگ کے ایک سال بعد عبدالرحمٰن عارف کا تختہ الٹ دیا گیا اس کی جگہ حسن البکری نے لی حسن البکری کے زمانہ میں کردوں نے متعدد دفعہ بغاوت کی حکومت بنارک پر پالنے میں تقریباً ناکام رہی ہے ۱۹۷۳ء میں عرب اسرائیل جنگ میں عراق نے پہلے کی طرح اپنی فوجیں شام وغیرہ میں مدد کے لئے روانہ کیں جنگ کے بعد مشرق وسطیٰ کے جن ممالک نے امریکہ، برطانیہ اور دوسرے ممالک کا تیل کے سلسلہ میں بائیکاٹ کیا تھا عراق بھی ان ممالک میں شامل ہے امریکہ مصر مذاکرات کے نتیجہ کے طور پر جب مصر نے تیل پر پابندی ختم کی تو لیبیا کی طرح عراق نے بھی پابندی ختم کرنے پر احتجاج کیا آج کل عراق میں کردوں نے بغاوت کی ہوئی ہے کردوں کی قیادت ملا مصطفٰی ابرزانی کے ہاتھ میں ہے اس بغاوت میں عراق کی فضائیہ اور پیدل فوج حصہ لے رہی ہے جب کہ کرد عراق کے متعدد طیارے گرا چکے ہیں۔

اومان۔

محل وقوع۔ خلیج فارس پر حضر موت کے مشرق میں مملکت اومان واقع ہے اس کے شمال میں خلیج اومان، مغرب میں سعودی عرب کا صحرا ربع الخالی اور عدن واقع ہے۔

رقبہ۔ . . . ۸۲۰۰۰ مربع میلے

آبادی۔ اس کی آبادی تقریباً چار لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔

دارالحکومت۔ مسقط اور دیگر اہم شہر مطرہ

زبان۔ عربی ملک کی سرکاری زبان ہے عربی کے علاوہ ہندی، اردو، بلوچی اور دوسری زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔

مذہب۔ اسلام

معدنی پیداوار۔ یہاں صنعتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

مختصر تاریخ۔ ۱۶ ویں صدی عیسوی میں پرتگالیوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۶۵۰ء میں مقامی لوگوں نے پرتگالیوں کو ملک سے باہر نکال دیا اس کے بعد ۱۷ ویں صدی کے آخری عشرے میں ایرانیوں نے اس پر قبضہ کر لیا اور ۱۷۴۴ء تک یہاں حکومت کرتے رہے اس دوران اومان نے ممباسہ۔ دیگر جزائر زنجبار اور مشرقی افریقہ میں پرتگالی مقبوضات فتح کر لئے ۱۷۸۴ء میں ساحل بلوچستان پر واقع بندرگاہ گوادر کو خان قلات اومان کے حوالے کر دیا اسے ستمبر ۱۹۵۸ء میں ۸۴ ملین ڈالر کے عوض خرید لیا۔

۱۹۵۸ء میں برطانیہ نے مسقط کے ساتھ کیا ہوا معاہدہ ختم کر دیا نتیجہ کے طور پر سید بن سلطان (۱۸۵۴ء۔۱۹۵۶ء) یہاں کا حکمران بنا مسقط نے امریکہ (۱۸۳۳ء میں فرانس سے ۱۸۴۶ء میں اور نیدر لینڈ سے ۱۸۷۷ء میں) کے ساتھ کئے گئے تمام معاہدے توڑ دیئے اور برطانیہ کے ساتھ معاہدوں کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا اس ضمن میں سب سے آخری معاہدہ ۱۹۵۱ء میں طے پایا ۲۳ جولائی ۱۹۷۰ء کو سلطان بن تیمور کو اس کے بیٹے قیوس بن سعید نے معزول کر دیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے مملکت کا نام اومان رکھا اب تو انہوں نے اومان کو ترقی یافتہ ممالک کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے ایک جامع منصوبہ بنایا اور ان باغیوں کی سرکوبی کے لئے اقدامات کئے جو اومان کے جنوبی علاقوں میں تخریبی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔

معاہدوں اور تنظیموں سے وابستگی۔ اومان عرب لیگ، اقوام متحدہ اور اسلامی سکریٹریٹ کا رکن ہے۔

مشہور شخصیات۔ اومان کی سب سے مشہور شخصیت عبداللہ بن عبادرب (۶۹۹ء) کی ہے جو اومان کے ایک مذہبی رہنما تھے۔

نضر بن حارث جو آپ کا مخالف ہونے کے ساتھ دنیوی معاملات میں قریش کے اندر سب سے زیادہ تجربہ کار تھا، اس نے ایک روز اپنی قوم سے کہا "قریش کے لوگو! محمدؐ کی دعوت نے تم کو ایسی مشکل میں ڈال دیا ہے جس کا کوئی حل تمہارے پاس نہیں ہے۔ وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے بچپن سے جوان ہوئے ہیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ تمہارے درمیان سب سے زیادہ سچے، سب سے زیادہ امانت دار اور سب سے زیادہ پسندیدہ شخص تھے۔ لیکن جب ان کے بال سفید ہونے کو آئے اور انہوں نے وہ کلام پیش کیا جس کو تم سن رہے ہو تو اب تمہارا حال یہ ہے کہ تم کہتے ہو یہ شخص جادوگر ہے، یہ شاعر ہے، یہ مجنون ہے" خدا کی قسم میں نے محمدؐ کی باتیں سنی ہیں، محمدؐ نہ جادوگر ہے، نہ وہ شاعر ہے، نہ وہ مجنون ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی اور مصیبت تمہارے اوپر آنے والی ہے۔

(سیرۃ النبی لابن ہشام جلد اص ۳۱۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "انسان کے لئے روزی کے دروازے عرش سے فرش تک کھلے پڑے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس کی طلب و ہمت کے بقدر روزی دیتا رہتا ہے۔"

(حلیۃ الاولیاء عن الزبیر)

محمود الازہار ندوی ایم۔ اے۔

ماریشس کے مسلمان

ماریشس بحرِ ہند میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جس کا رقبہ صرف ۷۲۰ میل مربع ہے آبادی تقریباً سات لاکھ ہے یہاں کے باشندے زمانہ قدیم ہی سے ملکی اور خارجی عناصر سے مخلوط ہیں جو اس جزیرہ میں آ کر سکونت اختیار کر لی، ان میں مختلف النسل چینی، ہندوستانی فرانسیسی اور انگریز نژاد ہیں۔

ماریشس ہمیشہ سے غیر ملکی بڑی طاقتوں کی زور آزمائی کا شکار رہا ہے۔ ہالینڈی فرانسیسی اور انگریزوں نے باری باری اس جزیرہ پر قبضہ کیا لیکن ۱۸۱۰ میں برطانیہ نے قبضہ کر لیا اور اس تاریخ سے برطانوی سامراج کا ایک جزء ہو گیا۔

اس وقت ماریشس میں دستوری حکومت ہے پارلیمنٹ ہے اور اقتدار اعلیٰ کی مدد کے لئے منتخب شدہ ارکان میں سے قانون ساز ادارہ ہے۔

مسلمانوں کا داخلہ

ماریشس میں اسلام کی دعوت اور تبلیغ افریقہ میں اسلامی دعوت کے ضمن میں آتی، اسلام کی دعوت افریقہ کے دوسرے جزیروں کی طرح مقبول ہوئی۔ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ جزیرہ عرب کے کچھ مسلمان تاجروں نے اسلام کو پھیلانے کی غرض سے تجارت کو وسیلہ بنایا، اور اسلام کی دعوت اس جزیرہ تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے، اسلام کو جزیرہ میں مقبولیت ملی اور قدم جماتے لیکن محدود کیوں کہ پورا جزیرہ اسلام کے سایہ میں نہیں آسکا اس کا اہم سبب رسل و رسائل کی کمی اور راستوں کی ناہمواری اور ٹوٹا ہونا ہے۔

مسلمان داعیوں نے اس جزیرہ کو اپنا وطن بنایا اور ایک فرد کی حیثیت سے زندگی گذارنے لگے، اور ملکی باشندوں سے مل جل کر اپنے کو وطنی لوگوں سے بہت ہی قریب کیا، مسلمان اس جزیرہ کے مختلف بعید المسافت جگہوں پر رہتے ہوئے اپنے تعلقات ایک دوسرے سے برابر رکھے رہتے ہیں اور اپنی مشکلوں میں ایک دوسرے سے مشورہ اور تعاون بھی کرتے ہیں۔

تعلقات کی ہم آہنگی کی وجہ سے ایک ایسے اسلامی معاشرہ کی بنیاد پڑی جس کا مقصد دینی اور اخلاقی اور مذہبی فرائض کو انجام دینے کے لئے مدرسہ قائم کرنا ہے۔ اس وقت جزیرہ میں ۸۰ مسجدیں ہیں جہاں قرآن کی ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے۔ صرف ماریشس کی راجدھانی پورٹ لوئس میں چھ مسجدیں ہیں۔

مسلمانوں کی تعداد

ماریشس کی مجموعی آبادی کے اعداد و شمار سرکاری طور پر نہیں ملتے اس لئے مسلمانوں کی تعداد بھی صرف اندازوں اور قیاسات پر مبنی ہے۔ ایک عام اندازہ کے مطابق مسلمانوں کی تعداد ۱۱۰۰۰۰ ہے لیکن اسی تعداد کو گھٹا کر پیش کیا جائے تو ۸۵ ہزار ہی رہ جاتی ہے اور بڑھا کر پیش کیا جائے تو ۱۲۰۰۰۰ ہو جاتی ہے۔

مذکورہ اعداد و شمار کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ با آسانی لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمان اقلیت میں ہیں اور اس وجہ سے مسلمانوں کی حالت اچھی نہیں ہے اور مسلمان خود مختلف فرقوں اور مذاہب میں منقسم ہیں... مسلمانوں کی تعداد اور دیگر مذاہب کے اعداد و شمار اس طرح ہیں۔

ہندو	۳۰۰،۰۰۰
عیسائی	۲۰۰،۰۰۰
مسلمان	۱۱۰،۰۰۰
چینی	۴۰،۰۰۰
اور دوسرے مذاہب	۵۰،۰۰۰
میزان	۷۰۰۰۰۰

مسلمانوں کی اقتصادی حالت

ماریشس مسلمانوں کی اکثریت مہاجروں کی ہے، ہندوستان اور دیگر ممالک سے ترک وطن کر کے آئے اور سکونت اختیار کر لی، مسلمانوں کی اقتصادی حالت مناسب ہے لیکن کالے مسلمانوں کی اقتصادی حالت ٹھیک نہیں ہے اکثریت غریب اور ناداروں کی ہے یہاں تک کہ اسلامی کالجوں میں طلباء کی اکثریت غیر مسلموں کی ہے جو ۶۰ فیصد بتائی جاتی ہے کیوں کہ مسلمان کالج کے مصارف برداشت نہیں کر سکتے ہیں اور جو طلباء پڑھتے ہیں وہ مالدار اور خوش حال مسلمانوں کے لڑکے ہوتے ہیں جن کی تعداد بہت ہی کم ہے۔

مسلمانوں کی عمومی حالت بھی متوسط سے نیچے ہے دین سے بے تعلقی اور لاعلمی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ حج پر جانے والوں کی تعداد ایک سال کے لئے صرف ۱۲ ہی ہوتی ہے اس کا بنیادی سبب واعظوں، استادوں اور مدارس میں تعلیم کی کمی ہے۔

اس جزیرہ میں مسلمان ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ دیہات، شہر ہر جگہ موجود ہیں اور اپنے ساتھ مدرسے اور مسجدیں بھی لئے ہوتے ہیں لیکن یہ مدارس اور مسجدیں لوگوں کی عنایتوں کے محتاج ہیں، ان کو استادوں کی ضرورت ہے نصاب کی دینی کتابیں نہیں ہیں اور عربی زبان کی قواعد کی کتابیں بھی اسی طرح کمیاب ہیں۔

مسلمانوں کے دوسرے مذہب والوں سے تعلقات اچھے نہیں ہیں بلکہ تماسایں اور کشیدہ رہتے ہیں اور بہت سے معاملات میں دونوں میں بالکل علیحدگی پائی جاتی ہے۔ ہندو اکثریت میں ہونے کی وجہ سے سیاست پر قابض ہیں چینی اگرچہ بہت ہی کم ہیں، لیکن اقتصادیات پر قبضہ ہے اور خاص طور سے راجدھانی کی اقتصادیات،

ماریشس میں مسلمانوں نے یتیموں کے لئے بھی انتظام کیا ہے اور اس کے لئے علامہ عبد العلیم صدیقی مرحوم نے ایک مخصوص ادارہ قائم کیا اس میں اس وقت تنو یتیم ہیں اور حکومت ہر مہینہ ہر یتیم کو تیس روپیہ مدد کے طور پر دیتی ہے۔

۱۹۵۹ء میں مسلمان نوجوانوں کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا اور خراب حالت کی اصلاح کی فکر ہوئی اور مخالف حالات سے مقابلہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اسلامی تنظیم قائم کی جس کا اولین مقصد مسلم عوام کی بہتری کے لئے کام کرنا تھا۔ اس کا مرکز راجدھانی میں رکھا البتہ اس کی شاخوں کو دوسرے شہر اور قصبوں تک پھیلایا اس کے علاوہ بھی دوسری چھوٹی تنظیمیں ہیں جن کا دائرہ محدود ہے۔ زکوٰۃ وصول کرنا غریب مسلمان کے مرنے والوں کی تجہیز وتکفین، اور تدفین ہے، مختلف مدرسوں میں اول پاس۔ طلبا کو وظیفہ دینا لڑکوں کو مفت کتابیں مہیا کرنا ہے۔ اس کے علاوہ لڑکیوں کے لئے گھریلو کام کاج اور دستکاری کی تعلیم دینا ہے۔

قانون ساز ایوان

قانون ساز ایوان کا مطلب وہ ایوان ہے جو اقتدار اعلیٰ کی حکومت چلانے میں مدد کرتا ہے۔ اس کے ۷۰ ارکان ہیں۔ ۶۲ ارکان منتخب ہو کر آتے ہیں اور نو کو خود ایوان منتخب کر کے متعین کرتا ہے اور ۳ سرکاری عہدیدار ہیں مسلمانوں کی نمائندگی ساٹھ ارکان کرتے ہیں، ان میں سے دو وزارت کے عہدے پر فائز ہیں، انتخاب کا حق سب کو حاصل ہے، ایوان کا انتخاب ہر پانچ سال ہوتا ہے اور جس طبقہ کو کوئی سیٹ نہیں ملتی ہے اس کے ارکان حاکم مقرر کرتے ہیں مسلمان چونکہ اقلیت میں ہیں اس لئے وہ کچھ نہیں کر پاتے ہیں اور کسی اہم کام کو سرگرمی اور دلچسپی سے انجام نہیں دے پاتے ہیں۔

عیسائی مشنریاں

عیسائیوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے لیکن ان کی تبلیغی سرگرمیاں بہت ہی مضبوط اور مربوط ہیں ان کے مدرسے ترقی یافتہ ہیں، اس لئے ہر شخص اس میں زیر تعلیم رہنا چاہتا ہے۔ مسلمان لڑکوں کی ایک بڑی تعداد ان مدرسوں میں زیر تعلیم ہے اس وقت ماریشس میں ۱۰۴ مبلغ اور ۲۲۶ راہب ہیں۔

قادیانی اور بہائی سرگرمیاں

قادیانی اس جزیرہ میں ۵۰ سال قبل آئے اور اس وقت سے ان کی تعداد صرف ۵۰۰ ہے لیکن وہ لوگ مغرب کے پروردہ ہیں اور بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز ہیں، اسلام کا نام لے کر تبلیغ کا کام کرتے ہیں مگر اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ آپس میں اتفاق ہے، عوام اور طلبا میں کتابیں تقسیم کرتے ہیں غریبوں کو وسائل مہیا کرتے ہیں اور آگے وقتوں میں ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن سب سے تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کی تعداد اتنی کم اور محدود ہے لیکن دولت کثیر ہے۔ قادیانیوں کے علاوہ کچھ بہائی بھی ہیں لیکن ان کی سرگرمیاں بہت ہی کم ہیں اور وسائل نہ ہونے کے برابر ہے، لیکن ان دونوں طبقوں کی سرگرمیوں سے مسلمان پریشان ہیں۔!!!

اسلام کی امامت

اصل یہ ہے کہ اسلام کی امامت بڑی نازک اور وسیع صفات کو چاہتی ہے جو فرد یا جماعت اس منصب پر فائز ہو اس کے لئے ذاتی صلاح وتقویٰ اور عدل کے علاوہ جہاد و اجتہاد کی قابلیت کی بھی ضرورت ہے، یہ دو لفظ بہت سادہ اور ہلکے ہیں لیکن معانی ومطالب سے لبریز، جہاد سے مراد ہے عزیز ترین اور اہم ترین مطلوب کے حصول کے لئے اپنی انتہائی طاقت اور وسائل صرف کر دینا، مسلمان کا سب سے بڑا مقصود اللہ کی فرماں برداری اس کی خوشنودی کا حصول اور اس کی بادشاہی اور احکام کے سامنے سپردگی اور سرافگندگی ہے، اس کے لئے ایک طویل جہاد کی ضرورت ہے، ہر اس عقیدہ، تربیت، اخلاق، اغراض اور خواہشات کے خلاف جو اس میں مزاحم ہوں اور ان تمام نفسی و آفاقی (داخلی و خارجی) آلہہ و معبودان باطل کے خلاف جو اللہ کی فرماں برداری اور اخلاص میں حریف اور رقیب ہوں جب یہ مقصد حاصل ہو جائے تو مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ اللہ کی بادشاہی اور اس کے احکام کو اپنے گردوپیش کی دنیا اور اپنے بنی نوع پر پھیلانے کے لئے جدوجہد کرے یہ اس کا دینی فریضہ ہے اور خلق خدا پر شفقت اور مخلوق کے ساتھ خیر خواہی کا بھی یہی مقتضا ہے، اور اس لئے بھی ضروری ہے کہ بعض اوقات انفرادی اطاعت اور دینداری بھی ماحول کی سازگاری کے بغیر مشکل ہو جاتی ہے۔

سید ابو الحسن علی ندوی

حکیم اجمل خاں

ذہنی پریشانیاں اور الجھنیں انسان کو زندگی میں ناکام بنا دیتی ہیں مگر ذہنی سکون، اور اطمینان
مب انسان شادمانیوں اور کامیابیوں سے ہم کنار کر دیتا ہے۔

نفسیاتی طور پر انسان کامیابی سے ہم کنار ہونے کے لئے سکون تلاش کرتا ہے۔ خدا کی عبادت
ےکے مذہبی توہمات میں ڈوب کر، چلہ کشی و دم کشی کر کے شراب پی کر، افیون، گانجہ، کوکین، بھنگ یا تمباکو کھا
ؤ اسے ہر دم سکون کی تلاش ہے۔ کیوں کہ سکون میں ہی کامیابی کا راز ہے۔ انسان دن بھر کا تھکا ماندہ اور
بیشان حال ہوتا ہے۔ قدرت نے اسے ذہنی سکون کے لئے نیند کی نعمت سے سرفراز کیا ہے۔ وہ رات کو
ی نیند سو کر ہر صبح تازہ دم اٹھتا ہے۔ اور پھر زندگی کی نئی منزل اور نئی راہ کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے۔

لکون کیا ہے۔

اس لئے اگر آپ کو زندگی سے پیار ہے۔ آپ کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں طویل عمر چاہتے ہیں
دماغی دکامرانی سے ہمکنار ہونا چاہتے ہیں۔ اچھی صحت سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں تو اپنے مقصد کی
یل کے لئے سکون کی تلاش کیجئے۔ ڈاکٹر الیکس کارل کا قول ہے۔

جو لوگ انتہائی شور و غل آلود شہروں و آبادیوں میں اپنا قلبی سکون و اطمینان برقرار رکھ سکتے ہیں
، اعصابی امراض سے محفوظ رہتے ہیں۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ذہنی پریشانیاں و الجھنیں نہ صرف یہ کہ آپ کو زندگی میں ناکام بنا دیتی ہیں۔
۔ وہ اعصابی امراض کا شکار کر دیتی ہیں۔ آرام و سکون سے آلودہ زندگیاں کبھی عصبی امراض کا شکار نہیں ہوتی
ام و سکون کے لئے آپ نہ صرف اپنے لئے مفید بنتے ہیں۔ بلکہ دوسروں کے لئے بھی مفید۔

سکون آپ کو پر وقار بناتا ہے۔ اطمینان سے آپ کی شخصیت میں جاذبیت پیدا ہوتی ہے۔
ام میں آپ عمدہ سوچ سکتے ہیں۔ دوسرے کو عمدہ مشورہ دے سکتے ہیں۔ ہر آدمی آپ کی طرف بھاگے گا
ےگا۔ اس لئے کہ دراصل آپ ہی ایک کامیاب آدمی ہیں۔

آپ اگر ایک ماہر نفسیات سے دریافت کریں گے۔ کہ آپ کے نزدیک متوازن شخصیت نال
ن ہے۔ تو وہ یہی کہے گا۔ جسے سکون اطمینان قلب حاصل ہے۔ ہم میں بہت سے آدمی اچھی صلاحیت
ی شخصیت اور عمدہ شعور کے مالک ہیں لیکن انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو اطمینان و سکون کے ساتھ
تعمال نہیں کیا۔ اگر یہ لوگ اپنی زندگیوں میں سکون پیدا کر لیں۔ تو بھاری انقلاب لا سکتے ہیں والٹن
ے ایسے ہی لوگوں کے لئے کہا ہے۔

شعوری کوششوں سے زندگی کو بلندیوں تک لیجانے کے لئے بھی انسان کی صلہ

صلاحیت کے علاوہ کسی دوسری حوصلہ افزا حقیقت کا علم نہیں۔ اگر آپ خود اعتمادی
خلوص کے ساتھ کامیابی کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں۔ تو اپنے خیال کے مطابق زندگی
کو ڈھالنے کی کوشش کیجئے۔ اسی سے آپ ایسی کامیابی سے ہم کنار ہو جائیں گے۔ جو
ناقابل توقع ہوگی۔

سکون ایک بنیادی ضرورت

آرام و سکون صحت کے لئے بے حد ضروری ہیں۔ اگر آپ کو سکون نہ ملے۔ تو آپ کے اعصاب
تھک جائیں اور اعصاب کی تھکاوٹ نہ صرف ذہنی سکون کو ختم کر دیتی ہے۔ بلکہ جسم کے دوسرے اعضا
بھی کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ خاص طور پر عصبی اعضا مثلاً ہضم کا پورا نظام باطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ انسان
مختلف امراض کا شکار ہو کر اپنی صحت کو کھو بیٹھتا ہے۔

پاگل پن ایک بہت بڑا مرض ہے۔ جو اصل میں ذہنی عدم توازن کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ اس مرض
میں سکون جاتا رہتا ہے۔ اعصاب حرکت کرتے ہیں مگر غیر شعوری حرکات، پاگل پن کے مریض کو اچھا کرنے
کے لئے ضروری ہے کہ ہم اسے غیر معمولی سکون دیں۔ جنسی عدم سکون بھی انسان کو بیماریوں کا شکار بنا دیتا
ہے۔ عورتیں ہسٹریا میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اور مرد مختلف پوشیدہ امراض کا شکار بن جاتے ہیں۔

اچھی فکر کے لئے عمدہ سکون کی ضرورت ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ گہری فکر کے آدمی بہت پر سکون
ہوتے ہیں۔ وہ ان لوگ سب سے زیادہ پر سکون ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی میں گویا انتشار اور پراگندگی
نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ان میں کوئی جذبہ بھی ایسا نہیں ہوتا جو ان کے سکون کو عدم سکون میں بدل دے۔
یہی حال فلاسفر کا ہے۔ پر سکون اور خاموش طبیعت لوگوں کے بارے میں مشہور ہو جاتا ہے کہ وہ بہت
گہری فکر کے آدمی ہیں۔ یہ لوگ اپنے سکون کا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور دنیا کو اس سے مستفید کرتے ہیں
آپ نے بہت سے لوگوں کو کہتے سنا ہوگا۔ ٹھنڈے دل سے بات کرو۔؟ اس سے ان کا یہی مطلب ہوتا ہے
کہ پر سکون ہو کر بات کیجئے کیونکہ بات سکون ہی میں اچھی طرح کی جا سکتی ہے۔

سکون کی تلاش

ہر انسان سکون کی تلاش میں ہے۔ اس لئے کہ اسے زندگی گذارنے کے لئے سکون کی ضرورت ہے
انسان کو عبادت میں سکون ملتا ہے وہ عبادت کرتا ہے۔ مذہب میں سکون ملتا ہے تو مختلف عقائد کی پابندی
کر کے ان پر عمل کر کے سکون حاصل کرتا ہے۔ جب ایک عقیدہ میں اسے سکون نہیں ملتا تو دوسرا عقیدہ اپناتا ہے

بقیہ ص ۲۷۵ پر

صنعتی میدان

کسی نئی صنعت کو شروع کرنے یا کسی چلتے ہوئے کاروبار کو آگے بڑھانے میں مختلف مسائل درپیش ہوتے ہیں اس میدان میں مختلف تنظیمیں اور ادارے کام کر رہے ہیں۔

یہ جاننا ضروری ہے کہ کس کام کے لئے کس کی مدد حاصل کی جائے۔ یہاں ان تمام اداروں کا تعارف کرادیا گیا ہے۔ جو چھوٹی صنعتوں کی ترقی کے لئے کام کر رہے ہیں ان کے دائرہ کار کی وضاحت بھی کردی گئی ہے۔

(الف) صنعتی میدان منتخب کرنے کے لئے

اسمال انڈسٹریز سروس انسٹی ٹیوٹ

یہ ادارہ صنعتوں کے انتخاب، کہاں انھیں شروع کیا جائے۔ ان کے لئے کس طرح کے کچے مال اور کیسی مشینوں کی ضرورت ہوگی ان سے متعلقہ مسائل کے متعلق مشورہ دیتا ہے۔

ان کے متعلق پچھلی اشاعت میں بھی بتلایا جاچکا ہے ان کی تنظیم، دائرہ کار اور پتے اس اشاعت میں الگ دیئے جارہے ہیں۔

انڈین انوسٹمنٹ سنٹر
پارلیمنٹ اسٹریٹ نئی دلی

یہ ادارہ غیر ملکی سرمایہ کی شمولیت اور تکنیکی اشتراک کے متعلق مشورہ دیتا ہے۔

وزارت صنعتی ترقی حکومت ہند نئی دلی

جن صنعتوں کے قیام یا جن کی توسیع کے لئے غیر ملکی اشتراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ وزارت صنعتی ترقی حکومت ہند نے ان کی منظوری دی ہے۔

(ب) رجسٹریشن کے لئے

۱۔ ڈائرکٹر آف انڈسٹریز سے رجسٹریشن نمبر حاصل کرنا ضروری ہے۔

۲۔ اسمال انڈسٹریز سروس انسٹی ٹیوٹ کے یہاں رجسٹر کرکے آپ سرکاری خرید میں شامل ہوسکتے ہیں رجسٹر شدہ اداروں کا مال حکومت خریدتی ہے۔

کارخانے کی جگہ کے لئے

ڈائرکٹر آف انڈسٹریز سے رابطہ قائم کریں۔ یہ ڈائرکٹریٹ انڈسٹریل اسٹیٹ میں شیڈ کرایہ پر دیتا ہے یا ترقی یافتہ زمین کارخانہ بنانے کے لئے دیتا ہے جہاں بجلی اور پانی کی سہولت ہوتی ہے۔ کارخانہ کا نقشہ میونسپلٹی سے منظور کرانا ضروری ہے پانی اور بجلی کا انتظام ریاستی حکومت یا متعلقہ تنظیم کے ذریعہ ہوسکتی ہے۔

مشینوں کی خرید کے لئے

اسمال انڈسٹریز سروس انسٹی ٹیوٹ

یہ ادارے مختلف اشیاء کی تیاری کے لئے مشینوں اور دیگر سازوسامان کے انتخاب کے متعلق مشورہ دیتے ہیں۔

نیشنل اسمال انڈسٹریز کارپوریشن

۲۔ مقامی اور درآمد کی ہوئی مشین آسان قسطوں پر فروخت کرتا ہے۔

۳۔ ریاستی اسمال انڈسٹریز کارپوریشن لمبی مدت کے قرضوں کے ذریعہ ملکی مشین فراہم کرتے ہیں۔

۴۔ چیف کنٹرولر آف امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ کے ذریعہ ریاستی ڈائرکٹر آف انڈسٹریز کی سفارش پر غیر ملکی مشینیں درآمد کرنے کا لائسنس حاصل کیا جاسکتا ہے۔

کچے مال کے لئے

ڈیولپمنٹ کمشنر، اسمال اسکیل انڈسٹریز آرگنائزیشن نئی دہلی

۱۔ ریاستی حکومتوں کے ذریعہ مقامی کچا مال تقسیم کرتا ہے۔ اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن اور منرلز اینڈ میٹلس ٹریڈنگ کارپوریشن کے ذریعہ چھوٹی صنعتوں کے لئے ضروری چیزیں درآمد کراتا ہے۔

۲۔ ڈائرکٹر آف انڈسٹریز کے ذریعہ لوہے کی چادر پرافین وغیرہ کنٹرولڈ چیزوں کا کوٹہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ ریاستی اسمال انڈسٹریز کارپوریشن کچے مال کی تقسیم کرتی ہیں۔

۴۔ چیف کنٹرولر آف امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ اور اس کے دیگر محکمہ جات چھوٹی صنعتوں کے لئے کچے مال کی درآمد کا لائسنس جاری کرتا ہے۔

مالی مدد کے لئے

۱۔ اسٹیٹ فائنینشل کارپوریشن مکڑی پونجی یعنی زمین کارخانہ مشین خریدنے کے لئے یا تعمیر کرنے کے لئے لمبی مدت کے قرضے دیتے ہیں۔

۲۔ ڈائرکٹر آف انڈسٹریز صنعتوں کی امداد کے قانون کے تحت صنعتوں کو شروع کرنے یا ان کی ترقی کے لئے قرض دیتا ہے۔

۳۔ اسٹیٹ بنک آف انڈیا اور اس سے ملحق بینک درمیانی مدت کے قرض دینے میں جن کے ذریعہ مشینیں خریدی جا سکتی ہیں کارخانہ کی عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے۔ یہ کچے مال کی خرید کے لئے اور کاروبار کی روزمرہ ضروریات کے لئے بھی قرض دیتے ہیں۔

۴۔ تجارتی بینک کے کاروبار کو چلانے کے لئے قرض دیتے ہیں۔

۵۔ اسمال انڈسٹریز سروس انسٹی ٹیوٹ

جو لوگ اسٹیٹ بینک سے قرضہ کے لئے درخواست دیتے ہیں اسمال انڈسٹریز سروس انسٹی ٹیوٹ ان کے بارے میں ٹکنیکل رپورٹ دیتا ہے۔ یہ قرض اس کی سفارش پر دیا جاتا ہے۔

ٹکنیکل جانکاری کے لئے

۱۔ اسمال انڈسٹریز سروس انسٹی ٹیوٹ چیزوں کی تیاری کے لئے ڈیزائن کارخانے کا نقشہ وغیرہ بنانے میں مدد دیتے ہیں۔

۲۔ وہ اوزار ذاتی، سانچہ اور دیگر ضروری سامان بنوانے میں مدد دیتے ہیں۔

۳۔ ٹکنیکل اور انتظامی مشورے کے ذریعہ وہ کاریگروں مشینوں، اور کچے مال کے بہتر سے بہتر اور زیادہ سے زیادہ منافع بخش راہ دکھاتے ہیں۔

۴۔ صنعتی انتظام کے لئے وہ منیجروں اور سپروائزروں کو ٹریننگ دیتے ہیں۔

۵۔ کاریگروں کی مہارت بڑھانے کے لئے وہ ٹریننگ دیتے ہیں۔ وہ جدید ٹکنیکل طریقوں سے کاریگروں کو واقف کراتے ہیں۔

نیشنل اسمال انڈسٹریز کارپوریشن نئی دہلی

اس کارپوریشن نے پیداوار اور تربیت کے مرکز قائم کر رکھے ہیں۔ جہاں کاریگروں کو جدید ترین مشینیں چلانے کی تربیت دی جاتی ہے۔

کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ نئی دہلی

یہ کونسل نئے ٹکنیکل طریقے ایجاد کراتی ہے اور ان کو صنعتوں کے حوالے کرتی ہے۔

پروڈکٹویٹی کونسل

یہ کونسل کارخانہ داروں کو اس بات کی تربیت دیتی ہے کہ وہ کس طرح زیادہ بہتر طریقے سے پیداوار کر سکیں۔

اسمال انڈسٹریز ایکسٹینشن ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد

یہ ادارہ کارخانہ داروں اور منیجروں کو کل وقتی ٹریننگ دیتا ہے۔

معیاری پیداوار کے لئے

اسمال انڈسٹریز سروس انسٹی ٹیوٹ

مقررہ معیار کے مطابق سامان کرنے کے لئے ٹکنیکل مشورے دیتا ہے۔

انڈین اسٹینڈرڈ انسٹی ٹیوٹ

یہ ادارہ صنعتی معیار مقرر کرتا ہے اور سامان کے معیار کے مطابق ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔

ڈائرکٹر آف انڈسٹریز

یہ محکمہ بھی معیار مقرر کرتا ہے اور چھوٹی صنعتوں کی پیداوار کے لئے "کوالٹی" کی مہر لگاتا ہے۔

مال کو فروخت کرنے کے لئے

اسمال انڈسٹریز سروس انسٹی ٹیوٹ

یہ ادارہ سروے کرتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ چھوٹی صنعتوں کا مال کس طرح بہتر طریقہ سے فروخت ہو سکتا ہے۔

یہ ادارہ اس بات کی سرٹیفکٹ دیتا ہے کہ ادارہ سرکاری آرڈر پانے کے لئے موزوں ہے

نیشنل اسمال اسکیل انڈسٹریز کارپوریشن

یہ ادارہ ڈائرکٹر جنرل آف سپلائز اینڈ ڈسپوزلز، ریلوے اور وزارت دفاع سے چھوٹی صنعتوں کی پیداوار کی خرید کے لئے کنٹریکٹ حاصل کرتا ہے۔

ریاستی اسمال انڈسٹریز کارپوریشن

یہ تنظیمیں ریاستی حکومتوں اور دیگر نیم سرکاری تنظیموں سے سامان کی سپلائی کے لئے آرڈر حاصل کرتی ہیں۔

ایکسپورٹ

اسمال انڈسٹریز سروس انسٹی ٹیوٹ

یہ ادارہ ایسے چھوٹے کارخانوں کی فہرست مرتب کرتا ہے جو اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن کی برآمدی اسکیم برائے چھوٹی صنعت میں شریک ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ایکسپورٹ آرڈر کی تسلی بخش تکمیل کے لئے وہ ٹکنیکل مشورے دیتے ہیں۔

جن چیزوں کا ایکسپورٹ کیا جا سکتا ہے ان کے بارے میں وہ معلومات حاصل کر کے ان کی اشاعت کرتے ہیں۔

ایکسپورٹ کی ترقی کے لئے کام کرنے والی کونسلوں سے وہ قریبی رابطہ رکھتے ہیں اور چیزوں کی ایکسپورٹ کے بارے میں پوری واقفیت حاصل کرنے اور فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

چیف کنٹرولر آف امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ نئی دہلی

یہ محکمہ غیر ملکوں کو مال برآمد کرنے کا لائسنس دیتا ہے ڈائرکٹوریٹ آف ایکسپورٹ پروموشن ادیوگ بھون نئی دہلی

یہ محکمہ غیر ملکی بازاروں کے متعلق معلومات حاصل کرتا ہے اور انھیں مشتہر کرتا ہے۔

یہ محکمہ مختلف اشیا کی کھپت کے امکانات پر روشنی ڈالتا ہے۔

ایکسپورٹ پروموشن کونسل

یہ تجارتی ڈائرکٹریاں، رسالے اور بلیٹن شائع کرتی ہیں جن میں متعلقہ اشیا کی ایکسپورٹ کے متعلق ساری معلومات یکجا ہوتی ہیں۔

یہ نمائشیں لگاتی ہیں اور شوروم قائم کرتی ہیں۔ یہ ہندوستان سے ایکسپورٹ کرنے والے اداروں اور غیر ملکی خریداروں سے رابطہ رکھتی ہیں۔

تجارتی قیمتوں کا فیصلہ کرتی ہیں۔

(۵) ایکسپورٹ کو آگے بڑھانے کے لئے مخصوص اسکیمیں تیار کرتی ہیں۔

<u>اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن آف انڈیا نئی دہلی</u>

یہ کارپوریشن کارخانہ داروں کی فہرست مرتب کرتا ہے جو چھوٹے کارخانہ دار ہیں اور کارپوریشن کی برآمدی اسکیم کے تحت مدد کے پروگرام میں شامل کئے جائیں گے۔

یہ چھوٹے کارخانہ داروں کو اشتہار، قیمتوں کی فہرست وغیرہ تیار کرنے میں مدد دیتی ہے۔

یہ چھوٹی صنعتوں کے لئے ایکسپورٹ آرڈر حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ایجادات کے لئے

<u>الونشن پروموشن بورڈ ۳۹۔ رنگ روڈ۔ لاجپت نگر ۴ نئی دہلی</u>

یہ ادارہ عملی اہمیت رکھنے والی ایجادات کی ترقی کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ جو لوگ نئے آلات، پرزے، طریقہ ایجاد کرتے ہیں۔ انھیں نقد انعام دے کر ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

متفرق مسائل کے لئے

<u>فیڈریشن آف ایسوسی ایشنز آف اسمال انڈسٹریز آف انڈیا رنگ روڈ نئی دہلی</u>

یہ تنظیم چھوٹی صنعتوں کی مشکلات اور مسائل کے متعلق حکومت کو باخبر رکھتی ہے۔

اسمال انڈسٹریز سروس انسٹی ٹیوٹ

اسمال انڈسٹریز سروس انسٹی ٹیوٹ بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے ذریعہ ملنے والی سہولتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

آپ اگر کوئی نیا کام شروع کرنا چاہتے ہوں یا اپنے موجودہ کام کو آگے بڑھانا چاہتے ہوں۔ ان سے آپ کو پوری مدد مل سکتی ہے۔ لیکن یہ کوشش کیجئے کہ اس ادارے سے آپ کا ربط ہو جو آپ کی صنعت سے تعلق رکھتا ہے۔

ان کے متعلق کچھ مزید تفصیلات دی جا رہی ہیں۔

ان سے خط و کتابت کرتے وقت "اسمال انڈسٹریز انسٹی ٹیوٹ" کے بعد ریاست اور علاقے کے مطابق پتہ لکھ دیں۔

<u>اسمال انڈسٹریز سروس انسٹی ٹیوٹ</u>

علاقہ ریاست	
۱۔ آندھرا پردیش	انتقار مینشن ۷-۹ اعظم آباد۔ حیدرآباد
۲۔ آسام، ناگالینڈ، منی پور، تری پورا، اوریسا۔ انڈسٹریل اسٹیٹ کے سامنے، بما گیا دہ باستی میدان، گوہاٹی۔	
۳۔ بہار	سینٹرل ایونیو، پاٹلی پترا ہاؤس کالونی، پٹنہ ۱۳

	علاقہ ریاست	
۴۔	دہلی، ہریانہ	انڈسٹریل اسٹیٹ کے سامنے اوکھلا نئی دہلی ۲۰
۵۔	گجرات	دود هیشور روڈ، رستم جہانگیر کیل ملز کے سامنے احمدآباد
۶۔	جموں و کشمیر	اسکول آف ڈیزائن بلڈنگ، کرن نگر، سری نگر
۷۔	کیرالا	کیرالا ورما کالج روڈ، تریچور ۴
۸۔	مدھیہ پردیش	۱۰ انڈسٹریل اسٹیٹ پولو گراؤنڈ، اندور
۹۔	مدراس	۵-۱ گرینڈ سدرن ٹرنک روڈ، مدراس ۳۲
۱۰۔	مہاراشٹر	کرلا اندھیری روڈ، ساکی ناکہ، بمبئی ۷۲
۱۱۔	گوا	میرانڈا بلڈنگ، ہیرا بازار، مرگاؤں، گوا
۱۲۔	میسور	راجہ جی نگر۔ بنگلور
۱۳۔	اڑیسہ	چاندنی چوک، درپن ہاؤس، کٹک
۱۴۔	پنجاب	انڈسٹریل ایریا بی، لدھیانہ
۱۵۔	راجستھان	مرزا اسمٰعیل روڈ، جے پور
۱۶۔	اترپردیش	۱۰۷ انڈسٹریل اسٹیٹ کالپی روڈ، کان پور
۱۷۔	مغربی بنگال	۱۱۱-۱۱۲ جی ٹی روڈ کلکتہ ۳۵

برانچ انسٹی ٹیوٹ

	علاقہ	اسمال انڈسٹریز سروس انسٹی ٹیوٹ
۱۔	گجرات	سہکار بھون، ترکون باگیچہ، راج کوٹ
۲۔	میسور	باچی لوج کلب روڈ، ہبلی
۳۔	اترپردیش	(ا) آدو گڑھ ہاؤس، ۱۲۱۔ مہاتما گاندھی روڈ آگرہ
		(ب) انڈسٹریل اسٹیٹ (نینی)

توسیعی مراکز (ایکسٹینشن سنٹر)

	علاقہ	سہولتیں
	آندھرا پردیش	
۱۔	صنعت نگر	حرارتی عمل، الیکٹرو پلیٹنگ اوزار خانے کا کام عام انجینئرنگ کے کام۔ دھات کی جانچ
۲۔	وجے واڑہ	عام انجینئرنگ کے کام۔ دھات کی ڈھلائی
۳۔	پایا نائیڈو پیٹ	عام انجینئرنگ کے کام بنانے کا کام

آسام (ناگالینڈ)

۴۔	تنسوکیہ	مشین ورکشاپ، حرارتی عمل، لوہاری اور الیکٹرو پلیٹنگ
۵۔	جورہاٹ	مشین ورکشاپ، حرارتی عمل اور لوہاری

بہار

۶۔ دھنباد — عام انجینئرنگ کے کام اور الکٹرو پلیٹنگ
۷۔ مظفر پور — اور الکٹرو پلیٹنگ
۸۔ رانچی — جوتے اور چمڑے کی چیزیں بنانے کا کام

دہلی

۱۔ نئی دہلی — بید اور لکڑی کے فرنیچر بنانے کا کام۔ دھات کی چادر کی بنی ہوتی چیزیں سلائی، اور چمڑے کی چیزیں بنانے کا کام

گجرات

۱۔ بھاؤنگر — مشین شاپ، ڈھلائی، ریت کی جانچ
۲۔ جام نگر — الکٹرو پلیٹنگ
۳۔ سابرکونڈلا — فورجنگ اور ہیٹ ٹریٹمنٹ
۴۔ ناڈیاڈ — مشین شاپ، بڑھئی کا کام، فورجنگ اور ہیٹ ٹریٹمنٹ

ہماچل پردیش

۱۔ سولن — تھرمامیٹر

کیرالا

۱۔ انگل — اسٹین لیس اسٹیل کے برتن
۲۔ الپی — جنرل انجینئرنگ
۳۔ مولوپوزا — ٹن کے ڈبے بنانا۔ ٹن کی چھپائی
۴۔ تریچور — جوتے، چپلیں وغیرہ
۵۔ شورانور — جنرل انجینئرنگ اور چھری کانٹے چمچے وغیرہ
۶۔ کلائی — لکڑی کا کام

مدھیہ پردیش

۱۔ اجین — جنرل انجینئرنگ (مشین شاپ)
۲۔ اندور — اوزار خانہ اور ریلوے گاڑی کے پرزوں کے لئے مشین شاپ
۳۔ گوالیار — جنرل انجینئرنگ

مدراس

۱۔ اروٹو — چمڑے کی تیاری اور فنش
۲۔ مدورائی — جنرل انجینئرنگ اور لوہے کا کام
۳۔ کوئمبتور — ڈھلائی
۴۔ سیرون دورائی — بڑھئی اور لوہار کا کام
۵۔ پانڈیچری — جنرل انجینئرنگ

مہاراشٹر

۱۔ کولہاپور — جنرل انجینئرنگ، ڈھلائی اور ریت کی جانچ
۲۔ وارڈھا — بڑھئی کا کام اور آئل انجن
۳۔ امراوتی — دھات کی چادر کا کام
۴۔ پونا — جنرل انجینئرنگ اور الکٹرو پلیٹنگ

میسور

۱۔ بلگام — جنرل انجینئرنگ
۲۔ میسور — جنرل انجینئرنگ

اڑیسہ

۱۔ جھارسوگوڈا — مشین شاپ، ہیٹ ٹریٹمنٹ، جانچ، لکڑی کا کام، پیٹرن بنانا

پنجاب و ہریانہ

۱۔ انبالہ — شیشے کا سائنس کا سامان، اوزار خانہ اور بلوئنگ ورکشاپ
۲۔ کیتھل — بڑھئی اور لوہار کا کام
۳۔ بٹالہ — جنرل انجینئرنگ
۴۔ ریواڑی — دھات اور جوتے چپل بنانے کا کام
۵۔ جالندھر — کھیل کا سامان
۶۔ جگادھری — دھات کے سامان کی جانچ کرنے کے لئے تجربہ گاہ
۷۔ فریدآباد — بڑھئی اور لوہار کا کام

راجستھان

۱۔ کوٹا — جنرل انجینئرنگ
۲۔ جودھپور — جنرل انجینئرنگ اور جوتے چپلیں بنانے کا کام
۳۔ اودے پور — جنرل انجینئرنگ اور الکٹرو پلیٹنگ

اترپردیش

۱۔ میرٹھ — کھیل کا سامان تیار کرنے کی سہولتیں۔
۲۔ فیروزآباد — شیشے کی جانچ کی سہولت
۳۔ علی گڑھ — اوزار خانہ اور جنرل انجینئرنگ کا کام

بقیہ ۔ صث پر دیکھئے۔

آپ کیا کھائیں۔؟؟

انسانی غذا کے تقریباً ۴۴ عناصر ایسے ہیں۔ جو تندرست اور معقول زندگی بسر کرنے کے لئے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہمارا فرض یہ ہے۔ کہ ہم ان ۴۴ عناصر کے متعلق معلومات حاصل کریں۔ اور یہ جان لیں۔ کہ ہمیں ان کی کتنی کتنی مقدار کی ضرورت ہے۔ اور یہ عناصر یا اجزاء غذا کن کن چیزوں کے ذریعہ حاصل کئے جا سکتے ہیں تغذیہ کی عام کمی اور خرابی ایک ایسی چیز نہیں ہے۔ جو بہت جلد کسی خاص بیماری کی شکل میں ظاہر ہو جاتی ہے اس لئے جس شخص کی غذا ناقص اور غیر متوازن ہوتی ہے۔ وہ بھی کافی مدت تک اپنی زندگی کی گاڑی کو کھینچتا رہتا ہے۔ اور روزانہ کے کام کو انجام دیتا رہتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی طاقت و توانائی اور قوت کارکردگی، اور دفع امراض کی صلاحیت بھی کم ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ بیمار ہو جاتا ہے۔ اور بعض امراض ایسے ہوتے ہیں۔ جو بالآخر اس کی ہلاکت کا باعث ہو جاتے ہیں۔

یہ ایک خوش نصیبی کی بات ہے۔ اور قدرت کا ہم پر بڑا احسان ہے کہ عملی نقطہ نگاہ سے بہت کم صحت بخش اجزا و عناصر ایسے ہیں۔ جن کی تلاش میں ہمیں سرگرداں رہنا پڑے۔ اس لئے کہ ایک اوسط درجہ کی معتدل غذا میں ہمیں زیادہ تر ضروری چیزیں مل جاتی ہیں۔ اور صرف تھوڑی سی عقلمندی اور احتیاط سے ہم اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔ قدرت فیاض ہے۔ لیکن اس کی فیاضی سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے ہمیں بھی دانشمندی سے کام لینا پڑتا ہے۔

انسانی غذا کے ضروری اجزا مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ حیاتین (وٹامنز) معدنیات (منرلز) ۳۔ لحمی اجزاء (پروٹین) ۴۔ روغنی اجزا (فیٹس) ۵۔ شکری اجزاء (کاربوہائیڈریٹس)

مناسب اور صحیح تغذیہ کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ غذا میں تنوع کا خیال رکھا جائے۔ اس لئے کہ ہمارے جسم کو مندرجہ بالا اجزاء میں سے بعض بڑی مقدار میں درکار ہوتے ہیں۔ اور بعض کم مقدار میں بعض غذاؤں مثلاً دودھ وغیرہ میں چند اجزا ایک ساتھ پائے جاتے ہیں لیکن بعض چیزیں مثلاً کیک اور مٹھائیاں ہمیں اس لئے کم مقدار میں کھانی چاہئیں۔ کہ ان کی کثرت بعض دوسرے ضروری اجزاء کے لئے گنجائش باقی نہیں رکھتی اور ہماری مجموعی غذا کمزور اور ناقص ہو جاتی ہے۔ اب مختلف اجزاء کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

حیاتین

حیاتین بھی حقیقت میں کیمیائی اجزاء ہیں۔ جو انسانی زندگی کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں

اگرچہ حیاتین کی ضرورت بہت کم مقدار میں ہوتی ہے۔ تاہم اگر کسی حیاتین کی جسم میں کمی یا فقدان ہو جائے۔ تو جسمانی بیماری اور عضویہ نقائص پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور بعض حالات میں موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔ اب تک ۲۰ حیاتین دریافت ہوئے ہیں جن کے متعلق کافی دریافت ہوئی ہے۔ لیکن غذائی نقطہ نظر سے چار حیاتین خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ حیاتین ا (وٹامن اے) اس کی کمی سے آنکھ کی بیماریاں ہوتی ہیں۔ متعدی امراض جلد حملہ کرتے ہیں۔ اور اعصاب میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔

۲۔ حیاتین ب ا۔ حیاتین ب ۲۔ (وٹامن بی ا۔ وٹامن بی ۲) ان کی کمی بھوک کو کم کر دیتی ہے قبض اور بدہضمی سیاہی و عصبی دردوں کا باعث بنتی ہے۔ جلد میں خرابیاں، اور آنکھ کے مخصوص امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔

۳۔ حیاتین ج۔ (وٹامن سی) اس کی کمی یا فقدان سے جلد پر دھبے پڑ جاتے ہیں۔ عام جسمانی کمزوری لاحق ہوتی ہے۔ مسوڑھوں اور جسم کے دوسرے حصوں سے خون آنے لگتا ہے۔

۴۔ حیاتین د۔ (وٹامن ڈی) اس کی کمی سے سوکھے کا مرض ہوتا ہے۔ ہڈیاں کمزور ہوتی ہیں۔ اور دانتوں میں بھی خرابی پیدا ہوتی ہے۔

ان تفصیلات سے یہ جان لینا چاہئے۔ کہ ان حیاتینوں کی کافی مقدار حاصل کر لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ جس بات کی ضرورت ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہم اپنی روزانہ غذا میں مناسب تبدیلیوں کے ساتھ ان چیزوں کا دور قائم رکھیں۔ ایک پاؤ سے لے کر آدھ سیر دودھ تک (بچوں کے لئے اس کی ڈیوڑھی مقدار) ایک انڈا تھوڑا سا گوشت دو قسم کی پکی ہوئی سبزیاں اور کچھ آلو، بغیر چھنے ہوئے آٹے کی روٹی اور کچھ دال، کچھ پھل اور کچی سبزیاں، ان چیزوں کے ذریعہ سے حیاتین د کے سوا تمام حیاتین حاصل ہو جائیں گے۔ حیاتین "د" ہم دھوپ کی شعاعوں سے یا روغن ماہی کی مختصر مقدار سے حاصل کر سکتے ہیں۔

اگر ہماری غذا میں ان حیاتینوں میں سے کسی ایک کی بھی کمی ہو گئی۔ تو ہماری طاقت و توانائی کم ہو جائے گی۔ اور ہم میں مدافعت امراض کی صلاحیت باقی نہیں رہے گی۔ ہم آسانی سے مرض زکام اور پھیپھڑوں کی بیماری میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اور پھر حصول صحت میں دشواریاں پیدا ہوں گی۔

اب مختلف حیاتینوں کا ذکر جدا جدا کیا جاتا ہے۔ تاکہ معلوم ہو جائے۔ کہ کن کن چیزوں میں کون کون سے حیاتین پائے جاتے ہیں۔ اور ان کی کمی سے کیا کیا نقصانات ہوتے ہیں۔

حیاتین ۔ ا

دودھ، مکھن، کریم، گاجر، ٹماٹر، سلاد کے پتے ساگ، انڈا، کلیجی، گردہ۔ یہ حیاتین اکثر چیزوں میں کافی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ اگر ہماری غذا میں ایک پاؤ سے آدھ سیر تک دودھ ہو۔ اور مزید براں صرف ایک انڈا اور سبزیاں ہوں اور کچھ آلو بھی ہوں تو حیاتین ا۔ مناسب مقدار میں مل جائیں گے۔ اس حیاتین کی کمی سے انسان ناک، حلق، اور پھیپھڑے کے امراض مثلاً زکام اور نمونیہ وغیرہ میں مبتلا ہوتا ہے جسم کا نشو نما رک جاتا ہے۔ وزن میں اضافہ نہیں ہوتا۔ اور چونکہ دانت پر اوپر سے چمکیلے غلاف تعمیر کرنے والے خلیا اچھی طرح کام نہیں کرتے۔ اس لئے دانتوں میں بھی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔

حیاتین ۔ ب ا ۔ ۲

پورے اناج یعنی آٹا یا دالوں کے بیس جو پیسنے کے بعد چھلنے نہ جائیں۔ انڈے کی زردی، دودھ کلیجی، گردہ، پھل اور اکثر سبزیاں بالخصوص سیم کے رنگ اور ہری مٹر۔

دونوں حیاتین ب، جب جسم میں کمزور ہو جاتے ہیں تو بھوک غائب ہونے لگتی ہے۔ بچوں کی طاقت و نمو کمزور ہو جاتی ہے اور وزن بھی بڑھنے نہیں پاتا۔ معدے اور آنتوں کا فعل خراب ہو جاتا ہے جس سے قبض بھی پیدا ہوتا ہے اور عام صحت بگڑ جاتی ہے۔

حیاتین ج

آملہ، سنترہ، لیموں، ٹماٹر، شلغم، چقندر، آلو، کچا کرم کلہ، تازہ سبز ترکاریاں، خربوزہ، تازہ جامن،

حیاتین ج کی کمی سے جلدی امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور دانتوں و مسوڑھوں سے خون آنے کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے کبھی نکسیر پھوٹ پڑتی ہے۔ اب لوگ غذا میں حیاتین کی اہمیت کو جاننے لگے ہیں۔ اس کی کمی سے عام جسمانی خرابی ہوتی ہے۔ اور وظائف اعضا میں نقائص پیدا ہو جاتے ہیں۔

حیاتین د

کاڈلیور آئل یا دوسری مچھلیوں کا تیل، انڈے کی زردی، سورج کی کرنیں۔

حیاتین د حاصل کرنے کے سلسلے میں جو مشکل پیش آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ معمولی غذاؤں میں اس کی کافی مقدار نہیں ہوتی، اس لئے ضروری ہے کہ ہر بچہ جوان بوڑھا موسم سرما کے چند ماہ میں دھوپ سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے اور ان مہینوں میں ہر شخص ایک چمچہ روغن ماہی استعمال کرے۔ بچوں کے لئے اس کی مقدار کم ہونی چاہیئے۔ تاکہ وہ آسانی سے ہضم کر سکیں۔ ابتدائے عمر میں اس حیاتین کی کمی ہڈیوں میں نرمی کا نقص پیدا کر دیتی ہے اور جوانوں کے دانتوں کو خراب کر دیتی ہے۔

معدنیات

دودھ، پنیر، انڈا، کلیجی، گردہ، پتوں والی سبزیاں، مثلاً ساگ، سلاد، کرم کلہ، پھل اور آیوڈین ملا ہوا نمک۔ ایک صحیح اور متوازن غذا کے لئے انسان کو تیرہ معدنی اجزا کی ضرورت ہے۔ لیکن ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہمیں زیادہ تر صرف تین اجزا ہی کی فکر کرنی پڑتی ہے۔ باقی ۱۰ اجزا ہر معقول غذائی مجموعہ سے خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں۔ تین اہم ترین معدنی اجزا یہ ہیں۔

۱۔ کیلسیم (چونا) جس کی کمی سے ہڈیاں دانت اور پٹھے کمزور ہو جاتے ہیں۔

۲۔ آئرن (لوہا) جس کی کمی سے خون کی پیداوار کم ہو جاتی ہے۔

۳۔ آیوڈین، جس کی کمی سے گھیگھے کا مرض لاحق ہو جاتا ہے، اور غدہ درقیہ کا نقص عمل جنسی کمزوری کا باعث بنتا ہے۔

ہمارے لئے کیلسیم حاصل کرنے کا بہترین طریقہ دودھ اور دودھ کی چیزیں مثلاً پنیر وغیرہ ہیں۔ بالغ کو دودھ روزانہ ایک پاؤ سے لے کر آدھ سیر تک کی مقدار میں حاصل کرنا چاہیئے بچے کو جس کی ہڈیاں نشو و نما پا رہی ہیں۔ اسے زیادہ مقدار میں دودھ دینا چاہیئے۔ پنیر بھی کیلسیم حاصل کرنے کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔ لوہے کی کافی مقدار ہم سبزیوں اور پھلوں سے لے سکتے ہیں۔ انڈا کلیجی اور گردے بھی کیلسیم کی مقدار معقول رکھتے ہیں۔ سبزیاں پکانے میں پانی زیادہ نہیں رکھنا چاہیئے۔ ورنہ لوہے کا اجزا پانی سے ضائع ہو جاتے ہیں۔ آیوڈین کی کچھ مقدار دودھ میں بھی ہوتی ہے۔ لیکن زیادہ مقدار سمندری غذاؤں میں ملتی ہے جو لوگ سمندر سے زیادہ فاصلہ پر رہتے ہیں۔ ان کو آیوڈائزڈ نمک کے ذریعہ آیوڈین استعمال کرنا چاہیئے۔

پروٹین (لحمی غذا)

گوشت مچھلی، مرغ، پرندے، دودھ، پنیر، انڈا، مٹر، سیم اور دوسری سبزیاں، اناج اور دالیں پروٹین کی اہمیت اس امر میں ہے کہ ہم ۲۰ غذائی اجزا میں کم از کم ۱۰ اجزا ہمارے لئے مہیا کر دیتے ہیں۔ اس لئے ہماری روزانہ غذا میں ان کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ پروٹین ہمیں حیوانی غذاؤں سے بھی ملتے ہیں سبزیوں اور اناجوں میں بھی، پروٹین میں دودھ پنیر انڈا ہماری بافتوں کی تعمیر کے لئے بہترین چیزیں ہیں۔ ہماری غذاؤں میں ان چیزوں کی شرکت کافی مقدار میں ہونی چاہیئے۔ اس لئے کہ صرف سبزیوں اور اناجوں کے ذریعہ سے ہم اتنی مقدار حاصل نہیں کر سکتے۔

روغنی غذائیں

مکھن، کریم، دودھ، چربی والا گوشت، گھی، نباتاتی تیل، انڈے کی زردی۔

روغنی غذاؤں کا مقصد یہ ہے۔ کہ وہ جسم کی حرارت (انرجی) قوت عمل مہیا کریں۔ تمام وظائف اعضا کے لئے ان کی موجودگی ضروری ہے۔ اگر روزانہ ہمیں روغنی غذا بس صرف دو تین اونس کی مقدار میں مل جایا کریں۔ تو ہماری جسمانی ضرورتوں کو کافی ہوں گی۔ روغنی غذا کے حاصل کرنے کے سبب سے اچھا ذریعہ ممکن ہے۔ انرجی اور قوت عمل اور حرارت پیدا کرنے کے علاوہ روغنیات کی اہمیت یوں بھی ہے کہ ان میں عام جسمانی صحت پیدا کرنے والے دوسرے ضروری اجزا بھی موجود ہوتے ہیں۔

کاربوہائیڈریٹس (شکری غذائیں)

روٹی، کیک، شکر، گڑ، مٹھائی، زمین قند، چقندر، آلو، سوئیاں وغیرہ شکری غذائیں انسانی جسم کے لئے انرجی کا مخصوص ذریعہ ہیں۔ اگر یہ اجزا ہمارے کھانے کے آٹے اور شکر میں موجود نہ ہوتے

بقیہ ص۲۴ پر

اطلاعات

پانی پت میں حالی پارک کا افتتاح

پانی پت۔ یہاں جناب چودھری بنسی لال وزیر اعلیٰ ہریانہ نے ممتاز قومی شاعر خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم کے نام پر حالی پارک و حالی لائبریری کا افتتاح فرمایا۔ حالی پارک کی یہ سکیم جناب سکھدیو پرشاد ڈپٹی کمشنر کرنال نے بنائی تھی۔ جسے مقامی میونسپل کمیٹی تعمیر کرا رہی ہے۔

افتتاحی تقریر کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے بتایا۔ کہ پانی پت ہی نہیں بلکہ ہریانہ کو اس بات پر فخر ہے کہ مولانا حالی مرحوم ایک ہندوستان گیر شخصیت کے مالک تھے۔ اور وہ ہریانہ کے باسی تھے۔ ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ہم ان کے وطن پانی پت میں ان کی یادگار قائم کر رہے ہیں۔ سکھدیو پرشاد جی نے جس وقت مجھے اس نام کا آئیڈیا دیا تو مجھے بہت خوشی ہوئی اور ڈپٹی کمشنر صاحب کی یہ سکیم بہت پسند آئی۔

افتتاحی تقریب میں مولانا حالی مرحوم کے باقیات جناب خواجہ احمد عباس، بیگم صالحہ عابد حسین، اور ڈاکٹر عابد حسین، بطور مہمان سرکاری مدعو تھے۔

جناب خواجہ احمد عباس صاحب نے تقریر کرتے ہوئے مولانا حالی مرحوم کی زندگی پر پوری روشنی ڈالی۔ جس میں آپ نے مولانا مرحوم کی حب الوطنی، اور قوم پرستی کے جذبات کو اجاگر کیا۔ انھوں نے پانی پت کے ساتھ اپنی زندگی کے پرانے واقعات اور یادیں بھی دہرائیں۔

بیگم صالحہ عابد حسین صاحبہ نے حالی مرحوم کی نظموں کے بعض حصے سنائے۔ آپ نے جب پانی پت سے اپنی وابستگی اور مولانا مرحوم کی زندگی کے حالات حاضرین کو سنائے۔ تو حاضرین انتہائی جذبات میں ڈوب گئے۔ اور بہت سے لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اس اجلاس میں پنڈت چرنجی لال وزیر مال ہریانہ، شریمتی پرسنی دیوی راجیہ منتری ہریانہ، چودھری سلطان سنگھ ایم پی، شری حکومت رائے ایم ایل اے، شری سرجیت سنگھ مان ایم ایل اے، شری ہری سنگھ نلوہ ایم ایل اے بھی شریک ہوئے۔ جناب حکیم اجمل خاں، میاں غلام صابر ممبران، غضنفر علی خاں سکریٹری نے پنجاب وقف بورڈ کی نمائندگی کی۔ اجلاس کے بعد جناب خواجہ احمد عباس و بیگم صالحہ عابد حسین، ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے ڈپٹی کمشنر کرنال کی معیت میں مقبرہ حالی، و حالی میوزیم زیر تعمیر کا درگاہ قلندر صاحب پانی پت میں معائنہ کیا۔

حالی لائبریری میں کتابوں کا کافی ذخیرہ جمع کیا جائے گا جس کا اہتمام حکومت کرے گی۔ لائبریری میں اردو کتابیں خاص طور پر رکھی جائیں گی۔ تاکہ اردو زبان و ادب کو ترقی دی جاسکے۔ پنجاب وقف بورڈ بھی کتابوں کے سلسلے میں امکانی تعاون کرے گا۔

مولانا حالی مرحوم کی یاد آج مدت کے بعد ان کے وطن میں تازہ کی گئی جس سے نئی نسلیں بھی متعارف ہوئیں۔ یہ پروگرام کامیابی کے ساتھ ختم ہو گیا۔

✤ ✤ ✤

حالی مرحوم کے مزار اور میوزیم کی تعمیر

پنجاب وقف بورڈ نے ممتاز قومی و ملی شاعر جناب خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم کے مزار کی تعمیر کا کام شروع کر دیا ہے۔ جو جناب رفیق الدین صدیقی آرکیٹیکٹ کی زیر نگرانی تعمیر ہو رہا ہے۔

مزار کے ساتھ ہی حالی میوزیم بھی زیر تعمیر ہے۔ جس میں مولانا حالی مرحوم کی یادگار چیزیں رکھی جائیں گی۔

پنجاب وقف بورڈ درخواست کرتا ہے۔ کہ جن احباب کے پاس مولانا حالی مرحوم کے قلمی مخطوطات ان کی تصانیف یا دوسرے نوادرات ہوں۔ وہ پنجاب وقف بورڈ کو میوزیم میں رکھنے کے لئے بطور عطیہ مرحمت فرمادیں۔ یہ نوادرات معطی صاحبان کے ناموں کے ساتھ میوزیم میں رکھے جائیں گے نیز مخطوطات کی فوٹو کاپیاں لے کر اصل مخطوطات شکریہ کے ساتھ واپس کر دیئے جائیں گے۔ غیر مطبوعہ چیزوں کی طباعت کا انتظام کیا جائے گا۔

سکریٹری پنجاب وقف بورڈ۔ انبالہ کینٹ

مولانا حالی سکول کا اجرا

پنجاب وقف بورڈ نے فیصلہ کیا ہے۔ کہ خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم کی یادگار مولانا حالی سکول، جو پانی پت میں تھا۔ اور جس کا ۱۹۴۷ء میں نام بدل دیا گیا ہے اس نام سے مولانا مرحوم کی یادگار کو از سر نو پانی پت میں زندہ کیا جائے۔ چنانچہ حالی سکول کا اجرا، درگاہ قلندر صاحب پانی پت میں کیا جا رہا ہے۔

یہ سکول مڈل کی سطح سے شروع کیا جائے گا۔ بعد میں اسے اپ گریڈ کر کے ہائی سکول کا درجہ دیا جاسکے گا۔ امید ہے کہ ہریانہ سرکار بھی حالی مرحوم کی یادگار کو قائم کرنے میں تعاون . . . . دے گی۔

✤ ✤ ✤

نواب محمد صابر قلی خاں (نواب صاحب محمد گڑھ)

ں ہند امارتِ شرعیہ کا قیام ـــ ایک ملّی فریضہ

اسلام میں اجتماعیت اور مرکزیت کو جو اہمیت حاصل ہے وہ اللہ تعالےٰ اور رسول برحق صلی اللہ
علیہ وسلم کے فرامین سے واضح ہے جن کی روشنی میں ملت اسلامیہ کے لئے نظام خلافت و امارت شرعیہ کا قیام
ا دینی فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ خلافت کا منصب عالمی نوعیت کا حامل ہے اور امارت شرعیہ ملکی
قاتی اعتبار سے ملی اجتماعیت اور دینی مرکزیت کا ذریعہ ہے۔ دنیائے اسلام کے لئے خلافت اسلامیہ
یا جس قدر ضروری ہے اتنی ہی ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ ہندوستان میں پوری ملت کی اجتماعیت
دینی مرکزیت کے لئے امارت شرعیہ کا قیام عمل میں لایا جائے۔ مسلمانوں کے ملکی و مقامی رہنماؤں پر یہ
ریضہ عائد ہوتا ہے کہ اس کام کو وہ ایک مقصد کے طور پر انجام دیں۔ اللہ تعالےٰ کی سنت میں کوئی
لی نہیں ہوا کرتی۔ وہ اس کو ہمارے لئے بے شمار کامیابیوں، کامرانیوں اور خیر کثیر کا ذریعہ بنا دیں گے
یں تو خود اس کو ایک مقصد بنا لینا چاہئے کیونکہ خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا تو کام ہی یہ ہے کہ
نتائج سے نظریں ہٹا کر صرف اللہ تعالےٰ اور رسول برحق صلعم کے احکامات کو بجالانا ہی اپنا مقصد قرار دے
اور فوائد اللہ تعالےٰ خود اس طرح عطا فرمائیں گے کہ معجزات کے نمونے سامنے آجائیں اور عقلیں حیران
ں کہ گویا آسمان سے برکات نازل ہو رہی ہیں اور زمین سے خیر کے سوتے ابل رہے ہیں۔ ہمارے اوپر
اضح رہنا چاہئے کہ ہم بندوں کے لئے اللہ تعالےٰ کے آخری اور ابدی پیغام ہدایت کے امین ہیں۔ ہم کو
بھی عزت ملے گی صرف اسی ہدایتِ خداوندی پر عمل کرنے کے باعث ہی ملے گی اور اس سے بے اعتنائی
رے لئے ذلت اور بربادی کا موجب ہوگی۔ اس لئے خلافت اور امارت کے معاملہ کو فوری نتائج
فوائد کی میزان میں تولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یوں تو وہ بھی واضح ہیں مگر ہمارا ایمان یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ
ایک حکم کے بجالانے کے نتیجہ میں جو کچھ ملے گا وہ عقل و استدلال کی گیرائی سے کہیں زیادہ ہوگا۔

اپی تجویز پریس کے ذریعہ ملت کے خواص و عوام کے سامنے اسے پیش کر دینا ضروری سمجھتا ہوں تجویز
مر اور اجمالی تھی جس کا متن ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔ تاہم یہ امر باعث مسرت و طمانیت و تقویت قلب
ہے کہ ملک کے مختلف حصوں سے علاقائی امارت شرعیہ کے قیام کی خوشخبریاں موصول ہو رہی ہیں۔ اخباروں
ذریعہ حال ہی میں مہاراشٹرا اور میسور (کرناٹک) میں امارت شرعیہ کے قیام کی مسرت افزا خبریں ملی ہیں۔ اللہ
لے ملت اسلامیہ ہند کو یہ نیک اقدام مبارک و مسعود فرمائیں اور اپنی تائید، نصرت اور حمایت سے دینی و
دی فوائد سے بہرہ ور فرمائیں۔ آمین۔

• تجویز: کل ہند امارت شرعیہ کا قیام شرعی امارت کا قیام دینی اعتبار سے کس قدر ضروری ہے۔
ئے اسلام اس سے کماحقہ واقفیت بھی رکھتے ہوں گے اور اس کا احساس بھی۔ ہم عامیوں کے نزدیک
ں کا صحیح علم نہ ہونے کے باوجود اس کی ضرورت کا احساس شدید ہے۔ اسباب و نتائج کے اعتبار سے
ں میں امارت شرعیہ کے قائم ہو جانے سے ملت کو جو فوائد حاصل ہوں گے ان کے علاوہ ہمارا ایمان ہے
اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی اجتماعی تعمیل کے باعث ملت کو ایسی عظیم الشان نصرت
اور تائید ایسے غیبی حاصل ہوں گی کہ عقلیں حیران رہ جائیں گی۔ پورے ملک کے علماء کرام اور ملت کے
حب الرائے حضرات کا ایک کنونشن اس غرض کے لئے طلب کیا جائے اور اس کے شرکاء پورے ملک
کے لئے ایک امیر شریعت اور مجلس شوریٰ کا انتخاب کریں۔ مجلس شوریٰ پچاس ممبران پر مشتمل ہو جن میں سے
چالیس منتخب اور دس امیر کے نامزد کردہ ہوں۔ مجلس شوریٰ امارت شرعیہ کا دستور مرتب کر کے اس پر عمل
پیرا ہو۔ ابتدا میں خاص طور پر حسب ذیل امور دائرہ کار میں لائے جائیں۔

۱۔ نظام مساجد
۲۔ دینی تعلیم و نظام مدارس و مکاتب
۳۔ پرسنل لا کا صحیح نفاذ اور تحفظ
۴۔ تبلیغ اسلام

عربی اور فارسی میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم کیلئے وظائف

امیدواروں کے انتخاب کا اعلان

نئی دہلی ستمبر۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ۷۵-۱۹۷۴ء کے دوران عربی اور فارسی میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے لئے نو اور آنرز تعلیم کے لئے دس امیدواروں کو وظیفے دینے کے لئے منتخب کیا ہے۔ پوسٹ گریجویٹ تعلیم حاصل کرنے والے امیدواروں کو ۸۰ ا روپے سالانہ نیز آنرز تعلیم حاصل کرنے والے امیدواروں کو ۲۰ ا روپے سالانہ کے حساب سے وظیفے دیئے جائیں گے۔ منتخب امیدواروں اور ان کی یونیورسٹی یا کالج کے نام حسب ذیل ہیں۔

عربی میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم

(۱) محمد عبدالوکیل، عثمانیہ یونیورسٹی (۲) غلام ربانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (۳) محمد حسن خاں، حمیدیہ آرٹس اینڈ کامرس کالج بھوپال (۴) شری شمس الحق گوہاٹی یونیورسٹی (۵) کماری ایم طاہرہ بی فاروق کالج کالی کٹ

فارسی کے پوسٹ گریجویٹ

(۱) شری نورالہدیٰ، ناگپور مہاودیالیہ (ناگپور یونیورسٹی) (۲) شریمتی طاہرہ خاتون عثمانیہ یونیورسٹی (۳) کماری عائشہ رضوانی کلکتہ یونیورسٹی (۴) کماری رضیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

عربی آنرز

(۱) شری وجہ القمر، جامعہ ملیہ اسلامیہ (۲) کماری یاسمین مختار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (۳) شری سلیم الدین احمد، پٹنہ کالج (پٹنہ یونیورسٹی) (۴) شری سید عبدالرحمن ہرکتی مولانا آزاد کالج کلکتہ

فارسی آنرز

(۱) کماری زہرہ خاتون علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (۲) کماری انصاری قمرالنساء، سیکو گجرات کالج احمدآباد (۳) کماری حلیمہ نکہت، پٹنہ کالج پٹنہ (۴) کماری شیخ شمشاد حیدر، نورجی اڈیا کالج، پورت (۵) محمد مقصود عالم مقصود، ایچ ڈی جین کالج آرہ (۶) کماری بی نسیم بانو نصیر میاں۔ ایم۔ ایس یونیورسٹی آف بڑودہ۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ۷۵-۷۴ء کے دوران سنسکرت، پالی اور پراکرت میں بھی پوسٹ گریجویٹ تعلیم کیلئے وظیفے دیئے

کے واسطے ۲۰ امیدواروں کا انتخاب کیا ہے ان امیدواروں کو ۵۰ روپے ماہانہ کے حساب سے وظیفہ دیئے جائیں گے۔

ترقی اُردو بورڈ کے پانچ سال

ترقی اردو بورڈ جو تعلیم سماجی بہبود اور ثقافت کی مرکزی وزارت نے جون ۱۹۶۹ء میں قائم کیا تھا اب تک ۲۴۳ کتابیں شائع کر چکا ہے۔ ان میں یونیورسٹی سطح کی کتابیں اسکول کی درسی کتابیں بچوں کے لئے کتابیں اور عام فہم سائنس کی کتابیں شامل ہیں، اس کے علاوہ ۱۲۱ قلمی نسخے اشاعت کے لئے تیار ہیں۔

خبرنامہ

بورڈ ہذا کی طرف سے اردو انگریزی دونوں زبانوں میں ایک خبرنامہ بھی شائع کیا جاتا ہے جس میں بورڈ کی سرگرمیوں کی مختصر روداد ہوتی ہے ۳۱ مارچ ۷۴ء تک اس طرح کے خبرنامے کے تین شمارے منظر عام پر آچکے ہیں۔

فنی اصطلاحات

بورڈ نے ۱۶ موضوعات سے تعلق رکھنے والی تقریباً ۸۰ ہزار فنی اصطلاحات کے اردو تراجم کو بھی حتمی شکل دیدی ہے بورڈ اس وقت تک ۴۹ کتابیں شائع کر چکا ہے۔

بورڈ نے اردو سے اردو میں لغت کی تیاری کا کام شروع کیا ہے اس کے علاوہ انگریزی اردو ڈکشنری کی تیاری کے لئے کام کر رہا ہے، اول الذکر لغت کے سلسلے میں یہ اب تک ۲۵ ہزار الفاظ مرتب کر چکا ہے اور انگریزی کے سلسلے میں اے اور بی کی تختی کے مسودے مکمل کر چکا ہے۔

اردو انسائیکلوپیڈیا

بورڈ نے اردو انسائیکلوپیڈیا کی تیاری کی ذمہ داری بھی سنبھالی ہے یہ بارہ جلدوں میں ہوگی۔ اس سلسلے میں تقریباً سو صفحات کا مواد مکمل کر لیا گیا ہے، اصطلاحات کے ضمن میں بورڈ مذکورہ نے ۵۵۰۰ فنی اصطلاحات کے اردو مترادفات مکمل کر لئے ہیں۔

تعلیم اور سماجی بہبود اور ثقافت سے متعلق جناب وزیر شری ڈی پی یادو کے ایک حالیہ بیان کے مطابق گزشتہ تین برسوں میں ۱۹۷۲ء - ۱۹۷۱ء، ۷۳ - ۷۲ء اور ۷۴ - ۱۹۷۳ء کے دوران بورڈ پر تقریباً ۱۹ لاکھ ۳۵ ہزار روپے خرچ ہوتے۔

بورڈ کے قیام کا مقصد ادبی مواد کی تیاری کے سلسلے میں سرکار کو مشورہ دینا ہے جس میں کہ جدید علوم و فنون کی کتابیں سائنسی موضوعات پر کتابیں، بچوں کا ادب، حوالہ جاتی کتب اور درسی کتب شامل ہیں۔

تشکیل نو

بورڈ نے اب تک جو تجربات حاصل کئے ہیں ان سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے سرکار نے بورڈ کی دوبارہ تشکیل کی ہے نو تشکیل شدہ بورڈ میں چیرمین اور وائس چیرمین کے علاوہ اردو پر قدرت رکھنے والے جدید علوم کے ۲۱ ماہرین اور ۳ دیگر ارکان کو شامل کیا گیا ہے توقع ہے کہ ان انتظامات کے ذریعے جن پر عمل درآمد شروع ہو چکا ہے، بورڈ کی کارکردگی میں مزید بہتری پیدا ہوگی۔

بقیہ - اقتصادیات

۴۔	دہلسی	جنرل انجینرنگ

مغربی بنگال

۱۔	ٹانگرا	چمڑے کمانے کی صنعت
۲۔	مانک تلہ	جوتے اور چمڑے کا دیگر سامان بنانے کی صنعت
۳۔	نپ دیپ	غیر آہنی سامان تیار کرنے کی صنعت
۴۔	بالاہگلی	چینی اور شیشے کی صنعت
۵۔	بانکورا	لوہار اور بڑھئی کا کام
۶۔	کلیانی	اوزار خانہ، ماڈل ٹو کانسٹریشن ورکشاپ
۷۔	بارونی پور	بڑھئی خانہ اور ماڈل ڈیمانسٹریشن ورکشاپ
۸۔	مالدا	لوہار اور بڑھئی کا کام
۹۔	سیرا	لوہاری اور ریسٹ ٹو پجمنٹ

پیداوار کے مراکز

کیرالا

۱۔	ترووللا	بجلی کے موٹر تیار کئے جاتے ہیں۔
۲۔	ایشومیسور	مشینی اور دستی اوزار بنائے جاتے ہیں

مہاراشٹر

۱۔	بمبئی	جنرل مشین شاپ اور الکٹرو پلیٹنگ وغیرہ

اترپردیش

۱۔	آگرہ	جوتے سے متعلقہ سامان وغیرہ

تربیتی مرکز

مدراس

۱۔	سنٹرل فٹ ویر ٹریننگ سنٹر مدراس	جوتے چپلیں وغیرہ

اترپردیش

۱۔	سنٹرل فٹ ویر ٹریننگ سنٹر آگرہ	جوتے چپلیں وغیرہ

سالانہ رپورٹ

طیب حسین خاں ایم پی جنرل سکریٹری

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن دہلی

آپ حضرات کا تہ دل سے خیر مقدم کرتا ہوں۔ حضرات مجھے احساس ہے کہ یہ جلسہ قدرے تاخیر سے منعقد ہو رہا ہے۔ اس کو اپریل ۷۴ء کی کسی تاریخ میں اپنے سال کے اختتام کر دینا چاہئے تھا مگر دہلی جیسے بڑے شہر میں جہاں فاصلے محلوں اور علاقوں کے نہیں بلکہ شہروں کے ہیں، لوگوں کو جمع کرنے اور ان تک اطلاع پہنچانے میں وقت کا زیاں کرنا ہی پڑتا ہے بگر یہ وہ زیاں ہے جس کے سود سے ہم مایوس نہیں۔

حضرات! کل کی سی بات ہے کہ ۸ رفروری ۷۳ء کو ویسٹرن کورٹ میں کچھ احباب جمع ہوئے یہ وہ صاحب فکر و نظر تھے جو ملک کے بدلتے ہوئے نظام اور تعلیم کے بدلتے ہوئے انتظام کو شدت سے محسوس کر رہے تھے، ان کو یہ احساس تھا کہ اس نئے ہندوستان میں ہر فرد کا ایک فرض منصبی ہے بلکہ میں نے غلط کہا! ہر فرد کے کئی فرض منصبی ہیں۔ اور ہر مورچہ پر اس کو بیک وقت کئی انجام دینے ہیں وہ اپنے مذہب کا نمائندہ بھی ہے اور اپنے ملک کا شہری بھی۔ اس کا تعلق اپنے گھر کی چہار دیواری سے بھی ہے اور شہر کے اس وسیع میدان میں بھی جد و جہد اور عملی زندگی کا آغاز کرنا ہے۔ ہندوستان کے وسیع نقشہ پر اگرچہ علی گڑھ ایک بہت چھوٹا سا شہر ہے۔ مگر اپنی قدر و منزلت، معیار، اور مزاج کے اعتبار سے اتنا وسیع ہے کہ خود ہندوستان اس کے اندر سمٹ سکتا ہے۔ علی گڑھ محض کسی شہر کا نام اور مسلم یونیورسٹی محض کسی ادارہ کا نام نہیں ہے بلکہ علی گڑھ اور مسلم یونیورسٹی ایک تہذیب کا نام ہے، ایک تمدن کی علامت ہے۔ بلکہ مجھے کہنے کی اجازت دیجئے کہ یہ کلچر مختلف مذہبوں، مزاجوں اور تہذیبوں سے مل کر ابھرا ہے گنگا جمنی تہذیب جس کو ہندوستان کی خصوصیت کہا جاتا ہے اس کا دوسرا نام مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہے۔

اس ۸ رفروری کی محفل میں ان اصحاب فکر و نظر نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شاخ اور رابطہ کی ایسوسی ایشن کی حیثیت سے کام کرے گی۔ اس مجلس میں جن اصولوں کو نصب العین بنایا گیا وہ یہ تھے کہ ہماری ایسوسی ایشن سیاسی مسائل سے الگ رہ کر سماجی، تہذیبی اور تعلیمی میدان میں علی گڑھ کے اساتذہ، طلبا اور دیگر علم دوست حضرات کے لئے کام کرے گی ——— سر سید علیہ الرحمہ نے مسلمانوں اور ہندوستان کے دوسرے رہنے والوں کے درد کا مداوا تعلیم میں تلاش کیا تھا۔ آج بھی چاہے دکھ درد کا مداوا صحیح تعلیم و تربیت میں پوشیدہ ہے۔ حکومت کے بڑھتے ہوئے دائرۂ اثر کو دیکھتے ہوئے محسوس کیا گیا کہ انتظامیہ میں مسلمانوں کی مناسب نمائندگی وقت کی اہم ضرورت ہے چنانچہ یہ طے کیا گیا کہ ذہین اور ہونہار طلبا کو مقابلے کے امتحان کے لئے آمادہ کیا جائے اور اس میں جو قدمے، سخنے اور درمے ان کی مدد کی جا سکتی ہے اس کے ذرائع تلاش کئے جائیں۔ ملازمتوں کے سلسلے میں کوشش کے علاوہ ان کو معلومات فراہم کی جائیں گی۔ اس ایسوسی ایشن کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک عارضی مجلس عاملہ کی تشکیل بھی عمل میں آگئی۔ یہ وہ خشت اول تھی جس کی تعمیر کو معمار اپنی حدوں تک لے جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

اس پہلے جلسہ کے بعد ۸ رمارچ، ۱۴ رمارچ اور ۱۵ رمارچ کو جو جلسے محترم شفیع قریشی صاحب اور معین الحق چوہدری صاحب کی قیام گاہوں پر ہوتے وہ اس اعتبار سے اہم اور تاریخ ساز ہیں کہ اس جلسے میں اس جماعت کا نام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن دہلی تجویز ہوا۔ اور دستور و ضوابط کو آئینی ترتیب دے کر مجلس عام کے سامنے پیش کرنے کے لئے تیار کر دیا گیا۔

اس دستور کو ذیل کے اصحاب نے ترتیب دیا اور مکمل کر کے پیش کر دیا۔

۱۔ جناب معین الحق چوہدری صاحب ۲۔ جناب سید حامد صاحب ۳۔ ڈاکٹر سجاد صاحب
۴۔ خواجہ محمد عبد الحیٔ صاحب ۵۔ جناب چوہدری محمد عارف صاحب۔

۸ راپریل ۷۳ء کو جناب معین الحق چوہدری صاحب کی کوٹھی پر مجلس عام کا پہلا کھلا اجلاس ہوا اس مجلس عام میں دستور کو تھوڑی تبدیلی کے بعد پاس کر دیا گیا۔ اس طرح اس عارضی مجلس عاملہ کا کام ختم ہو گیا اور انتخاب کے لئے ممبروں کو دعوت دی گئی۔ مجلس عاملہ کے لئے ذیل کے اصحاب کا انتخاب عمل میں آیا۔ جن کو دو سال کے لئے منتخب کیا گیا۔

صدر معین الحق چوہدری
نائب صدر سینئر ۔ محمد شفیع قریشی
〃 〃 جونیئر ۔ محمد یوسف صدیقی
جنرل سکریٹری ۔ چوہدری طیب حسین خاں
جوائنٹ سکریٹری جونیئر ۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی صاحب
خازن ۔ سید احمد صاحب

اراکین ۔

جناب حامد صاحب ۔ ڈاکٹر آئی، اے، سجاد صاحب۔ جناب بھوانی شنکر صاحب۔ جناب الیف۔ ایم کامل قریشی صاحب۔ جناب حاجی زین العابدین صاحب۔ جناب جمیل احمد قریشی صاحب جناب سید غلام صمدانی صاحب۔ محترمہ مس صغری مہدی صاحبہ۔

۸ رمئی اور ۹ رمئی کے مجلس عاملہ کے جلسے اس اعتبار سے کامیاب رہے کہ جن جن باتوں پر اس ایسوسی ایشن کے کاموں کا بار ڈالا گیا تھا انھوں نے بحسن و خوبی ان کو انجام دیا یعنی ایسوسی ایشن کا رجسٹریشن ڈاکٹر احمد صدیقی اور چوہدری محمد عارف صاحب کی کوششوں سے مکمل ہو گیا۔ اب ہماری

یسوسی ایشن کا رجسٹریشن نمبر ۵۹۴۳ Sتاریخ رجسٹریشن ۳-۴-۱۹۷۳ جناب معین الحق چودہری صاحب جناب محمد شفیع قریشی صاحب۔ سید محمد حامد صاحب۔ محمد عارف صاحب اور خاکسار کے سپرد یہ کام تھا کہ دلی وقف بورڈ سے زمین حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ تاکہ ہم اپنے خوابوں کی تعبیر عمارت کی تعمیر کی صورت میں دیکھ سکیں۔ چنانچہ وقف بورڈ کے تعاون سے وقف کی زمینوں کا ان اصحاب نے معائنہ کیا اور جو زمینیں موزوں سمجھی گئیں ان کے حصول کے لئے باضابطہ درخواست ۱۴ر اگست کو دے دی گئی۔

۱۶ر ۱۹۷۳ء کو ایسوسی ایشن کی عمارت کے لئے جگہ حاصل کرنے کے لئے چیرمین وقف بورڈ سے ملاقات کی گئی اور ان کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی گئی کہ وقف کی زمینوں کا سب سے بہتر مصرف یہ ہے کہ ان کو کسی ایسے کام میں لگا دیا جائے جس کا فیضان ہمیشہ باقی رہے۔ ان کو ہماری تجویز سے بنیادی طور پر اتفاق تھا۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وقف بورڈ کی اگلی میٹنگ میں ہماری درخواست کو پیش کر دیا جائے گا۔ ۵ر دسمبر کو اراکین ایسوسی ایشن جناب مرزا محمود بیگ صاحب ممبر وقف بورڈ سے ملے تو انھوں نے ہمارے کاموں کو دلچسپی کی نظر سے دیکھا۔ جناب سید مظفر حسین صاحب برانی چیرمین دلی وقف بورڈ اگرچہ علیگ نہیں ہیں مگر ایسوسی ایشن کے پروگراموں کو پسند فرماتے ہوتے انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس معاملہ میں ہر قسم کی مدد کو تیار ہیں۔ اس وقفہ میں دستور کی طباعت ہوئی۔ اور اسٹیٹ بینک پارلیمنٹ اسٹریٹ نئی دلی میں اکاونٹ کھول دیا گیا۔

۲۳ر دسمبر ۱۹۷۳ء کو ہمارا ایک وفد علی گڑھ گیا۔ اس وفد میں مندرجہ ذیل اصحاب شریک تھے۔

جناب محمد یوسف صدیقی۔ جناب سید احمد صاحب۔ جناب چودہری محمد عارف صاحب۔ جناب ظہیر احمد صدیقی صاحب۔ جناب سید حامد صاحب۔ جناب سعد ہاشمی صاحب۔ ڈاکٹر سجاد صاحب جناب جمیل احمد قریشی صاحب۔

افسوس اس بات کا تھا کہ میں ایک کار ایکسیڈنٹ کی وجہ سے صاحب فراش تھا اور شفیع قریشی صاحب امور مملکت میں اس قدر مصروف تھے کہ ہم دونوں اس وفد کے ساتھ نہ جا سکے۔ یہ وفد نواب صاحب چھتاری (چانسلر) پروفیسر ڈاکٹر عبدالعلیم (وائس چانسلر) اور پروفیسر خلیق احمد نظامی (پرو وائس چانسلر) کے علاوہ اساتذہ اور ایسے طلباء سے ملا جو مقابلہ کے امتحان کے لئے تیاری کر رہے تھے۔ ان اصحاب نے ہمارے ان اقدامات کو بہ نظر تحسین دیکھا اور خود علی گڑھ میں اس سلسلہ میں جو کچھ کیا جا رہا ہے اس کا خاکہ پیش کیا۔ اس میں شک نہیں کہ علی گڑھ میں جو سہولتیں اور مواقع میسر ہیں ان سے اگر فائدہ اٹھایا جائے تو مستقبل کے لئے بہت کچھ روشن امکانات ہیں۔ مگر یہاں دو باتوں کی طرف اشارہ ضروری ہے۔ طلباء سے تبادلہ خیال کے بعد جس نتیجہ پر پہنچے وہ یہ تھا کہ طلباء کے ذہن میں جو مایوسی کے بادل ہیں اُن کو دور کرنا ہے اس مایوسی کا سبب محض طلبا کو ٹھہرانا غلط ہوگا۔ اس کا سبب ہمارے سیاسی اور سماجی حالات اور انتشار میں ملتا ہے۔ دوسرے اساتذہ اور طلباء کا جو باہمی رابطہ اور رشتہ ٹوٹ کر رہ گیا ہے اور دونوں کے درمیان جو بے اعتمادی کی فضا پیدا ہوگئی ہے اس رشتہ کو پھر سے استوار کرنے کی ضرورت ہے ؎

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

یہ وفد اسی روز شام کو واپس لوٹ گیا۔ ۲۷ر فروری ۷۴ء کو دوسرا وفد گیا جو مندرجہ ذیل اصحاب پر مشتمل تھا۔

جناب محمد شفیع قریشی صاحب۔ جناب چودہری طیب حسین خاں صاحب۔ جناب چودہری محمد عارف خاں صاحب۔ جناب سید حامد صاحب۔ جناب سعد ہاشمی صاحب۔ جناب ڈاکٹر سجاد صاحب جناب قاضی زین العابدین صاحب۔

وفد کو اندازہ ہوا کہ علی گڑھ کے ارباب حل و عقد اولڈ بوائز اور طلبا مقابلہ کے امتحانات میں شرکت کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں۔ وفد نے ان سے اپیل کی کہ سارے ذرائع کو یکجا کر کے اس کی سمت منظم اقدام کیا جائے۔ اس وفد کے اراکین ارباب حل و عقد اساتذہ اور طلباء سے ملے اور اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری چودہری محمد طیب حسین نے ایسوسی ایشن کی طرف سے پیشکش کی کہ دس طلبا کو چھ ماہ تک ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ مقابلہ کے امتحانات کی تیاری کے لئے دیا جائے گا۔ اس پر علی گڑھ کے ارباب حل و عقد نے بھی تعاون اور مدد کا وعدہ کیا۔ سید حامد صاحب اور سید محمود ہاشمی صاحب نے اپنی رہنمائی کا پورا یقین دلایا۔ سکریٹری ایسوسی ایشن کی طرف سے اس امر کی بھی یقین دہانی کرائی گئی کہ دہلی کے راز اسٹڈی سرکل جو ایسے امتحانات کی تیاری کراتا ہے اس میں داخلہ کی پوری مدد کی جائے گی۔ محمد شفیع قریشی صاحب کی طرف سے اس امر کا وعدہ کیا گیا کہ وزارت ریلوے میں ہونے والی جگہوں کا نوٹس اور اس کی سہولتوں کے ضوابط برابر علی گڑھ بھیجے جاتے رہیں گے۔

۱۸ر مارچ ۱۹۷۴ء کو چودہری معین الحق صاحب کی قیام گاہ پر جو اجتماع ہوا اس میں یہ مژدہ سنایا گیا کہ دلی وقف بورڈ دونوں زمینوں یعنی شیخ سرائے اور رحتر گپتا روڈ نئی دہلی کے اطراف کی زمین پٹے پر دینے کے لئے آمادہ ہے۔ نقشہ کے لئے ملک کے ممتاز آرکیٹکٹ جناب حبیب الرحمان صاحب نے مدد کا وعدہ کیا۔ احباب کی ان کرم فرمائیوں کی باعث میری زبان پر یہ شعر بے ساختہ آتا ہے ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر

لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اب وہ منزل آگئی تھی جب ہم کو ہندوستان گیر مہم کا آغاز کرنا تھا۔ جناب کامل قریشی صاحب اور جمیل الرحمن صاحب کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ دہلی میں ایسے احباب کی فہرست تیار کریں جن کا علی گڑھ سے تعلق رہ چکا ہے۔ چنانچہ جمیل الرحمان صاحب نے اپنے حصہ کی فہرست بھجوا دی اور کامل قریشی صاحب کے حصہ کا کام باقی ہے۔

حضرات میرے تمام معروضے کا حاصل یہ ہے کہ ہماری حقیر کوششوں کی بدولت علی گڑھ میں مقابلہ کے امتحانوں میں شرکت کی فضا پیدا ہو گئی ہے۔ آئندہ سال آئی۔ اے۔ ایس اور ہمرشتہ ملازمتوں کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے چالیس طالب علم مقابلہ کے امتحان میں بیٹھ رہے ہیں۔ علی گڑھ کے طلباء اس سلسلے میں دلی آتے رہے ہیں اور اس سلسلہ میں ہم سے مشورہ کرتے رہے ہیں۔ ان کے اور ہمارے درمیان اسی رابطہ کا نتیجہ ہے کہ مسٹر راؤ نے علی گڑھ کے طلباء کی رہبری کا کام اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ ہماری تحریک اور یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی رضامندی سے وہ حال ہی میں تین روز کے لئے علی گڑھ تشریف لے گئے تھے۔ اُمید ہے کہ طلباء کے جوش، محنت اور مسٹر راؤ کی ہدایت اور دہلی اولڈ بوائز کے تعاون کے نتیجہ میں اُن طلباء کو کامیابی نصیب ہوگی۔ یہ معرکہ تو جب ہی سر ہو جائے گا۔ جب امتحانات کے نتائج دوسرے طلباء کے حوصلہ کو بڑھائیں گے۔

جہاں تک ہوسٹل تعمیر کرنے کا معاملہ ہے زمینوں کے سلسلہ میں جس دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہ یہ ہے کہ بعض زمینوں کے لئے حکومت کی خصوصی اجازت کی ضرورت ہے اور بیشتر زمینوں پر لوگ ناجائز طور پر متصرف ہو گئے ہیں۔ تاہم ہماری کوشش ہے کہ وقف بورڈ وہ زمین جس کا اس نے وعدہ کیا ہے جلد از جلد ہمیں دیدے۔

لیکن میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم ابھی سے چندہ کی فراہمی کا کام شروع کر دیں۔ اس کام میں

آپ سب حضرات کی عملی دلچسپی کی ضرورت ہو گی۔

حضرات! میں اس سمع خراشی کے لئے معذرت خواہ ہوں مگر جب جذبات کی شدت ہو اور ولولے ناپید کنار ہوں کے متلاشی ہوں تو جی چاہتا ہے کہ دل کو نکال کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔ بات کو ختم کرنے سے پہلے اپنا خوش گوار فرض سمجھتا ہوں کہ ان احباب کا شکریہ ادا کروں جن کی محبت اور تعاون نے قدم قدم پر مجھے حوصلہ بخشا میری مراد اپنے محترم معین الحق چوہدری صاحب شیخ تہوشی، محمد یوسف صاحب صدیقی، چوہدری محمد عارف صاحب سید احمد صاحب اور سید محمد حامد صاحب سے ہے اس کے علاوہ شکر گذار ہوں دوسرے اراکین اور احباب کا جنھوں نے میری رہنمائی کی۔ یہ میری ایک سال کی کوششوں کا ثمرہ ہے اس میں اگر کوئی خوبی نظر آئے تو ہم آپ سے درخواست کریں گے کہ آگے بڑھتے اور ہماری مدد کیجئے اس سے بہتر اور کون سا داد کا طریقہ ہو سکتا ہے اور اگر کوئی خامی نظر آئے تو اپنے دامن عفو میں نہ چھپایئے بلکہ اس سے ہم کو آگاہ کر دیجئے۔!

تفصیل ممبران

تفصیل ممبران پیش کرتے ہوتے مجھے بڑا افسوس ہو رہا ہے کہ دہلی شہر جس میں علیگز کی تعداد ہزاروں میں ہوگی مگر ایسوسی ایشن کے ممبروں کی کل تعداد ۶۹ ہے۔ جس میں لائف ممبران کی تعداد دس اور ممبران جن صاحبان نے سالانہ چندہ دیا گیارہ ہے۔ باقی اڑتالیس ممبران وہ ہیں جنھوں نے صرف داخلہ فیس اور ایک ماہ کی فیس دی۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں عرض کر دوں کہ علیگز نے اپنی ذمہ داری کو سمجھا نہیں اور نہ ہی علیگو سپرٹ کا مظاہرہ کیا۔ ورنہ ایک سال کی اس طویل مدت کی کاوش کے نتیجہ میں آج کا یہ جلسہ یونین ہال علی گڑھ کے جلسوں کے منظر کی عکاسی کرتا۔ میں ہر برادر علیگ سے اپیل کرتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک ممبر کم از کم دس ممبر بنایئے۔ ممبر بناتے وقت یہ کوشش کی جائے کہ ایک سال کی کے بجائے لائف ممبر بنائے جائیں۔ لائف ممبری کی ایک سو اکیاون روپے کی رقم اگر یکمشت ادا نہ کریں تو اس کو آسان تیس تیس روپے کی پانچ قسطوں میں ادا کر دیں۔ ایسوسی ایشن کی مالی رپورٹ سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ایسوسی ایشن کے پاس سرمایہ کی کمی ہے اور ایسوسی ایشن کی آمدنی کا واحد ذریعہ چندہ فیس ہے۔ گذشتہ سال جن حضرات نے صرف ایک ماہ کی فیس دی تھی اور بقایا کے لئے اگر ڈاک سے ایک دو مرتبہ تقاضے کی اطلاع بھیجی جاتی تو یہ ایک روپیہ بھی ڈاک کی نذر ہو جاتا ہے ہمیں ایسوسی ایشن کو چلانا ہے اور انشاء اللہ ایسوسی ایشن کے تمام پروگراموں کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ مگر یہ جبھی ہو سکتا ہے کہ اس کام کو ہم اپنی زندگی کا ایک جزو بنالیں۔ مجھے امید ہے کہ جولائی آگست کے جلسے میں ممبران کی تعداد حسب توقع ہو گی۔؟؟؟

کردار کے پھولوں کو نہ سولی پہ چڑھاؤ

معصوم رسولوں کو نہ سولی پہ چڑھاؤ

اے زندگیِ نو کے علم بردارو!

خود اپنے اصولوں کو نہ سولی پہ چڑھاؤ

شورش کاشمیری

دس برس کے بعد

زعیم الاحرار جناب آغا شورش کاشمیری کو پروفیسر رشید احمد صدیقی کا مکتوب گرامی موصول ہوا۔ تو آپ نے پرانی یادوں کو دہراتے ہوئے برجستہ فرمایا۔

یہ اسلوبِ نگارش مہرِ تاباں مسکرایا ہے

علیگڑھ سے رشید احمد کا خط کل شام آیا ہے

قلم کے چند فقرے ہیں کہ مروارید کی لڑیاں

نظر میں پھر گئیں اہلِ نظر کی گم شدہ کڑیاں

ارے توبہ کہ پورے دس برس کے بعد خط آیا

خیالوں کے افق پر ماضیٔ مرحوم لہرایا

ادیبِ عصر کے الفاظ میں یاقوت و گوہر ہیں

مطالب کے عمق میں راز ہائے دیدہ تر ہیں

غزل گوئی کا تیور، نثر کا اسلوب کیا کہنا

یہی طرزِ نگارش ہے مجھے محبوب کیا کہنا

مسرت جاگ اٹھی قلبِ محزوں جگمگایا ہے

یکایک نامہ پر بودھ بھی کل شام آیا ہے

وہی پر بودھ، جس کی دوستی پر ناز ہے مجھ کو

وہ جس کا بے غرض اخلاص سوز و ساز ہے مجھ کو

خدا شاہد ہے اب تک اس کے احساں یاد آتے ہیں

پسِ دیوارِ زنداں عہد و پیماں یاد آتے ہیں

کچھ اس انداز سے غمگیں طبیعت شاد کرتا ہوں

وہ اکثر یاد آتے ہیں، میں اکثر یاد کرتا ہوں

آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس

کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے گذشتہ جلسہ کو کم و بیش پانچ ماہ گزر چکے ہیں یہ جلسہ ۲۳ ستمبر ۷۲ء کو بنگلور میں ہوا تھا اور اس جلسہ میں تنظیمی امور اور دوسرے اہم طبی مسائل کے متعلق قراردادیں منظور ہوئی تھیں۔ ۲۳ ستمبر ۷۲ء سے اب تک کی کانفرنس کی کارکردگی سے متعلق ایک مختصر رپورٹ معزز ممبران کی اطلاع کے لئے پیش ہے ۔

۱۔ سرینگر کے طبیہ کالج کا معاملہ وادی کشمیر میں طب یونانی کے دوسرے مسائل

ورکنگ کمیٹی کے گذشتہ جلسہ کے ایجنڈے میں سرفہرست سرینگر کے طبیہ کالج کا معاملہ تھا اس ضمن میں وادی کشمیر میں طب یونانی کو درپیش مسائل بھی زیر غور آتے تھے۔ مجھے آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے مسرت ہے کہ کانفرنس کی پیہم جدوجہد کے نتیجہ میں حکومت جموں و کشمیر نے حال ہی میں ایک کمیٹی مقرر کی ہے جو ریاست میں دیسی طبوں کو فروغ دینے کے بارے میں ریاستی حکومت کو سفارشات پیش کرے گی حکومت جموں و کشمیر نے کمیٹی کی رہنمائی اور غور و خوض کے لئے کانفرنس سے نہ صرف تجاویز مانگیں بلکہ اس کمیٹی میں شمولیت کے لئے کانفرنس کے نمائندہ کا نام بھی طلب کیا چنانچہ کانفرنس کے سینیر نائب صدر جناب حکیم شکیل احمد شمسی کو کانفرنس کے نمائندہ کی حیثیت سے کمیٹی کا باضابطہ رکن بنایا گیا ہے۔ اس طرح ریاست جموں و کشمیر میں طب یونانی کے فروغ کے امکانات خاصے روشن ہو گئے ہیں۔ جیسا کہ تازہ ترین اطلاعات سے پتہ چلتا ہے یونانی کالج میں دوبارہ داخلے کھولنے کا مسئلہ بھی حکومت کے زیر غور ہے اور جلد ہی اس سلسلہ میں بھی فیصلہ متوقع ہے ۔

۲۔ مرکزی وزارت صحت میں یونانی ایڈوائزر کا تقرر اور دوسرے مسائل

ایک دوسری خوش خبری جو میں آپ کو دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ کانفرنس کی طویل اور پیہم جدوجہد کے نتیجہ میں حکومت ہند نے سنٹرل گورنمنٹ ہیلتھ اسکیم کے تحت نئی دہلی میں ایک یونانی ڈسپنسری کھولے جانے کے احکامات جاری کر دیئے ہیں۔ اس سلسلہ میں تمام ابتدائی کارروائی اور تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں اور جلد ہی ڈسپنسری اپنا کام شروع کر دے گی۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مرکزی ہیلتھ اسکیم کے تحت ایک اس قسم کی یونانی ڈسپنسری الہ آباد میں بھی جلد ہی کھولی جائے گی ۔

مرکزی حکومت میں یونانی کے علیحدہ ہمہ وقتی ایڈوائزر کے تقرر کے بارے میں کانفرنس ایک عرصہ سے مطالبہ کرتی رہی ہے اجلاس بنگلور کے بعد کانفرنس نے اس سلسلہ میں اپنی جدوجہد کو اور زیادہ شدید کر دیا اور تقریباً اسی ممبران پارلیمنٹ کے دستخطوں سے ایک یادداشت اس بارے میں وزیر اعظم اور وزیر صحت کو پیش کی گئی۔ یادداشت پیش کرنے کے بعد بھی کانفرنس ان ہی ممبران پارلیمان کے ذریعہ اس مسئلہ پر وزیر اعظم اور وزیر صحت کی توجہ برابر مبذول کراتی رہی ہے اور اب معلوم ہوا ہے کہ حکومت اس معاملہ پر بھی غور کر رہی ہے اور جلد ہی اس سلسلہ میں کوئی فیصلہ ہو جائے گا۔ اس بات پر یقین کرنے کا جواز موجود ہے کہ سردست ایک جوائنٹ ایڈوائزر کی تقرری عمل میں آجائے گی اور کچھ دن بعد اس جوائنٹ ایڈوائزر کو مستقل ایڈوائزر بنا دیا جائیگا۔

۳۔ صوبوں میں صورت حال امید افزا ہو رہی ہے۔

ادھر کرناٹک سرکار نے دیسی طبوں سے متعلق ڈاکٹر جی ایس ملکوٹے ممبر پارلیمنٹ کی سربراہی میں جو کمیٹی بنائی تھی اس نے دسمبر ۷۲ء میں اپنی رپورٹ ریاستی حکومت کو پیش کر دی ہے کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں یہ سفارش کی ہے کہ ریاست میں ایک طبیہ کالج قائم کیا جائے اور یونانی طب کو فروغ دینے کے لئے دوسرے اقدامات کئے جائیں۔ اس رپورٹ پر عملدرآمد ہوگا تو توقع ہے کہ ریاست میں کالج کا قیام عمل میں آنے کے ساتھ ساتھ دوسرے طبی مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔ یہاں یہ بات خاص طور پر ذکر کرنے کے قابل ہے کہ مرکزی دفتر کے علاوہ صوبائی کانفرنس نے اس سلسلہ میں زبردست جدوجہد کی اور اس نے صوبائی حکومت کے علاوہ کمیٹی ممبران سے بھی برابر رابطہ رکھا اور ملاقاتیں کیں۔ صوبائی جماعت کی یہ مساعی ستائش کی مستحق ہونے کے ساتھ دوسری صوبائی جماعتوں کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ عمل بھی ہیں۔ طب یونانی کے بارے میں سرکاری سطح پر جو امید افزا ردعمل ہوا ہے اس کی تازہ ترین خبر مغربی بنگال سے وصول ہوئی ہے۔ مغربی بنگال کے وزیر صحت مسٹر اے پانجا نے جنرل سکریٹری کے نام اپنے حالیہ مکتوب میں تحریر کیا ہے کہ ریاستی حکومت طب یونانی کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو گئی ہے اور اس سلسلہ میں ضروری اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ دوسرے بہت سے صوبوں سے بھی جن کو سرینگر میں منظور شدہ تجاویز بھیجی گئی تھیں ان تجاویز کے سلسلہ میں مناسب کارروائی کی یقین دہانیاں وصول ہوئی ہیں۔ اب یہ ہماری صوبائی جماعتوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی جدوجہد کو تیز کریں اور مقامی طور پر کوشش کر کے ان قراردادوں کو اپنی صوبائی حکومتوں سے منوائیں مرکز اس سلسلہ میں اپنے صوبائی یونٹوں کی پوری مدد کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہے۔ ایک خاص بات جس کا میں یہاں ذکر کرنا چاہوں گا اور جس کے متعلق میں صوبائی جماعتوں پر اپنے خطوط میں زور دیتا رہا ہوں یہ ہے کہ۔ اپنے مطالبات کے سلسلہ میں صوبہ کے ممبران اسمبلی اور ممبران پارلیمان سے رابطہ قائم کرنے اور ان کو اپنے مسائل سمجھا کر ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے نہایت دور رس نتائج

برآمد ہوسکتے ہیں اس لئے صوبائی جماعتوں کو اس بارے میں سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے اور اس پر عمل کرنا چاہئے اس کے ساتھ قومی پریس سے رابطہ بھی ہمارے کاموں کے حق میں مفید ثابت ہوگا ۔

۴ ۔ تنظیمی مہم

مجھے یہ بات کہتے ہوئے رنج ہو رہا ہے کہ تنظیمی امور کی بابت سرینگر میں جو قرار دادیں منظور ہوئی تھیں ان کے سلسلہ میں صوبائی یونٹوں سے کسی موثر کارروائی کی کوئی اطلاع ابھی تک موصول نہیں ہوئی ہے نہ ہی کانفرنس کی اعانت کے سلسلہ میں کسی مثبت ردعمل کا اظہار ہوا ہے ۔ اس طرف توجہ دینے کی خاص ضرورت ہے ۔

اتحاد نظم وضبط اور سعی پیہم ہی کے ذریعہ ہم طب یونانی کو وہ اعزاز وافتخار واپس دلا سکتے ہیں جو اس فن شریف کا حق ہے اور جس کے لئے ہم سب کوشاں ہیں ۔

معزز ممبران نے اس رپورٹ پر اطمینان ظاہر کرتے ہوئے اُسے منظور کر لیا ۔

رپورٹ کی منظوری کے بعد جنرل سکریٹری نے ایجنڈے کی دوسری مد کو جو مدھیہ پردیش کے طبی مسائل سے متعلق تھی ممبران کے غور کے لئے پیش کرتے ہوئے کہا ۔

" یوں تو ملک کی تقریباً ہر ریاست میں طب یونانی کے ساتھ اتنا فیاضانہ اور حوصلہ افزا سلوک نہیں ہو رہا ہے جتنا کہ دوسری طبوں کے ساتھ اس واسطے طب یونانی کی ترقی کی رفتار بہت سست ہے لیکن ریاست مدھیہ پردیش میں صورت حال بہت حوصلہ شکن ہے حصول آزادی کے بعد تک اس ریاست میں ایک آسامی افسر الاطبا کی ہوا کرتی تھی جو عہدہ اور اختیارات کے اعتبار سے جوائنٹ ڈائرکٹر آف ہیلتھ کے برابر تھی ۔ اب کئی سال سے اس آسامی کو ختم کر دیا گیا ہے بھوپال کی پرانی اور مشہور طبی درسگاہ آصفیہ طبیہ کالج کو بھی بند کر دیا گیا ہے ۔ ماضی میں صرف بھوپال کے علاقے میں یونانی ڈسپنسریوں کی تعداد ۳۶ تھی لیکن اب ان میں کی بہت سی ڈسپنسریاں بند کر دی گئی ہیں ۔ یونانی اسپتال کی عمارت کا جو اپنی ضروریات کے لئے ہی ناکافی تھی ایک حصہ آیورویدا کو دیدیا گیا ہے یونانی اسپتال کے سپرنٹنڈنٹ کی آسامی کا مرتبہ گھٹا دیا گیا ہے ۔ اطبا کی آسامیاں سالہا سال تک خالی پڑی رہتی ہیں اور ان پر تقرر نہیں کیا جاتا اس کے علاوہ اطبا کے رجسٹریشن کے جو نئے قواعد وضوابط بنائے گئے ہیں وہ بھی اطبا کے لئے چند در چند پریشانیوں کا موجب ہیں ۔ وقتاً فوقتاً صوبائی حکومت کی توجہ ان مسائل کی طرف مبذول کرائی جاتی رہی ہے لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے لہٰذا ضرورت ہے کہ اس جلسہ میں ایک جامع قرار داد اس سلسلہ میں منظور کی جائے اور حکومت کے ذمہ داروں سے کانفرنس کا ایک وفد مل کر طب یونانی کے ساتھ ہونے والی ان ناانصافیوں کا تدارک کراتے اور ارباب حکومت پر زور دے کہ وہ مندرجہ ذیل امور کی طرف فوری توجہ دیں اور مناسب کارروائی کریں ۔

۱ ۔ بھوپال کا آصفیہ طبیہ کالج دوبارہ کھولا جائے ۔

۲ ۔ طب یونانی کے لئے حسب سابق ایک جوائنٹ ڈائرکٹر مقرر کیا جائے ۔

۳ ۔ دیہی علاقوں میں طبی ڈسپنسریاں قائم کی جائیں اور ہر شہر میں کم از کم ایک یونانی ڈسپنسری قائم کی جائے ۔

۴ ۔ بنگلور ۔ حیدرآباد ۔ لکھنؤ ۔ پٹیالہ کی یونانی فارمیسیوں کے نمونہ پر جدید ساز وسامان سے لیس ایک یونانی فارمیسی بھوپال میں قائم کی جائے ۔

۵ ۔ رجسٹریشن کے طریقہ کار کو نرم کیا جائے اور اسے سنٹرل کونسل ایکٹ سے ہم آہنگ بنایا جائے

اس کے بعد جنرل سکریٹری نے ممبران کو بحث کی دعوت دی ۔ بحث میں جناب حکیم سید ظل الرحمن صاحب اور جناب حکیم محمد انور صاحب نے حصہ لیا اور ان تمام مسائل پر سیر حاصل تبصرہ کیا جس کے بعد ہاؤس نے مندرجہ ذیل قرار داد اتفاق رائے سے منظور کی ۔

آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کی یہ جلسہ حکومت مدھیہ پردیش سے پر زور مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ریاست میں طب یونانی کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو ختم کرنے کے لئے ضروری اقدامات کرے اور مندرجہ ذیل امور کے سلسلہ میں بغیر کسی تاخیر کے کارروائی کرے ۔

۱ ۔ بھوپال کا آصفیہ طبیہ کالج دوبارہ کھولا جائے ۔

۲ ۔ طب یونانی کے لئے حسب سابق ایک جوائنٹ ڈائرکٹر مقرر کیا جائے ۔

۳ ۔ دیہی علاقوں میں طبی ڈسپنسریاں قائم کی جائیں اور ہر شہر میں کم از کم ایک یونانی ڈسپنسری قائم کی جائے ۔

۴ ۔ بنگلور ۔ حیدرآباد ۔ لکھنؤ ۔ پٹیالہ کی یونانی فارمیسیوں کے نمونہ پر جدید ساز وسامان سے لیس ایک یونانی فارمیسی بھوپال میں قائم کی جائے ۔

۵ ۔ رجسٹریشن کے طریقہ کار کو نرم کیا جائے اور اسے سنٹرل کونسل ایکٹ سے ہم آہنگ بنایا جائے

اس قرار داد کے منظور ہو جانے پر جنرل سکریٹری نے ہاؤس کے سامنے برہانپور کے سیفیہ حمیدیہ یونانی طبیہ کالج کو حکومت کی طرف سے گرانٹ دیئے جانے کا مسئلہ رکھا اور حکیم محمد انور صاحب سے درخواست کی کہ وہ معزز ممبران کو اس کیس کی تفصیلات سے باخبر کریں ۔ چنانچہ حکیم صاحب موصوف نے ہاؤس کو بتایا کہ اگرچہ کالج کا الحاق ساگر یونیورسٹی سے ہو چکا ہے اور طلبا کا پہلا بیچ اس سال فراغت حاصل کر کے کالج سے نکل چکا ہے تاہم حکومت سے ابھی تک کالج کو کوئی گرانٹ حاصل نہیں ہو سکی ہے جس سے کالج کے تعلیمی اور توسیعی پروگراموں پر برا اثر پڑ رہا ہے ۔ آپ نے مزید کہا کہ حکومت کو اس سلسلہ میں متعدد یادداشتیں بھی پیش کی جا چکی ہیں اور ذمہ داران حکومت سے ذاتی طور پر مل کر ان کی توجہ اس طرف بار بار دلائی گئی ہے لیکن ہنوز کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا ہے حکیم محمد انور صاحب کی مفصل رپورٹ سن لینے کے بعد ہاؤس نے متفقہ طور پر مندرجہ ذیل قرار داد منظور کی ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا کہ اس سلسلہ میں حکومت کے ذمہ داروں سے رابطہ برقرار رکھا جائے اور اعلیٰ سطح پر گرانٹ کے لئے کوششیں جاری رکھی جائیں ۔

آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا یہ جلسہ منعقدہ بھوپال (۱۶ مارچ ۷۴ء) وزیر اعلیٰ مدھیہ پردیش اور وزیر صحت مدھیہ پردیش سے پر زور اپیل کرتا ہے کہ وہ برہانپور کے سیفیہ حمیدیہ یونانی طبیہ کالج کی گرانٹ کی درخواست پر ہمدردانہ غور فرما کر اس کے لئے مناسب گرانٹ کے احکامات جلد از جلد جاری کریں تاکہ یہ کالج مالی مشکلات سے چھٹکارا پا کر تعلیمی معیار کی بہتری اور علمی سہولیات کی توسیع جیسے مفید کاموں پر توجہ دے سکے ۔

اس کے بعد جنرل سکریٹری نے جناب حکیم رام بھلیا صاحب کی مندرجہ ذیل تجویز ہاؤس کے سامنے پیش کی ۔ آپ نے کہا کہ یہ تجویز ورکنگ کمیٹی کے ۲۳ ستمبر ۷۳ء کو سرینگر میں ہونے والے جلسہ میں پیش ہوئی تھی لیکن اس وقت یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ اس کو آئندہ جلسہ میں رکھا جائے ۔ چنانچہ یہ تجویز آپ حضرات کی خدمت میں پیش ہے ۔

جس طرح ویدوں کی آل انڈیا تجویز نے آیوروید آچاریہ اور وید بھیشگ وشارد کی سند دینے کیلئے

آیورویدودیاپیٹھ قائم کر رکھی ہے اور اس کی دی ہوئی اسناد کو حکومت ہند سے تسلیم کرالیا ہے اسطرح آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس بھی ایسے طبیبوں کے لئے جو پرائیویٹ امتحان دینا چاہتے ہیں پرائیویٹ طبی امتحانات کی ایک باڈی قائم کرے اور اپنی دی ہوئی اسناد کو حکومت سے تسلیم کرائے تاکہ اطبا اپنا کوالی فیکشن بڑھا سکیں اور مستند اطبا کی تعداد کم نہ ہو۔

محرک۔ حکیم رام لبھایا۔ موئید۔ حکیم صیانت اللہ

اپنی مذکورہ بالا تجویز کی وضاحت کرتے ہوئے حکیم رام لبھایا صاحب نے کہا میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ حکیم صاحبان کی تعداد روز بروز کم ہوتی جارہی ہے اور وئید صاحبان کی تعداد بڑھ رہی ہے جس کی وجہ سے حکومت ہند بھی آیورویدک ڈسپنسریاں یونانی کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ کھول رہی ہے اور اس کا خیال بھی زیادہ کرتی ہے ۔

۱۔ آیورویدک کالجوں کی تعداد یونانی کالجوں کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ ہے ۔

۲۔ اس کے علاوہ ودیاپیٹھ جیسے دو تین ادارے اور بھی ہیں جو وئیدوں کا پرائیویٹ امتحان لے کر ان کو باقاعدہ کوالی فائڈ بناتے ہیں جس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر بڑے شہر میں کچھ وئید صاحبان ایسے ہیں جو اپنے شاگردوں کو اپنے اپنے مطب میں پڑھاتے رہتے ہیں اور جب یہ شاگرد اس قابل ہوجاتے ہیں کہ امتحان میں بیٹھ سکیں اور ودیاپیٹھ کا دو سالہ اور چار سالہ نصاب مکمل کرلیتے ہیں تو ودیاپیٹھ والے اپنے مقرر کردہ سنٹروں میں اپنے مقرر کردہ نگرانوں کی نگرانی میں اور اپنے ہی وئیدوں کے ذریعہ ان کو امتحان دلاتے ہیں اور انھیں دو سالہ ڈپلوما اور چار سالہ ڈگری دیتے ہیں اس ڈپلوما اور ڈگری کو سنٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن نے تسلیم کرلیا ہے۔ اس طریق کار سے وئیدوں کی تعداد میں ہر سال قابل قدر اضافہ ہوتا رہتا ہے ۔

اگر ہماری کانفرنس بھی اس طرز کی باڈی مقرر کرکے پرائیویٹ امتحانات کا انتظام کرے تو حکیم صاحبان کی تعداد میں بھی کافی اضافہ ہوسکتا ہے اور آج کل کے زمانے میں تعداد کی کافی قیمت ہے ۔

میری یہ تجویز ہے کہ اس کام کے لئے تعلیمی کام جاننے والے اطبا کی ایک کمیٹی بنادی جائے جو اس باڈی کے قیام اور اس کے طریقہ پر اور امتحانات کے نصاب کے سلسلہ میں ٹھوس سفارشات پیش کرے تاکہ اس تجویز کو جلد از جلد عملی جامہ پہنایا جاسکے۔"

ہاؤس نے اس تجویز کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہوئے اس کے متعلق مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی ۔

"آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا یہ جلسہ طے کرتا ہے کہ حکیم رام لبھایا صاحب کی مذکورہ بالا تجویز کا تفصیلی جائزہ لینے اور اس کے بارے میں ٹھوس علمی سفارشات پیش کرنے کے لئے ایک ذیلی کمیٹی پانچ ایسے اطبا پر مشتمل بنادی جائے جس کو طبی تعلیم کا علمی تجربہ ہو اور یہ کمیٹی اپنی سفارشات آئندہ جلسہ میں پیش کرے ۔ ذیلی کمیٹی کے اراکین کی نامزدگی صدر محترم جنرل سکریٹری کے مشورہ سے کردیں۔

جناب حکیم ناظر حسن صاحب شمیم کی مندرجہ ذیل تجویز جناب حکیم سید حسن احمد چودھری کی تائید سے منظور ہوئیں۔

" آل انڈیا طبی یونانی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا یہ جلسہ حکومت ہند سے مطالبہ کرتا ہے کہ یونانی دواخانوں کے لئے ہر ضلع کے لئے ڈرگ انسپکٹر کا علیحدہ کوٹہ مقرر کیا جائے اور اس کی تقسیم ضلع طبی کانفرنس کے صدر اور سکریٹری کی مطابقت پر ہو جیسا کہ پہلے ہوتا تھا کیونکہ کنٹرول آفس سے صوبائی تقسیم کی وجہ سے ادویہ کے بنانے میں بڑی دشواری پیش آرہی ہے ۔"

جناب حکیم ناظر حسن صاحب شمیم کی دو تجویزیں اتفاق سے منظور ہوئیں جو ذیل میں دی جارہی ہیں ان تجاویز کی تائید علی الترتیب جناب حکیم سید حسن احمد صاحب چودھری اور جناب حکیم سید منظور علی صاحب سبزواری نے کی ۔

(۱) آل انڈیا طبی یونانی کانفرنس کی یہ ورکنگ کمیٹی کا یہ جلسہ محسوس کرتا ہے کہ اعلیٰ طبی تعلیم کے مناسب انتظام اور طبیہ کالجوں کے الحاق کے لئے ایک یونیورسٹی کے قیام کی ضرورت ہے اور طے کرتا ہے اس سلسلہ میں ایک مناسب اور تفصیلی منصوبہ مرتب کیا جائے ۔"

(۲) آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا یہ جلسہ سنٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن سے سفارش کرتا ہے کہ وہ بھارت طبیہ کالج سہارنپور کی مندرجہ ذیل اسناد کو تسلیم کرے ۔

چار سالہ کورس ڈی یو ایم

دو سالہ کورس سہایک حکیم

جناب حکیم ابوالکلام صدیقی صاحب کی مندرجہ ذیل تجویز جناب حکیم محمد مختار اصلاحی کی تائید سے منظور ہوئی ۔

"آل انڈیا طبی یونانی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا یہ جلسہ حکومت ہند سے مطالبہ کرتا ہے کہ جس طرح علوم و فنون کے ماہرین ٹیچرس گریجوٹس اور کچھ کردہ طبقوں کے نمائندے مرکزی اور صوبائی اداروں کے لئے منتخب کئے جاتے ہیں اس طرح اطبا کی نمائندگی کا اصول بھی تسلیم کرکے مرکز اور صوبوں میں اطبا سے بلحاظ تعداد ایک یا دو طبیبوں کو منتخب کیا جائے تاکہ ہم طبی مسائل کو صحیح طور پر براہ راست اور عوام کے منتخب نمائندوں کے سامنے پیش کرکے حق و انصاف حاصل کرسکیں اور اس طریقہ علاج کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید اور موثر بنا سکیں ۔"

اس کے بعد جناب حکیم رام لبھایا صاحب کی مندرجہ ذیل تجویز جناب حکیم ترلوکی ناتھ گپتا کی تائید و حمایت سے منظور ہوئی ۔

"آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا یہ جلسہ طے کرتا ہے کہ ورکنگ کمیٹی کے جلسوں اور عام اجلاس کے موقعوں پر اجتماعی مطب کے ساتھ ساتھ ایک سیمینار یا سمپوزیم کا بھی انتظام کیا جائے جس میں اطبا اپنی بہترین مجربات یا طبی میدان میں اپنی تحقیق و تجربہ کے نتائج پیش کریں اور کانفرنس ان کو کتابی شکل میں شائع کردے تاکہ ملک کے تمام اطبا ان سے استفادہ کرسکیں ۔"

مرہٹواڑہ (مہاراشٹر) کے علاقے کے مسائل کے بارے میں جناب حکیم سید منظور علی سبزواری نے جو تجاویز پیش کی تھیں ان کے متعلق طے ہوا کہ چونکہ یہ معاملات بنگلور اجلاس میں زیر غور آچکے ہیں ان کے متعلق قراردادیں منظور ہوکر حکومت مہاراشٹر اور متعلقہ افسران کو جاچکی ہیں اور اس سلسلہ میں برابر مرکزی دفتر سے مراسلت جاری ہے اسلئے از سر نو کوئی قرارداد منظور کرانا مناسب نہ ہوگا چنانچہ کہا گیا کہ جناب حکیم سید منظور علی سبزواری صاحب جناب حکیم محمد مختار اصلاحی صاحب صدر مہاراشٹر طبی سے مل کر اس سلسلہ میں کوئی پروگرام بنائیں تاکہ یہ مسائل جلد از جلد حل ہوسکیں ۔

چونکہ دوسرے صوبوں سے کوئی تجاویز موصول نہیں ہوئی تھیں اس لئے جنرل سکریٹری نے صدر کی اجازت سے جلسہ کی کارروائی ختم ہونے کا اعلان کیا اور معزز ممبران اور مدعوئین خصوصی کا شکریہ ادا کیا جو دور دراز کی مسافت طے کرکے اس جلسہ میں شریک ہوئے اور اپنا قیمتی وقت اور تعاون کانفرنس